آوارہ گرد

تیسرا حصہ

PDFBOOKSFREE.PK

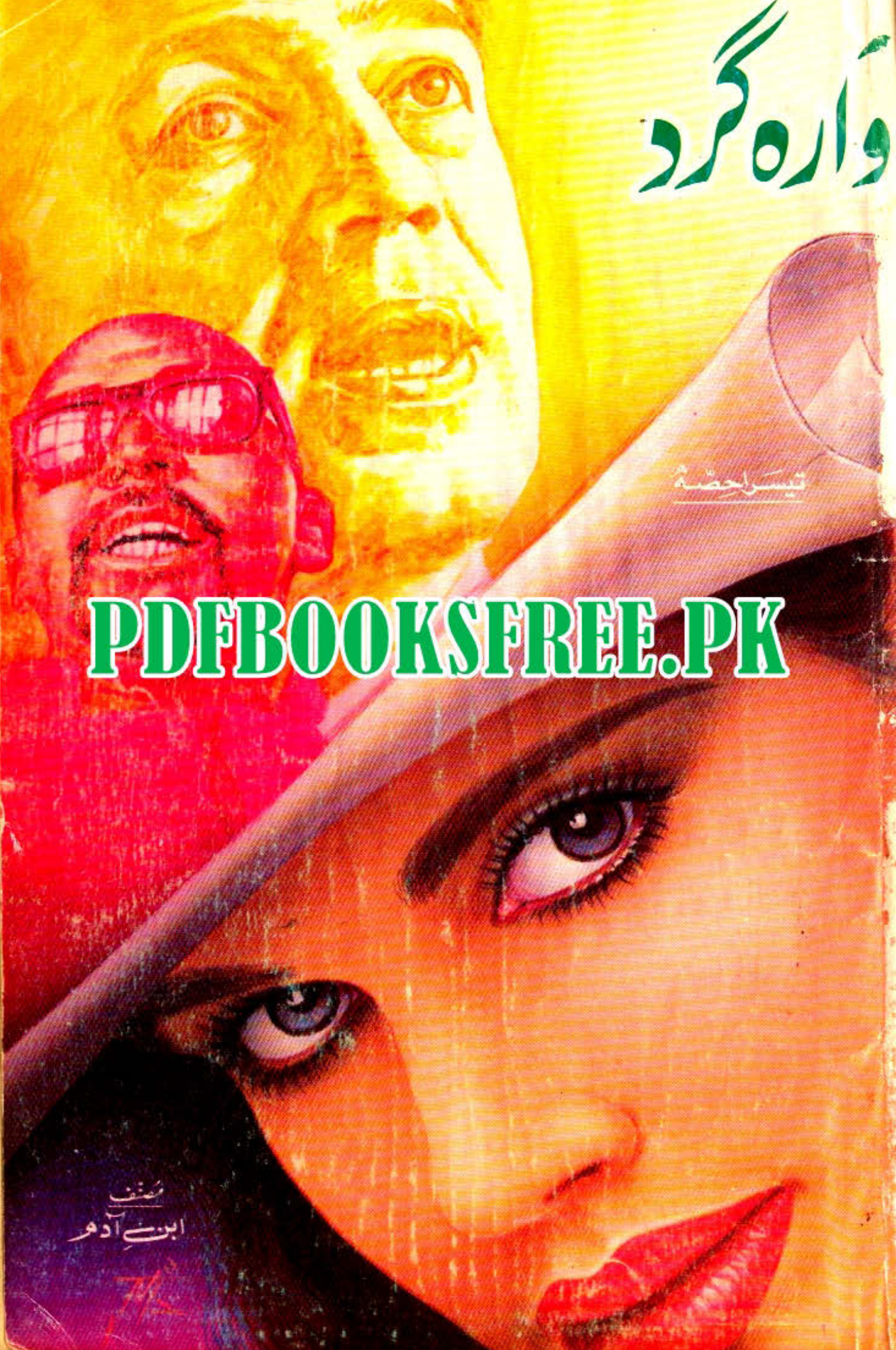

مصنف

ابنِ آدم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نئے اُفق کا طویل ترین سلسلہ جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کرتے تھے

◎

پنجاب کے گھبرو جیالے خرم سلطان چوہدری کی سرگزشت
جس نے بدی کے خلاف قدم قدم جہاد کیا

آوارہ گرد

تیسرا حصّہ

تحریر
ابنِ آدم

احباب
پوسٹ بکس ۲۱۴۷ ناظم آباد، کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

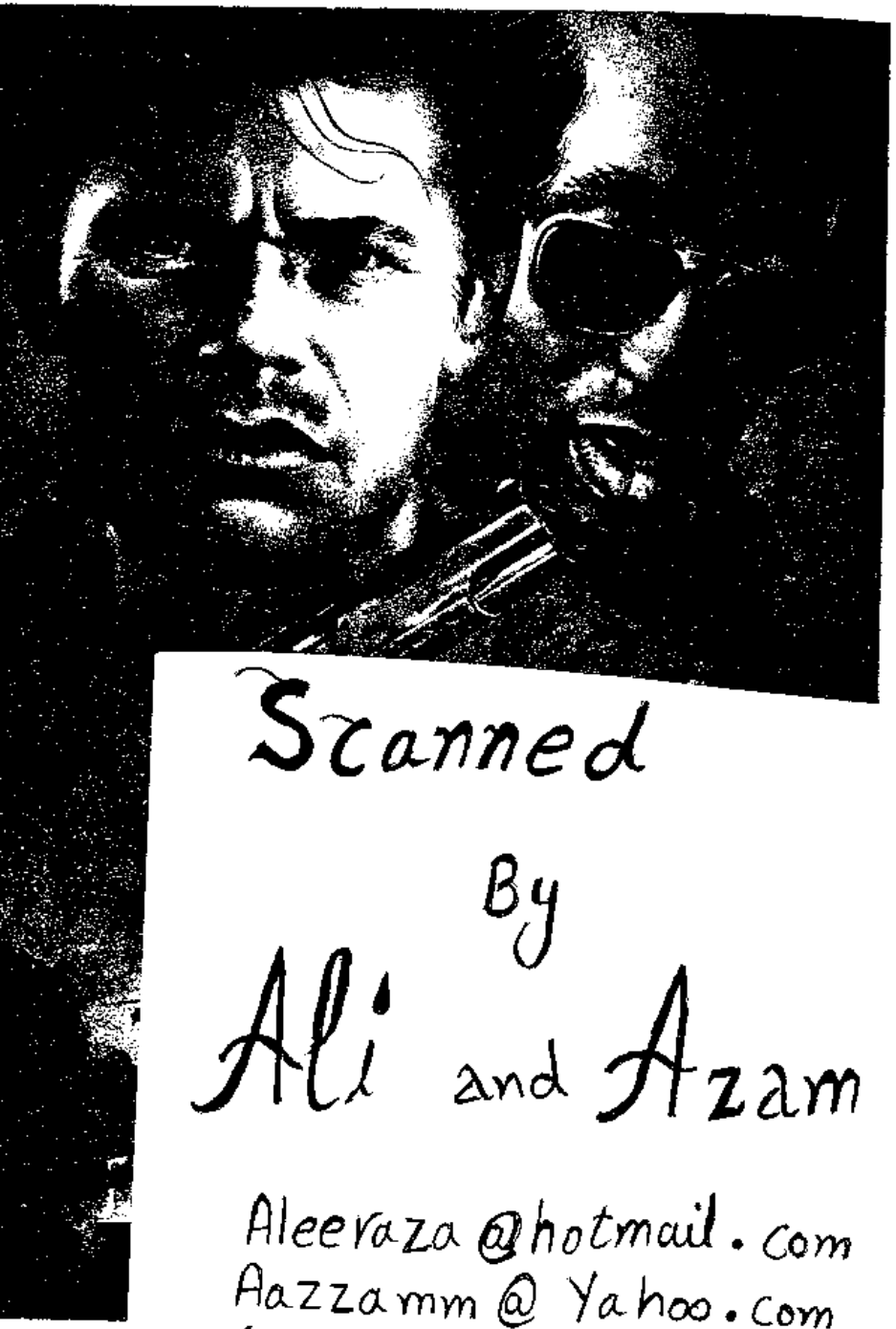

Scanned
By
Ali and Azam
Aleeraza@hotmail.com
Aazzamm@Yahoo.com
(Lahore & Sahiwal)

"اوہ خرم..." فون کرکے اندر آتے ہی وہ پریشان لہجے میں بولی۔ "مجھے یہ اطلاع سب سے پہلے دینا چاہیئے تھی کہ جب ڈاکٹر سلوین اور میں، وارڈ کا راؤنڈ مکمل کرکے واپس آرہے تھے تو محافظ کے ساتھ ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا اور وہ دونوں الحکرم کی سزا پر دبی دبی گفتگو کررہے تھے۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتی مگر میں نے اتنی بات ضرور سن لی تھی کہ الحکرم کو سزائے موت سنائی جاچکی ہے۔ جب ہم قریب پہنچے تو نووارد ایک فائل لے کر اندر چلا گیا تھا۔"

"اوہ میرے خدا۔ اگر یہ سچ ہے تو سزا پر کسی بھی وقت عمل ہوسکتا ہے۔ اگر کل ہی ایسا ہوگیا تو ہماری ساری محنت رائگاں جائے گی۔ کاش! مجھے یہاں پابند نہ کردیا گیا ہوتا۔ ان کو جلدی بلاؤ مارشا، اس فائل والے شخص کو بہرطور دیکھنا ہوگا۔"

"وہ چار بجے سے پہلے اندر داخل نہیں ہوسکتے۔" مارشا نے جواب دیا۔

"تم نے فون کہاں سے کیا ہے؟"

"ہمارے وارڈ کے کونے میں ایک بوتھ ہے۔" مارشا نے بتایا اور میں اچھل کر بیڈ سے اتر گیا۔ "چلو مجھے لے چلو تم باہر رُک کر خیال رکھو گی۔"

"آہستہ خرم آہستہ چلو، تم بیمار ہو۔" مارشا نے دوڑ کر مجھے روک لیا۔ "میں تمہیں سہارا دوں گی۔"

میں اپنی بے بسی پر دانت پیس کر رہ گیا۔ بہرکیف مجھے چال میں بیماروں جیسی نقاہت ظاہر کرنا پڑی۔ مارشا اگر بروقت نہ روکتی تو میں دوڑتا ہوا باہر نکل جاتا۔ اگر کوئی ڈاکٹر دیکھ لیتا تو مجھے پاگل ہی سمجھ لیا جاتا۔

مارشا میرے ساتھ بوتھ تک گئی۔ پھر اُسے باہر چھوڑ کر میں اندر چلا گیا۔ میں نے لیاؤش کا نمبر ڈائل کیا۔

اس نے بلاتاخیر ریسیور اُٹھا لیا تھا۔ "لیاؤش جارش بول رہا ہوں۔" اس کی آواز آئی۔

"سنیئے انکل جس حالت میں بھی ہیں، گوتھم کے ساتھ فوراً گیٹ کے سامنے والے سنیک بار میں چلے آئیں اور گیٹ پر نگاہ رکھیں۔ جس شخص کے ساتھ بھی مارشا اندرونی گیٹ سے نکلے اُسے بہرصورت مہمان بنانا ہے۔ اگر آپ کے پیش نظر کوئی مصلحت ہو تو میرا پیغام گوتھم تک پہنچا دیجئے۔ ابھی فوراً۔"

"ہم آرہے ہیں اور کوئی ہدایت؟"

"بس! وہ ایک اہم مہرہ ہے۔" میں نے کہا اور اُدھر سے لائن مُردہ ہوگئی۔

میں بے حد پریشان تھا اور طوفانی رفتار سے سوچ بھی رہا تھا۔ مگر سوچ نے چابک مارا۔ میں نے ایک شخص کو اغوا کرنے کا حکم تو دے دیا تھا مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ لیاؤش کا قیام سرائے میں ہے۔ ایسی جگہ جہاں رات دن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سرائے کا پارکنگ شیڈ لیاؤش کے کمرے سے خاصا دُور تھا۔ وہ دن کی روشنی میں اس شخص کو اپنے کمرے میں کیسے لے جاسکتا تھا؟ میں نے ریسیپشن کا نمبر ڈائل کرلیا۔ دوسری گھنٹی پر اس کی مترنم آواز سنائی دی۔ میں نے اپنا نام بتایا تو جواب میں اس کی گہری سانس سُنائی دی۔

"صرف سنو اچھی لڑکی! مجھے معلوم ہے کہ تم ناراض ہو لیکن میں جس منزل کا مسافر ہوں وہ تم بھی جانتی ہو۔ گاڑی لے کر جتنی جلدی پہنچ سکتی ہو، ہولی کراس اسپتال کے مین گیٹ پر چلی آؤ۔ سنیک بار میں تمہیں دو آدمی بیٹھے ملیں گے اُن میں ایک حبشی نوجوان ہے۔ میرے حوالے سے اس کے پاس بیٹھ جانا۔ وہ ایک شکار کریں گے اور شکار تمہیں اپنے گھر لے جانا ہے۔"

وہ غراتی آواز میں بولی۔ "یہ تم بالاہی بالا کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"کیا تم لیاؤش کو جانتی ہو...؟" میں نے اس کی بات نظرانداز کردی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں، جانتی ہوں۔"

"دوسرا شخص لیاؤش ہوگا۔"

"اوہ... تو تم کھیل شروع کر چکے ہو؟"

"یہ وقت طنز اور شکوے کا نہیں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "جو کہہ رہا ہوں، کرو۔"

"بہتر چیف۔"

میں نے جھلاہٹ میں ریسیور رکھ دیا۔ کیونکہ ایک شخص باہر اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ میں جوں ہی لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا، مارشا نے لپک کر مجھے سنبھال لیا اور وہ شخص مجھ پر رحم بھری نگاہ ڈالتا ہوا بوتھ میں چلا گیا تھا۔

میں نے تمام تیر اندھیرے میں ہی چھوڑے تھے، مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ فائل بردار شخص کا تعلق اسپتال کی انتظامیہ سے تھا یا وہ فوجی تھا لیکن اطلاع ایسی ہی تھی جس نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔

"نرم..." مارشا مجھے تھپکا دے کر بولی۔ "اگر وہ دونوں محافظ ہوئے تب...؟"

"تب بھی اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے بے چینی سے ہٹتے ہوئے جواب دیا۔ "ایسی صورت میں تمہیں اپنی موہنی صورت اور دردآمیز مسکراہٹ کا جادو جگانا ہوگا۔"

"کیا وہ اتنے ہی احمق ہوں گے۔"

"ہوئے تب بھی تم ان کے ذہن پر چھا جاؤ گی۔" میں نے کہا۔

"میں کوشش کروں گی۔" مارشا بدلی ہوئی آواز میں بولی "میں تمہاری کامیابی اور خوشی کی خاطر اس مارشا کو بھرپور زندہ کر لوں گی جسے تمہاری رفاقت حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنے ہاتھوں مار ڈالا تھا۔"

مارشا کے انداز اور جذبۂ قربانی نے میرے گلے میں فخر اور دکھ کے ملے جلے جذبات کا پھندا سا لگا دیا تھا۔ اس نے محض رسمی انداز اختیار نہیں کیا تھا۔ میں اس کے ماضی کا گواہ تھا جب اسے میری راہ پر ڈال دیا گیا تھا۔ اس وقت کی مارشا اور آج کی مارشا میں جو فرق تھا اُس سے میں پوری طرح آگاہ تھا بلاشبہ مارشا نے خود کو قربان کر دیا تھا۔ اس نے میری خاطر مذہب، دیرینہ رفقاء اور اپنی فطرت سب کچھ ہی بدل ڈالا تھا۔

"خدا حافظ۔" میں نے گلوگیر ہو کر کہا اور وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں چند لمحے دھواں دھواں سا ذہن لیے کمرے میں ٹہلتا رہا پھر قدموں کی چاپ سن کر بستر پر لیٹ گیا۔ آنے والی ایک سفید فام نرس تھی۔ اس نے میرا ٹمپریچر چیک کیا۔ چارٹ پر کچھ لکھا اور ایک کیپسول میری ہتھیلی پر رکھ کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ میری حالت اس شخص جیسی تھی جو کشتی، سمندر کی طوفانی لہروں کے سپرد کرنے کے بعد، جانے والے عزیزوں کے لیے ساحل پر کھڑا اپنا نشان ہو۔ میرے اور دوستوں کے درمیان وقت اور حالات کے پردے حائل تھے۔ میں کمرے میں بند تھا اور وہ کھلی فضا میں مصروف تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے۔

"سر آپ کے لیے کال ہے۔" ایک وارڈ بوائے نے جھانک کر بتایا۔ "استقبالیہ کاؤنٹر پر۔"

میں اس کے ساتھ ہولے ہولے چلتا استقبالیہ کاؤنٹر تک گیا۔ استقبالیہ کلرک نے مسکراہٹ کے ساتھ ریسیور مجھے تھما دیا۔ "یس! بول رہا ہوں۔" میں نے اپنا نام لیے بغیر کہا۔

"کون ہے؟"

"ہم تینوں ایک ساتھ ہیں۔ مس مارشا نے دس منٹ قبل ایک جنرل اسٹور میں ہمیں آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ شاپنگ کرتی پھر رہی ہے۔"

"وہ ایک نادان بچی ہے، انکل، اس کی بہن کو چاہیئے اس پر نظر رکھے۔ آپ آرام فرمائیں۔" میں نے کہا۔

"ہم ملاقات کے لیے آ رہے ہیں۔" لیاؤش نے کہا اور فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔

ٹھیک چار بجے لیاؤش اور گوتھم میرے کمرے میں داخل ہوئے، گوتھم ایک گلدستہ لایا تھا جب کہ لیاؤش کے ہاتھ میں پھل تھے۔

لیاؤش نے اخبار بچھا کر تپائی پر پھل رکھے اور گوتھم نے سائیڈ ٹیبل پر گلدستہ جما دیا۔ "یہ شخص بیچ میں کیسے آ گیا اور کون ہے؟" لیاؤش نے پوچھا۔

"اس کا ہمارے مطلوبہ شخص سے تعلق ہے۔" میں نے

بتایا۔ "ہمارے آدمی کو سزائے موت سنائی جا چکی ہے اور میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ سزا پر کب عمل درآمد ہو رہا ہے تاکہ کوئی کارروائی کی جائے۔"

"لیکن مارشا نے تمہارا پروگرام کیوں بدل دیا؟" لیاؤش نے پوچھا۔ "ہم نے اسے اس کے ساتھ باہر نکلتے دیکھ لیا تھا۔ پھر ہم ان کا تعاقب کرنے لگے۔ وہ اُسے سارے شہر میں گھماتا پھر رہا ہے۔ انھوں نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا، پھر ایک جگہ مارشا نے گوتھم کو دیکھ کر کار روکوائی اور جنرل اسٹور میں داخل ہونے سے قبل ہمیں اندر آنے کا اشارہ دیا۔ وہ چند لفافے اٹھائے ایک جگہ کھڑا تھا جب کہ مارشا کسی تتلی کی مانند اسٹور میں اُڑتی پھر رہی تھی۔ دراصل وہ ہمیں تعاقب ختم کرنے کی ہدایت دینا چاہتی تھی۔"

"انکل ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے۔ اتنے اہم اور خطرناک مجرم کے گرد حفاظتی انتظامات اتنے نرم کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ اعلیٰ حکام اُسے صرف ایک عام مریض کی طرح رکھنا چاہتی ہے۔" لیاؤش نے جواب دیا۔ "اگر انھیں انتظامات پر بھروسہ ہوتا تو اسے فوجی ایریا میں کیوں نہ رکھتے۔ وہ مجاہدین کو ڈاج دینے میں کامیاب رہے ہیں۔ اِدھر کسی کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ محافظ بھی بظاہر اسپتال کا ہی کوئی فرد ہوگا۔ اگر یہاں اسے سخت پہرے میں رکھا جاتا تو اُن کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جاتا۔"

"میرا اندازہ ہے۔" گوتھم بول پڑا۔ "سادہ لباس میں کچھ اور بھی لوگ یہاں ہوں گے۔"

"ہاں، ہو سکتے ہیں۔" لیاؤش نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس خطرے کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔"

"تم سگریٹ پینے کے بہانے باہر دروازے پر کھڑے ہو جاؤ۔" میں نے کہا تو گوتھم نے لیاؤش سے سگریٹ اور لائٹر لیا اور باہر چلا گیا۔ گوتھم نے سادہ لباس والوں کی بات کر کے مجھے محتاط کر دیا تھا۔ کوئی بھی ہماری باتیں سن سکتا تھا۔ "ہاں انکل، اب ہم آخری کارروائی کے بارے میں تفصیل طے کریں گے۔ میرے پاس ایک نرس رات گیارہ بجے آتی ہے، اس سے قبل ساڑھے دس بجے ڈاکٹر وارڈز میں راؤنڈ کرتا ہے۔ لہٰذا ٹھیک بارہ بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ طریقہ کار بالکل آسان اور سادہ ہوگا۔ میں ایک بوڑھے کے بھیس میں اس کے پاس جاؤں گا۔ مارشا کے مطابق وہ چاق و چوبند ہے۔ اگر وہ لاغر یا خوابیدہ قسم کا شخص ہوتا تو اس کو لے جانا مشکل اور خطرناک ہوتا۔ میں اُسے گیٹ سے نکال دُوں گا، باہر آپ گاڑی کے ساتھ ہوں گے، پھر آپ اسے سنبھال لیں گے۔"

"اُسے رکھا کہاں جائے گا؟ ظاہر ہے، وہ گھر اور اپنے لوگوں کے درمیان محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

"اس کے لیے محفوظ ترین جگہ، سرائے یا لیفہ کا گھر ہے یا پھر مضافات میں کوئی مکان لے لیں۔"

"یہاں چاروں طرف آباد ساحل ہیں۔ کوئی شکارگاہ کرایے پر مل جائے گی۔"

"یہ آپ کا مسئلہ ہے۔" میں نے کندھے اُچکا کر کہا۔ "میرا کام یہاں سے اُسے رہائی دلانا ہے۔"

"ہتھیار...؟"

"ہاں، شارک اسٹک، اسموکنگ بم اور ریوالور۔" میں نے کہا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب لیاؤش نے لباس کے نیچے سے تینوں چیزیں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ "میں بالکل تیار ہو کر نکلا تھا۔" اس نے بتایا۔ "کیونکہ تمہاری مہم گفتگو اور پریشانی نے مجھے بھی پریشان کر دیا تھا۔" اس نے بیڈ کا گدا اُٹھایا اور تینوں چیزیں اس کے نیچے چھپا دیں۔ "اور کوئی ہدایت؟"

"اس وقت برقی رَو کو بھی منقطع کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اوہ...." لیاؤش کے ہونٹ دائرے میں پھیل کر سکڑ گئے۔ "یہ کام واقعی اہم اور مشکل ہے۔ مجھے کسی الیکٹریشن کو خریدنا پڑے گا۔ یہ کام کوئی پیشہ ور شخص ہی کر سکتا ہے۔"

"وقت اور تاریخ آپ کو مارشا بتا دے گی۔"

معاً ائیرلیوں کی ٹک ٹک ہماری سماعت سے ٹکرائی۔ ہم نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ گوتھم نے کھولا تھا اور اندر صرف مارشا آئی تھی۔ نیم وا کواڑوں سے میں نے گوتھم کو جھگڑتے دیکھا وہ کسی سے ملتجی طلب ہو رہا تھا۔ "ایک لڑکی مسلسل میرا تعاقب کر رہی ہے۔" مارشا نے سراسیمگی سے بتایا۔

میں ہنس پڑا۔ دروازے کی چرچراہٹ پر مارشا نے چہرہ گھمایا اور ایک طویل سانس لے کر رہ گئی کیونکہ وہ لڑکی سراپا مسکراہٹ بنی اندر آئی تھی۔ "کبھی کبھی اجنبی ہم سفروں کی منزل ایک ہی ہوتی ہے۔" لیفہ اپنا ہاتھ مارشا کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ "تم نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کی اچھی کوشش کی تھی۔"

"مارشی!" میں نے مارشا کے چہرے کا رنگ پھیکا ہوتے دیکھ کر کہا۔ "یہ مس لیفہ ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہ"... مارشا نے یکدم اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "بھئی تم نے تو مجھے بہت ستایا ہے۔"

"تمہیں کیا ہُوا ہے خرّم؟" لئیقہ نے پوچھا۔ "تم جیسے لوگ اور ہاسپٹل؟"

"کیوں... کیا میں ذی روح نہیں ہُوں؟"

"اچھا تو تمھاری روح بیمار ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

"ہاں روح کا درد ہی اِدھر لے آیا ہے۔" میں نے ذو معانی جواب دیا تو لیاؤش بھی مُسکرانے لگا۔ مارشی! یہ سب اپنے ہیں، رپورٹ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ ہماری توقعات سے کہیں زیادہ احمق ثابت ہُوا ہے۔" مارشا بتانے لگی۔ "کسی معمول کی طرح میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ اس ہاسپٹل کا ڈاکٹر آن اسپیشل ڈیوٹی ہے۔ ہمارے مطلوبہ شخص کی ٹبی نگرانی کر رہا ہے۔" اس نے رُک کر باہر دیکھا۔ گوتھم ٹہل رہا تھا۔ "الحکرم کو ملٹری کورٹ نے سزائے موت سُنا دی ہے۔ توثیق کے لیے ہائی کمان کو فائل بھیجا گیا ہے جو تاحال زیرِ غور ہے۔"

"ڈاکٹر کی رہائش کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں خرّم۔" لیاؤش میرا مقصد سمجھ کر بولا۔ "براہِ راست ایکشن کرو۔ جتنے زیادہ لوگوں کو ملوث کرو گے، اتنا ہی نقصان ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ پروگرام آپ کو بتلا دیا گیا ہے۔ مارشا ساتھ جائے گی اور میری وِگ اور مصنوعی داڑھی لائے گی۔ آپ ٹھیک بارہ بجے اپنا کام کریں گے۔ آپ، مس لئیقہ پوری ذمّے داری اور آزادی سے بتائیں کہ الحکرم جیسے خطرناک بم کو اپنے گھر رکھنا پسند کریں گی؟"

"دل و جان سے۔" لئیقہ نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔ "اگر اس بم سے میری روح کا مسکن بھی تباہ ہو جائے تو مجھے کوئی پروا نہیں۔"

لیاؤش نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "مارشا تم لوگ لئیقہ کے ساتھ چلے جانا، مجھے کچھ ضروری کام کرنے ہیں، میں چابی گوتھم کو دے جاؤں گا۔ خرّم کا میک اَپ میرے تکیے کے نیچے ہے۔ او۔ کے خرّم، اعتماد اور یقین کے ساتھ قدم اُٹھانا۔"

"انکل گھڑی کی سوئیاں ملا لیجئے۔" میں نے اپنی کلائی گھڑی لیاؤش کے سامنے کر دی۔ اس نے اپنی کلائی سے آستین سرکائی اور دونوں گھڑیوں کو دیکھنے لگا۔

"تین منٹ سوئی آگے سرکا دو۔" اس نے کہا۔ "میری گھڑی کا نظام پیچیدہ ہے۔"

میں نے چابی باہر نکال کر گھڑی تین منٹ آگے کر دی اور لیاؤش رخصت ہو گیا۔ دفعتاً لئیقہ اُٹھنے لگی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔ میں کن انکھیوں سے مسلسل اس کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ناگواری کے سائے تیر رہے تھے۔ وہ لاتعلق سی دیواروں کو گھور رہی تھی۔ "اُدھر کے حالات کیسے ہیں مس لئیقہ؟" میں نے پوچھا۔ "میں کچھ ایسا اُلجھا رہا کہ آصف کی خیریت معلوم نہ کر سکا۔"

"میری معلومات ٹیلی فون پر علیک سلیک تک ہی محدود ہیں۔" اس نے متانت سے جواب دیا۔ "تم نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟ میں نے تمھاری ہدایت پر ملازمت بھی چھوڑ دی ہے۔"

"فی الحال کھاؤ پیو، گھومو پھرو۔ ملازمت کی بوریت دُور کرو۔ بہت جلد تمھیں مصروف کر دیا جائے گا۔"

"معاف کرنا خرّم۔" وہ ناخن کُریدتے ہُوئے بولی۔ "مجھے مسٹر لیاؤش پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"وضاحت کرو مس؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے سرد آواز میں کہا۔

"گروپ میں شامل ہونے سے قبل وہ اس شہر میں تھا اور مسلمانوں کے خلاف قائم ایک تنظیم کا سرگرم رُکن تھا۔ حسام الدین نے اُسے آفریدی اور پھر مادام کی خواہش پر اُدھر بھیجا گیا تھا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے مس لئیقہ۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "تیر، کمان سے نکل چکا ہے۔ دوسری بات جو میرے نزدیک اہمیت افزا ہے کہ انسان، عقائد اور سوچیں بدلنے والا ایک جانور ہے۔ آج کا بدمعاش کل کا راہب اور آج کا شریف کل کا بدمعاش بھی ہو سکتا ہے۔ میں جو آج ہُوں، اپنے مُلک میں نہیں تھا۔ ممکن ہے، لیاؤش نے بھی خود کو بدل لیا ہو، کسی شدید جھٹکے نے اس کے زہریلے دانت توڑ دیے ہوں۔ بہرکیف جو طے ہو چکا ہے، میں اس پر عمل کروں گا۔ جو ہوگا سامنے آ جائے گا۔"

"لیکن دوسری صورتِ حال کے لیے خود کو تیار تو رکھا جا سکتا ہے۔" مارشا نے کہا۔ "میں لئیقہ بہن کی ممنون ہُوں کہ ہمیں ایک نہیں بلکہ دو دروازے کھلے رکھنے ہوں گے۔"

"میرا دل مطمئن ہے لڑکیو۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"او۔ کے۔" لئیقہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں تو چاہتی ہوں کہ محتاط رہا جائے۔"

"شکریہ مس!" میں نے خوش دلی سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی مارشا اور گوتھم بھی چلے گئے تھے اور لئیقہ تو جاتے جاتے مجھے ایک انگارہ دے گئی تھی، جسے اس کی موجودگی میں، میں نے نگل لیا تھا لیکن اب مجھے بھی لیاؤش کے سلسلے میں تشویش ہونے لگی۔ میں نے ریوالور نکال کر چیک کیا۔ بارہ گولیاں موجود تھیں۔ پھر شارک اسٹک کا بٹن دبا کر چنگارتے ہُوئے شاک کو سہلایا۔ اسٹک کی کارکردگی بھی اطمینان بخش تھی۔ سب کچھ زبانِ حال سے لیاؤش کو شک و شبہے سے بری کر رہا تھا۔ اگر اس کی نیت میں فتور ہوتا تو یہ ہلاکت خیز ہتھیار ہرگز میرے حوالے نہ کرتا۔

شام سات بجے مارشا واپس آئی تو وہ نرس کی یونیفارم میں تھی۔ وہ اپنے پرس میں میک اَپ کا سامان چھپا لائی تھی۔ اس نے بتایا کہ لیاؤش ابھی واپس نہیں آیا اور نہ ہی اُس نے کوئی اطلاع دی ہے۔ میک اَپ کا سامان گدّے کے نیچے چھپا کر ہم دونوں ہاسپٹل کے تفریحی ہال میں چلے گئے کیونکہ مارشا نے اپنے دوست ڈاکٹر ریمنڈش کو وہیں ملنے کا وقت دے رکھا تھا۔ ہال میں فارغ ڈاکٹرز، نرسیں اور مریض اِن ڈور گیمز میں مصروف تھے۔ مارشا کا دوست تاش پھینک کر اُٹھا، مگر کباب میں مجھ جیسی ہڈی دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"تم خود بڑھو۔" میں نے مارشا کو ہدایت دی۔ "اور اسے اِدھر گھیر لاؤ۔"

مارشا مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی اور میں کیرم بورڈ کے گرد بچھی ہُوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ مارشا اسے لیے جب قریب آئی تو میں نے پُرتعجب انداز میں اپنا ہاتھ بڑھا دیا، جسے ڈاکٹر نے گرم جوشی سے تھام لیا۔ "میرے بہترین دوست ڈاکٹر ریمنڈش۔" مارشا نے فخریہ لہجے میں تعارف کرایا۔

رسمی کلمات کا تبادلہ ہُوا اور وہ دونوں مؤدب انداز میں میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر، مارشا کی وجہ سے بچھا جا رہا تھا۔ مارشا نے میرے بارے میں اُسے نہ جانے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ میرے سامنے طول کھینچ کر اُٹھا ہُوا تھا، جیسے سعادت مند بیٹا باپ کے سامنے بیٹھا ہو۔ "مجھے مارشا نے بتایا ہے کہ آپ دل کے مریض ہیں۔" ڈاکٹر نے ہمدردانہ آواز میں کہا۔ "میں نے آپ کی رپورٹ دیکھی ہے۔ انجیک خاصا سخت تھا، کیا پہلے بھی کبھی انجیک ہُوا ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر۔" میں نے نحیف لہجے میں جواب دیا۔

"تعجب ہے۔ پہلا حملہ اس قدر شدید۔" وہ گال کھجاتے ہُوئے بولا۔ "آج ایک اور کیس آیا ہے اُس کے معدے میں مچھلی کا کانٹا پھنس گیا ہے۔ پونے بارہ بجے اُس کا آپریشن ہوگا۔"

مارشا نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میرے ذہن کو بھی شدید جھٹکا لگا۔ "پونے بارہ کیوں ڈاکٹر؟" مارشا بولی۔ "ابھی کیوں نہیں؟"

"سرجن باہر سے آ رہا ہے، ملٹری ہاسپٹل سے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "ہمارا سرجن واشنگٹن کانفرنس میں شریک ہونے گیا ہے اور معاون سرجن فلو میں مبتلا ہے، آپ کے لیے کیا منگوایا جائے، جناب؟"

"اوہ شکریہ۔" میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ "میں کھانے سے قبل کچھ پسند نہیں کرتا۔"

"پھر مس مارشا کو چند منٹ کے لیے اجازت دیجیے۔" اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "ہم بار تک جائیں گے۔"

"اوہ ضرور۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "وقت جیسے اجازت دے، اُسے ضرور اپنا حصہ وصول کرنا چاہیے۔"

"شکریہ جناب!" ڈاکٹر نے مارشا کا ہاتھ تھام لیا اور مارشا کے چہرے پر ناگواری کی اَن گنت سلوٹیں اُبھر آئیں۔

جب وہ واپس آئے تو مریضوں کے لیے اپنے کمروں میں جانے کا اعلان ہو رہا تھا۔ مجھے ایک طرف سے مارشا نے اور دوسرا شانہ ڈاکٹر نے تھام کر اُٹھایا۔ پھر ڈاکٹر ہال کے دروازے تک ساتھ آیا اور پھر واپس چلا گیا۔

"پہلا محافظ بدل گیا ہے۔" مارشا نے سرگوشی کی۔ "اب دو محافظ کھڑے ہیں اور دونوں کے پاس اسلحہ ہے۔"

"کیا بار اوپر ہے؟"

"نہیں۔" مارشا بولی۔ "ڈاکٹر مجھے اپنے آفس میں لے گیا تھا۔ خدا کی قسم اگر مجھے اپنے مشن کا خیال نہ ہوتا تو اس کے دانت حلق میں لڑھکا دیتی۔"

"مجھے افسوس ہے مارشی، اگر میرے سامنے بھی عظیم مقصد نہ ہوتا تو ابھی اس کی گردن توڑ دیتا۔"

دروازہ کھولا تو مارشا کے حلق سے خوف آمیز آواز اُبھری اور میری آنکھیں بھی حیرت کی شدت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اندر باوردی پولیس آفیسر کے ساتھ لئیقہ سہمی ہوئی بیٹھی ہماری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانب پتھرائی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس غیر متوقع صورتحال نے میرا بدن پتھر کر دیا لیکن یہ کیفیت دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہی اور میں بیمار نرخرہ چوہدری سے یکدم چاق و چوبند اور درندہ بن گیا۔ فیصلے بے حد مشکل مگر ناگزیر تھا۔ مارشا دروازے میں کھڑی تھی اور میرے فیصلے اور عمل کے درمیان حائل تھی۔ پولیس آفیسر جوں ہی مسکراتا ہوا اُٹھا، مجھ سے وہ گناہ سرزد ہو گیا۔ میں نے اُچھل کر مارشا کو دولتی ماری۔ وہ ڈکراتی ہوئی کواڑوں کے خلا سے اندر جا گری اور میں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

"ٹھہرو، بات سنو، مسٹر خرم سلطان!" آفیسر کی دہاڑ سنائی دی مگر میں اپنے جسم میں یاؤش کی بے وفائی اور دھوکے کا زہر نہیں اُتارنا چاہتا تھا۔ پولیس آفیسر جس سیڑھی کو استعمال کر کے مجھ تک آیا تھا اس میں شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں بڑے دروازے کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا پاتھ وے پر دوڑ رہا تھا کہ آفیسر کی دہاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ عمتی کھڑکی سے کود رہا تھا۔ میرے بدن پر اسپتال کا لباس تھا اور پاؤں میں پرانے سلیپر جو دوڑنے میں حائل ہو رہے تھے۔ میں نے دائیں بائیں ٹانگیں اُچھالتے ہوئے سلیپر نکال دیے اور برہنہ پا دوڑنے لگا۔

"رُک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔" آفیسر نے چیخ کر کہا۔

"روکو اسے۔۔۔"

میں نے سامنے دیکھا تو پولیس جیپ سے تین آدمی کودتے نظر آئے۔ گیٹ کیپر بھی اپنے کیبن سے نکل کر گیٹ کی جانب دوڑنے لگا تھا۔ گیٹ بند ہو رہا تھا۔ میرے تعاقب میں موت تھی اور سامنے سے بھی موت کے ہرکارے چلے آ رہے تھے۔ میں نے رُک کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر دائیں جانب ذیبانشی جھاڑیاں پھلانگتا ہوا باغیچے میں داخل ہو گیا۔ اسی لمحے دھماکہ ہوا اور گولی سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔

"فائر۔" آفیسر نے گرج کر عام فائرنگ کا حکم دے دیا۔ وہ لوگ بھی پھولوں کو روندتے ہوئے باغیچے میں داخل ہو چکے تھے اور ہاسپٹل کی خاموش فضا فائرنگ سے مجروح ہونے لگی تھی۔

میرا ہمیشہ اس بات پر کامل اور مستحکم یقین رہا ہے کہ موت ایک ایسی ناقابلِ تردید حقیقت ہے جس کا وقت اور جگہ مقرر ہے، ایک سیکنڈ اِدھر نہ ایک سیکنڈ اُدھر اور جس جگہ کی مٹی ہوتی ہے، وہ میلوں دُور سے اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔ لہٰذا جب میرے چاروں طرف موت قہقہے لگا رہی تھی تو مجھے یہ خوف نہیں تھا کہ کوئی گولی مجھے چاٹ جائے گی۔ میں آخری سانس تک جدوجہد کرنے کا قائل تھا۔ میں آزاد انسان کی طرح جینا اور مرنا چاہتا تھا۔

اگر میں ہاتھ اُٹھا کر خود کو اُن کے حوالے کر دیتا تو وہاں کا قانون میرے ساتھ جو سلوک کرتا، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ اُن کے نزدیک میں ایک خطرناک قاتل تھا۔ مقتول، اُن کے اپنے تھے... مدعی گواہ قانون سب کچھ اُن کا تھا۔ میرا کون تھا، جو ہمدرد تھے، وہ بھی اپنی گردن اپنا تعلق بچانے کی فکر میں پس پردہ چلے جاتے... مجھے کون سہارا دیتا۔

آفیسر ایک درخت کی آڑ لیے چیخ چیخ کر اپنے ماتحتوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ تینوں ایک برسٹ مارنے کے بعد لائننگ پوزیشن میں چلے گئے تھے۔ میں بالکل نہتا تھا لیکن اپنے آفیسر کی فائرنگ سے غالباً وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مجرم مسلح ہے اور برسٹ نے آفیسر کو بھی اسی مغالطے میں مبتلا کر رکھا ہوگا۔ اگر انھیں میرے غیر مسلح ہونے کا یقین ہوتا تو وہ اب تک میرے گرد گھیرا تنگ کر چکے ہوتے لیکن وہ اپنی ہی چلائی ہوئی گولیوں سے خوف زدہ ہو کر محتاط ہو گئے تھے اور میں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا، ایک آدمی کمپاؤنڈ وال کے ساتھ ساتھ، سینڈک کی طرح پھدکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جبکہ دوسرا پیٹ کے بل لیٹا دائیں بائیں طرف دیکھ رہا تھا۔

میں اُس باڑ کے پیچھے دُبکا ہوا تھا جو شمالاً جنوباً، باتھ وے سے کمپاؤنڈ وال تک چلی گئی تھی۔ باڑ اس قدر گھنی تھی کہ میں شاخیں ہٹا کر بہ مشکل دوسری طرف دیکھ پا رہا تھا۔ مجھے صرف اس شخص سے خطرہ تھا جو تیزی سے باڑ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا باڑ عبور کر لیتا تو پھر میرے اور اُس کے درمیان کوئی آڑ حائل نہ رہتی، اور اگر میں اُس کی نگاہوں سے بچنے کی خاطر، جھاڑیوں سے رینگ کر لان میں نکل جاتا تو سامنے لیٹا ہوا شخص مجھے بہ آسانی بھون سکتا تھا۔

میں ایک دم زمین پر لیٹ گیا اور کسی تیز رفتار رینگ کی طرح سرسراتا ہوا تیزی سے کمپاؤنڈ وال کی طرف بڑھنے لگا۔ معاً اسی وقت پورا اسپتال تاریکی میں ڈوب گیا اور یہ اندھیرا میرے حق میں تھا۔ جب میں آخری سرے پر پہنچا تو میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں میں نے سانس روک کر چہرہ اوپر اُٹھایا اور دیکھا، باڑ

کی اوٹ میں بڑھنے والا شخص، کمپاؤنڈ وال کے ساتھ بیٹھا ہوا، اپنے عقب میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا جسم سمیٹا اور جھاڑی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

آفیسر اپنی مادری زبان میں دہاڑ رہا تھا لیکن اس کے ماتحت عقل کے ساتھ، جان کو عزیز رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پولیس کی گولی تو کسی قانون اور ضابطے کی پابند ہوتی ہے مگر مفرور قاتل، ہیضانی سے لے کر ٹھنوں تک کہیں بھی گولی مار دینے کے لیے آزاد ہوتا ہے... اندھیرے کی وجہ سے دو تو میری نگاہوں کی زد سے نکل گئے تھے، صرف ایک چند قدم دُور، تذبذب کی دلدل میں پھنسا بیٹھا، کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔

میں اس کے فیصلے کا منتظر تھا۔ میرا اگلا قدم، اُس کی نقل و حرکت پر منحصر تھا۔

بالآخر اپنے آفیسر کی ڈانٹ پھٹکار سے مجبور ہو کر، اُس نے اُٹھنے کا تکلیف دہ فیصلہ کر لیا۔ وہ اُٹھا اور جھکا جھکا آگے بڑھنے لگا۔ وہ بے حد چوکنا تھا۔ میں نے اپنی سانس بھی سینے میں روک لی۔ چند قدموں کا فاصلہ اُس نے نہایت سست رفتاری سے طے کیا اور پھر جونہی وہ میری جست کی زد میں آیا، میں نے چیتے کی مانند اُس پر چھلانگ لگا دی۔ میری ہتھیلی کا ہدف اُس کی گردن تھی۔ ضرب اُس کی ٹھوڑی سے رگڑ کھاتی نیچے لگی تھی۔ وہ چیخ جو حلق کی چڑھائی کا سفر طے کر رہی تھی، ضرب کھاتے ہی ایک کراہ بن کر اُس کے ہونٹوں سے اُبھری جو اتنی مدھم تھی کہ اگر اس کے کسی ساتھی نے سنی بھی ہوگی تو توجہ نہیں دی ہوگی۔ ہاں، میں نے اُس کی گردن ٹوٹنے کی آواز سُن کر، اُس کی بغل میں دبی ہوئی اسٹین گن کھینچ لی تھی۔ اسٹین گن ہاتھ میں آتے ہی میرا ساتھ چھوڑتا ہوا اعتماد بحال ہو گیا۔

اسپتال کی کمپاؤنڈ وال، پندرہ بیس فٹ بلند تھی۔ گیٹ کی جانب موت کے ہرکارے موجود تھے اور عقب میں اسپتال کی وسیع و عریض عمارت تھی۔ لہٰذا میں نے عمارت میں داخل ہو کر مخفی راستے سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے کھڑے قد کے ساتھ نہایت اطمینان سے لان عبور کیا۔ شاید اُنھوں نے مجھے دیکھ بھی لیا ہو لیکن اندھیرے کی وجہ سے وہ مجھے اپنا آدمی ہی سمجھے ہوں گے۔ وہ سوچ بھی نہ سکے ہوں گے کہ ایک مجرم شخص اتنی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

میں تیز تیز قدم اُٹھاتا بڑھتا گیا۔ اسپتال کی سہ منزلہ عمارت کے ساتھ، کاٹیج نما مکانوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ میں عمارت میں داخل ہونے کا ارادہ ملتوی کر کے، ایک روشن کاٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ اندر سے برتنوں کے کھنکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اُس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے کھڑکی کی طرف چہرہ گھما کر دیکھا، وہ اسپتال کا کچن تھا، دو آدمی اپرن باندھے، برتن دھو رہے تھے۔ میں، کاٹیج کے عقب میں پہنچ گیا۔ سامنے ہی ایک گیٹ نظر آ رہا تھا۔ خوشی کی ایک لہر میرے پورے وجود کو سرشار کر گئی۔

میں گیٹ سے نکل ہی رہا تھا کہ سارا علاقہ روشن ہو گیا... میں ٹھٹک گیا لیکن پھر سنبھل کر دوڑنے لگا... میری حالت اس گیدڑ جیسی تھی جسے شہر کی مصروف گلی میں، صبح کی روشنی نے گھیر لیا ہو۔ گیٹ اور نزدیک ترین کوارٹر کے درمیان ایک پلے گراؤنڈ تھا جس کے درمیان ایک چھوٹا مارکر کھڑا تھا۔ معاً میری سماعت سے دھمک ٹکرائی۔ میں اسے چھٹی حس کا الارم ہی کہوں گا۔ کیونکہ دوڑنے والے ابھی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، گیٹ تک میدان صاف تھا پھر بھی میرے کانوں میں دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی دھمک گونج رہی تھی۔

"اے... ہائے..." ایک گونجتی، چکراتی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ گیٹ سے چند قدم کے فاصلے تھے اور اُن میں سے کسی احمق نے مجھے دیکھتے ہی ہانک لگائی تھی۔ میں نے چھلانگ لگائی اور رولر کے پیچھے دُبک گیا۔ اسی وقت اسٹین گن کے برسٹ کی گولیاں میرے سر پہ سے گزر گئیں۔ اس سے قبل کہ دوسرا برسٹ مارا جاتا، میں تین چار چھلانگیں لگائیں اور ایک کھلے ہوئے کوارٹر کے صحن میں پہنچ گیا۔ صحن میں داخل ہوتے ہی میں درمیانی دیوار بھی پھاند گیا۔ دوسرے صحن میں ایک عورت کپڑے دھو رہی تھی، مجھے دیکھ کر خوف سے اُس کا منہ کھل گیا مگر اس سے قبل کہ وہ چیختی، میں دوسرے صحن کی دیوار عبور کر کے تیسرے کوارٹر کے صحن میں پہنچ گیا۔ اس کوارٹر کے صحن میں زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن کمرے کا دروازہ مقفل تھا۔ اِدھر دونوں کوارٹروں میں شور برپا تھا... وہ لوگ میرے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے اور عورتیں چیخ چیخ کر بول رہی تھیں۔

میں چوتھے کوارٹر میں چھلانگ لگانے کا ارادہ ملتوی کر کے کمرے کے بند دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کوارٹر باہر سے بھی مقفل ہے۔ وہ لوگ پہلے اور دوسرے کوارٹر کے مکینوں کے بیانات کی روشنی میں یہی فیصلہ کریں گے کہ مفرور دیواریں پھلانگتا ہوا آگے جا رہا ہے۔ وہ آخری کوارٹر کو گھیرنے کے لیے دوڑیں گے۔ گو کہ یہ ایک موہوم سا اندازہ تھا لیکن بھاگنے کے مقابلے میں دُبکے رہنے سے بچنے کے امکانات زیادہ تھے۔ اگر میں یونہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صحنوں کو عبور کرتا بھی جاتا تو آگے پتہ نہیں کس قسم کی صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا۔

میرے خدا سے نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ میں نے دور سے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ مجھے تلاش کرتے آ رہے تھے۔ جب قدموں کی آواز معدوم ہو گئی تو میں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ جب میں دور سے کوارٹر کے صحن میں بے آواز کودا تو وہ غوطہ دے رہے تھے۔ میں کھڑکی پولیس کی کارکردگی کا تجزیہ دیکھ رہی تھی۔

میں چونکہ بے ہوش پایا تھا اور احتیاط بھی مدنظر تھی، اس لیے وہ اس وقت میری موجودگی سے باخبر ہوئی جب میری ہتھیلی اس کے منہ پر جم چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی زخمی پرندے کی مانند چھپڑاتے ہوئے بھرپور مزاحمت کرے گی لیکن وہ تو میری گرفت کا احساس پاتے ہی بے جان ہو گئی تھی۔ میں نے بمشکل اسے سنبھالا اور پاؤں سے دروازہ بند کر کے ایک ہاتھ سے کنڈی لگا دی۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوئی تھی لیکن خوفزدہ صورت حال کے باعث سکتے کی کیفیت سے دوچار تھی۔ میری مزاحمت نے اسے چلنے پر مجبور کر دیا اور میں اسے گرفت میں لیے کمرے میں لے آیا۔ اور خدوخال سے وہ امریکن معلوم ہوتی تھی، لہٰذا میں نے انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔ "سنو، مغرور خاتون! بظاہر میں قاتل ہوں کیونکہ مقتول میرے دشمن تھے لیکن تم میری دشمن نہیں ہو، ہاں! اگر تم نے اپنی حماقت سے دشمنی مول لے لی تو میں بے دریغ تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔ اگر تم تعاون کرتی رہیں تو مجھے کسی معصوم بچے کی طرح بے ضرر پاؤ گی۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ جلدی فیصلہ کرو... ورنہ میں کوئی دوسری راہ نکالوں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے آزاد کر دیا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

"تم... میں تم سے تعاون کروں گی۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔ "بولو، کیا چاہتے ہو؟"

"صرف پناہ..."

"ٹھیک ہے۔" وہ بے جان سے انداز میں مسکرائی۔ "تم نے پولیس آفیسر کو بہت اچھا دھوکہ دیا ہے۔"

"ہاں..." میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "لیکن جب وہ مجھے نہیں پائیں گے تو ایک اور کوشش کریں گے۔"

"میں ترے ہوئے کی بھول' سے خود پر ہمارا کروں گی۔" وہ اپنے بکھرے ہوئے بال درست کرتی ہوئی بولی۔ "بہرحال تم بھروسہ کر سکتے ہو۔ ہاں، اگر تم کچھ کھانا چاہتے ہو..." اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ "اس بڑے کمرے میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں تم چھپ سکو۔"

"اوہ نہیں..." میں ہنس پڑا۔ "بڑا اچھا چھپنے کا مقام ہے... نہیں خاتون! تم ہر صورت انھیں باہر ہی باہر مطمئن کرنے کی کوشش کرو گی اور اگر پھر بھی انھوں نے اندر آنا چاہا تو تم مجھے دوسرے صحن میں اترنے کی مہلت دو گی۔"

"مغرور..." وہ پہلی بار کھل کر مسکرائی۔ "مگر شروع دن ہی اعتماد کھو رہے ہو۔"

"میں ہر وقت پراعتماد رہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

"میں تنہا ہوں اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میری ڈیوٹی نائٹ شفٹ میں نہیں ہے ورنہ مشکل ہو جاتی۔ میں مریضوں کو دوائیں دے کر سونے چلی جاؤں گی۔ اب میں کل دس بجے تک فارغ ہوں۔"

"فکر کرو۔ میں تمہیں زیادہ دیر پریشان نہیں رکھوں گا۔ خطرہ ٹلتے ہی نکل جاؤں گا۔"

"اس حالت میں کہاں جاؤ گے؟ خدا کرے، رات عافیت سے گزر جائے۔ صبح تمہارے لیے..." اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ غالباً اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ میرے جسم پر اس کے ہسپتال کا لباس ہے۔ "تم... تم نے یہ لباس کہاں سے حاصل کیا؟"

"میں مریض ہوں۔ وہ لوگ مجھے قتل کرنے آئے تھے۔"

"اوہ میرے خدا..." وہ جذباتی سی ہو گئی۔ "یہ تو بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ مریض تو ہمدردی کے قابل ہوتا ہے۔"

"ہاں، لیکن قاتل اخلاقیات کے طالب علم نہ تھے۔"

"پھر یہ میری پیشہ ورانہ ذمے داری ہے کہ میں ایک مریض کی حفاظت خود خدمت کروں۔"

"کیا تم نرس ہو؟"

"ہاں..." وہ مسکرائی۔ "لیکن میرا ابتدائی تعلق جرنیج سے ہے۔"

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ متوقع خطرہ سر پر آ گیا۔ دستک کی آواز میرے دل پر پتھر کی طرح گری تھی اور نرس بھی اچھل پڑی تھی۔

"چلو، میں تمہارے ساتھ دروازے تک چلوں گا۔" میں نے آستین گن پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں..." وہ تڑپ کر بولی۔ "کواڑوں کی جھریوں سے پورا صحن دکھائی دیتا ہے۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔"

"بہتر ہے۔" میں غرایا۔ "یاد رکھنا، تم میری آستین گن کی زد میں ہو گی اور اس میں موجود گولیاں سے میں کم از کم دس افراد کو بھون سکتا ہوں۔ جاؤ اور انھیں مطمئن کر کے ٹال دو۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے نکلی۔ میں نے کھلے کواڑوں سے باہر جھانکا۔ مجھے پورا احساس تھا کہ میں چوک ہو جانے پر بھی چوکنا ہوں اور اگر نرس نے غداروں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تو کوئی انسانیت کی خدمت کرنے والی اس لڑکی کو سزا دینا میرے لیے ایک مشکل مرحلہ ہو گا۔

"کون ہے؟" اس نے صحن عبور کرتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھا۔

"پولیس آفیسر، سسٹر!" دوسری طرف سے نرم لہجے میں جواب دیا گیا۔ "مفرور کوارٹروں سے باہر نہیں گیا ہے۔ براہِ کرم، کھڑکیاں دروازے بند کر لیں۔ ہم ایک طرف سے تلاش شروع کر رہے ہیں... وہ کسی کو یرغمال بنا کر ہمارے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔"

"شکریہ آفیسر!" نرس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "کوارٹر نمبر بارہ کی عقبی دیوار ٹوٹی ہوئی ہے۔ وہاں کوئی نہیں رہتا۔ آپ کو ادھر دھیان دینا چاہیے تھا۔ وہ یقیناً اسی کوارٹر سے نکل گیا ہو گا۔"

"اوہ... سن لیا تم نے احمقو!" آفیسر اپنے ماتحتوں پر برس پڑا۔ "وہ نکل چکا ہے۔"

وہ نرس میرے لیے نجات دہندہ بن گئی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ معاملہ اتنی آسانی سے نمٹ جائے گا۔ نرس کی ذہانت نے کھیل کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ اگر واقعی کوئی ٹوٹی ہوئی دیوار موجود تھی تو وہ لوگ اپنے زخم چاٹتے ہوئے لوٹ جائیں گے۔

نرس دو چار منٹ تک اُن کے دور چلے جانے کا انتظار کرتی رہی پھر دروازہ بند کر کے مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔ "اب ہم اچھے دوستوں کی طرح، وقت کے بارے میں باتیں کریں گے لیکن پہلے کھانے پینے کی بات کرو۔ سب کچھ موجود ہے، آؤ کچن میں چلیں۔"

مجھے مغرب کی چند خوبیوں میں سے کھانے پینے کا انداز بھی پسند ہے۔ ہماری طرح اُن کے ہاں بے جا تکلف نہیں ہوتا۔ ہر شے ریڈی میڈ ہوتی ہے۔ فریج سے نکالی، گرم کی اور کھالی۔ مجھے چوکی پر بٹھا کر، اُس نے چند منٹوں میں کھانا تیار کر لیا... اور میں تمام تکلف بالائے طاق رکھ کر کھانے پر پل پڑا۔

"کیا تم واقعی بیمار ہو؟" وہ مجھے کھاتے دیکھ کر بولی۔ "مجھے تو تم بیمار نہیں لگتے۔"

"نہیں..." میں نے پانی پی کر ہونٹ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم نے میری جان بچائی ہے، اس لیے میں تمہارا ممنون ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے دشمنوں سے چھپتا پھر رہا ہوں۔"

"دشمنی کی وجہ...؟" اس نے فریج کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا پھر بولی۔ "کافی یا کوئی اور مشروب؟ کون سا برانڈ پیتے ہو؟"

"شکریہ سسٹر..."

"رینا..." اس نے اپنا نام بتایا۔ "رینا ڈوبس... پلیز، تم مجھے صرف رینا کہہ سکتے ہو۔"

"رینا، میں شراب نہیں پیتا۔ البتہ کافی مل جائے تو پی لوں گا۔"

"اوہ... شاید تم..."

"ہاں، مس رینا!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "... میں مسلمان ہوں۔"

"مقامی تو نہیں ہو۔"

"نہیں... میرا تعلق پاکستان سے ہے۔"

"اوہ..." وہ ایک طویل سانس لے کر پلٹی پھر چند لمحوں بعد بولی۔ "ہاں، تو میں پوچھ رہی تھی کہ دشمنی کی بنیاد کیا ہے... عورت یا دولت...؟"

"دولت... وہ مجھے دولت پیدا کرنے والی مشین بنانا چاہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں قانون کا سہارا لینا چاہیے تھا۔"

"ہاں... لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ میرے اور قانون کے درمیان آگ اور خون کی وسیع جھیل حائل ہو گئی ہے۔"

"کب تک یوں بلوں میں چھپتے پھرو گے؟ تمہیں ایک مستقل ٹھکانا چاہیے، مسٹر..."

"خرم سلطان..." میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اپنا نام بتا دیا۔

"میں تمہیں ایک مستقل اور محفوظ ٹھکانہ فراہم کر سکتی ہوں..." رینا نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

ہم کچن سے نکل کر کمرے میں آ گئے۔ میں صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "میں آپ کی اس خوبصورت پیش کش کو ضرور قبول کروں گا، مس رینا! لیکن ابھی نہیں... پہلے میں اپنی راہ کے کانٹے چننا چاہتا ہوں... کچھ حساب بے باق کرنا ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو، خرم سلطان! وضاحت کرو۔"

"ابھی خطرہ اسپتال کے اندر موجود ہے۔ پہلے ایلینن... پھر دوسری بات ہو گی۔ تم ایسا کرو کہ دروازہ باہر سے مقفل کر کے چلی جاؤ اور اپنے طور پر معلومات حاصل کر کہ پولیس کہیں اور کیسے آئی تھی... اور اب کہاں ہے؟" میں اُسے ٹالنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے اس کی آنکھوں اور لہجے میں چھپا ہوا پیغام پڑھ لیا تھا۔

"اچھی تجویز ہے۔" وہ فوراً رضامند ہو گئی۔

"جب میں فرار ہوا تھا تو میرے کمرے میں دو لڑکیاں بھی تھیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر میری جانب مڑی۔

"ایک میری نرس تھی اور دوسری اس کی دوست۔"

"ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گی۔" اس نے ایک طویل سانس لی... پھر پرس میں سے چابی نکال کر دروازے کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑھتی ہوئی بولی۔ "مجھے دیر بھی ہو سکتی ہے، گھبرانا نہیں۔"

اُس کے جانے کے بعد میں نے صوفے ہی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ واپس آئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں بعد وہ کمرے میں تھی۔ میں نے استفہامیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس نے میری طرف متوجہ ہوئے بغیر اپنا اسکارف کھول کر بیڈ پر پھینکا اور سیدھی بک شیلف کی طرف گئی۔ وہاں سے اُس نے بادامی رنگ کی جلد والی ایک ڈائری نکالی اور مسہری پر بیٹھ کر اُس کے صفحے اُلٹتے ہوئے بولی۔

"پولیس کو شک ہے کہ مجرم اسپتال سے نہیں نکلا۔ فی الحال وہ واپس چلے گئے ہیں لیکن کہا جا رہا ہے کہ بھاری جمعیت کے ساتھ سرچ وارنٹ لے کر پھر آئیں گے۔ میڈن نے رہائشی گھروں اور وارڈز کی تلاشی دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس وقفے سے فائدہ اُٹھا کر نکل جاؤ۔"

"میرا خیال ہے آفیسر خود تو چلا گیا ہوگا مگر اپنے آدمیوں کو نگرانی کے لیے چھوڑ گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"میں اپنی کزن بلڈا کو فون کر کے بلا رہی ہوں، اگر اُس کا نمبر مل گیا تو... کیونکہ اُس نے چند روز قبل ہی نیا فلیٹ لیا ہے۔" وہ تھوڑی دیر تک ڈائری کی ورق گردانی کرتی رہی پھر بولی۔ "ہوں میں اُس کا نمبر کہیں لکھ چکی ہوں۔"

"چھوڑو، رینا!" میں نے ڈاپروائی سے کہا۔ "مجھے بتاؤ، اور کیا معلوم کر آئی ہو؟"

"متعدد افواہیں گردش کر رہی ہیں۔" رینا، ڈائری بک شیلف کی طرف اُچھالتی ہوئی بولی۔ "کوئی کہتا ہے کہ مجرم پناہ لینے اسپتال میں گھس آیا تھا اور تعاقب میں پولیس بھی اندر آ گئی تھی... میں نے استقبالیہ کلرک سے سُنا ہے کہ پولیس کو کسی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ مجرم اسپتال کے ریکریشن ہال میں ہے... ہاں، وہ دونوں لڑکیاں بھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگیں۔"

"اوہ... یہ اطلاع اچھی ہے۔" میں خوش ہو گیا۔ یہ لیفٹیہ کا اپنا شہر تھا، اس لیے میں اُس کے بارے میں پریشان نہیں تھا۔ مجھے تو صرف مارشا کی فکر ستا رہی تھی۔ اگر وہ گرفتار ہو جاتی تو گوتھم شہر کے سارے تھانوں کو آگ لگا دیتا۔ اپنی محبوبہ کی خاطر وہ کوئی بھی حماقت کر گزرتا... اور میں اتنے پیارے بہن بھائی سے محروم ہو جاتا۔

"ہم فرض کر لیتے ہیں، وہ واپس نہیں آئیں گے۔" رینا اُٹھتے ہوئے بولی۔ "اگر آ گئے تو میں تمہاری ڈھال بن جاؤں گی۔ میں بکس خالی کر دیتی ہوں۔ تم دو چار منٹ کے لیے اس میں چھپ جانا۔ ویسے وہ لوگ اتنی گہرائی میں نہیں جائیں گے۔ سارے دسوں سے نکال دو۔"

اچانک اُس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اُس کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے دروازے کی جانب چہرہ گھما کر دیکھا۔ میں چونکہ اوٹ میں تھا، اس لیے میں دروازے سے جھانکتی ہوئی بلوالور کی سیاہ نال ہی دیکھ سکا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، میرا دشمن تھا اور رینا نادانستگی میں اُسے اپنے ساتھ لگائے لیے چلی آئی تھی۔

فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ چوہے دان میں بند چوہا اگر شیر بننا چاہے تو یہ اُس کی حماقت ہی ہوگی۔ میں خالی ہاتھ تھا، اسٹین گن دروازے کے سامنے، ٹہائی پر رکھی، میری بے بسی پر خندہ زن تھی اور ایک بلوالور بردار شخص میرے سینے میں سوراخ کرنے پر قادر تھا۔

میں نے جھانک کر دیکھا اور سارا تناؤ ایسے ٹوٹ گیا، جیسے غبارے میں سے ہوا نکل گئی ہو۔ "اوہ، خدایا! شکر ہے۔" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ "انکل! یہ لڑکی ہماری ہمدرد اور میری محسنہ ہے۔" میں نے بڑھ کر رینا کو سہارا دیا۔ "مس رینا! ڈرنے کی بات نہیں، یہ میرے انکل لیاؤش ہیں۔"

"سوری، مسٹر خرم سلطان!" لیاؤش اندر آتے ہوئے سرد لہجے میں غرّایا۔ "مذہب کے رشتے نے ہمارا تعلق منقطع کر دیا ہے۔ اب میں صرف خداوند یسوع کا غلام لیاؤش جارش ہوں۔"

"اوہ... نہیں انکل!" میں نے تڑپ کر کہا۔ "مذہب کے علاوہ بھی ہمارے درمیان ایک رشتہ ہے، احترامِ انسانیت۔"

"ہاں تھا... لیکن اس وقت جب میں بھٹکا ہوا تھا۔" وہ اسی کاٹ دار برفیلی آواز میں بولا۔ "میں جب فادر ایلم سے ملنے گیا تو صرف لیاؤش تھا، مادام سعدیہ کا غلام اور تمہارا دوست... تب خداوند یسوع نے مجھے گلے میں شامل کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ میں نے سُنا، فادر ایلم وعظ کر رہے تھے، تم سب خداوند یسوع کی بکریاں ہو اور وہ تمہارا نگہبان ہے۔ جب تک ایک ریوڑ کی شکل میں متحد رہو گے، آفات کے بھیڑیے، تم سے دُور رہیں گے اور جو گلے سے الگ ہو گیا، اُس نے اپنے لیے عذاب مول لے لیا۔" لیاؤش کا سرد لہجہ بھرائی ہوئی آواز میں بدل گیا۔

"میں فادر ایلم کی باتوں کی سچائی کی تائید کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم جس مشن کے لیے کام کر رہے ہیں، وہ شیطانی مشن نہیں ہے۔ ہم انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کر رہے ہیں۔"

"میں اپنے گناہوں کا اعتراف کر آیا ہوں اور مجھے کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے... اور وہ تم ہو، مسٹر خرم سلطان... ایک کٹر اور متعصب مسلمان، عیسائیت کے دشمن۔ میں کس قدر اندھا تھا کہ اپنی قوم اور مذہب کے خلاف تمہارے ہاتھ مضبوط کرتا رہا۔ تم اس شخص کو زندگی دینا چاہتے ہو جو میری قوم کی ہڈیوں پر مسلمان ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔"

"اوہ..." میں نے ہونٹ سکیڑ کر اُسے دیکھا۔ "تو اب تم کیا چاہتے ہو، لیاؤش؟"

"میں اپنے سابقہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے سب سے پہلے خود کو قتل کیا ہے، پھر اپنی معصوم بچیوں کا مستقبل داؤ پر لگایا ہے اور اب تمہیں قتل کروں گا۔ میں نے پہلا موقع پولیس کو دیا تھا لیکن تم ہمیشہ کی طرح بچ نکلے۔ اگر یہ لڑکی مشکوک انداز میں معلومات حاصل نہ کرتی تو میں بھی پولیس کی طرح لوٹ جاتا۔"

"کوئی شرط... کوئی سمجھوتہ، مسٹر لیاؤش؟" میں نے تنکے کا سہارا لیا کیونکہ ریوالور کا رُخ میری جانب ہو گیا تھا۔

"نہیں، مکار روما! وہ غرّایا۔ "صرف موت..."

"اوہ... پپ... پولیس..." رینا نے دروازے کی طرف دیکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

لیاؤش نے برق رفتاری سے گردن گھمائی۔ یہ ذرا سی مہلت میرے لیے کافی تھی۔ میں اُڑتا ہوا اُس سے جا ٹکرایا۔ میرا دایاں مکّا، اُس کے جبڑے پر پڑا اور بائیں ہاتھ سے ریوالور اُچکتا ہوا آگے نکل گیا۔ لیاؤش لڑکھڑا کر دروازے سے جا ٹکرایا۔ میری پیشانی بھی دیوار سے ٹکرائی تھی۔ ضرب خاصی شدید تھی ورنہ میں، لیاؤش کو سنبھلنے کا موقع نہ دیتا۔ میں سر جھٹکتا ہوا پلٹ ہی رہا تھا کہ لیاؤش کا آہنی شکنجہ مجھے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ میری پسلیاں کڑکڑانے لگیں اور سانس سینے میں رُکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

اگر وہ سامنے ہوتا تو شاید میں مُکّے آزماتا یا کوئی دوسرا داؤ لگاتا مگر وہ میری پُشت پر کسی جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ میں نے بہ دقت تمام دونوں ہاتھ موڑ کر بیک وقت اُس کے پیٹ میں مارے۔ ایک لمحے کے لیے اُس کی گرفت کمزور ہوئی اور میں مچھلی کی مانند تڑپ کر اُس کی گرفت سے پھسل گیا لیکن میں گھوم کر اُس کے مقابل نہ آ سکا۔

اس سے قبل کہ میں چھلانگ لگا کر اپنے اور اُس کے درمیان فاصلہ بڑھاتا، اُس کا بھرپور ہاتھ میرے دائیں کان پر پڑا۔ درد سے میرے مُنہ سے آہ نکل گئی... پھر بھی میں نے خود کو غیر متوازن نہیں ہونے دیا۔ میں نے دیوار کا سہارا لے لیا تھا۔ میرے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ مجھے رُخ بدلنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ دُوبدو ہوتا تو یقیناً اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا۔

خانچہ تو کان پر لگا تھا لیکن ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے پاؤں کے قریب گر گیا تھا۔ میں دیوار پر ہاتھ ٹکائے جھکا ہوا تھا تب میری نگاہ لیاؤش کے ہاتھ پر پڑی۔ وہ میری ٹانگوں کے درمیان سے ہاتھ گزار کر ریوالور تک لے جا رہا تھا۔ میں نے ہاتھوں پر زور ڈال کر اُلٹی دولتی جھاڑی۔ میرے اندازے کے مطابق اس چہرہ، میری دولتی کی زد میں ہونا چاہیے تھا مگر میرے پاؤں ہوا میں اچھل کر خالی واپس آ رہے تھے کہ اُس نے میرے پیر پکڑ کر بھرپور جھٹکا دیا اور میں مُنہ کے بل گرتا چلا گیا۔ گرتے گرتے مجھے ریوالور نظر آ گیا۔ اسے گرفت میں لینے کے لیے میرا ہاتھ ذرا ترچھا پڑا اور وہ فرش پر پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔

گرتے ہی میں نے کہنیوں اور گھٹنوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کی اور ابھی چند انچ ہی اُوپر اُٹھا تھا کہ میری کھوپڑی کے عقبی حصّے میں کئی سُورج طلوع ہو کر غروب ہو گئے۔ لیاؤش نے اپنے جُوتے کی ایڑی بجائی تھی۔ ضرب کاری تھی لہٰذا میرا ذہن تاریکی میں ڈُوبتا چلا گیا۔

... اور پھر جب تاریکی کے سمندر سے روشنی کے ساحل پر پہنچا تو میرے ہونٹوں پر خون جما ہوا تھا اور فرش پر جس جگہ میرا چہرہ ٹکا ہوا تھا، وہاں خون کا ایک بڑا سا دھبہ موجود تھا۔ میں نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ میرے قریب ہی وہ دونوں آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے اور اُن کے درمیان خون کی ایک چوڑی لکیر کھنچی ہوئی تھی۔

میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چند لمحوں تک اُنھیں دیکھتا رہا...

لیاؤش کے سینے سے خون رس رہا تھا اور اُس کے دونوں ہاتھ رینا ڈورس کی گردن پر تھے۔ اُس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں نے بڑی مشکل سے اُس کے ہاتھ رینا کی گردن سے ہٹائے۔ رینا کی زبان کھنچے دبانے سے تھوڑی سی باہر نکل آئی تھی اور آنکھیں اُبل کر حلقوں سے جھانک رہی تھیں۔

میں نے باری باری دونوں کی نبضیں ٹٹولیں۔ دونوں مر چکے تھے۔ ریوالور رینا کے دائیں بازو کے قریب پڑا ہوا تھا۔ رینا نے لیاؤش کو گولی ماری تھی اور لیاؤش جیسے باحوصلہ اور تنومند شخص نے گولی نکل کر رینا کی گردن دبوچ لی تھی۔

ایک میرا دشمن تھا اور دوسری میری محسنہ تھی جس نے دوسری بار مجھے بچایا تھا اور اپنی زندگی مجھ جیسے بُرے شخص پر قربان کر دی تھی۔ وہ تمام نیکیوں پر سبقت لے گئی تھی۔ میری خاطر کون جہان سے گئی تھی۔ کس نے دل داری کا یہ انداز اپنایا تھا۔ دُکھ کا ایک گولہ سا میرے حلق میں پھنس گیا اور خشک آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ مجھے اس جاں نثار لڑکی کی لاش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر دو ڑیں مار مار کر رونا چاہیئے تھا لیکن آنسو نہ جانے کہاں رہ گئے تھے۔ میں نے بیڈ کور سے رینا کا چہرہ صاف کیا اور پھر وہی خون آلود چادر اس پر ڈال دی۔ اس کے علاوہ، میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی، پونے گیارہ کا وقت تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کم و بیش ایک گھنٹہ بے ہوش پڑا رہا تھا۔ اب وہاں ٹھہرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہ تھا اور میں جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ بقول رینا، پولیس کمک کے ساتھ کسی وقت بھی آسکتی تھی۔ اگر ایسی حالت میں، میں اُن کے ہتھے چڑھ جاتا تو دو قتل اور میرے چہرے پر تھوپ دیئے جاتے۔ مجھے جنونی قاتل ثابت کرنے کے لیے پولیس کو ایک معقول جواز مل جاتا۔

خطرہ کمرے میں بھی تھا اور باہر بھی میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ ہر طرف سے خطرے کا عفریت منہ کھولے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ ترپں بزدل بھیڑ کی طرح نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اگر موت کا وقت آ ہی چکا تھا تو میری دلی خواہش تھی کہ موت کسی بامقصد جدوجہد کی راہ میں میرے سامنے آئے۔

میرے سامنے اور قریب تر مقصد، المکرم کی رہائی کا پروگرام تھا۔ ایسی صورت میں جبکہ میری سلامتی خطرے میں تھی، تو میں یہ کوشش کرنا چاہتا تھا۔ کوئی لائحہ عمل ترتیب دینے سے پہلے میں اپنا حلیہ درست کرنا چاہتا۔ رینا ڈورس کے باتھ روم میں جا کر میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ پیشانی پر ایک نیلا گومڑا ابھر آیا تھا اور اوندھا گرنے کی وجہ سے سر کے زخم سے بہنے والا خون چہرے پر جم گیا تھا۔ میری شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا احساس، ریک پر پڑی ہوئی سیفٹی اور ریزر نے دیا تھا۔ برش اور کریم بھی موجود تھی۔ میرے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ ایک تنہا زندگی گزارنے والی نرس کے باتھ روم میں مردانہ ضروریات کا سامان کہاں سے آیا؟

میں نے اپنی داڑھی مونچھیں بالکل صاف کر دیں... پھر آئینے میں اپنا صاف و شفاف چہرہ دیکھتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے رینا کی یونیفارم میں خود کو چھپا لینا چاہیئے۔ بلاشبہ یہ ایک مضحکہ خیز خیال تھا لیکن وقت اور حالات کے تحت میری ضرورت کے عین مطابق تھا۔

یونیفارم تو کھینچ تان کر میں نے اپنے جسم پر چڑھا لی تھی لیکن مسئلہ جوتوں کا تھا۔ رینا کے بلیک شوز میں بمشکل میرا پنجہ سما رہا تھا۔ معاً میری نگاہ، لیاؤش کے جوتوں پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے، اس کے بلیک شوز میرے پیروں میں تھے۔ سفید لمبال، سوئیوں سے بنا بنایا موجود تھا۔ زیرو پاور کا چشمہ لگا کر، میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میں ایک طویل قامت نرس کا روپ دھار چکا تھا۔

جب میں بغلی دروازے سے اسپتال کی عمارت میں داخل ہوا تو بارہ بجنے میں چھ منٹ باقی تھے۔ عمارت گہری خاموشی اور نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے فوری طور پر نہیں پہچانا جا سکتا تھا۔ البتہ میں رینا کی کسی ایسی واقف کار نرس سے خوف زدہ تھا جو اچانک سامنے آجاتی لیکن اپنے کمرے تک پہنچنے کے دوران میں کسی سے آمنا سامنا نہیں ہوا۔

دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے گتے کو اُلٹ کر پرزے نکال لی جو مارشا لائی تھی۔ میک اپ کا سامان یونیفارم کی جیبوں میں ٹھونس لیا اور شارک اسٹک اُٹھا کر خاموشی سے باہر آگیا...

میں آخری مرحلے کے لیے خود کو تیار کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ مرحلہ پُل صراط سے گزرنے کے مترادف تھا۔ معمولی سی لغزش مجھے جہنم میں دھکیل سکتی تھی۔ آخری سیڑھی پر رُک کر میں نے چند گہری گہری سانسیں لیں اور پھر اللہ کا نام لے کر فرش پر قدم رکھ دیا...

دُور دروازے کے سامنے دو محافظ بیٹھے باتیں کر رہے۔ میرے قدموں کی چاپ سُن کر دونوں میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے اُٹھتے ہوئے قدموں کا تواتر برقرار رکھا ہوا تھا۔

فاصلہ قدم قدم گھٹ رہا تھا اور میرے سینے کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میرے قریب پہنچنے پر اُن میں سے ایک نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے مسکراتے ہوئے، ہاتھ سے اُسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھا ہی تھا کہ میں نے گزرتے گزرتے شارک کی نوک، اُس کے کندھے پر رکھ کر بٹن دبا دیا اور پھر اس کے ردِعمل کا انتظار کیے بغیر، دوسرے محافظ کے کندھے پر بھی یہی عمل دُہرایا۔ دونوں، کرسیوں سے اُچھلے اور کوئی آواز نکالے بغیر یکے بعد دیگرے میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئے۔

میں اُن کے اُوپر سے چھلانگ لگا کر، دروازے تک پہنچا اور ہینڈل گھمایا، دروازہ مقفل تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر، شارک کی نوک، کی ہول پر رکھ کر بٹن دبا دیا۔ ہلکا سا دھماکا ہوا اور دروازہ کھل گیا... پھر میں نے اُن دونوں کو گھسیٹ کر کمرے میں لانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

دھماکے نے المکرم کو بیدار کر دیا اور وہ شیر نما انسان غراتا ہوا بیڈ سے اُتر آیا۔

"کوئی آواز نہیں، انکل!" میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں، آپ کا ایک عقیدت مند ہوں اور یہیں فی الحال یہاں

سے نکلنا ہے۔"

"تم... تم..." وہ تذبذب سے بولا۔ "اپنا نام یا کوئی حوالہ بتاؤ۔"

"مادام سعدیہ اور حسام الدین" میں نے ایک محافظ کے جسم سے وردی اُتارتے ہوئے کہا۔ "یہ وقت وضاحت کا نہیں ہے... انکل! میں آگ اور خون کے کئی دریا عبور کر کے یہاں پہنچا ہوں۔"

چند لمحوں بعد میں محافظ کی وردی زیب تن کر چکا تھا۔ دروازے کا قفل ناکارہ ہو چکا تھا اور میں شارک اسٹک کے شعلے کی کارکردگی سے لاعلم تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس سے متاثر ہونے والا شخص کتنی دیر بے ہوش رہتا ہے۔ اگر وہ دونوں جلدی ہوش میں آجاتے تو ہمارے لیے خطرہ کھڑا کر سکتے۔

المکرم بھی اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے رینا کا نڈھال پھاڑ کر، محافظوں کے ہاتھ پیر باندھ دیئے اور باقی بچا ہوا کپڑا، اُن کے مُنہ میں ٹھونس دیا۔

"انکل! آپ اس کی جیبوں کی تلاشی لیجئے اور جو کچھ ملے، نکال لیجئے۔" میں نے ایک محافظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے لباس کی جیبوں کو کھنگال ڈالا۔ کرنسی نوٹ، ریزگاری، سیکوریٹی پاس، گاڑی کا لائسنس اور چابیاں تھیں۔ سیکوریٹی پاس کی تحریر میرے لیے اجنبی تھی۔ میں نے پاس، المکرم کے سامنے کر دیا۔ "اس کا نام تو بتایئے۔"

"اوہ..." المکرم، پاس پر جھک آیا۔ "ایش فیلے..."

"چلیے..." میں نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ قدرت ہم پر مہربان تھی۔ ہم دبے پاؤں باہر نکلے اور سیڑھیاں اُتر کر صدر دروازے سے باہر آگئے۔ باتھ روے کے اختتام پر دائیں جانب پارکنگ شیڈ تھا۔

"ایش فیلے کی وہ سُرخ گاڑی ہے۔" المکرم نے سرگوشیانہ انداز میں بتایا۔ میں دُھپر بڑھتا چلا گیا۔ وہ چھوٹی سی پرانی کار تھی لیکن انجن بہت اچھی حالت میں تھا۔ اگنیشن میں چابی گھماتے ہی سکاری نے کر بیدار ہو گیا۔ المکرم کے لیے میں نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"براہِ کرم، آپ نشستوں کے درمیان لیٹ جائیں۔" میں نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔

ابھی کئی رکاوٹیں تھیں، سب سے پہلی رکاوٹ تو میں گیٹ ہی تھا۔ انجن کی آواز سُن کر دربان اپنے کیبن سے نکل آیا اور مستعد انداز میں کھڑا، ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کار کی رفتار بے حد کم رکھی ہوئی تھی۔ میں اپنے کسی فعل سے اُسے شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کار رینگتی ہوئی، اُس کے قریب رُک گئی اور میں نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنا پاس اُس کی طرف بڑھا دیا...

اُس نے کارڈ پر ایک نگاہ ڈالی اور کچھ کہتے ہوئے کارڈ واپس کر دیا۔

اُس نے کیا پوچھا تھا، یہ تو میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا... میں نے پہلے ہتیلی نکالی اور پھر اشارات میں سر ہلانے لگا۔ اُس نے درشت لہجے میں پھر کچھ کہا اور میں ڈیش بورڈ پر جھک گیا۔ میں اُس کے سوالوں کے جواب نہیں دے پا رہا تھا اور المکرم پر زبان بندی کا پہرہ تھا۔ ایسی صورت میں انتہائی اقدام ناگزیر تھا۔

میں نے ایک دم دروازہ کھولا اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اُس سے جا ٹکرایا۔ میرے دونوں گھٹنے اُس کے پیٹ پر پڑے اور وہ تڑ کھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا پھر میری کھڑی ہتھیلی، اُس کی گردن پر پڑی۔ اس سے قبل کہ وہ گرتا، میں نے اُسے ہاتھوں پر سنبھال کر کیبن کی طرف دوڑ لگا دی... اور واپسی پر ایک رجسٹر پر پڑی ہوئی، گیٹ کی چابی اُٹھاتا لایا۔ گیٹ کھولتے ہوئے میں نے عمارت کی طرف دیکھا۔ وہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"اب تم آرام کرو، پیارے لڑکے!" میں واپس آیا تو المکرم ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا۔ "اگر تم زبان نہیں جانتے تو یقیناً راستوں سے بھی ناواقف ہو گے۔"

"ہاں، انکل!" میں نے پچھلی سیٹ پر گرتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ گیٹ سے نکل کر کہاں جانا چاہیئے؟"

"فکر مت کرو۔ اب اسٹیئرنگ میرے ہاتھ میں ہے۔"

"کیا آپ اپنے گھر جائیں گے، انکل؟"

"نہیں، میرا کوئی مخصوص گھر نہیں ہے۔ یہ سارا جزیرہ میرا گھر ہے، جس پر یہ ظالم مسلط ہیں۔"

"کیا آپ کو علم ہے، انکل؟" میں نے اگلی نشست گاہ کی پشت پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے پوچھا۔ "اُنھوں نے آپ کے لیے سزائے موت تجویز کر دی ہے۔"

"ہاں۔ اس سے کم سزا وہ دے ہی نہیں سکتے تھے۔"

"عمل درآمد کب ہونا تھا؟"

"مجھے کچھ بھی علم نہیں بیٹے۔" المکرم نے گہری سانس لی۔ "ویسے مجھے یقین تھا کوئی نہ کوئی اَن دیکھا ہاتھ ضرور میری مدد کرے گا۔ اس لیے کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ آزادی کا حق مانگنا جرم نہیں ہوتا۔"

میں، مارشا اور گوتھم کے متعلق سوچنے لگا تھا اس لیے المکرم کی بیشتر باتیں نہ سن سکا تھا غیر ارادی طور پر ہوں ہاں کرتا رہا تھا، اگر مارشا اور لیئقہ ایک ساتھ نکل گئی تھیں تو مجھے یقین تھا، لیئقہ ان حالات میں اپنے گھر جانے کی حماقت نہ کر سکتی تھی لہٰذا مارشا ہی اُسے اپنے ساتھ لے گئی ہو گی۔ میں نے لیئقہ کو واشگاف الفاظ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آگاہ کر دیا تھا کہ خرم سلطان کی راہوں میں سکون اور خوشی کی کہکشاں نہیں بلکہ نوکیلے سنگریزے بکھرے ہوئے ہیں جو ان راہوں پر چلے گا اُس کے پاؤں لہولہان ہو جائیں گے۔ وہ نہیں مانی تھی۔ وہ کیا میری بات پر کوئی لڑکی بھی یقین نہیں کرتی تھی۔ اب مارشا کو تھم اور لیقہ جیسے جاں نثاروں کی سلامتی خطرے میں تھی اور میری ذات ہی خطرے کی محرک تھی لہٰذا میرا اخلاقی فرض تھا کہ میں اپنی گردن کے ساتھ ان کو بھی خطرے کی زد سے نکال لے جاؤں۔

"تم کیوں پریشان ہو، نوجوان؟" الکرم نے میری محویت اور خاموشی کو بھانپ کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

"آپ جانا کہاں چاہتے ہیں، انکل؟"

"ایک ایسی پناہ گاہ کی طرف جو تا حال محفوظ ہے۔" اُس نے بتایا "تمہیں کہیں دوسری جگہ جانا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب میں بتایا "میں بتا چکا ہوں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، مگر میرے کچھ ساتھی سرائے میں مقیم ہیں اور وہ ہماری وجہ سے کسی بھی وقت خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔"

"یہاں تو سرائے ایک ہی ہے، چلو اُن کو بھی لے لیتے ہیں۔" الکرم نے بریک پر پاؤں ڈالتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے اسپتال کے ذریعے صبح تک بے خبر رہیں گے۔ اگر کسی کو اطلاع کر بھی دی گئی تو ان کو پلانگ میں کچھ وقت لگے گا اور وہ لوگ میری تلاش نہ سڑکوں پر کریں گے۔ ہو ٹلوں میں، وہ میرے سیاسی قد اور وقوت کو مدنظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔" اس نے اگلے دو راہے سے ایک دم دائیں ہاتھ ٹرن لیا اور دس منٹ بعد ہم سرائے کے گیٹ پر تھے۔

میں نے جیب سے ریڈی میڈ میک اپ نکال کر چہرے پر جما لیا۔ الکرم دلچسپ نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔ میں نے محافظ کی ڈیوٹی سیٹ پر بھی تو الکرم نے اپنے سر پر ہیٹ لی۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر جو فربہ اندام شخص بیٹھا ہوا تھا وہ کاؤنٹر پر سر ڈالے خراٹے نشر کر رہا تھا میں نے انگلی سے کاؤنٹر بجایا مگر وہ بیدار نہ ہوا تب ہی میں دبے پاؤں کاؤنٹر کے پیچھے گیا اور لیاؤش کے کمرے کی چابی ہک سے اتار کر اُسی خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ تینوں پریشان حال، جاگ رہے تھے یا صرف گوتھم حق نمبانی ادا کر رہا تھا میری ہلکی سی چپل دستک پر ہی اس نے کی ہول سے مجھے پہچان کر دروازہ کھول دیا تھا، دونوں لڑکیاں بھی ایک ایک کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں جوں ہی اندر داخل ہوا وہ دونوں بے تابانہ تڑپ گئیں "نہیں میری پیاری بہن تم آواز نہیں نکالو گی۔" میں نے مارشا کو بکنے سے روک دیا۔ وہ زخمی سسکی سن کر میں نے چہرہ موڑ کر دیکھا۔ میرا یار گوتھم بھی کلائی منہ پر رکھے رو رہا تھا۔

"یہ وقت رونے کا نہیں ہے پیارو۔" میں نے گوتھم کے کھردرے بالوں پر تھپکی دی "جیسے بھی ہو یہاں سے نکل چلو۔ میں اپنے کمرے سے ٹرانسمیٹر لے کر آتا ہوں واپسی پر تم لوگ تیار ملو گے۔" میں کسی کا جواب سنے بغیر باہر نکل گیا تھا۔

کار میں پانچ آدمیوں کی گنجائش نہ تھی، میں الکرم کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور وہ تینوں پچھلی سیٹ پر ایسے بیٹھے تھے کہ مارشا لیقہ کے اوپر لدی ہوئی تھی۔ کراہتی اور غراتی ہوئی کار تقریباً پون گھنٹے سنسان سڑکوں اور کئی چھوٹی تاریک گلیوں میں چلتی ہوئی ایک گنجان علاقے میں ایک آہنی گیٹ کے سامنے جا رکی تھی، گیٹ کی ساخت اور پس منظر میں بلند اور وسیع عمارت، بلبوں کی سجاوٹ پوزیشن کی غماز تھی، الکرم نے نیچے اتر کر اطلاعی گھنٹی کا بٹن تین چار مرتبہ دبایا اور پھر کار کے اندر آ گیا میں نے دیکھا مرکزی لائٹ میں ایک طویل قامت شخص آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ وہ ایک خمیدہ کمر بوڑھا تھا جو لاٹھی کی مدد سے چل رہا تھا، جونہی وہ گیٹ پر آیا، الکرم نے شیشہ اتار کر چہرہ باہر نکال لیا۔ پھر اُن کے درمیان مقامی زبان میں مختصر سی باتیں ہوئی تھیں۔ کار کا ہاتھ دے پر ہی روک کر الکرم نے ہمیں اترنے کا اشارہ کیا۔ بوڑھا اُن کر کھڑا تھا اور ہم باری باری اس سے مصافحہ کرنے لگے۔

"اندر چلو عزیزو۔" الکرم نے نرم لہجے میں کہا "باقی کار کا ہم و نشان مٹانے کا انتظام کرے گا۔" بوڑھے نے لاٹھی پر جسم کا وزن سہارتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔

الکرم اس طرح راہداریوں میں ہماری رہنمائی کرتا رہا تھا جیسے وہ خود میزبان ہو، تین موڑ مڑنے کے بعد اس نے ایک دروازہ کھول کر روشنی کی، وہ غالباً گیسٹ روم ہی رہا ہوگا کمرے میں چھ پلنگ بچھے ہوئے تھے، درمیان میں ایک بڑے سائز کی فارمیکا ٹاپ تپائی بچھی ہوئی تھی جس پر جرائد، پانی کا جگ اور ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا "خدا کے سوا اور کوئی آنکھ یہاں نہیں جھانک سکتی۔" الکرم بولا "میں ان پیارے بچوں سے متعارف نہیں ہوں، باقی باتیں صبح ناشتے کی میز پر، اب تم لوگ بس سو جاؤ۔"

وہ باتیں کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ میں نے گردن گھما کر باری باری تینوں کی جانب دیکھا، گوتھم پہلے ہاتھ باندھے پینگز دیکھ رہا تھا، مارشا فکرمند آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی جبکہ لیقہ ہاتھوں میں سر تھامے صوفے پر اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی "کیا تم ان حالات میں؟" مارشا دبکتی آواز میں بولتی میرے قریب آ گئی۔

"خرم سلطان تم خاموشی سے سو سکتے ہو، نہیں، ہرگز نہیں، تمہیں اپنے دل کا غبار اور ہمارے دل صاف کرنے ہوں گے۔"

"باس کو آرام کی ضرورت ہے مارشی۔" گوتھم نے بھرائی ہوئی لڑکی کے شانے پر ہولے ہولے تھپکیاں دیتے ہوئے کہا "باس زندہ ہے بس یہی ہمارے لیے سب کچھ ہے، جاؤ، خاتونِ محترم کو ساتھ لے جاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔"

"میں نے تم سے پوچھا ہے خرم۔" مارشا نے میرا گریبان دبوچ لیا "تم خاموش رہو گے تو میرے اندر طوفان گرجتا رہے گا۔ بتاؤ، پولیس کو کون لایا تھا؟" اس نے خشونت آمیز نگاہوں سے چہرہ گھما کر لیقہ کو دیکھا "میں اُس کا نام سننا چاہتی ہوں۔"

نہ جانے لیقہ کو ایک دم کیسا حساس ہو گیا تھا کہ اس کی ذات دو آنکھوں میں مشکوک ہو رہی ہے، اُس نے چونک کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ لحظہ بھر وہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر اچھل کر اٹھی اور مارشا کے مقابل آ گئی "وہ... وہ... میں نہیں ہوں، بہن!" اس نے نہایت پُرسکون آواز میں کہا۔

"پھر کون ہے؟ تم ہی بتا دو۔؟" مارشا غرائی۔

"مجھے نہیں معلوم۔" لیقہ بولی "جب میں، آصفہ کا ایک ضروری پیغام پہنچانے خرم سلطان کے کمرے میں داخل ہوئی تو پولیس آفیسر پہلے ہی موجود تھا اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہ مجھے حسام الدین کے حوالے سے پہچانتا تھا، اُس نے مجھے واپس جانے کی اجازت نہیں دی، ورنہ میں خرم کو بروقت مطلع کر دیتی۔"

"شکریہ لیقہ۔" میں نے متبسم انداز میں کہا "وضاحت کی ضرورت نہیں، مخبر میرا ہی رہبر تھا لیاؤش جارش۔"

"اوہ... نن... نہیں۔" لیقہ نے چیخ ہتھیلی سے روک لی "وہ تو گروپ کا وفادار تھا۔"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی "یقیناً وہ گروپ کا وفادار تھا، لیکن ہم یہ بھول گئے تھے کہ ایسا شخص اپنے مذہب کا بھی وفادار ہو سکتا ہے۔ الکرم اُس کے مذہب کا دشمن تھا اور مجھے اُس کو رہائی دلانے اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔"

"مادام اُس کی بوٹیاں کتوں کو کھلا دے گی۔" لیقہ مٹھیاں بھینچ کر غرائی "وہ اب کہاں ہے؟"

میں نے ان کو مختصراً تمام کارروائی بتا دی۔ اس میں اپنا ڈھونگ کی قربانی کا ذکر بھی میں نے عقیدت بھرے انداز میں کیا تھا۔

"میرا اس ناقابلِ تسخیر ہے۔" گوتھم نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے۔

"آصفہ کا پیغام کیا تھا۔؟" میں نے لیقہ سے پوچھا۔

"وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔" لیقہ نے بتایا "غالباً مادام عائشہ کا کوئی مسئلہ ہے۔"

"نہیں..." مارشا بول پڑی "ہم اب کسی پر بھروسہ نہیں کریں گے۔"

"نہیں جان وہ اچھی لڑکی ہے۔" میں نے کہا "اسے اگر میری مدد درکار ہے تو میں ضرور ملوں گا۔"

"سنو خرم سلطان۔!" مارشا درشتی سے بولی "اس ملک کے سارے لوگ خود غرض، مفاد پرست ہیں۔ وہ تمہاری مادام بھی مجھے فراڈ لگی تھی، ہنستی مسکراتی ڈائن۔ میری مانو پیارے واپس چلے چلو ہانگ کانگ تمہاری راہ دیکھ رہا ہے، تم پورے شہر کے بے تاج بادشاہ بن جاؤ گے۔"

"مجھے بادشاہت نہیں صرف روحانی سکون کی تلاش ہے میری بہن۔" میں نے دکھی آواز میں کہا "جب میں اپنے وطن، اپنے خاندان کے درمیان تھا اس بے کلی کو میں نے دولت اور اَن دیکھے سنہرے جزیروں کی جستجو سمجھا تھا، پھر دولت مل تو مجھ پر انکشاف ہوا دولت وہ سکون نہیں دے سکی جس کی تڑپ مجھے گھر سے نکال لائی تھی، ہاں اگر تم کسی شہر میں مجھے وہ دولت دلوا سکتی ہو تو میں ابھی چل پڑوں گا۔"

"دولت سے مجھے وہ دولت یاد آ گئی ہے خرم۔" لیقہ بول پڑی "جو میری تحویل میں ہے، اب تو میں پولیس کو بھی مطلوب ہوں، پلیز اُسے اپنے قبضے میں کر لو۔"

"ایک بات پوچھوں لیقہ؟" میں نے کہا "تم واپس گھر جانا چاہتی ہو؟"

"میں گوست... تو سنہرے جزیروں کا خواب لے کر نکلی تھی اور نہ ہی روحانی سکون کی جستجو تھی، مجھ پر باعزت زندگی اور ذلت آمیز کے دروازے ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے گئے تھے میری جیب خالی ہو تو وہ بھوکا ننگا فٹ پاتھوں پر راتیں بسر کر لیتا ہے، مزدوری کے عوض اُسے پیٹ کا ایندھن بھی مل جاتا ہے مگر ایک جوان لڑکی بھیڑیوں کے جنگل میں خالی ہاتھ ایک دن بھی باعزت نہیں رہ سکتی۔"

"اگر تمہارے ہاتھ خالی نہ ہوتے تو۔؟"

"تو..." وہ ناخن کریدنے لگی پھر اُس نے نم ناک آنکھیں اسکارف کے کونے سے مل کر کہا "میں اپنا اجڑا ہوا فارم آباد کرتی اپنے خاندان کی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرتی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں وہ ساری دولت، تمہارے نام کرتا ہوں، واپس چلی جاؤ۔"

"کیا مجھے جانے دیا جائے گا؟"

"ہاں۔" میں نے مضبوط آواز میں کہا۔ "میں تمہاری راہ کی ہر رکاوٹ کو ہٹا کروں پر رکھ لوں گا، میں راستہ صاف کرتا ہوا تمہارے آگے آگے چلوں گا۔"

"کاش ایسا ممکن ہوتا۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے میڈم؟" گوتھم بول پڑا۔ "میں تمہیں گھر کی چار دیواری میں چھوڑ آؤں گا۔"

"تم۔ تم۔۔۔" لیئقہ کی آواز شدتِ جذبات سے جھرجھرانے لگی۔ "کس دُنیا کے لوگ ہو تم مخلص کھرے اور نڈر۔ میں تم فرشتوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی، مجھے اپنے درمیان رکھ لو۔"

"جذباتی نہ بنو لیئقہ۔" میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ "جذبے، وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔۔۔ جب تمہارا یہ جذبہ سرد ہو گا تو واپسی کی سیڑھیاں شاید پانی میں ڈوب چکی ہوں، ہم کون ہیں اور کن حالات سے گزر رہے ہیں تم سے پوشیدہ نہیں، پورا غلیظ میری تلاش میں ہے۔"

"میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرتی رہوں گی۔" لیئقہ بولی۔

"مان جاؤ پیاری دوست۔" عارشا نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں بھی اس پنجرے کو یہاں سے واپس لے جانے کی کوشش کروں گی۔"

"ٹھیک ہے، مہربان لوگو۔" لیئقہ بھرائی آواز میں بولی۔ "میں یہ کوشش ضرور کروں گی۔"

"گوتھم، تم فی الحال محفوظ ہو۔" میں نے کہا۔ "صبح، بس لیئقہ کو تم خدا حافظ کہو گے۔"

"بہتر باس۔" گوتھم نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "میں یہ ثواب ضرور حاصل کروں گا۔"

"بس اب سو جاؤ۔" میں نے قریب ترین پلنگ پر پھیلتے ہوئے کہا کیونکہ میرے جسم کا رواں رواں درد کر رہا تھا۔

صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں نے لیئقہ کو دلی دعاؤں کے ساتھ روانہ کر دیا۔۔۔ گوتھم کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اگر لیئقہ کی حفاظت کے لیے ضروری ہو تو تم آخری منزل تک اُس کے ساتھ جاؤ گے۔ اگر عام حالات ہوتے تو مجھے یقین ہے، وہ لڑکی اتنی آسانی کے ساتھ میرا ساتھ نہ چھوڑتی، گزشتہ رات کے واقعات نے اُسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ جُرم کے اندھیروں میں چلنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اُسے خود سے جُدا کر کے میں خوش بھی تھا اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ حسام الدین کے توسط اور حوالے سے وہ خواہ مخواہ میری ذمے داری میں چلی آئی تھی اور جن حالات نے مجھے گھیر لیا تھا۔ ان میں اُس کی حفاظت میرے لیے بہت مشکل پیدا کر سکتی تھی، ہاں اگر وہ سونیا اور جولیانا جیسی لڑکی ہوتی تو اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی سُود مند ہوتی۔

"یہ تمہارے ساتھ کوئی نفسیاتی اُلجھن ہے، خرم۔" مارشا مجھے خیالوں میں ڈوبا دیکھ کر بولی۔ "تم ہر ملنے والی لڑکی سے اِس قسم کی درخواست کرتے ہو۔"

"اِسے تم میری کمزوری کہو، بیماری کہو یا اُلجھن۔" میں نے جواب دیا۔ "میں جس مٹی، جس معاشرے اور خاندان کا فرد ہوں، وہاں لڑکی صرف والدین کے گھر، خاوند کے محفوظ سائے اور چہار دیواری کے صحن میں اچھی لگتی ہے، ہمارے ہاں بھی اب کچھ رواج چل نکلا ہے لیکن مغرب کے رواج سے خاصا مختلف ہے۔ میں جب بھی کہیں گھر سے دُور کسی لڑکی کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ایک کراہتی، سسکتی اور مجبور لڑکی والدین کے پیار سے دُور کر دی گئی ہے، چشمہ نصیب [illegible] کی انتظار کرتی دکھائی دیتی ہے، میرے گھر میں بھی ایک جوان لڑکی ہے، اُس کا نام زینب ہے، وہ جس دن اسکول سے لیٹ واپس آتی تھی تو میری ماں ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر اُس کی راہ دیکھتی رہتی تھی، ماں یہاں ہو یا وہاں اُس کا دل ایک جیسا ہوتا ہے۔ بس یہی میرے ساتھ مجبوری ہے، مجھے ہر لڑکی زینب دکھائی دیتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ فوراً گھر واپس چلی جائے تاکہ کوئی ماں پریشان نہ ہو۔"

"تم کیا ہو؟ عجیب ہو، تضادات کا مجموعہ، دل پتھر سے سخت بھی اور پھول سے زیادہ نازک بھی رکھتے ہو، جب غراتے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے درندہ اور جب کسی کے دُکھ میں روتے ہو تو اوتار کا رُوپ دھار لیتے ہو۔"

"اجازت ہے، جناب؟" ایک دُبلی پتلی لڑکی نے فٹ میٹ پر خمیدہ ہو کر پوچھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ "جناب۔۔۔! سیدی، آپ کو یاد فرماتے ہیں۔"

"کون سیدی۔۔۔؟" میں نے استفہامی لہجے میں پوچھا۔

"سیدی، ابو ریحان، جناب۔" لڑکی متانت سے بولی۔ "صرف آپ کو۔۔۔"

میں اُس کی رہنمائی میں کاریڈور سے گزرتا، ایک بند دروازے

کے سامنے جا رُکا۔ لڑکی نے المائی گھنٹی کے بٹن پر اُنگلی رکھی اور دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ لڑکی نے نگاہوں کی زبان سے مجھ سے اندر داخل ہونے کی درخواست کی، میں نے ایک طویل سانس لے کر قدم بڑھائے، جونہی میں نے کمرے میں قدم رکھا، قطار میں بیٹھے چار اشخاص ہڑبڑاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے میں نے اسلام علیکم کہتے ہوئے چاروں چہرے دیکھ ڈالے، اُن میں المکرم موجود نہیں تھا، چاروں کے درمیان سے ایک طویل قامت، لاغر سا بوڑھا مسکراتا ہوا باہر نکل آیا۔ اُس نے اپنا لرزیدہ ہاتھ بڑھایا۔ "خوش آمدید عظیم فرزند۔۔۔" اُس کی آواز میں بوڑھے شیر کی گرج تھی۔ "مورو قوم کے محسن! ان لوگوں سے ملو۔" اُس نے پہلے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "آزاد فورس کے کمانڈر داؤد ہشاش۔" داؤد ہشاش نے ایڑیاں جوڑ کر سیلیوٹ کیا اور فوجی انداز میں ہاتھ بڑھا دیا۔ اُس کی گرفت گرم زنبور جیسی تھی۔ "داؤد کا معاون، جنرل سیف الدین۔" دوسرے مرد کا تعارف کراتے ہوئے بتایا گیا۔ "مندناڈیں بلیک ٹائیگر کے نام سے مشہور ہے۔" سیف الدین نے بھی سیلیوٹ کیا تھا۔ اگر اُسے کسی نے بلیک ٹائیگر کا خطاب دیا تھا۔ تو بے جا نہ تھا، وہ سیاہ فام نوجوان واقعی لو خیز چیتے کی اُٹھان رکھتا تھا، جب اُس نے ہاتھ چھوڑا تو میں نے نگاہوں کا قدم آگے بڑھایا اور لڑکھڑا سا گیا۔۔۔ میں اعتراف کروں گا کہ مجھے بھرپور برقی جھٹکا لگا تھا۔ وہ مجھے اس دُنیا کی مخلوق ہی نہ لگی تھی۔ زینت، عابدہ اور ایڈنا کے حُسن کو اگر یکجا کر دیا جاتا تو بھی اُس لڑکی کا پلہ بھاری رہتا۔ قدیں بلاشبہ وہ چھ فٹ سے کم نہ رہی ہو گی۔ "یہ ہیں ہمارے نجات دہندہ اور رُوحانی پیشوا المکرم کی بیٹی خالدہ، محاذِ آزادی کے محکمہ خفیہ کی سربراہ۔"

نہ خالدہ نے مصافحہ کی رسم نبھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا نہ مجھے ہاتھ اُٹھانے کا ہوش رہا تھا۔ ہم دونوں رُوبرو کھڑے ایک دوسرے کو نگاہوں میں تول رہے تھے، اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نہ تو سرد مہری تھی، نہ درشتی نہ خشونت اور نہ ہی مسکراہٹ کی کرن۔

"خالدہ۔۔۔!" ابو ریحان کی آواز اُبھری۔ "یہ نوجوان تمہارا، میرا اور مورو قوم کا محسنِ عظیم ہے، میری بیٹی!"

"بے شک سیدی۔۔۔" ایک بہکی سی مترنم چہک سنائی دی۔

"میں نے جان اور پہچان لیا ہے، یہ وہی ہے، جس کی مدتوں سے اِس سرزمین اور ہماری مظلوم قوم کو تلاش تھی۔" اُس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "سیدی۔۔۔! ابو جان کو جگا دیجئے تاکہ کارروائی۔۔۔ شروع کی جائے۔" ابو ریحان لاٹھی ٹیکتا ہوا، جب بغلی دروازے کی جانب چلنے لگا تو خالدہ نے چہرہ گھما کر اپنے کمانڈروں کی جانب دیکھا اور سرد آواز میں بولی۔ "جنرل داؤد آپ کی سیکرٹری کہاں ہے؟"

"باہر، ویٹنگ روم میں میڈم!" جنرل داؤد نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کی ہدایات کے مطابق، میڈم!"

"یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں کہ وہ زیرِ نگرانی ہے؟"

"نگرانی۔۔۔!" جنرل داؤد چونک کر بولا اور میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔ "نہیں میڈم! مجھے ایسی کوئی ہدایت نہیں ملی اور نہ ہی نگرانی کی ضرورت تھی۔"

"جنرل۔۔۔!" خالدہ کی غراہٹ اُبھری۔ "تم بچے نہیں ہو، تم کمانڈر انچیف ہو، تمہاری عقل اور نگاہ کو خود فیصلہ کرنا چاہیے تھا، جاؤ دیکھو اور خالی کرسی سے پوچھو، وہ عیار لڑکی کہاں ہے؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں میڈم!" داؤد مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "وہ شک اور شبہے سے بالاتر لڑکی ہے اور میں آپ کی غلط فہمی رفع کرنے ہی کے لیے اُسے ساتھ لایا ہوں۔"

"جنرل۔۔۔" خالدہ برہم لہجے میں بولی۔ "تم نے آتے ہی ایک حماقت کر ڈالی ہے، تم نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ ساتھ آئی ہے، تم نے مجھے بتایا کہ اُسے فون پر پیغام دے کر اِدھر چلے آؤ گے۔"

"جی ہاں میڈم۔۔۔" داؤد نے جواب دیا۔ "میں نے فون پر اُسے تیار رہنے کی ہدایت دی تھی اور آتے ہوئے ساتھ لیتا آیا تھا، اُس کی کار آف روڈ ہے۔"

"تم جانتے ہو، جنرل۔۔۔ وہ بایونک گرل ہے۔"

"جی ہاں میڈم یہ بات آپ نے ہی مجھے بتائی تھی۔"

"پھر بھی تم نے اُسے ایک عام سیکرٹری کا درجہ دیے رکھا اور گفتگو میں بھی احتیاط نہ برتی۔" خالدہ کہتی گئی۔ "وہ ایک فرلانگ دُور بیٹھ کر سرگوشی سن لیتی ہے، جنرل! تمہارے کانفرنس روم اور اُس کے کیبن کے درمیان کتنا فاصلہ ہو گا، پھر یہاں آتے ہی تم نے زوردار آواز میں اعلان کیا تھا کہ میری سیکرٹری پر ناروا الزام لگایا جا رہا ہے۔ اُس نے تمہاری آواز سن لی ہو گی۔ اگر وہ داغ دار نہیں تو جاؤ اُسے لے آؤ، بصورتِ دیگر وہ ہماری دسترس سے بہت دُور نکل گئی ہو گی۔ اگر ایسا ہوا تو جنرل یقین کرو، وہ محاذِ آزادی کے لیے ٹائم بم رکھ گئی ہے۔" جنرل ابو داؤد ایڑیوں کے بل گھوما اور پٹخکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ "احمق۔۔۔" خالدہ بڑبڑائی۔ "اوہ۔۔۔ معاف کرنا۔۔۔ مسٹر خرم سلطان! ہم کچھ ناخوش گوار باتوں میں اُلجھ گئے، تشریف رکھیئے، میں آپ کے دوسرے ساتھیوں سے بھی ملوں گی، مسٹر گوتھم واپس آئیں تو مطلع کر دیجئے گا۔" میں نے ہونٹ سختی سے بند کر رکھے تھے، حیرت ہو رہی تھی کہ اُسے ہماری نئی کارروائی اور ناموں سے کس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

متعارف کر دیا تھا۔

قدموں کی چاپ اُبھری اور بغلی دروازے سے المکرم کا روشن اور متبسم چہرہ برآمد ہُوا۔ اُس کے پیچھے خمیدہ کمر ابُو ریحان تھا۔ خالدہ کا تمتماتا ہُوا چہرہ یکدم نرم ہوگیا۔ وہ سر سے ڈھکا ہُوا سیاہ اسکارف درست کرتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ المکرم نے گزرتے گزرتے اس کے سر پر تھپکی دی اور سیدھا میری طرف بڑھتا آیا۔ میں بھی مؤدب کھڑا تھا۔ اُس نے کچھ بولے بغیر بازو پھیلائے اور میں سمٹ کر اُس کی بانہوں کے پھیلاؤ سے گزرتا، فراخ سینے سے جا لگا۔ بچھانے کا انداز والہانہ ہی تھا جیسے کوئی باپ بچھڑے ہوئے بیٹے کو وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر بھینچ رہا ہو۔ "تم لوگوں نے..."

"جی ہاں ابّو جان!" خالدہ کسی سعادت مند اور شرمیلی بیٹی کی طرح بولی۔ "یہ اعتراف مجھے کرنا ہے۔ میں جو اپنے عظیم باپ اور سپریم کمانڈر کو تلاش کرنے میں ناکام رہی ہوں۔"

"شکریہ!" المکرم نے مجھے چھوڑ دیا اور بالکل بدلی ہوئی آواز میں پلٹ کر بولا۔ "اور تم اس اصول کو بھی کھلے دل سے تسلیم کر دو کہ اس اہم عہدے پر اُس شخص کو تعینات کیا جاتا ہے، جو ذہنی، جسمانی اور روحانی طور پر برتر ہو۔"

"جی ہاں ابّو جان!" خالدہ کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "میں تسلیم کرتی ہوں۔"

"پھر..." المکرم غرّایا۔

خالدہ نے جیکٹ کی جیب سے کچھ نکالا... اور دو قدم بڑھ کر مٹھی المکرم کے سامنے کھول دی۔ اُس کی ہتھیلی پر ایک چاکو رڈ ٹنگ تھا۔ المکرم نے ڈسک اُٹھا لیا اور خالدہ پھر دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ ساری بات مجھ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھی۔ خالدہ، آزاد فوج کے خفیہ محکمے کی چیف تھی اور فوج کا سپریم کمانڈر، ملکی فوج نے اغوا کر لیا تھا۔ خالدہ بحیثیت ایجنسی چیف اُسے رہا کرانا تو درکنار اُس کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی اور سپریم کمانڈر رشتوں اور دلی جذبوں سے بالاتر ہو کر ایجنسی چیف کو معتوب کر رہا تھا۔ اس لمحے نہ وہ باپ تھا اور نہ خالدہ بیٹی تھی۔

"دوسرے حکم تک..." وہ ڈسک اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے سرد ترین لہجے میں غرّایا۔ "تم صرف ایک عام مجاہد عورت ہو۔ میں آج کے اجلاس میں کوئی فیصلہ کر لوں گا۔"

"بہتر جناب!" خالدہ تھوک نگل کر بولی۔ "کیا میں چلی جاؤں؟"

"نہیں..." المکرم نے نفی میں سر ہلایا۔ "نئے چیف کے انتخاب تک عارضی طور پر تم اپنی سابقہ خدمات سرانجام دو گی۔ میں باہر تھا کون اس کا ذمّے دار تھا۔ یہ فیصلہ ابھی باقی ہے۔ ابُوداؤد کہاں ہے؟"

"شاید باہر اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہوگا۔" خالدہ نے جواب دیا اور المکرم نے چونک کر اُسے دیکھا۔ قبل اس کے کہ خالدہ اپنی بات کی وضاحت کرتی۔ تھکے تھکے قدموں سے ابُوداؤد اندر داخل ہُوا پھر جوں ہی اُس کی نگاہ المکرم پر پڑی، وہ یکدم تن گیا اور ایڑیاں بجا کر اُس نے سیلوٹ کیا۔

"کیا خبر لائے ہو جنرل؟" خالدہ کا ڈھیلا ڈھالا چہرہ فوراً تن گیا۔

"مجھے افسوس ہے میڈم!" ابُوداؤد نحیف آواز میں بولا۔ "وہ... وہ فرار ہوگئی ہے۔"

"اُوں...!" خالدہ نے طویل سانس لی اور اُس کا دایاں ہاتھ جیب میں رینگ گیا۔ ابُوداؤد فٹ سیٹ پر ہی کھڑا تھا۔ "کب اور کیسے جنرل؟"

"اُسے میں ویٹنگ روم میں بٹھا کر ادھر آیا تھا میڈم!"

"سیف الدین!" خالدہ کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ اُبھری۔ "جنرل نے جب کار پارک کی تو...!" معاً خالدہ کا ہاتھ بجلی کی طرح کوندا اور دھماکے کی آواز گونج اٹھی۔ جنرل ابُوداؤد کے حلق سے بھاری چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑاتا ہُوا پیچھے ہٹ گیا۔ "رُک جاؤ ابُوداؤد!" خالدہ کی گرج سُنائی دی۔ "ورنہ دوسری گولی تمہیں اعترافِ جُرم کا بھی موقع نہیں دے گی۔"

میں متحیرانہ نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جنرل داؤد نے پیٹی میں اُڑسے ہوئے ریوالور کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا اور خالدہ نے حیرت انگیز پھرتی سے اُس کے ہاتھ کا سفر روک دیا تھا۔ ابُوداؤد کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں خون اُگلنے لگی تھیں۔

"جنرل سیف الدین!" خالدہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "ابُوداؤد کو حراست میں لے لو۔"

"نہیں!" ابُوداؤد حلق پھاڑ کر دہاڑا۔ "رُک جاؤ سیف الدین!" اُس نے بایاں ہاتھ پیٹی پر رکھ لیا۔ "اگر کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی تو میں بے دریغ گولیاں برسا دوں گا۔"

معاً ایک سایہ لہرایا اور جنرل ابُوداؤد ڈکراتا ہُوا منہ کے بل اندر آن پڑا... وہ کوئی چھلاوہ ہی تھا جس نے دائیں جانب سے اُچھلتے ہوئے ابُوداؤد کی پُشت پر ضرب لگائی تھی اور خود بائیں طرف کُود گیا تھا۔ جنرل سیف الدین نے ابُوداؤد کے بال مٹھی میں پکڑے اور گھسیٹتا ہُوا المکرم کے سامنے لا کر پٹخ دیا۔

"ابُوداؤد!" المکرم کی سپاٹ آواز اُبھری۔ "اُٹھو اور سامنے کھڑے ہو جاؤ۔" جب وہ گھٹنوں کے بل ہُوا تو سیف الدین نے جُھک کر اُس کی پیٹی الگ کر لی۔

"بولو ابُوداؤد! وہ لڑکی کہاں ہے اور کس نے تمہیں غدّاری پر مجبور کیا ہے؟" خالدہ اچھل کر اُٹھی اور اُس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ "میں نے تمہیں اسی دن پہچان لیا تھا۔ مکّار لومڑ! جس دن سپریم کمانڈر المکرم انتہائی خفیہ دورے پر گئے اور پھر واپس نہیں آئے تھے۔ اس دورے کا علم تین اشخاص کو تھا۔ میں تم اور سپریم کمانڈر۔ وہ غدّار تم ہو جس نے وقت اور مقام دشمن کو بتا دی تھی۔"

"نہیں یہ جھوٹ ہے۔" ابُوداؤد حلق پھاڑ کر چیخا۔ "سیف الدین میری گواہی دے گا۔ میں کانفرنس رُوم سے نکل کر سب سیکٹر وار ٹریکمانڈر طارق کے پاس گیا تھا۔ مجھے اپریشن سیون کی رپورٹ لینا تھی۔ سیف الدین وہاں موجود تھا۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سپلائی سیکشن کا کمانڈر آیا اور اُس نے بتایا کہ ایک پارٹی اسلحہ سپلائی کرنے پر رضامند ہوگئی ہے اور نقد ادائیگی کی بنیاد پر مال فوری ڈیلیور کرنا چاہتی ہے۔ جنرل ابُوداؤد نے تائید طلب نگاہوں سے سیف الدین کی طرف دیکھا۔

"یہاں تک تمہارا بیان درست ہے۔" خالدہ بول پڑی... "سیف الدین پہلے ہی بتا چکا ہے، پھر کیا ہُوا تھا؟"

"پھر... پھر...!" ابُوداؤد پشیمانی رگڑنے لگا جیسے یادداشت کو گھیر کر جمع کر رہا ہو۔ "وہاں پھر شاید مجھے گھر سے فون کال آئی تھی اور میں گھر چلا گیا تھا۔"

"تمہیں گھر کون لے گیا تھا؟" خالدہ کی آواز میں یکایک سفاکی عود کر آئی تھی۔ "تم جب اپنی کار میں بیٹھے تو ایک شخص نے تمہیں رُکنے کا اشارہ کیا، وہ تمہارے نزدیک گیا اور تم نے اُس کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ وہ کون تھا؟"

"وہ... وہ... مم... میرا ایک دوست تھا۔" ابُوداؤد کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ "میڈم ہماری ایک دوسری حیثیت بھی ہے۔ یہ پہلی حیثیت کو چھپانے کے لیے ہمیں معاشرے میں گھُل مل کر رہنا ہوتا ہے۔"

"وہ کون تھا؟" خالدہ کرسٹی "جواب دو ابُوداؤد! کیونکہ اغوا کرنے والوں میں وہی شخص شامل تھا۔" وہ دو قدم ٹہلنے کے انداز میں چل کر رُک گئی۔

"میں کورٹ مارشل کا حکم دیتا ہوں۔" المکرم کی وہی مخصوص سرد اور کھرکھراتی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ "جنرل سیف الدین! تم خالدہ کی مدد کرو گے۔"

"بہتر کمانڈر۔" سیف الدین نے دایاں پاؤں اُٹھا کر زمین پر مارا۔ "ابُوداؤد! تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا حق دیا جائے گا۔"

"تم!" المکرم نے میری جانب نرم نگاہوں سے دیکھا۔ "جبوری کے فرائض سرانجام دو گے۔ پوری دیانت داری سے... اور تم ابُوریحان وکیل صفائی ہو گے۔" ابُوریحان نے صرف تفہیمی انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"ابُوداؤد!" خالدہ نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "اگر تم اُس شخص کا نام اور مقام بتا دو جس نے تمہیں خریدا ہے تو بہت آسانی سے حق میں جائے گا۔" ابُوداؤد نے جھکا ہُوا چہرہ آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھایا۔ دونوں ایک دوسرے کو لحظہ بھر گھورتے رہے۔ ابُوداؤد کے ہونٹ پھڑپھڑائے لیکن اُس نے فوراً ہونٹ سکوڑ کر سر جُھکا لیا۔ "اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم غیر مسلم ہو!" خالدہ نے کہا۔ "تو یقین کرو میں تمہاری ذہانت اور جُرأت کا اعتراف کرتے ہوئے تمہارے ساتھ وہی سلوک کرتی جو مہذب حکومتیں ایک جاسوس کے ساتھ کیا کرتی ہیں۔ جاسوسی اور ہمارے خلاف بڑی سے بڑی کارروائی کرنا تمہارا حق ہوتا... لیکن تم ایک مسلمان ہو! اس لیے تمہارا جُرم جاسوسی کے زمرے میں نہیں آتا بلکہ تم غدّارِ ملّت ہو۔ ہم اپنے دشمن کو معاف کر سکتے ہیں... مگر غدّار کو نہیں۔"

"کیا میں زبان کھولنے کا حکم دوں؟" المکرم نے درشت آواز میں کہا۔ "میں جب اغوا ہو رہا تھا، اُسی وقت مجھے یقین ہوگیا تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ خالدہ کہیں لڑکھڑا گئی ہے یا ابُوداؤد نے ڈس لیا ہے۔ تمہاری خاموشی، سیکرٹری کا فرار اور قاتلانہ حملے کی کوشش تینوں باتیں میں فیصلے کے قریب کر رہی ہیں۔ میجر سعدی کا انجام تمہیں یاد ہوگا، ہم غدّاروں کو سانسوں کی مہلت دینے کے عادی نہیں ہیں۔"

خالدہ نے کندھے اُچکائے اور آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگی پھر ابُوداؤد کے مقابل پہنچ کر کھڑی ہوگئی۔ میں سانس سینے میں روک کر ایک ٹک اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُس کا دایاں ہاتھ کوٹ کے پھن کی طرح اوپر اُٹھا اور کمرے کی خاموشی، ابُوداؤد کی کربناک چیخ سے زخمی ہوگئی۔ میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ خالدہ نے ایک سیکنڈ میں ابُوداؤد کا بایاں کان جڑ سے اُکھاڑ کر بڑی لاپروائی سے ایک طرف اُچھال دیا تھا۔ "میرا سوال غور سے سنو!" خالدہ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "کس کی ایما پر سپریم کمانڈر کو اغوا کیا گیا تھا؟"

"مم... مجھے گولی مار دو۔" ابُوداؤد کراہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے صرف فون پر ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔"

"وضاحت کرو۔" خالدہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔

"اُس نے مجھے وزارت کی پیش کش کی تھی۔" ابُوداؤد بتانے لگا۔ "پھر ایک اجنبی شخص وہ ضمانت تحریری طور پر میرے پاس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لایا تھا۔ وہ فلپائنی زبان نہیں جانتا تھا، اس لیے اُس کے ساتھ ایک ترجمان بھیجا گیا تھا جسے اُس نے شمعون کے نام سے پکارا تھا۔"

شمعون کا نام سُن کر میرے ساکت و صامت جسم کو برقی جھٹکا لگا تھا۔ میں تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک منٹ جنرل۔" میں ہاتھ اُٹھا کر چیخا تھا۔ "کیا وہ پیغامبر چینی نژاد فلپائنی تھا، جس کی ناک طوطے کی چونچ سے مشابہ ہے؟"

"ہاں!" ابُوداؤد نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "وہ طویل قامت اور داغر چینی تھا۔"

"چنگ چی۔" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"محترم سلطان!" خالدہ نے استفسارانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ "کیا تم اُس کو جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح میڈم۔" میری آواز بھرا گئی۔ "وہ... وہ میرا قاتل ہے۔"

"تمہارا قاتل!" خالدہ استفہامیہ آواز میں بولی۔

"ہاں میڈم!" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ایک معصوم نوجوان کا قاتل، یہ ایک دردناک اور طویل داستان ہے۔ آپ ابُوداؤد کو فی الحال یرغمال رکھیں۔"

"جنرل سیف الدین!" خالدہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی۔ "کیا آپ ابُوداؤد کو اپنی ذمے داری میں لیں گے؟"

"سوری میڈم!" سیف الدین نے نگاہیں چُراتے ہوئے جواب دیا۔ "ابُوداؤد میرا بگڑی یار اور کمانڈر رہا ہے۔ میں اس کڑی آزمائش میں شاید کسی قدم پر لڑکھڑا جاؤں۔"

"یہ ذمے داری میرے بُوڑھے کندھوں پر ڈال دو بیٹی۔" ابُوریحان نے لرزیدہ آواز میں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ "اکرم کو بھی چند دن آرام اور خوراک کی ضرورت ہے۔ تم لوگ کشتی کا سوراخ بند کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھو۔"

"سیف الدین!" خالدہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔ "محترم بابا نے تمہاری معذرت قبول کر لی ہے۔ تم ہیڈ کوارٹر نمبر دو میں چلے جاؤ اور سپریم کمان کی ہدایات کا انتظار کرو۔"

"شکریہ میڈم!" سیف الدین نے ابُوداؤد کی پیٹی الحکم کو دیدی۔

"مسٹر محترم سلطان!" خالدہ نے نرم آواز میں کہا۔ "آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"کسی ایسے بیل کی تلاش، میڈم! جو مجھے بیلوں سے محفوظ رکھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "مندناؤ کی پولیس اور فوج مسلح سال میری تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔"

"مجھے اور میری قوم کو آپ جیسے بایونک نوجوان کی اشد ضرورت ہے۔" وہ ہونٹ چباتی ہوئی بولی۔ "ہم ایک غدار کی وجہ سے بڑے نازک حالات سے دوچار کر دیے گئے تھے۔ غدار تو ہماری گرفت میں ہے لیکن اہم راز وہ اپنی سیکرٹری کے ذریعے باہر نکال چکا ہے... اگر بروقت تدارک نہ کیا گیا تو محاذ کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا...!"

"مجھے کیا کرنا ہوگا، میڈم؟"

"مجھے سیکرٹری چاہیے، زندہ یا مُردہ...!"

"مل جائے گی۔" میں نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ "لیکن میں اپنی اصل صورت سے کہ باہر آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتا۔"

"صورت بدلنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" وہ آگے بڑھی۔ "میرے ساتھ آؤ۔" وہ پون گھنٹے تک میرے چہرے کی مرمت کرتی رہی پھر بولی۔ "اب آئینے میں اپنے ہم زاد سے مل لو۔"

میں نے آنکھیں کھول کر جو چہرہ دیکھا، وہ میرا نہ تھا بلکہ ایک فلپائنی خدوخال لیے ہوئے وجیہہ چہرہ تھا۔ "لاکمال ہاتھوں کا لاجواب شاہکار...!" میں نے اُسے پُرستائش نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"شکریہ۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "میں نے ہی تمہیں ایک آئیڈیل چہرہ دیا ہے، ہر لڑکی کا آئیڈیل۔ اُن لڑکیوں میں ہی کہیں وہ لڑکی ہوگی... جسے اس جال میں جکڑنا ہے۔ تمہیں اُس کی تصویر دکھا دی جائے گی۔ گڈ لک مسٹر محترم سلطان!" وہ بولتی ہوئی واش بیسن پر جھک گئی۔

"تم ایسے فلپائنی ہو جس کی پرورش امریکہ میں ہوئی ہے۔" اُس نے چہرہ موڑ کر کہا۔ "وہ تمہاری ساتھی لڑکی فلپائنی ہے، نا؟"

ہاتھ صاف کر کے وہ میرے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ اُس کا تنا ہوا چہرہ خاصی حد تک نرم ہو گیا تھا اور آنکھوں میں تیرتے ہوئے سُرخ دھاگے بھی صاف ہو گئے تھے۔ لحظہ بھر وہ گہری نگاہوں سے میرے سراپے کا جائزہ لیتی رہی پھر بولی۔ "تم واقعی بایونک ہو، مسٹر محترم؟"

"نہیں مس خالدہ۔" میں نے بھی پہلی بار اُسے بے تکلفی سے جواب دیا تھا۔ ورنہ اُدھر میں نے بھی... اُس کے عہدے اور شخصیت کی برتری خود پر طاری کر رکھی تھی۔ "میں عام گوشت پوست کا انسان ہوں۔ آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہوئی؟"

"تم سے پہلے ہمارے پاس مادام سعدیہ کے توسط سے تمہاری شہرت شخصیت، سفاک خصلت، مشکوک ماضی بہت کچھ پہنچ گیا تھا مسٹر محترم سلطان! میں نے تم پر کچھ کام کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن تم میرے نگرانوں کو نچاتے پھرتے رہے۔ پھر ایک دم رپورٹ ملی کہ محترم سلطان ہوا میں تحلیل ہو گیا ہے اور آج رات سوتے میں اُٹھا کر مجھے خبر پہنچائی گئی اور میں نے یہاں آ کر تمہیں اسکرین پر دیکھا، تمہاری باتیں سُنیں، وہ باتیں جو کوئی راہب ہی کر سکتا ہے۔ اگر تم اندر سے اس قدر نرم اور اخلاقی قدروں کے علم بردار ہو تو پھر تمہارے وہ کارنامے کس خانے میں رکھے جائیں۔ اُس محترم سلطان کو کیا سمجھا جائے جو بیک وقت درجن بھر درندہ صفت غُنڈوں کی گردنیں توڑ تا رہا ہے۔ وہ محترم سلطان عام گوشت پوست کا انسان نہیں ہو سکتا، جسے بلندی سے گہرائی میں بکھری چٹانوں پر اُچھال دیا گیا تھا اور وہ ایسے ہی ہنستا مسکراتا، ٹہلتا ہوا اُوپر آ گیا تھا جیسے اُسے پھولوں کی پتیوں پر لٹایا گیا تھا۔ نہیں، مسٹر محترم سلطان!" اُس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "اگر تمہیں ہماری تقدیر سنوارنے کے لیے بھیجا گیا ہے تو میں تمہیں اندر باہر سے جان لینا چاہوں گی۔ تم پر یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ میں کون ہوں اور میری فتے داریاں کس قدر حساس اور اہم ہیں۔ میں ہمیشہ قدر اور قوت کے مطابق دوسروں سے کام لینے کی عادی ہوں۔"

اُس کی طویل ترین باتوں کے جواب میں میں لاپروایانہ انداز میں ہنس پڑا۔ میں نے اُسے یقین دلانا چاہا تھا، میں نے اُس کی غلط فہمی کی تردید بھی کر دی تھی لیکن اُسے جب یقین نہیں ہو رہا تھا تو میں سوائے ہنسنے کے اور کیا کرتا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر وہ غلط فہمی میں رہنا چاہتی ہے تو میرا کیا جائے گا۔

"ٹھیک ہے محترم سلطان!" وہ میری ہنسی سُن کر اُچھل کر بولی۔ "میں تمہیں تلاش کر لوں گی۔"

"نقل برائے اطلاع مجھے بھی بھجوا دیجئے گا۔" میں نے پھر مضحکہ اُڑانے والے... نہیں کہا۔ "میں بھی تلاش میں ہوں۔ جو انسان میں گھر سے لے کر چلتا۔ وہ اِدھر آ کر مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، مسٹر۔" اُس نے ہونٹ بھینچ کر تفہیمی انداز میں کہا۔ "اب بتاؤ تمہیں اِس مہم کے لیے کیا چاہیے؟ آج ڈرائیور کے ساتھ جاؤ گے۔ کل تک تمہیں جی کا زی لائسنس کے ساتھ مل جائے گی۔"

"میں مس مارشا کے ساتھ ہوں گا، وہ ایک اچھی گائیڈ ہے۔"

"اوہ نہیں۔" خالدہ جانے جاتے پھنکارتی ہوئی بیٹی۔ "تمہیں ایک شکاری نوجوان کا کردار ادا کرنا ہے، اگر تم اپنے ساتھ مارشا جیسی خوبرو لڑکی لگائے پھرو گے تو کوئی لڑکی تمہیں لفٹ نہیں دے گی۔ لوگ غالی ٹیکسیوں کو ہی روکنے کا اشارا کرتے ہیں۔ تم تنہا رہو گے۔"

"ایسی صورت میں مجھے ایک دو روز کی مہلت ملنی چاہیے۔"

"مہلت...!" اُس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت عود کر آئی۔ "لیکن کیوں...؟"

کالج

کے نوٹس بورڈ پر لکھا تھا۔ "فزکس کی نصابی کتاب گم ہو گئی ہے، جس کی مجھے اشد ضرورت ہے، جن صاحب کو ملی ہو وہ دیے ہوئے فون نمبر پر مطلع کر دیں تو انہیں گھر کا پکا ہوا کھانا کھلاؤں گی ــــــ"

یہ نوٹس پڑھ کر ایک طالب علم نے کتابوں کے انبار میں سے اپنی کتاب نکالی اور خوشی خوشی ان محترمہ کو فون کیا کہ آپ کی گمشدہ کتاب مل گئی ہے۔

طالبہ نے جواب دیا۔ "جناب آپ نے دیر سے رابطہ قائم کیا۔ گزشتہ تین گھنٹوں میں ساٹھ افراد کتاب ملنے کی نوید سُنا چکے ہیں ــــــ"

"اس لیے، مس خالدہ کہ میں بایونک مین نہیں ہوں۔" میں نے بمشکل اُسے مارشا کی خوبی کے تعلق بتاتے ہوئے کہا۔ "جب کہ مارشا سونگھنے کی جس تک بایونک گرل ہے۔"

"اوہ...." اُس کے ہونٹوں سے سیٹی اُبھری۔ "تو... تو... اُسی نے ابُوجان کو تلاش کیا تھا۔"

میں نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلائی۔

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔" وہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے پُرجوش آواز میں بولی۔ "میں اُس عجیب لڑکی سے ضرور کام لوں گی لیکن وہ تمہاری ساتھی ہے، اُسے بھی اپنی شکل کے ساتھ باہر نہیں... نکلنا چاہیے۔"

"مرمت کے بعد کام چل جائے گا۔" میں نے قریب رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اُٹھا کر خالدہ کی جانب دیکھا اور اُس نے سیٹ کا ایک بٹن دبا کر مارشا کے کمرے سے رابطہ ملا دیا اور میرے ہاتھ سے ریسیور لے کر مادری زبان میں بولنے لگی۔

"مس خالدہ، وہ لڑکی آپ کی زبان نہیں جانتی۔" میں نے اُسے ٹوک دیا۔

"میں نے نگران کو حکم دیا ہے کہ مارشا کو میرے پاس لے آئے۔" خالدہ نے ریسیور رکھتے ہوئے بتایا۔ "رپورٹ میں مادام سعدیہ نے بتایا ہے کہ محترم سلطان کے اندر کوئی نفسیاتی گرہ ہے، وہ لڑکیوں سے الرجک رہتا ہے لیکن مارشا جیسی لڑکی تم ساتھ لیے پھرتے ہو، کیا یہ تضاد نہیں؟"

"پہلی بات تو یہ ہے، مس خالدہ۔" میں نے سپاٹ لہجے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب دیا۔ "مارشا میرے بیٹے لڑکی نہیں، جس طرح بہنیں اور بیٹی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مگر بھائی اور باپ کے نزدیک وہ لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں لڑکیوں سے نہیں... بلکہ لڑکیوں کے روپ میں چڑیلوں سے الرجک ہوں۔"

"اوہ..." خالدہ کے لبوں پر ناگوار سی مسکراہٹ ابھری۔ "میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"خوش رنگ پتنگ کی طرح۔" میں نے بے ساختہ اپنی رائے بتا دی۔ خالدہ نے اپنی نمایاں مسکراہٹ چھپانے کے لیے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ "ایسی مورتی جسے خالق نے فرصت کے لمحے میں تخلیق کیا ہوگا۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے چہرہ آہستہ آہستہ گھمایا ہی تھا کہ مارشا ایئربیوں کا سازبجاتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور میرے چہرے پر نگاہ ڈالتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ خالدہ آسیہ گہری نگاہوں سے گھور رہی تھی... پھر مارشا نے گھوم کر اس سے ہاتھ ملایا اور بولی۔ "اگر اسے نئی وجاہت تم نے دی ہے تو میں تمہارے فن کو داد دیتی ہوں۔ پہلے لڑکیوں کے لیے خطرناک تھا، اب قاتل بن گیا ہے۔"

"شکریہ مس مارشا۔" خالدہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں چاہتی ہوں تم بھی اپنے چہرے کو ڈھال دے دو۔ تاکہ صنف کا انتقام لیا جا سکے۔ یہ لڑکیوں کو قتل کرے گا اور تم اسی حساب سے لڑکوں کو گھائل کرتی رہو گی۔"

مارشا نے استفسارانہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔ "ہاں مارشا! یہ تجربہ ضروری ہے، تیاری کر لو۔"

جوں ہی مارشا آئینے کے سامنے بیٹھی اور خالدہ لوشن تیار کرنے لگی۔ میں خاموشی سے نکل گیا، جو نیا کھیل شروع ہو رہا تھا، اس میں مادام سعدیہ کا مشن پس پردہ جانے والا تھا۔ گو اس نے الکرم کی مدد کرنے کی اجازت دے دی تھی، مگر اصل دقتے واری گروپ کا مفاد تھا، جسے میں ذہنی طور پر قبول کر چکا تھا۔ اس لیے میں نئی ... نمتے داریوں اور صورت حال سے مادام کو آگاہ کر دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا۔ ٹرانسمیٹر کا بٹن باہر نکال کر میں نے بٹن آن کیا، سرخ لفظ کوندنے لگا تھا، تین چار منٹ بعد سبز دائرہ روشن ہوا تو میں نے مادام کو کال کیا۔ "دن روشن ہے، پیارے۔" مادام کی بھرائی ہوئی آواز سیٹ سے ابھری اور میں نے کندھے اچکا دیے کیونکہ کوڈ نہ تو مجھے ہدایت دی گئی تھی اور نہ ہی دن روشن کا جوابی کوڈ میرے علم میں تھا۔

"ادھر تو موسم بے حد خراب ہے۔ مادام!" میں نے مجھک کر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"کون سلطان...؟" ادھر سے متاثر انداز میں پوچھا گیا۔ "اگر ہی تو رپورٹ شروع کر دو۔"

تب میں نے الکرم کی بابیانی، لیاؤش کی غداری اور اس کی تفصیل سے مادام کو بتا دیا۔ جب میں سانس لینے کو رکا تو اس نے پھنکار سنائی دی۔

"محترم سلطان! تم نے میرا ایک مضبوط بازو کاٹ دیا ہے۔ میں درد محسوس کر رہی ہے لیکن اس کا کٹ جانا ہی بہتر تھا، ورنہ سارے جسم میں زہر پھیل جاتا۔ حسام الدین پھر نراؤش دو ستونوں جو اندر سے کھوکھلے تھے، تم گرا چکے ہو، واپس چلے آؤ بیٹے میں گروپ کی اسکریپنگ کرنا چاہتی ہوں، صرف تم ہی ناکارہ اور زہر آلود حصے کاٹ سکتے ہو۔ ان دونوں نے مجھے جڑوں سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم پرانی عمارت مسمار کر کے خود نئی عمارت تعمیر کرو۔ میں تمہارے دماغ کو مقفل کر رہی ہوں، بولو کب آ رہے ہو؟"

"جب حکم ہو، مادام!" میں نے سعادت مندانہ آواز میں کہا۔ "لیکن یہاں الکرم کو میری ضرورت ہے، اسے بھی ایک آستین کے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ آزاد فوج کا کمانڈر انچیف غدار ثابت ہوا ہے، کچھ اہم راز اس کی سیکرٹری لے کر غائب ہے۔ مجھے الکرم نے لڑکی کو تلاش کرنے کا حکم دیا ہے... اگر وہ نکل گئی تو محاذ آزادی کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میرا دیرینہ ساتھی جنگ کی مخالف محاذ پر سرگرم عمل ہے۔ میں کچھ دنوں کی اجازت لے کر یہ کام نپٹانا چاہتا ہوں۔ مادام! دوسری رکاوٹ یہاں کی پولیس بھی ہے۔ میں ان کی نگاہوں میں آ چکا ہوں، رینا اور لیاؤش کی لاشیں مل چکی ہوں گی اور دونوں میرے گھاتے ہی میں ڈالے جائیں گے۔ اسی اسٹال سے اسی رات الکرم کا فرار بھی اسی سلسلے کی کڑی سمجھ لیا گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے فوج کی خفیہ قوت بھی مجھے تلاش کر رہی ہو گی۔ ان حالات میں میرا جزیرے سے نکلنا ناممکن تو نہیں، دشوار ضرور ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، تم الکرم کے لیے کام کرو۔" مادام نے کہا۔ "وہ تحریک ہمارے مشن سے کہیں زیادہ اہم اور مقدس ہے۔ بہرکیف میں گروپ کو فی الفور معطل کر رہی ہوں، جب تم آؤ گے تو تنظیم نو کا آغاز کیا جائے گا۔ میں غداروں اور مفاد پرستوں کے درمیان سکون سے نہیں رہ سکتی۔"

"شکریہ، مادام!" میں نے ممنونیت سے کہا۔ "ایک کام میں نے آپ کی اجازت کے بغیر کر ڈالا ہے، حسام الدین کی دست راست لیفٹیننٹ پولیس کی نگاہوں میں آ گئی ہے۔ وہ معصوم لڑکی اپنا بچاؤ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے حسام الدین سے حاصل ہونے والی رقم، اس کو دے کر اسے گھر واپس بھیج دیا ہے۔"

"تم آزاد اور خود مختار ہو میرے بیٹے۔" مادام کی تھکی تھکی آواز سنائی دی۔ "میری قنائیدار دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ایک بات، جو بحیثیت ماں مجھے زیب نہیں دیتی، مگر میں ایک ایسی ڈکھیاری اور بدنصیب ماں ہوں جو دل کا سکون اور گھر کی رونق گنوا چکی ہے، یہ کہ میری کل کائنات اور زندگی کا اثاثہ ہے، میں اسے خوش رکھنا چاہتی ہوں اور وہ مندناؤ سے بہت اداس آئی ہے۔ میں ماں کے ساتھ ساتھ ایک عورت بھی ہوں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اداسیوں کے دھوئیں میں جو عکس تیرتا دیکھا ہے، وہ تمہارا ہے، میں سفارش نہیں کر سکتی لیکن درخواست ضرور کروں گی، میری لیلیٰ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا، خدا حافظ بیٹے... خدا حافظ۔"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا، لیلیٰ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرنا چاہتا تھا... مگر مادام نے نہ جانے کیوں ایک دم ہی سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ میں نے ناک سے گہری سانس لی اور سیٹ آف کر کے واپس اوھر گیا۔ خالدہ برش سے مارشا کے بال رنگ رہی تھی۔ مارشا کے چہرے پر اخبار کا کاغذ چپکا دیا گیا تھا، خالدہ نے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا اور میں نے ہونٹ بھینچ کر زور سے پھونکی آواز نکالی۔

"میں شاک پروف ہوں، مسٹر محترم سلطان۔ اگر تم مجھے مشتعل کرنے کے لیے پھونک بھی دیتے تو میں اتنی ٹھنڈی رہتی۔ تمہاری ساتھی دس منٹ بعد تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔"

"اور میں دس منٹ یہاں تمہیں اشتعال دلانے کی کارروائیاں کرتا رہوں؟"

"ہاں... کوشش کرو۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

اس سے قبل کہ میں جھنجلاہٹ کا کوئی مظاہرہ کرتا، ٹیلی فون کی گھنٹی نے میرا بھرم رکھ لیا تھا، چونکہ وہ مصروف تھی، اس لیے... ریسیور میں نے اٹھا لیا۔ "فرمایئے۔" میں نے بھاری آواز میں کہا۔

"میڈم کو دیجیے، میں سیف الدین بول رہا ہوں، جلدی پلیز۔"

"مس آپ کا جنرل..." میں نے سیٹ اٹھا کر اس کے قریب رکھ دیا۔

"یس جنرل کیا بات ہے؟" خالدہ نے کہا اور پھر چونک پڑی۔ "کوئی بات نہیں جنرل! اچھا ہوا ورنہ یہ تکلیف دہ کام مجھے کرنا پڑتا، میں آ رہی ہوں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ "ابوداؤد نے دیوار سے سر ٹکرا کر خودکشی کر لی ہے۔"

"شاید اس کے لیے دوسرا کوئی راہ تھی بھی نہیں۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"مس مارشا!" خالدہ کا گل رنگ چہرہ خبر سنتے ہی خزاں زدہ ہو گیا تھا۔ "دس منٹ تک کا غذ ہٹانا، میں نیچے تہ خانے میں جا رہی ہوں، ابوداؤد نے ہمارے لیے خطرناک مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ وہ اس شہر کا ایک معتبر اور بااثر تاجر بھی تھا، اس کی لاش ایک سنگین مسئلہ بن گئی ہے۔"

"تمہارے لیے، مس خالدہ؟" میں تحیر زدہ آواز میں پوچھا۔

"نہیں مس، کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"اوہ... تم نہیں جانتے، مسٹر محترم سلطان!" وہ مترددآواز میں بولی۔ "موت کا تجار..."

"قتل..." میں نے کہا اور خالدہ جاتے جاتے تیزی سے پلٹی۔ "اسے رات کے اندھیرے میں کسی بھی جگہ ڈالا جا سکتا ہے، وہ شہری تھا، بڑا تاجر تھا، ایسے لوگوں کے دشمن بھی ہوتے ہیں۔"

"شکریہ محترم سلطان!" وہ خجل سے لہجے میں بولی۔ "میں واقعی ناکارہ ہو گئی ہوں، مجھ سے اگر یہ دو چھین لیا گیا ہے تو بے جا نہیں ہوا۔ تم نے چٹکی میں اتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔" وہ گردن ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

چند منٹ گہرا سکوت طاری رہا تھا، میرا خیال تھا کہ مارشا اس حالت میں بولنے کی پوزیشن میں نہیں ہوگی اور شاید مارشا اس لیے خاموش رہی ہوگی کہ اس کو معلوم نہیں تھا، خالدہ... کمرے سے باہر جا چکی ہے۔ "کوئی ہے؟" مارشا بولی۔

"کیوں گھبرانے لگی ہو؟" میں نے جواب دیا۔ "میں تمہارے قریب ہوں۔"

"اچھا، یہ بتاؤ یہ لڑکی کیا شے ہے؟ میک اپ گرل تو نہیں شاید..."

"یہ بہت بڑی اور خوفناک شے ہے، مارشی!" میں نے بتایا۔ "اتنی عجیب شے، میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ آزاد آرمی انٹیلی جنس کی سربراہ ہے۔"

"اوہ... اس کے علاوہ...؟" مارشا بولی۔ "تعجب کیسی لگی ہے؟"

"متاثر کر گئی ہے، مارشی!" میں نے گہری سانس لے کر سچ اگل دیا۔

"آہا..." وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "تمہارے اندر بھی گداز پیدا ہونے لگا ہے، پتھر کے انسان؟"

"طنز کر رہی ہو، مارشی جان!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں، بلکہ... چھوڑو۔" وہ بولتے بولتے بات بدل گئی۔ "یہ بتاؤ، یہ بناؤ سنگھار کیوں ہو رہا ہے؟"

"شکار، مارشی..."

"گڈ..." وہ چہکی۔ "گوتم بھی ساتھ ہوگا؟"

"فی الحال ہم دونوں جھاڑیاں جھانٹنے جائیں گے۔ اگر شکار مل گیا تو شاید گوتم کی ضرورت پڑ جائے۔"

"شکار کس قسم کا...؟"

"ایک خوب صورت ہرنی، محاذِ آزادی کے کچھ راز لے گئی ہے۔"

"لیکن میں اُسے کیسے تلاش کروں گی؟"

"جس طرح المکرم کو تلاش کر چکی ہو۔" مارشا تفہیمی انداز میں سر کو ہلا کر رہ گئی۔

میری ہدایت پر خالدہ نے ابو داؤد کی سیکرٹری کا آفس دکھایا، کانفرنس روم میں ہی پائیشن کر کے سیکرٹری کے لیے کیبن بنا دیا گیا تھا، مارشا بھی کی مانند ٹرے، فائلیں، کرسی اور کاغذات سنوٹھتی پھر رہی تھی۔ پھر دراز سے اُس نے ایک میلا سا رومال نکال لیا، جو سُرخ دھبوں سے بھرا ہوا تھا، یقیناً وہ لڑکی ہوتوں کی سُرخی صاف کرتی رہی ہوگی۔ مارشا نے رومال اپنے بلاؤز کے گریبان میں رکھ لیا۔ مجھے اعشاریہ تین ایٹھ کا آٹومیٹک ریوالور دیا گیا تھا، جس سے حسبِ خواہش گولیاں اور ایٹمی شعاعیں فائر کی جا سکتی تھیں۔ خالدہ نے طریقۂ استعمال عملی طور پر سمجھا دیا تھا۔ اس میں ایک میگزین اور ایک سُوب مشین گن ہوئی تھی۔

وہ سمپر بڑی روشن تھی اور ساحل کی طرف سے آنے والی نم آلود ہوائیں میرے جسم پر خوش گوار تاثر چھوڑ رہی تھیں۔ دفاتر کے لوگ اِدھر اُدھر آ، جا رہے تھے۔ طالبات کا ایک خوش لباس ڈار چہلیں کرتا ہوا فٹ پاتھ پر رواں تھا۔ اُن سے تھوڑے فاصلے پر پیچھے نوخیز لڑکوں کی ٹولی آ رہی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا، جب میرے جسم پر بھی یونیفارم اور ہاتھوں میں کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ ہم بھی گولیوں کی شکل میں لمبا چگر کاٹ کر لڑکیوں کے کالج کے سامنے سے گزرا کرتے تھے۔ کتنے ہی شاداب چہرے میری نگاہوں میں بسے ہوئے تھے۔ "دائیں موڑ لو۔" مارشا کی آواز سُنائی دی اور میں ماضی کی حسین وادیوں سے نکل آیا۔ آگے چوک تھا۔ دائیں ہاتھ ایک پتلی سی سڑک دو رویہ درختوں کو چیرتی جا رہی تھی۔

"یہ سڑک بدھ مذہب کی خانقاہ کے لیے مخصوص ہے۔"

ڈرائیور نے چوک میں بریک لگاتے ہوئے بتایا۔ "آگے کرنا پٹا ہوا ساحل ہے۔"

"ہمیں اُدھر ہی جانا ہے۔" مارشا تحکمانہ آواز میں بولی۔

"چلو بڑھاؤ گاڑی۔" مارشا کھڑکی سے چہرہ باہر نکالے فضا سونگھ رہی تھی۔ سڑک مخروطی ناگن کی طرح بل کھاتی، قد آور درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کے نیچے سے پیچھے جا رہی تھی۔ درختوں نے سورج کی گرم اور روشن کرنوں کو روک رکھا تھا۔ اس لیے ٹھنڈی اور سنگلجے سے اندھیرے کا احساس ہونے لگا تھا۔ تنگ اور پیچ دار سڑک پر کاروں کی رفتار سے رینگ رہی تھی۔ "عبدالجبار۔" مارشا نے چہرہ اندر کر کے ڈرائیور کے شانے پر تھپکی دی۔ "کیا ہم خانقاہ میں داخل ہو سکتے ہیں؟"

"میں نہیں جانتا مس۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "میں صرف مسجد میں داخل ہونے کے بارے میں جانتا ہوں۔"

"ہم اپنی معلومات کے لیے بدھ مذہب کی عبادت گاہ اور طریقۂ عبادت دیکھنا چاہتے ہیں۔" اس سے قبل کہ عبدالجبار کوئی جواب دیتا، خطرناک موڑ مڑتے ہی خانقاہ کا گیٹ سامنے آ گیا۔ سڑک مڑتی ہوئی گیٹ سے اندر جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے آہستگی سے کار روک لی اور پلٹ کر دیکھنے لگا۔ "ہم اندر جائیں گے، عبدالجبار۔" مارشا قطعیت سے بولی اور دروازہ کھول کر باہر رینگ گئی۔ دوسرے دروازے سے میں بھی نکل گیا تھا... عبدالجبار نے اپنا سر اسٹیئرنگ وہیل پر رکھ لیا تھا۔

"کیا وہ اندر ہے؟" میں نے گھوم کر قریب جاتے ہی پوچھا۔

"ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔" مارشا بدستور ہواؤں کو سونگھتی ہوئی بڑبڑائی۔ "اگر نہیں تو ابھی ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے نکل گئی ہے، فضا میں اُس کی خوشبو تیر رہی ہے۔" وہ باتیں کرتی ہوئی بند گیٹ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ سنگی سیڑھیوں پر دو بھکشو بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، مارشا نے لوہے کے گیٹ کو تھپتھپایا تو دونوں نے چونک کر دیکھا، مارشا نے ایسا اشارا کیا، جسے میں تو سلام ہی سمجھا تھا۔ ایک طویل قامت بھکشو... سیڑھیاں پھلانگتا ہوا ہماری طرف آ گیا۔ "شام کا سلام، مقدس راہب۔" مارشا نے گردن جھکا کر کہا۔ "ہم غیر ملکی سیاح ہیں، ہمارا تعلق صحافت سے ہے، ہم آپ کی مقدس عبادت گاہ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"بصد شوق، خاتونِ محترم!" سفید فام بھکشو نے بھی گردن کو خم دے کر جواب میں کہا۔ "آپ کو زحمت تو ہوگی... لیکن

مقدس لامہ کی اجازت ضروری ہے۔"

"اوہ..." مارشا ہلک کر بولی۔ "شکریہ، مقدس راہب! آپ بے شک اپنے مذہب کی طرح نرم اور مہربان ہیں، ہم اجازت تک انتظار کر لیں گے، براہ کرم ہماری درخواست مقدس لامہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔"

"تشریف لائیے۔" بھکشو نے گیٹ کھول کر کہا اور ایک طرف باادب کھڑا ہو گیا۔

وہ ایک گول کمرے میں ہمیں چھوڑ کر اجازت لینے چلا گیا۔ میں تو خالی کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا تھا لیکن مارشا چٹائی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی تھی۔ "تمہیں شاید نہیں معلوم محترم۔" وہ بولی۔ "میں اس عمل کے دوران نڈھال سی ہو جاتی ہوں، جیسے بے شمار ٹھون کے قطرے سانسوں کے ساتھ ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہوں؟"

میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

جب بھکشو واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک خوش رُو نوجوان راہبہ بھی تھی، جس نے سر اور ناک تک چہرہ جالی دار نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اُس کی سیاہ روشن آنکھوں اور شفاف پیشانی سے عمر اور سُن کا اندازہ لگایا تھا۔ وہ دونوں سفید فام تھے اور امریکن بھیجوں میں بولتے تھے۔ لڑکی نے جھک کر مارشا سے مصافحہ کیا اور پھر میری جانب گھوم کر کورنش بجا سلام کیا۔ "میں مقدس لامہ کی فرستادہ ہوں۔" راہبہ نے ترنم آواز میں بتایا۔ "وہ اس وقت استراحت فرما رہے ہیں۔ اگر آپ عبادت گاہ دیکھنا چاہیں تو تشریف لائیے۔ البتہ مقدس لامہ کی زیارت شام پانچ بجے ہو سکے گی۔"

"کیا وہ تنہا ہیں؟" مارشا نے پوچھا اور لڑکی نے چونک کر بھکشو کی جانب دیکھا۔ "نہیں خاتون۔" بھکشو نے نفی میں سر ہلایا۔ "اُن کے ساتھ کچھ مہمان بھی ہیں۔"

راہبہ مارشا کا ہاتھ پکڑے میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ دونوں ہولے ہولے باتیں بھی کر رہی تھیں۔ جب سیڑھیاں طے کر کے ہم پہلی راہ داری میں داخل ہوئے تو نوجوان اور مہ جبیں لڑکی نے استقبال کیا تھا۔ بڑی تیز مہک تھی، جیسے قریب ہی کہیں سے آ رہی تھی۔ آگے بڑھے تو رات کا سماں لگا، بائیں جانب کمرے تھے، سارے کے سارے۔ بند راہ داری میں بھی کوئی روزن نہ تھا، روشنی کے لیے طاقچوں میں جھلملاتے شعلوں والے چراغ روشن تھے۔ راہ داری اتنی تنگ تھی کہ مارشا اور راہبہ کے گزرنے سے اُن کے لباس کی سرسراہٹوں سے چراغوں کی لو تھرتھرانے لگتی تھی۔ چکراتی راہ داری سے گزرتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم گولائی میں سفر کر رہے ہیں۔ چلتے چلتے بالآخر ایک کھلے ہال میں داخل ہوئے، غالباً وہ عبادت گاہ کا شو رُوم تھا۔ پتھر اور چاندی کے بنے ہوئے بے شمار چھوٹے بڑے بُت شعلوں کی روشنی میں چمک رہے تھے، دیواروں پر ہیبت ناک چہروں والے نقاب آویزاں تھے۔ ایک قطار میں بڑے بڑے اژدہوں، پرندوں اور درندوں کے مصنوعی چہرے مُنہ کھولے ہوئے تھے۔ وہ منظر کچھ اتنا ڈراؤنا اور بھیانک تھا کہ مارشا... ایک دم راہبہ سے کٹ کر میرے پہلو میں آن لگی تھی۔ راہبہ نے رُک کر ایک محرابی دروازے کی جانب دیکھا، جس پر سُرخ ریشمی پردہ ہوا نہ ہونے کے باوجود سرسرا رہا تھا۔ "براہ کرم جوتے اتار دیں۔" راہبہ بولی۔

معاً سُرخ پردے میں جنبش ہوئی اور ایک دیو ہیکل شخص نمودار ہوا۔ راہبہ بڑبڑاتی ہوئی رکوع میں چلی گئی تھی۔ اُس کے بدن پر گیروے رنگ کی چادر تھی، ایک بازو چھوڑ کر سارا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ چراغوں کی روشنی میں اُس کا گٹھا ہوا سر انڈے کی طرح چمک رہا تھا اور اُس کے نرم چہرے پر گول گول سُرخ آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ "خوش آمدید پیارے بچو!" اُس کی آواز میں حلاوت کے باوجود کوئی ایسی بات تھی کہ میرا جسم جھرجھرا سا گیا تھا۔ "ناقوتی... بچوں کو سکون گاہ میں لے چلو۔" اُس نے پردہ چھوڑا اور اوجھل ہو گیا۔

راہبہ رکوع سے سیدھی ہوئی تو اُس کی آنکھوں میں خوف کے سائے تیر رہے تھے۔ اُس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے آہستہ آہستہ چہرہ گھما کر اِدھر دیکھا، جدھر وہ پُراسرار شخص غائب ہوا تھا، پھر اُس نے ایک قدم بڑھا کر پردہ ہٹا کر اندر دیکھا۔ "یہ... یہ... تمہاری کون ہے؟" اُس نے لرزیدہ سی سرگوشی میں مارشا کی جانب اشارا کیا۔

"یہ میری بہن ہے۔" میں نے جواب دیا اور اُسی لمحے میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ "کیوں خاتونِ محترم؟"

"انکار کر دو... واپس نکل جاؤ۔" وہ سرگوشیانہ انداز میں بولنے لگی۔ "جو لڑکی ایک دفعہ سکون گاہ میں داخل ہو جاتی ہے، وہ پھر کبھی واپس نہیں نکل سکتی، وہ سکون گاہ نہیں شیر کی کچھار ہے۔ ایک لڑکی کل سکون گاہ میں داخل کی گئی تھی۔ آج اُسے بہا دیو کے سامنے جب لے جایا جانے لگا تو اُس کا سر بالوں اور ذہن عقل سے خالی ہو گیا۔ جاؤ بھلے لوگو، اب تک تم آزاد ہو، سکون گھر سے باہر کوئی کسی پر جبر نہیں کر سکتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا تم اُس کی محسوس کر رہی ہو؟" میں نے مارشا سے پوچھا اور مارشا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "تم خوف زدہ تو نہیں؟" مارشا نے کہا۔

"نہیں... میرے ارد گرد جیسے بھوت سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ آؤ واپس چلیں۔ باقی کام ہمارا نہیں۔"

"نہیں جان۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں انکار کر دیا۔ "ہم وہاں جائیں گے خطرے کی صورت میں ہمارا فوراً ریموٹ دھر خبر کر دے گا۔ یہ ایک مہذب اور آزاد ملک کی خانقاہ ہے۔ آؤ چلیں۔"

"سنو..." راہبہ میرے کان میں بولی۔ "تم... تم... اُس لڑکی کے لیے آئے ہو نا؟"

"ناتوئی..." میں نے انجام سے لاپروا ہو کر راہبہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ اُچھل کر دُور ہو گئی۔ "سنو نیک دل لڑکی! ہم ہر اُس لڑکی کے نجات دہندہ ہیں، جو ظلم و ستم کی وادی میں سلامتی کے راستوں کی متلاشی ہو۔ ہم امن اور سلامتی کے پیامبر ہیں۔ ہمیں وہاں لے چلو اور ہم جب واپسی کے لیے رستہ بنائیں گے تو تم... ہمارے ساتھ ہو گی۔"

"بے شک۔" اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں پہلی ہی نظر میں تمھیں پہچان گئی تھی کہ تم ہی وہ ہو جو بہاڑوں سے رہ بناتا ہے۔ میں نے تمھاری پیشانی پر روشنی کی لکیر دیکھ لی ہے۔"

"کیا وہ شخص ہی مہاگرو تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں..." ناتوئی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ "وہ نائب ہے، مہاشرے۔"

پھر گولائی میں سفر شروع ہو گیا تھا۔ ناتوئی آگے آگے تھی اور مارشا کسی ڈری ہوئی بچی کی طرح میرے پہلو میں چل رہی تھی۔ کئی غلام گردشوں سے ہوتے ہوئے ہم ایک منقش دروازے پر جا رُکے۔ دروازے کی بائیں جانب چھوٹے چھوٹے نیزے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ ایسے ہی جیسے معزز مہمان کی آمد پر استقبالیہ گیٹ پر نیزوں پر رنگ برنگی جھنڈیاں لگایا کرتے ہیں۔ تمام نیزوں کی انیوں پر ایک سفید رومال ٹنگا ہوا تھا۔ ناتوئی نے دو رومال نوچے اور ایک ایک رومال ہمیں دے دیا۔ "اگر مہاگرو اس وقت اندر ہوئے تو تم اُن کی خدمت میں بطور نذرانہ اور پیغام آشتی رومال پیش کرو گے، یہ یہاں کا دستور ہے۔ اگر تم اپنی توانائی اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو تو مہاگرو سے آنکھیں نہ ملانا اور نہ ہی کچھ نوش کرنا۔" ناتوئی بے حد مدھم آواز میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اُس نے لکڑی کا ایک ہتھوڑا اُٹھایا اور دروازے کی پیشانی پر لگی پیتل کی پلیٹ پر مار دیا۔ تیسری چوٹ پر دروازہ کھل گیا اور ناتوئی مؤدب سی ہو کر ایک طرف ہو گئی۔ میری نگاہیں کھلے دروازے پر لگی ہوئی قیمتی دروازے کے اندر بھی ایک دروازہ تھا، جس پر مہاتما بدھ کی شبیہہ پرنٹ تھی۔ "اندر چلے جاؤ۔" ناتوئی نے بالکل اجنبی سی آواز میں کہا۔

میں سورۃ فاتح پڑھتا ہوا دھڑکتا ہوا دل اندر داخل ہو گیا۔ پردہ ہٹاتے ہی لحظہ بھر کے لیے میرا دل اُٹھا ہوا قدم ٹھٹک سا گیا تھا۔ سامنے شیر منہ کھولے کھڑا تھا لیکن وہ زندہ شیر نہیں تھا، بلکہ دھات کا مجسمہ تھا لیکن اصل اور نقل میں تمیز کرنا آسان نہ تھا۔ مجسمے کی پشت پر مہاتما بدھ کا سنہرا بت سوار تھا۔ مہاخاموش اور ساکت فضا قافلوں کی دھمک سے لرزنے لگی۔ بے حد ہلکی سی دھمک دار آواز تھی جیسے کوئی ہماری آمد کی خبر مہاگرو تک پہنچا رہا ہو۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی، جو کمرے کے وسط میں جھکی نقارے پر تواتر سے ضربیں لگا رہی تھی۔ ہم جونہی نزدیک ہوئے اُس نے مسکراتی نگاہوں کا اشارہ کیا۔ ہم آگے بڑھتے چلے گئے اور محرابی دروازے میں داخل ہو گئے... وہ ایک وسیع و عریض ہال تھا جس کی عقبی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ باہر سے گلابی پردے ہلکے سے لہرا رہے تھے اور گاہے گاہے سورج کی کرنیں بھی پردوں سے چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ فرش پر سُرخ مُنڈھے قالین بچھا ہوا تھا اور مغربی کونے میں عود دانوں سے لوبان کا خوشبو دار دھواں پل کھاتا اُٹھ رہا تھا اور اُس دھوئیں کے حصار میں نیچے چبوترے پر ایک دبلا پتلا تنگ دھڑنگ شخص دو زانو بیٹھا ہوا تھا اور اُس کی پشت پر دو چوٹی چوٹی پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ گوتم بدھ کا نقرئی مجسمہ یہ گمان تھا جیسے اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں یہ سب بغور اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ پیلے تانبے جیسا تھا اور جبڑوں کی ہڈیاں نمایاں تھیں۔ پھر جونہی اُس کے پپوٹوں میں ہلکی سی سرسراہٹ اُبھری میں نے اپنی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا... اُسی وقت میری سماعت سے سانپ کی باریک سیٹی سے مشابہ آواز ٹکرائی۔ "خوش آمدید معزز مہمانو! خدا تم پر اپنی نعمتیں نازل کرے۔"

"ہم دُعا کے دُکھوں میں جیتے ہوئے بندے ہیں محترم بزرگ۔" میں نے گوتم بدھ پر روشن آنکھوں پر نگاہیں جما کر کہا۔ "ہمیں سکون کی تلاش ہے، ایسا سکون جیسے مہاتما بدھ نے گیا کے مقام پر حاصل کیا تھا۔"

"سکون اپنے ہی من میں ہے۔" اُس کی باریک جھنکاتی آواز اُبھری۔ "مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دو گرم اور نوکیلے ہوئے میرے ذہن کو چھید رہے ہوں۔ من میں ڈوب جاؤ، کبھی نہ اُبھرنے کے لیے، سکون... وہ بولنے سے ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ زبان کھولنا ہی عمل کی ابتدا ہوتی ہے اور دُنیا میں جو عمل کرو گے، وہ آخرت کا پھل ہو گا۔"

"دُنیا کی ہوس سے نجات کیسے ممکن ہے محترم؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے اندر بچے کی فطرت پیدا کرو۔ طمع و حرص سے نجات پاؤ گے۔" اُس نے منتاقی آواز میں کہا۔ "مہاتما نے کھلی آنکھوں سے اس دُنیا کو دیکھا تھا، تم بھی آنکھیں، ہاں من کی آنکھیں کھول دو، قدم قدم پر عبرت اور سچائی پاؤ گے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ بچے کے اندر فطرت موجود ہوتی ہے، جو دُنیاوی طمع و حرص سے پاک اور بے نیاز ہوتی ہے۔ بس، بچہ بن جاؤ، سکون میں داخل ہو جاؤ گے۔"

"کیا دُنیا میں رہ کر بدی اور ظالموں سے مقابلہ کرنا جائز نہیں؟" میں نے وقت گزاری کا فیصلہ کرتے ہوئے، اس درویش سے... سلسلۂ کلام کو طول دیتے ہوئے پوچھ لیا۔

"کیا تم مسلم ہو؟"

"جی ہاں محترم..."

"بے شک تیرا دین، دُنیا اور دین کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔" اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن مہاتما بدھ کا عقیدہ ہے کہ جڑ کو کاٹ دو تاکہ ایک کانٹا ہر روز نہ چبھنا پڑے۔ کڑوا دُھواں گیلی لکڑیوں سے نکلتا ہے اور لکڑی آگ میں جلتی ہے، دُھواں ختم کرنے کے لیے اگر آگ بجھا دی جائے تو اس سے بہتر ہو گا کہ دُھوئیں سے نجات حاصل کرنے کے لیے بار بار آنکھیں بند کریں۔"

ٹرالی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ دائیں سمت سے سنائی دی۔ میں نے گردن موڑی۔ ایک خوب رُو لڑکی جو غلافوں کے روایتی لبادے میں ملبوس تھی، ٹرالی دھکیلتی ہوئی بغلی دروازے سے نمودار ہوئی۔ اُس نے بھوری دراز زُلفیں سیاہ اسکارف میں اُڑس رکھی تھیں، مارشا نے میرے پہلو میں کہنی کا ٹھوکا دیا اور سسکی سی لینے کے انداز میں جھرجھری لیتے ہوئے بولنے لگی ہے۔"

"مہاگرو..." لڑکی، ٹرالی قریب روک کر عقیدت مندانہ آواز میں بولی۔ "کاہنہ نے مہمانوں کے لیے شربت بھیجا ہے۔" مہاگرو نے ہاتھ اُٹھا کر اجازت دے دی۔

"مہاگرو..." اچانک مارشا نے میرے پہلو سے نکل کر کہا۔ "میں خانقاہ میں آزادانہ پھرنا چاہتی ہوں، میری بہن میرے ساتھ ہو گی۔" اس سے قبل کہ مہاگرو کوئی ردِعمل ظاہر کرتا، مارشا نے لپک کر لڑکی کا ہاتھ تھام لیا اور جھک کر باتیں کرنے لگی۔

"شربت پی کر تم جہاں چاہو گی، تمھیں پہنچا دیا جائے گا۔" مہاگرو کی سرد آواز اُبھری۔

"مجھے معذرت کرتے افسوس نہیں ہو گا، مہاگرو۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "کیونکہ آپ دینِ حق کے پرستار ہیں، ہم روزے سے ہیں۔"

"اُف..." مہاگرو کی غراہٹ سنائی دی۔ "مہاشرے تک ان کو پہنچا دیا جائے۔"

"مہاشرے حاضر ہے، مہاگرو۔" وہی دیوہیکل شخص ایک محرابی کھڑکی نما دروازے سے داخل ہوتا ہوا جھک گیا۔

"سکون کے تلاشیوں کو سکون گاہ دکھا دو، مہاشرے۔" مہاگرو نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔ "کل کی تقریب میں ان دونوں کو ابدی سکون کے راستے پر ڈال دیا جائے گا۔"

"میرے ساتھ آؤ، معزز مہمانوں۔" مہاشرے کا لہجہ ایک دم مہربان ہو گیا تھا۔ "مہاتما نے تمھیں درست سمت دکھائی ہے۔" مارشا نے اُس لڑکی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور وہ تذبذب کے عالم میں چپ چاپ کھڑی تھی۔ مہاشرے اُسی دروازے کی جانب بڑھا تھا، جدھر سے لڑکی ٹرالی کے ساتھ آئی تھی۔

دروازے سے نکل کر پھر ایک تنگ اور نیم تاریک راہ داری میں وہی دائرے کا سفر کرنا پڑا تھا۔ خانقاہ غالباً فٹ بال کی طرح گول تھی۔ مہاشرے نے ایک دروازے کے سامنے رُک کر بظاہر تعظیماً ہی گردن جھکا کر ہمیں پہلے داخل ہونے کا اشارہ کیا تھا۔ ڈرنے، ٹھٹکنے کا وہاں سوال ہوتا ہے، جہاں انسان کسی انہونی سے خوف زدہ ہوتا ہے، جو مرا جانتا ہو اُس کے اندر سے چونکا نہیں نکل جاتی۔ میں جو ہو گا، سو ہو گا کا فیصلہ کر کے ہی سکون گاہ کی طرف چلا تھا... اگر ڈرنا اور پلٹنا ہوتا تو راہبہ کی وارننگ سن کر لوٹ جاتا۔ میں، مارشا کو لے کر اندر داخل ہو گیا، اندر کا منظر دیکھ کر جو جھٹکا محسوس ہوا تھا، اُسے میں خوف کا نام نہیں دوں گا، وہ حیرت و استعجاب کا فطری جھٹکا تھا۔ خانقاہ اور جدید ترین فرنیچر سے آراستہ آفس، بات تو حیرت کی تھی، بڑی آبنوسی میز کے پیچھے محرابی پشت والی کرسی موجود تھی اور دیواروں کے ساتھ دائرے میں دیدہ زیب صوفے تھے۔ میز پر وہ ٹیلی فون سیٹ سنگِ مرمر کا قلم دان، پن کشن اور دیگر دفتری ضروریات کی اشیا قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔

مہاشرے نے اندر داخل ہو کر پاؤں سے دروازہ بند کیا اور ٹہلتا ہوا کرسی تک گیا۔ وہ لڑکی اندر نہیں آئی تھی۔ میں کچھ ذہنی طور پر پریشان ہو گیا تھا۔ اگر وہ ہمیں باتوں میں اُلجھا کر اُسے یہاں سے نکال دیتا تو پھر سارے جزیرے کی خاک چھاننا پڑتی، لیکن مجھے تو اس اُونٹ کو دیکھنا تھا کہ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ آخر وہ بیٹھ ہی گیا اور بیٹھتے ہی کہنیاں میز پر ٹکا کر تیز دھار لہجے میں بولا۔ "اب تم بتاؤ گے اور خوب سوچ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب دو گے، البوریحان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" اگر میں ذہنی طور پر ضرب سہنے کے لیے تیار نہ ہوتا تو ابو دجان کا حوالہ مجھے جھنجھوڑ دیتا مگر میں فرسٹریشڈ اَمنس دیکھ کر ہی بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ . . . جن لوگوں نے المکرم کو مجاہدین کی نگاہوں سے بچانے کے لیے ہسپتال جیسی عوامی جگہ کا انتخاب کیا تھا، انھوں نے اگر ابو داؤد کی سیکرٹری کے لیے خانقاہ جیسی پُرسکون جگہ مقرر کرلی تھی تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ وہ مجاہدین کی سرگرمیوں اور حکمتِ عملی سے اتنے ہی خوف زدہ تھے کہ قیمتی شے ایسے ہی کونوں کھدروں میں چھپا سکتے تھے۔

"جو مہمان اور میزبان کے درمیان تعلق ہوتا ہے محترم" میں نے نرم اور متبسم لہجے میں جواب دیا۔

"اور اُس نے اپنے مہمانوں کو خانقاہ میں بھیج دیا؟" وہ چاچا کریولا نہ کیوں کوئی قابلِ دید جگہ اور نہ تھی۔"

"یہ فیصلہ کسی نے بھی نہیں کیا تھا" میں بولا۔ "ہم صحافی علاقے سے نکلے تھے۔ شاید ڈرائیور نے شارٹ کٹ مارنا چاہا ہوگا جب یہاں سڑک بند ہوگئی تو ہم نے سوچا خانقاہ ہی دیکھتے جائیے!"

"حالانکہ . . ." وہ طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ "ڈرائیور یہیں کا باشندہ ہے اور پانچ برس سے البوریحان کی خدمت میں ہے۔"

اس سوال کا جواب وہی دے سکتا ہے۔" میں کندھے اُچکا کر کہا۔ "ویسے محترم راہب آپ کو اعتراض کیا ہے۔ یہ مقدس جگہ ہے، کیا دوسرے لوگ یہاں داخل نہیں ہو سکتے؟"

"لوگ . . ." وہ ہنس پڑا۔ "ان لوگوں کے لیے اللہ کے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں لیکن تم، لوگ نہیں ہو۔"

"پھر کون ہیں؟"

"یہی تو معلوم کر رہا ہوں۔"

"ہم جو ہیں، بتا دیا ہے۔" میں نے اکھڑی آواز میں کہا۔ "آپ اپنی تسلی کرلیں۔"

"سنو نوجوان . . ." وہ ایک دم بھڑک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر مجھے یقین ہوتا کہ تمہارا تعلق صرف البوریحان سے ہے، تو فیصلہ ہو چکا ہوتا . . . لیکن میں اُلجھ گیا ہوں کہ تمہیں خانقاہ میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ وہ کون ہے، جس نے تمہیں ادھر کا راستہ بتایا ہے؟"

اُس کی باتوں سے اچانک میرے اندر ایک نئے خیال کا پتا خ پھوٹ پڑا۔ اُس کی اُلجھن البوریحان نہیں بلکہ غدار ابو داؤد کی ذات تھی۔ خانقاہ کا حوالہ صرف ابو داؤد ہی دے سکتا تھا۔ شاید اُسی نے اپنی سیکرٹری مرجانہ کو اِدھر بھیجا تھا۔ . . میں لحظہ بھر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر مسکراہٹ میرے چہرے پر پھیل گئی۔ "ہماری امانت کہاں ہے، مقدس راہب میری بات سُن کر اُس کا تناؤ ٹوٹنے لگا تھا، وہ چند لمحے دانتوں پر دانت جمائے، مجھے گھورتا رہا . . پھر ایک طویل سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ابو داؤد کہاں ہے؟"

"اُسے حراست میں لے لیا گیا ہے۔" میں نے دُکھ بھرے انداز میں بتایا۔ "اگر ہم نے دانش مندی سے کام نہ لیا ہوتا تو شاید یہاں ہوتے۔ ڈرائیور اندر کے حالات سے لاعلم تھا جب ہم نے باہر بدلتے دیکھا تو باہر نکل کر ڈرائیور کو ساتھ لے لیا۔"

"یہ تو بہت بُری خبر سنائی آپ نے۔" اُس کا چہرہ لٹک گیا۔ پھر اُس نے سرخ ٹیلی فون سیٹ قریب کیا اور نمبر ڈائل کرنے کھڑی ہتھیلی سے اُس نے تین بار سلسلہ منقطع کرنے کے بعد دوسرے شارٹ رینج کا چھوٹا ٹرانسمیٹر سیٹ نکال لیا۔ سیٹ پر اُس کا رابطہ فوراً ہی مل گیا تھا۔ "مہاشرے ہوں جناب۔ ایک کی تصدیق کرنا تھی۔ میرے پاس ابو داؤد کے بارے میں ایک بُری خبر ہے۔ وہ حراست میں لے لیا گیا ہے۔"

"کب اور کہاں؟" ٹرانسمیٹر سے دہاڑ اُبھری، مہاشرے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"مجھے افسوس ہے، جناب۔" میں چہرے پر مغمومیت طاری کرتے ہوئے بولا۔ "وہ ایک سُرخ عمارت ہے۔"

"خبر لانے والا ابھی نہیں جانتا، جناب۔" مہاشرے نے بتایا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"اُسے میرے پاس لے آؤ، جلدی . . ." اُدھر سے کہا گیا۔ "یہ سچ ہے، تو سارا کھیل ہی بدلنا پڑے گا۔"

"میں آرہا ہوں جناب۔" مہاشرے نے جواب دیا اور رابطہ آف کرکے دراز میں رکھ دیا۔ "چلو نوجوان، تمہیں ایریا کمانڈر کے روبرو بیان دینا ہوگا۔"

"آپ نے میری آمد کا مقصد تو پوچھا ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے ابو داؤد نے پیشگی ہدایت کی تھی کہ بُری صورت میں خانقاہ سے رابطہ قائم کرکے، وہاں سے مرجانہ کو ٹالے جانا۔"

"اوہ . . ." وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔ "یہ اُس کا باہر نکلنا بھی خفیہ ہوگا۔ البوریحان کے جاسوس اُسے تلاش کر رہے ہوں گے۔"

"اور اگر ابو داؤد نے زبان کھول دی، تب . . .؟"

"ٹھہرو۔ میں اُسے بُلا لیتا ہوں۔" اُس نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ دُور کہیں گھنٹی بجنے لگی تھی۔ ایک گبرو جھکھو اندر آیا۔

پہلے رکوع میں گیا، پھر سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ "نئی لڑکی کو اندر بھیج دو۔" مہاشرے بھرائی آواز میں بولا۔

تین چار منٹ بعد وہ اندر داخل ہوئی اور میں نے مارشا سے مدد تصدیق کے لیے سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے، مارشی؟" مارشا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"مس مرجانہ . . . کیا تم اِن کو پہچانتی ہو؟" لڑکی نے ہماری جانب دیکھا اور نفی میں سر ہلانے لگی۔

"ہم کل رات دارالحکومت سے آئے ہیں، جناب . . ." میں نے بتایا۔

"تمہارا باس گرفتار کر لیا گیا ہے۔" مہاشرے نے بتایا اور مرجانہ کی چیخ بڑی دلدوز ہوئی، مگر اُس نے ہتھیلی سے مُنھ فوراً ہی بند کر لیا تھا۔ "کیا وہ جانتا تھا کہ تم کہاں ہوگی؟"

"م . . . مجھے . . . تن . . . نہیں معلوم۔" وہ خواب ناک لہجے میں بڑبڑانے لگی۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم . . . اُس نے مجھے میسجر رائس کے حوالے کر دیا تھا۔"

"بریف کیس کہاں ہے؟"

"میرے کمرے میں . . ." مرجانہ سسک کر بولی۔ "باس نے مجھے حکم دیا تھا کہ دوسرے حکم تک بریف کیس کسی کے حوالے نہ کرنا، وہ ہائی کمان سے کوئی معاہدہ کرنے والا تھا، معاہدے کے بعد بریف کیس ہائی کمان کے حوالے کرنا تھا۔"

"لیکن اب صورت بدل چکی ہے، مس مرجانہ۔" مہاشرے غرایا۔ "وہ لوگ اُسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیں گے، پھر نہ تم رہو گی نہ بریف کیس۔ لہٰذا بریف کیس میرے حوالے کر دو۔ اس کے عوض ہائی کمان تمہیں تحفظ کی ضمانت دے گی۔" لڑکی نے بولنا چاہا تھا لیکن صرف تھوک نگل کر رہ گئی تھی۔ "جاؤ، بریف کیس لے آؤ۔" وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔ "جلدی کرو، ہمیں یہ جگہ چھوڑنا ہوگی۔"

"ہاں مس مرجانہ۔" میں نے اُسے سہارا دیا۔ "ہمارا باس جو کچھ اپنے دوستوں تک پہنچانا چاہتا تھا، اُسے بہرحال محفوظ ہاتھوں میں دے دینا چاہیے۔"

مرجانہ جونہی باہر نکلی، مہاشرے نے جلدی جلدی کسی کا نمبر ڈائل کیا۔ "میں مہاشرے بول رہا ہوں۔ میجر رائس، میرے لیے دو محافظ، سادا لباس میں بھیج دو۔ میں مرجانہ سے بریف کیس لے کر آرہا ہوں۔ محافظوں کو میری کار کی حفاظت کرنا ہوگی، ہاں جلدی، باقی باتیں اگر بتاؤں گا . . . نہیں فی الحال اُسے ساتھ نہیں لاؤں گا . . . وہ بریف کیس کے ساتھ ہمارے لیے اہم تھی۔" اُس نے ریسیور رکھا اور جھک کر دراز سے کچھ نکالنے لگا۔ میرے لیے فوری فیصلہ ناگزیر ہوگیا تھا۔ وہ اہم راز لے کر جا رہا تھا اور مرجانہ کو یہاں چھوڑے جا رہا تھا جب کہ مجھے مرجانہ اور راز دونوں کو بچانا تھا۔ خالدہ نے یہی کہا تھا کہ سیکرٹری کو زندہ یا مُردہ، دونوں حالتوں میں لانا ہے۔

میں نے جیب میں ہی محض اندازے سے گولی والا بٹن آن کیا تھا، مجھے گولی کی کارکردگی پر بھروسہ تھا لیکن ایٹمی شعلے کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں، مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شعلے کا دائرہ کار کتنا ہے، اگر میں شعلہ اِدھر اُدھر اُچھالتا اور فاصلہ دھوکا دے جاتا تو کھیل بگڑ سکتا تھا۔ وہ جونہی سیدھا ہوا تو میں نے جیب سے ہاتھ نکال کر سیدھا کر دیا۔ مدّھم آواز کا شعلہ لپکا اور مہاشرے بے آواز دُہرا ہوتا ہوا کرسی کے دائیں پہلے پر اُوندھا ہوگیا تھا۔ میرا اندازہ ہی مجھے دھوکا دے کر کامیاب کر گیا تھا۔ میں نے غلطی سے دوسرا بٹن آن کر دیا تھا۔ میں نے جھپٹ کر مہاشرے کو سیدھا کیا اور اُسے ایسے بٹھا دیا، جیسے تھکاوٹ دُور کرنے کے لیے کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا ہو۔ نہ تو کوئی سوراخ ہوا تھا نہ خون کا قطرہ نکلا تھا، صرف اُس کی پیشانی پر ایک گول سیاہ دھبہ اُبھر آیا تھا۔ اُسے بٹھا کر میں دوڑتا ہوا کھلے دروازے کے ایک کواڑ کی آڑ میں دبک گیا تھا۔ ایک منٹ بعد فرش پر تواتر سے بجتی ایڑیوں کی آواز سُنائی دی۔ میں دُعا کر رہا تھا کہ مرجانہ کے ساتھ کوئی بھگشو یا راہبہ نہ آئے، خواہ مخواہ ایک لاتعلق شخص کو اذیت دینا پڑتی۔ مرجانہ بغیر رُکے سیدھی میز کی جانب بڑھتی چلی گئی تھی۔ "مس مرجانہ . . ." میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے اُسے پکارا اور اُس نے آہستہ سے گردن گھمائی . . . "مقدس راہب سو گئے ہیں، ان کو آرام کرنے دو۔" اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے مہاشرے کی جانب دیکھا۔ "میری بات سنو، میں باس کا خاص پیغام لے کر صرف تمہارے لیے آیا ہوں۔ میں نے مہاشرے کو غلط اطلاع دی ہے۔ باس بالکل ٹھیک ہے اور ہائی کمان کی نیت میں فتور آگیا ہے، اس لیے باس نے ایک منصوبے کے تحت مجھے بھیجا ہے۔ اگر وہ بریف کیس اور تمہاری واپسی کا مطالبہ کرتا تو تمہیں ہلاک کر دیا جاتا اور بریف کیس کے بارے میں کہہ دیا جاتا کہ ہم تک پہنچا ہی نہیں، میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

"ہاں . . .!" مرجانہ کے زرد چہرے پر سُرخی عود کر آئی۔ "تو کیا باس . . .؟"

"ہاں مس مرجانہ!" میں نے اُس کی بات قطع کرتے ہوئے بتایا۔ "باس بخیریت ہے، اب یہاں سے نکل چلو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہ... یہ لوگ کیسے جانے دیں گے؟" وہ گھبرا گئی "میری نگرانی ہوتی ہے۔"

"تم صرف راستہ بتاتی چلو۔" میں نے ہریف کیس اُٹھاتے ہوئے کہا "کیونکہ ہم اُدھر سے نہیں نکل سکتے، اِدھر سے لائے گئے تھے مہاگرو کے کمرے والے راستے...!"

"لیکن صرف وہی راستہ ہے۔"

میں نے کھڑکیوں کی جانب دیکھا، لوہے کی موٹی سلاخیں سراپا تھیں۔

"دوسرا راستہ ہونا چاہیے۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"ہاں، ہے... مگر لوہے کا وہ مضبوط دروازہ بند رہتا ہے۔" مرجانہ نے بتایا۔

"تالا باہر ہے یا اندر؟"

"اندر...!"

"چلو دیکھتے ہیں شاید کوئی صورت نکل آئے۔"

"نہیں، اُدھر راستہ بند ہے۔" مرجانہ بولی "راہداری میں درجنوں ننگ دھڑنگ بھکشو بیٹھے رُوحانی عبادت میں مصروف ہیں۔"

"میں اور مرجانہ باتیں کرتی مہاگرو کے کمرے سے ایسے نکلیں گی جیسے مرجانہ مجھے خانقاہ کی سیر کرا رہی ہے۔"

مارشا کی تجویز اچھی تھی۔ میں نے فوراً اُن کو روانہ کر دیا تھا اور خود کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد میں بھی اُن کے پیچھے نکل پڑا۔ مہاگرو اُسی آسن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

راہداری میں وہی سکوت اور لوبان کی مہک طاری تھی۔ کسی کمرے میں نقارہ بج رہا تھا۔ میں دبے قدموں ایک سے دوسری اور پھر آخری راہداری تک چلا گیا۔ اچانک احساس ہوا تھا کہ مجھے اپنے پاؤں کی چاپ گراں گزر رہی تھی، پھر آخری دروازے سے نکل کر میں سیڑھیاں اُترتا جب لان میں اُترا تو وہی دو بھکشو اچانک میرے سامنے آ گئے۔

"لڑکیاں اُدھر گئی ہیں جناب!" ایک بھکشو نے خانقاہ کے باغیچے کی طرف اشارہ کیا۔ میں مسکراتا ہوا اچکے فٹ پاتھ پر مُڑ گیا۔ ان لوگوں کو میں یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ مہاگرو نے ہمیں خانقاہ میں آزادی سے گھومنے کی اجازت دے دی ہے۔ دوسری بات یہ بھی رہی تھی کہ درختوں کے درمیان سے میں نے دیوار میں ایک کھڑکی بھی دیکھ لی تھی۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ مرجانہ اُس کھڑکی کے راستے نکلنے کا ارادہ کر کے ہی باغیچے میں گئی ہوگی۔ میں روش روش گھومتا اُن کو تلاش کرتا، کھڑکی تک گیا تو چونک پڑا۔ کھڑکی کے کواڑ کیلوں سے پکے بند تھے اور دونوں بھکشو کیاریاں دیکھتے ہوئے میرا تعاقب کر رہے تھے۔ میں جونہی پلٹا، وہ دونوں سینہ تان کر روش پر کھڑے دکھائی دیے۔

"اچھے لوگو!" قریب جا کر میں نے مؤدب انداز میں کہا "لڑکیاں اِدھر نہیں ہیں۔"

"سنیے جناب!" ایک بھکشو بولا "لڑکیاں مہاتما بدھ نے قبول کر لی ہیں۔ ہم نے آپ کو اس لیے جانے دیا تھا کہ آپ لڑکی خانقاہ کے لیے لائے ہیں۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" میں نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا "میں اُسے خدا حافظ کہنا چاہتا ہوں۔"

"وہ...!" دوسرا بھکشو بولا "مہاتما کے قدموں میں محفوظ ہو گئی ہے۔ تم بھی نائب گرو کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جا سکتے، ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے۔"

غصہ میری کنپٹیوں کو ٹھوکریں مارنے لگا تھا اور ہاتھ ناگ کا پھن بن گئے تھے۔ وہ بہترین ہدف تھے۔ میں دونوں کو ایک پل میں ادھیڑ اور توڑ سکتا تھا لیکن مارشا اور مرجانہ کی سلامتی آڑے آ رہی تھی۔ میں محفل فضا میں کوئی ہنگامہ کھڑا کر کے جیتی ہوئی بازی کو ہیر داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے نیک دل بھائیو۔" میں نے اپنی پھنکار کو دبا کر دھیمے لہجے میں کہا "تو مجھے بھی مہاتما کے قدموں میں محفوظ کر دو، جو سکون یہاں ہے، باہر نہیں ہے۔"

"تم اسے اندر لے جاؤ۔" طویل قامت بھکشو نے اپنے ساتھی سے کہا۔

میں تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح حالات کے رحم پر بھکشو کے پیچھے پیچھے گردن جھکائے چل پڑا تھا کیونکہ میں اپنی مارشا کو گنوا کر دو قدم سے ایک قدم دوسری سمت نہیں جا سکتا تھا۔ ابھی ہم سیڑھیوں کو طے ہی کر رہے تھے کہ میری سماعت سے مارشا کی چکراتی ہوئی چیخ ٹکرائی۔ اُس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا تھا۔ ضبط اور احتیاط کے سارے بند، مارشا کی چیخ نے توڑ دیے تھے۔ اُسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ اُس نے مجھے پکارا تھا۔ میرا ہاتھ گھوم گیا اور دوسرے لمحے بھکشو ڈکراتا ہوا سیڑھیوں سے لڑھکنے لگا تھا اور اُس کا ساتھی میری طرف دوڑتا آ رہا تھا۔

✂

راہداری میرے دوڑتے قدموں کی دھمک سے گونجنے لگی تھی۔ اس دھمک کے علاوہ اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ خانقاہ میں نے تھوڑی دیر قبل مارشا کی دلدوز چیخ سنی تھی، لیکن اب یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چیخ کے ساتھ ہی سارے لوگ کسی کھائی میں گر گئے تھے، وہ لڑکی جس نے ہماری رہنمائی کی تھی، وہ خوفناک

چہرے والا بھکشو کوئی بھی تو دکھائی نہ دیا تھا۔ میں ہر کھلے دروازے میں رُک کر جھانکتا، ہر بند دروازے کو ٹھوکر مارتا، کمروں میں سجی مورتیاں، دھات کے دیو ہیکل مہاتما بدھ کے مجسمے دُنیا سے لاتعلق تپسیا میں مگن بے حس و حرکت بھکشو تھے لیکن جس کے لیے میں چکراتا پھر رہا تھا۔ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ آسمان نے اُٹھا لیا تھا یا زمین نے نگل لیا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو ضرور اُس کا کہیں نہ کہیں سُراغ ملتا۔ میں اُسے تلاش کرتا ہوا پروہت کے کمرۂ خاص میں داخل ہوا، وہ خالی تھا، جب میں چند منٹ قبل دبے پاؤں وہاں سے گزرا تھا تو وہ استغراقی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اب یہ خوف بھی نہ رہا تھا کہ مہاتما سے کی ملاقات ملتوی ہو گئی ہوگی اور بھکشوؤں کی فوج ظفر موج میری تکا بوٹی اُڑانے کے لیے پر تول رہی ہوگی۔ میں سب کچھ بھول کر صرف مارشا کی تلاش میں سرگرداں تھا جس نے مجھے مدد کے لیے پکارا تھا۔

معاً میری بیدار سماعت سے بڑیوں کے کڑکڑانے کی آواز ٹکرائی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی بوڑھے اونٹ کے جوڑ جواب دے گئے ہوں۔ میں نے پلٹتی سے گردن موڑی اور پھر میں پتھر کا مجسمہ بن کر رہ گیا کیونکہ وہ منظر ایسا ہی ناقابلِ یقین اور دہشت ناک تھا۔ میری سرگزشت پڑھنے والے بخوبی جانتے ہوں گے کہ میں عصرِ حاضر کا ایک تعلیم یافتہ شخص ہوں اور توہمات پر یقین نہیں رکھتا۔ مگر جو کچھ میں نے دیکھا، عقل اُس کی توجیہہ کرنے سے قاصر تھی۔ میں نے جاگتے میں ایک دھات کا مجسمہ متحرک دیکھا تھا، جو اسی طرف سے چلا آ رہا تھا جدھر میں مہاتما کی تلاش چھوڑ کر آیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اُس مجسمے نے اپنے دونوں ہاتھوں پر مارشا کو اُٹھایا ہوا تھا، جو اکڑی ہوئی چت پڑی تھی۔ یقیناً مارشا نے اُس وقت مجھے چیخ کر پکارا تھا جب اُس بلا نے اُس کی جانب ہاتھ بڑھائے ہوں گے۔

وہ میری متاعِ عزیز اُٹھائے میرے قریب سے گزر رہا تھا، سوچنے کی قوت بیدار تھی لیکن میرا بدن جیسے کسی جادوگر نے پتھر بنا دیا تھا، عین ممکن ہے شدتِ خوف و ہراس نے میرے اعضا مفلوج کر دیے ہوں، جس کیفیت سے میں گزر رہا تھا، الفاظ اُس منظر... اور خوف کی عکاسی کر ہی نہیں سکتے۔ مجھے اندازہ نہیں کہ میرے جیسا جیتا جاگتا انسان کتنی دیر تک بُت بنا رہا اور ایک دھات کا بُت کتنا عرصہ میری نگاہوں کے سامنے متحرک رہا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اُدھورہ مجسمہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوا اور اُدھر میرے سکوت کا عالم ٹوٹ گیا لیکن عین اُسی وقت مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا... پروہت اپنی جگہ آنکھیں موندے جس سابق بیٹھا ہوا تھا، بیٹھا رہا۔ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جب میں اندر آیا تھا تو وہ کمرے میں موجود نہ تھا اور دونوں دروازوں پر میری نگاہیں مسلسل جمی ہوئی تھیں۔ اُن کے راستے کوئی چڑیا بھی اندر داخل نہیں ہوئی تھی۔ یہ سارے مناظر انتہائی محیر العقول تھے۔ میں سوچنے لگا کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں لیکن باہر راہداری میں سے سُنائی دینے والی دھاتی قدموں کی گونج نے اِن خیالات کی نفی کر دی۔ وہ مجسمہ ابھی تک محوِ حرکت تھا اور میری متاعِ بول بہن مارشا کو نہ جانے کہاں اُٹھائے لیے جا رہا تھا۔

میں نے برق رفتاری سے مڑ لیا اور ابھی پہلا قدم اُٹھایا ہی تھا کہ ایک انتہائی باریک، تلوار کی طرح تیز دھار آواز میری سماعت کو چھید گئی۔ "رک جاؤ خرم سلطان۔" میں نے اُسی سرعت سے پلٹ کر دیکھا۔ پروہت کی گدلی گول، اندر دھنسی ہوئی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ "وہ بھگوان کے محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اُسے خود تتھاگت نے یہاں بُلایا ہے۔ مارشا آج سے نہیں صدیوں قبل بھگوان بُدھ کی منتظر نظر ہے، آج کی مارشا صدیوں پہلے کی ویشیا امبپالی ہے جس نے بھگوان کی سیوا کی تھی، اُسے فی الحال بھگوان کے چرنوں میں رہنے دو اور میرے قریب آؤ تمہیں بھگوان بُدھ کا حکم پہنچاؤں۔"

میں باہر جانے کی بجائے عالمِ بے خودی میں آہستہ آہستہ پروہت کی طرف بڑھنے لگا۔ میں چاہتے ہوئے بھی مارشا کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ کوئی نادیدہ قوت مجھے دھکیل رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" پروہت کا استخوانی ہاتھ اُٹھا اور میں ٹھٹک گیا۔ "خرم سلطان۔ ایک بات ذہن نشین کر لو، دُنیاوی گرد میں اَٹے ہوئے انسان بے بس اور مجبور ہوتے ہیں اور جو شخص دُنیاوی لالچ کے حصار سے نکل کر گیانِ دھیان میں مصروف ہو جاتا ہے اُس کی رہنمائی قدرتی بیدار ہو جاتی ہے جو لامحدود اور ناقابلِ شکست ہوتی ہیں۔ یہ بات دل سے نکال دو کہ تم خود یہاں آئے ہو۔ مجھے معلوم ہے تمہیں کس نے یہاں بُلایا ہے۔ تمہاری آتما کو پیغام ملا اور تم یہاں آ گئے۔"

"مجھے کس نے بُلایا ہے گرو دیو؟" آواز میری تھی لیکن الفاظ کا انتخاب اجنبی تھا۔

"شاکیہ منی نے۔" پروہت نے جواب دیا "لیکن بھگوان سے درخواست ایک مہاتما نے کی تھی۔ اُن چند ہندوستان سے پچاس برس قبل چلا تھا، تبت، نیپال، چین، سیام، ملائشیا، کمبوڈیا، جاپان، کوریا، منگولیا کی خاک چھانتا ہوا فلپائن میں داخل ہوا ہے۔ بقول اُس کے اُسے خواب میں بھگوان بُدھ نے مندناؤ کے اِس مندر کی بشارت دی تھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اُتم چند، کیا چاہتا ہے گرو دیو؟" کسی ان دیکھی طاقت نے میرے مُنہ سے کہلوایا۔

"وہ بھگوان سے بھگوان کے درشن چاہتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں گرو دیو۔!"

"یہ ایک طویل اور قدیم داستان ہے میرے بچے۔" پروہت تھکے تھکے انداز میں بولا۔ "میں نے اُس مُورتی کا نام ضرور سُنا تھا لیکن اُس کی تاریخی حقیقت اور اہمیت اُتم چند کی زبانی سُنی تھی جو اب تمہارے گوش گزار کر رہا ہوں، کیونکہ بھگوان بُدھ نے تمہیں ہی وہ سعادت عطا کی ہے، جس کی تلاش اور خواہش میں بڑے بڑے گرو اور گیانی تپسیا کرتے قضا کی گود میں اُتر گئے ہیں۔" پروہت بولتے بولتے سوچوں میں ڈوب گیا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے آنکھیں کھول کر لحظہ بھر مجھے دیکھا جیسے پہچان رہا ہو۔ "سنو نوجوان تم بھگوان کی مُورتی واپس لاؤ گے جس کی کھوج کا بھید تم ہانگ کانگ سے ساتھ لے کر چلے تھے، کچھ یاد ہے تمہیں؟"

"ہاں گرو دیو۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں نے ایک سنگِ مرمر کی سِل کے لیے سفر کیا تھا جس کے اندر مہاتما بُدھ کی مُورتی پیوست تھی۔"

"وہ اُس مورتی کی پوری تاریخ اور سفر کی داستان تھی۔" پروہت نے بتایا۔ "بھگوان کی ایک پرستار اُسے بہت دُور سے لائی تھی، اُسے بتایا گیا تھا کہ جیون بھید بھگوان کی مُورتی کے نیچے گُندہ ہے لیکن سیکڑوں پیش رووں کی طرح وہ بھی جیون بھید حاصل کرنے کا سفر مکمل نہ کر سکی، عمر بڑھانے کی خواہش دل میں لیے واپس چلی گئی۔ یہی بھید بھگوان کی منظورِ نظر امبپالی نے بھگوان کے خاص چیلے انند سے معلوم کرنا چاہا تھا، مگر انند کی آمد سے چند لمحے قبل اجل نے سانپ بن کر امبپالی کو ڈس لیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتی تو شاید بھگوان بُدھ کا جیون بھید جان لیتی۔"

اُس کے الفاظ میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے لیکن ذہن ان باتوں کو قبول کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے صرف کتابوں میں گوتم بُدھ کے حالاتِ زندگی پڑھے تھے اور اس کی تصویریں دیکھی تھیں لیکن مجھے کبھی بُدھ مذہب سے دلچسپی رہی تھی نہ اُس کی تعلیمات سے۔ پروہت بار بار کسی ایسی مُورتی کا ذکر کر رہا تھا جو اپنے اندر کوئی راز چھپائے بُدھ گیانیوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ میں نے اُس سنگی سِل کے بارے میں بھی یہی سُنا تھا کہ وہ بُدھ مذہب کے نزدیک ایک مقدس شے ہے۔ لیکن میں نے سودا بازی کرتے وقت اِس پہلو کو مدِ نظر نہیں رکھا تھا۔ اصل مقام کچھ اور تھے۔ ایک یہ کہ می جُو کا آخری اثاثہ لوٹ لیا جائے اور دوسرا میں ہانگ کانگ کی اُچھل کُود کی زندگی سے تنگ آ چکا تھا اور کہیں دُور نکل جانا چاہتا تھا۔ ابدُنا کی وجہ سے بیکر بھی می جُو کے مخالف گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور میں وہ چانس ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا سنگی سِل تو ایک اضافی مواد تھا جو چلتے چلتے میں نے قبول کر لیا تھا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا جناب۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ٹکٹکی باندھ لی تھی کہ میرے کھوئے ہوئے حواس بحال ہو گئے اور میں پھر سے خرم چوہدری کی اصل جون میں واپس آ گیا تھا۔ مجھے نہ صرف دھات کے دیوتا کے ہاتھوں پر لیٹی ہوئی مارتا اور اُس کی چیخ یاد آ گئی تھی، بلکہ وہ لڑکی بھی جس کے لیے ہم آئے تھے اور جسے میں مہاترے سے چھین کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"میری زبان یاگنشگو؟ تمہیں کیا سمجھ نہیں آ رہا؟" پروہت نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"دونوں ہی۔" میں نے اُچھلتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ، میری ساتھی کہاں ہے؟"

"صبر کرو مورکھ۔" عقب سے کسی نے اُردو میں کہا۔ غیر اختیاری طور پر میری گردن گھومی تو مجھے دروازے میں کھڑا ایک مُردہ نظر آیا۔ پلاسٹک و خشبو وہ ایک لاش نما شخص تھا جس نے گیروا لباس پہن رکھا تھا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے نے دوبارہ کہا۔ "جلدی کرو گے تو خود بھی گُم ہو جاؤ گے۔"

"مہاگیانی۔!" میرے سامنے بیٹھا پروہت بولا۔ "آپ اپنی زبانی لڑکے کو تفصیل بتائیں۔"

ہڈیوں کا ڈھانچا بھی پروہت کے پہلو میں ہڈیاں کڑکڑاتا ہوا آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ "سنو نوجوان۔! میں سترہ برس سے اُس پوتر مورتی کی تلاش میں نگر نگر پھرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ جب مورتی ہانگ کانگ میں لائی گئی تو میں جاپان میں تھا، جب ہانگ کانگ پہنچا تو مُورتی فلپائن کے لیے محوِ سفر تھی، لیکن میں مُورتی کا سواگت کرنے کے لیے بندرگاہ پر ہی بیٹھا رہا۔ معلوم ہوا وہ جہاز جس پر مُورتی تھی سمندر میں ڈوب گیا۔ ہے اُس مُورتی کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔" بوڑھے نے ہڈیوں سے کھینچ کر سانس لیتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "تم خود کو خواہ مخواہ کشٹ میں ڈالے بغیر مجھے بتاؤ۔ کیا مورتی کسی دھات کی بنی ہوئی تھی؟"

"نہیں۔" میں نے سر کو نفی میں جُنبش دی۔ "میرا خیال ہے

پتھر کی تھی اور سِل کے اندر پیوست تھی۔" "کسی چتر کار نے شاید مورتی پر سنگِ مرمر کا لیپ کر دیا ہو۔" بوڑھے نے پوچھا۔

"میں نے غور نہیں کیا تھا پنڈت جی۔" "لفاظ آپ سے آپ میرے مُنہ سے بہہ رہے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ بلا ارادہ میری زبان ٹیپ ریکارڈر کی مانند چلنے لگی تھی۔

"مورتی کے ساتھ کوئی تحریر بھی تھی؟" اُس نے پوچھا۔ "یاد کرو، اس پر چار پوتر شبد ہیں، جیون بھید، چار اناتے۔ تتھاگت شاکیہ منی۔ امی تابھ۔ آتما روپی۔"

"نہیں، یہ نام مورتی پر نہیں تھے۔" میں نے جواب دیا۔ "بلکہ پوری سِل پر آڑھی ترچھی لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا۔"

"ہو سکتا ہے وہ پال بھاشا ہو۔ قدیم زبان جو بھگوان بُدھ کے زمانے میں رائج تھی۔"

"میں اس بھاشا سے ناواقف ہوں۔"

"تم ہی نہیں، اسے کوئی بھی نہیں جانتا سوائے ایک شخص کے جو ان دنوں تبت کے پہاڑ پر گیا ہوا ہے۔ اس کا نام گیانی سیلانی منش ہے کسی سے بہت کم ملتا ہے۔ خیر یہ ضرورت بعد کی ہے تم یہ بتاؤ اب وہ مُورتی کہاں ہے؟"

"چنگ چی کے پاس۔"

"جھوٹ بولو گے تو بھگوان بُدھ تم پر بے انت کشٹ طاری کر دیں گے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں مجھ سے مُورتی اُس کی بیٹی مسادام جوزیفائن نے حاصل کی تھی اور میری اِطلاع کے مطابق چنگ چی نے وہ مُورتی مصر بھیج دی ہے۔"

"بوچی۔" بوڑھے نے اپنا چہرہ فلپائنی پروہت کی جانب گھمایا۔ "مہمان کو بُلاؤ۔"

پروہت نے اُٹھ کر مکڑی کا ہتھوڑا ایک تو سے پر مارا اور پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کوئی اندر آیا اور پروہت نے اپنی زبان میں اُسے کچھ ہدایات دیں۔

چند منٹ بعد میری سماعت سے بھاری قدموں کی چاپ ٹکرائی، کوئی شخص ننگے فرش پر اڑیاں بجاتا اندر آیا تھا۔

"اِدھر میرے قریب چلے آؤ۔" پنڈت نے ہاتھ اُٹھا کر آنے والے کو اشارہ کیا، وہ جب سامنے آیا تو میرا جسم لرز گیا... وہ جانسن تھا، وہی شخص جو مُورتی کو حاصل کرنے میرے تعاقب میں فلپائن تک آیا تھا اور پھر میرے سامنے اُسے چنگ چی اُچک لے گیا تھا۔

"ہیلو مسٹر خُرم سُلطان۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "یار زندہ صحبت باقی، تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی، تمہارے بارے میں حیرت انگیز خبریں سُنتا رہا ہوں شکر تم نے می جُو کا گروہ حاصل کر لیا ہے اور چنگ چی کو بھی فلپائن سے بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اِدھر کیسے آنا ہوا؟"

"آپ کی ملاقات کے لیے انکل۔" میں نے بھی خوش گوار لہجے میں کہا۔ "آپ دلیو کی قید سے کیسے اور کب رہا ہوئے؟"

میری بات پر اُس نے مختصر سا قہقہہ مار کر کہا۔

"جب تم نے دلیو کے پَر نوچ ڈالے تھے تو وہ مکلندیوں سے لپٹیوں میں آ گرا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جس سے میں نے فائدہ اُٹھا لیا تھا۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے مسٹر جانسن۔" میں نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ پَر کٹا دلیو میرے تعاقب میں منیلا سے مندناؤ تک آ چکا ہے۔"

"اوہ۔ نہیں۔" جانسن اس انکشاف پر اُچھل پڑا۔ "اس خبر کا ذریعہ؟"

"میری آنکھیں، میرا گیان مسٹر جانسن، وہ یہاں دیکھا جا رہا ہے اور اُس کا اس مندر سے قریبی تعلق ہے۔"

"کیا تم اس تعلق کی وضاحت کرو گے لڑکے؟" اُس نے تمتماتے لہجے میں کہا۔

"ان گیانیوں سے پوچھ لو۔" میں نے دونوں بُوڑھوں کی جانب اشارہ کیا تو فلپائنی پروہت نے آنکھیں کھول دیں۔

"یہاں کے انتظامی امور کا انچارج مہاترے اُس کا دوست ہے۔"

"اُوں تو وہ میری بُو سونگھتا ہُوا یہاں بھی داخل ہونے کا دروازہ کھول چکا ہے۔" جانسن نے کینہ توز نگاہوں سے بُوڑھے کی جانب دیکھا۔ "مسٹر بوچی یہ لڑکا جو کچھ کہہ رہا ہے تم سُن رہے ہو، مجھے جواب دو مسٹر بوچی۔ کیا مجھے مہاترے کے ذریعے چنگ چی کی ایما پر گھیرا گیا ہے؟"

"میں کسی چنگ چی سے واقف نہیں ہوں۔" بوچی نے نتھنے پھُلاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ نام میرے لیے نیا ہے، بہرکیف مہاترے کو تمہارے سامنے کروں گا، اگر الزام درست ثابت ہوا تو اُس سے تمام اختیارات واپس لیے جائیں گے یہ بھگوان کا گھر ہے سازشوں کا اکھاڑہ نہیں ہے۔"

"مہاترے کی آتما انت کا ذائقہ چکھ چکی ہے۔" پنڈت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے میری آنکھوں میں جھانک کر بتایا اور میں بُری طرح چونک اُٹھا، اگر وہ اُس کی ہلاکت سے آگاہ تھا تو اُسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے تھا، ہلاک کرنے والے ہاتھ کس کے ہیں؟

پروہت نے اُٹھ کر پھر گھنٹی بجائی، یقیناً اُس نے پنڈت کی زبان نہیں سمجھی تھی، کیونکہ پنڈت ہندی بول رہا تھا، جانسن بھی مہاتر سے کی ہلاکت سے بے خبر تھا۔

پروہت نے کسی بھکشو کو مہاتر سے کا نام لے کر کوئی حکم دیا تھا، چند منٹ کمرے میں گہرا سناٹا طاری رہا تھا، بوچی اور جانسن کو مہاتر سے کا انتظار تھا جب کہ میں اور پنڈت جانتے تھے مہاتر سے اب بلاوے سے بہت دُور جا چکا ہے۔

بھکشو چیختا ہوا واپس آیا وہ ہین کرنے کے انداز میں بار بار مہاتر سے کا نام دُہرا رہا تھا، پروہت کی ہڈیوں کو بھکشوں نے کڑکڑا دیا تھا، وہ اُٹھا اور پھر چکرا تا ہوا اچل پڑا، جب وہ باہر نکل گیا تو بوچی فرش پر گھسٹتا ہوا میرے نزدیک چلا آیا۔ "سُنو رہا لک! میں جانتا ہوں مہاتر سے کو تم نے ہلاک کیا ہے، پرنتو میں تمھاری رکھشا کروں گا۔ اس کے بدلے میں تم مُورتی میرے حوالے کر دو گے۔"

"میں بتا چکا ہوں پنڈت جی مُورتی مجھ سے چھین لی گئی تھی۔"

"یہ مَنش جو تمہارے سامنے کھڑا ہے!" اُس نے جانسن کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ گواہ ہے، اس نے مُورتی کی کھوج لگائی ہے جو تمھارے پاس ہے۔"

"مسٹر جانسن!" میں نے احتجاج کیا۔ "سادام جوزی نے وہ مُورتی اپنے باپ کے حوالے کر دی تھی اور اُس کے باپ نے ایک پارٹی کے ہمراہ مُورتی مصر روانہ کر دی ہے تاکہ اس کا راز معلوم ہو سکے۔"

"یہ صرف تمھارا بیان ہے خرم سُلطان!" جانسن طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں نے موٹر بوٹ کے بدلے اس سے مُورتی مانگی تھی حالانکہ اُسے موٹر بوٹ کی اشد ضرورت تھی لیکن اُس نے معذرت کر لی تھی۔ اُس نے قسم کھا کر مجھے بتایا تھا کہ جہاز چھوڑتے وقت مُورتی خرم سُلطان کے پاس تھی۔ جوزی اُسی مُورتی کے لیے اُس سے تعاون کرتی جہاز سے بوٹ پر گئی تھی، اُس کے بیان کی تصدیق اُس ڈاکٹر نے بھی کی ہے جس نے تمھارا علاج کیا تھا جو تم دونوں کو ساحل سے سنبھالا لایا تھا۔"

"جوزی نے ڈاکٹر کو اُس وقت بُلایا تھا جب بوٹ کے حادثے میں میری حالت خراب ہو گئی تھی، اُس وقت تک سہل میرے پیٹ پر بندھی ہوئی تھی، لیکن جوزی نے اپنے تھکا نے پر پہنچتے ہی وہ سہل مجھ سے لی تھی۔"

"سنو لڑکے!" جانسن یکدم گرج اُٹھا۔ "تم کون ہو؟ یہ بُوڑھا نہیں جانتا مگر میں تمھیں سر سے لے کر پیر تک جان چکا ہوں، میں نے اس مُورتی کے لیے خاصا وقت اور بہت کچھ ضائع کیا ہے۔ میں تم سے ہر صُورت میں وہ مُورتی حاصل کر کے رہوں گا۔"

"تم غلط سمت سفر کر رہے ہو دوست!" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "جس کی منزل مایوسی ہو گی، تمھیں پہلے ہی یقین کر لینا چاہیئے تھا، جب میں نے تمھیں بتا دیا تھا، چنگ چی نے بھی میری بات کی تائید کرتے ہوئے تم سے بوٹ کا سودا کرنا چاہا تھا۔"

"غلط! بالکل غلط۔" جانسن نے کہا اور یہ کہتے ہی اچانک جھک کر میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا، اگر کوئی دُوسری جگہ ہوتی اور میں بُوڑھے جادوگر کے زیر کنٹرول نہ ہوتا تو وہ ہاتھ کلائی سے علیحدہ کر دیا جاتا۔ اس وقت تو میں مٹی کے مادھو سے بھی کہیں زیادہ مجبور تھا۔ اُس نے میری جیکٹ کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا تو میں لڑھک کر دائیں جانب گر گیا۔ جانسن نے جھک کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ "میری بات غور سے سنو لڑکے! مُورتی میرے حوالے کر دو۔ میں اس بُوڑھے سے اس کا سودا کر چکا ہوں۔ ہاں اگر تم نے میری یہ بات بلا چون و چرا مان لی تو میرا وعدہ ہے کہ اس میں سے نصف حصّہ تمھیں ادا کر دوں گا۔ میں ایک بزنس مین ہوں اور بزنس مین اپنے ساتھیوں کا حصّہ رکھنے کے قائل نہیں ہوتے۔"

میں کسی فالج زدہ انسان کی طرح... پہلو کے بل پڑا ہوا سوچ رہا تھا شاید عمل مکافات کا وقت آ چکا ہے، جتنے گناہ مجھ سے سرزد ہوئے تھے۔ اُن کا پھل ملنے والا ہے، ورنہ یہ بُوڑھا میری قوّت سلب نہ کرتا اور بھولی بسری مورتی کا چکر پھر نہ چلتا۔

پروہت اپنے دس بارہ چیلوں کے ساتھ واپس آیا، تو سیدھا جانسن کی طرف چلا گیا، سرمنڈے بھکشوؤں نے آناً فاناً جانسن کو گھیرے میں لے لیا تھا، سب کے ہاتھوں میں موٹی موٹی سلاخیں تھیں اور وہ خونخوار دکھائی دے رہے تھے۔

"اس دُنیا میں کہیں انصاف نہیں!" شاعر نے افسردگی سے کہا۔

"وہ کیسے؟" اس کے دوست نے پوچھا۔

"کوئی بیکار سا خراب نظم لکھے تو لوگ کوئی پروا نہیں کرتے، لیکن اگر کوئی شاعر خراب چیک لکھ دے تو قیامت آ جاتی ہے۔"

"تم نے اُسے قتل کر دیا ہے!" پروہت نے چیختی کراتی آواز میں کہا۔ "میرا جی تو چاہ رہا ہے کہ تمھیں اپنے ہاتھوں ترگ میں پہنچا دُوں لیکن میں قانون کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے سکتا۔ اس لیے میں تمھیں صرف پولیس کے حوالے کرنے پر اکتفا کروں گا۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو بوڑھے!" جانسن حلق کے بل چلّایا۔ "میں نے مہاتر سے کو قتل نہیں کیا، وہ تو میرا دوست اور مضبوط رابطہ تھا، میں اُسے کیوں قتل کرتا؟"

"مجھے نہیں معلوم!" پروہت نے پُرسکون آواز میں بولا۔ "لیکن تم جس ملک کے باشندے ہو وہاں ایسی ہی خطرناک ایجادیں روز روز کا کھیل ہیں، مہاتر سے کا جسم ہڈیوں کی راکھ میں تبدیل ہو چکا ہے یقیناً اُسے ان مُہلک شعاعوں سے ہلاک کیا گیا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ بوچی، بیٹھ جاؤ۔" پنڈت نے مداخلت کی۔ "قاتل کو صرف میں جانتا ہوں اور وہ جانسن نہیں ہے، ان لوگوں کو واپس بھیج دو۔" پنڈت نے بھکشوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پروہت اُٹھی اُٹھی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ "میں کہتا ہوں ان کو واپس بھیج دو۔ قاتل میری مٹھی میں ہے۔" یہ سنتے ہی پروہت نے سب بھکشوؤں کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور خود اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ "مسٹر جانسن لڑکے کی جیب سے آلۂ قتل نکال لو۔" پنڈت امریکن لب و لہجے میں بول رہا تھا۔

میں تو ناک سے مکھی بھی نہیں اُڑا سکتا تھا۔ جانسن کا ہاتھ کیسے روکتا، اُس نے میری جیبوں سے سب کچھ نکال کر فرش پر ڈھیر کر دیا۔ اُس سامان میں زیرو شعاعیں پھینکنے والا پستول بھی تھا۔ جانسن نے وہ پستول ایک طرف کر دیا۔

"تو کیا؟" پروہت حیرت زدہ آواز میں بول کر پھر ڈوب گیا تھا۔

"ہاں بوچی اس نوجوان نے مہاتر سے کو اس لیے قتل کیا ہے کہ وہ نام نہاد مسلم محاذِ آزادی کا دُشمن تھا جب کہ خرم چوہدری ان دنوں محاذِ آزادی کے لیے کام کر رہا ہے!"

"پھر تو اس کی گرفتاری ہماری نیک نامی میں اضافہ کرے گی۔" پروہت بولا۔

"نہیں بوچی نہیں، بُودھ مذہب کسی نیک نامی کا محتاج نہیں ہے، نیک نام کی تو بُرے سے نام کو ضرورت ہوتی ہے، بُودھ کے پرستاروں کو پرتر مُورتی کی ضرورت ہے، وہ مُورتی جسے صدیوں سے تلاش کیا جا رہا ہے۔" بُوڑھا چھوٹی چھوٹی سانسوں میں اتنا کہہ پایا اور سانس لینے کے لیے رُک گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سلسلۂ کلام پھر جوڑا۔ "کچھ بھید دیدوں میں کچھ شاستروں میں ہوتے ہیں اور کچھ رشیوں اور گیانیوں کے سینے میں سفر کرتے آنے والی نسلوں کو منتقل ہوتے رہتے ہیں، مورتی کا بھید بھی ہم تک پُرکھوں اور رشیوں سے پہنچا ہے، میں ہی نہیں بہت سے بھگوان کے پریمی اُس پوتر مورتی کا درشن کرنے کی آشا لیے نگر نگر کی خاک چھان رہے ہیں اور بے شمار اس آشا کو من میں لیے سورگ میں جا بسے ہیں۔"

"گستاخی معاف جنابِ عالی!" جانسن بول پڑا۔ "ہانگ کانگ میں جب مادام شیلی وارد ہوئی تو اُس کے ساتھ یہ افواہیں بھی گردش کرنے لگی تھیں کہ مُورتی تو محض ایک بہلاوا ہے دکھاوا ہے۔ اصل راز تو سیل کی لکیروں میں پوشیدہ ہے جو کسی بہت بڑے خزانے کا ہے۔"

"نہیں!" پنڈت نے نفی میں گردن ہلائی تو گردن کی ہڈیوں سے کڑاکے اُبھرنے لگے۔ "یہ افواہ کسی مُورکھ ذہن کی شرارت ہے، بھگوان کی مُورتی دُنیا کے لوبھ کی گنجی کیسے ہو سکتی ہے! شاکیہ منی نے تو دُنیا کے لوبھ کو ہمارے دُکھوں اور گناہوں کی بنیاد قرار دیا ہے۔ نہیں میرے بچّے! مُورتی اپنے اندر کوئی اور بھید رکھتی ہے، مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ مُورتی کو جو روگی چھُو لے اُس کا روگ دُور ہو جاتا ہے۔"

"سنو اُتم چند!" جانسن کے لہجے میں کرختگی اور زہر کی کڑواہٹ گھُل گئی تھی۔ "تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، تم مُورتی کی اہمیّت کو مذہبی رنگ دے کر میرے لیے بے سُود بنانا چاہتے ہو تاکہ میں بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مصداق تم سے جو ملے لے کر مُورتی سے دستبردار ہو جاؤں، اُسی بھید ہی ہے اُتم چند جس کے لیے ہم دونوں پریشان ہیں۔ مُورتی کسی بہت بڑے خزانے کی کنجی ہے، مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ آڑھی ترچھی لکیریں بُودھا کے زمانے کی ایک زبان ہے جسے پالی کا نام دیا جاتا ہے، اس بات کی تائید بوچی کر چکا ہے کہ پالی زبان پڑھنے والے اب خال ہیں۔ ایک شخص ان دنوں پاکستان کے قدیم تاریخی شہر ٹیکسلا میں ہے، تم غالباً مُورتی لے کر ٹیکسلا جانا چاہتے ہو، تاکہ خزانے کا بھید ساتھ لے آؤ، کیوں اُتم چند کیا یہی بات ہے؟"

"شک شیطان کا کھیل ہے اور اُس کا علاج لقمان... کے پاس بھی نہیں تھا۔" اُتم چند نقاہت زدہ آواز میں بولا، چونکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں حق پر ہوں اس لیے بلا خوف و تردد کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ تیکسلا چلے چلنا، اگر مزدوری کے ساتھ کسی خزانے کا بھید ملا تو میں یاترا کر کے واپس چلا آؤں گا اور تم خزانے کو کھوج لینا اور اگر میرے بڑھاپے کی بات سچ ہوئی تو رتم سے لینا، میں اور کیا کر سکتا ہوں؟"

"اب کی ہے تم نے کام کی بات۔" جانسن پرمسرت آواز میں بولا۔ "پالی زبان کے ماہر تک تو سہر طور جانا ہی تھا، تم ساتھ ہو گے تو اسے تلاش کرنے میں آسانی رہے گی۔"

"اب یہ تمہارا کام ہے کہ مورتی جلد از جلد حاصل کر لو۔"

"میں مہمان ہوں اُتم چند۔" جانسن بولا۔ "مجھے عزم میزبان سے مکمل اختیار دلوا دو، میں جس طرح چاہوں اڑیل ٹٹو کا منہ کھلوا کر میرا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو گا۔"

"میری طرف سے اجازت ہے تمہیں۔" پروہت بوچی نے بلا تامل اُسے اجازت دے دی۔ "ہماری شکتیاں بھی تمہاری معاون ثابت ہوں گی۔"

"شکریہ مہربان بزرگ۔" جانسن یہ کہتا ہوا میری جانب غیظ سانڈنی کی طرح پھنکارتا ہوا بڑھا۔

"عزم سلطان!" جانسن نے زہریلے بوٹ کی ٹھوکر میری پسلیوں پر ماری تو درد کی شدید لہر میرے بدن سے ہراتی ہوئی کراہ بن کر منہ سے نکل گئی... "میں تسلیم کرتا ہوں اگر تم ان بوڑھوں کے سحر میں نہ جکڑے ہوتے تو میں اتنی آسانی سے تمہیں ضرب نہیں نہ لگا سکتا تھا۔ بہر حال جنگ اور محبت کے کھیل میں ہر چال جائز ہوتی ہے۔ البتہ میں تمہیں صرف دو منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ میں تیسرے حصے کی پیش کش پہ بھی قائم رہوں گا، اپنی جوانی اور وجاہت پر رحم کرو اور مورتی میرے حوالے کر دو، میں عزت و احترام کے ساتھ تمہیں جانے کی اجازت دے دوں گا۔" اُس نے کلائی موڑ کر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان حالات میں اگر تم مجھے دو برس کی مہلت بھی دو گے تو جواب وہی ہو گا۔" میں نے کہا۔ "ہاں اگر مجھے آزاد کر دو اور صرف چند دن کی مہلت دو تو میں چنگ چی کے حلق سے تمہاری مطلوبہ مورتی نکال سکتا ہوں۔ اس وقت تو پتھر بنا ہوا ہوں۔ پوچھ گچھ میں تم پتھر کے ساتھ ہی سر پھوڑو گے۔"

"مگر میں اسی پتھر کے حلق سے اُگلوانا چاہوں گا۔" جانسن نے میری بے جان ٹانگ پہ پاؤں سے ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر کوشش کر دیکھو۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"میری کوشش بڑی ظالم ہے لڑکے، پتھر بھی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔" اُس نے پتلون کا بیلٹ کھولتے ہوئے کہا اور میری کھلی آنکھوں نے چاندی کا چوڑا نکل فضا میں گھومتا ہوا دیکھا اور پھر فوراً ہی میرے پیٹ پہ پہلی ضرب لگی۔ میں نے بڑے ضبط سے وہ چوٹ سہہ لی۔ پھر تو جیسے اُس پہ وحشت طاری ہو گئی، شڑاپ شڑاپ چابک نما بیلٹ میری کھال اُدھیڑنے لگا تھا، میں دانتوں تلے زبان چبا کر ہر وار سہہ رہا تھا، لیکن انسان کب تک درد برداشت کر سکتا ہے۔ چاندی کا نکل جہاں لگتا تھا بوٹی نکال لے جاتا تھا۔

"بولو۔ بولو۔" جانسن ہانپتا ہوا چیخا۔

"ابھی تو چند منٹ ہوئے ہیں۔" میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "دو برس بھی اگر تم کوشش کرتے رہو گے تو یہی جواب وہی ہو گا۔"

جانسن کا زخمی ہاتھ پھر متحرک ہو گیا اور تہہ خانہ شڑاپ شڑاپ کی آوازوں، سرسراہٹوں اور میری کربناک سسکاریوں سے گونجنے لگا۔

اُس نے میرے بدن کے ایک ایک مسام کو ادھیڑ دیا تھا، لباس دھجیوں کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ خون کے اُڑتے ہوئے چھینٹے پروہت بوچی اور پنڈت اُتم چند کے لبادوں کو بھی رنگین کر گئے تھے۔

جنوں ہی جانسن نے ایک زوردار ٹھوکر مار کر مجھے پشت کے بل گرایا اور پھر چہرے پر پوری طاقت سے ایک ضرب لگائی تو پروہت بوچی نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا... اُس کا سارا جسم بید مجنوں کی مانند لرزنے لگا تھا۔

"رُک جاؤ۔" بوچی کی چیخ میری ڈوبتی سماعت سے ٹکرائی۔

"نہیں۔" جانسن ہانپتا ہوا دہاڑا۔ "تم مجھے مکمل اختیار دے چکے ہو۔"

"رُک جاؤ۔ میری بات سنو۔" بوچی شاید اُس کے قریب آ گیا تھا کیونکہ تواتر کے ساتھ پڑنے والی ضربوں میں تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ "چہرے پر نہیں، خوب صورت چہروں میں بھگوان بستا ہے۔"

"بھگوان کو اُٹھا کر کچرا جانے والے کمرے میں لے جاؤ۔" جانسن نے شاید بوچی کو دھکا دیا تھا کیونکہ میں نے ہڈیوں کی

کڑکڑاہٹ سنی تھی۔ "میں نے کہا تھا، ہر مسام کو چھیدوں گا۔"

"ٹھہرو جانسن۔" اُتم چند بول پڑا۔ "لڑکا چٹان کی مانند سخت اور لوہے کی طرح اٹوٹ ہے، چٹانیں بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ لوہا بھی کٹ جاتا ہے، مجھے دوسرا طریقہ آزمانے دو، اس چٹان کو برق کی شعاع توڑے گی، لوہے کو لوہا ہی کاٹے گا، بوچی! اسے نیچے دوسرے تہہ خانے میں پہنچا دو۔"

"نہیں۔!" جانسن کی دھاڑ کے ساتھ ہی میرے سینے پر ایک اور ضرب لگی اور میرا ڈگمگاتا ہوا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا، بے ہوشی نے مجھ سے ہر درد کا احساس چھین لیا تھا۔

ہوش آیا تو میں نے دیکھا بوسیدہ چھت سے لکڑی کے لالٹین لٹک رہے تھے، میں کراہ کر اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دو نرم نرم ہاتھوں نے مجھے تکیے پر رکھا اور ایک انتہائی شیریں آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "اتوپ نوجوان، میں تمہارے زخموں پر مرہم تو نہ رکھ سکی صرف آنسو بہاتی رہی ہوں..."

"کس ظالم درندے نے تمہارے شریر کو اُدھیڑ کر رکھ دیا ہے، بولو اجنبی وہ کون ہے؟"

چہرے پر ہاتھ محسوس کر کے میں نے ٹھہر کر کروٹ بدلنا چاہی تو کئی ٹیس میں درد لہریں مارنے لگا اور میں کراہ کر رہ گیا۔

"آرام سے لیٹے رہو اجنبی! ہلو گے تو گھاؤ دُکھ جائیں گے۔" اُس آواز میں پیار کی مٹھاس اور دُکھی دل کی تڑپ تھی، آواز کے ساتھ میرے چہرے پر گرم گرم دو قطرے ٹپکے تو میں پھر تڑپ گیا اور بدن دُکھ گیا تھا۔

وہ کون تھی، میں کہاں تھا، وہ کیوں میرے لیے رو رہی تھی، یہ سب کچھ مجھے معلوم نہ تھا، یہی کچھ معلوم کرنے میں اُسے سامنے لانا چاہتا تھا، بیٹھ کر دیکھنا اور باتیں کرنا چاہتا تھا، لیکن جسم زخموں سے گھائل اور ضربوں سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ "مجھے سہارا دے کر بٹھاؤ مہربان لڑکی۔" میں نقاہت زدہ آواز میں بولا۔ "میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں بابو۔" اُس نے میرے ماتھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "تم بخار میں جل رہے ہو، تمہارا شریر بہت زیادہ زخمی ہے۔ آرام سے لیٹے رہو، میں تمہارے قریب ہوں۔ بس آنکھیں اُوپر اُٹھاؤ اور دیکھ لو۔"

میں نے پوری آنکھیں کھول کر اُوپر دیکھا... وہ قدرے نیچے... جھک آئی تھی اور مجھے یوں دکھائی دیا جیسے سیاہ چادر میرے سینے تک آ گئی ہو جس کا ایک سرا اُس کے سر پہ تھا اور دُوسرا میرے بدن پر۔ میں اُس چادر سے اُس کا روشن گلاب رنگ چہرہ دیکھ رہا تھا، میں نے جو حسن کا معیار قائم کر رکھا ہے جس پر زینت، عابدہ اور ایڈنا پوری اُترتی تھیں۔ اُس لڑکی کا حسن اُس معیار سے کہیں برتر تھا۔

"کیا میں تہہ خانے میں ہوں؟" میں نے زلفوں کی چھاؤں میں پوچھا۔

"ہاں۔" اُس نے میرے چہرے سے شاید خون کی جمی ہوئی پپڑیاں اُتارتے ہوئے کہا۔ درد کے باوجود میں نے اُسے منع نہیں کیا تھا۔ یہ میں تمہارے ماضی سے واقف نہیں ہوں اجنبی، میں نہیں جانتی تم کون ہو، کہاں تھے اور ان لوگوں سے تمہاری کیا کھٹ پٹ چل رہی ہے، لیکن تمہاری حالت دیکھ کر مجھے انتہائی دُکھ ہوا۔ جب تم بے سُدھ تھے تو میں نے تمہارے لیے پرارتھنا کی تھی، شاید بھگوان نے میری پرارتھنا قبول کر لی ہے لیکن یہ لوگ تم سے جو بات سنوانا چاہتے ہیں تم مان کیوں نہیں لیتے؟"

"اگر اس سلسلے میں تمہیں پہلے میرے پاس بھیج دیتے، تو شاید میں مان لیتا۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"لیکن اب۔ وقت گزر چکا ہے، مان لینے سے مجھے میرا ٹوٹا پھوٹا جسم واپس تو نہیں مل سکتا۔"

"وہ نہیں پردیسی۔" وہ غریب سی گئی۔ "یوں نہ سوچو تمہارا شریر صرف گھائل ہے ٹوٹا نہیں، میں تم سے بنتی کرتی ہوں، اُن کی جو آشا ہے، جو مانگ ہے پوری کر دو، میں تمہیں یہاں سے ہاسپٹل لے جاؤں گی۔ تم چند دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"اپنا تعارف تو کراؤ اچھی لڑکی۔" میں اُس کی بات ٹال گیا، کیونکہ اُسے قائل کرنے کے لیے طویل داستان سنانا پڑتی۔ "تم اس کال کوٹھری میں کیسے اُتری ہو؟"

"میرا نام چندا ہے۔" وہ بولی۔ "میں بُدھ مت کا بھکشو جی پرکام کر رہی ہوں، بُدھ مت سیکھنے کی اسکالر ہو۔ میرے آنکل اُتم چند بہت بڑے اسکالر اور گیانی ہیں۔ میں اُن کی شش ہوں، اُن کے ساتھ تاریخی مقامات پر گھومتی پھرتی یہاں آئی ہوں۔ اب تم اپنا جغرافیہ بتاؤ؟"

"ابھی تک تم اس کٹے پھٹے ساحل اور بنجر زمین کا جغرافیہ نہیں جان سکی ہو۔" میرے جواب پر وہ دیر تک جلترنگ بجاتی رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب اُس کی ہنسی تھمی تو میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میرا نام عزم سلطان چوہدری ہے۔ وطن پاکستان اور کام آوارہ گردی ہے۔"

"تمہاری طرح تمہارا نام بھی سندر ہے۔" اُس نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں تمہاری تعریف کرنے سے قاصر ہوں۔ میرا مطلب ہے میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں جو تمہارے حسن کا احاطہ کر سکیں۔ بہرحال چندا دیوی۔۔۔" میں کچھ پوچھتے پوچھتے رُک گیا۔

"ہاں۔ ہاں بولو رُک کیوں گئے؟" چندا نے کہا۔ "ہاں اب بولو کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں مس چندا۔" میں نے اُس کے بالوں کی لٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو اُم چندا نے کوئی غرض سونپ کر نیچے اُتارا ہے؟" وہ لحظہ بھر اپنے ہونٹ موتیوں جیسے سہ دانتوں سے چباتی رہی، شاید جھوٹ اور سچ سے لڑنے کی تھی۔

"ہاں خرم سلطان۔" آخر وہ مسکرا کر بولی۔ "مجھے آپ کی سیوا کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

"غروب صورت ہونٹوں سے جب جھوٹ مس کر کے نکلتا ہے تو لالی متاثر ہو جاتی ہے، اپنے ان گلابوں پر رحم کیا کرو چندا۔"

"چلو اگر اتنے ہی گیانی ہو تو میرے دل کی کیفیت تو جانو۔"

"دل اور فرض بالکل الگ الگ شعبے ہیں مس۔"

"تم کس شعبے میں رہنا پسند کرو گے؟" وہ پھر جھکی اور بالوں کی جھالریں قدرے اونچے اُٹھیں۔۔۔ "جب سے تمہیں دیکھا ہے۔ دل کا شعبہ زیادہ فعال ہو گیا ہے۔ میں تمہیں اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"پھر میری تھوڑی سی مدد کر دو پلیز۔" وہ التجائیہ انداز میں بولی۔ "یقین کرو میں بھی تمہیں اسی شعبے میں پوری طرح بسا چکی ہوں اگر میرے ساتھ کچھ مجبوری بھی ہے، اگر تم نے میری مدد نہ کی تو یہ شعبہ تم سے دُور کر دیا جائے گا۔"

"پہلے تمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔" میں مسلسل اُسے سورتی کے ذکر سے دُور رکھ رہا تھا، کیونکہ میرا جواب بہرطور نفی میں تھا، وہ مایوس ہو جاتی تو ناراض بھی ہو سکتی تھی، جب کہ میں اُسے اُس چپاس کے درمیان رکھنا چاہتا تھا، مجھے اُس سے کچھ کام لینا تھا، وہ ایک مضبوط سہارا بھی بن سکتی تھی، اُس کی مایوسی اور ناراضگی مجھ سے یہ رابطہ اور سہارا چھین لیتی اور میں تہہ خانے کی تنہائیوں میں سسکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جاتا۔ "تم یہ بتاؤ سمندر کے ہر حصے میں تم آ جا سکتی ہو؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں مجھ پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔"

"میرے ساتھ دو لڑکیاں بھی مندر میں داخل ہوئی تھیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے پوچھا۔

"دو نہیں ایک۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "بولو وہ کون ہے تمہاری محبوبہ؟"

"وہ اب کہاں ہے؟" میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے مارشا کے لیے دُکھی ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ مندر میں موجود ہے؟"

"ہاں۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں نے اُسے چیختے سُنا تو اُنکل سے پوچھا تھا۔"

"وہ چیخ رہی تھی۔" میں تڑپ گیا۔ "کیوں۔ کیوں۔ کیا اُس پر بیتی؟"

"نہیں۔" اُس نے میرے سینے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ تم سے ملاقات کے لیے ضد کر رہی تھی۔"

"سنو چندا، اگر تم اُسے کسی طرح رہا کر دو تو میں تمہاری آشا پُوری کر دوں گا۔"

"وعدہ۔" اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ہاں تو دے رہا ہوں جتنا کچھ میں جانتا ہوں تمہیں بتا دوں گا۔"

"پرنتو۔" وہ اُلجھ گئی۔ "وہ اگر پولیس لے آئی تب۔"

"نہیں مس چندا، وہ ایسا نہیں کر سکتی، کیونکہ خرم چوہدری یہاں کی پولیس اور فوج کو مطلوب ہے۔"

"اوہ۔ رام۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر مجھے تیکھی نگاہوں سے گھورنے لگی۔ "تو تم کوئی بڑی شے ہو، کیوں خرم چوہدری پولیس تمہاری تلاش میں کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ میں قاتل ہوں۔"

"اوہ۔ نہیں۔" وہ ہلک کر دُور ہو گئی۔ "تم۔ نہیں، میں کیسے یقین کر لوں۔"

"اپنے اُنکل سے پوچھ لینا۔"

"او۔ کے خرم۔" وہ فیصلہ کُن انداز میں بولی اور اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "میں صرف تمہاری خاطر یہ رسک لوں گی۔ تم اپنا وچن یاد رکھنا، مجھے وشواش ہے تم مجھے نراش نہیں کرو گے۔"

"سنو چندا وہ میرے بغیر یہاں سے نہیں جائے گی لیکن تم اُسے یقین دلا دینا کہ خرم چوہدری یہاں سے فرار ہو گیا۔ شاید اس طرح وہ یہاں سے چلی جائے۔"

"کیوں؟ اُسے تم پر اتنا ہی مان ہے۔" چندا نے رقابت بھرے تیکھے لہجے میں کہا۔

میں نے چہرہ دُوسری طرف پھیر لیا تھا۔ میں اُسے کیسے بتاتا کہ بہن کو بھائی پر مان نہیں ہو گا تو کس پر ہو گا۔ میں نے عورت کو عورت کی ہی ایک فطری خامی سے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا تھا، جب میں نے محسوس کیا کہ چندا مجھ سے خاصی متاثر ہے اور وہ مجھے

عارضی ہی سہی کچھ وقت کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر چکی ہے تو میں مارشا کی ذات کو درمیان میں لے آیا تھا، چاہنے والی اپنے محبوب کی زندگی میں کسی دُوسری عورت کا وجود برداشت نہیں کرتی چاہے وہ اُس کے محبوب کی ماں ہو، ساس، بہو کے اکثر جھگڑوں کی تہہ میں یہی فطرت کارفرما ہوتی ہے۔

چندا نے مارشا کو مجھ سے دُور کرنے کا فیصلہ بھی عورت کی اسی ازلی فطرت کے تحت کیا تھا، مجھے یقین تھا وہ اپنی ساری صلاحیتوں اور چترکاریوں سے کام لے گی اور کم از کم میری بہن مارشا تو اُس بندی خانے سے نجات پا لے گی، اس کی نجات میں میری کامیابی بھی مضمر تھی کیونکہ جب جانسن مجھ پر تشدد کر رہا تھا۔ مجھے ہر لمحہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ مارشا کی ذات کو درمیان نہ لے آئے۔۔۔ لیکن اس بات کا خیال جانسن کو نہ آیا تھا یا شاید وہ تڑپ کا پتا ہر بازی ہارنے کے بعد استعمال کرنا چاہتا تھا، اگر وہ مارشا کو درمیان میں لے آتا تو میں جیتے جی مر گیا ہوتا کیونکہ جانسن کی مطلوبہ مُورتی نہ میرے پاس تھی نہ مجھے اُس کی موجودہ پوزیشن معلوم تھی، میں جانسن کو کیا جواب دے کر مارشا کو بچاتا۔ اگر چندا اُسے تحفظات باہر نکال دیتی تو یہاں صرف میری اپنی ذات رہ جاتی، کوئی بھی سزا ملتی تو مجھے ملتی۔ میری سزا کسی معصوم لڑکی کو نہ دی جاتی، میں نے خود کو ہر سزا کے لیے تیار کر لیا تھا، ہیم جانسن اُدھیڑ چکا تھا صرف سانس جاری تھے، وہ بھی اگر ساتھ چھوڑ دیتے تو میری رُوح پر مارشا جیسی ہستی کا قرض اور دُکھ نہ ہوتا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ پروہت بوڑھی کھٹ کھٹ چلتا اندر داخل ہوا، چندا نے ہاتھ جوڑ کر اُسے تعظیم دی، وہ سر کو اثباتی جنبش دیتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

"تم باہر جاؤ۔" اُس نے چندا سے کہا۔ "میں اس سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسی باتیں محترم پروہت؟" چندا نے پوچھا۔

"ایسی باتیں جو تم جیسی بچیوں کی موجودگی میں نہیں کی جا سکتیں۔"

چند لحظہ بھر سوچتی رہی اور پھر کندھے اُچکا کر چل پڑی۔۔۔ پروہت نے بلیٹ کر دیکھا، جب دیواریں خلا خود کار نظام سے بند ہو گیا تو وہ کُرسی گھسیٹ کر میرے نزدیک بیٹھ گیا۔

"تم نے اس لڑکی سے سودا کر لیا ہے لڑکے؟"

"کیسا سودا جناب؟"

"عورت سے سودے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

"آپ اپنے مطلب کی بات کریں۔" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"سنو۔" وہ جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "تم چند سوداگر ہے، اُسے بھگوان اور بھگوان کی مُورتی سے کوئی سروکار نہیں ہے، وہ سودا در سودا طے کر چکا ہے، جانسن سے مُورتی خرید کر تبت لے جائے گا اور ادا شدہ رقم سے کئی گنا زیادہ منافع پر فروخت کر دے گا۔" "اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے جناب۔" میں نے اُسے مزید کُریدتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی تو ایک بے جان پتھر کے عوض معقول رقم مل رہی ہے۔"

"احمق نوجوان۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشیانہ انداز میں بتانے لگا۔ "میں اُن کی باتیں سُن چکا ہوں، اگر تمہارا خیال ہے کہ جانسن تمہیں حصہ ادا کرے گا تو یہ خوش فہمی دل سے نکال دو، وہ تمہیں ہلاک کرنے کا پروگرام طے کر چکے ہیں، جانسن صرف مُورتی سے ہی دولت نہیں کمانا چاہتا بلکہ وہ تمہارے جانی دُشمن چنگ چی سے بھی تمہارا سودا طے کرنا چاہتا ہے۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں بھی مُورتی کا طلب گار ہوں۔" وہ بولا۔ "مگر اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کے اصولوں کے تحت۔"

"کوئی ضمانت؟" میری بات سُن کر وہ چونکا تو میں نے پھر کہا۔ "آپ بھی تو مُورتی حاصل کر کے میری زندگی کے چراغ کو گُل کر سکتے ہیں۔"

"نہیں لڑکے نہیں۔" اُس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تمام پتے تمہارے ہاتھ میں دے کر صرف مرد کی زبان پر بھروسہ کروں گا، آئندہ تمہاری طرف ہو گی۔"

"وضاحت کیجیے محترم پروہت۔"

"میں۔" اُس نے دروازے کی جانب پلٹ کر دیکھا۔ "سنو، میں تمہیں یہاں سے نکال دُوں گا، لیکن ایک وعدہ کرنا ہو گا تمہیں مُورتی میرے ہی حوالے کرنا ہو گی۔"

"اگر میں نے آزاد ہو کر اپنا وعدہ ایفا نہ کیا تب۔"

"تب۔" وہ یکدم غرّانے لگا تھا۔ "تب اس یقین کے ساتھ بے وفائی کا فیصلہ کرنا کہ دُوسرے دن کا سورج تمہیں دیکھنے کی مہلت نہیں دی جائے گی۔ میری رُوحانی اور افرادی قوتیں تمہیں زمین کے پاتال سے بھی کھینچ لائیں گی، میں کسی بھروسے پر ہی تمہیں آزادی دے رہا ہوں لڑکے۔"

"آزادی کے علاوہ بھی کچھ انعام دیا جائے گا۔"

ہاں۔ دولت ریے شمار دولت، نصف ادائیگی روانگی کے وقت کر دی جائے گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے، مجھے یہ سودا منظور ہے، لیکن اس کے لیے میرے تندرست ہونے تک انتظار کرنا ہوگا۔"

"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے، جب تم صحت یاب ہو جاؤ گے تب اس معاہدے پر عمل کرنا شروع ہوگا۔"

"مجھ پر اعتماد کا شکریہ۔ میں بھی آپ کو یہ بات سچ بتا دوں کہ مورتی چنگ چی کے قبضے میں ہے اور میں آزاد ہو کر اس کے حلق میں انگلی ڈال دوں گا، چونکہ یہاں آنے سے قبل مورتی میرے نزدیک محض پتھر کی سل تھی۔ میں نے ادھر کبھی توجہ نہ دی تھی۔ اب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، مورتی جہاں ہوگی میں ضرور حاصل کروں گا اور سیدھا آپ کے پاس آؤں گا۔"

"سچ بولنے کا شکریہ۔" وہ ممنون لہجے میں بولا۔ "اب میں جا رہا ہوں، جب صحتیاب ہو جاؤ تو لڑکی کو نہ بتانا، وہ اس کا انکل اس درندے کو کال کریں گے۔"

"بہتر۔" میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ چھو لیا۔ "آپ مجھے میک اپ کا سامان مہیا کر دیں، باہر میرے بے شمار پرستار منتظر ہوں گے، دیکھتے ہی مجھ کو گدھوں کی مانند چمٹ پڑیں گے۔"

"آ جائے گا اور کچھ؟"

"صرف میری ایک الجھن رفع کر دیں"... میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی گرفتاری کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ "کیا مجھے وہاں سے بلایا گیا تھا یا کسی نے دیکھ کر روکنے کا فیصلہ کیا تھا؟"

وہ تھوڑی دیر مسکراتا رہا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ "جب تم جا رہے تھے تو بالکونی سے جانسن نے تمہیں پہچان لیا تھا، اس وقت دونوں لڑکیاں عقبی راستے کی جانب جا رہی تھیں۔ جانسن کے حکم پر تمام راستے فوراً بند کر دیے گئے تو وہ پلٹ پڑیں، تب تمہاری ساتھی لڑکی کو ڈرامائی انداز میں روک لیا گیا تھا۔"

"وہ کون تھا جس نے مارشا کو اٹھایا تھا؟"

"ایک مشینی بھکشو۔" پروہت نے بے خیالی میں اپنی مذہبی عیاری ظاہر کر دی تھی۔ "تم زیادہ نہ سوچو، بس جلدی ٹھیک ہونے کی کوشش کرو۔"

پروہت بوچی دست شفا عنایت کر آیا اور کامرانی کی نوید سنا کر چلا گیا تو میں چندا کماری کے بارے میں سوچنے لگا، وہ بوچی کی خفیہ ملاقات سے متعلق ضرور پوچھتی اور مجھے جواب بھی دینا پڑتا، اگر ٹال مٹول کرتا یا اسے گول مول جواب دیتا تو وہ ذہین لڑکی فوراً شک میں مبتلا ہو جاتی اور اس کا شکی مزاج ہونا میرے مفاد میں نہ ہوتا۔

لیکن وہ نہ آئی تھی۔ انتظار کرتے کرتے جب خاصا وقت گزر گیا تو مجھے عجیب عجیب وہموں نے گھیر لیا اور سوچتے سوچتے میں نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔ دوبارہ جب آنکھ کھلی تو وقت کا اندازہ لگانا مشکل تھا کیونکہ تہہ خانے میں دن رات کا احساس نہ رہا تھا، مرکزی لائٹ تب بھی روشن تھی جب پہلی بار میری آنکھ کھلی تھی، ہاں ہمنظر میں واضح فرق تھا پہلے میں سیلن زدہ فرش پر لیٹا ہوا تھا اور میرے پاس صرف ایک عُل بدن شعلہ رو لڑکی تھی لیکن دوسری بار جب میں جاگا تو مجھ کو بستر پر پایا، پتنگ کے ساتھ تپائی رکھی تھی جس پر دودھ کا بھرا ہوا گلاس رکھا تھا۔ میرے بدن سے خون آلود چیتھڑے اتار کر نیا لباس پہنا دیا گیا تھا۔

سامنے قطار میں تین کرسیاں رکھی تھیں، ایک پر جانسن، دوسری پر پنڈت اُتم چند اور تیسری کرسی کی نشست گاہ پر ہتھیلیاں ٹیکے چندا جھکی کھڑی، مسکراتی نگاہوں سے میری جانب ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ میری نگاہ جیسے ہی اس پر پڑی۔ اس نے دائیں آنکھ دبا کر ایک مخصوص اشارہ کیا۔ اس کی بولتی آنکھ کا مطلب بڑا واضح تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مارشا اس جہنم سے دور چلی گئی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میری روح تک میں مسرت اترتی چلی گئی۔

"خرم سلطان مجھے اپنے طرز عمل پر افسوس ہے۔" جانسن معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "میں نے ایک ڈاکٹر کو بلوایا ہے، لیکن تم جس دنیا کے باعمل انسان ہو، اس کا یہاں رواج ہے، کوئی چیز حاصل کرنے کے لیے بہت آگے جانا پڑتا ہے، مجھے مس چندا کماری نے سب کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے چونک کر چندا کی جانب دیکھا۔ اس نے پھر آنکھ کی زبان سے مجھے سمجھا دیا۔

"جانسن جو کچھ دیوی جی نے بتایا ہے، فی الحال اسی پر اکتفا کرو۔" میں نے سرد آواز میں کہا۔ "جو کچھ تم چاہتے ہو، اس کے لیے تمہیں انتظار کرنا ہوگا اور مجھے ہاتھوں اور پاؤں سے کام لینا پڑے گا، ایسی نایاب شے کوئی جیب میں ڈالے نہیں پھر سکتا۔ میں نے چندا سے جو وعدہ کیا ہے۔ اس پر تمہیں بھی یقین کرنا ہوگا۔ میں صحت یاب ہونے کے بعد مورتی تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"اگر تم پسند کرو۔" جانسن بڑے مؤدبانہ انداز میں کہنے لگا۔ "یہ تم پر جبر نہیں صرف میری درخواست ہے کہ میں تمہیں نہایت آرام سے وہاں لے چلوں گا۔"

"کہاں مسٹر جانسن؟" میں نے استفہامی نگاہوں سے اس کو دیکھا تو اس نے گھبرا کر نگاہوں کا زاویہ بدل لیا... اس کی تمام تر چالیں اور مکارانہ سوچیں اس بھوکے بھیڑیے جیسی تھیں جو اپنے شکار کو چابلوسی سے کھوہ کی جانب لے جانا چاہتا ہو۔

"میرا مطلب ہے۔" وہ گڑبڑانے لگا۔ "جہاں مورتی ہے اُدھر۔"

"کیا میں نے دیوی جی سے یہ کہا تھا؟"

"انکل۔!" چندا تیکھی آواز میں بولی۔ "آپ مسٹر جانسن کو منع کیوں نہیں کرتے، یہ اعتماد اور مفاہمت کی فضا خراب کر رہے ہیں، خرم نے مجھے بھی نہیں بتایا کہ مورتی کہاں ہے، بس اس نے میری درخواست پر مورتی دینے کا وعدہ کر لیا ہے، کیا یہ کافی نہیں؟"

"کیا کسی بینک کے لاکر میں ہے؟" اُتم چند نے نرم اور اپنائیت بھرے انداز میں جال پھینکا۔

"مورتی ایسی جگہ ہے جہاں صرف میرے قدم اور ہاتھ جا سکتے ہیں۔" میں نے کرخت آواز میں بتایا۔

"مسٹر جانسن جان چکے ہیں خرم چوہدری کی حیثیت اب بھگوڑے کی نہیں رہی، میرے ساتھ بانگ کانگ کے بیتاج بادشاہ کی جو کئی افرادی اور مالی قوت ہے، اگر تم لوگ مجھے اس حالت میں وہاں لے گئے تو تمہاری ہڈیاں بوٹیوں سے جدا کر دی جائیں گی، اگر تم نے دوسرا راستہ اختیار کیا تو ایک طاقتور گروہ سے تمہیں طویل جنگ لڑنا پڑے گی، میں چندا کماری سے شریفانہ عہد کر چکا ہوں، اگر اعتبار اور انتظار کر سکو تو اس میں تمہارا مفاد ہے، بصورت دیگر میں تمہارے پاس ہوں، جو چاہو کرو۔"

"ٹھیک ہے بالک ہم آشتی، شانتی اور وشواش کا راستہ اختیار کریں گے۔" پھر جانسن کی جانب چہرہ گھما کر انگریزی میں بولنے لگا۔ "جانسن۔! ہمیں کوئی جلدی نہیں جس چیز کی تلاش میں صدیاں گزر گئیں اس کے لیے چند دن صبر کرنا بھی پڑے تو کوئی حرج نہیں، ڈاکٹر آئے تو اسے واپس کر دینا۔ خرم سلطان کے زخموں کا علاج میں اور چندا کریں گے، تم اگر یہاں قیام کرنا پسند کرو تو ٹھیک ہے اور اگر واپس جانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ خرم جب فعال ہوگا تو تمہیں اطلاع کر دی جائے گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" جانسن کند ہے اچکا کر ناخوش گوار آواز میں بولا۔ وہ میرے فیصلے پر کبیدہ تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو میری بوٹیاں نوچنے لگتا لیکن کسی مجبوری نے اسے اپنی بوٹیاں نوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے میری طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک بات تم سب غور سے سن لو، اگر مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کرو گے تو میں اس بدصورت لڑکی کو اذیت ناک موت سے ہمکنار کر دوں گا، میں صرف دوستوں کا دوست ہوں، خرم سلطان یہ بات ذہن میں رکھنا تمہاری مارشا بطور ضمانت میرے پاس رہے گی۔"

میں نے چندا کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں میں طمانیت بھری چمک دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

جانسن مجھے خشونت بھری نگاہوں سے گھورتا ہوا اٹھا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد اُتم چند مدھم لہجے میں کہنے لگا۔ "چندا اب خرم سلطان کے گھاؤ جلد مندمل ہو جائیں گے، تم میری سچائی اور سچائی سے بخوبی واقف ہو۔ مجھے یہ لڑکا ایک اور کارن بھی عزیز ہے، کچھ بھاشن جو سینہ بسینہ چلتے ہیں اُن کے مطابق پوتر مورتی وہی شخص حاصل کرے گا جو سندر انوپ ہوگا اور جس کا بھجتر سوم اور اندر ویتا سمان ہوگا، میری نگاہیں

عادت

ابو کی عادت تھی کہ لکھتے لکھتے جب وہ سوچ میں گم ہو جاتے تھے تو سوئے کے اوپری حصے میں دائیں یا بائیں جانب کوئی نہ کوئی تصویر بنانا شروع کر دیتے تھے۔ شروع شروع میں وہ بے ترتیب سی لکیریں محسوس ہوتی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے سوچ کا عمل فزوں ہوتا جاتا تھا، اُن بے ترتیب اور غیر مانوس لکیروں سے چہرے نمودار ہوتے جاتے تھے۔ جیسے ہی خیالات کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا تھا یوں لگتے کہ وہ الجھے ہوئے خیالات کو لفظوں میں سلجھا لیتے تھے۔ لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ اور جب پھر سوچنا شروع کرتے تو ان ہی چہروں میں مزید لکیروں کا اضافہ ہو جاتا۔ اُن کے کسی ناول کا مسودہ ان چہروں سے خالی نظر نہیں آتا۔ اگر ان کا مطالعہ اس صفحے کی تحریر سے کیا جائے تو چہروں کے تاثرات عبارت کے مزاج کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک نئے کاتب کو مسودہ دینے لگے تو اس نے مسودہ دیکھ کر کہا: "صاحب! کتابت تو میں کر لوں گا لیکن یہ تصویریں کسی اور سے بنوانا پڑیں گی۔" جس پر انہیں بہت محظوظ ہوتے۔

مرسلہ : احمد صفی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی روشن پیشانی میں وہی علامت دیکھ رہی ہیں۔ یہ سُندر ہے اور سنسار کی تمام سندرتا پر اس کا ادھیکار ہے۔"

"مجھ پر بھی؟" چندا نے جھجک کر پوچھا۔

"ہاں تم پر بھی، کیونکہ تم بھی سُندر ہو، اندر دیوتا کی اپسراؤں کی مانند سُندر ناری۔"

"تم نے۔ تم نے سُن لیا خُرم۔" وہ چیختی ہُوئی میرے قریب بیٹھ گئی۔ "انکل نے مجھ پر تمہارا ادھیکار سویکار کیا ہے شاید اس لیے کہ تم اس یگ کے رشی ہو۔"

وہ دونوں ہندی بول رہے تھے، مجھے نہ تو ادھیکار کا مطلب سمجھ میں آیا تھا نہ دُوسرے ہندی الفاظ میرے پلّے پڑے تھے۔ اس لیے میں صرف مسکراتا رہا تھا۔

بُوڑھا اُتم چندر لڑکھڑاتا ہڈیاں بجاتا ہُوا جب تہہ خانے سے چلا گیا تو چندا . . . گھٹنے پر ٹھوڑی رکھ کر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑانے لگی، میں سوچنے لگا، شیطان کی چیلی، جادوگر کی شاگرد بھی اپنا منتر پھونک رہی ہے، بُوڑھے اُتم چندر نے مجھے جادو کی زنجیروں میں جکڑ کر جانسن کے سامنے ڈال دیا تھا، اُس بیچارے اس کی بھتیجی نہ جانے کیا کرنا چاہتی تھی۔ میں نے ہاتھ اُٹھایا، ہاتھ آزادانہ اُٹھ گیا، پاؤں کو حرکت دی، وردی کی دھجیوں کے سوا کچھ نہ تھا، اس کا مطلب تھا وہ لڑکی مجھے مفلوج نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کیا کر رہی ہو چندا کماری؟" میں نے پوچھا۔ "اِدھر آؤ۔"

وہ لپک کر اُٹھی اور پُرجوش آواز میں بولی "میں اپنے دیوتا کی پُوجا کر رہی تھی۔ تم نے سُنا نہیں انکل نے تمہیں دیوتا سمان کہا ہے۔"

"چندا تم جانتی ہو، عبادت کے لائق صرف خُدا ہوتا ہے ہم خُدا کی عبادت کرتے ہیں۔ تم اُس خدا کو پتھر میں سجا کر پرستش کرتے ہو، میں ایک گنہگار بندہ ہوں، چندا کماری، مجھے مزید گنہگار نہ کرو۔ ہاں! مجھے یاد آگیا۔ تم نے مارشا کا کیا کیا؟"

"اُسے جانسن نے نیند کا انجکشن دیا تھا۔" وہ بتانے لگی۔ "لیکن میرے پاس اِتنا وقت نہ تھا کہ اُس کے جاگنے کا انتظار کرتی، جانسن باہر گیا ہُوا تھا، بس میں نے اپنے آدمی سے اُسے اُٹھوایا اور گرجے کی سیڑھیوں پر ڈال آئی، جب ہوش میں آئے گی تو خود ہی چلی جائے گی۔"

"شکریہ چندا! تم نے مجھے ایک بہت کٹھن آزمائش سے بچا لیا ہے۔" میں نے ممنون آواز میں کہا۔ "میں جانسن کی لاتعداد ضربیں جسم پر برداشت کر گیا ہُوں، لیکن جاتے جاتے اُس نے جو آخری ضرب لگانے کی دھمکی دی تھی اگر وہ اُس پر عمل پیرا ہو جاتا، تو میں اُسے مار ڈالتا یا خود مر جاتا۔"

"تو کیا تم . . . . ؟"

"اوہ نہیں چندا، نہیں، میں بات کر رہا ہُوں۔"

"سنو پیارے، اگر تم اپنے وچن سے پھر گئے تو انکل مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"میں اپنی بات سے نہیں پھروں گا چندا، میں نے یہی وعدہ کیا تھا مُورتی کے بارے میں تمہیں بتا دُوں گا۔"

"ہاں یہی۔" وہ مطمئن سی ہو گئی۔ "میں مقابلے کا نام سُن کر پریشان ہو گئی تھی خُرم۔"

"وہ تو ہو گا چندا کماری، لیکن مُورتی کے لیے نہیں بلکہ ظالم سے ظُلم کا حساب چکانے کی خاطر۔"

"ہاں اُس درندے نے تم پر بڑا اپنائے کیا ہے، میں تمہارا ہاتھ نہیں روکوں گی۔"

وہ ہنسی مُسکراتی ہُوئی دیوار کے خلا میں داخل ہو گئی۔ میں نے اپنی اداکاری کو سراہا، میں نے خلافِ عادت چہرے پر ہیبتناک غلاف چڑھا لیا تھا اور لہجے میں چاہت کی شیرینی اور آواز میں والہانہ پن رچا کر اُس تمثالِ ہندو زادی کو شیشے میں اُتار لیا تھا۔ مجھے اس کے سہارے کی ضرورت تھی۔

چندا واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں ہلکے سبز رنگ کا پاؤڈر تھا، پُرجوش انداز میں آگے بڑھتی بڑھتی وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اُس کا انداز جھینپا جھینپا اور شرمایا لجایا سا تھا۔ "یہ پاؤڈر شریر کے گھاؤ پر چھڑکنا ہے۔"

"تو رُکا کس نے ہے چندا جی۔"

"ناری کی لاج نے۔" وہ شرما گئی۔

"اوہ۔" میں ہنس پڑا۔ "ایسے کرو انکل کو بھیج دو۔"

"وہ جانسن کے ساتھ جا رہے ہیں۔"

"کسی بھکشو کو بُلا لو۔" میں نے کہا۔ "میں کپڑے خود اُتار سکتا ہُوں نہ تم، جاؤ اپنے کسی آدمی کو بھیج دو۔"

وہ پاؤڈر تپائی پر رکھ کر چلی گئی، اُس لمحے پہلی بار وہ لڑکی مجھے اچھی لگی تھی ورنہ میں تو اُسے بے راہ رَو لڑکی سمجھتا رہا تھا۔

اُس نے جو بھکشو بھیجا تھا وہ بھی ہندوستانی تھا، یقیناً وہی میری مارشا کو مندر سے اُٹھا کر لے گیا ہو گا، اِس احسان کے ناتے وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔

اُس پاؤڈر میں خدا جانے کیسی تاثیر تھی۔ زخموں پر لگاتے ہی درد کی ٹیسوں کا لہریں مارتا طوفان یکدم تھم گیا تھا۔ بھکشو بڑے انہماک اور احتیاط سے ایک ایک زخم کو سکون کی دولت بانٹ کر جب فارغ ہُوا تو میلا لباس دُور رکھ کر مجھے سوتی کمبل اوڑھانے لگا۔

اُسی لمحے چندا اندر آگئی . . . اور بھکشو ہاتھ جوڑ کر وہاں سے نکل گیا۔

"کیا محسوس کر رہے ہو خُرم سلطان؟" چندا نے میری پیشانی پر ہتھیلی پھیرتے ہُوئے پُوچھا۔

"بے حد سکون، تمہارے انکل گیانی اور اسکالر ہی نہیں بہت اچھے ڈاکٹر بھی ہیں۔"

"ہاں وہ ایسے ہی ہیں، عجیب اور ناقابلِ فہم انسان۔" چندا کے لہجے میں عقیدت اور پیار کی جھلک تھی۔ "ابھی تم نے اُن کی استھائی شکتی نہیں دیکھی خُرم، ہڈیوں کے ڈھانچے میں بے پناہ شکتی ہے، نگاہ اُٹھائیں تو پہاڑوں کے سینے مُنہ ہو جائیں، میں نے دھارتے ہُوئے شیروں کو پاؤں چاٹتے، پُچکارتے زہریلے ناگوں کو تابعداری میں پھن جھکاتے اور چٹانوں کو پاش پاش ہوتے دیکھا ہے۔"

میں چُپ لیٹا رہا، میں نے اُسے نہیں بتایا کہ ایک شکتی میرے جیسے ناقابلِ تسخیر شخص کو بھی شکست و ریخت سے دوچار کر چکی ہے جسے مادام شنورا ہموار نہ کر سکی تھی، جس نے میری جُوکی دوست اور خطرناک عورت مادام ژی تاں کو ایک ٹھوکر سے توڑ دیا تھا، جسے ہانگ کانگ کے سارے ماسٹر اور غُنڈے قابو نہ کر سکے تھے، جس نے جوزیفائن جیسی زہریلی ناگن کے پھن پر کئی بار پاؤں رکھ دیا تھا، جس خرم سُلطان نے می جُو کو خودکشی پر مجبور کر دیا تھا، جس کی تلاش میں نیلہائن کی پولیس سرگرداں تھی جو چنگ چی کو ناکوں چنے چبواتا رہا تھا، جس نے ہارنا اپنی زندگی سے خارج کر رکھا تھا، اُسی خرم سلطان چوہدری کو اُتم چندر جیسے اہلِ بدوش بُوڑھے اور ہڈیوں کے ڈھانچے نے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"خرم سچ بتاؤ اُس لڑکی سے تمہارا کیا سمبندھ ہے؟"

"وہ میری بہن ہے۔"

"اور سے۔" وہ اُچھل پڑی۔ "کیا سچ کہتے ہو؟"

"ہاں ماں اور بہن جیسے سچے رشتے کو کون جھوٹ سے جوڑنا پسند کرتا ہے؟"

"سگی بہن۔" اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔

"اُس نے میری ماں کے بطن سے جنم نہیں لیا لیکن میں اُسے اپنی سگی بہن سمجھتا ہُوں۔"

مُنہ بولی؟"

"ہاں چندا کماری۔" میں نے طویل سانس لے کر بولنا شروع کیا۔ "وہ بھی تمہاری طرح انتہائی نازک لمحات میں مجھے ملی تھی۔ چندا یہ انسانی جذبے کا اعجاز ہے۔ کسی کے لیے وحشی درندہ بن جانا اور کسی کے لیے سراپا شفقت۔ تم بس تو کل تک میرے لیے تھیں اور آج . . . ."

وہ چُپ چاپ کھڑی میری بات مکمل ہونے کا انتظار کرتی رہی تھی، پھر جب میں مناسب اور موزوں الفاظ کی تلاش میں ڈوب گیا تو وہ تڑپ کر بڑھی . . . اور گرتے گرتے سنبھل کر بولی۔ "آج کیا۔ بولو بولو خرم۔"

"یہ نہ پوچھو چندا۔" میں جذباتی آواز میں بولا۔ "کچھ جذبے اتنے نازک اور مقدس ہوتے ہیں کہ اظہار کا لمس پاتے ہی اہمیت کھو دیتے ہیں۔"

"تم۔ تم۔" وہ شدتِ جذبات سے ہانپ گئی تھی۔ "مجھے چاہنے لگے ہو، کہہ دو۔ پلیز کہہ دو ناں۔"

"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، تمہیں دیکھ کر میں نے زندگی کی دُعا مانگی تھی، اگر اس کیفیت کا نام چاہت ہے تو میں اعتراف کرتا ہُوں۔"

یہ سنتے ہی اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں . . . اور ہونٹ تھرتھرانے لگے، وہ چُپ تھی لیکن اُس کا انگ انگ بولنے لگا تھا۔ میں یکدم پیار کے جوار بھاٹے کی زد میں آگیا اور بے ساختہ اپنے ہاتھ اُٹھائے۔ وہ لرزتی کپکپاتی ہُوئی جُھکی، تب اچانک میرے ہاتھوں اور گرتے پھُول کے درمیان تین لڑکیاں آگئیں، زینت، عابدہ اور ایڈنا، چندا کا جسم نہ جانے کس نے پرے دھکیل دیا تھا، جب میری بند ہوتی آنکھیں جھپک کر کھُلیں تو میں نے دیکھا وہ دو قدم دُور کھڑی تھی اور ہاتھوں میں چہرہ چھپائے لرز رہی تھی، سسک رہی تھی۔

"ہم۔ میں۔ شما چاہتی ہُوں خُرم۔" وہ ہلکتی آواز میں بولی۔ "مجھے وارفتگی میں یاد نہیں رہا تھا کہ تم تو گھائل ہو تمہارے زخموں کو ہاتھ لگایا تو تمہیں تکلیف ہو گی۔" میں حیرانی سے اُسے تکتے ہُوئے سوچنے لگا کہ وہ ہستی کون تھی جس نے چندا کو میری ذات کے صحن میں داخل ہونے سے روک دیا ہے، میں نے تو اپنے من کا دَوَر دا زہ کھول دیا تھا۔ یقیناً میرے رب نے ایک بار پھر اِس عاجز بندے پر کرم کیا تھا۔

میری آپ بیتی پڑھنے والے! میری ایک کمزوری سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ ہی حسن مجھے متاثر کر سکا ہے کہ جس میں معصومیت، پاکیزگی اور سادگی ہو۔ اس حسن کے عرفان نے میرے اندر عورت کی سُندرتا کا ایک احترام سا پیدا کر دیا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں تو چندا میرا سر سہلانے لگی اور پھر میں نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

رات مجھے ٹوٹ کر نیند آئی تھی، مجھے کسی کے ہاتھوں کے لمس نے بیدار کیا تھا۔۔۔ یہ ہاتھ چندا کی ساری کے تھے۔

"دوش نہ دینا ڈیئر" اُس نے میرے سینے پر دوا۔۔۔ کھلتے ہوئے کہا۔ "انکل نے مجھے باہر بُلا لیا تھا، جانسن مارشا کے فرار کی ذمے داری انکل پر ڈالنے لگا تھا، جانتے ہو انکل نے مجھے کیوں بُلایا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بتانے لگی "انکل بطور خاص مجھے اُس کے حوالے کرنا چاہتے تھے، کتنی عجیب بات ہے خرم، انسان لوہے جیسی سارے ناتے بھول جاتا ہے، بھلا کوئی ہوشمند شخص اپنی بیٹی کو کسی غیر مرد کے حوالے کر سکتا ہے؟" "پھر تم نے کیا؟"

"خرم" اُس نے تڑپ کر میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں۔ میں اپنی توہین برداشت نہیں کیا کرتی۔ تمھیں ایسا نہیں سوچنا چاہیئے"

"میں نے تو تمھاری بات۔۔۔"

"بس اب کچھ نہ بولو، میں ایسی نہیں ہوں" غصّے نے اُس کے حُسن میں جیسے آگ لگا دی تھی۔ اُس کا گلابی چہرہ دمک اُٹھا تھا "میں نے دونوں کو کھری کھری سُنائی تھیں"

"تمھیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا چندا کماری۔ اگر۔ اگر۔۔۔"

"اگر مگر نہیں، میں جانتی ہوں تمھیں کتنا دُکھ ہوتا"

"میں لباس پہننا چاہتا ہوں" رات بھر کی پُرسکون نیند لے کر خرم کو بہتر اور ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا، ہلنے جُلنے سے اب ٹیسیں بھی نہیں اُٹھتی تھیں۔ گہرے زخم اُتم چندر کے جادوئی اثر پاؤڈر نے مندمل کر دیئے تھے۔

میں لباس پہننے کے بہانے خود کو پرکھنا چاہتا تھا اور اپنی کھوئی ہوئی قوت آزمانا چاہتا تھا۔ یہاں سے نکلنے کا پروگرام بوچی سے جلد طے کرنا تھا، مجھے جلدی اس لیے تھی کہ مارشا اور گوتم مجھے غائب پا کر کوئی سا بھی قدم اُٹھا سکتے تھے۔ وہ اگر ادھر آ نکلتے تو میں جیتی ہوئی بازی ہار جاتا۔ جانسن کی ایما پر اُتم چندر دونوں کو اپنی پُراسرار شکتی سے پتھر بنا کر کسی دُوسرے تہہ خانے میں پھینک دیتا۔ اس سے قبل کہ وہ پھندے سے لٹک آتے۔ میں بوچی کی آڑ لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

"کسی کو بھیج دُوں؟" چندا نے میرا لباس میرے قریب رکھتے ہوئے پوچھا۔ "یا خود بدل لو گے؟"

"شاید ابھی نہیں" میں نے نقاہت زدہ آواز میں جواب دیا۔ "ہڈیاں درد کر رہی ہیں"

"اگر فریکچر ہوا تو ڈاکٹر کی خدمات ناگزیر ہو جائیں گی" چندا متفکر آواز میں بولی۔ "جب کہ انکل اور جانسن تمھیں کستوری کی مانند ڈبّی میں چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں"

"شاید تمھارے انکل کے پاس ہڈیوں کی بھی کوئی دوا ہو"

"نہیں، ٹوٹ پھوٹ کی کوئی دوا نہیں"

"دیکھا جائے گا جانسن کو بھیج دو، میں باتھ روم تک جاؤں گا"

چندا جیسے ہی باہر گئی۔ میں نے کروٹیں بدل کر ہاتھ ٹھیک کر لیا، آنکھیں چلا کر خود کو آزمایا اور یہ جان کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ میں بالکل فٹ تھا، میں نے لباس اُٹھایا اور باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ غسلخانہ مجھ جیسے بدبخت قیدی کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ تنگ و تاریک اور گندہ۔ میلے سے ٹب میں پانی تھا۔ صاف نہ تولیہ، میں جب ضروریات سے فارغ ہو کر باہر نکلنے لگا، تو چندا کا ملازم حیران حیران نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے حیرت زدہ ہونے کی وجہ فوراً سمجھ گیا اور جان بوجھ کر لڑکھڑاتا ہوا بستر کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ دیکھتے ہی وہ لپک کر میری طرف بڑھا اور مجھے سہارا دیتے ہوئے احتیاط سے بستر پر لٹا دیا۔ میں اگر ڈگمگانے کی اداکاری نہ کرتا تو وہ لازماً چندا کو رپورٹ دیتا کہ قیدی تو بھلا چنگا خود اپنے پیروں پر چل کر غسلخانے میں گیا تھا۔

"پرھو۔!" وہ مؤدب آواز میں بولا۔ "میرا انتظار کر لیا ہوتا"

"میرا نام خرم ہے دوست" میں نے ہندوانہ نام سُن کر اُسے اپنا نام بتایا۔

"جانتا ہوں پربھو" وہ عقیدت مندانہ انداز میں کہنے لگا۔ "آپ دیوتا سمان ہیں اور میں پاپی منش ہوں۔ آپ کا سیوک ہوں، نام کیسے لے سکتا ہوں"

"پنڈت جی کہاں ہیں؟"

"پوجا کر رہے ہیں پربھو" اُس نے جواب دیا۔ "اُن کا جیون ہی پوجا پاٹ تھا ہے، میں آپ کے لئے بھوجن لے آؤں"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ابھی وہ میرے سامنے جھک ہی رہا تھا کہ چندا خود ناشتہ لے کر آ گئی۔ اُس نے لپک کر چندا کے ہاتھوں سے ٹرے لے لی تھی۔

"تم جاؤ داس تمھارے مالک بھوجن کا انتظار کر رہے ہیں"

ناشتے میں حسبِ سابق وہی لوازمات تھے جو فلپائن اور ہانگ کانگ میں رہتے ہوئے کھاتا رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ چندا اپنے ہاتھوں سے مجھے کھلا رہی تھی۔

وہ دن سوتے جاگتے، چندا کے ساتھ باتیں کرتے اور اُتم چندر کے ساتھ ہونے والی کاروباری باتوں پر غور کرتے کرتے گزر گیا۔ شام کے وقت جب چندا میرے پاس موجود نہیں تھی تو چند منٹ کے لیے پروہت بوچی میری خیریت معلوم کرنے آیا تو میں نے مختصر لفظوں میں جلدی جلدی اُسے اپنے صحت یاب ہونے کی اطلاع دے دی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ پروہت بوچی اندر آیا۔ میں نہ صرف بیدار تھا بلکہ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے میک اپ کا سامان میرے ہاتھ پر رکھ دیا، ریڈی میڈ چہرہ تھا۔ میں نے فوراً اپنے چہرے پر وہ مصنوعی چہرہ سجایا اور چھوٹے سے آئینے میں نئی صورت دیکھی تو مُنہ بن گیا۔ جعلی نے رنگ بدلا تھا، خدوخال وہی تھے البتہ بالوں کے بدلے ہوئے رنگ اور انداز نے خرم چوہدری کو خاصا بدل دیا تھا۔ ریڈی میڈ میک اپ میں کئی طرح کی سہولتیں بھی تھیں میں جب چاہتا جعلی اُتار کر خرم سُلطان بن سکتا تھا

"تمھارے لیے ایک نئی گاڑی تمام کاغذات کے ساتھ باہر کھڑی ہے یہ رہا تمھارا لائسنس" بوچی نے سُرخ جلد والی چھوٹی سی کاپی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "اس میں درج کوائف ذہن نشین کر لو کہیں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ فوٹو میک اپ کے مطابق ہے۔ میں نے ایک جھلکتا کو یہ چہرہ بنا کر سب کاغذات بنوائے ہیں"

میں نے لائسنس کھول کر کوائف نامہ پڑھا، بوچی نے میرے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے عبدالباسط نام دیا تھا۔ تولیت کے خانے میں امریکن درج تھا۔ میں نے اُسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھا اور لائسنس جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

"دستاویزات کے مطابق اب تم امریکن ہو" وہ چمڑی بیگ لبادے سے نکالتا ہوا بولا۔ "اس لیے کرنسی بھی امریکن ہوگی، اس میں دس ہزار امریکی ڈالر ہیں اور ضروریات کے لیے مقامی کرنسی بھی موجود ہے۔ وعدے کے مطابق پچاس فیصد ایڈوانس دے رہا ہوں، مجھے اُمید ہے تم معاہدے کی پابندی کرو گے"

"میرے محترم" میں نے اس کا سرد ہاتھ تھام لیا۔ "گو ہر کام کا نتیجہ مثبت نہیں ہوتا، کامیابی کے ساتھ نامرادی بھی ہوتی ہے۔ بہرحال میں اپنی تمام تر صلاحیتوں سے کام کروں گا اور دونوں صورتوں میں آپ تک واپس آؤں گا"

"میں نے تم پر اعتماد کرتے ہوئے یہ قدم اُٹھایا ہے۔ تم نیک نیتی سے کام کرو اور نتیجہ بھگوان پر چھوڑ دو۔ آؤ میں تمھیں گیٹ تک چھوڑ آؤں"

گیٹ پر رُک کر بوچی نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "خوش بخت نوجوان! پیشانی پر کوئی تحریر ہوتی ہے اور تمھاری پیشانی پر خوش بختی کا ستارہ روشن ہے" میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور سوچتا ہوا سامنے کھڑی کار کی جانب بڑھنے لگا کہ یہی ستارہ چنگ چی کو دکھائی دیا تھا۔ اگر یہ خوش بختی کی علامت ہوتا تو میں مرتے مرتے کے پتھر کا نصیب لے کر لوٹ سکتا نہ پھرتا، پھر بھی چنگ چی، اُتم چندر اور بوچی مجھے خوش بخت سمجھتے تھے۔

ویران سڑک پہ کار دوڑنے لگی تو مجھے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ شاید اس لیے کہ قیدی رہا ہو کر سیدھے اپنے گھر کا ہی رُخ کرتے ہیں۔

ایک چوک پہ پولیس کی پٹرولنگ جیپ دکھائی دی، میں نے اپنی کار جیپ کے قریب روک دی۔

"آفیسر" میں امریکن سب و لہجے میں بولا۔ "کسی اچھے ہوٹل تک میری رہنمائی کریں" اُس نے ڈیش بورڈ سے ایک سرورق نما بچہ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ کتابچہ سیاحتی گائیڈ کا مکمل نقشہ تھا۔ ایک ایک سڑک، عمارتیں، درس گاہیں، عبادت خانے، ہوٹل وغیرہ سب کچھ وضاحتوں اور رنگوں کے ساتھ نقشے میں تھا، میں نے نقشہ آفیسر کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "پوزیشن پلیز" وہ دروازہ کھول کر نیچے اُترا آیا اور نقشے کی ایک لکیر پہ پنسل چلاتا ہوا چوک کے کونے نشان پر رُک گیا، جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں سے دائیں جانب والی سڑک پر خوراستار ہوٹل تھا۔ میں نے آفیسر کا شکریہ ادا کیا اور ہوٹل کی جانب چل پڑا۔

ہوٹل کر بند کے کاؤنٹر سے ڈرم سٹک دار کی چابی لے کر میں نے لفٹ کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ کاؤنٹر کلرک نے معذرت خواہانہ آواز میں بتایا۔ "مجھے افسوس ہے جناب بارہ بجے یہ سہولت ختم ہو جاتی ہے"

میں نے کندھے اُچکائے اور سیڑھیوں کی جانب چل پڑا، کیونکہ پریشانی نہ تھی میرا کمرہ دُوسری منزل پر تھا، اگر دسویں یا گیارہویں منزل پر ہوتا تو مجھے دقت ہوتی، کمرہ جدید سہولتوں سے آراستہ تھا، کہاں گندہ اور سیلن زدہ تہہ خانہ اور کہاں وسیع و عریض فرنشڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرہ۔ جی خوش ہو گیا تھا، چونکہ میرے پاس تن کا لباس ہی تھا اس لیے صرف جوتے اُتارے اور بستر پر گر گیا۔

ارادہ تو سونے کا تھا لیکن نیند کا بھی اپنا مزاج ہوتا ہے۔ آنا چاہے تو تختۂ دار پر بھی آ جاتی ہے اور نہ آئے تو گداز بستر پر بھی نہیں آتی، یہی سوچتے سوچتے پوری رات گزر گئی۔ مجھے سب سے پہلے کس کا قرض چکانا چاہیے۔ آخر جب میں اس فیصلے پہ پہنچا کہ پہلے جانسن کا حساب بے باق کر کے اپنی ساکھ برقرار رکھنی چاہیے تو صبح کی روشنی کھلی کھڑکیوں سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

میں نے سرد رُوم سے رابطہ قائم کر کے، ہاتھ صاف کرنے کا سامان، صابن، بالوں کا بُرش اور شیونگ کا سامان اپنے کمرے میں منگوایا۔ دسویں منٹ پہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ایک گول چہرے والی، سادگی سی خلیائی لڑکی تھی جو چہرے پہ مسکراہٹ سجائے کھڑی تھی، اُس کے ساتھ ایک نوجوان ویٹر تھا جس نے میرا مطلوبہ سامان اُٹھا رکھا تھا۔ نوجوان سیدھا باتھ رُوم کی طرف چلا گیا، اور وہ خلیائی لڑکی پلکیں جھکا کر مؤدب لہجے میں بولی "مسٹر کارا، نیتو کارا۔ میں اس ہوٹل کی مینیجر ہوں۔"

"شکریہ مس ۔۔۔۔!"

"نہیں مسٹر کارا۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "مسٹر کارا جنرل مینیجر ہیں۔ آپ کچھ اور منگوانا چاہتے ہوں تو بتا دیجیے۔"

"نہیں۔ شکریہ مسز کارا۔" اتنے میں ویٹر سامان باتھ رُوم میں رکھ کر باہر نکل آیا اور نیتو کارا میزبانہ مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

غسل اور شیو کے بعد میں خود کو بالکل تر و تازہ محسوس کرنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے ناشتے کا آرڈر دیا۔

میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں یہ سمجھتے ہوئے کہ میرا برتن اُٹھانے آیا ہوگا۔ دروازے کی طرف دیکھے بغیر کہہ دیا۔ "یس کم اِن۔"

کوارٹ دھڑ سے بند ہوئے تو میں نے پھرتی سے پلٹ کر دیکھا اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کمرے میں مارشا کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ سُتا ہوا تھا اور وہ ایک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔ اس کی حالت ابتر نظر آ رہی تھی۔

میں وارفتہ وار اُس کی جانب بڑھا۔ وہ بھی بانہیں پھیلا کر میری جانب بڑھی تھی۔ خوشی سے اُس کے مُنہ سے ایک دل گداز چیخ نکل گئی تھی۔ "خرم۔ خرم۔ میرے پیارے بھائی۔" وہ دیوانوں کی طرح چیخی۔ "تم کہاں تھے؟ اُنھوں نے سب کچھ ختم کر دیا ہے، تباہ کر دیا ہے۔" میں جب تک بُچی ابرداؤد کے پاس پہنچی تو وہاں تو تم نہیں تھا۔ ابرداؤد مجھے لے کر فوراً ایک ڈاکٹر کے پاس گیا اور جب ہم واپس آئے تو ابرداؤد کی بُلند عمارت ملبے کا ڈھیر بنا دی گئی تھی۔ ہمارے پیچھے آرمی نے ریڈ کر دیا تھا۔۔۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے جانے کے بعد میرا پیارا گوتم عمارت میں واپس آ گیا تھا اور عمارت کی تباہی کے ساتھ ساتھ ہم سے گوتم بھی جُدا ہو گیا۔" وہ سسکیاں بھرتی ہوئی گلوگیر آواز میں کہنے لگی۔ "گوتم ہم سے چھن گیا ہے خرم۔"

"نہیں۔ نہیں۔" میں تم سے چلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "گوتم کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"یہ سچ ہے میرے بھائی۔ تم سے ایک وفادار بھائی اور مجھ سے بہت کچھ چھن گیا ہے۔ سب کچھ خرم۔ میں تمھیں پکارتی رہی، آوازیں دیتی رہی، لیکن تم نے میری پکار نہیں سُنی۔ اُس نادر شاہ ذہین سے ایک ناقابلِ یقین منظر مجھے دکھایا۔ تم تہہ خانے میں اور مُنہ پڑے تھے۔ میں نے تمھیں آوازیں دی لیکن تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر دُوسرا منظر بھی میں نے دیکھا تھا۔ ایک لڑکی تمھارے قریب بیٹھی تم سے باتیں کر رہی تھی، تب میرے مُنہ پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں تم تک اپنی آواز نہ پہنچا سکی تھی۔" یہ کہہ کر وہ لرزنے لگی۔ میں نے اُسے سنبھال کر صوفے پہ بٹھا دیا اور خود اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

مارشا نظریں جھکا کر سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ ایک بہن کی اپنے بھائی کو بچانے کے لیے قربانی کی ایک لرزہ خیز کہانی ہے۔ مجھے تمھاری زندگی ہر چیز سے بڑھ کر پیاری تھی خرم، جب اُس نے تمھاری زندگی کا مول لگایا تو میں نے دل میں ایک مستحکم ارادہ کرتے ہوئے بظاہر اُس کی بات مانتے ہوئے بھائی کی زندگی بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس نے جیرا مجھ سے تمھاری زندگی کی قیمت وصول کر لی تھی۔" وہ ہچکنے لگی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپاتے ہوئے کہنے لگی۔ "۔۔۔۔ جیت گیا اور میں ہار گئی تھی۔ اس دوران میں میں بے ہوش ہو گئی تھی اور مجھے ہوش آیا تو میں گہرے کی سیڑھیوں پر پڑی ہوئی تھی۔ جاتے سورج کا بجھا ہوا اور مجھ پر بجلی گرچکی تھی۔ میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ۔ وہ کون تھا بُچی یا تم چند؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"وہ۔ وہ جس نے تمھیں رہا کیا تھا۔" مارشا نے سسکیوں میں بتایا۔ "اُس نے تمھاری زندگی کا سودا چکایا تھا۔"

"شیطان بُچی۔" میں مٹھیاں بھینچ کر چلّایا۔ میری نس نس میں شعلے بھڑک اُٹھے تھے، مارشا نے جو کچھ بتایا تھا وہ اس قدر لرزہ خیز اور دل خراش تھا کہ میرا پورا جسم لرز اُٹھا تھا، میں چیخنا اور دہاڑنا چاہتا تھا لیکن حلق میں کچھ پھنس گیا تھا، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مارشا مر گئی تھی۔

مارشا نے ایک خبر نہیں دو خبریں سُنائی تھیں۔ ایک گوتم کے مرنے کی اور ایک اپنی موت کی۔

"نہیں خرم نہیں۔" انتقام کا نام سُن کر اُس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ "تم کسی سے انتقام نہیں لو گے۔ میں تمھیں اُس دوزخ میں پھر نہیں جانے دوں گی۔ ہمارا خدا خود اُس سے انتقام لے گا۔ مجھے گوتم نے بتایا تھا کہ جو لوگ انتقام لینے کی سکت رکھنے کے باوجود اپنا معاملہ خدا کی طرف لوٹا دیتے ہیں خدا اُس معاملے کو اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ میں تمھیں ضائع نہیں کر سکتی خرم، میرا اب اِس دُنیا میں کوئی نہیں رہا۔"

"کیا سب لوگ شہید ہو گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"شاید، وہاں ملبہ ہٹانے کا کام جاری ہے، جو لاشیں ملی ہیں ناقابلِ شناخت ہیں، اُن میں بھی ہمارے گوتم کی لاش ہوگی۔ ساری لاشیں جل کر کوئلہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں غم سے نڈھال ہو گئی۔۔۔ اور بوجھل قدموں سے روتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ میں وقتی طور پہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی اور روتی ہوئی سڑکوں پر بلا مقصد پھرنے لگی تھی۔ میں روتی ہوئی یہاں سے گزر رہی تھی۔" وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بتانے لگی۔ "اچانک ہی تمھاری خوشبو نے مجھے پکار لیا اور میں دوڑتی ہوئی یہاں آ گئی۔"

"مارشا۔" میں نے اُس کے بکھرے بالوں کو سُلجھاتے ہوئے کہا۔ "تمھیں کچھ یاد ہے۔ کس نے عالمِ بے ہوشی میں تمھیں خانقاہ سے نکالا تھا؟"

"نہیں۔" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے ریسیور اُٹھا کر آپریٹر سے ڈیسٹ خانقاہ کے چیف بُچی سے رابطہ ملانے کی درخواست کی، اُس نے فوراً ہی نمبر ملا کر گھنٹی دے کر مجھے اطلاع دی تھی۔ بُچی کی سیٹی نما آواز میں نے پہچان لی تھی۔ شاید وہ اپنی خواب گاہ میں تھا۔

"محترم پروہت، میں باسط بول رہا ہوں۔ کیا میں آزادی کے ساتھ بات کر سکتا ہوں؟" میں نے اسی کا تجویز کیا ہوا نام بتایا۔ میرا نام سُن کر وہ غرایا تھا یا ہانپنے لگا تھا، کچھ ایسی ہی آواز تھی۔

"ہاں۔ بولو کیا بات ہے؟"

"میں امانت واپس کرنے آ رہا ہوں، آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"کیا مل گئی، اتنی جلدی؟"

"ہاں۔ بہت آسانی سے بقایا رقم تیار رکھیں۔"

"چلے آؤ، میں اپنا آدمی گیٹ پر بھیج رہا ہوں، باسط کے رُوپ میں آنا۔"

"بہتر جناب۔" میں نے ریسیور رکھا تو مارشا دوڑ کر آئی اور میرا ہاتھ تھام کر بولی۔

"نہیں، میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔"

"جانِ برادر، ضد نہ کرو۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "اگر میں اُدھر نہ گیا تو جانتی ہو کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا خرم۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔" اُس نے میرے ہاتھ جکڑ لیے۔ "ہم یہاں سے دُور چلے جائیں گے۔"

"میں ہمیشہ جیتا رہوں گا مارشی، میری رُوح کی تسلی کو یہ انگارہ جلتا رہے گا، کیا تم اپنے بھائی کو خلتا دیکھنا پسند کرو گی، مجھے جانے دو۔ میں قرض ادا کر کے فوراً لوٹ آؤں گا۔"

مارشا نے خلاف توقع مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے متعجب نگاہوں سے اُسے دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔ میں نے اُس کے کندھے تھپتھپائے اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

بدھسٹ خانقاہ کے گیٹ پر ایک بھکشو ٹہل رہا تھا، مجھے ہی میں نے ہارن دیا وہ لپکتا ہوا آیا اور جھک کر بولا۔ "کیا میں عبدالباسط کو سلام کر رہا ہوں؟" میں نے اثبات جنبش دی۔ "چلیے جناب گاڑی میں اندر لے چلیں۔" لیکن میں گاڑی کے ساتھ اندر جا کر پھنسنا نہیں چاہتا تھا، میں تو دیوار پھاند سکتا تھا مگر گاڑی بند گیٹ کو کسی مشکل لمحے میں پھاند سکتی تھی۔

گیدری سُنسان تھی۔ خانقاہ پہ مصاب شکن سکوت طاری تھا۔ خانقاہ سارے لوگ عبادت میں معروف تھے۔ خاموشی اُن کی عبادت کا لازمی جزو ہوتی ہے۔ فضا میرے لیے سازگار تھی۔ میں جانتا تھا میں راستوں سے گزرتا جب بُچی کے استھان میں داخل ہوا تو وہ کمرہ خالی تھا۔

"میرے ساتھ تشریف لائیں جناب۔" بھکشو نے بغلی دروازے کی جانب قدم بڑھایا، میں اُس کے پیچھے اندر داخل ہوا۔ سامنے چبوترے پہ آلتی پالتی مارے بُچی بیٹھا دکھائی دیا۔

اُس نے ہاتھ اُٹھا کر میرا استقبال کیا، اُس کے چہرے پر گناہ کی پشیمانی تھی نہ جرم کا خوف تھا۔ وہی بے تاثر مردہ چہرہ مسکرانے کی کریہہ کوشش کر رہا تھا۔ میں اُس کی ایک طاقت سے باخبر تھا، اس لیے میں نے بھی آنکھوں میں اُترتی ہوئی سفاکی اور خون چھپاتے ہوئے چہرے پہ مسکراہٹ کی ایک اور جھلی چسپاں کی تھی درندہ مجھے پھر سِل پتھر بنا کر تہہ خانے میں ڈال دیتا اور میری دُکھیاری بہن مارشا میرا انتظار کرتی رہتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بیٹھ جاؤ شیر دل نوجوان، تمھاری اطلاع نے مجھے حیران کر دیا تھا۔"

"میرے ساتھ حیرتوں کی بارات چلتی رہتی ہے جناب۔" میں نے جواب دیا۔ "کہیا آپ نے دُوسری قسط کا انتظام کر لیا ہے؟"

"ہاں۔" اُس نے چہرے کے نیچے سے ایک بیگ نکال لیا۔ "دولت کی میرے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ پھر میں جانسن اور اُس چند سے منہ مانگی قیمت وصول کرنے کی پوزیشن میں ہو گیا ہوں۔"

"یہ رقم بہت کم ہے۔" میں نے بیگ کو ٹھوکر ماری۔ "تم نے مجھ سے جو موتی خریدا ہے، وہ انمول تھا۔ میں اُس کا معاوضہ حاصل کرنے آیا ہوں۔"

"موتی۔!" وہ سراسر حیرت آواز میں بولا۔ "کون سا موتی؟"

"وہ موتی جو تم نے میری زندگی کے بدلے حاصل کیا ہے یاد کرو۔"

"اوہ۔" وہ تڑپ کر بولا۔ "تو وہ لڑکی..." اس سے قبل کہ وہ انگاروں کا جال مجھ پر پھینکتا، میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور بوٹ کی نوک اُس کی ٹھوڑی کے نیچے اُٹھتی انداز میں ماری۔ وہ الٹ کر پیچھے جا گرا، میں پھر اچھلا اور اُس کے سینے پر دونوں پاؤں مارتا ہوا نکل گیا۔ سینے کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز آئی، لیکن عجیب بات تھی کہ وہ ایک بار بھی نہیں چیخا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی لاش کو ٹھوکریں مار رہا ہوں۔ میرے غصّے کا سارا اُبال تحلیل ہونے لگا۔ میں تو اُس کی کراہوں، کراہوں اور جان کنی کے عذاب سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا لیکن اُس نے مجھے مایوس کر دیا تھا، تب میں نے جھک کر ایک ہاتھ ٹھوڑی اور دُوسرا پچھلے حصّے پر رکھا اور جھٹکا دے کر گردن توڑ دی۔ اُس کا پورا منہ غارکے دہانے کی طرح کھل گیا تھا اور آنکھوں میں حیرت منجمد ہو گئی تھی، جب میں بیگ اُٹھا کر سیدھا کھڑا ہوا تو جھٹکتا ہوا موتی سا چہرہ دکھائی دیا... وہ آنکھیں پھاڑے دروازے میں کھڑا تھا۔ اُس نے چیخنے کے لیے جیسے ہی منہ کھولا، میں نے سرعت کے ساتھ بیگ کو پوری قوت سے اُس پر دے مارا، ضرب کھا کر وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر گرنے ہی لگا تھا کہ میں ایک لمبی جست لگا کر اُس کے سر پر پہنچ گیا... دُوسرے لمحے وہ بھی بُوچی کی لاش کے قریب اُوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اُسے اُوپر اُٹھا لیا، وہ کیکڑے کی مانند ہاتھ اور پاؤں چلانے لگا تو میں نے دُوسرے ہاتھ کی ٹکّ اُس کی پسلیوں میں ماری۔ "اگر تم نے آواز نکالی تو اُس کا حشر دیکھو گے۔" وہ گھگیانے لگا۔ "میں تم سے صرف ایک بات پُوچھ کر چلا جاؤں گا۔ بتاؤ جانسن کہاں ہے؟" اُس نے نفی میں زور زور سے سر ہلایا، تب میں نے اُس کو بُوچی کی لاش پر اُچھال دیا۔ "لعنت

اگر تم نے زبان کھولی تو میں واپس بھی آ سکتا ہوں۔"

"میں نے کچھ نہیں دیکھا جناب۔" وہ لیٹے لیٹے سسک کر بولا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔"

"چلو مجھے باہر چھوڑ آؤ۔" میں نے تحکمانہ آواز میں کہا...

وہ اچھل کر اُٹھا اور لمبا وہ دُرست کرتا ہوا میرے آگے آگے چل پڑا۔

جب میں ہوٹل واپس پہنچا تو مارشا مجھے دیکھتے ہی دیوانہ وار دوڑتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ "تمھارے جانے کے بعد میں خُدا کے حضور سجدے میں گری تمھاری سلامتی کی دُعائیں مانگتی رہی ہوں۔"

"اور دیکھو تمھاری دعائیں مجھے ساتھ لے آئی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا کر آئے فرہم؟"

"وہی جو ایک غیرت مند بھائی کو کرنا چاہیے تھا۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں۔" اُس نے بیگ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے متردّد لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "خُدا ظالم کے ساتھ نہیں ہوتا مارشا جان۔"

"میں نے خُدا سے برتر سے یہی دُعا کی تھی جو اُس نے قبول فرمالی۔"

میں نے دیکھا ناشتہ میز پر لگا ہوا ٹھنڈا ہو چکا تھا، اس لیے میں نے سروس رُوم کو دو آدمیوں کا گرما گرم ناشتہ لانے کا حکم دیا۔ ناشتے کے دوران مارشا مسلسل سسکتی رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے پوچھا۔ "کیا تم جانتی ہو ہمارے پیارے گوتھم کا قاتل کون ہے؟ البرداؤد کی عمارت کی نشان دہی کس نے کی ہے اور... کس کی ایما پر ریڈ ہوا ہے؟" مارشا نے سر کو نفی میں ہلایا۔ "سنو مارشی۔ ہمارے پیارے گوتھم اور اُن بڑے لوگوں کا قاتل چنگ چی ہے، وہی ان دونوں مجاہدین کے خلاف کارروائیوں کا انچارج ہے۔"

"ہاں۔ وہی ہو سکتا ہے۔" مارشا کی آنکھوں میں نفرت و حقارت جھلکنے لگی تھی۔

"کیا تم اپنے گوتھم کے قاتل کو معاف کر دو گی، مارشی؟"

"نہیں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "میں چنگ چی کا خُون پی کر ہی اُسے معاف نہ کر سکوں گی، جس نے مجھ سے میری زندگی کا ساتھی چھین لیا۔"

"تو پھر اُٹھو، مجھے قاتل تک لے چلو۔"

"ابھی۔ اوہ نہیں فرہم۔ دن کی روشنی میں نہیں۔"

"کیا ہم گوتھم کی رُوح کو طویل انتظار کے کرب میں رکھیں گے؟"

"لیکن۔ لیکن۔" وہ اُلجھ کر بولی۔ "احتیاط۔....."

"ہاں ہم احتیاط کو ملحوظ رکھیں گے۔" میں نے اُس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ "دن کی روشنی میں ہم اُس جہنّم کا نقشہ بھی لے لیں گے اور کچھ ضروری تیاری کر لیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

کارروائی کلیوں اور سڑکوں پر شام تک دوڑتی رہی تھی، لیکن چنگ چی کی موجودگی کا سندیسہ ہواؤں نے نہ دیا تھا۔ ہم نے جزیرے کے غیر آباد علاقوں کو بھی چھان مارا تھا۔ ساحلوں پر بنے خیمہ نما کٹیروں میں بھی تلاش کیا تھا، صرف آرمی کا ہیڈ کوارٹر کو جہنّم کو نظر انداز کیا تھا، کیونکہ مارشا اپنی بھوں شکل و صورت میں تھی، اور میرے حوالے سے وہ آرمی کی خفیہ نگاہوں میں موجود تھی۔ ہیڈ کوارٹر ایک تین منزلہ ہوٹل لانگ فیلو میں قائم کیا گیا تھا، تیسری منزل پر آرمی تھی اور دو منزلوں میں ہوٹل چل رہا تھا۔

"ایک رسک لینا پڑے گا۔" میں نے سروس اسٹیشن پر کار روک کر کہا۔ "... ہم رات کا کھانا ہوٹل لانگ فیلو میں کریں گے، عین ممکن ہے کہ ہمارا چنگ آرمی والوں کی بغل میں ہو۔"

"میں تو اُس کی تلاش میں جہنّم تک جا سکتی ہوں۔" مارشا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "مجھے صرف تمھاری فکر ہے فرہم۔ میں نہیں چاہتی تم کسی نئی مصیبت میں پھنس جاؤ۔"

مارشا نے سروس اسٹیشن پر اپنا خرد و نوش سیٹ سنبھال لی، کیونکہ میں سارا دن ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔ تھوڑے سے چنگ کی تلاش میں نکلنے سے پہلے ہم نے خاصی خریداری بھی کی تھی۔ میں نے مارشا اور اپنے لیے کئی ریڈی میڈ سوٹ، دو اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور، شکاری چاقو اور ایک بٹرفلائی چاقو خریدا تھا۔ ہنٹر کو میں نے کمر کے گرد پیٹ کر دونوں سرے بیلٹ کے بکل میں پھنسا لیے تھے۔

مارشا نے جب لانگ فیلو کے وسیع و عریض پارکنگ میں بے شمار گاڑیوں کے ساتھ اپنی کار پارک کی تو رات کے نو بجنے میں تین منٹ تھے۔ اُداسی پلاٹ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ گرمیاں چھٹی ہوئی تھیں، کچھ جوڑے پچھلوں کے تختوں کے ساتھ گھاس پر بچھی چٹائیوں پر لیٹے ہنٹر نے مشروبات سے شغل کر رہے تھے۔ ہم خالی گرمیوں کی طرف بڑھ گئے اور مارشا لان کے کونے پر بنے ہوئے ٹوائلٹ کی طرف چلی گئی تاکہ آرڈر بک کرا سکے۔

"ایک اچھی خبر ہے فرہم۔" اُس نے چہکتی آواز میں بتایا اور ایک گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"گزشتہ رات ہوٹل پر چھاپہ مار گوریلوں نے حملہ کر کے آرمی ہیڈ کوارٹر تباہ کر دیا ہے۔ اس وقت تیسری منزل کے ہال میں اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔"

"گڈ نیوز۔" میں نے اس خوشی میں سارا شربت اُنڈیل لیا۔ "اتنی جلدی کیسے معلوم کر لیا تم نے؟"

"کاؤنٹر کلرک اپنے کسی دوست کو بتا رہا تھا کہ عموماً لان میں گرمیاں نہیں لگاتے یہ تو رات گوریلوں نے ہوٹل پر حملہ کر کے تباہی مچا دی تھی۔ آرمی ہیڈ کوارٹر تباہ ہو کر رہ گیا۔"

"نقصان کی تفصیل۔" میں نے گلاس فضا میں اُچھال کر پوچھا۔

"تم بیٹھو، میں سن گن لے کر آتی ہوں۔"

اس خبر نے مجھے خوش کر دیا تھا، دن بھر کی تھکن اور کوفت یکدم ختم ہو گئی تھی۔ مجاہدین نے اپنے بھائیوں کا انتقام لے کر ایک بڑا کام سرانجام دیا تھا۔ غاصبوں کو بتا دیا تھا کہ جدید ترین اور آزادی کی شمع فروزاں مجھوکوں سے کہیں تابناک ہو چکا ہے۔ تقریباً دس منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو جوش سے اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی کہنا شروع کر دیا۔ "وہ۔ وہ یہاں ہے۔ میں نے اُس کی بُو سونگھ لی ہے۔ خُدا کی قسم! وہ کہیں قریب ہی ہے۔" وہ جوش میں یہ بات بھی فراموش کر گئی تھی کہ ہم کھلی جگہ لوگوں کے درمیان بیٹھے ہیں۔ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اُسے اس بات کا احساس دلایا تو وہ یکدم چُپ ہو گئی۔ "اوہ۔ میرے خُدا۔" وہ طویل سانس لے کر کرسی پر دھب سے گر گئی۔

"کون ہے یہاں؟ گوتھم؟" میں نے آگے جُھک کر مدھم آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔ چنگ چی۔" اُس نے بھی سرگوشیانہ انداز میں جواب دیا اور میں خود پر کنٹرول نہ کر سکا۔ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرے سارے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگیں۔

"تم بیٹھو۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں شاید چنگ یہیں کہیں قریب ہی ہو۔"

"میں بھی تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔" وہ بھی میرے پہلو بہ پہلو چل پڑی۔ "آنکھیں اور ناک مل کر اُسے آسانی سے تلاش کر لیں گے۔"

ہم ٹہلتے ہوئے ایک ایک چہرہ دیکھ رہے تھے کہ مارشا نے یکایک چونک کر میرا بازو تھام لیا۔ میں نے دم سادھ لیے دیکھ رہا تھا۔ وہ فضا کو سونگھتی خراب ناک انداز میں ایک سمت چلنے لگی تھی۔ میں بھی اُس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ سیڑھیوں پر ایک ویٹر نے ایک طرف ہٹ کر ہمیں راستہ دیا، گھومتے شیشے کے دروازے سے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ڈانسنگ ہال خالی تھا، البتہ کاؤنٹر پر ایک بوڑھا شخص رجسٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ مارشا سیدھی کاؤنٹر پر جا کر رکی۔ جب کاؤنٹر کلرک نے کوئی توجہ نہ دی تو اُس نے اُنگلی کی ٹک سے کاؤنٹر بجایا۔

"کیا مسٹر چنگ چی اپنے کمرے میں موجود ہیں؟" مارشا نے پوچھا اور بوڑھے نے گردن موڑ کر کی بورڈ کو دیکھا اور پھر چہرے پر معذرت خواہانہ مسکراہٹ سجا کر بولا۔ "سوری مادام"

"پھر دیکھیے۔ مارشا تحکمانہ آواز میں بولی۔" آدھ گھنٹہ قبل وہ یہاں تھے ہم بُودھ خانقاہ سے آئے ہیں۔"

میں بھی گنبیاں کاؤنٹر پر ٹیک کر رجسٹر پر جھک گیا تھا، وہ آمد اور رخصت کا گوشوارہ تیار کر رہا تھا۔

"ہاں کچھ دیر قبل وہ یہاں آئے تھے۔ چار یہاں یہاں رُکے غالباً میجر سے باتیں کرنے لگے تھے۔"

میں نے چہرہ گھما کر بائیں جانب دیکھا، تیسرے کیبن کی پیشانی پر میجر کی نیم پلیٹ آویزاں تھی اور سبز پردے سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ میں گھومتا ہوا ڈانسنگ ہال کی جانب چند قدم گیا پھر قدموں کا رُخ پھیر لیا، کاؤنٹر کلرک پھر رجسٹر پر جھک گیا تھا۔ مارشا نے مجھے لفٹ کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود بھی تیز تیز قدم اُٹھاتی اُدھر چل پڑی تھی۔ "اوپر ہے یہ بوڑھا جھوٹ بولتا ہے۔" میں نے سرگوشیانہ میں جنبش دی کیونکہ مجھے مارشا کی سماعت پر یقین تھا۔ زبان جھوٹ بول سکتی تھی آنکھیں دھوکا کھا سکتی تھیں لیکن مارشا کی سُونگھنے کی صلاحیت نے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ اُس نے لفٹ کال کرلی اور بٹن ہی لفٹ کا دروازہ کھلا ہم اندر داخل ہو گئے۔ اُسی نے دُوسری منزل کا بٹن دبایا تھا۔ "اگر وہ چل گیا تو کیا یہاں ہی۔۔۔" بات نامکمل چھوڑ کر اُس نے میری جانب دیکھا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

دُوسری منزل سنسان تھی سناٹا سا چھایا تھا۔ غالباً حادثے کے بعد لوگوں نے سوئچ بورڈ بند کر دیا تھا۔ مارشا کاریڈور میں رُک کر پھر فضا سُونگھنے لگی اور سیڑھیوں کی جانب چلنے لگی۔ خم دار سیڑھیاں چڑھ کر جب ہم تیسری منزل پر پہنچے تو مارشا نے چھاپہ ماروں کی کارروائی کا مشاہدہ کیا۔ قالین کے ٹکڑے بکھرے، شیشے کی کرچیاں، ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور چابی لگے خانوں کے بڑے بڑے دریچے، قیامت کے گزرنے کا مُنہ بولتا ثبوت تھے۔

مارشا دبے پاؤں بے کواڑ دروازے میں جا کھڑی ہوئی میں بھی آہستہ آہستہ چلتا وہاں پہنچا ہی تھا کہ میری نگاہ کچھ سے ہوئے بتاہ شدہ فرنیچر کے درمیان جم گئی۔ چنگ چی ایک توندلی ہوئی الماری میں گردن گھسیڑے جلے بجھے کاغذوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی ایک باوردی آفیسر سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا، مارشا نے گردن موڑ کر شاید داد طلب کی تھی یا وہ اگلے قدم کے بارے میں استفسارانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُسے اشارے سے بُلایا اور دس قدم دُور لے گیا اور سرگوشی کی۔ "تم پیچھے لان میں میرا انتظار کرو۔ اگر میں کار لے کر نکل جاؤں تو تم ہوٹل پہنچ جانا۔" اُس نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولنا چاہا تو میں نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے چُپ کرا دیا۔ وہ روہانسی سی ہو کر چل پڑی تھی۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لان تک چلی گئی ہو گی تو میں نے ریوالور نکال کر سائیلنسر چیک کیا اور دروازے کی جانب بڑھا، آفیسر ایک اُدھ جلا کاغذ پڑھ رہا تھا اور چنگ چی ہنوز الماری سے ایک ایک ورق نکال رہا تھا۔ فیصلہ تو میں اُن کو دیکھتے ہی سُنا چکا تھا صرف اسے عمل جامہ پہنانا تھا، میں نے ریوالور سیدھا کیا اور چشمِ زدن میں آفیسر کا جسم پھر پُور جھٹکا کھا کر کاغذوں کے ڈھیر پر اوندھا ہو گیا، گولی کی آواز پر ہی چنگ نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ گومیرے چہرے پر مصنوعی چہرہ چپکا ہوا تھا پھر بھی چنگ چی مجھے دیکھ کر بُری طرح اُچھلا تھا۔

"تم پیارے انکل" میں نے نقلی چہرے سے اصلی آواز میں کہا۔ "بڑی مدت بعد ملاقات ہوئی ہے۔"

چنگ کی گول گول چندھیائی آنکھوں میں پہلے اُلجھن نظر آئی پھر دہشت جھلکنے لگی تھی۔ لیکن یہ کیفیت چند سیکنڈ تک برقرار رہی تھی۔ اُس کے اندر سویا ہوا گرینڈ ماسٹر چنگ چی جیسے بیدار ہو گیا تھا، اُس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اُس کا طویل لاغر بدن پہلے سیدھا ہوا پھر سُکڑنے لگا جیسے بھیڑیا شکار پر جست لگانے کی تیاری کر رہا ہو، ایک قدم پھر دُوسرا قدم تیسرے قدم پر وہ پاؤں پھیلا کر رُک گیا، اُس کی نگاہیں میرے جسم کو چھید رہی تھیں۔

"شیر کی کچھار میں تم جیسے اناڑی شکاری کو داخل نہیں ہونا چاہیے تھا خرم چوہدری۔"

"میں پہلے بھی تمہاری کچھار میں گھسنے کا اعزاز حاصل کر چکا ہوں انکل۔" میری آواز میں طنز اور لہجے میں سفاکی تھی۔ "اور آج بھی تمہارا بچہ توڑ کر واپس نکلوں گا۔"

"نہیں لڑکے" وہ غرّایا۔ "آج فیصلے کی رات ہے، ایک فیصلہ ہو جانا چاہیے، تمہارا قرض بڑھتا جا رہا ہے۔"

"شکریہ انکل" میں استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ "تم نے میرے مُنہ کی بات چھین لی ہے، میں بھی تمہارے پیچھے بھاگتے بھاگتے تنگ آ گیا ہوں، عمر کے تقاضے تحت تمہیں اب مکمل آرام کرنا چاہیے، ایسا پُرسکون آرام کہ اُس آرام میں دُنیا کی کوئی خواہش اور آواز مخل نہ ہو اور مجھے بھی اپنی انرجی تار کیوں میں ضائع نہیں کرنی چاہیئے، میں اُس غار سے باہر نکلنا چاہتا ہوں جس میں تم اور میری بچو نے مجھے دھکیل دیا تھا اور خود چٹانوں کی طرح دہانے پر جم گئے تھے، میں ایک چٹان اُٹھا کھا چکا ہوں صرف مجھ سبتداہ ہو، میں تمہیں ہٹا کر آزاد اور روشن دُنیا کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہوں۔"

"اگر میں تمہیں سچے دل سے نکل جانے دُوں تو؟"۔۔۔ وہ مفاہمت آمیز آواز میں بولا۔ "دراصل کوشش کے باوجود میں تمہیں ہلاک نہیں کر سکا، شاید اس لیے کہ تم میرے پسندیدہ نوجوان ہو لوٹ جاؤ خرم سلطان میں تمہیں یقین دلاتا ہوں تمہاری راہ نہیں روکی جائے گی، اس میں میرا دُنیاوی مفاد بھی ہے، میں تمہاری وجہ سے بہروپے زیر ہو چکا ہوں، میرا یہ اعتراف ہی سچائی کا گواہ ہے۔"

مجھے بھی اعتراف کر لینا چاہیے کہ چنگ چی کے مقابلے میں ذہنی اور فنی لحاظ سے میں طفلِ مکتب ہی تھا۔ اُس نے مجھے باتوں ہی باتوں میں الجھا کر وقت اور مفاد حاصل کرنا چاہا تھا اُس میں اُسے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ میرا دھیان بٹانے میں وہ کامیاب ہو گیا تھا، میں اُسے ایک عرصے سے جانتا تھا، میں نے بارہا اُس کی ناقابلِ یقین صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا، لیکن یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ایک کمزور بدرُوح نحیف و نزار بوڑھا فضا میں تیر کی سرعت سے تیر سکتا ہے، یہی بے خبری مجھے چوٹ دے گئی تھی۔ وہ پلک جھپکنے سے بھی کہیں تیزی سے سلیپ میں ڈوبا اور میرے گھٹنوں سے ذرا نیچے ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا، کسی ایسپرنگ کی مانند سُکڑتا ہوا اپنی جگہ چلا گیا تھا، خلافِ توقع شدید ضرب نے میرا توازن بگاڑ دیا تھا اور ریوالور گرفت سے نکل کر دُور جا گرا تھا۔ پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ ریوالور پر چھلانگ لگائی وہ پھر سلیپ میں بڑھا تھا اور تیرتا ہوا اُس کے اُوپر جا گرا تھا۔

ریوالور اُس کے نیچے دب گیا تھا، میں نے اُس کی سُوجھی ہوئی ران پر مُکا مارا اور ہاتھوں کے جوڑوں میں ٹکر مار دی، اُس کے حلق سے کراہتی ہوئی دھاڑ اُبھری، پھر اُس نے پھرتی سے مجھے اُچھال دیا تھا۔

جب میں گر رہا تھا تو میری نگاہ ریوالور پر جا پڑی تھی ریوالور وہاں تھا جس جگہ میں کھڑا تھا، شاید چنگ کے ہاتھ کی اندھی اسٹروک سے سلیپ کر گیا تھا، وہ کسی مُنڈے کی مانند گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل ریوالور کی جانب لپکا لیکن میں نے گرتے گرتے کروٹ بدل لی تھی فضا میں رُخ بدلنے سے مجھے خون سے میں بخوبی آگاہ تھا، میں نے بیک وقت دو کام کر ڈالے تھے، چیل کی مانند ریوالور پر جھپٹا مارا اور دائیں بُوٹ کی لگ چنگ چی کے پہلو میں لگائی تھی، وہ ڈکراتا ہوا اُلٹ گیا تھا۔

اُٹھنے میں اُس نے صرف چند سیکنڈ ہی لگائے تھے لیکن میں نے اُس سے زیادہ پھرتی دکھائی تھی، وہ ابھی پلٹ رہا تھا کہ میں نے اُس کی سُوجھی ہوئی گردن میں دایاں بازو حائل کر دیا۔۔۔ اور دایاں گھٹنا اُس کی ریڑھ کی ہڈی پر رکھ دیا، یہ جوجستو کا ایک آزمودہ داؤ تھا جس سے ہاتھی بھی بے بسی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

پھر مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔۔۔ چنگ چی جیسے تجربہ کار لڑاکے اور شیطانوں کے چیلے کے دونوں ہاتھ آزاد تھے اور۔۔۔ میرا چہرہ اُس کے بائیں کندھے پر تھا، مجھے اپنی حماقت اور چنگ چی کی ذہانت کا احساس تب ہوا جب اُس کا بائیں اُلٹا مکہ میری ناک پر لگا اور میں ڈکراتا ہوا لڑھک گیا، ریوالور دُوسری بار پھر میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا، میری بینائی لمحہ بھر کے لیے جیسے اوجھل ہو گئی تھی اور سر لٹو کی مانند گھوم گیا تھا، پھر دُوسری کاری ضرب میرے پیٹ میں لگی۔ درد سارے بدن میں پھیل گیا اور سانس پھندے کی مانند حلق میں پھنس گئی تھی۔

تاریک ہوتے ہوئے ذہن نے بھی مجھے سوچ کی ایک کرن سُجھائی۔ وہ سوچ اپنی شکست چنگ چی کی کامرانی اور اپنی موت کے بارے میں تھی۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، چنگ پُوری طرح خادم میں تھا اور کھلی آنکھوں سے گرا ہوا ریوالور اُٹھا کر میری زندگی کے چراغ کو بہ آسانی بجھا تک مار سکتا تھا۔

ایک سیکنڈ، دو، تین سیکنڈ بیت گئے۔ دُوسری ضرب لگی، نرم گولی جسم میں پیوست ہونے کا ذائقہ نہ چکھا۔ تب میں نے سر کو زور سے جھٹکا اور روشنی کی کرن دکھی دی۔ بینائی واپس آ گئی تھی، میں نے چشمِ حیرت سے دیکھا، چنگ چی توڑے ہوئے فرنیچر کو ٹھوکریں مار رہا تھا، غالباً میرا ریوالور اُدھر سے ہو کر فرنیچر کے درمیان جا گرا تھا، آخر چنگ چی بھی انسان تھا، بوڑھا انسان، وہ دست بدست جنگ سے خوفزدہ ہو گیا تھا اور ریوالور سے مدِمقابل کو مزید جنگ سے باز رکھنا چاہتا ہو گا، صرف ریوالور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی چنگ چی کوئی اہم فیصلہ کرنے میں مدد دے سکتا تھا۔

مجھول تھا اُس سے بھی ہوئی تھی۔ اگر وہ دُوسری ضرب لگاتا تو میں اُس کے پاؤں میں ڈھیر ہو جاتا لیکن اُس نے میرا کام تمام کرنے کے بجائے رسّا اور تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے خود کو تولا اور فلائنگ ہُک کے لیے اُٹھ گیا، وہ جھکا ہُوا تھا۔ اس لیے میرا بہترین ہدف ثابت ہُوا تھا۔ ہُک زوردار تھی وہ سر کے بَل ٹوٹتے ہُوئے فرنیچر کے اندر گھُس گیا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اُس کی چلتی ٹانگوں کو پکڑا اور گھسیٹ لیا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہُوں کہ چنگ کے نانواں بُوڑھے جسم میں شیطانی قوت تھی، ورنہ فلائنگ ہُک اور ٹوٹے ہُوئے فرنیچر پر اوندھے مُنہ گرنے والا اگر کوئی پہلوان بھی ہوتا تو بے ہوش ہو جاتا، مرتا نہ تو بے ہوش ضرور ہو جاتا، لیکن وہ بُوڑھا شیطان جیسے ہی ٹوٹے ہُوئے فرنیچر سے باہر آیا تو کسی ناگ کی مانند پھنکارتا ہُوا دُہرا ہو کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور میں پشت کے بَل گر گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جلا ہُوا قالین ڈھیر کی صُورت میں وہاں تھا اور میرا سر اُسی گداز ڈھیر پر جا لگا تھا ورنہ سر کے ٹھیکرے ہو جاتے۔

چنگ چی ٹانگوں کو روندتا ہُوا میرے سینے تک آگیا اور پھر اُس کے اُستخوانی پنجے میرے گلے میں پیوست ہو گئے تھے، وہ آہستہ آہستہ اپنی اُنگلیاں سوڑنے لگا تھا۔ میں اِس کے ارادے کو بھانپ گیا تھا۔ اگر وہ اُنگلیاں دُہری کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو یقیناً اُنگلیوں سے نیزے کا کام لیتا۔ اِس فن میں وہ ماہر تھا، بس ایک لمحے کی بات تھی۔ میں نے ہتھیلیوں کو پوری طاقت سے اُٹھایا اور چنگ چی کے کانوں پر بیک وقت دو تالیاں پھوٹے اور میں نے اُسے اچھال کر پہلے گھٹنوں پر رکھا پھر دُوسرے لمحے اُسے فُٹ بال کی مانند اُچھال دیا۔۔۔ وہ پاؤں کے بَل گرا ——— اور میں پاؤں کے بَل کھڑا ہو گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اپنا رُخ نہ بدل سکا تھا، اگر اُس کی پشت میری جانب نہ ہوتی تو وہ بھی جوابی داؤ آزماتا، میں نے بڑے آرام سے اپنا بازو اُس کے گلے میں ڈال دیا۔ "لیں اُنکل کھیل ختم ہو چکا ہے۔" میں نے جھرجھراتی آواز میں کہا۔ "اگر حرکت کرو گے تو گردن اور ریڑھ کی ہڈی توڑ دُوں گا، میری چند باتیں بغور سُنو اور کوشش کرنا درست جواب دے سکو، کیا الجواد اُدوکے ہیڈ کوارٹر پر آرمی ریڈ تمہاری ایما پر ہُوا تھا؟" اُس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے پتہ چلا ہے کہ اُس ریڈ کے دوران میرا بھائی گو تم بھی شہید ہو گیا ہے، کیا یہ سچ ہے؟"

"ہم۔۔۔ ہیں۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں ہکلانے لگا تب میں نے گرفت ذرا ڈھیلی کر دی۔ "میں ساتھ نہیں تھا، سُنا ہے کچھ لوگ دیوار پھاندنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

"جوزی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اُسے ماما مام سعد نے ہانگ کانگ بھجوا دیا تھا۔"

"ایک آخری اور اہم سوال اُنکل۔"

"پوچھو۔"

"وہ سنگی سہل کہاں ہے۔ جس کے اندر مہاتما بُودھ کی شُورتی ہے؟"

"اگر۔ اگر جان کے بدلے وہ تمہیں مل جائے تو؟"

"نہیں۔۔۔ تم سودا بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو، ہاں اگر جبریل کوئی شرط نہیں سنوایا کرتا۔"

"تمہیں میری موت سے کیا ملے گا خُرم؟"

"کیا تم جیسا شخص موت سے خوفزدہ ہے؟"

"نہیں۔" وہ تھُن سا گیا۔ "بولو کیا چاہتے ہو؟"

"وہی سہل کیونکہ کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہُوئے ہیں، بتا چکا ہُوں کہ میں واپس اپنی دُنیا میں جانا چاہتا ہُوں، جانے سے قبل لین دین کا حساب صاف کر رہا ہُوں۔"

"میرے کمرے میں، باتھ رُوم کے آئینے کے پیچھے دیکھ لینا۔"

"شکریہ اُنکل۔" ساتھ ہی میں نے اُس کے بدن کو پیچھے جھٹکا دے کر دُہرا کر دیا۔ گھٹنا مہروں پر جا ہُوا تھا، نہ جانے کتنے مُہرے رُک گئے تھے، اُسے اذیت سے بچانے کے لیے دُوسرا جھٹکا دیا میں ہاتھ نے گردن کو دے ڈالا تھا، سُوکھی ہُوئی گردن سُوکھی لکڑی کی طرح ٹوٹ گئی۔

"میری زندگی کا دُوسرا باب اور تمہاری زندگی کا آخری باب ختم ہو گیا ہے چنگ چی۔" میں نے اُس کے تڑپتے جسم پر آخری نگاہ ڈالی اور دُکھ کی گہری سانس لے کر چل پڑا۔۔۔!

جیب میں سنگی سہل پیٹ پر بیلٹ کے نیچے باندھ کر نیچے اُترا تو کاؤنٹر پر وہ بُوڑھا ہنوز تڑپتا جھٹکا کو شوارہ مرتب کر رہا تھا۔

لان کی رونق پُورے شباب پر آچکی تھی، کوئی گوشہ خالی نہ تھا، میری نگاہیں مارشا کو تلاش کر رہی تھیں، اچانک میرے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا، میں اُچھل گیا لیکن وہ ہاتھ مارشا کا تھا۔

"سب ٹھیک ہے نا؟" مارشا نے سامنے آکر پوچھا۔

"ہاں۔ اِن دنوں تمہاری دُعاؤں میں بہت اثر ہے۔

دوسری چٹان بھی آج بھر گئی ہے۔ بس ایک چھوٹا سا قرض باقی ہے، دعا کرو وہ بھی اُتر جائے تو میں اپنی بہن کے ساتھ سلاتی اور روشنی کی طرف چل سکوں، ارے ہاں ایک بات اُس نے بتائی ہے، ریڈ کے وقت کچھ لوگ دیوار پھاند کر فرار ہو گئے تھے اللہ کرے اُن میں ہمارا پیارا گو تم بھی فرار ہو گیا ہو۔"

"واقعی۔" مارشا کی چیخ نکل گئی۔ "خدا کرے۔ خدا کرے۔ پھر تو مجھے ہواؤں سے گو تم کے بارے میں ضرور پوچھنا چاہیے۔"

"پوچھو، ضرور پوچھو، میرا دل کہتا ہے مارشی، ہمارا گو تم زندہ ہے۔"

جب کار سڑک پر دوڑنے لگی تو مارشا نے چہرہ باہر نکال لیا تھا، یقیناً وہ اپنے کو تم کو ہواؤں میں تلاش کرنے لگی تھی۔ اِسی لیے میں نے اس کو ڈسٹرب نہ کیا تھا، میں چاہتا تھا کہ وہ پُوری یکسوئی اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر گو تم کو تلاش کرے۔

اب صرف جانسن ہی ایک ایسا شخص رہ گیا تھا جو میرا قرض خواہ تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ مارشا صرف اُسی جو کو تلاش کرنے کی اہل ہے جسے وہ قریب سے جانتی ہو، صرف تام سُن کر وہ میری مدد نہیں کر سکتی تھی، اِس لیے میں اُسے گو تم کی تلاش میں مگن رکھ کر خود جانسن کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔

کار ایک سڑک سے دُوسری سڑک پر مُڑتی رہی اور میں جانسن کی یادوں میں ڈُوبتا رہا۔۔۔

معاً میری نگاہ ایک سڑک اِستادہ ایک بورڈ پر جا پڑی، ڈرگ اسٹور کے باہر پبلک کال آفس کا بورڈ تھا، میں نے کار موڑ کر پبلک کال آفس کے سامنے روکی اور مارشا کو بٹھا کر اُتر گیا، میرے پاس وقت نہ تھا۔ میں اِس جزیرے سے نکلنا چاہتا تھا، محمد و جزیرے میں میری خُفیہ کارروائیاں بڑھتی جا رہی تھیں، اِس سے قبل کہ کوئی ذہین خُرم چہ ہدری کی جانب پرواز کرتے تھے، میں یہاں سے دُور نکل جانا چاہتا تھا۔ بوتھ میں داخل ہو کر میں نے فائقاہ کا نمبر ڈائل کیا۔ دُوسری طرف گھنٹی بجنے لگی جو تھی گھنٹی پر جواب ملا تھا۔ "پنڈت اُتم چند سے بات کروائیں جناب۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"ہیلو۔ کون؟" اُتم چند کی بھرائی ہُوئی آواز سُنائی دی۔

"آپ کا داس خُرم سلطان مہاراج۔"

"اوہ۔" اُدھر سے چیخ کار سُنائی دی پھر جیسے لائن مُردہ ہو گئی تھی۔

"سُنیے پنڈت مہاراج میں مشکل میں گھر گیا ہُوں۔ سوال و جواب اور وضاحتوں کا وقت نہیں ہے، آپ کی مطلوبہ شے میرے پاس ہے اور وہ لوگ میرے تعاقب میں ہیں، براہ کرم مجھے سٹر جانسن تک پہنچایئے، میں زیادہ دیر مُورتی اپنے پاس نہ رکھ سکوں گا، اُن کا خبر نہتا دے دیجیے، جلدی۔"

"تم یہاں چلے آؤ لڑکے۔"

"نہیں آسکتا، سڑکیں خطرناک ہیں، اگر مورتی چاہتے ہو تو آپ کو مجھے بچانا ہوگا۔"

"نمبر نوٹ کرو۔" اُس نے نمبر بتایا اور پھر سرزنش بھرے لہجے میں بولا۔ "تم مُورتی اُس کے حوالے نہیں کرو گے۔ میں بھی وہاں آرہا ہُوں۔"

"بہتر مہاراج۔" میں نے سلسلہ توڑ دیا اور دُوسرا سکہ ڈال کر جانسن کا نمبر ڈائل کیا۔ "ہوٹل ڈی لاس۔" مترنم آواز نے بتایا۔ "کوئی خدمت جناب؟"

"مسٹر جانسن سے بات کرائیں مس۔"

"ایک منٹ انتظار فرمائیں جناب۔"

"ہیلو جانسن بول رہا ہُوں۔" ایک منٹ بعد میری سماعت سے اُس ناگ کی پھنکار ٹکرائی اور میرا بدن سرسراہٹوں کی زد میں آگیا۔ "کون ہے؟"

"آپ نامالائق بھتیجا خُرم چہ ہدری اُنکل۔"

"اوہ۔ تم۔ کہاں ہو؟" وہ گرج کر بولا۔ "تم۔۔۔ تم۔۔۔"

"حوصلہ اُنکل حوصلہ۔" میں نے استہزائیہ قہقہہ لگایا۔ "میں آپ کا تابعدار ہُوں۔"

"تمہیں کس نے رہا کیا تھا؟"

"مجھے کوئی بھی رہا نہیں کیا کرتا اُنکل۔" میں نے جواب دیا۔ "پلیز ذرا آرام سے میری بات سُن لیں۔ ابھی ابھی میں نے تم چند کو بتایا ہے کہ مُورتی میرے قبضے میں ہے اور کچھ لوگ میرے تعاقب میں ہیں، وہ شاید اُدھر آتا ہُوا تمہاری طرف آرہا ہوگا۔ اُس نے تجھے بھی تنبیہ کی ہے کہ میں مورتی کسی کے حوالے نہ کروں، اگر تم مورتی حاصل کرنا چاہتے ہو تو مجھ سے فوراً مل لو۔"

"میں کیسے یقین کر لُوں پیار سے بھتیجے۔" اُس نے جواب دیا۔ "تم خُرم سلطان چہ ہدری زور آور ضرور ہو مگر ابھی بچے ہو۔"

"ایسا کرو اپنے کسی آدمی کو بھیج دو، مورتی دیکھ جائے۔"

"ٹھیک ہے جگہ بتاؤ میں اپنا نمائندہ بھیج رہا ہُوں۔"

"کیا مُورتی اُس کے حوالے کر دُوں؟"

"ہاں۔"

"بہتر۔ اگر تم اُس کے ہاتھ ادائیگی کر دو گے تو مجھے کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اعتراض نہ ہوگا۔"

"تیسرا حصہ تین ہزار ڈالر۔ ٹھیک ہے؟" میں نے قہقہہ مارا اور ہنستے ہوئے کہا۔

"مسٹر جانسن اگر تم خرم سلطان کو جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ خرم سلطان کس طوفان کا نام ہے؟"

"تم مجھے دھمکانا چاہتے ہو لڑکے۔" وہ گرم لہجے میں بولا۔ "میرے ہاتھوں کا ڈانڈا بھول گئے ہو؟"

"خیر ڈونٹ مسٹر جانسن میں گزری باتوں کو یاد نہیں رکھا کرتا۔" میں نے مفاہمتی انداز اختیار کر لیا ورنہ وہ بدک جاتا تو مجھے ہاتھا لگانے کی از سر نو جدوجہد کرنا پڑتی۔ "میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب میں سودا کرنے کی پوزیشن میں ہوں، چاہوں تو مورتی لے کر تبت کے لاما کے پاس جا سکتا ہوں تم جانتے ہو کوئی لاما مورتی کی کیا قیمت لگا سکتا ہے۔ نیپال اور تبت کے خانقاہوں میں بھی میری پذیرائی ہو سکتی ہے اور فوری مال فروخت کرنے کے لیے اگر تم چند بھی بڑا نہیں جب کہ وہ اپنی شاگرد چندا کماری کے ذریعے مجھ تک براہ راست سودا بازی کی آفر بھی دے چکا ہے لیکن میں تھوڑا اصول پرست بھی ہوں، بانگ کانگ کے حوالے سے مورتی پر تمہارا حق فائق ہے، بس جلدی سے فیصلہ کرو، دس ہزار ڈالر۔"

"اوہ۔ نہیں برخوردار۔" وہ یکدم نرم اور دوستانہ لہجے پر آ گیا۔ "یہ میرا شہر نہیں ہے۔ میں اتنی رقم ادا نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار۔"

"اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"کیوں پیارے انکل مجھے کون روک سکتا ہے؟" میں نے طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں بے بس ہوتا تو سودا بازی کیوں کرتا؟"

"پھر ایک وعدہ تمہیں کرنا ہوگا خرم۔ مجھے کم از کم سات دن کی مہلت دو گے۔"

"اب بکواس نا بات۔" میں بشاش آواز میں چہکا۔ "سنو انکل میں تمہاری مجبوری سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاؤں گا، میں ایک سفتہ مورتی کی حفاظت نہیں کر سکتا، لہٰذا میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں۔۔۔

پانچ اب نقد ادا کر دو اور مورتی وصول کر لو۔ باقی رقم میں تم سے ہانگ کانگ میں وصول کروں گا۔"

"واہ۔ پیارے لڑکے، شکریہ۔" وہ خوش ہو گیا۔ "اب میں کسی نمائندے کو نہیں بلکہ خود آ رہا ہوں، بولو کہاں ہو؟"

"میں تو شہر میں ہوں مگر زیادہ دیر خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا، لہٰذا تمہیں خانقاہ والی سڑک پر آنا ہوگا جو خانقاہ سے نکل کر ساحل کی جانب جاتی ہے۔ میں کسی بھی جگہ تین بار ٹارچ جلا کر تمہیں روک لوں گا۔"

"اوہ۔ اتنی دور؟"

"ہاں انکل، میری تلاش میں چنگ کا گروہ سڑکوں پر دوڑ رہا ہے۔"

"او۔ کے، بوائے۔" اس نے چہک کر سلسلہ منقطع کر دیا اور میں اپنی اداکاری کو سراہتا ہوا تھرتھ سے نکل کر کار میں جا بیٹھا، مارشا باہر کھڑی چہرہ گھما رہی تھی، اسے بے کل اور دکھی دیکھ کر میری خوشی غم میں بدل گئی، وہ اپنے کھوتے ہوئے محبوب کے لیے کتنی پریشان تھی۔

"نہیں۔" وہ بلک اٹھی۔ "کہیں بھی نہیں ہے، میں اسے پکار رہی ہوں، ہو گا تو جواب ضرور دیتا۔"

"مایوسی نہیں جان بہادر۔" میں نے اسے سہارا دے کر سیٹ پر بٹھا دیا۔ میرا دل بھی بھر آیا تھا، آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ عورت ہونے کے ناتے وہ رو کر دل کی بھڑاس نکال سکتی تھی لیکن میں مرد تھا مجھے تو ضبط سے کام لینا ہی تھا، بس اندر ہی اندر آگ سلگ رہی تھی اور میں جھلس رہا تھا۔ "تم ایسا کیوں نہیں سوچتیں وہ کسی کمرے میں بھی بند ہو سکتا ہے یا مجاہدین کے ساتھ کہیں دور نکل گیا ہوگا، دعا کرو مارشا۔۔۔ رونے سے بچھڑے ہوئے نہیں ملا کرتے، میں تمہیں ہوٹل چھوڑ کر خود قرعن کی آخری قسط ادا کرنے جاؤں گا۔"

"بس کرو خرم بس کرو۔" اس نے میرے دونوں ہاتھ جکڑ لیے۔ "وہ جو کوئی بھی ہے اسے معاف کر دو تم نے ہی تو کہا تھا انتقام لینے سے معاف کرنا بہتر ہوتا ہے۔"

"ہاں میں نے کہا تھا اور اس پر میرا ایمان بھی ہے۔" میں نے آہستگی سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری پیاری بہن، معاف، انسانوں کو کیا جا سکتا ہے، زہریلے ناگوں اور درندوں کو معاف کرنا انسانیت پر ظلم ہوتا ہے، ناگ کو اگر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کسی اور بے گناہ کو ڈس لیتا ہے اور اسی طرح درندے کو معاف کرنا بھی خطرناک ہوتا ہے۔ خانقاہ میں جب تم نے مجھے فرش پر بے سدھ دیکھا، اسی درندے نے مجھ پر ظلم ڈھایا تھا، اگر میں تمہیں اپنا جسم دکھا سکتا تو تم مجھے کبھی معاف نہ کرتیں، مجھے ہر حال میں یہ قرض چکانا ہے، ورنہ زندگی بھر زخموں اور خراشوں کے نشان مجھے پریشان کرتے رہیں گے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو جاؤ، میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں۔" وہ ہوٹل کے قریب اترتی ہوئی بولی۔ اسے اتارتے ہی میں تیر کی طرح چل نکلا مجھے جانسن سے پہلے ساحل پر پہنچنا تھا، جانسن جس قماش اور فطرت کا انسان تھا اس پر بھروسہ کرنا گویا خود کشی کے مترادف تھا اس لیے میں اس کا استقبال کرنا چاہتا تھا، فوج کا ایک سبق مجھے یاد تھا کہ جو بہتر پوزیشن میں ہوگا، وہ ایڈوانس کرتے ہوئے دشمن پر کاری ضرب لگا سکتا ہے، کیونکہ بڑھنے والا گھات میں بیٹھے ہوئے سے مقابل سے لاعلم ہوتا ہے۔

خانقاہ کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے کار کی رفتار کم کر دی، کیونکہ سڑک ناہموار تنگ اور خود رو جھاڑیوں سے اٹی ہوئی تھی، دو میل کے بعد کار ہچکولے کھانے لگی تو میں نے جھاڑیوں کی اوٹ میں اسے روک دیا اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا، خود رو جھاڑیوں کا جنگل اتھاہ خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

اچانک مجھے دور سے ایک کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں تو میں نے کار اسٹارٹ کر کے عین سڑک کے درمیان روک دی۔ میں نے اچانک ہی اپنا پروگرام بدل دیا تھا۔ جانسن کی کار جب ذرا نزدیک آ گئی تو میں اپنی کار سے اتر کر قریب ترین جھاڑی کی اوٹ میں دبک گیا۔ مجھے یقین تھا وہ میری کار کے ساتھ ہی اپنی گاڑی روکے گا۔

اس نے حسب توقع اپنی گاڑی میری کار کے قریب روکی تھی۔ اور روشنی بجھا کر دو تین منٹ خاموشی سے اندر بیٹھا رہا تھا، پھر دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی اترا میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

"ہاتھ اوپر کر لو۔" میرا ریوالور اس کی کنپٹی سے جا لگا تھا۔

"میں جانسن ہوں اور تمہاری پگڑی اور احتیاط کی داد دوں گا۔" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اب ریوالور ہٹا لو۔"

"ابھی نہیں پیارے۔" میں نے للکارتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ دروازہ کھولنے سے جب اندر روشنی ہوئی تھی تو میں نے تمہارے ارادے کی جھلک دیکھ لی تھی۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور چھین لیا۔ "دوستانہ علاقات ایسے نہیں ہوا کرتی، آگے بڑھو، ہم معاملے کی بات کھلی جگہ کریں گے۔"

"کیسی بات خرم چوہدری۔" اس نے ایڑیاں جماتے ہوئے کہا۔ "سودا طے ہو چکا ہے، مورتی میرے حوالے کر دو اور رقم لے لو۔"

"جب کہ میں تمہارا ہاتھ خالی دیکھ رہا ہوں۔" میں نے اسے گھٹنے کی ضرب لگائی۔ "میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ خرم چوہدری کس بلا کا نام ہے، پھر بھی تم اپنی فطرت سے باز نہیں آئے۔"

"رقم گاڑی میں ہے ڈیئر۔" اس کی آواز میں خوف کی لرزش نمایاں ہو گئی تھی۔ "مجھے مورتی دکھاؤ تاکہ میں رقم تمہارے حوالے کر دوں۔"

"چلتے رہو۔" میں نے اس کی ایڑیوں پر بوٹ کی نوک ماری اور وہ لڑکھڑاتا ہوا لڑکھڑانے لگا۔ "تم زیادتی کر رہے ہو خرم سلطان۔"

"چلو اب سیدھے ہو جاؤ تاکہ تم سے پیار بھری دو چار باتیں کر سکوں۔" میں نے اس کے شانے کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "میں مسلمان ہوں اور میرے دین میں انصاف کو اولیت دی جاتی ہے ہم بدلہ لیتے وقت بالکل زیادتی نہیں کرتے، تم نے مجھ پر ایسی حالت میں تشدد کیا تھا جب میں ہاتھ پاؤں ہلانے سے قاصر تھا۔" ریوالور میں پہلے ہی سیف میں منتقل کر چکا تھا، جھپٹ کر میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف جھٹکا دیا تو جانسن قلابازی کھاتا ہوا میری پشت پر لد گیا، ہماری پشتیں مل گئی تھیں اور اس کے بازو میری گرفت میں شانوں پر اس طرح تھے کہ جوڑ بالکل شانوں پر اور کلائیاں میرے ہاتھوں میں تھیں یہ میرا مخصوص اور آزمودہ داؤ تھا۔ دوسرے لمحے میں نے اسے نیچے جھٹکا دیا تو اس کے ڈکرانے کی آواز سے پرسکوت جنگل گونج اٹھا۔ اس کے دونوں بازو جوڑوں سے خانہ توڑ چکے تھے۔ وہ مجھے تی تی گالیوں سے نوازنے لگا۔ مجھے اپنا وقت یاد آ گیا جب میں بھی بے دست و پا تھا اور جانسن کی ہر ضرب پر کراہ کر ہونٹ کاٹ لیتا تھا میں نے نہ اسے گالیاں دی تھیں نہ رحم کی بھیک مانگی تھی۔ اپنے اپنے ظرف کی بات تھی۔

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا، ابھی روتا ہے کیا آگے آگے دیکھ ہوتا ہے کیا، میں نے کمر کے گرد لپٹے ہنٹر کو تھپ تھپایا اور بگل سے ایک سرا کھینچا تو ہنٹر مکمل کراہ تھ میں آ گیا۔۔۔!

ہنٹر ہوا میں سرسراتا ہوا شڑاپ کی آواز سے ہدف سے ٹکرایا، تو جانسن نہ صرف چیخا تھا بلکہ پہلی ضرب کھا کر گھٹنوں کے بل گر گیا تھا، دوسری شڑاپ پر وہ بلبلاتا ہوا اٹھا اور جھاڑیوں میں الجھتا گرتا دوڑنے لگا، ہر ضرب پر وہ چیخ کر گر پڑتا میں اچھل کر ہنٹر مارتا تو وہ پھر تڑپ کر دوڑنے لگتا، مجھ پر عجیب مسرت طاری تھی اس کی چیخیں سن کر مجھ پر کیف و سرور طاری ہونے لگا تھا۔

"رحم۔ رحم کرو۔" وہ گرا اور کروٹیں لیتا ہوا میرے پاؤں پر چہرہ رگڑنے لگا۔ "میں۔ میں تمہاری برتری تسلیم کرتا ہوں۔"

"تم نے کیوں اس جذبے سے کام نہیں لیا تھا۔" میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کے چہرے پہ ٹھوکر ماری اور وہ کراہتا ہُوا خاردار جھاڑی میں گھس گیا۔ "آئندہ دور ہو، میں وعدہ کرتا ہوں، اگر تم نے دو قدم کا فاصلہ رکھا تو میں تمہیں چھوڑ کر پلٹ جاؤں گا۔ عورتوں کی طرح بین نہ کرو، بہادر بنو اور مرد بھاگو۔" وہ گھٹنوں کے بل اُٹھا اور میں نے ہنٹر گھما کر اُس کے چہرے پہ مارا، وہ اُچھل کر اُٹھا اور دوڑنے لگا۔ میں اُسے ایسے ہی پیٹ رہا تھا جیسے دوڑتے بیل کو شیطان کسان مار رہا ہو۔ پھر اُس نے بیچ بیچ زندگی کی آخری دوڑ لگا ڈالی اور میرے ہنٹر کی زد سے دُور ہوتا چلا گیا۔۔۔ مجھے اپنا وعدہ یاد تھا، اگر میں چاہتا تو اپنی رفتار بڑھا کر اُسے جا لیتا لیکن میں صرف سابقہ رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگتا ہُوا قدم قدم فاصلہ بڑھاتا مجھ سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔

اُس کا وہ انداز بھی میرے لیے باعثِ مسرت و کیف تھا، وہ جھاڑیوں کو روندتا ہے تحاشا دوڑ رہا تھا، اور ساتھ ساتھ رو بھی رہا تھا، میں اُسے ہنٹر سے نہیں خوف سے ہلاک کرنا چاہتا تھا، ہنٹر کی موت سے وہ موت زیادہ اذیت ناک تھی۔

معاً مارشا آپ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور جانسن چشمِ زدن میں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں فوراً رُک گیا اور محتاط قدموں سے چلتا ہُوا اُس جگہ پہنچا جہاں وہ غائب ہُوا تھا اور میرے پیچھے سے ایک طویل سانس نکلی۔ وہ ایک متروک کنواں تھا جس میں جانسن گرا تھا۔ میں نے جیب سے ٹارچ نکال کر اُس کی روشنی نیچے ڈالی تو وہاں ایک ایسا منظر تھا جسے دیکھ کر میں بھی چکرا گیا۔ صدیوں پرانے کنویں میں جانسن کسی مینڈک کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پھیلائے مُردہ مچھلی آنکھوں سے اُوپر تک رہا تھا۔ میں نے کندھے اُچکائے اور واپس چل دیا۔ واپس جا کر جانسن کی کار پر روشنی ڈالی۔ کار کی سیٹ پہ چرمی بیگ پڑا ہُوا تھا۔ میں نے اُسے کھولا تو اس میں صرف سفاکی کرنسی تھی لیکن بہت تھوڑی۔ اس کا مطلب تھا کہ جانسن مجھے ہلاک کرنے کے ارادے سے آیا تھا، وہ مخبری حاصل کرتا اور مجھے گولی مار کر لوٹ جاتا، اگر میں محتاط اور تیار نہ ہوتا تو میری لاش بھی شاید اسی متروک کنویں کے اندر ہی ہوتی۔ میں نے بیگ کو کار کے اندر پھینکا اور اپنی کار میں سوار ہو کر واپس ہوٹل کی طرف چل دیا۔

ہوٹل کے کمرے تک میں خوش تھا اور رنجیدہ اعصاب پُرسکون ہو چکے تھے، لیکن دروازہ مقفل دیکھ کر ساری خوشی اور سکون ساتھ چھوڑ گیا۔۔۔ میں اُوپر آنے سے قبل ڈائننگ ہال پر بھی نگاہ ڈال آیا تھا، مارشا کی غیر حاضری پریشان کر گئی تھی، چابی میں اس لیے نہیں لایا تھا کہ مارشا کمرے میں ہو، جا کر چابی طلب کی تو چابی کے ساتھ ایک چٹ بھی دی گئی، مارشا کی تھی، دو سطروں میں پیغام تھا۔

"پیارے بھائی!۔۔۔ میں تمہارے لیے بہت اچھی خبر ہوں، میرا یا ٹیلی فون کا انتظار کرنا۔"

اچھی خبر جو میں سننا چاہتا تھا وہ صرف گوتھم کے بارے میں تھی اور مارشا بھی اُسے ہی پکارتی پھر رہی تھی، یوں لگا جیسے میرا سگا بھائی پھر زندہ ہو گیا تھا۔ میں خوشی کمرے میں گیا اور ٹیلی فون کے قریب بیٹھ گیا۔

میں بار بار گھڑی کو دیکھ رہا تھا، تقریباً چالیس منٹ دستک ہُوئی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھول دیے اور میری حیرت اور خوشی سے چیخ سی نکلی۔ میرے سامنے مارشا اور انکل بیکر کھڑے تھے۔ میں تو خوشی سے پتھر کا مجسمہ بن گیا، گوتھم دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے بھی اُسے اپنے ساتھ بھینچ لیا، خوشی سے میری آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔

پانچ چھ منٹ ہم چاروں ہم بغل ایک دوسرے کو بوسے دیتے ہی رہے تھے۔ جیسے کسی کو بھی یقین نہ آ رہا تھا کہ ہم پھر سے ہو ایک بار پھر مل گئے ہیں۔

"ماسٹر۔۔۔!" گوتھم بوجھل اور بھرائی آواز میں بولا۔ "آپ دونوں کو تلاش کر رہا تھا کہ اچانک باس مل گئے، مجھے مارشا نے بتا دیا ہے ماسٹر آپ کو کسی نے قید کر لیا تھا۔"

"ہاں پیارے۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر مارشا اِدھر نہ ہوتی تو میں مایوس ہو کر صبح واپس چلا جاتا۔" انکل نے بتایا۔

"ایڈی کیوں نہیں آئی انکل؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تم سے ناراض ہے۔" انکل مسکرانے لگے۔ "تم نے ہمیں اپنی خیریت کی بھی اطلاع نہیں دی۔"

"میں اُسے راضی کر لوں گا انکل۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس میری مجبوریوں کے دو معتبر گواہ ہیں۔"

"ہاں باس۔" گوتھم بول پڑا۔ "ماسٹر بے حد معذرت کر رہے ہیں۔"

"سنا ہے تم نے مسٹر جو اور چنگ چی کو میدان سے اُٹھا پھینکا ہے۔"

"وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے انکل۔" میں نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ "آپ جانتے ہیں مجھے اس مقام پہ لانے والے وہی دونوں تھے۔"

"اب کیا پروگرام ہے تمہارا؟"

"واپسی۔"

"کہاں؟" اُنھوں نے چونک کر پوچھا۔

"شرافت کی دُنیا میں انکل۔" میں نے ہونٹ چبا کر کہا۔ "میں جرم کی دُنیا سے اُکتا چکا ہُوں۔"

"بہت اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے خرم سلطان۔" وہ پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہُوئے کہنے لگے۔ "جُرم آگ ہے [illegible] یہاں رُکنا مناسب نہیں۔ چنگ چی کی لاش ملتے ہی طوفان [illegible] پہلے بچوں کو اس طوفان سے پہلے یہاں سے [illegible]"

"ہم تیار ہیں انکل۔" میں نے جواب دیا۔ "میں یہاں کا سارا قرض اُتار چکا ہُوں۔"

"اپنا قرض اُتار کر تم نے اچھا کیا ہے بیٹے۔ مجھے یقین ہے، وہاں جا کر تم لوگ میرا بزنس سنبھال لو گے اور پھر میں بھی رُوح کے سکون کو پانے میں مصروف ہو جاؤں گا۔ دُنیا کے گناہ بھی تو انسان پر قرض ہی ہیں۔ ویسے بھی میں اب تھک گیا ہُوں، چاہتا ہُوں کوئی مجھے اپنا سمجھتے ہُوئے آرام پہنچائے۔"

"ہم آپ کی خدمت کریں گے انکل، آپ کے سوا ہمارا کون ہے۔" میں نے عقیدت مندانہ انداز میں کہا۔

"جیتے رہو میرے بچو! یہی یقین اور مان مجھے اس طرف لے آیا ہے۔" انکل نے شفقت سے ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا۔

ہوٹل کے واجبات ادا کرتے ہی ہم دو کاروں میں روانہ ہو گئے تھے، مارشا میرے ساتھ تھی اور گوتھم اپنی سابقہ ڈیوٹی پر اپنے باس کا باڈی گارڈ بن گیا تھا۔

میں اپنے اور انسانیت کے تمام دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اُتارنے اور اپنے پیاروں سے ملنے کی خوشی میں جیسے دیوانہ ہو گیا تھا، مستقبل کا رنگین آنچل میری نگاہوں کے سامنے لہرانے لگا تھا، وہ آنچل ایڈیتا بیکر کی ذات کا تھا، کتنے ہی سہانے خواب جاگتی آنکھیں دیکھنے لگی تھیں، بیکر کی بیٹی میری زندگی میں پیار بن کر آنے والی تھی۔ میں ایسے ہی خوش رنگ خواب دیکھتا ہُوا جب بیکر کی قیام گاہ میں داخل ہُوا تو مجھے خبر نہ تھی کہ خوش رنگ خوابوں کی [illegible]

"تمہارے لیے ایک خط ہے بیٹے۔" انکل بیکر نے بریف کیس سے ایر وگرام نکال کر میری جانب بڑھایا۔ میں نے خط لے کر دیکھا اور پاکستان کا نام پڑھ کر اُسے چُوم لیا، خط کھولتے ہی دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اُنگلیاں جو ظالموں کے نرغے سے اُچکتی رہی تھیں ہلکا پھلکا کاغذ تھامتے وقت کانپ رہی تھیں۔ خط میرے نام مارشا کی معرفت آیا تھا اور اس پہ بیکر کا پتہ لکھا ہُوا تھا۔

"میں نے ڈرافٹ کے ساتھ احتیاطاً انکل کا ایڈریس لکھ دیا تھا۔" مارشا نے مجھے مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔ میں نے گزرتی اُنگلیوں سے خط کھول لیا۔ تحریر اجنبی تھی۔

"نورِ چشم راحتِ جاں خرم سلطان۔!

بہت سی دُعاؤں کے بعد واضح ہو کہ تمہارے گھر والے بے حد پریشان حال ہیں۔ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارا خاندان برادری کی سازشوں کا شکار ہو چکا ہے۔ میرے پیارے بھائی سُلطان چوہدری ایک بلوے میں زخمی ہو کر چل بسے ہیں۔۔۔"

میں نے ابھی اتنا ہی پڑھا تھا کہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں چیخنے لگا۔ نہیں، نہیں اور خط میرے ہاتھوں سے گر گیا، مارشا اور گوتھم میرے قریب ہی کھڑے تھے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئے۔ انکل بیکر باتھ رُوم سے دوڑتے ہُوئے نکل آئے۔ "کیا ہُوا خرم۔ بولو خرم کیا ہُوا؟"

"میرے۔ میرے۔" طویل مدت بعد میری آنکھوں کے خشک سوتے اُبل پڑے تھے جیسے اُن کو ایسے ہی زلزلے کا انتظار تھا۔ "میرے ابو انتقال کر گئے ہیں۔"

"اوہ۔ نہیں۔" مارشا کی چیخ نکل گئی۔

"مجھے افسوس ہے بیٹے۔" انکل بیکر میرے بالوں کو تھپتھپانے لگے۔ "سب کو جانا پڑتا ہے، اُن کی کمی کوئی دُوسرا پوری نہیں کر سکتا میرے بیٹے، مجھے۔ مجھے بھی تو تم نے باپ کا مقام دیے رکھا ہے۔"

"ماسٹر۔!" گوتھم گلوگیر آواز میں بولا۔ "میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہُوں۔۔۔"

خط پڑھو ماسٹر اور بتاؤ ہمارے باپ کو کیا ہُوا؟" گوتھم نے خط میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"بلوہ چوہدری سرور کے بیٹے فاروق کی سازش سے ہُوا تھا جس میں صرف سُلطان کو ہی نشانہ بنانا مقصود تھا، ابھی سُلطان کا جسم بھی نہیں ہُوا۔۔۔ کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آیا تھا مگر سُلطان نے اپنی آبرو کو بچا لیا ہے۔ کرم سُلطان ان دِنوں اسپتال میں ہے کیونکہ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ تمھاری ماں پے در پے دُکھوں کی وجہ سے چارپائی پر لگ گئی ہے۔ جہاں ہو واپس چلے آؤ، تمھاری ماں، زینت، کرم سُلطان اور خاندان کی عزت کو تمھاری ضرورت ہے۔

تمھاری بھوپی راشاں بیگم۔"

"اُونہہ" میرے حلق سے غراہٹ نکلی اور میری مٹھیاں اتنی زور سے بھنچ گئیں... کہ ناخن ہتھیلیوں میں گھب گئے تھے۔

"میں آ رہا ہُوں پھوپھو جان۔ میں آ رہا ہُوں پیاری اماں جی۔"

"ماں تمھیں جانا چاہیئے۔" انکل نیاز اسٹاف روم میں چھپ چھپا کر بولے "ہانگ کانگ سے تم پہلی فلائٹ سے چلے جانا۔"

"نہیں انکل۔" میں نے مستحکم آواز میں جواب دیا۔ "میں منیلا سے فلائی کر جاؤں گا۔"

"میں تمھیں روک نہیں سکتا۔" وہ میرے قریب بیٹھ گئے۔ "لیکن بحیثیت باپ مجھے کہنے کا حق ہے خرم بیٹے۔ میں مشرقی ولایات سے آگاہ ہُوں، تمھارے علاقے میں سب سے طاقتور چیز پیسہ ہے۔ میں چاہتا ہُوں تم دولت کی قوت بھی ساتھ لے کر جاؤ۔ میری دولت کس دِن کام آئے گی پیارے بیٹے۔"

"شکریہ انکل۔" میں نے ممنون انداز میں بتایا۔ "میرے پاس کچھ رقم ہے۔ آپ میرے جانے کے بعد ڈرافٹ بھجوا دیں گے۔"

مارشا اور گوتھم نے ایک آواز میں کہا۔ "ہم بھی تمھارے ساتھ جائیں گے خرم۔"

"نہیں پیارو۔ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تم جیسے وفادار اور پیارے لوگوں کو انکل سے جُدا نہیں کروں گا۔ میں اپنی واپسی کے معاملات نمٹا کر واپس چلا آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔" انکل خوش ہو گئے۔

میں نے سنگی سل پیٹ سے کھول کر انکل کے سامنے رکھ دی۔

"اوہ۔" وہ اُچھل پڑے۔ "تو۔ تو۔ تم نے حاصل کر لی۔" وہ ہانپ گئے تھے۔

"ہاں انکل۔" میں نے کہا۔ "میری طرف سے ایڈی کے لیے تحفہ۔"

"بہت۔ بہت بڑا۔ بہت قیمتی تحفہ ہو گا اُس کے لیے۔" انکل نے سِل اُٹھا کر فوراً بریف کیس میں رکھ دی۔

دستک دے کر ایک ویٹر اندر آ گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔

"اُٹھو میرے بچو۔ کھانا کھا لو۔" انکل نے کہا۔

"سوری انکل۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تنہائی چاہتا ہُوں۔"

"لے جاؤ۔" مارشا بولی۔ "کوئی بھی نہیں کھائے گا۔ خُرم سُلطان۔ اِدھر اور تنہائی بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ تمھارے قریب رہوں گی۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا نہ اُسے منع کیا... مجھے معلوم وہ ضِدی نہیں مانے گی۔ وہ میری بہن تھی اپنے بھائی کو تنہا ہرگز حوالے نہیں کر سکتی تھی۔

ہجرت

باعثِ برکت ہوتی ہے۔ مجھے بحیثیت مسلمان اس سے انکار نہیں، لیکن مجھے ہجرت نے جو تلخ اور خونچکاں تجربات دیئے میرے جسم پر ثبت مندمل زخموں کے نشان اس کے شاہد ہیں اور میں جب بھی پلٹ کر ماضی کے ان راستوں کو دیکھتا ہوں جن پر مجھے قدم قدم پر ٹھوکریں لگیں، جہاں ہر موڑ نے مجھے ناگ بن کر ڈسا اور ہر موڑ پر نئے رہزن نے لوٹا تو خون آلود نقش پا وہاں سے یہاں تک دکھائی دیتے ہیں۔ یقیناً اس کی کوئی وجہ تھی۔ ہر عمل کا ردِ عمل "نیت" کے رنگ اور ذائقے کا پھل دیتا ہے۔ جیسی زمین ہو گی ویسا ہی پھل ہو گا۔ یہ آفاقی قانون ہے، فطرت کا اٹل فیصلہ ہے۔ میری ہجرت کی نیت میں ہی فتور تھا۔ میں نے نہ تو جہاد کے لیے گھر چھوڑا تھا، نہ ہی تعمیری مقاصد تھے۔ مجھے تو دولت کی ہوس اور سُنہرے دیسوں کا شوق ملک سے لے گیا تھا۔ میرے ساتھ والدِ محترم کی رضامندی تھی نہ ماں کی دُعائیں سایہ فگن تھیں۔ میری ہجرت چور کے فرار کے مترادف تھی جو چور بھی تو چوری کا مال لے کر گھر اور شہر چھوڑتا ہے۔ میں نے بھی تو زیور چُرایا تھا اور ملک سے فرار ہو گیا تھا۔

جُرم کی سزا اِسی تاخیر بھی نہ ہوئی تھی، فطرت حق کی عدالت نے فیصلہ سنانے میں دیر نہ کی۔ منزل کی پہلی سیڑھی پر ہی سزا کا پہلا کوڑا اسی جوکے غنڈے نے مارا تھا جو دہ ماں کی بددُعا تھی یا آنسو تھا جو کوڑا بن کر مجھے لگا تھا۔

میرے پاس اگر ریٹرن ٹکٹ ہوتا، پاسپورٹ ایجنٹ نہ لے گیا ہوتا تو میں توبہ کا ورد کرتا ہوا واپس چلا آتا اور ماں کے قدموں میں گر گڑگڑاتا۔ ابا جان کی دلی خواہش پوری کرتا۔ پاک آرمی میں شامل ہو جاتا مگر مجھے تو کالے پانی کی سزا سنائی گئی تھی۔ ویران جزیرے میں اُچھال کر جہاز واپس چلا گیا تھا اور میں ساحل کی گرم ریت، جزیرے پر آباد عفریتوں بے پھل پھول خاردار جھاڑیوں کے رحم و کرم پر تنہا رہ گیا تھا۔ اس بے رحم اور آدم خور جزیرے پر مجھ جیسے احمق نوجوان جس نے سُنہرے دیسوں کے خواب دیکھے تھے کیا گزری، خوابوں کی تعبیر کس قدر ہولناک اور خونچکاں تھی میری آپ بیتی پڑھنے والے جانتے ہوں گے۔

میں اس خونی جزیرے سے نکل کر جب اپنی فضاؤں میں داخل ہوا تو میرے جسم پر عجیب سی سنسنی خیز تھرتھری طاری تھی۔ وہ خوف تھا، خوشی تھی یا دوزخ سے جنت کی جانب سفر کا ردِ عمل تھا۔ میں اس سنسنی کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔

مارشا کے مشورے پر انکل بیکر نے اکرم بھائی کو بذریعہ ٹیلی گرام میری واپسی کی اطلاع کر دی تھی حالانکہ میں اپنا خراش خراش شرمندہ چہرہ دن کی روشنی میں لے کر اماں بی کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ میں زینت کی بھوری آنکھوں میں چھپے ہزاروں سوال اور شکوے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ رات کی چادر میں چہرہ چھپا کر خاموشی سے حویلی میں داخل ہوں گا اور روتا ہوا اماں بی کے پاؤں پر سر رکھ دوں گا۔ جب وہ مجھے معاف کر دیں گی۔ سینے سے لگا کر ممتا کے نور سے تاریک سینہ منور کریں گی تو میں معاف کیا گیا دُھلا ہوا چہرہ لے کر سب کے سامنے جاؤں گا۔ اس اندھیرے کی اوٹ میں گھر جانے کی تہہ میں ایک جلتا ہوا منصوبہ بھی تھا جسے میں نے آگ کے شعلوں پر پگھلایا تھا۔ انتقام کی آگ میرے اندر دہک رہی تھی۔ فاروق چوہدری اگر میرے پورے خاندان کو قتل کر دیتا تو میں رو دھو کر چُپ ہو جاتا، قانونی چارہ جوئی کرتا لیکن اس نے میرے خاندان کی آبرو لوٹنے کی ناکام کوشش اور میری منگیتر زینت کی جانب ناپاک ہاتھ بڑھانے کی ذلیل ترین حرکت کر کے میری غیرت کو للکارا تھا۔

جہاز میں تقریباً تمام ہی مسافر تقریباً سبھی لہولتوں سے لُطف اندوز ہو رہے تھے لیکن میں واحد مسافر تھا جس نے کچھ بھی نہ طلب کیا تھا۔ دل میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ فاروق چوہدری میرا کلاس فیلو رہا تھا۔ کبڈی کی ٹیم میں وہ میری کپتانی کے تحت کھیلتا رہا تھا۔ نیزہ بازی کی مشقیں اس نے میرے ساتھ کی تھیں۔ وہ میرا دوست کبھی نہیں رہا تھا۔ اس کی وجہ خاندانی رنجشیں اور دیرینہ رقابتیں تھیں لیکن بحیثیت کھلاڑی وہ مجھے ہمیشہ عزیز رہا تھا۔ وہ بہت اچھا کھلاڑی تھا۔

اگر دیارِ غیر کے تلخ تجربات میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں دھڑکتا ہوا گاؤں پہنچتا اور چوہدری فاروق کو للکارتا لیکن میں جذباتی اور ناپختہ خرم چوہدری نہ رہا تھا۔ وقت نے میرے اندر بھیڑیوں جیسی خصلت پیدا کر دی تھی۔ بھیڑیا کبھی شور مچاتے ہوئے باڑے پر حملہ نہیں کرتا۔ وہ دبے پاؤں باڑے کے قریب جاتا ہے۔ محتاط نگاہوں سے رکھوالے کو دیکھتا ہے اور پھر باڑے کی دیوار پھلانگ کر شکار کا نرخرہ پھاڑتا ہے اور تڑپتا جسم لے کر واپس چلا جاتا ہے۔

اگر مارشا میری اجازت اور رضامندی سے ٹیلی گرام، دلواتی تو میں ان کو روک دیتا۔ مصلحت اور احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ خرم چوہدری دبے پاؤں گاؤں میں داخل ہو کر فاروق چوہدری کا نرخرہ پھاڑتا اور اسی خاموشی سے واپس ہانگ کانگ چلا جاتا۔ میں نے مارشا، گوتھم اور بیکر سے یہی کہا تھا، وعدہ کیا تھا۔ ورنہ وہ لوگ مجھے ایڈنا کی عدالت تک ضرور لے جاتے، اُس لڑکی کے حوالے کر دیتے جو مغرب زادی ہونے کے باوجود اپنے اندر بھرپور شرقیت زندہ رکھے ہوئے تھی۔ جس کے چاہنے اور چاہے جانے کے سارے انداز مشرقی تھے۔ جس نے نہ صرف خرم چوہدری کو چاہنے کا اظہار کر دیا تھا بلکہ اس نے اپنے کردار سے خرم چوہدری کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ یہی وہ تاثر تھا جس سے میں خوف زدہ تھا۔ مجھے خود پر بھروسہ نہ تھا۔ دل پر یقین نہ تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ ایڈنا کا پکارتا پیار، اس کی بے پایاں محبت اور آنسو میرے پاؤں کی بیڑیاں بن جائیں گی اور میں بیمار ماں،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھائل بھائی اور مظلوم زینت کے لیے کچھ نہ کر سکوں گا۔

میں سوچوں کی گرم وادیوں میں ڈوبتا ابھرتا رہا اور جہاز اپنی منزل کی جانب خوب پرواز رہا۔۔۔ میری سیٹ فیلو میری ہم وطن تھی۔ اس کی گود میں دو سالہ بچی تھی۔ اس نے گڑیوں جیسے نرم نرم اور شفاف ہاتھوں سے کئی بار میری چپ توڑنے کے معصوم جتن بھی کیے تھے۔ جب میری چپ نہ ٹوٹی اور میں متوجہ نہ ہوا تو خاتون اسے ڈانٹ کر دوسری طرف کر لیتی۔ میں کوئی سنگی بُت نہ تھا کہ احساس نہ ہوتا۔ مجھے اپنی بے حسی، بے مروتی اور سرد مہری پر افسوس بھی ہو رہا تھا لیکن میں جس تانے بانے میں الجھا ہوا تھا اسے ایئر پورٹ تک سُلجھ جانا چاہیے تھا۔ میں اپنے وطن کی سرزمین پر پاؤں رکھنے سے قبل ایک حتمی فیصلہ اور مکمل لائحہ عمل تیار کر لینا چاہتا تھا۔ فلپائن میں کچھ وقت سفر کی قانونی تیاریوں میں اور باقی وقت میرے پیاروں نے لیا تھا۔ تجھے تنہا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ جب بھی میں منصوبہ سازی کے لیے تنہائی مانگتا مارشا سائے کی طرح ساتھ چلی آتی۔

بچی کو شاید بہلانے کے لیے خاتون نے جلدی جلدی فیڈر میں دودھ بھرا اور نپل لگا کر بچی کے مُنہ میں دے دیا۔ میں سوچ تو رہا تھا لیکن کن انکھیوں سے گڑیا جیسی بچی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے جلدی میں نپل ٹھیک نہیں فٹ ہوا تھا۔ بچی میری جانب ہمکی اور فیڈر اس کے ہاتھوں سے نکل کر میری ران سے ٹکراتا نیچے جا گرا اور دودھ کا بیشتر حصہ میرے لباس کو تر کر گیا تھا۔

"اوہ۔۔۔ سوری۔" خاتون نے بوکھلا کر اپنی ریشمی چادر سے میری پتلون صاف کرنا شروع کر دی۔

"کوئی بات نہیں خاتون۔" میں نے اس کا ہاتھ روک دیا اور رومال سے صاف کرنے لگا۔ "میں اس سزا کا حق دار تھا۔ مجھے فرشتے نے اچھی سزا دی ہے۔"

خاتون کے۔۔۔ گلنار چہرے پر ندامت کی زردی کھنڈتی جا رہی تھی۔

"آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں خاتون۔" میں نے بچی کو اُٹھا کر گود میں رکھ دیا۔ "داغ نہیں اُترے گا تو یہ لباس اُتر جائے گا۔"

"میں تو ڈر گئی تھی۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "میرا خیال تھا آپ ٹینا کو طمانچہ ماردیں گے۔"

"کیا میں شکل سے اتنا ہی سنگدل لگتا ہوں؟"

"اوہ۔۔۔ نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "میں تو پریشان تھی کہ شکل سے آپ کا رویہ میل نہیں کھا رہا تھا۔"

"بعض اوقات انسان جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا۔"

"معاف کیجیے گا۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "ایک ذاتی سا سوال کر سکتی ہوں؟"

"ظاہر ہے ہم ذات پر ہی بول سکتے ہیں۔"

"آپ کچھ اِدھر چھوڑ آئے ہیں یا آگے کچھ گم ہو چکا ہے؟"

"آپ قیافہ شناس ہیں محترمہ؟"

"میرا نام رضیہ سلطانہ ہے۔" اس نے تعارف کروایا۔ "میرے شوہر ایک سینئر سفارت کار ہیں۔"

"شکریہ رضیہ صاحبہ۔" میں نے ممنون انداز میں کہا۔ "آپ نے درست اندازہ لگایا ہے۔ میں کچھ عزیز ترین ہستیاں چھوڑ آیا ہوں اور سوگوار لوگوں کے پاس جا رہا ہوں۔"

"اوہ۔۔۔ کوئی ماتم۔"

"جی ہاں میرے والد۔۔۔"

"مجھے افسوس ہوا۔ آپ کا نام؟"

"خرم سلطان۔"

"کاش! میں شریکِ سفر ہی نہیں بلکہ شریکِ غم ہونے آپ کے گھر جا سکتی۔" اس کا چہرہ واقعی ملول ہو گیا تھا۔ "میرے بھائی کی کل بارات ہے۔"

"خدا آپ کو خوشیاں نصیب کرے۔" میں نے رسمی انداز میں جواب دیا۔

"آپ پنڈی جائیں گے یا آگے کوئی گاؤں ہے؟"

"گاؤں، لیکن زیادہ دُور نہیں، اور آپ؟"

"گولڑہ شریف۔" وہ بولی۔ "ویسے ہماری اپنی کوٹھی لفرچیک پر ہے۔"

جہاز نے ہچکولہ لیا شاید ایئر پاکٹ میں گیا تھا۔ رضیہ نے چیخ کر میرا بازو تھام لیا۔ جب جہاز سنبھلا تو وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ "میں۔۔۔ میں ڈر گئی تھی۔"

"جب کہ یہ معصوم ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے پالنے نے ہلکورا دیا ہو۔" میں نے ٹینا کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "دراصل دُنیا کی محبت ہمیں خوف زدہ کر دیتی ہے۔"

رضیہ شرمندگی کی وجہ سے خاموش ہو گئی تھی یا کوئی دوسری وجہ تھی۔ ٹینا کو بھی اس نے میری گود سے واپس نہیں لیا تھا۔ ٹینا نے میری سوچوں کے دھاگے گولا بنا کر جیسے فضا میں اُچھال دیے تھے۔ میرا جمود اس نے توتلی باتوں اور چہکاروں سے توڑ دیا تھا۔ میں نے بھی سابقہ بے توجہی اور سرد مہری کی تلافی کرتے ہوئے سارا دھیان اور وقت اسے دے دیا۔ جب جہاز کے اُترنے کا اعلان ہوا تو میں نے ٹینا کو اُٹھا کر رضیہ کی گود میں رکھ دیا۔

"میں باہر نکل کر شاید آپ کو خدا حافظ نہ کہہ سکوں۔" رضیہ نے مدھم سُروں میں کہنا شروع کیا۔

"میرے بھائی وہاں ہوں گے۔" اس نے پرس سے طلاقی کارڈ نکالا اور فلپائن کا پتہ کاٹ کر اسلام آباد کا پتہ لکھ دیا۔ "میں ایک ہفتے تک یہاں نہیں ہوں گی، پھر مستقل قیام ہوگا۔ ٹینا کے لیے تو چھ ماہ بعد آئیں گے۔ اگر آپ کبھی اسلام آباد آئیں تو ٹینا سے ملنے ضرور آئیے گا۔"

"ضرور۔" میں نے ٹینا کے گالوں پر تھپکی دی۔ "ٹینا بہت کامیاب سفیر ہے۔"

رضیہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ "جی ہاں اچھے سفارت کار تعلق کا چراغ جلانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتے ہیں۔ ٹینا اگر چراغ نہ جلاتی تو ہم بالکل اجنبی ہی رہتے۔"

جہاز نے غوطہ لگایا۔ رضیہ بولتے بولتے ایک دم چُپ ہو گئی تھی۔

میرے پاس صرف بریف کیس تھا جس میں مارشا گوتم اور جیکر کے کچھ گروپ فوٹو تھے۔ انٹرپول کے چیف کا ایک خط تھا جو اس نے وزیرِ داخلہ کے نام میرے حوالے کیا تھا اور میری تقرری کا حکم نامہ تھا۔ ایک لفافے میں ڈرافٹس تھے جو بیکر نے بنوائے تھے۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں دس منٹ میں کسٹم کاؤنٹر سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ رضیہ سلطانہ ایک پورٹر کے ساتھ اپنا سامان ایک جگہ رکھوا رہی تھی۔ میری نگاہیں شناسا چہروں کو تلاش کر رہی تھیں۔ اکرم بھائی کو آنا چاہیے تھا لیکن بے شمار منتظر لوگوں میں اکرم بھائی کا چہرہ میرا منتظر نہ تھا۔

استقبال کرنے والے دونوں اطراف کھڑے ایئر بیگ اُٹھا اُٹھا کر آنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا جوں ہی برآمدے سے اُترنے لگا، ایک ہاتھ شانے پر ٹک گیا۔ میں نے گردن گھمائی، پیچھے چاچا سجاول خان کھڑا مونچھوں میں مسکرا رہا تھا۔

میں پلٹا اور اس نے مجھے باہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔ حسبِ رواج تین بار ہمارے چہرے دائیں بائیں ہوئے۔

"It's too heavy"

پھر اس نے ہاتھ ملا کر مجھ سے بریف کیس لے لیا۔

"اکرم بھائی کیوں نہیں آئے چاچا!" میں نے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ "ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ٹھیک ہوتا تو مجھے کیوں بھیجتا۔" سجاول خان نے جواب دیا۔ "اِدھر تیرے بعد بہت خراب حالات ہو گئے ہیں خرم۔ گیدڑ بھی شیروں کی طرح دہاڑنے لگے ہیں۔ لومڑ، بھگیاڑ بن گئے ہیں۔ دن دیہاڑے بندوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح چیر پھاڑ دیتے ہیں۔"

"کیا گاؤں میں مرد نہیں رہے چاچا؟" میں نے جھرجھراتی آواز میں کہا۔ "آخر یہ گیدڑ اور لومڑ کیسے شیر بھگیاڑ بن گئے؟ یہاں صرف خرم سلطان ہی نہ تھا، تم لوگ تو تھے۔"

"جوان لوگ سب تمہاری طرح باہر دولت کمانے چلے گئے۔ خرم میاں، جہاں دولت آتی ہے وہاں شیر نہیں رہتے۔ گاؤں میں بوڑھے ہیں اور عورتیں راج کرنے لگی ہیں۔"

"کیا اکرم بھائی زیادہ ذمے دار ہیں؟"

"ہاں! جیسے بس ایکسیڈنٹ کے بعد نا کارہ ہو جاتی ہے۔" سجاول خان نے بتایا اور میری کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔

"تیری ماں نے مجھے بھیجا ہے۔ اس نے تیرے لیے پیغام دیا ہے کہ حویلی کا دروازہ اور ماں کی گود تب تم پر کھلے گی جب تیرے ہاتھ میں فاروق چوہدری کا سر ہوگا۔ یہ پیغام ہے تیری ماں کا، بول کدھر چلو گے؟"

"میرا بریف کیس لے جا چاچا۔" میں نے خالی ٹیکسی پر ہاتھ مارا۔ "ماں کو بتا دینا خرم سلطان نے تیرا حکم سن لیا ہے۔"

"پھر او ہو چل خرمیں۔" چاچا نے ہاتھ مار کر کھلا دروازہ بند کر دیا۔ "میں ٹیکسی اور کچھ مددگار لایا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ میرے بدن کا رُواں رُواں شعلے اُگلنے لگا تھا۔ میں دورانِ سفر جو کچھ سوچتا رہا تھا۔ منصوبے بناتا رہا تھا وہ ریت کے گھروندے ثابت ہوئے تھے۔ وہ سوچ اور منصوبہ بندی اس خرم سلطان چوہدری کی تھی جس نے بین الاقوامی گرینڈ ماسٹروں کو نیست و نابود کر دیا تھا لیکن خرم چوہدری بھول گیا تھا کہ ماں کے حکم اور کسی گرینڈ ماسٹر کے حکم میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

سجاول خان نے واسکٹ کی جیب سے ٹیلی گرام کا لفافہ نکال کر دکھایا اور بولا: "پرواز نمبر اور تیری تسلی کے لیے بھابھی نے یہ تار دی ہے۔ میں نے کہا تھا بھابھی۔ بیٹے کے لیے کوئی بہتر تحفہ دے۔"

"میں۔" میرے حلق سے غرّاہٹ اُبھری۔ "یقین کرو چاچا میں تیرے بغیر بھی فاروق کے تن سے گردن نوچ سکتا ہوں۔ میں اُدھر برتن مانجھنے نہیں گیا تھا۔"

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ تم پہلے والے شرمیلے خرم نہیں رہے۔"

سجاول خان کو دیکھتے ہی مجھے تعجب ہوا تھا۔ میں اسے اتفاقیہ ملاقات ہی سمجھ رہا تھا۔ وجہ معقول تھی۔ وہ ہماری برادری سے تھا لیکن ہمارے خاندانوں کے درمیان مہر و محبت اور میل ملاپ نہ تھا۔ موت مرگ بے شک سانجھی تھی لیکن بیاہ شادیوں میں ہم شریک نہ ہوتے تھے۔ خاندان کی تاریخ کا وہ باب مجھے پڑھایا گیا تھا جس میں سجاول خان کے باپ اور میرے دادا مرحوم کی خونی ریزہ جنگ کا ذکر تھا۔ میرے دادا نے دن کی روشنی میں بلاول خان کی گردن اتار دی تھی اور مقدمہ بازی میں ہماری کئی زرخیز زمینیں فروخت ہو گئی تھیں۔ اُسی بلاول خان کا بیٹا سجاول خان میرے بخش کے پوتے کو لینے ہی نہیں بلکہ اس کے دشمن سے لڑنے آیا تھا۔

دفعتاً میری نگاہ ان پر پڑی اور اٹھا ہوا قدم ٹھٹک گیا۔ وہ خرم سلطان کی چھٹی حس تھی جس نے سب سابق خطرے کا الارم دیا تھا لیکن دوسرے لمحے میں نے الارم کا بٹن آف کر دیا تھا۔ وہ لوگ ہی جو یا چنگ چی کے گرگے نہ تھے بلکہ میرے اپنے گاؤں کے معصلی تھے۔ غلاموجو کسی بھی چوہدری کے اشارے پر جھپٹ پڑتا تھا، دلبر معصلی جسے کرائے کا قاتل کہا جاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں کے اکڑے ہوئے جسم ایسے ہی سکڑ گئے تھے جیسے کتا مالک کو دیکھ کر تعظیماً سکڑ جایا کرتا ہے۔ دونوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا اور میں نے آگے بڑھ کر باری باری دونوں کو سینے سے لگا لیا۔

غلاموں نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر مجھے اندر بٹھایا۔ جب میں پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تو دائیں غلاموں اور بائیں جانب دلبر بیٹھ گیا۔ فرنٹ سیٹ پر سجاول خان نے بیٹھ کر کہا۔

"ہم فاروق کے گاؤں چلیں گے۔" ڈرائیور نے جوں ہی دروازہ کھولا۔ میرے اندر پھر گھنٹی بجنے لگی۔ وہ چوہدری عدالت تھا فاروق کی برادری بلکہ اس کا رشتہ دار۔

"عدالت بھی ہمارا ساتھ دے گا۔" سجاول خان بولا۔

"گزشتہ دنوں اس کی فاروق سے ایک جھڑپ ہوئی تھی۔"

عدالت خان کا ہاتھ جب میرے ہاتھ میں آیا تو میرے تجربہ کار ہاتھ نے محسوس کیا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کی دھڑکنوں کا غماز تھا، دوست اور دشمن کے ہاتھ کو پہچاننے کی صلاحیت مجھ میں موجود تھی اور وہ ہاتھ دوست کا نہ تھا۔

جب ٹیکسی ہائی وے پر ٹریفک کے درمیان چل رہی تھی تو میرے اندر چیف ماسٹر خرم سلطان غرّانے لگا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور ابھی منزل دُور تھی۔ میں نے خود کو پُرسکون رکھنے کے لیے اکڑا ہوا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اعصاب آہستہ آہستہ پُرسکون ہونے لگے تھے۔

"ہم نے چوہدری عدالت کا تعاون حاصل کیا ہے۔" سجاول خان بتانے لگا۔ "فاروق خود تو چوہے کی طرح دُبک جاتا ہے مگر اس کے گرگے اندھیرا ہوتے ہی گاؤں کے گرد گھوڑیوں پر گردش کرنے لگتے ہیں۔ وہ باہر چکر لگائیں گے اور ہم بغل سے اُٹھ کر اسے داب لیں گے، یہ میرا منصوبہ ہے۔"

"ہم چوہدری کو باہر گھسیٹ لائیں گے۔" غلاموں نے کہا۔ "باقی کام خرم چوہدری کریں گے۔"

"کلثوم کے بارے میں کیا خیال ہے میرے چوہدریوں کا؟" دلبر نے پوچھا۔ "اڈے کا بدلہ تو ہونا چاہیے۔"

"نہیں۔" میں نے سرد آواز میں تردید کی۔ "بچے بوڑھے اور عورتیں ان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ فاروق کے علاوہ تمام لوگ محترم ہوں گے۔ ہاں جو رکاوٹ بن جائے اُسے ہٹانا مجبوری ہوگی۔"

انھوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموش ہو گئے۔

میرے شعور اور لاشعور کی سرحد پر وہ لڑکی نمایاں ہو گئی جس کا نام کلثوم تھا جسے میں نے پہلی بار تب دیکھا تھا جب ان کا ٹیکسی ایک نوتعمیر مکان کے سامنے رُکی تھی۔ وہ مکان گاؤں سے قدرے ہٹ کر جوار کے کھیت میں تھا۔ عدالت خان نے اندر جا کر لالٹین روشن کی اور پھر ہم اندر داخل ہوئے۔ میرے ساتھ صرف چاچا سجاول اندر گیا تھا۔ عدالت خان کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ ٹیکسی گیراج میں بند کرنے چلا گیا ہے۔ غلاموں اور دلبر برآمدے میں ہی پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔ فرنیچر کی سیٹنگ اور اُجلاپن مجھے مصنوعی سا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ڈرامے کے کسی سین کے لیے عارضی طور پر سیٹ تیار کیا گیا تھا۔

"میں چوہدری عدالت سے کھانے کا کہہ آؤں۔" احمق بوڑھے نے معقول بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ اس سے حماقت سرزد ہوئی تھی کہ بریف کیس ساتھ لے کر اُٹھا تھا میں نے ہاتھ بڑھا کر بریف کیس لے لیا۔

"اس میں ضروری کاغذات ہیں چاچا۔"

"اوہ... اچھا اچھا۔" وہ کھسیانی ہنسی میں بولا۔ "بھئی جوان معاف کرنا، بوڑھا دماغ ہے نا۔"

میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ سجاول خان نے چونک کر میری جانب دیکھا پھر پلٹ کر بے معنی باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرتے کرتے اس نے واسکٹ کی جیبوں میں کچھ تلاش کیا۔

"غلاموں ذرا نسوار تو دیتے جاؤ، میری ڈبی نہ جانے کہاں رہ گئی ہے۔" غلاموں نے دروازے سے باہر رُک کر نسوار کی ڈبی کھولی، سجاول خان باتیں کرتا ہوا اُٹھنے کے انداز میں اُدھر چلا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور غلاموں نے ایک دم اسے باہر گھسیٹ لیا اور دھڑ سے کواڑ بند ہو گئے۔ میں نے بھی طویل پھلانگ لگائی تھی مگر وہ باہر سے کنڈی لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"دروازہ کھولو غلام خان۔" میں نے کواڑوں کو ٹھوکر لگائی۔ "ورنہ میں کواڑ توڑ دوں گا۔"

"ضرور کوشش کرو چوہدری۔" اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ "جب تم دروازہ توڑ کر باہر نکلو گے تو ہم تمھارا سر توڑنے باہر حاضر ہوں گے۔"

"آرام کرو جوان آرام۔" سجاول خان نے ہنستے ہوئے مشورہ دیا۔ "ہماری ڈیوٹی شیر کو کٹڑی میں پھنسانے تک تھی۔ آگے فاروق جانے اور اس کا دشمن۔"

"وہ خود سامنے کیوں نہیں آیا؟" میں نے دہاڑتی آواز میں کہا۔ "جاؤ اُسے لے آؤ۔"

"وہ گاؤں سے غیر حاضری کی سند لینے شہر گیا ہوا ہے برخوردار۔" سجاول نے بتایا۔ "اسپتال داخل ہوگا اور پھر رات کسی پہر یہاں آ کر تیرا کوندا کر کے پھر اسپتال کے بستر پر لیٹا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا ملے گا اُن کو۔"

اگر دروازہ بند ہوتا اور مجھے باہر سے توڑنا پڑتا تو دو چار جسم کی چوٹیں اس کی چولیں ہلا دیتیں مگر اندر سے دروازہ اکھاڑنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا اور میں نہ تو اپنی انرجی ضائع کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی باہر کھڑے سازشیوں کے قہقہے برداشت کر سکتا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر خود کو پُرسکون کیا۔ بین الاقوامی غنڈوں نے یہی درس اور تجربہ مجھے دیا تھا کہ خود کو پُرسکون رکھو کہ بڑے سے بڑے دشمن سے مقابلہ جیتا جا سکتا ہے۔ میں اچھا فائٹر تھا، حوصلہ بھی چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ میں نے بیک وقت دو جنوں غنڈوں سے مقابلہ جیتا تھا۔ میرے ہاتھوں بے شمار لوگ موت کے گھاٹ اُترے تھے۔ مجھے جی جو اور چنگ چی جیسے گرینڈ ماسٹروں پر برتری حاصل ہوئی تھی۔ میں نے چابک سے جانسن جیسے ہیوی ویٹ شخص کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوا تھا۔ جس نازک صورتِ حال سے میں دوچار ہو گیا تھا وہ ایسی نہ تھی کہ میں پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتا۔ مجھے گاؤں کے جاہل ترین آدمیوں نے جال میں پھانس لیا تھا اور میں بھولے پرندے کی مانند خود ہی جال تک چلا آیا تھا۔

میں خوف زدہ تو نہ تھا لیکن بے بسی کی موت پر کچھ پریشان ضرور تھا چنانچہ میں نے دروازے پر دستک دی۔ باہر باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

"کیا بات ہے چوہدری؟" دلبر نے پوچھا۔ "بھوک لگی ہے یا پیاس؟"

"سجاول کہاں ہے؟"

"وہ تو واپس اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔"

"دلبر! دیکھو میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔" میں نے مصلحانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میں جانتا ہوں فاروق نے تمہیں خریدا ہے۔ سنو دوست خریدی ہوئی شے اگر منافعے پر بک جائے تو سودا کرنے والوں کو عقل مند کہا جاتا ہے۔ بولو کتنا منافع لو گے؟"

"دس ہزار۔" دلبر نے جواب دیا۔ "پانچ پانچ ہم دونوں بانٹ لیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ادائیگی کے لیے تمہیں اعتماد کرنا ہو گا۔"

"اعتماد کی بات نہیں چوہدری۔" غلام بول پڑا۔ "ہم خود کو منافعے پر فروخت کر کے اس گاؤں میں نہیں رہ سکتے۔"

"میں تمہاری حفاظت کی ضمانت دوں گا دوستو۔"

"کوئی ضمانت دیرپا نہیں ہوتی چوہدری۔" دلبر نے کہا۔

"قنون کے ہاتھ بڑے لمبے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ تم پندرہ دن مہینہ ضمانت دو گے۔ پھر کسی رات فاروق چوہدری کا کوئی آدمی وار کر جائے گا۔ نہیں چوہدری جی، نقد سودا۔ اس ہاتھ دو اور دوسرے ہاتھ ہم تالا کھول دیں گے۔"

"میرے پاس ڈرافٹ ہیں، جانتے ہو ڈرافٹ دکھا کر بینک سے رقم مل جاتی ہے۔"

"نہیں۔ ہم جاہل، اَن پڑھ بندے ہیں چوہدری۔ ہم سے سرخ نوٹوں کی بات کرو، ڈرافٹ کا چکر نہ دو۔"

"چکر نہیں، ڈرافٹ کی اُلٹی طرف میں دستخط کر دوں گا، تم بینک سے رقم وصول کر لینا۔ ادھر کھڑکی میں آؤ۔ میں تمہیں ڈرافٹ دکھاتا ہوں۔ یہ نقد رقم ہوتی ہے۔"

میں نے بریف کیس سے ایک ڈرافٹ نکال لیا اور وہ دونوں کھڑکی کی سلاخوں سے چہرہ لگائے دیکھنے لگے تھے۔ "یہ ڈرافٹ ہے، میں نے ادھر اس بینک کی شاخ میں ڈالر جمع کروائے تھے یہاں سے پاکستانی کرنسی ملے گی۔ غلام تم دیکھو، مجھے معلوم ہے تم ساتویں جماعت تک میرے ساتھ اسکول جایا کرتے تھے۔ رقم تو پڑھ لو گے نا۔" میں نے ڈرافٹ روشنی کی طرف کیا، اور پھر میرے ہاتھ بجلی کے لشکارے کی مانند لہرائے اور دونوں کے بال میری مٹھیوں میں آ گئے تھے۔

میں نے جھٹکا دے کر اُن کو پیچھے کیا پھر پوری قوت سے دونوں کے سر سلاخوں سے ٹکرائے، دونوں حلق پھاڑ کر ڈکرائے تھے۔ غلام تو تیسری ضرب پر بے جان ہو کر لٹک گیا تھا۔ البتہ دلبر کچھ دیر مچلتا تڑپتا اور دہاڑتا رہا تھا۔ غالباً چھٹی یا ساتویں ضرب پر وہ گھٹنے موڑ کر بے حس و حرکت ہوا تھا۔ میں نے دونوں کو بمشکل اوپر اٹھایا۔ ان کے چہرے خون سے سرخ ہو چکے تھے اور زبانیں باہر لٹک آئی تھیں۔

وہ جیسے چھوڑا تو دونوں نیچے ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے تھے۔

ان کی خاموشی نے صرف میرا وقتی غصہ سرد کیا تھا میں نے ہاتھ نیچے لے جا کر باری باری دونوں کو اوپر اٹھایا۔ ان کی جیبوں کی تلاشی لی، دو چاقو، ایک نسوار کی ڈبی اور کچے تو کے چار سگریٹ نکلے تھے۔ میرا خیال تھا شاید اُن کے پاس چابی ہو گی اور میں شور مچاتا رہوں گا۔ گاؤں کا کوئی نہ کوئی فرد سن لے گا۔

سگریٹوں کے ساتھ ماچس بھی تھی۔ ماچس نے ہی میرے ذہن میں خطرناک ترین خیال پیدا کیا تھا۔ میں نے کمرے کا فرنیچر اُٹھا کر بیلی چھوٹے کمرے میں رکھنا شروع کر دیا کیونکہ فرنیچر کے باعث آگ پھیل سکتی تھی۔ اس طرح فاروق کا کام میں خود کر دیتا۔ میں کمرے کو خالی کر کے دروازے کو آگ لگانا چاہتا تھا۔

ابھی میں فرنیچر اندر پھینک ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میرا بدن سنسنا تا ہوا تن گیا۔ میری ناک سے طویل دکھ بھری سانس اُبھری جیسے لب بام کسی نے کمند کو ٹوٹتے دیکھ لیا ہو۔

"خرم! خرم سلطان!" مترنم آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کیا آپ اندر ہی ہیں؟"

"ہاں! زندگی کی بشارت میں اندر ہوں۔" میری آواز آپ سے آپ ہونٹوں سے پھسل گئی تھی۔

میں نے جست لگائی اور کواڑوں سے جا ٹکرایا۔ دفعتاً نسوانی چیخ سنائی دی۔ دبی دبی خوف سے بھرپور آواز کھڑکی سے آئی تھی۔ میں کھلی کھڑکی کے سامنے گیا تو لالٹین کی مٹمیلی روشنی میں سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ہیولا دکھائی دیا۔ سایہ ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"کون... کون ہے؟" میں نے سلاخوں کے ساتھ چہرہ لگا کر پوچھا۔

"م... میں... کلثوم ہوں۔" اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ "میرے پاس چابی نہیں ہے خرم سلطان۔ یہ کون ہیں؟"

"یہ میرے گاؤں کے کتے ہیں کلثوم ان سے نہ ڈرو اور تالا کھولنے کا انتظام کرو۔"

"چابی نہیں ہے کیسے کھولوں۔"

"پتھر سے۔ ضربیں لگا کر۔"

"میرے پاس ریوالور ہے، گولی سے ٹوٹ جائے گا نا؟"

"ہاں، کی ہول پر نال رکھ کر فائر کرو۔"

دوسرے لمحے دھماکہ ہوا اور پھر دروازہ کھول کر کلثوم ایک طرف ہٹ گئی۔

"جلدی کریں، وہ کھانا کھا رہے ہیں۔" کلثوم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ میں نے بریف کیس اُٹھایا اور باہر نکل گیا۔ "میرے ساتھ آئیں، میں گھوڑیاں لائی ہوں آپ کو فوراً نکل جانا چاہیے وہ لوگ ابھی کھانے میں مصروف ہیں۔ پھر گھوڑیاں لے کر گاؤں کو گھیر لیں گے۔" کچے راستے پر کلثوم میرے ساتھ دوڑ رہی تھی اور گاؤں کے کتے ہمارے فرار کا چیخ چیخ کر اعلان کرنے لگے تھے۔ کچھ کتے فاصلہ رکھے ہمارے ساتھ ساتھ بھونکتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ گاؤں سے کوئی دو فرلانگ نالے کے کنارے کلثوم کی مشکی گھوڑی تیار کھڑی تھی۔ اس نے لگام میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"گھوڑی گاؤں جا کر چھوڑ دیجیے گا گھر لوٹ آئے گی۔"

"میں آپ کا شکریہ ادا کر کے عظیم احسان کی توہین نہیں کروں گا کلثوم، ہاں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ میری خاطر ایک مہربان لڑکی نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔"

"ایسی باتوں کے لیے یہ وقت موزوں نہیں ہے۔" کلثوم نے پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اتفاقاً آپ کا نام سن لیا تھا۔ وہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بڑی خطرناک باتیں تھیں۔"

"سنو کلثوم!" میں نے ایک قدم بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اس کا جسم لرز اٹھا۔ "ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں لیکن میں صبح واپس آؤں گا۔ اگر فاروق نے..."

"نہیں... نہیں۔" اس نے میری کلائی پر چہرہ رکھ دیا۔ "نہیں خرم وعدہ کرو۔ مجھ سے مردانہ وعدہ کرو تم واپس نہیں آؤ گے۔ ہمارے حالات بہت خراب ہیں۔ میری محنت رائگاں جائے گی۔"

"ٹھیک ہے کلثوم۔" میں نے اس کے چہرے پر تھپکی دی۔ "میں جا رہا ہوں لیکن خرم سلطان احسان فراموش نہیں ہے۔ میں تا زیست یاد رکھوں گا، ہر آتی جاتی سانس کو یاد دلاتا رہوں گا۔ کہ یہ زندگی، یہ سانس کسی خوش بدو کی احسان مند اور مرہونِ منت ہیں۔"

"کوئی احسان نہیں۔" وہ اپنی ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر سسک پڑی۔ "یقین کرو خرم، میں نے تم پر نہیں بلکہ فاروق بھائی، اپنے خاندان اور اپنی ذات پر احسان کیا ہے۔ اگر یہ احسان ہے تو میں بدلہ چاہوں گی۔ تم سے درخواست کروں گی، تم سے عہد لوں گی، جو ہو چکا ہے اُسے بھول جاؤ۔ فاروق بھائی جیسا بھی ہے میرا بھائی ہے۔ ماں کے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ خاندان کا آخری چراغ ہے۔ اُسے نہ بجھانا خرم۔"

میں خاموش رہا تھا۔ اُسے کیا جواب دیتا۔ کس طرح وعدہ کر لیتا۔ اس لڑکی نے مجھے احسان کے جال میں بڑی ہوشیاری سے جکڑ لیا تھا۔ اگر انکار کرتا تو احسان فراموش کہلاتا۔ میں اس کا احسان تسلیم کر چکا تھا۔ اس لڑکی کو بڑا دکھ ہوتا جس نے کسی بھی جذبے کے تحت بے حد خطرناک اور جرأت مندانہ بروقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدم اٹھایا تھا جس نے میری جان بچائی تھی۔ اقرار کرتا تو دل میں بھڑکتی آگ مجھے تازیست جلاتی رہتی۔ مجھے ماں اور زینت کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا۔ برادری طعنوں سے جگر چھلنی کر دیتی۔ لوگ انگلیاں اٹھاتے۔ جدھر سے میں گزرتا ایک دوسرے کو بتاتے، دیکھو وہ جا رہا ہے بزدل اور بے غیرت جس نے باپ کے قاتل اور منگیتر کے ڈاکو سے انتقام نہیں لیا۔ فاروق چوہدری بھری محفلوں میں میرا مذاق اڑاتا اور مجھے بزدل جان کر وہ دن دیہاڑے میرے خاندان کی پگڑیاں اور دوپٹے اچھالنے چلا آتا۔

اس کے ہاتھ توڑنے ضروری تھے۔ جوابی کارروائی ناگزیر تھی۔

"بولتے کیوں نہیں ہو خرم سلطان؟" کلثوم نے تڑپ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میری درخواست پر غور کرو، دونوں خاندانوں کی سلامتی اسی میں مضمر ہے ورنہ یہ آگ دونوں گھرانوں کو چاٹ جائے گی۔ تمھارے ابا واپس نہیں لائے جا سکتے۔ زینت کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی تلافی بھی ناممکن ہے، مگر جو زندہ ہیں، جن کے دامن سلامت اور بے داغ ہیں ان کو تو بچایا جا سکتا ہے۔"

"جو آگ اندر بھڑک رہی ہے کلثوم۔" میں نے سلگتی آواز سے کہا۔ "اس کو سرد کیسے کیا جائے؟ آگ لگانے والے ہاتھوں کو معاف کیسے کیا جا سکتا ہے، اگر وہ ہاتھ نہ توڑے گئے تو کل وہ پھر آگ لے کر بڑھیں گے۔ میں ان ہاتھوں کو عبرتناک سزا دینا چاہتا ہوں۔ ایسی سزا جو دوسرے ہاتھوں کے لیے بھی ناقابل فراموش سبق بن جائے۔ تم جو راستہ دکھا رہی ہو وہ ہم جیسے دنیا داروں کا نہیں بلکہ ولیوں کا راستہ ہے۔ میں اُدھر ولایت حاصل کرنے نہیں گیا تھا۔ میں نے وہاں گردنیں چٹخانے اور ہاتھ توڑنے کا فن سیکھا ہے۔ مجھے معاف کر دینا کلثوم میں تمھارے بھائی اور اس کے حواریوں کو معاف نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے خرم۔" وہ سسک پڑی۔ "ایک... ایک وعدہ تو کر لو۔ میرے بھائی کو قتل نہیں کرو گے۔"

"ٹھیک ہے، اگر اس نے خودکشی نہ کی تو میں اُسے ہلاک نہیں کروں گا۔" میں نے یہ کہہ تو دیا اور اس کے بالوں پر تھپکی دے کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔

جوں ہی میں برساتی نالے کے کنارے گیا۔ جھاڑیوں پر روشنی کا دھندلا سا جھپاکا لہرایا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ فاروق چوہدری کے گاؤں کی جانب تین ٹارچوں کی متلاشی روشنی دکھائی دی۔ اگر روشنی اس راستے پر ہوتی جدھر کلثوم گئی تھی تو میں یقیناً یہ معلوم کرنے پلٹ جاتا کہ آنے والوں نے اُسے تو نہیں روک لیا لیکن وہ لوگ کھیتوں میں تھے۔ ناچتی روشنی سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تلاش کرنے والے گھوڑیوں پر سوار ہوں گے۔

میں نے فاروق چوہدری کی گھوڑی کو ایڑیوں کی ضربیں لگائیں۔ گھوڑی چلتی تڑپتی اترائی اترنے لگی۔ نالا خشک تھا۔ ریت کی وجہ سے گھوڑی کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ جب میں چڑھائی چڑھ کر کھیتوں میں داخل ہوا تھا تو فاروق کے آدمی اُدھر پار کھڑے نالے میں روشنی ڈال رہے تھے۔ نالا دونوں گاؤں کی سرحد پر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ وہاں سے ہی واپس پلٹ گئے تھے دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ کرائے کے لوگ تھے۔ پرائی آگ میں کون جلنے کی حماقت کرتا۔

گاؤں کے کتوں نے میرا بڑا پُرتپاک استقبال کیا تھا۔ گاؤں کی چپ چاپ گلیوں، درختوں اور گونگی دیواروں کی مانند وہ بولتے کتے بھی مجھے بڑے عزیز تھے۔ ان انجانے جذبوں کا ذائقہ گاؤں میں رہنے والوں کو محسوس ہو ہی نہیں سکتا۔ دیارِ غیر کی گرد پھانک کر جو اپنے دامن اور اپنے گاؤں میں اترتا ہے وہی اس ذائقے کی شیرینی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ میں ایک جگہ دُبک کر بے حس و حرکت بیٹھ گیا۔ میں شہری تھا نہ غیر ملکی۔ میری پرورش اس گاؤں اور ماحول میں ہوئی تھی۔ میں گاؤں کے ان رکھوالوں کی نفسیات بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ مجھے غائب اور بے ضرر جان کر کتے پُرسکون ہو کر واپس چلے جائیں گے۔ جب فضا پر سکوت طاری ہو گیا تو میں اُٹھا اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا چوہدری سجاول خان کی حویلی کے قریب جا رکا۔ حویلی پر اندھیرا اور گہرا سناٹا طاری تھا۔ میں نے برلبِ کیس دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔ سجاول خان نے جو قرض مجھے دیا تھا، میں اپنے گھر جانے سے قبل تمام قرض دار کم از کم پہلی معقول قسط ادا کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ دن کی روشنی میں یا رات کی تاریکی میں للکار کر وار کرتا تو میں اسے بوڑھا شیر مان کر اس کی تکریم کرتا، لیکن اس نے اپنا بن کر چور کتے کی مانند میری پنڈلی زخمی کرنا چاہی تھی۔ میں حویلی کے پچھلے حصے سے واقف تھا۔ حویلی ہانگ کانگ یا خلیائن کی کسی عمارت کی نہ تھی کہ مجھے معلوم نہ ہوتا کہ اندر کیا ہے۔ میں نے لوڑھی بیر کی جھکی ہوئی شاخ پکڑی اور الارا لے کر دیوار سے کود گیا۔ چوہدری کا کتا بھونکنے لگا تو میں دیوار کے ساتھ پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یہاں سے گئے کوئی برسوں کا وقت نہ ہوا تھا۔ کتا مجھے پہچانتا تھا۔ مجھ سے مانوس تھا۔ میرے سامنے اس کا بچپن اور جوانی بیتا تھا۔ کتے کے بارے میں ہم لوگ جانتے ہیں کہ جس سے مانوس ہوتا ہے اس کی آواز ہی نہیں بلکہ چاپ اور بو سے پہچان لیتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ چوہدری کی طرح اس کا کتا بے وفا اور ذلیل نہیں ہوگا۔ ڈبو بھونکتا ہوا آیا۔ میں نے پچکارا۔ وہ ایک دم رُک گیا اور پھر دُم ہلاتا ہوا بیٹھ گیا۔

دفعتاً لکڑی کا چھاتک کراہنے لگا۔ کوئی اندر آیا تھا۔ میں نے خود کو اینٹوں کے ستون کی آڑ میں چھپا لیا تھا۔ طویل قامت سایہ تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جب وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر آیا تو اندھیرے میں دیکھنے والی آنکھوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ میرا شکار، میرا دشمن چوہدری سجاول ہی تھا۔ کتا درمیان میں کھڑا کبھی ادھر کبھی میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اگر اُسے زبان مل جاتی تو اپنے مالک کو ضرور بتا دیتا۔ بے چارا نگاہوں کی زبان سے بولتا رہا تھا لیکن نگاہوں کی زبان چوہدری سجاول جیسا امتی کیسے سمجھ سکتا تھا۔

وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا جوں ہی میرے قریب سے گزرا میں اپنی جگہ سے اُچھلا۔ دوسرے لمحے اس کی گردن میرے بازو کی گرفت میں تھی۔

"خبردار آواز نہ نکلے چوہدری، میں تم سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میری سرگوشی میں درندگی تھی۔ اس نے بے آواز اقرار کیا اور میں اسے گرفت میں لیے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ وہ بُری طرح مچل رہا تھا۔ اس کی سانس سینے میں گھٹ گئی تھی۔ جب وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا تو میں نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ لحظہ بھر کراہتی ہوئی طویل سانسیں لیتا میرے ساتھ چلتا رہا تھا۔ میں اُسے بکریوں کے باڑے کے عقب میں لے گیا۔

"اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ آئے ہو چاچا؟" میں نے غرا کر اُسے جھٹک کر چھوڑ دیا۔

"اوہ... کیا اُن سب کو...؟" اس کی آواز اُبھر کر ڈوب گئی۔

"نہیں صرف دو، غلاموا اور دلبر۔"

"نہیں... میں کھانا کھاتے ہی دوسرے راستے چل پڑا تھا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "کیا انھوں نے تالا کھول دیا تھا؟"

"نہیں..." میں نے سرد آواز میں بتایا۔ "میں اندر تھا اور وہ باہر میرے ہاتھوں مر گئے۔"

"اوں۔ اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" وہ سنبھل کر مضبوط اور بے خوف انداز میں بولا۔

"غداری کی وجہ چاچا۔"

"تم نہیں جانتے؟"

"نہیں، میں نے تو تمھیں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا۔"

"سنو خرم!" وہ خشک گھاس پر بیٹھ کر بولا۔ "مجھے معلوم ہے تم..... کیوں آئے ہو، جس نے تار دے کر تمھیں بلایا ہے اس نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہوگا۔ میں نے اپنے باپ کا انتقام لیا ہے، وہ قرض ادا کیا ہے جو مجھ پر فرض تھا۔ یہ ہماری روایات اور خاندانی مجبوری ہے جسے ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ میں نے ہی فاروق چوہدری کی آڑ لے کر تمھارے باپ کو ہلاک کروایا ہے۔ میں نے ہی کلثوم اور تمھارا نام لے کر فاروق کو غیرت کا احساس دلایا تھا۔" وہ کھانسنے لگا۔ پھر چند گہری سانسیں لے کر بولنے لگا۔ "وہ ڈر گیا تھا ورنہ چوہدری سلطان کی بھتیجی اُدھر ہی رہتی۔"

"خاموش بے غیرت بوڑھے۔" میری لات اس کے سینے پر لگی۔ وہ گھاس پر اُلٹ گیا۔ "کمینے! تم نے یہ نہیں سوچا کہ بیٹی گاؤں اور برادری کی آن ہوتی ہے۔ تم نے زینت کو نہیں، خود اپنی ملک... برادری کی عزت برباد کر دی ہے۔"

"انتقام کی آگ اپنا پرایا نہیں دیکھتی لڑکے۔" وہ سینے کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "میں چاہتا ہوں تم اپنی بربادی، بگڑی کی بیٹی اور زینت کے دامن کا تار تار میری زبان سے دیکھو اور میرے سامنے تڑپو، میں جانتا ہوں تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے میں مرنے سے قبل چوہدری سلطان کے بیٹوں کی گردنیں جھکی دیکھنا چاہتا ہوں، پھر میں سکون سے مر جاؤں گا۔ میں تم سے زندگی نہیں مانگوں گا، میں تم سے مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ میں گرتی دیوار ہوں لیکن تمھیں بتا تو سکتا ہوں کہ تمھارے خاندان کو تباہ کرنے والا بلا دل کا بیٹا ہے۔"

"آپا جی کے قتل میں کس کس کا حصہ ہے چاچا؟" میں نے نہایت ہی ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

"دو وہ تھے جن کو تم مار چکے ہو۔" اس نے بتایا۔ "ایک میں ہوں جسے تم ابھی اُدھیڑ دو گے اور چوتھا شخص فاروق ہے۔ اس نے مال خرچ کیا تھا۔ غلاموا اور دلبر کو اسی نے تیار کیا تھا۔"

"زینت کو کیسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی؟"

"کوشش۔" سجاول استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگا۔ "وہ اکرم کے ساتھ شہر سے آ رہی تھی۔ فاروق نے گھوڑی سے اکرم کو روندا اور زینت کو اُٹھا لے گیا۔ میں نے تو کہا تھا اُسے شہر لے جانا مگر وہ اسے عدالت خان کے ڈیرے لے گیا اور چوتھے دن جرگے کو واپس کر دی اس نے۔"

"چوتھے دن؟" میرے دل پر جیسے برچھی اُتر گئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں چوتھے دن۔" سجاول کے حلق سے ہذیانی قہقہا ابھرا اور میری لات اس کے چہرے پر لگی پھر میں نے جھک کر اُسے گریبان سے پکڑ کر اوپر اُٹھالیا، وہ شاید پاگل ہوگیا تھا، حواس کھو بیٹھا تھا، مسلسل قہقہے لگائے جارہا تھا۔ میں نے سیدھی ہتھیلی تھپ سے اُس کے کھلے مُنہ پر ماری۔

"سنو بوڑھے لوفر، میری بات سنو۔ میں تمہیں نہیں ماروں گا اس لیے کہ تم مقابلے سے دست بردار ہوچکے ہو، ہاں اگر مقابلہ کرو تو دوسری بات ہے۔" میری انگلیاں سیدھی ہو کر تن گئیں۔ چیف ماسٹر خرم سلطان چوہدری نے خصوصی انداز اپنایا اور دو انگلیاں نیزے کی انیاں بن کر اس کی دونوں آنکھوں میں دُور تک پیوست ہوگئی تھیں۔

اس کے حلق سے اُبھرنے والی دل دہلا دینے والی خراش چیخ کو میرے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی نے جذب کرلیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ فریاد کرنے کے سے انداز میں اُٹھائے۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر دائیں بائیں جھٹکا دیا۔ جب چھوڑے تو کلائیاں کہنی کے جوڑ سے ناتہ توڑ چکی تھیں۔ چونکہ میرے دونوں ہاتھ مصروف تھے اس لیے اس کے ڈکرانے کی آواز سکوت کو زیروزبر کرگئی تھی۔

میں لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ رہا تھا کہ میں نے اُچھل کر دونوں پاؤں اس کے گھٹنوں پر مارے۔ ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ نے دوسری بار تاریک خاموشی کو لرزا دیا تھا۔

"بول شیطان مجھے بتاؤ۔" میں نے اس کے سینے پر گھٹنا رکھتے ہوئے سفاک لہجے میں پوچھا۔ "تمہیں وہ ٹیلی گرام کس نے میرے گھر سے چُرا کر دیا تھا؟"

"ڈاک... ڈاکیا... ہم... مجھے دے گیا تھا۔ میں نے صفراں سے پڑھایا اور سیدھا فاروق کے پاس چلا گیا تھا۔"

"تو یہ سازش بھی تم نے تیار کی تھی؟" میں نے گھٹنا اُٹھا کر مارا۔ اس کا منہ کھل گیا لیکن آواز کہیں نیچے ہی رہ گئی تھی صرف اس کی زبان باہر آئی تھی۔ میں نے زبان پکڑی اور حلق سے کھینچ کر دائیں جانب کھڑے کتے کی جانب اُچھال دی۔ میرے سامنے ہی کتا اپنے مالک کی گندی زبان چبا کر نگلنے لگا۔

سجاول خان شاید بے ہوش ہوگیا تھا۔ میں نے اُسے گھسیٹ کر گھاس پر ڈالا اور آہستہ آہستہ چل پڑا۔ واپسی کا راستہ سیدھا ہی اختیار کیا تھا کیونکہ اب احتیاط اور خوف دل سے دُور ہوچکا تھا البتہ کتا مجھ سے ناراض ہوگیا تھا، وہ سجاول کے قریب کھڑا رہا تھا۔ میں نے بریف کیس اُٹھایا اور گھر جانے والی گلی میں داخل ہوگیا۔

میری سوچوں کی وادی دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ جو ہو چکا تھا میں اس پر آنسو بہانے اور خاندان کے بکھرے ہوئے سکون کو سہارا دینے اتنی دُور سے دوڑا آیا تھا لیکن وہ نامعلوم ہاتھ میرے ساتھ ہی اسی فلائٹ میں چلا آیا تھا۔ وہی جو حادثے گھر کر میرے سامنے لاتا رہا تھا۔ جس نے مجھے وطن سے دُور بھی سکون کا سانس نہیں لینے دیا تھا جس کی ٹھوکروں پر میں فٹ بال کی مانند ایک سے دوسرے اور تیسرے چوتھے کھلاڑی کی ٹھوکروں کے لیے اُچھالا جاتا رہا تھا۔

میں اپنے گھر، جس گھر میں میرا بچپن گزرا تھا جس دروازے کی دہلیز میری آشنا تھی، در و دیوار مجھے پہچانتے تھے اُسی دروازے پر... چور بنا کھڑا تھا۔ احساس جرم جو بڑے سنگین جرائم کے نیچے دب گیا تھا۔ دہلیز پر قدم رکھتے ہی ہڑبڑاتا ہوا بیدار ہوگیا تھا۔ میں چور تھا۔ میں نے چوری کا مال لے کر اسی دہلیز کو عبور کیا تھا، میں اپنی ماں کا مجرم تھا اور عزیز از جان زینت کا چور تھا۔

دستک کے لیے اُٹھا ہوا ہاتھ ٹھٹک کر رُکا اور پھر گر گیا تھا۔ میں دستک دے کر اندر جانے کی اپنے اندر جرأت گم کر بیٹھا تھا۔ دستک دیتا تو سارے لوگ بیدار ہوجاتے اور مجھے فوراً ہتھکڑی عدالت میں پیش کردیا جاتا۔ میرے پاس تو بیان تھا نہ صفائی کا کوئی وکیل تھا۔ یہی خوف مجھے چور دروازے تک لے گیا تھا۔

میں نے حسب سابق انگلی سے شیشہ بجایا۔ تین بار ٹک ٹک۔ یہ ہمارا طے شدہ اشارہ تھا۔

"کون!" زینت کی مدھم اور لرزتی آواز سنائی دی۔

"میں... میں خرم ہوں زینی۔" میری آواز میں بھی تھرتھراہٹ نمایاں تھی۔

"تم؟" اس کی چیخ اُبھری پھر خاموشی چھاگئی۔ گہری اور سماعت سے کھڑکی کھلنے کی آواز ٹکرائی تھی اور سر دل پر کہنیاں ٹیک کر وہ باہر جھکی تھی۔ وہ چہرہ اندھیرے میں ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے دھند کی اوٹ سے چاند جھانک رہا ہو۔

میں چپ چاپ کھڑا دھندلی دھندلی چاندنی دیکھتا رہا تھا۔

"اُدھر جاؤ۔" اس نے سرد آواز اُبھری۔ "یہ قبر کی کھڑکی ہے۔"

"نہیں، اس وقت میں دوسروں کو جگانا نہیں چاہتا۔" میں نے سرگوشیانہ انداز میں بتایا۔ "ساتھ والے کمرے میں..."

"سنو خرم!" وہ اجنبی لہجے میں بولی۔ "وہ لڑکی جو کبھی تمہارے لیے جاگتی رہتی تھی اور دستک کی آواز سن کر تڑپ جایا کرتی تھی، وہ اب یہاں نہیں رہتی، وہ... وہ مرگئی ہے۔" اس نے پیچھے ہٹ کر ایک دم کھڑکی بند کرنا چاہی۔ میں نے کواڑوں کے درمیان بازو رکھ دیا۔ جب میں اندر اُترا تو وہ کہیں سسک رہی تھی اور میں تاریک کمرے میں گردش کرتی سسکیوں کے درمیان سِل پتھر ہوگیا تھا۔

"جاؤ... چلے جاؤ۔" وہ بلک کر بولی۔ "اب کیا لینے آئے ہو؟"

"بتی جلاؤ زینت۔" میں نے جھرجھراتی آواز میں کہا۔ "میں سنگسار ہونے آیا ہوں۔ مجھے دیکھ کر نفرت کے پتھر مارو۔"

اس نے تیلی جلائی اور پھر لالٹین روشن کردی۔

میں نے نگاہ بھر کر اس کو دیکھا اور جی جان سے لرز گیا۔ وہ لڑکی جو میرے دل میں یہاں وہاں روشن شمع دہی تھی وہ واقعی بجھ گئی تھی۔ وہ تو دھوئیں کا میلا میلا لاشعر سا ثبت میرے سامنے تھا۔

"جاؤ۔" اس نے انگلی سے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "نکل جاؤ یہاں سے۔"

"زینت!" میں نے قدم بڑھایا اور وہ سمٹ کر دُور ہوگئی۔ "میں... میں۔ دُکھ کی داستان سن چکا ہوں، میں زخم دکھانے نہیں مندمل کرنے مرہم بن کر آیا ہوں۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ حلق پھاڑ کر دہاڑی۔ "بزدل کمینے انسان، راکھ تو رہنے دو۔ کیوں آئے ہو اب، کس لیے، کس کے لیے کون ہے یہاں تمہارا؟"

میں ہونق سا ہوگیا تھا۔ وہ لڑکی تند و تیز لہجے میں گالیاں دے رہی تھی جو کبھی مجھے قریب پاکر ہانپنے لگتی تھی، جس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی رنگت بدل جایا کرتی تھی وہ کڑک رہی تھی برس رہی تھی کتنا انقلاب آگیا تھا، اس گھرانے میں میری عدم موجودگی کے دوران۔

"تم!" میرے اندر کا خرم سلطان جاگ پڑا۔ "زینت جانتی ہو میں بدتمیزوں کو برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"زینت نہیں ہے یہاں اندھے۔" وہ شاید دماغی توازن ہی کھو بیٹھی تھی پھر دھڑ سے دروازہ کھلا۔ میں نے چونک کر دیکھا، بغلی دروازے میں اکرم بھائی کھڑے مجھے گھور رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ڈبل بیرل گن تھی۔

"تم..." وہ خواب ناک آواز میں بڑبڑائے۔ ان کے ہاتھ سے گن فرش پر گری اور پھر دھاڑ دھڑ سے لپکے میں ادھر سے دوڑا۔ انھوں نے مجھے باہوں میں بھر کر سینے سے لگالیا۔ میرے ضبط کا بندھن آپ سے آپ ٹوٹ گیا تھا اور ہم دھاڑیں مارتے ایک دوسرے کو چمٹاتے دیر تک روتے رہے تھے۔

"ہم پر۔" اکرم بھائی مجھے پلنگ پر بٹھلاتے ہوئے سسکے۔ "ظلم اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں خرم۔ کاش تم باہر نہ جاتے۔ تم چلے گئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ تم ہی مضبوط قلعہ تھے، خاندان کا، دشمن نے ایک ہی تلے میں ہمیں تباہ کردیا ہے۔"

"میں... واپس آگیا ہوں بھائی جان۔" میں نے جھرجھراتے لہجے میں کہا۔ "قہر اور انتقام کی علامت بن کر واپس آیا ہوں۔ یہ دیکھیے۔" میں نے دونوں ہاتھ سامنے کردیے۔

"اوہ... خون۔" اکرم بھائی نے تڑپ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "خرم! خرم سلطان! مجھے بتاؤ تم کیا کرآئے ہو، کہاں سے آئے ہو، یہ خون کس کا ہے؟"

"اس دشمن کا بھائی جان۔" میں ٹھہرے انداز میں بولا۔ "جس کے ناپاک قدم اور ہاتھ اس حویلی کی جانب اُٹھے تھے۔"

"کک... کیا فاروق چوہدری؟" اکرم بھائی ہکلانے لگے۔ "بتاؤ۔ بولو کیا تم نے اسے...؟"

"نہیں۔ وہ بزدل کرائے کے لوگوں کی آڑ میں تھا۔"

"تو پھر؟"

"سجاول خان، وہی بوڑھا لوفر سازش کا اڈہ تھا۔" میں نے ہولے ہولے ایئرپورٹ سے کھڑکی تک کے واقعات اکرم بھائی کو بتادیے۔

زینت ہاتھوں میں چہرہ چھپائے... بیٹھی روتی رہی تھی۔

"میرے خدا۔" اکرم بھائی طویل سانس لے کر بولے۔ "اگر وہ لوگ کامیاب ہوجاتے تو ہم یہی سمجھتے رہتے کہ تم ہانگ کانگ میں ہو، بڑا ہی خطرناک منصوبہ تھا اُن کا۔"

"اپنے کمرے میں چلیں۔" میں نے اکرم بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں تفصیل سُننا چاہتا ہوں۔"

"ہاں چلتے ہیں۔" اکرم بھائی بولے۔ "زینت تم خرم کے لیے کچھ تیار کرلو لیکن اماں بی کو نہ جگانا۔"

اکرم بھائی نے وہی کچھ بتایا تھا جو سجاول خان بتا چکا تھا۔ اضافہ اتنا ہی تھا کہ فاروق نے اس لیے زینت کو اغوا کیا تھا کہ خرم سلطان کے تعلقات اس کی بہن کلثوم سے تھے اس لیے اکرم بھائی نے تمام تر تباہی کی ذمہ داری مجھ پر عائد کردی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہی وجہ تھی کہ زینت بھی مجھ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اسے دُہری چوٹ لگی تھی۔ اسے دُکھ ہونا ہی چاہیے تھا۔ خرم سلطان اس کا محبوب تھا۔ اسے چاہنے کا دعوے دار تھا اور کلثوم سے بھی پیار تھا۔

"خرم!" اکرم بھائی بھرائی آواز میں بولے "تمہاری غیر معمولی خاندان کے لیے بڑی جان لیوا ثابت ہوئی ہے، ہم غریب تھے لیکن عزت تھی، سکون تھا اور وقار کا بھرم قائم تھا۔ تم نے بے حساب دولت دی۔ دولت آئی تو سب کچھ غارت ہوتا چلا گیا۔ ابا جی چلے گئے، ناموس کو زخم لگانے گئے، وقار ملیا میٹ ہوگیا۔ دولت کچھ بھی نہ روک سکی۔ زینت لٹ گئی پھر بھی وہ ہمارے لیے محترم اور معصوم ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تم زینت کو اس حال میں بھی قبول کرلو گے؟"

"پہلے مجھے اماں بی کے فیصلے سے آگاہ کریں؟"

"زینت میری شریک حیات بنائی جانے والی تھی۔ پر یوں بارات چڑھنے والی تھی۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"صرف خاندان کی عزت کا تحفظ۔"

"زینت کی رائے لے لی گئی ہے نا؟"

"ہاں۔ میں نے خود اس سے بات کی تھی۔ وہ۔۔۔ وہ پتہ نہیں کیوں تم سے نفرت کرنے لگی ہے۔"

"وہ حق بجانب ہے۔ میں ہوں ہی قابل نفرت۔" میں نے کہا اور زینت کھلے دروازے سے داخل ہوئی۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی، پراٹھے اور آملیٹ تھا۔ میں نے صرف جگ سے پانی لیا اور ٹرے پرے ہٹا دی۔ "کھانا لے جائیے مجھے بھوک نہیں ہے۔ تین انسانوں کا خون پی آیا ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کریں خرم۔" اکرم بھائی جھرجھراتے ہوئے بولے "ہمارے جسم ابھی پہلے زخموں سے دُکھ رہے ہیں۔"

"اب کسی کا جسم نہیں دُکھے گا بھائی جان۔ میں آگیا ہوں تمام ہاتھوں اور خنجروں کا رُخ میری جانب ہوگا، آپ کی طرف صرف خوشیاں آئیں گی۔ میں صبح منہ اندھیرے واپس نکل جاؤں گا۔"

زینت نے ایک دم پلٹ کر دیکھا اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

"کہاں جاؤ گے خرم؟" اکرم بھائی تڑپ اُٹھے "نہیں تم نہیں جاؤ گے، زینت تمہاری امانت ہے، اسے سنبھالو، اُسے تمہاری ضرورت ہے خرم، میں تو ماں کے حکم پر شولی چڑھ رہا تھا۔"

"جو ہو رہا ہے اچھا ہو رہا ہے، میں اب آپ لوگوں کے کام کا نہیں رہا۔ میں اس احساس کے ساتھ یہاں کیسے رہ سکوں گا کہ میرے پیارے میرے اپنے مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔"

"کون... کون؟" اکرم بھائی ہانپ گئے "نفرت کرتا ہے، کوئی بھی تو نہیں۔"

"اماں بی اور زینت۔"

"ہاں اماں بی تم سے ناراض ہیں۔" اکرم بھائی بولے۔ "لیکن ماں کی آنکھیں ترس رہی ہیں، دل تڑپ رہا ہے خرم دروازہ کھلا ہے جاکر انھیں معاف کردیں گے۔"

صحن کا اندر والا دروازہ کھل گیا اور میں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے ہی سیاہ شال اوڑھے دروازے میں کھڑی تھیں۔ میں دوڑا اور تیزی سے اُلجھ کر منہ کے بل گر پڑا۔ میری سماعت سے اماں بی کی چیخ ٹکرائی۔ شاید ماں کا دل بولا تھا۔ میرے سینے تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ پھر دو ہاتھوں نے مجھے اٹھانا چاہا۔ میں نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا اماں بی مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ میں ان کے پاؤں سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار نے لگا۔ وہ مہربان ہاتھ دھیرے دھیرے مجھے تھپکنے لگے تھے۔ ویسے ہی جیسے ماں شیر خوار روتے بچے کو تھپک کر چپ کرا رہی ہو۔

"اٹھو۔ اوپر آؤ میرے بچے۔" اماں بی کی آواز میں ممتا کا پیار تھا۔ میں اوپر اٹھا اور اماں بی نے مجھے باہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔

میں جوں ہی اُن سے جدا ہوا دو لڑکھرانے لگی تھیں، اکرم بھائی نے ان کو سنبھال کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ میں ان کے پاؤں میں فرش پر بیٹھ گیا اور سر ان کے گھٹنوں پر ٹیک دیا۔

"بہت دیر کردی خرم بہت دیر۔" اماں بی نے میرے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم کہیں جانے کی بات کر رہے تھے نا۔ تمہیں صبح جانا ہوگا۔ زینت سے ملے بغیر اسے نہیں معلوم ہوتا چاہیے۔ وہ دُکھیاری لڑکی بکھر جائے گی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سمیٹ رکھا ہے۔ میں عورت ہوں، ماں ہوں، مجھے دونوں فرائض ادا کرنے ہوں گے۔ میں زینت کے دل کی آواز بھی سن رہی ہوں اور اب مجھے خاندان کی عزت بھی بچانا ہے۔"

"اماں بی خرم اس سے مل چکا ہے۔" اکرم بھائی نے بتایا اور اماں بی کو چپ سی لگ گئی۔

"میں چلا جاؤں گا اماں بی۔" میں نے چہرہ ان کے ہاتھوں

پر رکھ دیا۔ "مجھے آپ معاف کردیں۔"

"اکرم!" اماں بی بولیں "کیا تم بھائی کے لیے پیچھے ہٹ جاؤ گے؟"

"کیوں نہیں اماں بی۔" اکرم بھائی نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔ "میں دونوں پر ظلم کرکے سکھی کیسے رہ سکتا ہوں۔ وہ تو آپ کا حکم تھا ورنہ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ آپ کل یہ شادی ملتوی کردیجیے۔"

"سنیے بھائی جان۔" میں نے پلٹ کر کہا۔ "پروگرام تبدیل مت کیجیے۔ میں یہاں رُک گیا تو دوسرا طوفان جو یتی کی راہ لگ جائے گا۔ پھر زینت کی شادی بھی نہ ہوسکے گی۔ میں تین انسانوں کو قتل کرچکا ہوں۔ یہ ہاتھ کانگ نہیں پاکستان ہے۔ یہاں غنڈے اور قاتل قانون کے ہاتھوں سے دُور نہیں رہتے۔ جب میں آیا تو سجاول خان زندہ تھا۔ وہ میرا نام لے گا اور پھر پولیس مجھے گرفتار کرلے گی۔ مجھے ابھی فاروق کا قرض بھی چکانا ہے۔ میں شادی کے بندھن میں زینت کو نہیں باندھ سکتا۔ سجاول کے علاوہ کوئی گواہ نہیں۔ میں روپوش رہوں گا تو یہاں امن و سکون ہوگا۔ اماں بی مجھے اجازت دیجیے۔"

"ٹھیک ہے چلے جاؤ۔" انھوں نے جھک کر میری پیشانی چوم لی "میں فرض کی ادائیگی سے تمہیں نہیں روک سکتی۔"

"شکریہ اماں بی۔" میں نے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا کر چوم لیے "آپ نے مجھے اپنا لیا۔ مجھے بخش دیا، بڑا کرم کیا، آپ نے۔ میں آپ کے اس اعزاز کو برقرار رکھوں گا۔"

انھوں نے میرا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا "تم ہی خاندانی غیرت اور وقار کی علامت ہو۔"

میں نے بریف کیس سے ڈرافٹ نکال کر اکرم بھائی کے حوالے کردیے اور دیگر کاغذات جن میں پاسپورٹ بھی تھا، اماں بی کی گود میں ڈال دیے۔

"ڈرافٹ آپ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیجیے گا۔" میں نے ایک لاکھ پچیس ہزار کا ڈرافٹ الگ کرلیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ زینت پلنگ پر اکڑوں بیٹھی چکیاں لے رہی تھی۔

"زینی! میری باتیں غور سے سنو۔" میں کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا "میں تمہارے قابل نہ تھا۔ مجھے معاف کردینا زینت۔ میں تمہیں بچا سکا نہ اپنا سکا لیکن میں نے تمہارے قاتلوں کے نرخرے پھاڑ دیے ہیں۔ میں ایک ایک ظالم سے انتقام لوں گا۔ میں نہیں چاہتا تم اس شخص کے نام کو سینے سے لگا کر سسک سسک کر زندگی گزارو جس کے قدموں کے نیچے بدبختی چمٹ گئی ہے۔ میں شاید تمہاری ڈولی کو کندھا نہ دے سکوں گا۔ تمہارے لیے جہیز نہ خرید سکوں گا۔ میری طرف سے ایک بھائی کے جذبوں کی جانب سے یہ سوالاکھ قبول کرو۔"

"ٹھیک ہے خرم۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی "شاید یہی قسمت کے لیکھ تھے۔ ایک وعدہ کرو خرم جب کبھی تمہیں میری موت کی خبر پہنچے تو جنازے کو کندھا دینے ضرور آنا۔ میری آخری آرزو یہی ہے۔ تم اپنے ہاتھوں سے مجھے قبر میں رکھو۔"

جب میں اپنی کوٹھی سے نکلا تو میری جیب میں انٹرنیشنل اسمگلنگ رنگ کا تقرری خط تھا اور کچھ کرنسی تھی۔ دل میں دُکھ تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر اپنے گھر کو دیکھا اور طویل سانس لے کر دوسری گلی میں داخل ہوگیا تھا۔

دن ہوتا تو شاید کوئی سواری مل جاتی تاریک رات کے مسافر کو ٹھوکریں اور گرد کے سوا کیا ملتا۔ راستے جانے پہچانے تھے۔ ان راستوں میں میرا ماضی کہیں گم ہوا تھا۔ چلتے چلتے میں اس جگہ رُک گیا تھا جہاں میری پہلی ملاقات کلثوم سے ہوئی تھی۔ کتنا عجیب اتفاق تھا کہ وہ پتھر بھی وہیں پڑے ہوئے تھے جو پہیہ ٹھیک کرنے کلثوم اُٹھا لائی تھی۔ جب پچھلے پہر کا آدھا چاند طلوع ہوا تو میں ہائی وے پر کھڑا تھا۔ کئی ٹرک مجھ پر گرد اُچھالتے گزر گئے تھے۔ میں نے لفٹ کا اشارہ بھی دیا تھا لیکن ویران سڑک اور گئی رات میں ایک اجنبی پر ٹرک ڈرائیور کیسے اعتبار کرتے پھر ایک بس نے مجھے اٹھایا تھا۔ مسافر کچھ سوئے ہوئے تھے، باقی اونگھ رہے تھے۔ کسی نے بھی میرے لباس پر توجہ نہ دی تھی ورنہ پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیتے۔ میں اڈے کی چہل پہل پر ہی اُتر گیا تھا۔ برقی روشنی نے اڈے کو میرے جیسے شخص کے لیے خطرناک بنا رکھا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک ہوٹل کی جانب چل پڑا۔ استقبالیہ کے کاؤنٹر پر سر ڈالے ایک بوڑھا سویا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ اس نے سر اٹھائے بغیر آنکھیں کھول دیں "ڈبل یا سنگل؟"

"سنگل۔" میں نے جواب دیا۔ اس نے رجسٹر کھول کر میرے سامنے رکھ دیا اور دراز سے ایک چابی نکال کر رجسٹر پر رکھ دی۔ چابی کے ٹوکن پر روم نمبر سولہ درج تھا۔ میں نے لحظہ بھر کے لیے سوچا اور پھر فرضی نام اور ایڈریس لکھنے لگا۔

کمرہ واجبی سا تھا۔ بہرکیف چہرہ چھپانے اور رات بسر کرنے کا انتظام ہوگیا تھا۔ میں جوتے اتار کر لیٹ گیا اور تمام سوچوں کو دھکیل کر کمرے سے باہر کردیا۔ میں صرف سونا چاہتا تھا۔ اگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوچوں کی چمگادڑ یوں کھلی رہ جاتیں تو میں شاید ایک پل نیند بھی نہ سکتا۔ صبح اٹھا تو ساری کوفت اور تھکن دُور ہو چکی تھی ٹھنڈے پانی سے غسل کیا تو طبیعت خوش ہو گئی۔ میرا لباس اور جوتے خون آلود تھے۔ اگر چند دھبے ہوتے تو میں دھو کر صاف کر دیتا مگر آستینوں پر اُن گنت دھبے بکھرے ہوئے تھے۔ دامن بھی داغ دار تھا۔ چنانچہ ایک چادر کی تہمد بنائی دوسری اوپر اوڑھ لی اور ناشتے کے لیے سروس روم کو کال بیل سے مطلع کر دیا۔

ادھیڑ عمر بیرے نے اندر آ کر فرشی سلام کیا۔ اس کے چہرے پر بھوک اور آنکھوں میں التجاؤں کے سایے تیر رہے تھے۔ وہ میرے مطلب کا آدمی تھا۔ ایسے لوگ معاوضے اور انعام کی خاطر بہت کچھ کر گزرنے والے ہوتے ہیں۔

"ناشتہ، ذرا ڈبل قسم کا۔" میں نے نرم اور مسکراہٹ بھری آواز میں کہا۔ وہ جھکا اور باہر نکل گیا۔

دس منٹ بعد وہ ٹرے سجا لایا تھا۔ سلائس، آملیٹ، مکھن، جام لایا تھا۔ میں رات کا بھوکا تھا بلکہ وہ وقت ہو گئے تھے کچھ کھائے۔

"اور کچھ صاحب؟" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "کوئی بھی خدمت جناب؟"

"بتاتا ہوں چاچا جی۔ ذرا ہوش آنے دو۔" میں نے نوالا ٹھونستے ہوئے جواب دیا۔ "شیو کا سامان، ہاں آپ کا نام کیا ہے؟"

"لال دین جناب۔"

"اپنے گرائیں لگتے ہو؟"

"جی ہاں مری کا رہنے والا ہوں جناب۔"

"ایسے کرو لال دین۔" میں نے تکیے کے نیچے سے دو نوٹ نکالے۔ "مجھے ایک وزیر صاحب سے ملنے اسلام آباد جانا ہے، سنا ہے قومی لباس کا رواج ہو گیا ہے، میرے پاس انگریزی سوٹ ہے، کیا یہاں سے ریڈی میڈ شلوار قمیض مل جائیں گے؟"

"بالکل مل جائیں گے جی فس کلاس۔ مدینہ مارکیٹ سے ابھی لا دیتا ہوں۔" میں نے دو سو روپے اس کو دیے وہ سلام کر کے دوڑتا ہوا نکل گیا۔

ادھر میں ناشتے سے فارغ ہوا اُدھر لال دین ریڈی میڈ سوٹ کا پیکٹ لے کر آ گیا۔ براؤن رنگ کا سوٹ تھا۔ ساتھ شیو کا سامان بھی لایا تھا۔ میں نے ریزہ کاری اور دس کا نوٹ ٹرے میں رکھ دیا۔ "یہ تمہارا انعام ہے لال دین، جاؤ مل لے آؤ۔"

جب میں ہوٹل سے نکلا تو میری جیب میں صرف پچاس روپے تھے اور مجھے بہت سے کام کرنا تھے۔ آنے والی راتوں کا خیال رکھنا تھا۔ خالی جیب کے ساتھ میں خالی پیٹ کسی مسافر خانے کی سنگی سل پر بھی راتیں بسر کر سکتا تھا۔ میں نے کندھے اُچکائے اور ہوٹل کی آخری سیڑھی سے اُتر کر باہر نکل گیا تھا۔ دولت کے بارے میں سوچنا فضول تھا۔ دولت نے مجھے پہلے چور بنایا تھا پھر قاتل بنا دیا۔ جب دولت نہ تھی تو میں صرف طالب علم تھا۔ دولت کی ہوس نے مجھ سے علم کی طلب، روشنی اور انسانیت سب کچھ چھین لیا تھا۔

لیکن کی عیاشی نہیں کر سکتا تھا اس لیے اڈے پر کھڑی بس میں جا بیٹھا۔ بس براستہ سیکرٹریٹ نور پور شاہاں جا رہی تھی۔ جمعرات کا دن تھا لوگ نذریں نیازیں لیے بیٹھے تھے۔ میرا دل بڑا ہی تڑپا تھا۔ بری سرکار کے دربار عالیہ پر حاضری دینے کے لیے۔ تب ہی میں نے تمام پروگرام بس پشت ڈال کر پہلے بری سرکار کو سلام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دیگر عقیدت مندوں کے ہمراہ دربار میں جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر دل ہر غم سے بیگانہ سا ہو گیا۔ ایک عجیب سا سکون میری رگ رگ میں بس گیا۔

اگر آفس ٹائم کا خیال نہ ہوتا تو میں اس نور کی بستی سے اتنی جلدی رخصت نہ ہوتا لیکن مجھے آج ہی وزیر داخلہ اور مسٹر بیگن سے ملنا تھا۔ تاخیر میرے لیے کئی پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔ میرے ہاتھوں تین قتل ہو چکے تھے۔ میری آمد کے تین گواہ زندہ تھے فاروق چوہدری، عدالت خان اور کلثوم اور سجاول خان کو بھی میں نزع کی حالت میں چھوڑ آیا تھا۔ اگر کوئی بھی پولیس کو اشارہ دے دیتا تو میرے لیے روپوشی ممکن نہ رہتی۔ دوسرے ملک کی پولیس اور ہماری پولیس کی سوچ اور طریقہ کار میں زمین آسمان کا فرق مجھے معلوم تھا۔ وہاں پولیس صرف مجرم کو تلاش کرتی ہے۔ قانون بھی صرف مجرم کو ہی سزا دیتا ہے لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ مجرم جرم کر کے اگر فرار ہو جانے میں کامیاب ہو جائے تو ہماری پولیس نہ تو نقش پا تلاش کرتی ہے نہ فنگر پرنٹس لینے کا رواج ہے۔ وہ مجرم کو تلاش کرنے کی بھی زحمت نہیں اُٹھاتی بلکہ مجرم کے لواحقین سے کہا جاتا ہے مجرم کو تلاش کر کے پیش کرو۔ اگر وہ میرے گھر والوں سے بھی روایتی سلوک کرتے تو میں شاید ایک لمحہ بھی روپوش نہ رہتا۔ اس لیے میں وزیر داخلہ سے مل کر اپنی پوزیشن صاف کر لینا چاہتا تھا اور مسٹر بیگن کے بارے میں مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں وہ اس تنظیم کا شیلٹر ہے۔

استقبالیہ آفس کی رسمی کارروائیوں سے گزرتا جب میں

وزیر موصوف کے سیکرٹری تک گیا تو آفس بند ہونے لگے تھے۔ کلرک کاغذات سنبھال رہے تھے۔ میں نے چٹ پر نام لکھ کر اندر بھجوایا تو دو منٹ بعد مجھے اندر بُلا لیا گیا تھا۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی آؤ گے۔" انھوں نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا کر کہا۔ "مجھے کل ہی آپ کے بارے میں لکھا ہوا خط ملا ہے۔ میرے لیے یہ بات باعث فخر ہے کہ میری قوم کا نوجوان اس کام اور عہدے کا اہل مانا گیا ہے۔ وہ غیر ہیں مگر انھوں نے تمہاری بے حد تعریف کی ہے۔ بتیس حیرت انگیز اور ذہین ترین نوجوان کہا گیا ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔ ریکارڈ فائل ہے۔ تم نے اپنی خدمات اپنے ملک کو دے کر قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ بھی جہاد ہو گا۔" پھر انھوں نے سیکرٹری سے میرا فائل منگوا کر آئی جی سے لائن ملانے کو کہا۔

وہ بہتر سمجھ کر واپس چلا گیا تو وہ مسکراتی نگاہوں سے میرے سراپا کا جائزہ لینے لگے۔

"ہاں تو خوب صورت نوجوان، ڈپلومیٹک جوائن کرنا پسند کرو گے؟"

"ابھی سے جناب۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ! گھر نہیں جاؤ گے؟"

تب میں نے ان کو وہ سب کچھ بتا دیا جو میرے خاندان پر بیت چکا تھا اور وہ کچھ بھی جو میرے ہاتھوں سے ہو چکا تھا۔ چھپانے کا فائدہ تو نہ تھا، ہاں نقصان ہو سکتا تھا۔ وہ دیر تک پیشانی رگڑتے اور سوچتے رہے تھے۔ پھر جب انھوں نے چہرہ اوپر اُٹھایا تو ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ فیصلے کا سفر اتنا ہی مشکل تھا وہ بوڑھا شخص پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔

"تو وہ جارح تھے نا۔" انھوں نے جیسے خود کو سہارا دینا چاہا۔ "حفاظت خود اختیاری کا حق تم نے استعمال کیا تھا۔"

"جی ہاں جناب۔" میں نے بتایا۔ "اگر وہ رحم دل لڑکی مجھے نہ چھڑاتی تو آپ اور میرے گھر والے انتظار ہی کرتے رہ جاتے۔"

"یقیناً یقیناً بڑا خطرناک منصوبہ تھا۔" وہ تائیدی لہجے میں بولے۔ اتنے میں سیکرٹری نے سرخ فائل اُن کے سامنے رکھ دی اور بولا۔

"آئی جی آن دی لائن سر۔" وزیر داخلہ نے عینک چڑھائی اور بائیں ہاتھ سے فائل کھول لیا اور دائیں ہاتھ سے ریسیور اُٹھا لیا۔ دعا سلام کے بعد ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میرے پلے نہ پڑی تھی۔ ہاں نام یہاں بھی لیا جاتا مجھے پتہ چل رہا تھا کہ عنوان میری ہی ذات ہے۔ انھوں نے فاروق چوہدری، کلثوم، عدالت خان، سجاول اور دو قتلوں مقصیوں کے نام لیے تھے، پھر وہ فائل کے اوراق اُلٹنے اور میرے بارے میں آئی جی کو کچھ بتاتے رہے تھے۔

"ٹھیک ہے خرم سلطان۔" ریسیور رکھ کر وہ بولے۔ "بڑے قومی مقاصد کی خاطر ہم نے برامر مجبوری، انسانیت کی بھلائی کے نام پر فیصلہ کیا ہے کہ تمہارا نام نہیں آنا چاہیے۔ قانون بہرصورت قانون ہے۔ اگر تم اُلجھ گئے تو ملک کا بہت نقصان ہو گا۔ تم آج شام سات بجے آئی جی سے مل لو۔ اور کوئی بات؟"

"جی جناب کچھ باتیں ہیں۔" میں نے نگاہیں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ "گو یہ باتیں خود غرضی اور لالچ کے زمرے میں جائیں گی مگر میں تہی دست ہوں۔ میرے پاس ایک رات بسر کرنے کا بھی سامان نہیں ہے۔"

"بولو، بولو تمہاری جائز ضروریات ہم پوری کریں گے۔" انھوں نے پنسل اُٹھا لی۔

"میری آفیشل حیثیت کیا ہو گی جناب؟"

"بہت بڑی، بہت اہم، عہدے کا نام چاہتے ہو؟"

"نہیں جناب۔" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں میرا دائرہ اختیار کیا ہو گا۔"

"چاہو تو مجھے گرفتار کر سکتے ہو۔" وہ بولے اور پھر ہنسنے لگے۔ "برخوردار! تم اپنے دائرے میں خود مختار ہو گے۔ ملک کی انتظامی قوت تمہارے اشارے پر کام کرے گی۔ اصل کام تو تمہارا اس لعنت کو قوم کی پیشانی سے مٹانا ہے۔ ہمارا ملک بین الاقوامی طور پر ہر معاملے، ہر پہلو سے نیک نام رہا ہے لیکن منشیات نے ہمیں کچھ داغ دیے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے روٹ ہی مانا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم اپنی پوری صلاحیتوں اور قوتوں سے راستے بند کر دو، اس پاک دھرتی کو ناپاک کرنے والے پاؤں توڑ دو، پوری قوم تمہاری پشت پر ہو گی۔"

"کیا مجھے سرکاری رہائش اور عملہ ملے گا؟"

"ہاں، جو تم طلب کرو گے۔ میں نے آئی جی کو کئی اختیارات دے دیے ہیں۔"

"شکریہ جناب۔" میں نے ہتھیلیاں ٹیک کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ "آئی جی صاحب کا ایڈریس؟"

انھوں نے ڈائری سے چٹ اُتاری اور ایڈریس لکھ کر میری جانب بڑھا دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھٹی ہو چکی تھی اس لیے بس اسٹینڈ پر بڑی طویل قطار لگی ہوئی تھی۔ یہ منظر میرے لیے دل خوش کن تھا۔ میری قوم میں بھی نظم و ضبط پیدا ہونے لگا تھا۔ میں بھی قطار میں لگ گیا تھا۔

مسٹر بیگن ویسٹرخ ایریا میں ایک الگ تھلگ یک منزلہ ہٹ میں قیام پذیر تھا۔ پاکستان جیسے ملک میں ایک بہت بڑی تنظیم کا اعلیٰ نمائندہ ہونے کے باوجود وہ تنہا تھا اور جھاڑو سے برتن دھونے تک تمام کام خود کرتا تھا۔

پہلی ملاقات ہی عجیب انداز سے ہوئی تھی میں چیرنگ کراس اسٹاپ پر اتر کر پیدل ہی قطار در قطار کوٹھیوں کے عقب پڑتا ہوا نالہ پار کر گیا تھا۔ میں نالے سے پار خودرو جھاڑیوں سے گزر رہا تھا کہ اتفاقاً میری نگاہ میلی سی نیم پلیٹ پر چلی گئی تھی۔ وہی میری مطلوبہ منزل تھی۔ میں نیم وا گیٹ سے جوں ہی داخل ہوا ایک سفید کتا غرانے لگا۔ میں بڑھتا گیا اور کتا پھپ پھپ کرتا الٹے قدموں پیچھے ہٹتا جا رہا تھا، جیسے کوئی لڑکی کہہ رہی ہو "رک جاؤ، میرے نزدیک نہ آنا"۔

"بی اینزی پومی" گلاب کی گیندی جھاڑی سے ایک طویل قامت شخص باہر نکل کر بولا۔ اس کے ہاتھ مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے بلکہ گھٹنوں تک گرد آلود تھا۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر، میں مٹی والے ہاتھ نہیں ملا سکتا"۔

"لیکن تم مجھے مسٹر بیگن سے تو یقیناً ملا سکتے ہو؟" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"ہاں، اندر چلو، میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں" وہ نل کی جانب چل پڑا۔

"کیا مسٹر بیگن اندر تشریف رکھتے ہیں؟"

"ہاں، اُدھر برآمدے میں بیٹھو" اس نے میرے سامنے ہاتھ چہرہ اور ٹانگیں صاف کیں اور پھر ہٹ کے عقب میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ صاف لباس میں باہر آیا اور ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

"مجھے ہی ادھر لوگ بیگن کے نام سے جانتے ہیں"۔ میں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کا بڑھا ہوا ہاتھ گرم جوشی اور عقیدت سے تھام لیا "میں کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔

میں نے جیب سے لفافہ نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بغیر کھولے بشرٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

"مسٹر خرم سلطان؟" اس نے میرا چہرہ تکتے ہوئے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا "غالباً ایئرپورٹ سے آ رہے ہو"۔

"میں کل رات کی فلائٹ سے آیا تھا مسٹر بیگن"۔

"مجھے آج ٹیلی پرنٹر اور مذریعہ وائرلیس تمہارے بارے میں بتایا گیا ہے۔ ٹیلی پرنٹر میسج مسٹر مڈسن نے بھیجا ہے اور وائرلیس کا پیغام ہیڈ کوارٹر نے دیا ہے۔ شہر کے حالات ہوا"

"فی الحال بس چل ہی رہا ہوں"۔

"آؤ اندر چل کر آرام کرو" اس نے اپنائیت سے میرا ہاتھ تھام کر اٹھا لیا "میں دوسرے ساتھیوں کو بھی کال کرتا ہوں۔ آج ہم ایک اچھی شام منائیں گے"۔

"ساتھیوں کا تعلق اسی ملک سے ہے؟"

"نہیں" بیگن نے نفی میں سر ہلایا "اس ملک کی نمائندگی تم کرو گے، ہر ممبر ملک کا ایک ایک نمائندہ یہاں ہے"۔

ہٹ چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک بیڈ روم جسے میں نے عبادت کا کمرہ سمجھا تھا، قالین پر صاف ستھرا کپڑا بچھا ہوا تھا اور کونے میں بستر تہہ کی شے تھی۔

"میں اعصابی کھچاؤ کا مریض ہوں اس لیے ہارڈ بیڈ پر سوتا ہوں۔ اس نے اپنے بستر کی طرف اشارہ کیا "ادھر ڈرائنگ روم ہے تم صوفے پر آرام کرنا چاہو تو کر لینا"۔

"میں صرف آپ کو رپورٹ دینے حاضر ہوا ہوں مسٹر بیگن" میں نے کہا "میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا ہے اور آنے والی رات کا کرایہ میرے جیب میں نہیں ہے"۔

"شاندار لڑکے ہو" اس نے قہقہہ لگایا "مجھے صاف گو اور کھلے دل کے لوگ پسند ہیں۔ یہ بتاؤ مڈسن نے تمہیں کس کان سے کھود نکالا ہے"۔

"مادام سعدیہ کے توسط سے"۔

"وہ عظیم عورت بھی اس ادارے کی سینئر ممبر ہے" بیگن نے بکھرے ہوئے اخبارات اور کپڑے صوفے سے ہٹاتے ہوئے بتایا "اس کا پورا خاندان تباہ کر دیا گیا ہے۔ بڑی دکھی خاتون ہے۔ تم مجھے اجازت دو کافی چلے گی نا"۔ میرے جواب سے پہلے ہی وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور میری سوچ کا پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا ذہن کے دریچے سے نکل گیا۔ مجھے مادام سعدیہ یاد آئی جس نے مجھے بتایا کہا تھا اور خود میرے منہ سے اماں بی سننے کی پیاسی تھی۔

مسٹر بیگن کب بے آواز چلتا ہوا کمرے میں آیا مجھے کوئی احساس نہ ہوا تھا میں کمرے میں تھا کب۔ میں تو فلپائن کی مادام سعدیہ کے زیر سایہ تھا۔ بیگن نے کھٹ سے کافی کا مگ تپائی پر رکھا تو میں چونک پڑا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے مسٹر خرم سلطان؟"

"فلپائن جناب" میں نے مسکرا کر جواب دیا "اپنی ماں کی آغوش میں"۔

"ہاں وہ بہت مہربان ماں ہے" وہ کافی کا سپ لے کر بولا "مجھے اس عورت نے بے حد متاثر کیا تھا"۔

"مسٹر بیگن مجھے کچھ بتائیے۔ یہاں گروپ کیا کرتا ہے اور دائرہ کار کہاں تک پھیلا ہوا ہے، ہیڈ کوارٹر کہاں ہے"۔

"فی الحال" بیگن نے مگ سے اٹھتی بھاپ کو گھورتے ہوئے بتانا شروع کیا "ہم ان فٹ پڑے ہیں۔ ماحول، زبان اور اجنبیت، ہم سنتے ہیں دیکھتے ہیں مگر کچھ کرتے نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف کاغذی چھاپے مارتے ہیں، گھوڑے دوڑاتے ہیں اور جتنا کچھ کرتے ہیں وہ کمپیوٹر کی ہدایات کی روشنی میں کام ہمارا اور نام اُن کا ہوتا ہے"۔

"گروپ لیڈر تو آپ ہی ہیں نا؟"

"ہاں نام مقام" اس نے اثبات میں گردن ہلائی — ادارے کے قانون میں گروپ لیڈر مقامی شخص ہوتا ہے چونکہ مقامی آدمی موجود نہ تھا اس لیے عارضی طور پر یہ ذمے داری مجھے سونپی گئی تھی۔ سابق ہیڈ کوارٹر نے لیڈر چن لیا ہے، لہٰذا کل تم مجھ سے چارج لے لو گے"۔

"اوہ نہیں جناب" میں نے کسر نفسی سے کام لیا "میں آپ کو اسسٹ کروں گا"۔

"ہاں اخلاقاً" وہ مسکرانے لگا "میں بھی عمر اور تجربے کے حوالے سے تمہیں مشورے دیتا رہوں گا۔ میری حیثیت مشیر کی ہوگی۔ اصول اور قانون سے روگردانی ہم نہیں کریں گے"۔

"شکریہ مسٹر بیگن" میں نے ممنون لہجے میں کہا "مجھے آپ جیسے بزرگ کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ براہ کرم ساتھیوں کو کال کر لیں۔ ملاقات اور میٹنگ ہو جائے۔ اگر یہ گراں ذمہ داری میرے کندھوں پر ہی رکھی جا رہی ہے تو میں تنظیم نو کروں گا اور اپنے ونگ کو خود مختار بناؤں گا کسٹم والے ہماری ہدایات پر کام کریں گے"۔

"کوشش تو میں نے بھی کی تھی" وہ شاکی لہجے میں بولا۔ "لیکن قدم قدم پر مجھے روکا ٹوکا گیا تھا"۔

"اب ایسا نہیں ہوگا محترم" میرے حلق سے غراہٹ ابھری۔ "میں روک ٹوک کو ٹھوکریں مارنے کا عادی ہوں۔ میں نے وزیر داخلہ سے اس بات کی ضمانت لے لی ہے کوئی ہمارے کام میں مداخلت نہیں کرے گا"۔

"اوہ۔ تم پہلے مرحلے سے گزر آئے ہو، بہت خوب، چیف نے بہتر ٹریزہ بھیجا ہے۔ اب واقعی مزا آئے گا"۔

"مجھے کچھ رقم درکار ہے، فنڈ سے یا اپنی جیب سے قرض حسنہ"۔

"میرے ساتھ آؤ" وہ اچھل کر اٹھا "جو کل تمہارا ہو گا وہ ابھی ہو جائے تو بہتر ہوگا"۔ دوسرے کمرے کی دیوار گیر آہنی الماری کھولی اور جوں ہی پٹ کھلا میری آنکھیں حیرت سے چھل سی گئیں۔ اندر الماری میں کرنسی نوٹوں کی گڈیاں سجی ہوئی تھیں بیگن نے پلٹ کر گردن کو خم کیا اور چابیاں میری جانب بڑھا دیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ روک دیا۔

"اس شعبے کے سربراہ آپ ہی رہیں گے محترم مجھے گزارے کے لیے کچھ رقم دے دیں"۔

اس نے سو اور پچاس کی ایک ایک گڈی نکال کر میرے حوالے کر دی۔ میں نے پچاس والی گڈی جیب میں رکھ لی۔ پانچ ہزار ذاتی ضروریات کے لیے کافی تھے۔

"آپ ساتھیوں کو آٹھ بجے کا وقت دے دیں" میں نے تالا لگاتے ہوئے کہا "میں آئی جی پولیس سے ملنے جا رہا ہوں، وقت طے ہو چکا ہے۔ ہاں کھانے کا انتظام کیا ہوگا؟"

"آج میزبانی کا شرف میں چاہوں گا" اس نے بشاشت سے کہا "پہلے میٹنگ ہو گی پھر ہم کسی اچھے ہوٹل میں ڈنر لینے چلیں گے"۔ سڑک تک بیگن میرے ساتھ آیا تھا۔ اس نے ٹیکسی روکی اور میں اندر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے بھی ساتھ چلنے کی پیش کش کی تھی لیکن اس نے معذرت خواہانہ انداز میں انکار کر دیا تھا۔

ٹیکسی میری جانی پہچانی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی جلد ہی مجھے میری منزل تک لے آئی۔

جب میں اطلاعی گھنٹی بجا کر گیٹ سے داخل ہوا تو ایک سڈول بدن شخص لان میں ٹہل رہا تھا۔ لان چیئر پر ایک ادھیڑ عمر خاتون اور ایک نوعمر لڑکی بیٹھی گپ شپ کر رہی تھیں۔ میں ہاتھ کے پروانہ قدم رکھتا جوں ہی پورچ تک گیا۔ ڈرامائی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے روک لیا۔

"جی فرمایئے۔" وہ ہاتھ جھاڑتا ہوا قریب آ گیا۔

"صاحب سے ملاقات۔"

"وقت لیا تھا نا آپ نے؟"

"ہاں۔ ان کو بتاؤ خرم سلطان آیا ہے۔"

معاً وہ سڈول بدن شخص باڑ پھاند کر میرے عقب میں آ گیا تھا۔ ڈرائیور کا جسم سکڑتا چلا گیا تھا۔

"خوش آمدید مسٹر خرم سلطان۔" وہ مسکراتے ہوئے بڑھے۔ "تمہارا میزبان۔۔۔"

"السلام علیکم سر۔" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"آیئے اندر میں بیٹھتے ہیں۔" وہ میرا ہاتھ تھامے چل پڑے۔

خواتین نے چہرے گھما کر ہماری جانب دیکھا۔ لڑکی نے اون کے گولے تیسری کرسی سے اٹھا کر شاپنگ بیگ میں رکھ لیے۔

"بیگم! یہ خرم سلطان چوہدری، پاکستان اینٹی اسمگلنگ بیورو کے نئے چیف۔" انھوں نے میری پشت سہلاتے ہوئے تعارف کرایا۔ میں نے جھک کر مؤدبانہ سلام کیا۔ "خرم سلطان! یہ میری بیٹی۔" وہ ہنس پڑے۔ "بیگم کی اس لیے نہیں کہ ہم دونوں نے بغاوت کر رکھی ہے۔ نادیہ لاء میں ڈگری حاصل کرنا چاہتی تھی اور بیگم اس کی شادی کرنے پر مصر تھیں۔ لہٰذا فی الحال نادیہ صرف میری بیٹی ہے۔" نادیہ نے تبسم آمیز سلام کیا تھا۔

مجھے وہ شخص صرف باپ اور خاوند ہی لگا تھا کسی زاویے سے پولیس چیف دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیگم صاحبہ میرے سراپا کو ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے قربانی کے بکرے کا معائنہ کر رہی ہوں۔

"اب خواتین اندر جائیں گی۔" آئی جی صاحب بولے۔ "کیونکہ ہم خالص پولیس کی زبان اور اصطلاحات میں باتیں کریں گے۔ نادیہ جان! آپ ہمارے لیے کافی بنائیں گی۔ دہی اپنے والی۔" نادیہ اٹھی تو اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھوٹ گیا اور گولے بکھر گئے۔ میں نے اٹھ کر گولے چنے اور بیگ میں ڈال دیے۔

"تھینک یو۔" نادیہ کی بھوری نگاہوں نے شکریہ ادا کیا۔

"ہاں تو تم ہو۔" وہ بولے۔ "ویسے میں حیران ہوں تم ہو گے اتنا بڑا اعہدہ، گراں قدر ذمہ داری اور تمہاری عمر سب کچھ میل نہیں کھاتا۔ یہ انتخاب کیسے ہوا؟"

مجھے اس کی باتوں سے حسد کی بُو آنے لگی تھی۔ "اگر آپ کو یہ انتخاب پسند نہیں تو میں واپس گھر چلا جاتا ہوں جناب۔"

"اوہ۔۔۔ اوہ۔" انھوں نے جھک کر میری ران پر تھپکی دی۔

"بُرا مان گئے جوان۔ نہیں میرا مطلب یہ نہیں، معاف کرنا جس اتھارٹی نے تمھیں بھیجا ہے وہ گھسیارے نہ ہوں گے۔۔ کچھ دیکھ کر ہی نوجوان خون کو آگے بڑھایا ہو گا۔ بہرحال الحال تمہارے عہدے پر نہیں بلکہ تمہاری دوسری ذات پر گفتگو کریں گے۔ مجھے خان صاحب نے بتایا تھا کہ آتے ہی تم نے تین قتل کر دیے ہیں۔"

"جن حالات میں وہ ہلاک ہوئے جناب۔۔۔"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔" وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولے۔ "لیکن میرے عزیز قتل قتل ہی ہوتا ہے۔ پولیس یہ فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں کہ قتل کن حالات میں ہوا۔ یہ فیصلہ عدالت کرتی ہے۔ ہمارا کام ہے قاتل کو قانون کے حوالے کرنا لیکن یہاں ہمیں مجبور ہونا پڑے گا۔"

"ابھی مجھے ایک قتل اور کرنا ہے۔"

"نہیں۔" وہ اچھل کر دہاڑے۔ "مسٹر خرم سلطان میرے مُنہ پر جُوتا نہ مارو۔"

"وہ قتل ناگزیر ہے سر۔" میں نے دھیمی آواز میں بتایا۔

"وہ میرا ہدف ہے۔ میں اسی کے لیے باہر سے آیا ہوں۔ اس نے پہلے میرے باپ کو قتل کیا پھر میری منگیتر کو اغوا کیا۔ تین دن اسے قید رکھا۔ میرے بھائی نے پولیس کی مدد کے لیے فریادیں کیں لیکن کسی نے مدد نہ کی۔ تب آپ کا قانون کہاں تھا آئی جی صاحب! میں۔۔۔ میں۔۔۔ اُسے قتل کروں گا اور پھر آپ کے پاس آؤں گا۔ میں مفرور قاتل نہیں بنوں گا سر۔"

"کیا ایسا ہی ہوا ہے؟"

"جی ہاں اور آپ کا ایس۔ ایچ۔ او ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ اس لیے کہ فاروق چوہدری مالی لحاظ سے مضبوط شخص ہے۔"

"سنو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ میں خود اس کیس کو ڈیل کروں گا۔ فاروق چوہدری کو سزا دلواؤں گا۔ تم قانون ہاتھ میں نہ لو۔"

"سوری سر۔" میری آواز شدتِ دُکھ اور غصے سے پھٹ گئی تھی۔ "میرے خاندان کی پگڑی کی دھجیاں تو میرے پاس رہنے دیں۔ آپ فاروق پر کیا الزام لگائیں گے۔ میرا باپ بلوے میں ہلاک ہوا تھا۔ فاروق اس بلوے میں موجود نہ تھا۔ کیا آپ زینت کو بدنامی کی صلیب پر چڑھا کر فاروق کو چند برس کی سزا دلوانا چاہتے ہیں۔ نہیں جناب! پیاسا میں ہوں۔ مجھے ہی پیاس بجھانی ہو گی۔"

"اور میں تمھیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"ٹھیک ہے پولیس کال کر لیں پھر۔"

"نہیں۔ میں فاروق چوہدری کی حفاظت کا انتظام کروں گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا جناب۔" میں نے کہا۔ "اگر میں حفاظتی دیواروں کے اندر جا کر فاروق سے جا ملا تو آپ کو بھی اصولی طور پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"چیلنج کر رہے ہو خرم سلطان؟"

"جی سمجھ لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔"

نادیہ ٹرے میں کافی لے آئی تو ہماری گفتگو رک گئی تھی۔ وہ تین پیالیاں لائی تھی۔ میرا خیال تھا آئی جی صاحب اسے بیٹھنے کی اجازت نہیں دیں گے مگر وہ مہربان باپ تھا۔ جب نادیہ ٹرے لے کر چلی گئی تو وہ پھر آئی جی بن گئے تھے۔

"فاروق چوہدری کام کیا کرتا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"کام اُس کے پیش رو کیا کرتے تھے۔ وہ اب صرف لوگوں کی پگڑیاں اُچھالتا ہے۔"

"خیر چھوڑو۔ تم جو چاہو کرنا، میں اپنا فرض ادا کروں گا۔ اب یہ بتاؤ کہ ہمارے رابطے کا کیا طریقہ کار ہو گا اور کس کوڈ سے کال کیا جائے گا۔ تم صرف مجھ سے رابطہ قائم رکھو گے ہم چاہتے ہیں کہ تم خفیہ ہاتھ بن کر کام کرو ورنہ مجرم کے ہاتھ تمھیں پریشان کرنے لگیں گے۔"

"آپ ہی کوئی کوڈ مقرر کر دیں۔"

"چیترا۔ کیسا رہے گا۔" وہ مسکرانے لگے۔ "تمھیں دیکھ کر یہی احساس سب سے پہلے جاگتا ہے، تم واقعی چیترے کی مانند چُست اور خوب صورت ہو۔"

"شکریہ جناب۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا فطرتاً ظالم درندہ ہوتا ہے، جب کہ میں فطرتاً نرم دل ہوں اور پھر میں ظلم کے خلاف جہاد کروں گا۔"

"پھر تم کوئی نام سوچو۔"

"شکرا۔" میں نے بتایا۔ "باز سے زیادہ پھرتیلا پرندہ۔"

"ہاں اچھا ہے۔" وہ بولے۔ "میں بذریعہ سرکلر تمام پولیس اسٹیشنوں کو اس نام سے آگاہ کر دوں گا۔ اس نام کے ہر حکم کی تعمیل ہوا کرے گی۔"

"ایک خیال عام ہے سر۔" میں نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ "اور کسی حد تک درست بھی ہے کہ جرم پولیس کی ناک کے نیچے تلے پلتے ہیں، میں چاہوں گا پولیس نشان دہی کرے۔ ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔"

"ہاں! لیکن نچلی سطح تک۔"

"بہرکیف میں آپ سے رہنمائی حاصل کرتا رہوں گا۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے اجازت دیجیے۔"

"فاروق چوہدری کو معاف کر سکو تو میں ذاتی طور پر تمہارا ممنون ہوں گا۔"

"ایک معاہدہ طے پا چکا ہے سر۔"

"ٹھیک ہے۔ تم بڑے ضدی نوجوان ہو۔ میں اس احمق کو کہیں باہر دھکیل دوں گا، بائس نہ ہو گا تو تم بائسری نہ بجا سکو گے۔" ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں اُمید رکھوں گا۔" ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آئی جی صاحب نرم لہجے میں کہنے لگے۔ "ہماری آئندہ ملاقات خوش گوار ہو۔ میرے عہدے اور منصبی ذمے داریوں کا خیال رکھنا خرم سلطان۔ میں تم جیسے نوجوان کو ضائع کرنا پسند نہیں کروں گا۔ انتقام سے معاف کر دینا اللہ اور بندوں کے نزدیک بڑی بہادری ہوتی ہے۔"

"معاف انسان کو کیا جاتا ہے۔ ناگ اور درندے کو معاف کرنا انسانیت پر ظلم کے مترادف ہوتا ہے۔"

گیٹ پر رُک کر میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور انتظار میں کھڑی ٹیکسی سے ڈرائیور اُتر آیا۔ "سول ہسپتال۔" میں نے اندر بیٹھتے ہی کہا۔

مجھے خطرہ تھا کہ آئی جی صاحب کل سے فاروق چوہدری کے گرد مضبوط حصار کھڑا کر دیں گے اور میں سر ٹکراتا ہوا کسی مگرمچھ کی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا۔ لہٰذا میں اس وقت سے قبل ہی فاروق چوہدری کا خون پی کر اپنی پیاس بجھا لینا چاہتا تھا حالانکہ میں نے کلثوم سے وعدہ کیا تھا لیکن وعدہ کرتے وقت مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ فاروق کتنی بڑی ذلیل حرکت کر چکا ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ جس شخص کو معاف کرنے کا میں وعدہ کر رہا ہوں وہ میری زینت کا قاتل ہے۔ میں بہرصورت فاروق چوہدری کا خون پینا چاہتا تھا۔ مجھے کسی عہدے کا خیال تھا نہ سربراہی کا شوق میرے قدم روک سکتا تھا۔ اگر مجھے عہدہ اور اپنی جان کی پروا ہوتی تو میں پولیس چیف کو نہ بتاتا۔ چوری چھپے ضرب لگا کر فاروق کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا لیکن میرے اندر جو آگ دہک رہی تھی وہ صرف اسی صورت سرد ہو سکتی تھی کہ میں دن دہاڑے للکارتا ہوا جاتا اور فاروق کو اُدھیڑ دیتا۔ لوگوں کو بتاتا کہ دیکھو یہ ہے وہ بھیڑیا جو عزتوں کا ڈاکو ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹیکسی مین گیٹ سے داخل ہوئی تو رُک گئی۔ آگے بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ کچھ آدمی اسٹریچر لیے دوڑ رہے تھے۔

"شاید کوئی حادثہ ہوا ہے۔" ڈرائیور بولا۔ "دیکھ آؤں جناب؟"

"آؤ دیکھتے ہیں۔" میں نے اُترتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کنارے لگا دی تھی۔

ابھی میں ہجوم سے دس قدم دُور تھا کہ اچانک میرے قدم رُک گئے۔ ایمرجنسی وارڈ کے جالی دار دروازے سے فاروق چوہدری باہر نکل رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ہم دونوں ایسے ہی منجمد ہو گئے تھے جیسے ٹی وی میں متحرک تصاویر ایک دم جام ہو گئی ہوں۔

اس نے سر کو جھٹکا دیا، پھر اُلٹے پاؤں ایک سیڑھی اُوپر گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا سایہ تیرنے لگا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اُچھلا اور وہ دروازہ بند کرتا ہوا وارڈ میں غروب ہو گیا۔ جب میں دروازہ دھڑ دھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا تو وہ کوریڈور میں بے تحاشا دوڑتا دکھائی دیا۔ اس نے سیڑھیوں کے قریب رُک کر پیچھے دیکھا اور پھر موڑ گھوم گیا۔

وہ عقبی دروازے سے باہر جانا چاہتا تھا اس لیے میں ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ سنگل روم تھا ایک بیڈ کا، کوئی مریض نیم دراز تھا۔ میں دوسرے دروازے سے نکلتا چلا گیا تھا۔ فاروق سامنے سے آ رہا تھا۔ غالباً اُسے اُدھر کا دروازہ بند ملا تھا۔

"پہلے طعام پھر کلام۔" بیگن بول پڑا۔ "میں نے ہوٹل سے کھانا منگوا لیا ہے۔"

میں اُن سے مل کر خوش ہُوا تھا۔ وہ مُردے کانوں، لوتے دانتوں اور زخموں کے تنکے سجائے مجھے جی دار لگے تھے۔ سلوا کے کان آگے جھکے ہوئے تھے۔ بارکن کی ناک غالباً آپریشن کے مرحلے سے گزر چکی تھی۔ ہنٹ کا یک دانت آدھا تھا اور کونز کے چہرے پہ گہری خراشوں کا جال بچھا ہُوا تھا۔ وہ یقیناً میری ہی دُنیا کے نوجوان تھے اور کٹھن مراحل سے گزر کر یہاں آئے تھے۔

"ہنٹ!" بیگن نے مُنہ چلاتے ہوئے پوچھا۔ "تمھارے مُنکر کی کیا رپورٹ ہے؟"

"اُسے ہیلتھ الاؤنس کر دی گئی تھی چیف۔" ہنٹ نے دُور کے لہجے میں جواب دیا۔ "یہاں چور پہلے رکھوالے کُتے سے دوستی کر لیتے ہیں۔"

"ایک بات۔" بیگن چمچ لہرا کر بولا۔ "اب ہمارا چیف ماسٹر خرم سلطان ہے۔ ہاں تم لوگ مجھے ماسٹر کہہ سکتے ہو۔"

میں نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیا تو سب نے ہاتھ روک لیے۔

"نہیں نہیں دوستو!" میں نے ہاتھ اُٹھایا۔ "اپنی اپنی بھوک کے مطابق۔ کھانے کے معاملے میں چیف کا نہیں پیٹ کا احترام فرض ہے۔" سب ہنسنے لگے اور میں اُٹھ کر باتھ رُوم کی جانب بڑھ گیا۔

باتھ رُوم سے نکلا تو لٹے کے برتن سمیٹ رہے تھے۔ برتن ہٹا کر سلوا نے ٹیبل صاف کر کے نئی چادر بچھا دی۔ کونز قہوے کا بھرا ہُوا تھرماس اور کانچ کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں لے آیا تھا۔

"خرم سلطان!" بیگن نے ایک فائل ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اپنی کُرسی سنبھال لو اب یہ کانفرنس رُوم ہے۔" کونز نے پیالیاں سامنے رکھ کر قہوہ ڈالا اور مجھے درمیان والی کُرسی پیش کی گئی۔

"ماسٹر!" میں نے سب سے کہا۔ "آپ آج تک کی کارگزاری اور طریقہ کار بتائیں گے۔" اُس نے فائل کے چند کاغذات اُلٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر ایک گلابی کاغذ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ چند نام ہیں پیٹ یانیل کے۔" میری نگاہ کاغذ پر پڑی۔ دُوالی۔ ہر نام کے سامنے مختصر کوائف تھے۔ اُن میں تین آدمی صنعت کار تھے۔ ایک ٹرانسپورٹر تھا۔ "ہماری کارگزاری صفر ہے چیف۔ یہ لوگ اتنے مضبوط اور بااثر ہیں کہ یہاں کی انتظامیہ بھی بے بس ہے۔ آپ پہلا نام دیکھیں سلیمان اعظم۔"

میں نے سلیمان اعظم کے کوائف پر نظر ڈالی۔ بیگن بولنے لگا تو میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مسٹر کونز کو مال خریدنے پر مقرر کیا گیا تھا۔ کونز نے نمونے کے چند پیس حاصل کیے اور جب آپریشن کیا گیا تو والی بال فٹ بال، ہاکی گیند اور پیس بال کے اندر ہیروئن موجود تھی۔ میری رپورٹ پر فیکٹری پہ چھاپہ مارا گیا لیکن چوتھے روز مال چیک کیا گیا اور مسٹر سلیمان نے ہتک عزت اور نقصان کے دعوے واثر کر دیے کیونکہ مال اندر سے بالکل صاف تھا۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہُوں ماسٹر۔" میں نے کہا۔ "میں شرمندہ بھی ہوں لیکن اب ہم رپورٹ دینے کی حماقت نہیں کریں گے۔ میں نے اعلیٰ اختیاری سے واضح اور کھُل کر بات کر لی ہے۔ میں ہی اختیاری ہُوں اور آپ میری قوت ہوں گے۔ ابھی میں کچھ نجی معاملات میں اُلجھا ہوا ہُوں۔ آپ مجھے بتائیں گے کہ ہیڈ کوارٹر کہاں قائم کیا جائے۔ میری ذاتی رائے اگر آپ سب پسند

کریں تو یہ کاٹج بہترین جگہ ہے لیکن ہم یکجا ہو کر قیام کریں گے۔ آپ تین کوٹھیاں کرائے پر حاصل کریں۔ ہر کوٹھی میں دو دو آدمی ہوں گے۔ آپ میرے ساتھ ہوں گے۔ ہر کوٹھی میں ٹیلی فون کی سہولت ضروری ہو گی اور ہر ممبر کے پاس ٹرانسمیٹر بھی ہونا چاہیے۔"

"ٹرانسپورٹ اور اسلحہ چیف۔۔۔" کونز نے پوچھا۔

"ماسٹر بتائیں گے مالی پوزیشن کیا ہے؟" میں نے بیگن کی جانب دیکھا۔

"ہم بلٹ پروف کاریں خرید سکتے ہیں چیف ماسٹر۔" بیگن نے کہا۔

"گڈ۔۔۔" میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ "کتنا وقت لیں گے ماسٹر؟"

"دو دن چیف۔"

"ٹھیک ہے آپ جلدی نہ کریں سوچ سمجھ کر انتظام کریں۔ ایک ہفتہ دیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے دوستو! مجھے یقین ہے آپ کے بڑوں نے آپ کا انتخاب غور و خوض کے بعد ہی کیا ہو گا۔ آپ اپنی ذات میں پوری قوم ہیں۔ آپ کو احترامِ انسانیت کا محافظ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ہمارے سامنے صرف چیلنج نہیں بلکہ شیطانی قوت ہے۔ یاد رکھیں شیطان کی طاقت تسلیم شدہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت کے ساتھ، جس سے رب کائنات ناراض ہو، ان کے قلعے ریت کے گھروندے بن جاتے ہیں۔ اس لیے میرے دوستو تم لوگ ہر قدم اُٹھانے کے لیے آزاد اور خود مختار ہو۔ صرف ذاتی مفادات کو ہمیشہ خود سے دُور رکھنا کہ یہ ایسی آگ ہے جو سرد کی قوتوں کو رنگ آلود کر دیتی ہے۔" میں نے رُک کر پانچوں کو باری باری دیکھا۔ وہ پتھرائی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ "میں ایک اور بات واضح کر دینا اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہُوں۔ عورت کو خود پہ حاوی نہ ہونے دینا۔ عورت کی چاہت بھی سرد کو گرم دل بنا دیتی ہے۔"

"اس پابندی کی وضاحت کرو چیف ماسٹر۔" ہنٹ بول پڑا۔

"ہم آسمانی مخلوق نہیں ہیں۔"

"تم ہی اپنے سوال کی وضاحت کر دو مسٹر ہنٹ۔"

"میں اپنی دوست کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تمھاری ہم مذہب ہے؟" میرے حلق سے غراہٹ اُبھری۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ ٹیلی فون آپریٹر ہے۔" ہنٹ ہکلانے لگا۔ "مسلم ہے۔"

"وہ تم سے شادی کر سکتی ہے ہنٹ؟"

"نہیں چیف۔۔۔"

"تم۔۔۔!" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر سرد آواز میں کہا۔ "آئندہ اس سے نہیں ملو گے ہنٹ۔ جولڑکی کسی مرد سے شادی کے لیے محبت نہیں کرتی وہ وفادار نہیں ہو سکتی۔ میری بات پہ غور کرنا پیارے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور میرے ساتھ پانچوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

میرے ساتھ برآمدے تک صرف بیگن آیا تھا۔ آخری لمحے ہنٹ کی وجہ سے فضا کچھ ناخوش گوار سی ہو گئی تھی لیکن میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔ حالانکہ وہ میری احمقانہ سوچ تھی۔ پورے ملک میں پھیلی ہوئی غلاظتیں میں کیسے دھو سکتا تھا۔

"آپ کا کیا پروگرام ہے چیف؟" بیگن نے پوچھا۔

"کوئی پروگرام نہیں مسٹر بیگن۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ اپنی گاڑی دے سکتے ہیں؟"

"میں بلٹ پروف سائیکل بھی چلا سکتا ہُوں چیف۔"

"ٹھیک ہے لڑکوں کو بتا آئیں۔" وہ ہنستا ہُوا اپنی چال چلا گیا اور میں سیڑھیاں اُترتا ہُوا پورچ تک ٹہلنے کے انداز میں گیا۔ بیگن کے سوال کرنے تک میرا ذہن بالکل خالی تھا پھر ذہن میں یکایک چھلبھڑی سی پھوٹ پڑی تھی۔ ہر شرارہ ایک چہرہ تھا جانا پہچانا چہرہ۔ بے شمار چہرے ذہن میں روشن ہو گئے تھے۔ بعض اوقات انسان مذاق میں جو بات کہہ جاتا ہے وہ پوری ہو کر رہتی ہے اور کچھ لوگ عمر بھر راتوں کو آنسوؤں سے بھگوتے اور دُعائیں کرتے رہتے ہیں مگر امتحان کا نتیجہ نہیں سامنے آتا۔ بہت عرصہ پہلے میں اور زینت پیار میں تڑپ رہے تھے۔

"لال مرچ! میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔" میں نے اُس کی سُرخ ناک کو چٹکی میں بھر کر کہا تھا۔

"تو پھر تمھیں دو میں سے ایک فرض ادا کرنا پڑے گا۔" اُس نے میری کلائی پہ ہاتھ مار کر کہا تھا۔ "جب تم انکار کرو گے تو میری جان نکل جائے گی اور تمھیں میرے جنازے کو کندھا دینا پڑے گا اور اگر میں زندہ رہی تو ڈولی کو کندھا دو گے۔"

میں نے انکار کیا تھا نہ اقرار۔ پھر بھی میں اس سے شادی نہیں کر رہا تھا۔ وہ زندہ تھی اور مجھے اس کی خواہش یاد تھی۔

جب ہماری کارمثل اسکول کے گراؤنڈ میں داخل ہوئی تو مجھے اپنی حویلی کی اونچی چھت روشن دکھائی دی۔ میں نے وقت دیکھا، دس بجنے والے تھے۔ آج رات مہندی کی رسم تھی شاید یہی وجہ تھی کہ حویلی روشن تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مسٹر بیگن!" میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ سے نجی معاملات کا ذکر کیا تھا۔ میں خوش گوار ماحول میں نہیں جا رہا۔ اس لیے آپ کو گھر نہیں لے جا سکتا۔"

"کوئی خطرہ چیف؟" بیگن نے پوچھا۔

"خطرے تو میرے ہم سفر ہیں۔" میں ہنس پڑا۔ "لیکن میں کسی خطرے کو ساتھ نہیں لے جا رہا۔"

جوں ہی میں گلی میں داخل ہوا لڑکیوں کی ڈار موڑ پر ایکدم میرے سامنے آگئی۔ اُن کے ساتھ چند لالٹینیں تھیں لیکن میں نے چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ کچھ میرے گاؤں کی لڑکیاں بھی شرمیلی تھیں وہ بھی ایک طرف ہو کر نکل گئی تھیں۔ وہ حویلی سے واپس آ رہی تھیں۔ میں اندھیری گلیوں میں عورتوں اور مردوں کی نگاہوں سے بچتا ہوا قصبے کے دروازے سے حویلی میں داخل ہوا۔ پیٹرومیکس کی روشنی سے سامنے کا حصہ روشن تھا۔ گاؤں کے لوگ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور شیرونائی حلیم گھما رہا تھا۔ میں تنا ور شہتوت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا کہ معاً ایک سایہ مویشی خانے سے نکلا اور جوں ہی اس کا فاصلہ چند قدم ہوا تو دُھندلی روشنی میں میں نے اُسے پہچان لیا وہ عابدہ تھی۔ جس نے مجھے ہانگ کانگ کے بُرے دنوں میں اپنی ہڈیوں کی مجھاوں دی تھی۔

"عابدہ!" میں نے سرگوشیانہ آواز میں پکارا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی رُک گئی۔ "ادھر آؤ عابدہ۔ میں روشنی میں نہیں آسکتا۔"

"خرم...!" اُس کے مُنہ سے سسکاری اُبھری۔ "تم...!" وہ دوڑتی ہوئی نزدیک آگئی۔

"عالی!" میں نے اُسے کاندھوں سے تھام لیا۔ یوں ہی ۔۔۔ ہو گئی۔"

"کب آئے ہو اور یہاں چھپ کر کیوں کھڑے ہو؟" وہ اپنے کاندھوں سے میرے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔ "آؤ اندر چلو۔"

"نہیں عابدہ۔۔۔" میں نے کہا۔ "تم جاؤ اور اکرم بھائی کو لے آؤ۔"

"کیوں خرم؟" وہ چل کر بولی۔ "تم اندر کیوں نہیں چلتے؟"

"اندر خوشیاں ہیں عابدہ۔" میں نے بھرائی آواز میں بتایا۔ "اور پھر میری ذات آگ کا گولہ ہے۔ میں اندر چلا گیا تو معصوم خوشیاں جلنے لگیں گی۔ جاؤ اکرم بھائی کو یہاں بھیج دو۔"

"تو تمہیں سب کچھ معلوم ہے خرم؟"

"ہاں سب کچھ۔۔۔"

"پھر میری جان خرم۔" عابدہ نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ "واپس چلے جاؤ اگر اُن دونوں کو تمہاری موجودگی کا علم ہو گیا تو طوفان اُٹھ کھڑا ہو گا۔ اماں بی نے دونوں کو بہت مشکل سے سمیٹ کر راضی کیا ہے۔ چلے جاؤ خرم کل تک خود کو چھپا لو۔"

"اور کوئی خاص بات؟"

"کیا یہ خاص بات نہیں خرم؟" عابدہ میرے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی۔ "تمہاری منگیتر اکرم بھائی کی بن رہی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے خرم جو منزل کے تعین تک ہم سفر ہوتے ہیں اچانک اجنبی راستوں کی جانب مڑ جاتے ہیں۔ تمہیں صرف یہی کچھ معلوم ہوا ہو گا خرم۔ تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ اکرم کے لیے اماں بی نے مجھے مانگ لیا تھا اور میں جو کسی اور کو من میں چھپا لائی تھی احسان اور مروت کے پتھروں سے خاموشی سے مر گئی تھی۔"

"کیا یہ ان باتوں کا وقت ہے عابدہ؟" میری آواز میں سرزنش تھی۔ "جاؤ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

معاً رات کا سکوت ایک دھماکے سے ٹوٹ گیا۔ فائر حویلی کے گیٹ کی جانب ہوا تھا۔ میں نے عابدہ کو شانوں سے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا اور رسماً احتیاطیں بھول کر دوڑتا چلا گیا تھا۔ کچھ لوگ گیٹ کی طرف دوڑتے دکھائی دیے۔ کچھ ایک جگہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہجوم بنا رہے تھے۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ میں پیچھے ہٹنے کے لیے قدموں کا رُخ بدلنا چاہتا تھا نہ وقت ضائع کرنا چاہتا تھا کہ گولی کا ہدف کون ہے۔ جو بھی کوئی ہدف بنا تھا کوئی اپنا ہی ہو گا۔ میں سیدھا دوڑتا ہوا حویلی کی دیوار پھاند کر باہر جا گرا اُدھر سے گیٹ کے راستے بھی لوگ باہر نکل آئے تھے۔

"سنو لوگو! میری سماعت سے دھاڑتی ہوئی آواز ٹکرائی۔ "میں جاوید خان ۔۔۔ کا بیٹا باپ کا بدلہ لینے آیا ہوں۔ میرے سامنے کوئی نہ آئے ورنہ بے گناہ شخص مارا جائے گا۔"

میری ناک سے طویل سانس اُبھری۔ کیونکہ میرے ہاتھ خالی تھے اور جیب میں نوٹ تھے اور دشمن رائفل لیے للکار رہا تھا۔ مجھے بس ایک دھڑکا تھا کہ اکرم بھائی اگر مشتعل ہیں تو باہر نہ نکل آئیں کسی دانا نے پیٹرومیکس بجھا کر حویلی پر تاریکی مسلط کر دی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ چند قدم بڑھا پھر دھتوں کی اوٹ میں ہو گیا۔۔۔ جاوید خان کو گاؤں کے بزرگوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ وہ دہاڑ رہا تھا اور لوگ اُسے منانے اور افہام و تفہیم کی تلقین کر رہے تھے۔ وہ

سچوئیشن میرے لیے سازگار نہیں بلکہ بہترین تھی۔ میں درختوں سے نکل کر لوگوں میں شامل ہو گیا۔

"میری ماں نے مجھ پر دودھ حرام کر دیا ہے۔" دلاور خان پاگل اونٹ کی مانند چہرہ اُٹھا کر بڑبڑایا۔ "ہٹ جاؤ مجھے اندر جانے دو اگر وہ گیدڑ بن گئے ہیں تو میں اُن کو تلاش کر کے ماروں گا۔"

"میری بات سُن دلاور خان۔" ایک بزرگ نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ "تیرے باپ کا قاتل عدالت خان ہے۔"

"نہیں۔" دلاور خان نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں اُس سے حوالات میں مل آیا ہوں۔ میں اُسے تھانے میں قتل کرنے گیا تھا اُس نے مجھے قاتل کا نام بتا دیا ہے۔ میرے باپ کا قاتل خرم سلطان ہے۔"

"خرم سلطان!" کئی آوازیں اُبھریں پھر تایا فضل بولا۔ "نہیں نہیں دلاور خان خرم سلطان باہر ملک گیا ہوا ہے اور اکرم سلطان ایسا نہیں ہے۔ عدالت خان نے تمہیں غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔"

میرا خوف ایکدم دُور ہو گیا۔ جس خوف کی بگل میں میں چہرہ چھپائے حویلی میں داخل ہوا تھا۔ وہ خوف پولیس نے مجھ سے دُور کر دیا تھا۔ میری جگہ عدالت خان کو قربانی کا بکرا بنا دیا گیا تھا۔ دلبر غلام اور سجاول خان کا خون اُس کے ہاتھوں پر مل دیا گیا تھا اور خرم سلطان کے ہاتھ صاف کر دیے گئے تھے۔ احتیاط کا تقاضا تو یہی تھا کہ خرم سلطان گاؤں والوں کے لیے باہر کے ملک میں ہی رہتا لیکن وہ پھر اُبھرا ہوا گل شخص میری حویلی کے دروازے میں کھڑا تھا اور میرے خاندان کے کسی بھی شخص کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

احتیاط اور وقت دونوں میرے سامنے فیصلہ سُننے کے لیے کھڑے تھے۔ احتیاط کے حق میں فیصلہ سُنا کر اگر میں واپس چلا جاتا تو ہونے والا خونی عادتاً مجھے عمر بھر نشتر لگاتا رہتا حویلی میں جتنے بھی لوگ تھے۔ وہ مجھے اپنی جان سے بھی عزیز تھے۔

پھر اور شور کے درمیان میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ تب ہی میں نے ایک فیصلہ کر لیا اندھا اور اتھاہ فیصلہ تھا۔ میں نے ایک شخص کے کندھے سے ٹٹتی دھوئی سرکائی اور چہرے پر منڈاسہ باندھا اور آہستہ آہستہ لوگوں کے درمیان سے سرکتا دلاور کے قریب ہو گیا۔ اُس کی پہلی دو گولیاں تنی ہوئی تھی میں اُس کے دائیں شانے پر جھکا اُس نے چونک کر میری جانب چہرہ گھمایا تھا۔

"دلاور خان!" میں نے سرگوشی میں اُس کے کان میں کہا۔ "فاروقی چوہدری تمہیں بُلا رہا ہے۔ یہ تیر بھی اندھیرے میں ہی چھوڑا تھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ گیا تھا۔

وہ تذبذب میں تھا لیکن میں نے اُس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ کر اُسے گھسیٹ لیا تھا۔ اُسے سوچنے اور سوال کرنے کا موقعہ مل جاتا تو پھر مجھے دوسرا فیصلہ کرنا پڑتا جو لوگوں کے درمیان خطرناک تھا۔

"کہاں ہے چوہدری اور تم کون ہو؟" لڑکوں سے دس قدم دُور جا کر وہ ایڑیاں اچکا کر تک گیا تھا۔

"مڈل اسکول کے گراؤنڈ میں۔" میں نے کھرکھراتی آواز میں بتایا۔ "خرم سلطان اس کی نظر میں ہے۔"

خرم سلطان کا نام سُن کر دلاور خان شکاری کتے کی طرح کنوتیاں پھڑکاتا آگے آگے دوڑنے لگا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن گلی ویران ہی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ دلاور کا کوئی ساتھی اُس کے تعاقب میں نہ ہو لیکن وہ تنہا ہی حویلی پر چڑھ دوڑا تھا۔ گو وہ میرا دشمن تھا لیکن مجھے اس کی جی داری نے متاثر کیا تھا۔ باپ کے قاتل سے بدلہ لینے وہ شیر کی مانند گرجتا ہُوا حویلی تک گیا تھا۔

بیگن سگریٹ ہونٹوں میں دبائے ٹہل رہا تھا اور دلاور مجھ سے چند قدم آگے تھا اگر بیگن بول پڑتا تو وہ فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہوتا دلاور کے ہاتھ میں رائفل تھی وہ پلٹ کر میرا چہرہ بے نقاب کر سکتا تھا۔ میں نے طویل چھلانگ لگائی اور اُڑتا ہوا دلاور سے ٹکرایا۔ وہ ڈکراتا ہُوا منہ کے بل گرا تھا اور رائفل اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ "کھڑے ہو جاؤ دلاور۔" میں نے اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔

وہ شیر جوان دہاڑتا ہُوا اُٹھا لیکن میری لات نے اُسے پھر زمین بوس کر دیا تھا۔ میں گرینڈ ماسٹر خرم سلطان تھا اور وہ صرف گاؤں کا ایک شیر دل نوجوان تھا۔ وہ لاٹھی اور رائفل سے لڑنے کا ماہر تھا اور میں جوڈو کراٹے کے فن کا ماسٹر تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل اُٹھ رہا تھا کہ میں نے اُچھل کر اُس کی پشت پر دونوں پاؤں مارے وہ پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ میں نے ایک منٹ انتظار کیا لیکن وہ مرتے ہوئے سانپ کی مانند بل کھا رہا تھا۔

"مسٹر بیگن!" میں نے مرتی آواز میں دلاور کے چہرے پر ضرب لگاتی۔ "اسے اُٹھا کر گاڑی میں ڈال دو۔"

بیگن نے سگریٹ کا بھرپور کش لے کر سگریٹ فضا میں اُچھال دیا اور دلاور خان کو اُٹھا کر کار کے نزدیک گیا پھر گھوم کر بولا۔ "ڈگی میں چیف؟"

"نہیں بیگن۔" میں نے دکھتے ذہن کو سرد کرتے ہوئے نرم آواز میں جواب دیا۔ "میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اسے ہیڈ کوارٹر لے جاؤ۔ اگر زحمت گوارا کرو تو صبح چار بجے مجھے یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے لے لینا۔"

"بہتر چیف۔" اس نے دلاور کو پچھلی نشست پر پھینک دیا۔

میں جب دوبارہ حویلی میں داخل ہوا تو صحن میں چند برادری کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے درمیان اکرم بھائی کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر گولی اُس نے کس پر چلائی تھی۔ یوں ہی ہوائی فائر اُس نے نہ کیا ہو گا۔

میں نے پہلے زینت کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا تھا... وہ لڑکیوں کے درمیان مرجھائے بیٹھی تھی اُس کے ہاتھ گود میں تھے۔ پھر میں مویشی خانے کی جانب گیا۔ عابدہ اُدھر سے ہی آئی تھی۔ گودام کے کمرے شاید اماں بی نے عابدہ کے خاندان کو دیے تھے۔ یہی اُمید کچھ اُدھر لے گئی تھی۔ گودام کے چار کمرے قطار میں تھے۔ دو کمروں کے سامنے پانچ فٹ اُونچی کہاڑ دیوار تھی جو یقیناً میرے بعد اور عابدہ کے خاندان کی آمد پر بنائی گئی تھی۔ میں نے کواڑوں سے آنکھ لگائی اندر روشنی تھی اور عابدہ گھڑونچی پر رکھے گھڑے پر جھکی ہوئی تھی۔

دستک کی مدھم سی آواز سُن کر عابدہ نے چہرہ گھمایا اور پیالہ گھڑے پر رکھ کر دروازے کی جانب آئی۔ اصولاً اُسے پوچھنا چاہیے تھا۔ حالات ہی ایسے تھے لیکن اُس نے بے آواز کنڈی اُتاری اور ایک کواڑ کھول کر مدھم سُر میں بولی۔ "اندر آؤ محترم سلطان۔"

"اندر کون ہے؟"

"صرف اماں۔"

"مولوی صاحب کہاں ہیں؟" میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔

"تمہارے ابا جان کے ساتھ۔" اُس کی آواز جھرجھری لے گئی۔ "تھیں تو....."

"اوہ... وہ بھی..." میں چونک پڑا۔ "کب اور کیسے...؟"

"کون ہے عابدہ؟" اندر سے اماں نے پوچھا اور عابدہ یکدم گھڑونچی کی جانب چلی گئی پھر پانی سے بھرا پیالہ لے کر میرے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

"کون محترم...؟" اماں جان کی چیخ نکل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھنے لگیں تو میں نے لپک کر اُن کو تھام لیا۔ اُن کے انداز میں مستانا پیار تھا اور خوشبو تھی۔ "میرا بیٹا آ گیا۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حویلی پر چھائے نحوست کے سائے دُور ہو جائیں گے۔ سارے دُکھوں کا مداوا میرا شیر بیٹا بن جائے گا۔"

"ہاں اماں جی! اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے دھڑکتی آواز سے کہا۔ "ہم بہت جُدا ہو چکے ہیں اُن کا دُکھ ہے لیکن میں اُن کے سامنے دُکھ میں سمیٹ لوں گا۔"

"میرے بیٹے۔ فیصلے اوپر والا کرتا ہے۔" اماں میری پیشانی ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ "ہم انسان اپنی عقل اور مجبوری سے جو فیصلے کرتے ہیں وہ ناقص ہوتے ہیں۔" وہ بہت کچھ کہتی رہیں۔ میں سُنتا رہا تھا۔ میں تائید یا تردید کر کے اُس ماں کا مان اور قریب کھو رہا تھا۔ اُس لڑکی کا دل نہیں توڑ سکتا تھا جس سے واقعی میں نے جذباتی وابستگی محسوس کی تھی۔

"عابدہ جاؤ اکرم بھائی کو بُلا لاؤ۔ میں باہر گیا تو سب لوگوں کو میری آمد کی خبر ہو جائے گی۔"

"کیوں۔ کیا بات ہے محترم تم شادی میں شرکت نہیں کرو گے؟" اماں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں اماں جان حالات ایسے ہی ہیں۔"

"اوہ..." وہ پہلو بدل کر کچھ کہتے کہتے رُک گئیں۔

اکرم بھائی لنگڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور میں تعظیماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ گزشتہ رات میں محسوس نہ کر سکا تھا کہ وہ چلنے میں تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

"دلاور کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟" اکرم بھائی نے سوال کیا۔ مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ جب شریف نے مجھے بتایا کہ کوئی اُسے بلا لے گیا ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم ہی ہو گے؟"

"اُس نے گولی کس پر چلائی تھی؟" میں نے اُن کا سوال گول کر دیا۔

"مجھ پر لیکن ہاتو خان زخمی ہو گیا۔ گولی پنڈلی کے گوشت میں ہے لیکن تم نے بتایا نہیں وہ کہاں ہے؟"

"اُسے پابند کر دیا گیا ہے بھائی جان۔" میں نے بتایا۔ "چوہدری کی طرف سے کوئی پیغام؟"

"نہیں۔" اکرم بھائی نے نفی میں گردن ہلائی۔ "حالات دوسرا رُخ اختیار کر گئے ہیں محترم۔ تم نے جو کچھ بتایا تھا پولیس نے بالکل برعکس کارروائی کی ہے۔ سُنا ہے عدالت خان نے محترم کا اعتراف کر لیا ہے اور گواہی فاروق کی بہن کلثوم نے دی ہے؟"

"اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"چلو اماں بی سے مل لو۔" اکرم بھائی بولے۔ "اگر انھوں نے اجازت دے دی تو رہ جانا۔"

اماں بی تخت پر مصلیٰ بچھائے اپنے مخصوص انداز میں آلتی

پالتی کے انداز میں بیٹھی ہوئی تھیں اور زینت اُن کے لیے دودھ تپائی پر رکھ رہی تھی۔

میں نے سلام کیا اور انھوں نے میرے چہرے پر پھونک ماری۔ میں اُن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ زینت بے آواز چلتی کمرے سے نکل گئی تھی۔ اُس نے میری جانب دیکھا تک نہ تھا۔

"اماں بی!" اکرم بھائی بولے۔ "عدالت کی گرفتاری نے وہ خطرہ ٹال دیا ہے۔ محترم کو اب سامنے آنا چاہیے۔ میں اپنی پشت خالی خالی محسوس کرتا ہوں۔ محترم ہو گا تو میں مکمل ہو جاؤں گا۔"

"سوچ لو دشمن کی کوئی چال نہ ہو۔" اماں بی بولیں۔ "پولیس والے اصل مجرم کو ڈھیل دینے کے لیے عموماً ایسے حربے آزمایا کرتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے اماں بی۔" میں نے بتایا۔ "میں تمام رکاوٹیں دُور کر کے واپس آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر تمام انتظامات سنبھال لو۔" اماں بی نے کہا۔

"زینت ابھی شریف کے گھر چلی جائے گی۔" اُس نے جرگہ بھیجا تھا۔

"ٹھیک ہے وہ زینت کا تایا زاد ہے۔ بھائی کے گھر سے ہی بہن کی ڈولی اُٹھنی اچھی لگے گی۔ حالات کو دیکھ کر میں نے خاموشی اور سادگی سے رسم ادا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب بارات جائے گی اور برادری کی دعوت بھی ہو گی۔ کل کا دن ہے انتظام کر لو گے محترم؟"

"جی ہاں اماں بی۔" میں نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔ "ہر کام آپ کی خوشی اور پسند کے مطابق ہو گا۔"

"میرے ساتھ آؤ محترم۔ ہر دو گرام پر بات کر لیں۔" اکرم بھائی نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں اُن کے ساتھ جب باہر نکل رہا تھا تو زینت ٹرے میں کھانا لا رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ ایک طرف ہو گئی۔ میں نے ہر دو کہ اُس کے ہاتھوں سے ٹرے لے لی۔ میں نے اس کے ہونٹ کپکپاتے دیکھ لیے تھے وہ ایک دم اندر چلی گئی تھی۔

بارہ بجے جب زینت حویلی سے جانے لگی تو اماں بی کے گلے سے لگ کر وہ اتنی روئی تھی کہ میرا چہرہ بھی بھیگ گیا تھا۔ میں ہی نہیں اکرم بھائی، اماں بی اور عابدہ سب جانتے تھے کہ زینت کے رلکنے کا اصل سبب محترم سلطان تھا۔ وہ حویلی سے نہیں جا رہی تھی بلکہ اُس شخص کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نفی ہو رہی تھی جسے شعور کی آنکھیں کھولتے ہی اُس نے اپنی ذات میں جذب کر لیا تھا۔

زینت کے ساتھ مجھے جانے کا حکم ملا تھا۔

شریف خان، اکرم بھائی سے باتیں کرتا حویلی کے دروازے تک ساتھ آیا تھا پھر وہ دونوں رُک گئے۔ زینت چونکہ آگے نکل گئی تھی اس لیے مجھے اُس کا ساتھ دینا پڑا تھا۔ حالانکہ میں اسی لمحے سے خوف زدہ تھا۔ میں تنہائی میں زینت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تم اتنے ظالم تو نہ تھے محترم۔" زینت نے گلی میں مُڑتے ہوئے پہلا تیر چلایا۔

"آنا پڑا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ محترم تو تم کر رہی ہو زینت۔"

"تمھیں کہا تھا واپس نہ آنا۔" وہ دبتی آواز میں بولی۔ "میں تمھارے سامنے مجبوری کا پھندا کیسے قبول کروں گی۔ چلے جاؤ محترم خدارا چلے جاؤ واپس اس ملک سے دُور چلے جاؤ۔ ورنہ میں... میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

"تم نے ہی ایک بار کہا تھا زینت نہ۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "یاد کرو تم نے کہا تھا اگر ہماری شادی نہ ہو سکی تو...."

معاً ایک سایہ دیوار سے لہراتا ہوا دکھائی دیا اور میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے بس اتنا ہی یاد ہے کسی نے لاٹھی یا پتھر مارا تھا اور میری بند ہوتی آنکھوں نے کچھ لوگ دیکھے تھے اور ڈوبتی سماعت نے زینت کی چیخ ٹیپ کر لی تھی۔

پہلے میرا ڈوبا ہوا ذہن تاریکیوں سے اُبھرا تھا۔ مجھے زندہ ہونے کا احساس ہوا تھا، پھر میں نے آنکھوں کی جھریوں سے دُھندلی دُھندلی چیزیں دیکھیں تھیں۔ دُھند آہستہ آہستہ یادداشت کی ہوا کے ساتھ چھٹنے لگی اور مجھے یاد آنے لگا میرے ساتھ کہاں کیا ہوا تھا۔

میں صرف آنکھیں کھولنے اور چہرہ گھمانے تک آزاد تھا باقی جسم جکڑا ہوا تھا۔ وہ کسی کا آباد گھر تھا۔ تین بیڈ روم تھا جا بجا کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ بستر زیرِ استعمال رہتے ہوں گے۔ کارنس پر برتنوں کی قطار تھی۔ کسی کے استعمال شدہ کپڑے ایک کونے میں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے غور کیا تو یقین ہو گیا تھا کہ میں اپنی حویلی کے کسی کمرے کا قیدی نہیں ہوں۔

"تو فاروق چوہدری...!" میرے لمنے سے طویل پھنکار نما سانس اُبھری۔ "تم میدان میں اُترنے ہو۔"

قدموں کی چاپ سُن کر میں نے چہرہ موڑ کر دیکھا۔ بغلی دروازے سے فاروق چوہدری باہر آیا تھا۔ اُس کا چہرہ سُوجا ہوا تھا لیکن آنکھیں قہقہہ زن تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں نے کل تمہیں زندہ چھوڑ کر غلطی کی تھی ناجو ہدری؟" میں نے اُس کی مُسکراتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "لیکن میں عہد شکن نہیں ہوں۔ میں تمہیں زندہ چھوڑنے پر مجبور تھا۔"

"میں نے بھی تمہارے اُس احسان کے بدلے تمہیں زندہ رہنے دیا ہے خُرم سلطان۔" وہ کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ "حالانکہ ناگ کو زخمی کر کے چھوڑ دینا کوئی دانش مندی نہیں۔"

"ایک سوال کا سچ سچ جواب دو گے فاروق؟"

"وعدہ نہیں کرتا۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر بولا۔ "ہر کیف اگر میرے لیے خطرناک نہ ہُوا تو۔۔۔"

"زینت کہاں ہے؟"

اُس نے حلق پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ "مزا آگیا۔ تیرا شکستہ لہجہ مجھے خوش کر گیا ہے خُرم۔ ذرا اور لہجے کو زخم خوردہ کر دو پھر جواب دوں گا۔"

"میں اس جواب کے لیے بہت نیچے جا سکتا ہوں فاروق۔"

"تو سُنو خُرم سلطان۔" وہ تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔۔۔

"۔۔۔میں نے چوہدری سلطان خان کی حویلی میں اپنا نمائندہ داخل کر دیا ہے۔ زینت چوہدری فاروق کا بچہ جنے گی۔ وہ بچہ اپنی ذات پہ اکرم چوہدری کی نیم پلیٹ سجا کر اُس حویلی میں پرورش پائے گا۔ میرا منصوبہ بڑا شاندار ہے خُرم سلطان اگر ہونے والا بچہ لڑکا ہوا تو میں اکرم سلطان کو منظر سے ہٹا کر اُس حویلی کا وارث اُس بچے کو بناؤں گا اور سلطان خان چوہدری کی ساری جائیداد فاروق کے بیٹے کی ہو گی۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا اور میرا جکڑا ہوا جسم تڑپنے لگا تھا۔

"نام پھر بھی سلطان خان کی نسل کا چلے گا چوہدری۔" میں نے ٹھہری آواز میں جواب دیا۔ "کیونکہ زینت کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ اکرم سلطان کے حوالے سے پہچانا جائے گا۔"

"نہیں۔" وہ حلق پھاڑ کر بولا۔ "لوگ جان گئے ہیں اور یہ آگ پُورے علاقے میں پھیلا دی جائے گی۔"

"اس کا نتیجہ بھی جانتے ہو؟"

"ہاں۔" اُس نے جیب سے ایک فارم نکال کر میرے سامنے کر دیا۔ "یہ نکاح نامہ ہے۔ میں نے زینت کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نکاح کیا تھا اور یہ دیکھو طلاق جو جیرے کے رُوبرُو مجھ سے نکھوائی گئی تھی۔" اُس نے دونوں کاغذ میز پر گرا کے جیکٹ کی جیب میں ڈال دیے۔ "کل نکاح ہو گیا ہے جو شرعی ناجائز ہُوا ہے۔ زینت کو عدت کی مدت پُوری کرنا تھی۔ چند دنوں بعد وہی جرگہ نکاح کو باطل قرار دے کر تمہارے خاندان کو دوسری رسوائی دینے بھیجا جائے گا۔"

میں جانتا تھا وہ محض مجھے رسوا کرنے، تڑپانے اور جلانے کے لیے بکواس کر رہا تھا۔ وہ اتنا احمق نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ نکاح فریقین کی رضامندی کا نام ہے اور زینت اغوا کی گئی تھی۔ وہ جھوٹا نکاح نامہ سامنے کر کے خود کو شرعی حد کا مُجرم نہیں بنا سکتا تھا۔

"اب اس سب بکواس کے عوض چاہتے کیا ہو؟"

"اچھا سوال ہے۔" وہ سگریٹ سُلگا کر بولا۔ "کیا دے سکتے ہو؟"

"جان سے لے کر تمہاری پسند کی ہر شے۔"

"صرف جان۔" وہ مُسکراتا ہوا بولا۔ "بولو منظور ہے؟"

"ہاں۔" رسوائی اور اذیت سے بچنے کے لیے۔۔۔ میں نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے شک ہے فاروق تم یہ خطرہ مول نہ لو گے۔"

"وہ کیوں؟"

"خود سوچ لو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔ تمہاری آمد کی خبر صرف حویلی تک محدود ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

"پھر سوچ لو دوست؟" میں نے اُسے چڑاتے ہوئے کہا۔ "تم جیسا بزدل شخص اتنا بڑا قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ ذرا حالات کی جانب دیکھو پھر سوچو۔ تمہارے مینوں گُرگے میرے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں سگر قاتل عدالت خان ٹھہرایا گیا ہے۔ آخر کیوں ہو گا؟ کہ جس نے خُرم سلطان پر ہاتھ کا سایہ کر رکھا ہے۔ کس نے پولیس کے قدموں کا رُخ عدالت خان کی طرف کیا ہے۔ میری پشت پر کوئی ایسی طاقت ہے فاروق چوہدری جس نے مجھے پناہ میں لے لیا تھا۔ وہ طاقت متحرک ہو چکی ہو گی اور اُس کے قدموں کا رُخ صرف اور صرف فاروق چوہدری ہونا چاہیے۔ جس نے رپورٹ پر قاتل کھڑے کیے تھے اور خود اسپتال کی آڑ میں چھپ گیا تھا۔ مجھے مرنے سے قبل باہر کی فضا ضرور سونگھ لینا۔"

میں جسمانی لحاظ سے تو بے دست و پا تھا۔ اپنی مرضی سے ہاتھ کو بھی جُنبش نہیں دے سکتا تھا لیکن ایک تسلیم شدہ طاقت آزاد تھی۔ دُنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جسمانی طور پر نحیف اور مفلوج انسانوں نے ذہن سے قوموں کی قسمتیں بدلی ہیں۔ تاریخ کے دھارے موڑے ہیں۔ ذہن کا خزانہ خالی نہ ہو تو جسم کی طاقت

جُزوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ میں نے ذہن کو ہی استعمال کر کے غالب دُشمن اور مائل بہ قتل قاتل کی قوت کو مفلوج کر دیا تھا۔ میری باتوں نے اُس کی مُسکراتی آنکھوں میں خوف کا دھواں بھر دیا تھا۔

"میں دیکھوں گا میرا ہاتھ کون روکنے آتا ہے۔" وہ اُچھل کر اُٹھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا اور دوسرے کمرے میں غائب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا میری تلاش شروع ہو چکی ہو گی۔ مجھے زینت کے سامنے گرایا گیا تھا۔ اکرم بھائی اور برادری کے بڑے لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ گرانے والے ہاتھ کس کے ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے یقیناً بات پولیس تک پہنچائی ہو گی اور پولیس کے اعلیٰ افسران کو جدھر سے خُرم چوہدری کو تحفظ دینے کا اشارہ ملا ہو گا۔ انھوں نے بات کو اوپر تک پہنچا دیا ہو گا۔ یہ اُن کا فرضِ منصبی بھی تھا اور "لاپتہ" ظاہر کرنے کا ایک معقول بہانہ بھی تھا۔

اسی یقین نے مجھے سہارا رکھا تھا۔ ورنہ جس حالت میں مجھے جکڑ دیا گیا تھا۔ ایک چھ سالہ بچہ بھی مجھے ہلاک کر سکتا تھا۔

وقت چیونٹی کی رفتار سے میری کھلی آنکھوں اور جاگتے ذہن پر رینگتا ہُوا دن سے رات میں داخل ہو گیا تھا۔ میری ٹانگیں اور بازو درد بھر درد کرتے رہے تھے پھر آہستہ آہستہ جیسے ٹرنے لگے تھے۔ دوران خون کی بندش نے سارے جسم کو سُن کرنا شروع کر دیا تھا۔ کوئی دانہ پانی پوچھنے آیا تھا نہ بتی جلانے۔ بھوک کی تو مجھے کوئی شدت محسوس نہ ہوئی تھی لیکن پیاس سے زبان سوکھے چمڑے کی مانند اکڑ گئی تھی اور حلق میں ببول کی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔

تب ہی مجھے ارشا کی یاد آئی تھی اگر وہ میری بیاری بہن میرے ساتھ آئی ہوتی تو اب تک میں اذیت میں گرفتار نہ رہتا۔ اُس نے کئی ضد کی تھی، کتنا رو دی تھی لیکن میں اُسے گوٹھ سے کیسے لاتا۔ میں بہن کے پیار کے بغیر جینے اور خوش رہنے کا حوصلہ رکھتا تھا لیکن گوٹھ اپنی محبوبہ سے کٹ کر شاید پاگل ہو جاتا۔

میری آنکھ لگ گئی تھی یا نقاہت کی غشی تھی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا میری سماعت سے کوئی آواز ٹکرائی تھی۔ میں نے اپنی ساری قوتوں کو سمیٹ کر بکھیرا کیا قدموں کی چاپ تھی کوئی میرے نزدیک دھپ سے گرا تھا۔ سب کچھ خواب کی مانند محسوس ہو رہا تھا پھر روشنی کی تیز دھار میری بند پلکوں سے ٹکرائی میں نے سر کو جھٹکا دیا اور چہرہ گھمایا۔

میرا یقین مجسم صورت میں تھا۔ بیگن اور ہنٹ میرے سامنے کھڑے تھے اور کوبرا مجھ پر جھکا ہُوا تھا۔ وہ بند شیں کاٹ رہا تھا آہستہ آہستہ بڑے ہی محتاط انداز سے، جیسے ماہر سرجن دل کا آپریشن کر رہا ہو۔

وہم ہی رہی ہو گی کہ ناسیلوں کی ڈوری سو جن کی وجہ سے ڈھیلی ہو گئی تھی۔

"ہنٹ!" بیگن کی دھرکتی آواز اُبھری۔ "دونوں مل کر چیف کے جسم کی بائنڈنگ آہستہ آہستہ تاکہ خون کی نالیاں کھل جائیں۔"

"پانی دلاسو۔" میں نے مشکل اپنی خریدہ خواہش کو آواز دی تھی۔

ہنٹ وہاں سے ہٹ گیا تھا اور چند منٹ بعد سپلاٹ ٹھنڈا جاں افزا قطرہ میرے بنجر اور تڑختے ہوئے ہونٹوں پر ٹپکا تھا۔ ہنٹ انگلیاں پانی میں ڈبو کر قطرہ قطرہ ٹپکانے لگا اور میں نے پہلے خشک ہونٹ تر کیے پھر زبان سیراب ہونے لگی اور قطرے زندگی کا احساس دلاتے حلق سے اُترنے لگے تھے۔

ہنٹ میرے تپتے صحرا کو سیراب کر رہا تھا اور اُس کی جگہ بیگن نے سنبھال لی تھی۔ وہ کوبرا کے ساتھ مل کر مساج کرنے لگا تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرے مفلوج جسم میں انھوں نے نئی رُوح پھُونک دی تھی لیکن مساج سے مجھے بڑی راحت محسوس ہو رہی تھی

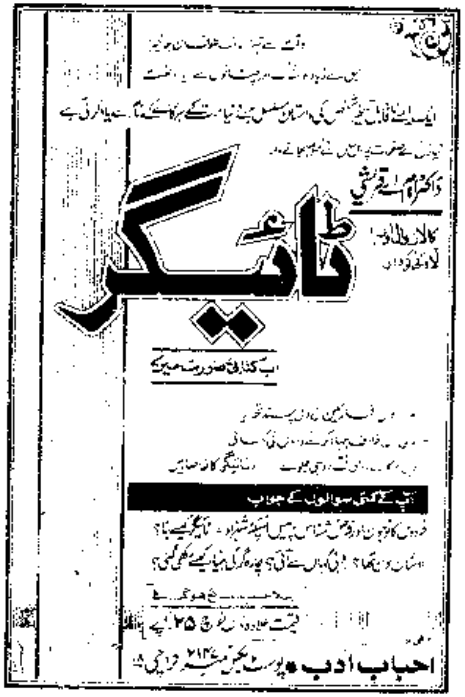

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ یہ عمل آدھا گھنٹہ جاری رہا اور اتنی ہی دیر ہنٹ مجھے پانی پلاتا رہا تھا۔

"چیف!" بیگن نے سہارا دے کر مجھے بٹھا دیا۔ "آپ خود ہاتھ پاؤں ہلائیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "سب ٹھیک ہے چیف، خون کی گردش بحال ہو گئی ہے۔" اس نے میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اُٹھا کر فرش پر کھڑا کر دیا۔

"قدم بڑھائیں چیف۔" اُس نے یوں پکارا جیسے کوئی ماں بچے کو چلنا سکھا رہی ہو۔ میں نے قدم اُٹھایا تو قدم فرش پر پڑا ہوا گولہ مجھے یوں لگا جیسے گرم ریت کے ذرات پاؤں اور پنڈلیوں پر طوفانی رفتار سے لگ رہے تھے، لیکن وہ سہارا دیے چلاتا رہا تھا۔

"بس ماسٹر۔" میں نے ہانپ کر کہا۔ "یہاں سے چلو باقی کسر اُدھر پوری کر لینا۔"

"اپنے دوست سے نہیں ملاقات کرو گے چیف!" بیگن نے تاسف کا رُخ گھماتے ہوئے کہا اور میرا مغلوج جسم فاروق چوہدری کو دیکھ کر دہک اُٹھا تھا۔

وہ اُوندھے مُنہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ پُشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں ایک دم آگے بڑھا اور بیگن کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میں مشکل بیگن کے سہارے چند قدم چل سکا تھا۔ میں نے فاروق کی پیٹھ پر مُکّے برسانے شروع کر دیے اور وہ ہیما رکتے کی مانند چیختا ہوا سیدھا ہو گیا۔

"اسے کھول دو۔" میرے اندر وحشی شیطانی روح حلول کر گئی تھی۔ میں سلطان خان کا بیٹا نہیں بلکہ غنڈوں کا گرینڈ ماسٹر بن گیا تھا۔ وہی خرم سلطان جس نے کوچۂ چیلاں کی اور جالندھر جیسے بڑے شیطانوں کو اُدھیڑ دیا تھا۔

"یہ ہمارے ساتھ چلے گا چیف!" بیگن نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔ "آپ کی وجہ سے ہم اس کی شایانِ شان خدمت نہیں کر سکے۔ یہ فرض ہم پر قرض ہے۔"

"ہنٹ!" میرے حلق سے سرد غراہٹ اُبھری اور ہنٹ میرے سامنے جُھک گیا۔ "اس کے ہاتھ آزاد کر دو۔"

"بہتر چیف۔" ہنٹ نے چاقو سے ڈوری کاٹ دی اور پیچھے ہٹ گیا۔

"اُٹھو فاروق چوہدری۔" میں نے اُس کے شانے پر پاؤں مارا۔ "میں تمہاری طرح بزدل نہیں ہوں کہ دشمن کو جکڑ کر باتوں کی ضربیں لگاؤں۔"

"بیگن! مجھے بتایا جائے یہ مکان کہاں واقع ہے؟"

"یہ شہر کے وسط میں تین منزلہ مکان ہے چیف۔" بیگن نے جواب دیا۔ "ہم دن بھر اس کا تعاقب کرتے رہے ہیں۔"

"ہم۔" میں فاروق اُٹھ کر ہکلانے لگا۔ "یقین کرو خرم میں تمہیں آزاد کرنے آ رہا تھا۔"

"یہ بکواس کر رہا ہے چیف۔" بیگن نے ہاتھ اُٹھایا۔ "دروازہ تک یہاں رہنے کے باعث تھوڑی بہت اُردو سیکھ گیا ہے یہی وجہ تھی کہ وہ فاروق کے جھوٹ بولتے ہی بھڑک اُٹھا تھا۔" میں نے اشارے سے روک دیا۔ "اس کی گاڑی میں بکس ہے، یہ تمہاری لاش یہاں سے لے جانا چاہتا تھا۔"

میں نے ایک قدم بڑھایا۔ فاروق کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ میں نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سیدھی کی اور اسے فاروق کے حلق سے کرب ناک چیخ کمرے کی دیواروں سے سر پھوڑتی بکھر گئی تھی۔ میری اُنگلی اُس کی دائیں آنکھ میں پوری پیوست ہو کر واپس نکل آئی تھی۔

وہ آنکھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر چیخ گیا تھا۔

میں نے جھپٹ کر اُس کا دایاں ہاتھ آنکھ سے نوچ لیا اور بازو اُوپر کر کے کہنی کے نیچے دایاں گھٹنا مارا۔ ہڈی چٹخنے اور فاروق کے ڈکرانے کی آواز آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔

"میں نے کسی سے شریفانہ وعدہ کیا تھا فاروق چوہدری۔" میں نے خون آلود اُنگلی بستر کی چادر سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اس لیے دوسری بار تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ آئندہ بھی جب میرے راستے پر آؤ گے میں تم سے اسی طرح خراج وصول کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم میرے ہاتھوں مرو گے نہیں لیکن گاؤدی گلیوں میں موت کی بھیک ضرور مانگو گے... اور ہر بار میں موت تم سے دُور رکھوں گا۔"

باہر گلی میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک جیپ تھی اور دوسری کار۔ بیگن نے بتایا تھا کہ فاروق جیپ میں آیا تھا۔ میں نے دیکھا واقعی جیپ میں بڑا بکس کمبل اور بیلچہ رکھا ہوا تھا۔ شاید اُسے یقین نہ رہا ہو گا کہ خرم سلطان بھوکا پیاسا دم توڑ گیا ہو گا۔

"تم فاروق تک کیسے پہنچے ہو ماسٹر؟" میں نے راستے میں بیگن سے پوچھ لیا۔

"میں چار بجے سے چھ بجے تک انتظار کرتا رہا تھا چیف۔" بیگن بتانے لگا۔ "میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہو چکی ہے۔ میں کسی راہگیر سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ گاؤں کی طرف سے اسکول کے بچے آ رہے تھے اُن سے میں نے آپ کا کر گھر پوچھا۔ ایک لڑکا مجھے ساتھ لے گیا اور اکرم صاحب نے بہت جرح کے بعد یقین کرتے ہوئے اصل بات بتائی۔ وہاں کچھ دوسرے لوگ بھی تھے۔ وہ لوگ فاروق چوہدری کے گاؤں جانا چاہتے تھے... کچھ کی رائے تھی کہ پولیس کو رپورٹ کر دی جائے۔ میں اکرم صاحب کو الگ لے گیا اور اُن کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا پھر میں نے ان لوگوں کو کال کر کے ڈیوٹی پر لگا دیا۔ اکرم صاحب نے ایک لڑکا ساتھ کیا تھا جس نے ہمیں فاروق کا گھر اور پھر فاروق دکھا دیا تھا۔ اس ہم نے اُس کی نگرانی شروع کر دی۔ وہ پولیس اسٹیشن گیا پھر گھر گیا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر جیپ دوڑاتا رہا تھا۔"

"چیف!" کونز سنسناتی آواز میں بولا۔ "یہ فن آپ نے کہاں سے سیکھا۔ اُف وہ میری زندگی کا بھیانک منظر تھا اور اُس منظر سے کہیں زیادہ آپ کا چہرہ دہشت ناک ہو گیا تھا۔"

"تمہارا تعلق پولیس سے ہے کونز؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں چیف۔"

"پھر مجھ سے یہ فن سیکھ لو پیارے۔" میں نے کہا۔ "جس کے ہاتھ اس فن کے ماہر ہوں اُن کو کسی ہتھیار کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہتھیار ہر جگہ قابلِ استعمال بھی نہیں ہوتا اور ساتھ بھی نہیں رہتا لیکن ہاتھ کھانے کی میز سے میدانِ جنگ تک ساتھ رہتے ہیں۔ ہاتھوں کو استعمال کرنا سیکھو۔"

"مجھے آپ کی ایک ادا نے متاثر کیا ہے چیف۔" ہنٹ کے لہجے میں عقیدت کی خوشبو تھی۔ "آپ نے دشمن کو بار بار موت کا ذائقہ چکھنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ میرے نزدیک ایک بار دشمن کو ساری اذیتوں سے نجات دلانا کوئی انتقام نہیں۔ وہ جب تک زندہ رہے گا ہر لحظہ جان کنی کے عذاب سے دوچار رہے گا۔"

چیمبرنگ کراس پر بیگن نے کار روک دی اور وہ دونوں اُتر گئے۔

"صبح آٹھ بجے تمہاری حاضری ہو گی۔" بیگن نے کہا۔ "کیوں چیف؟"

"ہاں۔" میں نے ثبات میں سر ہلایا۔ "میں چاہتا ہوں کام کا آغاز ہو جانا چاہیے۔"

چونکہ رات خاصی بیت گئی تھی۔ اس لیے کاٹیج میں جاتے ہی بیگن نے صوفے جوڑ کر میرے لیے بستر بچھایا اور خود فرشی بستر پر لیٹ گیا۔ میں بھوکا تھا لیکن بھوک سے کہیں زیادہ نیند کی ضرورت تھی۔ گرم بستر نے مجھے فوراً تمام دیگر ضروریات سے بے نیاز کر دیا تھا۔

صبح بیگن نے بھاری ناشتہ کرایا تھا۔ میرا جسم ڈوری کے نشانوں کے علاوہ بالکل نارمل ہو گیا تھا۔ پوری نیند اور ڈبل ناشتے نے تھکاوٹ کا احساس بھی دُور کر دیا تھا۔ میں خود کو تر و تازہ اور فٹ محسوس کرنے لگا تھا۔

"رہائش گاہوں کے لیے کہاں تک کام ہوا ہے ماسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"اٹھارہ شائع ہو گیا ہے۔ ویسے اتنی جلدی بھی نہیں ہے لڑکے ٹھیک ٹھاک ہیں۔" بیگن بتانے لگا۔ "آپ کے لیے کوئی جگہ دیکھ لوں گا۔" اُس نے ہونٹ دبا کر لمحہ بھر سوچا۔ "مجھے یہاں ہی رہنے دو چیف۔"

"ٹھیک ہے پھر میرے لیے بھی ایک پلنگ کا انتظام کر لو۔"

"شکریہ چیف۔" وہ خوش ہو گیا۔ "میں ہنگاموں سے دُور بہت خوش رہتا ہوں۔"

"اچھا اب فائل لے آؤ ایک شکار کا انتخاب کر لیا جائے۔ لڑکے بھی مصروف رہیں گے۔"

"میں سلیمان پہ کام کر رہا تھا۔" وہ فائل نکالتے ہوئے بولا۔ "نہیں ماسٹر بد کار شکار جال اور شکاری کو بہت پریشان کرتا ہے۔ اُسے اپنی جگہ بیٹھنے دو۔ تم نے پولیس کو شامل کر کے اُسے محتاط کر دیا ہے۔ وہ اب دوسرے ذرائع پیدا کرے گا پھر ہم اُسے بھی... دیکھ لیں گے۔"

فائل میں آخری نام رنگ باز خان کا تھا۔ کوائف کے خانے میں اُس کی متعلقہ لائف ہسٹری درج تھی۔ وہ پاڑہ چنار کا رہنے والا تھا۔ اصل اور جائز کاروبار عمارتی لکڑی کا تھا لیکن وہ تین بار شراب کی بھٹیوں سمیت گرفتار ہو چکا تھا۔ بارڈر بازار میں اُس کی تین دُکانیں تھیں۔ صدر کے علاقے میں راگ رنگ کے نام سے ہوٹل چلا رہا تھا۔ جوئے کے اڈوں کی وجہ سے معروف غنڈہ تھا اور غنڈوں کا گروہ بھی رکھتا تھا۔ کئی چھاپے مارے گئے اور ہر چھاپے میں اُس کا کوئی نہ کوئی پروردہ غنڈہ خود کو اڈے کا مالک ظاہر کر کے گرفتاری دے دیتا تھا۔

"رنگ باز خان کو مارک کر لو ماسٹر۔" میں نے بال پوائنٹ سے اُس کا نام ٹک کرتے ہوئے کہا۔

"اس چھتے پہ ابھی پتھر نہ مارو چیف۔" بیگن بولا۔ "پہلے قدم جما لو۔ ٹیم مکمل کر لو۔ رنگ باز خان ایک شخص نہیں بلکہ بے حد مضبوط گروہ ہے اور اس کی جڑیں انتظامیہ کے بال پنجوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔"

"مجھے یہی نام پسند آ گیا ہے ماسٹر۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "میں ذرا اُلٹی کھوپڑی کا آدمی ہوں، اس لیے سفر کا آغاز آخری آدمی سے کروں گا۔ شیر کے شکار کے دوران چھوٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درندے ہلاک ہوتے چلے جاتے ہیں یا جنگل سے بھاگ جاتے ہیں مگر گرگوش کے شکاری کا سامنا ایک دم شیر سے ہو جائے تو وہ خود شکار ہو جاتا ہے۔"

"سب سے پہلے آپ کو گھر جانا چاہیے چیف۔" بیگن شاید میلی بیچی کا ماہر تھا میرے ذہن کو اس نے پڑھ لیا ہوگا۔ میں ذہنی طور پر حویلی میں داخل ہو گیا تھا۔ ادھر میری ماں، بھائی، زینت اور عابدہ سامنے لوگ انگاروں پر لوٹ رہے ہوں گے۔ جن حالات نے مجھے ان سے دور کر دیا تھا وہ ایسے نہ تھے کہ مجھے بھول کر وہ اپنی خوشیاں منائیں۔

"شکریہ ماسٹر۔" میں نے بوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ "کچھ رقم بھی لے لینا۔ میں اپنی بھائی کو سلامی دوں گا۔" بوٹ پہن کر میں نے وائرلیس فون کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ آفس میں نہ تھے پھر آئی جی کا نمبر ملایا۔ کسی خواتین نے کال وصول کی تھی۔ دو منٹ بعد آئی جی صاحب کی کھرکھراتی آواز سنائی دی۔

"السلام علیکم سر، خرم سلطان۔"

"وہ لڑکے کہاں ہو؟" انھوں نے ٹانگ لگائی۔ "آفس میں مجھ سے مل لو۔ گائیڈ لائن کے لیے۔"

"گستاخی معاف سر۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔ "میں چاہوں گا آپ صرف اپنی دعاؤں میں مجھے شامل رکھیں۔ بتائے ہوئے راستے اکثر سیدھے سے زیادہ مشکل ہوتے ہیں جو خود دریافت کیے جائیں۔ میں نے منسٹر صاحب سے بھی یہی درخواست کی تھی۔ ہاں ناقابل تسخیر رکاوٹ کے لیے رجوع کروں گا۔"

"مجھے یہ بات پسند آئی خرم سلطان۔" وہ شاباش انداز میں بولے۔ "اپنے آپ پر بھروسہ کرنے والے لوگ شکوک سے محفوظ رہتے ہیں۔ ایک بات ضرور کہوں گا رابطہ قائم رکھنا۔ مجھے اوپر والوں کو جواب دینا پڑتا ہے۔"

"بہتر سر۔" میں نے مؤدب جواب دیا۔ "مجھے ایک گاڑی چاہیے بہت اچھی حالت میں۔"

"آفس آؤ گے تو بات کر لیں گے۔ فاروقی چوہدری والا معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا ہے۔"

"میں ممنون ہوں سر۔" میں نے لمحوں تک آئی بات کو روک کر صرف شکریہ ادا کر دیا۔ میں ان کو فاروقی چوہدری کی نئی رپورٹ دینا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر ارادہ بدل لیا کہ خود فاروقی چوہدری اس سلسلے کا منہ کبھی موڑنا چاہے گا اگر وہ زبان بند رکھتا تو یہ بات میرے حق میں جاتی۔

حویلی تک میں پہلی بار دن کی روشنی میں کار لے گیا تھا اگر پیدل ہوتا تو شاید مہر جنگل کی آگ کی طرح نہ پھیلتی لیکن گلیوں میں غراتی ہوئی کار نے پورے گاؤں میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ سڑک کے تعاقب میں دوڑنے لگے تھے اور عورتیں چھتوں پر چڑھ آئی تھیں۔ وقت میں بڑی طاقت ہے چاہے تو آفتاب کو تاریک کر دے اور ایک حقیر سے ذرے کو آفتاب کی روشنی دے ڈالے۔ میں اسی گاؤں کا عام سا لڑکا تھا جو کتنے ہی برس پرانی سائیکل کھڑکھڑاتا ہوا ان ہی گلیوں سے گزرتا رہتا تھا۔ کبھی کسی نے دوسری بار پلٹ کر نہ دیکھا تھا لیکن وہی لڑکا اتنی اہمیت اور شہرت اختیار کر گیا تھا کہ پورا گاؤں گھروں سے نکل آیا تھا۔

میری خبر مجھ سے قبل حویلی کے اندر جا پہنچی تھی۔ میں نے اکرم بھائی کو دروازے سے نکلتے دیکھا تو کار روکی اور بیگن کو شاید تھپتھپاتا ہوا باہر کود گیا۔ اکرم بھائی کے پیچھے برادری کے مردوں کی فوج تھی۔ اکرم بھائی نے مجھے سینے سے لگا کر چوما اور پھر لوگوں نے مجھے اٹھا لیا جیسے میں کبڈی کا مقابلہ جیت آیا تھا۔

میں نے بیگن کی جانب دیکھا وہ بڈھے ٹیک لگائے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور اکرم بھائی اسے لیے جا رہے تھے۔

زنانے حصے میں بھی شور اور ہل چل مچی ہوئی تھی۔ کچھ بزرگ خواتین برآمدے تک چلی آئی تھیں۔ میں نے مردانے حصے میں موجود لوگوں سے اجازت لی اور دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا برآمدے میں گیا۔

بزرگ خواتین نے حسب روایت میرے چہرے، پیشانی اور بازوؤں پر پیار کیا تھا۔ ان میں اماں بی اور عابدہ کی ماں نہ تھیں۔ میں ان کو چھوڑ کر اماں بی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سجدے میں گری ہوئی تھیں۔ میں گھٹنے موڑ کر ان کے دائیں پہلو میں بیٹھ گیا۔ انھوں نے سجدے سے سر اٹھایا اور پھر میرے چہرے پر گرم گرم آنسو ٹپکنے لگے۔ میں ان کی آغوش میں تھا۔

میرا دل مطمئن تھا۔ وہ بولیں۔ "جب کسی ماں کا جگر گوشہ کٹ جاتا ہے تو ماں کا جگر درد کرنے لگتا ہے۔ میں نے اکرم اور زینت سے کہہ دیا تھا خرم سلطان جہاں بھی ہے زندہ ہے۔"

"جس بیٹے کے ساتھ ماں کی دعائیں ہوں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" میں نے ان کی گالی سے چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔ "جاؤ ان بچیوں سے مل لو۔ دونوں نے رو رو کر خود کو ہلکان کر لیا ہے۔"

میں تین کمروں سے گزرتا جب چوتھے کمرے میں داخل ہوا تو کمرے میں جیسے زلزلہ آ گیا تھا۔ کمرہ گاؤں کی لڑکیوں سے

بھرا ہوا تھا۔ وہ ایسے ہی بدحواس ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگی تھیں جیسے مٹھاس کے ذرے سے اٹھتی ہوئی چیونٹیوں کو کسی نے چھیڑ دیا ہو۔ لڑکیوں کی سرمرائی سرگوشیوں اور چوڑیوں کی کھنک کے درمیان میں سے گزرتا سرخ جوڑے میں ملبوس روتی ہوئی دلہن تک گیا۔ اس نے جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور پھر سرد و بارہ گھٹنوں میں رکھ لیا۔ میں نے اس کے خشک بال بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ رکھ دیا پھر اسے شانوں سے پکڑ کر سامنے کیا۔ "مسکراؤ میری پیاری بہن۔" اس نے بیچ کو ہاتھ کی پشت سے روک لیا۔ میں نے ایک ہزار کی گڈی اس کے ہاتھوں کے درمیان رکھ دی۔ "چھوٹے بھائی کی سلامی۔" سسکیوں کی آواز سن کر میں نے گردن موڑ کر دیکھا میرے پیچھے عابدہ کھڑی تھی۔

"عجیب لوگ ہو تم۔" میں نے عابدہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خوشی کے دن رو رہی ہو۔" تب مجھے اچانک احساس ہوا تھا کہ کمرے میں صرف عابدہ اور زینت ہیں۔ لڑکیاں دبے پاؤں نکل گئی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ خرم۔" زینت نے بھرائی آواز میں کہا اور میں اس کے ساتھ گدے پر بیٹھ گیا۔ "عابدہ! تم جاؤ اکرم سے کہو نیاز دے دیں ہمارا بھائی واپس آ گیا ہے۔"

"کیا منت مانی تھی تم نے؟" میں نے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"وہ کون تھے خرم؟" اس نے میرے سوال کو ان سنا کرتے ہوئے پوچھ لیا۔ "ادھر دکھاؤ زخم۔"

"میں ہاتھی ہوں۔" میں نے ہنس کر بتایا۔ "صبح کی روشنی پھوٹتی ہے تو میرے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔"

"تم نے بتایا نہیں کون تھے؟" اس کی آواز میں ایک دم وقار سج گیا تھا۔ جیسے اس نے اپنی حیثیت کو قبول کر لیا تھا۔

"وہی ہمارا منشر کہ دشمن بھائی۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں بھائی ایک دن اسے تمہارے پاؤں میں گرا لوں گا لیکن وہ وقت ایسا ہوگا کہ اسے تم ٹھوکر لگانا بھی گوارا نہ کرو گی۔ میں اس کی ایک آنکھ پھوڑ اور ایک بازو توڑ آیا ہوں۔ یہ پہلی قسط ہے۔ میں نے اس کو بتا دیا ہے کہ قسطوں میں قرض وصول کیا جائے گا۔"

"مجھ پر ایک احسان کرنا خرم سلطان!" وہ سرد آواز میں بولی۔ "ایک بار اس کا چہرہ میرے سامنے لے آنا۔ میں اندر کی ساری نفرت اور آگ اگل دوں تب اسے مارنا۔"

"ایسا ہی ہوگا زینت۔" میرا لہجہ بھی سفاک ہو گیا تھا۔ "فاروقی پھر وہ قتل کیسے کرے گا۔ میرا مسئلہ پولیس کا سر براہ اس کا پشت پناہ ہوگا۔"

"میں اس لائن پر سوچوں گا۔" انھوں نے انٹرکام پر بیلی اے کو کال کیا۔ "ایس پی کینٹ کو میرا سلام بولو۔" ریسیور رکھ کر وہ پھر میری جانب متوجہ ہو گئے۔ "کیا پینا پسند کرو گے؟ ویسے مجھے تمہارے خاندانی کوائف معلوم کر کے دکھ ہی خوشی ہوئی ہے۔ معزز خاندان اور ایک نیک نام باپ کے بیٹے کو ہی یہ اعزاز زیب دیتا ہے لیکن تمہاری اس سروس کی رپورٹ کچھ ٹھیک نہیں تم جرائم پیشہ لوگوں سے وابستہ رہے ہو۔"

"مجھے گھیر لیا گیا تھا سر۔" میں نے بتایا۔ "میں نے دفاع میں گرینڈ ماسٹروں کو ختم کیا تھا۔"

"آؤ کار دیکھ لو۔" وہ اٹھے اور میں ان کے ساتھ عقبی دروازے سے نکل کر پارکنگ سٹینڈ میں گیا۔ ایک بنام نشان نئی کار مجھے دکھائی گئی۔ "بلٹ پروف اور آرمڈ کار ہے۔ کچھ نظام خود کار ہیں۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"آگے آ کر دیکھو۔" میں فرنٹ سیٹ پر آ گیا۔ کھٹاک کی آواز سنائی دی اور نمبر پلیٹ کے دائیں بائیں سے دو پیرل سامنے آ گئے۔ ایسی ہی دو گنیں بیک میں فٹ ہیں۔ اب اندر آؤ۔ آپریٹ کر کے دیکھ لو۔ یہ بٹن لانگ رینج ٹرانسمیٹر کا ہے اور یہ وائرلیس فون ہے۔"

میں نے ایک ایک چیز کو چیک کیا۔ آپریٹ کیا۔ ایک بٹن دباتے ہی ڈارک شیشے شفاف شیشوں کے سامنے آ گئے تھے۔

"... اور یہ رہا تمہارا اسپیشل ڈرائیونگ لائسنس۔" انھوں نے سرخ جلد کی کاپی ایک خانے سے نکال کر دکھائی۔ "ابھی ایس پی کینٹ تمہیں وہ رہائش گاہ دکھائیں گے جو تمہارے لیے حاصل کی گئی ہے۔"

"یہ سب کچھ میری ضرورت اور طلب سے زیادہ ہے سر۔" میں نے ممنون بلکہ ندامت سے کہا۔

"مجھے جو اوپر سے آرڈر ملا تھا میں نے اس کے مطابق کام کیا ہے خرم سلطان۔" وہ کندھے اچکا کر بولے۔ "تم نے جن درندوں کی کچھاروں میں داخل ہونے کی ذمہ داری قبول کی ہے، میرے خیال میں یہ انتظامات بہت کم ہیں۔"

"میں شرمسار نہیں ہونا چاہتا تھا سر۔" میں نے کہا۔ "ایس پی کینٹ آپ کی خوشنودی کے لیے اپنے ماتحتوں کو میری خدمت پر لگائیں گے اور اس طرح وہ کالی بھیڑیں میرے گرد بھی جمع ہو جائیں گی۔"

"لیکن کوٹھی کی لوکیشن مجھے معلوم نہیں۔"

"میں رہائش کا انتظام خود کر لوں گا سر۔ آپ ان کو منع کر دیں۔"

"یعنی تم صحیح معنوں میں سیکرٹ ایجنٹ رہنا چاہتے ہو۔"

"یہ میری مجبوری ہے سر۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے، تم کھانے جاؤ۔" انھوں نے چابیاں میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ اب احساس ہو رہا ہے کہ تمھیں ہماری نگاہوں سے دُور رہنا چاہیے۔"

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور کار اسٹارٹ کر کے دوسرے پارکنگ پلاٹ میں لے گیا جو عوام کے لیے تھا۔ وہاں بیگن میرا منتظر تھا۔ مجھے کار میں دیکھ کر وہ نزدیک آ گیا۔

"میرے آگے آگے چلو ماسٹر۔" میں نے کہا۔ "میں اتنا اچھا ڈرائیور نہیں ہوں۔"

"بہتر چیف۔" وہ سر خم دے کر واپس چلا گیا۔

کاٹج میں صرف ایک کار کی گنجائش تھی، جو کار بیگن کو لانی تھی وہ بیگن کو اتنی پسند آئی تھی کہ اُس نے اپنی کار باہر روک کر اُس کار کو گیراج میں بند کر دیا تھا۔ لنچ کا وقت تنگ ہو رہا تھا، اس لیے بیگن کی تجویز پر ہم نے صدر کے ایک اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے دوران ہی میں نے رنگ باز خان سے ملاقات کی پلاننگ بیگن کی منظوری کے لیے اُسے بتائی۔ وہ نوالے چباتے ہوئے اثبات میں گردن ہلاتا رہا تھا۔

رنگ باز کے لیے خصوصی پلاننگ کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ وہ بدکا ہوا شکار تھا۔ پولیس کی رسمی اور مصنوعی کارروائیاں میرے علم میں لائی گئی تھیں۔ ایسا شخص کسی اجنبی سے مصافحہ کرنے سے قبل بھی ہزار بار سوچتا ہے۔

"کر دار تم حاصل کرو گے یا کسی لڑکے کی ڈیوٹی لگائی جائے؟" میں نے قہوے کا سپ لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہاں معاوضے پر سپر درجے کے بدمعاش عام مل جاتے ہیں۔"

"اس کام کے لیے سلوا ماہر ہے۔ وہ رنگ اور زبان سے ادھر کا ہی دکھائی دیتا ہے۔"

"اب اُٹھ چلو۔ میں آج رات ہی ڈرامہ کرنا پسند کروں گا۔" میں نے آخری گھونٹ حلق میں اُنڈیل کر کہا۔ "تمھیں بھی اس سُنہرے اصُول سے اتفاق ہو گا کہ بُرائی کرنے میں جلدی نہ کرو۔ شاید نیکی کا فرشتہ تمھیں بُرائی سے بچالے اور نیکی میں کوئی لحظہ ضائع نہ کرو، کیونکہ خیر و شر کی قوتیں ہر وقت برسرِ پیکار رہتی ہیں۔"

بیگن نے ہنس کر تائید میں گردن ہلائی اور بولا۔ "چیف! ہم نام اور رسمانے والوں کے وقت کے لحاظ سے مختلف ہیں ورنہ سوچ تو تنا ایک ہی ہے۔ اس خدا کو تم ربِ اعلیٰ مانتے ہو، وہی ہمارا رب ہے اور اُسی کے بتائے ہوئے راستے پر ہم چلتے ہیں۔"

"سوری ماسٹر۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اس نازک موضوع پر تم سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ ہم فی الحال بحیثیت انسان انسانیت

کی فلاح کے لیے معروف عمل اور ساتھی ہیں۔ خرم سلطان اکثر ان صرف نام ہیں جیسے ہماری کاروں کی پیشانی پر نمبر پلیٹس لگی ہوتی ہیں۔"

بل بیگن نے ادا کیا اور ہم کاؤنٹ پلیٹ میں چھوڑ کر کاؤنٹر سے ہٹ آیا تھا۔

"بات سُنیے پلیز۔" کاؤنٹر کلرک نے آواز دی۔ ہم نے بیک وقت پلٹ کر دیکھا۔ اُس کی انگلیوں میں پانچ کا نوٹ دبا ہُوا تھا۔ "کاؤنٹر پر پے منٹ کرنے والے ٹپ نہیں دیا کرتے سر۔" اُس نے نوٹ بیگن کو لوٹا دیا۔

"شکریہ دوست۔" میرا سر فخر سے تن گیا۔ اُس قوم کے ایک نوجوان نے انگریز کی عنایت شِش کو اُس کے مُنہ پر دے مارا تھا جس کے بارے میں انگریز کہتے سنے گئے تھے کہ ایک پیسے پر وہ بھوکے گدھوں کی مانند گرا کرتے تھے۔

مجھے کاٹج میں چھوڑ کر بیگن واپس چلا گیا تھا۔ کوئی کام نہ تھا اور میں بیدار رہ کر ذہن کے کھلے دریچوں سے خیالوں کو چمگادڑوں کو در آنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اگر ایک چمگادڑ اندر داخل ہو جاتا تو پھر یہ سلسلہ جو یہی سے لے کر فلپائن کی خانقاہ تک پھیل جاتا، اس لیے میں جوتے اُتار کر بیگن کے فرشی بستر میں گھس گیا تھا اور سونے کے آسان عمل نے پانچ سِن منٹ بعد مجھے اپنے نرم گرم پروں تلے چھپا لیا تھا۔

کال بیل کی آواز سُن کر میں نے چہرے سے کمبل ہٹایا۔ کمرہ تاریک تھا۔ میں نے اُٹھ کر بیل لیمپ روشن کیا اور حسبِ عادت میرا ہاتھ جیب میں رینگ گیا۔

"دروازہ کھولو چیف۔" بیگن کی آواز سُن کر میں نے لیک کر دروازہ کھول دیا۔ اُس کے ساتھ کوئی نہ تھا اور سلوا تھے "گڈ۔ آپ نے تیندے لی۔ میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا تھا۔" میں مسکراتا ہُوا باتھ روم میں داخل ہو گیا۔

"حال کیا۔؟" میں نے تولیہ اچھالتے ہوئے پوچھا۔

"سلوا! چیف کو بتاؤ۔" بیگن بولا۔

"تین آدمی ٹھیک نو بجے ہوٹل کے لان میں موجود ہوں گے۔" سلوا بتانے لگا۔ "ایک سوئی اُس مقرر ہُوا ہے۔"

"اُن کو بریف کر دیا تم نے؟"

"یس چیف۔" سلوا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ماسٹر کی ہدایت کے مطابق۔"

"رنگ باز خان کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟"

"وہ پانچ بجے رات دس بجے تک ہوٹل میں رہتا ہے۔"

جو ہدردی کی ذات نشانِ عبرت بن کر اس علاقے کی تاریخ میں محفوظ ہو جائے گی۔"

"اب آپ واپس تو نہیں جائیں گے؟"

"تم نے کہہ دیا تھا اس لیے میں نے باہر جگہ بنالی ہے۔"

"وہ... وہ... وقت اور تھا۔ جب مر چکی ہوں تو اب کوئی احساس پریشان نہیں کرے گا۔"

"نہیں زینت، زخم پر چوٹ لگتی رہے تو زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ میں فی الحال کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، کسی وقت تمھیں بتاؤں گا۔ تمھارا بھائی، تمھارا خرم کیا ہے اور کیوں گھر سے دُور رہتا ہے۔ بس اتنا بتا دوں، میں آن ڈیوٹی ہوں۔"

"آن ڈیوٹی!" اُس کی لانبی لانبی پلکیں تھرک کر اُوپر اُٹھیں۔ "کیا آتے ہی تمھیں ملازمت مل گئی ہے۔ جھوٹ نہ بولو خرم۔ میں نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ میں پہلے والی جذباتی زینت نہیں ہوں۔ بہانے کی ضرورت نہیں، جب میں نے چوٹ سہہ لی ہے تو تم کیوں فرار ہوتے ہو۔ مرد میں تو بڑا حوصلہ ہوتا ہے۔ ہم مل کر پھر اس حویلی کو آباد کریں گے۔ کتنی اُجڑ گئی ہے۔"

"میں آباد ہوں گا زینت۔"

"ایک بات پوچھوں خرم؟" وہ پہلی بار مسکرائی۔ "جھوٹ نہیں بولو گے۔ اب میں تمھاری بزرگ ہوں۔"

"پوچھیے مترمہ۔"

"عابدہ سے اُدھر تم نے کوئی وعدہ کیا تھا؟"

میرے جسم کو جھٹکا لگا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا عابدہ بھی وہاں سے جا چکی تھی۔ "ہاں زینت لیکن وہ خرم سلطان کو وعدہ نہ تھا بلکہ ایک غریب الوطن اداسی ہوئے نوجوان کا وقتی وعدہ تھا۔ اس خاندان نے مجھے اُس وقت گھر کا سایہ اور اپنائیت کا بھرپور احساس دیا تھا۔ جب ہانگ کانگ کا ذرہ ذرہ میرا دشمن تھا۔ میری جیب اور پیٹ خالی تھا۔ یہ میرا محسن خاندان ہے زینت۔"

"لیکن وہ تو سنجیدہ ہے خرم۔"

"فی الحال اُسے سنجیدہ ہی رہنے دو۔ ورنہ وہ رنجیدہ ہو جائے گی۔"

"کیا مطلب؟" زینت نے میری کلائی پر ہاتھ مارا۔ "تم اُسے مایوس کرو گے؟"

"آج ہی فیصلہ سُنو گی؟" میں نے مضبوط لہجے میں کہا اور وہ ہونٹ چبانے لگی۔ "یہ وقت اور حالات ان باتوں کے لیے موزوں نہیں زینت بھابی۔ وہ لوگ میرے لیے بڑے محترم ہیں۔ اُن کا خیال رکھنا اور جب فیصلے کی گھڑی آئے گی تو میں اپنے پیار کو فیصلے کا اختیار

دے دوں گا۔"

"شکریہ خرم۔" زینت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "بس اب تم باہر جاؤ۔ تمھارے بھائی جان کو تمھاری ضرورت ہو گی۔ سب پروگرام کینسل ہو گئے تھے، باہر جاؤ۔ میں جذباتی باتیں نہیں کروں گی۔ میں نے خود کو بہت مشکل سے راضی کیا ہے خرم، جاؤ۔"

"بہتر بھابی محترمہ۔" میں نے اُٹھ کر گردن کو خم دیا اور زینت ایک رقم دوسری طرف گھوم گئی تھی۔

میں بارہ بجے تک حویلی میں واپس آ گیا تھا۔ میں نے اکرم بھائی کو اپنی موجودگی، حیثیت اور مجبوریوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ خوش بھی تھے اور پریشان بھی۔

●●

ایک بجے میں آئی جی کے وسیع و عریض آفس میں داخل ہُوا۔ وہ فون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ بائیں ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ ڈٹے تھے۔ میں صرف پوچھوں گا وہ کہنی بھر کیوں ٹریس نہیں ہوتی۔ جب بھی ریڈ ہوتا ہے اصل مجرم وہاں نہیں ہوتے۔ آپ کے قریب ہے وہ شخص اُسے ٹریس کرو۔ ورنہ یہ پوسٹ چھوڑ دو۔" انھوں نے گھٹ سے ریسیور رکھ دیا پھر لمحہ بھر ہاتھوں پر سر تھام کر نیچے رکھے کاغذ کو پڑھتے رہے۔

"اس شخص کو اپنی سیٹ میں رکھو خرم سلطان۔" انھوں نے وہی کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔ میں اُس پر رنگ باز خان کا نام پڑھ کر بے اختیار مسکرانے لگا۔ کیسا عجیب اتفاق تھا۔ یہ انسان زردوشکا میرے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔

"یہ شخص میرے محکمے کی رگوں میں زہر کی طرح سرایت کر چکا ہے۔ اس کے پروردہ ججز، پولیس آفیسرز ہر جگہ ہیں۔ ہماری سرگوشی بھی وہاں سُن لی جاتی ہے۔"

"طریقۂ کار غلط ہے سر۔"

"اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

"جس شکار گاہ میں ہر روز شکاری جائیں وہاں کے ہرن محتاط ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کسی ایسے دستے یا شخص کو حکم دیں جس پر آپ یقین کرتے ہوں کہ وہ ایجنٹ نہیں ہے کہ آئندہ رنگ باز خان کو چھڑا جائے اگر وہ اس حیثیت کا مالک ہے کہ آپ جیسا اعلیٰ آفیسر اُس سے ملاقات کر سکتا ہے تو کسی تقریب میں اُس سے مل لیں اور اُسے دانہ ڈالیں۔"

"ہوں... میں تمھاری بات سمجھ رہا ہوں۔" وہ تعریفی لہجے میں بولے۔ "پھر کیا ہو گا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیگن نے الماری کھول کر بوتل نکالی اور گلاس میں شراب انڈیل کر واپس پلٹا۔ "سوری چیف" وہ لنگڑاتی ہوئی جھکا کر معذرت طلب لہجے میں بولا۔ "میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے ماسٹر۔" میں نے کہا۔ "ویسے ہم لوگ نشے کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔"

"آپ کوئی نشہ نہیں کرتے چیف؟" سلوا نے عقیدت بھرے انداز میں پوچھا۔ "شاید آپ سگریٹ بھی نہیں پیتے۔"

"ہاں دوست میں کوئی نشہ نہیں کرتا۔" میں نے جواب دیا اور تیار ہونے لگا۔

بیگن نئی کار استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اُسے منع کر دیا۔ وہ منہ سے تو نہیں بولا لیکن اُسے میرا انکار پسند نہ آیا تھا۔ کندھے اُچکاتا ہوا اپنی کار کی جانب بڑھ گیا تھا۔

"میں ایک قلاش اور آوارہ گرد نوجوان کے روپ میں اپنا کردار ادا کروں گا ماسٹر۔" میں نے اُس کی کمیشن دور کرنے کی خاطر اپنے انکار کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "ایسے نوجوان کے پاس دنیا کی بہترین کار نہیں ہونی چاہیے... ہاں اگر تم مجھے اور سلوا کو ہوٹل سے دور ڈراپ کر دو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ویسے بھی تم لوگوں کو دوسرے سیٹوں کے لیے پس پردہ رہنا ہوگا۔"

"معذرت کی ضرورت نہیں چیف۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ہم وہ کار خاص مقاصد کے لیے ہی استعمال کیا کریں گے۔ میں تو فینشل رنگ کے خیال سے نکالنا چاہتا تھا۔"

"میرا خیال ہے کار دو ہزار میٹر چل چکی ہے۔" میں نے بتایا۔

میں اور سلوا پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور ہنٹ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

"تم لوگ شیراز میں ہمارا انتظار کرو گے۔" میں نے کہا۔ "اگر ڈراما کامیاب رہا تو پروگرام کے مطابق صرف سلوا تمہیں ملے گا۔"

بیگن نے ہوٹل راگ رنگ سے ایک فرلانگ دور رکھی اور سلوا کو اُتار دیا اور ہم باتیں کرتے ہوئے مصروف فٹ پاتھ پر چل پڑے تھے۔ سلوا اردو اور پنجابی روانی سے بولتا تھا اس لیے ہم پنجابی میں باتیں کر رہے تھے۔

"آپ کو لباس دوسرا پہن آنا چاہیے تھا چیف۔" سلوا نے میرے سراپا پر نگاہیں ڈال کر کہا۔ "آپ قلاش لگتے ہیں نہ آوارہ گرد۔"

"عام لباس ہے۔ اب پھٹے ہوئے کپڑے کہاں سے لاتا۔"

ہوٹل کے نیون سائن دھمک رہے تھے۔ خنکی کی وجہ سے لان خالی پڑے تھے۔ صرف دو بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔ البتہ سفید پوش اور کالی بلیاں میزوں کے اردگرد گھوم پھر رہی تھیں۔ میں نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ پونے نو بجنے والے تھے۔ پلاننگ کے مطابق مجھے تنہا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کمروں کی رہنمائی سلوا کو کرنا تھی۔ اس لیے سلوا مجھ سے لاتعلق سا ہو کر لان میں داخل ہو گیا تھا اور میں بجری کو اُڑاتا ہوا پاتھ وے پر چلتا شیشے کے ریوالونگ دروازے سے اندر چلا گیا۔

دائیں جانب لش لش کرتا کاؤنٹر تھا اور تین خوش رو نوجوان تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مستعد کھڑے تھے۔ ایک شخص کاؤنٹر پر کہنیاں ٹیکے فون پر باتیں کر رہا تھا۔

میں نے بائیں طرف کا جائزہ لیا۔ بائیں ہاتھ ڈائننگ ہال تھا۔ کاؤنٹر اور ہال کے درمیان گدازقالین اور کاؤچ بچھے ہوئے تھے۔ میں نے وہی جگہ پسند کی تھی۔ اچھل کود کے لیے کھلی جگہ ناگزیر تھی۔ میں چاہتا تھا کہ منیجر اندر بیٹھ کر ڈراما دیکھے۔ اصل جج اور مہمان خصوصی تو وہی تھا۔ اگر وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو میرے حق میں فیصلہ کیسے کر سکتا تھا۔

پردہ ہٹا ہوا تھا اور اُس کے سامنے ایک موٹا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ منیجر کی کرسی پر بیٹھا ہوا شخص ہی رنگ باز خان تھا تو وہ ایک شاندار اور باوقار شخصیت رکھتا تھا۔

میں دروازے کے سامنے ایک کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گے جناب؟" ایک ویٹر نے جھک کر پوچھا۔

"تمہارا خون..." میرے حلق سے غراہٹ ابھری اور وہ میکانکی انداز میں سیدھا ہو گیا۔ "جاؤ دفع ہو جاؤ۔ تمہیں معلوم نہیں میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں؟"

وہ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹا اور پھر پلٹ کر کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا۔ تینوں کاؤنٹر کلرکوں نے میری آواز سن لی تھی اور مجھے گھورنے لگے تھے۔

شیشے کا دروازہ گھوما اور سلوا کے ساتھ ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ سلوا سیدھا کاؤنٹر کی جانب بڑھتا گیا تھا لیکن لڑکی چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ سجائے میری طرف چلی آئی۔

"سوری ڈیئر..." وہ لہراتی ہوئی میرے قریب بیٹھ گئی۔ "میں کچھ لیٹ ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں..." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم آئی ہو۔ میرے لیے یہی سب کچھ ہے۔"

میں نے دزدیدہ نگاہوں سے پھر بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ اسٹیج پر دوسرے کرداروں کو آنا چاہیے تھا۔ ہم نے اپنے حصے کے مکالمے ادا کر دیے تھے۔ وہ پرس میں کچھ تلاش کرنے لگی تھی اور میں سوچ رہا تھا مجھے دیکھنے والوں کو مصروف رکھنے کے لیے آف دی ریکارڈ کون سا مکالمہ...

بولنا چاہیے۔

"کیا پینا پسند کرو گی؟" میں نے جھک کر فدویانہ انداز میں پوچھا۔

لڑکی نے چونک کر دیکھا اور ایسے شکریے تھی، جیسے مسکراتی تو ورغلا لیتی۔ شیشے کا دروازہ گھوما اور پے بہ دیگرے تین نوجوان دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ تینوں اچھے قد کاٹھ کے تھے اور چہروں سے بدمعاشی جھلک رہی تھی۔ تیسرے درجے کے غنڈوں کی یہی شناخت ہوتی ہے۔ وہ دور سے پہچان لیے جاتے ہیں۔

دوسری پشت پر چلے گئے اور تیسرے نے سامنے آکر چھوٹی تپائی کو ٹھوکر لگائی۔ میں اُچھل کر اٹھا اور لڑکی ایک دم میری آڑ میں ہو گئی۔

"اے گڑیا!" سامنے کھڑے غنڈے نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم ایک طرف ہو جاؤ۔"

"نن... نہیں..." وہ چیختی ہوئی میرے قریب ہو گئی۔ "رحم... رحم کرو۔"

عقب سے ایک ہاتھ بڑھا اور لڑکی میرے پہلو سے ایسے نکل گئی جیسے مکھن سے کسی نے بال کھینچ لیا ہو۔ میں نے پھرتی سے پلٹ کر دیکھا، وہ لڑکی کو کاؤنٹر کی جانب دھکیل رہا تھا اور لڑکی چیخ رہی تھی۔

"ہمارے ساتھ چلو۔" سامنے کھڑے شخص نے سرد لہجے میں کہا۔

میں نے گردن موڑ کر دائیں بائیں اور پھر پیچھے دیکھا۔ وہ دونوں کاؤچ کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے تھے۔ سلوا نے میری ہدایات کے مطابق ہر کردار کو اپنی اپنی جگہ خوب اچھی طرح سمجھائی تھی۔ تپائی میرے سامنے تھی۔

میں نے دونوں پاؤں فرش سے اُچھال دیے۔ تپائی اُڑتی ہوئی، سامنے کھڑے غنڈے کے سینے سے ٹکرائی اور میں مڑتا ہوا کاؤچ کی پشت سے دوسری طرف چلا گیا تھا۔ ہاتھ کاؤچ کی سخت پشت کے اوپر جما کر میں نے پیچھے کھڑے غنڈوں کے پیٹ پر بیک وقت دھماکے کیے۔ وہ تو بے چارے بادشاہ کے چوب داروں کی مانند کھڑے تھے۔ ضرب بالکل اصلی تھی۔ اس لیے وہ ڈکراتے ہوئے اُلٹ گئے تھے۔

سامنے والے نے تپائی اُٹھائی اور میری طرف ایسے اُچھال دی، جیسے کہہ رہا ہو سنبھالیے جناب۔ میں نے بڑی آسانی سے ہاتھوں پر تپائی روک کر نیچے رکھ دی اور اُچھل کر اوپر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ میری فلائنگ کک اُس کے سینے پر لگی۔ میں تڑپ کر گرا تھا، لیکن وہ پشت کے بل پیچھے پڑے کاؤچ سے ٹکرایا اور کاؤچ اُلٹ گیا۔

دوسرے اُٹھ کر میری طرف بڑے جارحانہ انداز میں دانت پیستے ہوئے بڑھے ہی تھے کہ ایک گرجتی ہوئی للکار سنائی دی۔

"خبردار...! اب اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کرے گا۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ یقیناً رنگ باز خان تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سیاہ پستول دبا ہوا تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور کندھے اُچکاتا ہوا چل پڑا۔

"رک جاؤ۔" وہ پھر دہاڑا اور اُچھل کر میرے سامنے آگیا۔

"کیا تین سے تمہاری کارروائی مکمل نہیں ہو سکتی؟" میں نے سرد آواز میں کہا۔

"نہیں..." وہ مونچھوں میں مسکرایا۔ "میں اُٹھائی گیروں سے منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔" پھر اُس نے اُن تینوں کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا تینوں کی حالت خراب تھی۔ ایک سو روپے میں انھیں یہ سودا مہنگا پڑا تھا۔ وہ مجھے کینہ توز نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ سلوا نے تو اُن کو بتایا ہوگا کہ ایک نوجوان کی گھوٹ موٹ ٹھکائی کر کے رفوچکر ہو جانا ہے لیکن وہ میرے ہاتھوں لوٹ پوٹ گئے تھے۔ اب مجھے نیچرل ایکٹنگ کرنا تھی کیونکہ میرا جج کوئی اناڑی شخص نہ تھا۔

"کیا معاملہ ہے لڑکو؟" رنگ باز نے پوچھا۔

"ہلکا ذاتی معاملہ ہے جناب۔" ایک شخص نے باجیوں سے خون پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"تم لوگوں کے درمیان وہ لڑکی تھی، نا؟"

"ہاں..." اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"تم میں سے اُس کا دھوے دار کون ہے؟"

"وہ... وہ... ہماری..."

رنگ باز نے اُس کے منہ پر اُلٹا ہاتھ مارا۔

"بزدلو... ہتھیار اور عورت بزدلوں کا ساتھ نہیں دیتیں۔ تم اُسے اگر ٹکڑے ٹکڑے کر دو گے، تب بھی اُس کا ہمرگڑا اس نوجوان کے نام پر تڑپے گا... جاؤ بھاگ جاؤ۔"

"ہم اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" اُن کا لیڈر غرایا۔

"میں کہتا ہوں یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" رنگ باز نے ہاتھ اُٹھایا اور وہ تینوں لڑکھڑاتے ہوئے چل پڑے۔

"میرے ساتھ آؤ بہادر لڑکے... مجھے تم نے آج اچھی فائٹ دکھائی ہے۔"

"شکریہ..." میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "ان گیدڑوں نے میرا پروگرام خراب کر دیا ہے۔ میں..."

"نہیں میری جان قدردانوں سے ایسا سلوک نہیں کیا کرتے۔" اُس نے پھر میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

اچھی فائٹ اور اچھی داری کے نام پر میرے ساتھ ایک کپ چائے پیو۔"

ہوٹل میں موجود لوگ، ویٹر اور کاؤنٹر کلرک ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ جب میں رنگ باز کے آفس میں داخل ہوا تو اُس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازہ بند کر کے پردہ گرا دیا۔

"بیٹھو عزیزم۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ نسلاً پٹھان ہے، لیکن اُس کی زبان بڑی شستہ اور صاف تھی۔ میں سوچنے لگا کہیں ساری محنت ضائع تو نہیں ہو گئی۔ یہ شخص اُس کا منیجر بھی ہو سکتا ہے۔

"سگریٹ...؟" اُس نے تھری کیسل کا ٹن نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"میں اپنا برانڈ پسند کرتا ہوں۔" میں نے بے رُخی سے ٹن واپس کر دیا۔

اُس نے کال بیل بجائی اور ایک کاؤنٹر کلرک اندر آ گیا۔

"چائے اور ساتھ بھی کچھ..." رنگ باز نے اُسے آرڈر دیا۔ "اور اندر کوئی نہ آئے، ہاں... وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"وہ... جناب جھگڑا شروع ہوتے ہی یہاں سے نکل گئی تھی۔" کلرک نے بتایا۔

"کاش میں تمہیں دوست کہہ سکتا۔" وہ بے قرار سی آواز میں بولا۔

"دوست کہنا اور دوست بن کر رہنا الگ الگ جذبے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں کسی کو دوست کہتا ہوں نہ بناتا ہوں، دشمن کو دشمنی سامنے ہوتی ہے لیکن دوست کی دشمنی زخم کھا کر معلوم ہوتی ہے۔"

"خوب..." اُس کی کرنجی آنکھوں میں تحسین اُبھرنے لگی۔ "کیا کام کرتے ہو؟"

"آوارہ گردی..."

"مقامی ہو...؟"

"کبھی تھا..."

"اب...؟" وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا۔ "صاف صاف بات کرو نوجوان۔ میں تمہارے لیے بڑے نرم جذبات محسوس کر رہا ہوں۔"

"میں بانگ کانگ سے آیا ہوں۔"

"بزنس ٹور...؟" اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

"نہیں..." میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے والد کو قتل کر دیا گیا ہے، میں قاتل کی تلاش میں آیا ہوں۔"

"کچھ سُراغ ملا؟"

"ابھی نہیں..." میں نے جواب دیا۔ "یہ لوگ بکواس کر رہے تھے۔ میں اُس لڑکی کو جانتا تک نہیں، جو میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔ یقیناً اُسی قاتل نے میرے پیچھے غُنڈے لگا دیے ہیں۔"

"اوں..." وہ سوچنے لگا۔ "کوئی چوٹی ہے، جو میدان میں نہیں آتا۔ اچھا یہ بتاؤ۔ وہاں کیا کرتے تھے؟"

"کوئی اچھا کام نہ تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ شہر ایسا ہی ہے۔"

"میری ایک پیشکش قبول کرو گے، نوجوان؟" وہ اچانک آواز میں بولا۔ "میں کوئی رحم دل انسان نہیں ہوں۔ اس لیے اس پیشکش کی بنیاد کسی ایسے جذبے پر نہ ہو گی۔ یہ ایک طرح کا دو طرفہ معاہدہ ہو گا۔ مجھے تم جیسے بانکے سجیلے اور جی دار نوجوان کی ضرورت ہے اور تمہیں اپنے باپ کے قاتل کی تلاش ہے۔ میرے پاس وسائل ہیں۔ میں کسی چیونٹی کو بھی بل سے نکال سکتا ہوں۔"

"کیا ہوٹل میں مجھے ویٹر رکھنا چاہتے ہو؟" میں نے سرد اور غراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اوہ..." وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "نہیں نوجوان، رنگ باز احمق ہے نہ خوش فہم ہے۔ میں جانتا ہوں تم جیسے نوجوان سے مانگ کانگ میں کیا کام لیا جاتا رہا ہو گا؟"

"نہیں..." میں تڑخ کر بولا۔ "میں کسی کا گرگا نہیں رہا۔ میرا اپنا گروہ تھا۔"

"میں یقین کر سکتا ہوں لڑکے۔" وہ سگریٹ بجھاتے ہوئے بولا۔ "میری جوہر شناس نگاہوں نے تمہیں اچھی طرح پرکھ، پہچان لیا ہے۔ تم بلاشبہ کسی گروہ کے گریڈ ماسٹر ہی ہو سکتے ہو۔ اِدھر بھی میں تمہاری قدر کروں گا، دوست سے تم ارجک ہو، میں ساتھی کہوں گا۔ میرے ساتھ رہو، ماتحت بن کر نہیں بلکہ ساتھی بن کر۔ جس دن تمہیں محسوس ہوا کہ رنگ باز خان نے تمہیں پہچاننے میں ٹھوکر کھائی ہے، میرے مُنہ پر تھوک کر الگ ہو جانا۔"

"کام بتاؤ، خان...؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"میں دوسرے تیسرے درجے کی غُنڈہ گردی اور ہنگ آمیز کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میری تربیت بین الاقوامی شہرت یافتہ ماسٹروں نے کی ہے، یہ بے شک میرا مُلک ہے، لیکن میں اب اس مُلک کے لیے فٹ نہیں ہوں۔"

"تمہیں وہی عزت، شہرت، مقام اور کام دیا جائے گا، نوجوان۔ جسے تم یقیناً پسند کرو گے۔"

"اگر ایسا ہو تو میں یہاں کچھ مدت رہنے کے بارے میں سوچ... سکتا ہوں۔"

"شکریہ..." وہ بھرکتی آواز میں بولا۔ "لیکن کام کی نوعیت میں فی الحال تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ میرے بھی کچھ اصول ہیں... اور بزنس کی مجبوریاں ہیں۔"

اسی اثنا میں چائے اور بسکٹ آ گئے۔ رنگ باز نے ویٹر کو واپس کر دیا تھا۔ میں نے چائے کی دو پیالیاں تیار کیں، ایک پیالی اُس کے سامنے رکھ دی۔

"فی الحال بحیثیت باڈی گارڈ دیسرے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟"

"بات پھر وہی ماتحتی کی آتی ہے، خان۔" میں نے پُردرد آواز میں کہا۔ "اور میرا مزاج ایسا نہیں ہے۔"

"کیا محافظ ماتحت ہوتا ہے؟"

"بشرطیکہ پیڈسرونٹ نہ ہو۔"

"میں نے کوئی معاوضہ مقرر تو نہیں کیا۔"

"ٹھیک ہے خان۔ ایک تجربہ ہی سہی۔" میں نے حتمی فیصلہ سُنا دیا۔

"شکریہ..." اُس نے اپنا چوڑا ہاتھ بڑھایا۔ "اشتراک کے نام..." اور میں نے گرم جوشی سے اُس کا ہاتھ پنجے میں لے کر دبایا۔

جب چائے سے فارغ ہوتے تو اُس نے واسکٹ کی جیب سے گھڑی نکال کر دیکھا۔

"نام نہیں بتاؤ گے؟" وہ نرم اور پیار سے بولا۔ "اصل نہ سہی..."

"محترم سلطان چوہدری..." میں نے بانگ کانگ کا بنا ہوا شناختی کارڈ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اصل نام بتانے کا مقصد یہی تھا کہ رنگ باز خان کو یقیناً میرے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اس کارڈ پر میرے گھر کا پتہ بھی درج تھا۔

اُس نے ایک منٹ کارڈ پر نگاہیں جمائے رکھی تھیں، غالباً وہ میرے کوائف ذہن میں نقش کر رہا تھا۔ پھر اُس نے کارڈ مجھے واپس کر دیا۔

"آؤ چلیں..." وہ اُٹھتے ہوئے بولا اور پلٹ کر دیوار گیر الماری کھولنے لگا۔ نچلے خانے سے اُس نے ایک چھوٹا سا پستول نکال کر میز پر رکھا... اور میری جانب دیکھا۔

"شکریہ خان..." میں نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ "میں ہتھیاروں پر کم اور ہاتھ پاؤں پر زیادہ اعتماد رکھتا ہوں۔"

"میری طرف سے پہلا تحفہ..." وہ مسکرایا اور میں نے جُھک کر پستول اُٹھا لیا اور بغیر دیکھے جیب میں لڑھکا دیا۔

باہر شیشے کے دروازے کے ساتھ سیاہ مرسیڈیز کھڑی تھی، حالانکہ جب میں داخل ہوا تھا تو وہاں کار نہ تھی۔ ایک نوجوان نے پک کر کار کا دروازہ کھولا... اور رنگ باز نے میری پُشت پر ہاتھ رکھ کر مجھے بیٹھنے کا اشارا کیا۔

"ڈرائیونگ جانتے ہو نا؟" جونہی کار گیٹ سے نکلی اُس نے پوچھا۔

"کام چلا لیتا ہوں۔" میں نے سرسری جواب دیا۔

کار ایک بڑے گیٹ سے گزرتی ہوئی ایک وسیع و عریض کوٹھی کے پورچ میں رُکی تھی۔ ڈرائیور نے باہر نکل کر دروازہ کھولا۔ میں اپنی سمت کے دروازے سے نکل کر اطراف کا جائزہ لینے لگا... وہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ میں نے گراسی لان، کیاریوں میں کھلے ہوئے پھول اور لان کے درمیان چھوٹا سا سوئمنگ پول دیکھا تھا۔

رنگ باز خان جس کمرے میں داخل ہوا وہ ڈائننگ ہال تھا، وسیع و عریض ڈائننگ ٹیبل پر چھوٹے برتن بکھرے ہوئے تھے، برتنوں کی تعداد سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ چار آدمیوں نے کھانا کھایا ہو گا؟

رنگ باز نے ٹیبل کے پائے پر نصب برقی بٹن دبایا اور بولا۔

"ڈنر صاف کرنے کی رف بیل بجا دو۔" قدموں کی چاپ اُبھری۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

"بیٹے ایک معتبر مہمان ہے، جو ہمیں لے آؤ، ہمیں واپس جانا ہے۔"

"بہتر ڈیڈی..." جلترنگ بجا اور میں نے خود کو پلٹ کر دیکھنے سے بمشکل باز رکھا تھا۔ وہ آواز میری رگوں میں سنسنی دوڑا گئی تھی۔

"ہماری ملازمہ بیمار ہے۔" رنگ باز نے بتایا۔ "بیٹیاں مل جل کر کھانا تیار کرتی ہیں۔"

میں صرف آنکھیں جھپکا کر رہ گیا... اُس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں کُہنیاں ٹیبل کی سطح کے اندر اپنے چہرے کا دُھندلا دُھندلا عکس دیکھتا رہا تھا۔

مجھے یہ معلوم کر کے تھوڑا سا دُکھ ہوا تھا کہ رنگ باز خان ایک خاندان رکھتا ہے، جس میں معصوم بیٹیاں بھی ہیں۔ میں نے اُدھر مند ناؤ میں بھی ایک جوان بیٹی کے باپ کو ہلاک کر کے دل پر جبر کیا تھا۔ چنگ چی کی بھی ایک بیٹی تھی لیکن چنگ چی جیسے باپ کو اندھیرتے وقت مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوا تھا کیونکہ اُس کی بیٹی بھی ناگن جتنی زہریلی اور پھرتیلی تھی۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں، خان؟"

"بس تین، ایک بیٹا ہے، جسے میڈیکل لائن میں لگا دیا ہے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی اس سال ایم اے کرے گی اور چھوٹی ایف اے میں ہے۔" خان نے میرے دُکھ کو ایک دم کم کر دیا تھا۔ کوئی بچہ اتنا کم سن نہ تھا کہ باپ کے بغیر چل نہ سکتا۔

وہ اندر آئی، چونکہ میں دروازے کی طرف پُشت کیے بیٹھا تھا اس لیے اُس نے میرے دائیں پہلو میں رُک کر ٹرے ٹیبل پر رکھ دی۔ پھر جب وہ پلیٹیں رکھنے لگی تو گول گول کلائیاں بھی میری آنکھوں کے سامنے آ گئی تھیں۔ اُس نے راڈو گھڑی باندھی ہوئی تھی۔ پھر میں نے نگاہوں کا زاویہ ہی بدل لیا، لیکن ناک کیسے بند کرتا؟ اُس کے لباس سے پھوٹتی ہوئی عنبر بُو کی لپٹیں پریشان کرنے لگی تھیں، تب میں نے بے سوچے اور بالکل غیر ارادی طور پر چہرہ گھمایا اور اُس حُسن بے مثال کو دیکھ کر میرے سارے ارادے ریت کے گھروندوں کی طرح بیٹھنے لگے تھے۔ اُس وقت رنگ باز خان باتھ رُوم میں تھا اور میں دو نیلی جھیلوں میں ڈوب گیا تھا۔

اُس کے پاس رنگ تھا، سُنہرے بال تھے، لیکن سب کی سرداری آنکھوں کے پاس تھی، اُس کی آنکھوں کا رنگ ایک نہ تھا، جس طرح شفق کا کوئی رنگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ نہ تو نیلی تھیں، نہ بھوری اور نہ سیاہ، تینوں رنگوں نے مل کر آنکھوں کو جادو اثر بنا دیا تھا، جونہی باتھ کا دروازہ کھلا اُس کی لانبی لانبی پلکوں کے چلمن بھی گر گئے۔

لڑکیوں کے معاملے میں میں ہمیشہ ہی عجیب اور متضاد کیفیت کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکار ہوتا رہا ہوں۔ میں اُس دُرسے، سہمے بچے کی مانند رہا ہوں، جو روشن شوکیس میں سجے ہوئے خوش رنگ اور من موہ لینے والے کھلونے کو دیکھ کر ایک دم مچل کر پھر اس خوف سے مبہوت سا ہو جاتا ہے کہ اُس کے ہاتھوں کے لمس سے شوکیس کا شفاف اور نازک شیشہ میلا نہ ہو جائے، تڑخ نہ جائے۔ یہ کوئی نفسیاتی گرہ تھی یا احساسِ گناہ کا راسخ یقین تھا، جسے میں نہ تو ہیلا کرنا چاہتا تھا نہ اُس میں کوئی خراش لگانا پسند کرتا تھا۔

پھر اگر وہ جلدی ہٹ نہ جاتی تو خان میری کمزوری پہلے ہی دن پکڑ لیتا اور میری ساری اکڑفوں بھاگ کی طرح ہوا میں اُڑا دیتا۔ میں نے خود کو اتنا ہی اکھڑا اور تند خو پوز کیا تھا۔

کھانا کیسا تھا، کھانے میں کیا کیا شامل تھا، مجھے کچھ یاد نہیں۔ میرے ہاتھ، مُنہ اور حلق بالکل مشینی انداز میں کام کرتے رہے تھے۔ ذائقوں کا تعلق تو ذہن اور سوچ سے ہوتا ہے۔ میں تو اُس لڑکی کی آنکھوں میں ڈوبتا، اُبھرتا اور اُسے ہی سوچتا رہا تھا۔

میں دعائیں مانگتا ہوا ٹیبل سے اُٹھا تھا کہ دشمنِ ہوش پھر سامنے نہ آ جائے۔ خان نے کسی کو آواز نہیں دی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل سے اُٹھ کر سیدھا کار میں جا بیٹھا تھا۔ جب کار شہر سے نکل کر مضافاتی علاقے میں داخل ہوئی تو میں نے سوچا... خان مجھے گودام میں مل دکھا کر حیرت زدہ کرنا چاہتا ہوگا اور میری نگاہوں میں اپنی ذات کا قد پست کروانا چاہے گا۔ میں نے جو کچھ اُسے بتایا تھا اندر اُس کی آنکھوں نے جتنا کچھ میری ذات میں دیکھا تھا، اُس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ بھی جوابی کارروائی کر کے مجھے مطمئن کرے۔

اندازہ یہی تھا کہ ہمیں کلومیٹر چل کر اُس نے پختہ سڑک پر کار لگوا دی تھی۔ اطراف میں چھدرے درخت اور جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ ایک ٹیکری پر چراغوں جیسی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں، سڑک کے دائیں جانب کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

"ریشم جان...؟" اُس نے ڈرائیور کو مخاطب کیا "تم حسبِ سابق یہاں آدھ گھنٹہ رُکو گے اور کسی بھی غیر معمولی حرکت کی اطلاع مجھے بذریعہ ٹرانسمیٹر دو گے۔"

ڈرائیور نے صرف سر کو اثباتی جنبش دی۔

"آؤ خرّم سلطان..." وہ میرا ہاتھ تھام کر اندھیرے میں اُتر گیا۔ "میرے آگے آگے چلو گے، راستہ میں بتاتا جاؤں گا۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "کیوں خرّم سلطان غیر آزمودہ شریکِ کار کے معاملے میں یہ احتیاط تمہیں ناگوار تو نہیں گزرے گی؟"

"خان..." میں سرسراتی آواز میں بولا "اگر ٹانگ اُٹھانا چاہتے ہو تو ہاتھ میں ریوالور بھی لے لو اور مجھے آگے چلاؤ۔ پھر دیکھنا کہ خرّم سلطان کا آگا، پیچھا ایک جیسا ہے۔ یہ لو اپنا ٹھنڈا..." میں نے جیب سے اُس کا دیا ہوا چھوٹا سا پستول نکال کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا "اور میری تلاشی لے لو۔"

"لڑکے لڑکے..." وہ میرے ہاتھوں کو زور زور سے بھینچنے لگا۔ "مجھے اب بہت زیادہ حیرتوں میں نہ ڈالو۔ تم پہلی ہی حیرت انگیز ہو، لیکن میں کسی خانقاہ کا مجاور نہیں ہوں، میرے اردگرد قانون اور رقابتوں کے ناگ پھنکارتے رہتے ہیں، میرے سامنے راستوں پر جال پھیلائے جاتے ہیں، گڑھے کھود دیے جاتے ہیں، کیا یہ میرا حق نہیں بنتا کہ اجنبی نوجوان کو کسوٹی پر پرکھوں کہ کہیں ذہین رنگ دام ہی نہ ہو؟"

"ہاں خان، اگر ایسی بات ہے تو میں اصیل گائے کی طرح تمہارے ساتھ چلوں گا۔" میں آگے آگے چل پڑا۔ اندھیرے میں چند منٹ رُکنے اور چلنے کے بعد آنکھیں کچے راستے سے مانوس ہو گئی تھیں... اندھیرے میں جھاڑیوں کے درمیان وہ کچا راستہ میلی چادر کی طرح بچھا ہوا تھا۔

ٹیکری پر کوئی دیہات تھا، لیکن چند گھروں کی آبادی تھی جس کی کوئی گلی نہ تھی، وہی راستہ ہمیں ایک چوبی ٹک لے گیا تھا۔ رنگ باز نے تین بار دستک دی۔ اندر سے دو کتے بھونکنے لگے تھے۔ پھر کواڑوں کی درزوں سے لالٹین کی روشنی دکھائی دی اور کواڑ کھل گئے۔

سامنے ایک نوجوان لڑکی سیاہ شال میں لپٹی کھڑی تھی۔ اُس نے لالٹین والا ہاتھ اُوپر کر کے خان کے شانے سے اُبھرا ہوا میرا چہرہ دیکھا اور ایک دم اوٹ میں ہو گئی "اندر چلے جائیں، خان چاچا بیمار ہے۔"

"شیر کہاں ہے؟" خان نے پوچھا

"ابھی باڑے کی طرف گیا ہے۔" لڑکی نے جواب دیا "بی بی کے ساتھ لے جائیں اندر..."

"آؤ خرّم سلطان۔" رنگ باز نے سرگوشیانہ آواز میں کہا اور اندر داخل ہو کر اُس نے لالٹین اُٹھائی۔ میں نے داخل ہو کر دیکھا کہ لڑکی دیوار کے ساتھ چند قدم دُور مغربی حصے کی جانب جا رہی تھی۔

کتے نصیاں تڑا رہے تھے۔ خان نے حلق سے عجیب آواز نکالی اور دونوں کتے خاموش ہو گئے، ٹوہلی کے اندر قطار میں چار کمرے تھے۔ خان پہلے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص پہلو کے بل نیم دراز حقے کی نے ہونٹوں میں دبائے ناک سے دُھواں خارج کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے، کرم خان؟" خان نے بُوڑھے کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔ "بخار تو نہیں..."

"بیٹھو خان..." وہ لیٹے لیٹے بولا "ذرا ٹھنڈ لگ گئی ہے، تیرے ساتھ مہمان کون ہے؟"

"اپنا ہی بندہ ہے، کرم خان۔" خان نے جواب دیا "کچھ دن یہاں

رہے گا۔"

بُوڑھے نے تیز تیز تین کش لیے اور پھر میری جانب دیکھا۔

"خطرناک ہتھیار ادھر نہ لایا کرو خان۔"

رنگ باز نے قہقہہ لگایا "کرم خان، یہ چلا ہوا کارتوس ہے اور پھر جس گھر میں شیر خان جیسا بم موجود ہو، تمہیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"پہاڑ اُڑانے والا بارود اور تار دیکھا ہے، تو نے خان۔" کرم خان کش لگا کر بولا "تار کے سرے کو آگ کا شعلہ جب مل جاتا ہے تو دیکھنے والی آنکھیں آگ کے سفر کو نہیں دیکھ سکتیں، پتہ تب چلتا ہے، جب دھماکا ہو جاتا ہے اور بڑی بڑی چٹانیں اُڑ جاتی ہیں، یہ ہتھیار ایسا ہی ہے، خان..."

سیاہ شال میں لپٹا ہوا طویل سایہ دروازے سے گزرا تو کرم خان نے اُدھر چونک کر دیکھا تھا۔ کرم خان کا شمار یقیناً اُن دانا ؤں میں تھا۔ جو ہر گاؤں کے نصیب میں ہوتے ہیں اور جن کی دانش مندانہ باتوں کی خوشبو گاؤں کی آن کے جسم کے گرد چادر کی طرح لپٹی رہتی ہے۔

وہ جانتا تھا کہ پھول اور خوشبو کو ایک صحن میں خانوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ شمع روشن ہو اور پروانے کی اُڑان پر پہرہ لگایا جائے یہ ممکن نہیں تھا۔

دھرتی کا سینہ دھڑکتا ہوا کوئی آ رہا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا لیکن نام کے حوالے سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آنے والا بلا ڈگ کے چہرے والا دیو قامت شیر خان تھا، اُس کے بازو غیر معمولی طویل تھے اور پنجے چھاج کی طرح چوڑے اور مُڑے ہوئے تھے۔ اُس نے کاندھے سے تبر اُتار کر دیوار کے ساتھ رکھ دی۔

"ان سے ملو، شیر خان۔" رنگ باز نے میری پُشت سہلاتے ہوئے کہا "یہ ہماری ٹیم کا نیا اور بہت ماہر کھلاڑی ہے۔" شیر خان کے دونوں چھاج میری طرف بڑھے، میرا ہاتھ اُس نے ایسے دبوچ لیا تھا، جیسے کسی بچے کا ننھا سا ہاتھ ہو۔

"کس پنڈ کے ہو، دوست؟" اُس نے پوچھا اور میں نے اپنے گاؤں کا نام بتا دیا۔

"اچھا، اچھا... اپنے چوہدری رحمتے کے گرائیں ہو۔"

"ہاں وہ رشتے میں میرا بھائی ہے، تائے کا لڑکا۔"

"خرّم سلطان..." خان بے حد پیار سے بولا "میں دور دنیا باہر رہوں گا، بزنس ٹور رہے، تم شیر خان کے ساتھ رہو گے، میں تمہیں اپنے گھر چھوڑتا، لیکن میں بزنس اور خاندان کو الگ الگ رکھتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے، تم بُرا محسوس نہ کرو گے، یہ بھی میرا ہی گھر ہے۔ بزنس کا ہیڈ کوارٹر کوئی بات نہیں، خان..." میں نے بھی نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا "میں شیر خان کے ساتھ اچھا وقت گزاروں گا۔"

"شکریہ..." رنگ باز خان مسکرانے لگا "شیر خان جاؤ، اپنے دوست کو کمرہ دکھاؤ۔"

"کمرہ نمبر خان..." شیر خان نے میرا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"وہی جس میں میرے خاص مہمان قیام کرتے ہیں۔" خان نے جواب دیا "چلو میں بھی چلتا ہوں۔"

قطار میں وہ آخری کمرہ تھا۔ لالٹین شیر خان نے اُٹھا رکھی تھی۔ رنگ باز نے واسکٹ کی جیب سے چابیاں نکال کر ٹرائی سرکل تالا کھولا اور کواڑ چرچراتے ہوئے... کھل گئے۔ پہلے شیر خان اندر داخل ہوا۔

کمرے میں صرف ایک سُرخ پایوں والی چارپائی تھی اور صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ رنگ باز خان دروازے میں ہی رُک گیا تھا۔ شیر خان کونے میں رکھا ٹیبل لیمپ لینے آگے بڑھ گیا تھا۔

"خرّم سلطان..." رنگ باز بولا "تم آرام کرو تاکہ میں اطمینان سے واپس جاؤں۔"

"جاؤ خان..." میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

معاً رنگ باز خان نے پلٹ کر دیوار میں لگا ہوا لوہے کا کڑا کھینچا اور مجھے زوردار جھٹکا لگا اور میں چارپائی سمیت تاریکیوں میں ڈُوبتا چلا گیا تھا۔ ٹک وٹبچے کی بات دستی، جو ہوا تھا وہ نورِ روشن کی طرح تب بھی میرے ذہن میں عیاں تھا، جب میں گر رہا تھا۔ میں نے چارپائی کی پٹی مضبوطی سے پکڑ لی تھی تاکہ نیچے فرش پر گرنے سے محفوظ رہوں، لیکن چارپائی کسی اٹن کھٹولے کی طرح آہستہ آہستہ اُترتی زمین پر ٹک گئی تھی۔ چاروں طرف گھُپ تاریکی تھی۔

پھر روشنی در آئی، لالٹین رسّی سے بندھی نیچے آ رہی تھی۔

"خرّم سلطان..." رنگ باز کی آواز تہ خانے میں ایسے اُتری، جیسے کوئی درندہ کچھار میں عزا رہا ہو۔ "میں تم سے کوئی معذرت طلب نہیں کروں گا۔ یہ کارروائی ناگزیر تھی، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں درندوں، ناگوں اور دُشمنوں میں گھرا ہوا شخص ہوں، ہر کوئی رُوپ بدل بدل کر آتا رہا ہے۔ اگر تم وہی ثابت ہوئے، جو تم نے بتایا ہے تو میں تمہارے پیر پکڑ کر بھی تمہیں راضی کروں گا، بصورتِ دیگر تمہاری لاش اُوپر آئے گی۔ اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں کہ تم میرے بزنس ہیڈ کوارٹر سے آگاہ ہو چکے ہو، میں اپنے وسائل سے تمہارا اصل چہرہ بہت جلد دیکھ لوں گا۔ میرے ہاتھ ہانگ کانگ تک بھی جائیں گے۔ تمہیں یہاں موت یا دوستی کی تجدید تک کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ آرام کرو۔ زیادہ دن تمہیں انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لکڑی کا جھولتا ہوا تختہ اوپر اٹھنے لگا اور پھر بند ہو گیا، بالفاظِ دیگر خرم سلطان چوہدری کا باہر کی دُنیا سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

مجھے حیرت ہوئی تھی نہ کوئی صدمہ ہوا تھا۔ میرے ساتھ یہ پہلا مذاق نہ تھا، پہلی ضرب نہ تھی، درخت سے چوٹ کھا کر جدا ہو جاتا ہے، اُسے ہوا کے جھونکے اور راہگیروں کی ٹھوکروں کے سوا اور کیا مل سکتا ہے؟

میرے سامنے دو راستے تھے، ایک سلامتی اور کامیابی کا، دوسرا موت کا۔ اگر رنگ باز خان تحقیق کی ابتدا میرے گھر سے شروع کرتا تو میرا بیان صداقت پر مُہر ثبت کرتا چلا جاتا۔ میں نے اپنے کوائف میں دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تھا۔ اگر وہ گھر سے چلتا، میرے نقشِ پا کی بُو سُونگھتا ہوا ڈانگ کانگ جاتا تو بھی رپورٹ میرے حق میں ہی جاتی، مجھے صرف خطرہ پولیس کی کسی کاہی بھیڑ سے تھا۔ آئی جی صاحب نے ایس پی کینٹ کو میرے لیے رہائش کا انتظام کرنے پر مقرر کیا تھا، اگر نام لے کر حکم دیا گیا تھا تو ایس پی نے خود کو بھی تلاش نہ کی ہو گی۔ اُس نے اپنے کسی ماتحت کو حکم دیا ہو گا اور ماتحت نے آگے اپنے ماتحت سے کام لیا ہو گا۔ کسی برزگر سے بات کی ہو گی اور اُن گڑیوں میں کالی بھیڑ بھی ہو سکتی تھی۔ رنگ باز خان کو یقیناً پولیس کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے تھا... وہ اپنے ہمدردوں سے خرم سلطان نام کے کسی شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تو پھر کڑیاں جوڑنا، اُس کے لیے مشکل نہ ہوتی۔

میں نے نہ خانے میں گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ چاروں دیواریں مٹی کی تھیں، کدالوں کے نشان ظاہر کرتے تھے کہ زمین کھود کر تہ خانہ بنایا گیا ہے۔ لہٰذا کسی دیوار میں نقب لگانے کا خیال ہی خارج از امکان تھا۔ وہ سوراخ جو تختے سے بند تھا، وہ اتنا اُونچا تھا کہ اگر تین چار چارپائیاں بھی کھڑی کر دی جائیں تو اُوپر جانا ممکن نہ تھا۔

تہ خانہ یقیناً چار کمروں کی لمبائی چوڑائی کے برابر رہا ہو گا۔ مغربی دیوار کے ساتھ چند لکڑی کی پیٹیاں پڑی ہوئی تھیں اُوپر شہتیاں جڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ناک لگا کر سُونگھا، جانی پہچانی بُو تھی۔ پیٹیوں میں بلاشبہ منشیات کا مال تھا۔ ایک طرف چوکور ڈبے بھی قطاروں میں کھڑے تھے، ڈبوں میں ہیروئن کا پاؤڈر تھا، ہر ڈبے کا وزن ایک کلو سے کم نہ رہا ہو گا۔

ایک لوہے کی الماری تھی، میں نے اپنا خفیہ دیوالور نکال کر تالے کے سوراخ پر نال رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ مجھے یہ تو خطرہ نہ تھا کہ دھماکے کی آواز کوئی سُن لے گا، کیونکہ میں چوری چھپے تہ خانے میں داخل نہیں ہوا تھا، شیر خان اُوپر ہی دھاڑ سکتا تھا۔

الماری کا پٹ کھولا تو میری سانس رُک گئی تھی، حالانکہ اصل مال تو ہیروئن کے ڈبوں میں دیکھ کر میرے چہرے پر حیرت کی شکن تک نہ اُبھری تھی، لیکن کرنسی کی گڈیاں دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ تین خانوں میں گڈیاں بڑے سلیقے سے چُنی ہوئی تھیں پہلے خانے میں ٹکی کرنسی تھی، سو اور پچاس کے نوٹ تھے، دوسرے میں افغانی نوٹ تھے اور تیسرے میں انڈیا کی کرنسی تھی۔ افغانی اور ٹکی کرنسی کی موجودگی تو سمجھ میں آتی تھی کہ ایک کرنسی سے مال خریدا جاتا ہو گا اور دوسری سے فروخت ہوتا ہو گا، مگر انڈیا کی کرنسی کی ضرورت اور موجودگی باعثِ حیرت تھی، مالیت لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں تھی۔ یہ وہ کالا دھن تھا جس سے ایک طرف گھناؤنا کاروبار جاری تھا اور دوسری طرف وہ انکم ٹیکس کی چوری کر رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ خبر لینے شیر خان تک گا، لیکن کوئی بھی نہیں آیا تھا... جیسے تہ خانہ ساؤنڈ پروف تھا۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ باغی ٹوٹا، صابن اور تولیہ سوراخ کے عین نیچے فرش پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے مُنہ ہاتھ دھویا اور ناشتے کا انتظار کرنے لگا۔

ٹھیک چھ بجے اُوپر تین مربع فٹ روشنی دکھائی دی میں دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا، اُوپر شیر خان کا کریہہ چہرہ دکھائی دیا۔ وہ ناشتے کا سامان چھوٹے سے ٹب میں رکھ رہا تھا۔

"ہیلو دوست" میں نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ "آج کی صبح کیسی ہے؟"

"رات تم نے کس پر فائر کیا تھا؟ خرم سلطان؟"

"اوہ... شاید چوہا تھا۔ میں ہنس پڑا۔ میں وہم پرست ہوں بس ڈر گیا تھا۔"

"مجھے یقین ہے، تم کوئی مزید حماقت نہیں کرو گے۔" شیر خان ٹب نیچے لٹکاتے ہوئے بولا۔ "میں تم سے نہیں ڈرتا، حالانکہ تم مجھے گولی مار سکتے ہو، لیکن میری موت تمہیں کوئی سہارا نہیں دے سکتی۔"

"ارے نہیں شیر خان۔" میں نے جواب دیا۔ "خان تو کاروباری آدمی ہے، آج یہاں کل نہ جانے کہاں ہو گا؟ ہم کو تو اسی علاقے میں رہنا ہے، پھر ہماری دُشمنی بھی تو نہیں..."

"تم ٹھیک کہتے ہو چوہدری۔" وہ بولا... اور میں نے ٹب سے کیتلی، مگ، انڈے اور پراٹھے نکال لیے۔ میں نے محتاط نگاہوں سے اندازہ لگایا تھا شیر خان بے حد چوکنا تھا۔ اُس نے رسّی ایسے انداز میں پکڑی ہوئی تھی۔ اگر میں جھپٹا مارتا تو وہ ایک دم رسّی چھوڑ سکتا تھا۔

میں نے ناشتہ کیا اور برتن اُٹھا کر ٹب میں رکھ دیے۔ شیر خان نے جاتے وقت یہی ہدایت دی تھی، دوپہر کا کھانا بھی وہی دینے آیا تھا اور خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔

تیسری رات میں گیارہ بجے تک کھانے کا انتظار کرتا رہا، حالانکہ ہر رات آٹھ نو بجے تک شیر خان کھانا دے جاتا تھا۔ پھر دس بجے دودھ کا گلاس اُتارا جاتا تھا۔

میں نے سوچا تھا شاید آج رنگ باز خان فیصلے کی گھڑی لے کر آ رہا ہو گا۔ میں مایوس ہو کر سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ مانوس آواز سُنائی دی کوئی اُوپر آیا تھا۔ پھر جانی پہچانی ٹرے نمودار ہوئی۔ میں ٹرے لینے جب نیچے گیا تو وہ چہرہ شیر خان کا نہ تھا، سوراخ سے ایک خوب صورت چہرہ جھانک رہا تھا۔

"شیر خان کہاں ہے، خالون؟" میں نے پوچھا۔

"وہ شہر گیا تھا، ابھی واپس نہیں آیا۔" اُس نے چہرہ ایک دم جُھکا لیا۔ "میں انتظار کرتی رہی۔"

ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے برتن ٹب میں تھے، میرے ذہن میں ایک خیال کوندا اور میں نے پانی کی بھری ہوئی بالٹی بھی ٹب میں رکھ دی اور ٹب کے کُنڈے میں رسّی باندھ کر اُوپر اُٹھائی۔ "میں نے ٹرے کی رسّی ٹب کے کُنڈوں میں باندھتے ہوئے کہا۔ اُس نے جھک کر دیکھا اور ٹب اُٹھانے کے لیے رسّی کھینچی، لیکن ٹب ایک انچ بھی اُوپر نہ اُٹھا تھا۔

"برتن بہت ہیں بہن جی۔ رسّی کو ہاتھ پر بَل دے کر کھینچیں۔"

اُس نے میری ہدایت پر رسّی کو دائیں ہاتھ پر لپیٹ لیا۔ میں مزید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ جونہی جھکی میں نے رسّی کو زوردار جھٹکا دیا، وہ سر کے بَل سوراخ سے اندر گرتی چلی آئی اور میں نے اُسے دونوں ہاتھوں پر سنبھال کر نیچے رکھ دیا۔

"آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔" میں نے نرم آواز میں کہا۔ "میں نے آپ کو بہن کہا ہے۔"

"آپ نے مجھے جان بُوجھ کر گرایا ہے۔" وہ بھوکی شیرنی کی طرح دہاڑتی ہوئی اُٹھی اور میں نے ہاتھوں پر اُسے روک کر دُور اُچھال دیا۔

"میری اچھی بہن میری بات سُن لو۔" میں نے پلٹ کر جھکائی دے کر آگے جانے دیا۔ اُس نے جھک کر جگ اُٹھانا چاہا اور میں نے لات مار کر جگ کو اُس کے ہاتھوں سے دُور کر دیا۔ "ہاں میں نے جان بُوجھ کر تمہیں گرایا ہے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہیں بطور یرغمالی استعمال کروں گا۔ یہ قیدی کو دیا جاتا ہے۔"

"وہ... وہ..." اُس نے رونا شروع کر دیا۔ "یقین کرو، وہ مجھے مار دے گا۔ اُس نے منع کیا تھا۔ میں خود کو روک نہ سکی، مجھے تمہارا خیال ستا رہا تھا کہ تم بھوکے ہو گے؟"

"میں اُسے مجبور کر دوں گا۔ مجھ پر بھروسہ کرو بہن۔ میں تب یہاں سے اُوپر جاؤں گا جب تمہاری سلامتی اور زندگی کی بابت ثوق ضمانت حاصل کر لوں گا۔"

"نہیں اجنبی..." وہ سسک کر بولی۔ "شیر خان انسان کے روپ میں درندہ ہے۔ جب تم چلے جاؤ گے، خدا کرے تم یہاں سے نکل جاؤ تو پھر وہ مجھے پھاڑ کھائے گا۔"

"آؤ ہم بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" میں نے ٹرے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ اور وہ میرے ساتھ چل پڑی۔

اُس نے شال سے بھیگا ہوا چہرہ صاف کیا اور جب میں چارپائی پر بیٹھا تو وہ قریب کھڑی ہو گئی۔ میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارا کیا، وہ پٹی پر کُرسی بیٹھ گئی۔

"آرام سے بیٹھو اور مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" میں نے نوالہ بناتے ہوئے کہا۔ "شیر خان کون ہے اور اُس سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟"

"میں ایک کرم جلی عورت ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی... "رنگ باز نے مجھے لاہور کی آگ میں جلا دیا ہے۔ میں اُس کا مال سپلائی کرتی تھی اور پھر پولیس میرے پیچھے پڑ گئی تو خان مجھے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ میں بھی تمہاری طرح قیدی ہوں، آزاد ہونے کے باوجود اس حویلی سے فرار نہیں ہو سکتی۔"

وہ لمحہ بھر تامل کے بعد بولی۔ "نہیں، میں پولیس کو مطلوب ہوں، اُس جیل سے تو یہ جیل بہتر ہے۔"

"اگر تمہیں سابقہ زندگی اور خان کی ملازمت پر ندامت محسوس ہوتی ہے اور تم اس غلطی کا کفارہ ادا کرنا چاہو تو میں تمہیں اس جیل اور جیل سے بچانے کی ضمانت دے سکتا ہوں۔"

"لیکن تم کون ہو؟" اُس نے چونک کر اچانک سوال کیا۔ "یہاں وہ قسم کے قیدی آتے ہیں۔ خان کے کاروباری رقیب اور قانون کے محافظ، تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟"

"میں نہ تو خان کا رقیب ہوں اور نہ ہی قانون کا محافظ... میں تمہارے گروہ سے تعلق رکھتا ہوں۔" میرا جواب سُن کر اُس نے ہونٹ سکوڑ لیے... "میں فوجی فوج کا سپاہی ہوں۔ مجھے اور میری بات تم اتنی آسانی سے نہ سمجھ سکو گی۔ بہرکیف میں تمہیں گناہوں کے کفارے کا موقعہ فراہم کر سکتا ہوں۔"

"لیکن..." اُس نے پلکیں جھپکا کر مجھے دیکھا۔ "یہاں سے رہائی تو نہیں، میں نے اُس رات خان کی باتیں سُنی تھیں، اگر اُس نے تمہیں پہچان لیا، اپنے لیے خطرناک جان لیا تو میری ڈھال بھی تمہیں نہ بچا سکے گی۔ میں اُن کو اتنی عزیز تو نہیں ہوں۔"

"شیر خان کے لیے تو عزیز ہو نا؟" میرا معنی خیز سوال سُن کر اُس کے چہرے پر سوگواری مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"ہاں وہ مجھے چاہنے لگا ہے۔" اُس نے اعتراف کر لیا۔ "وہ مجھے بچانے کی ضرور کوشش کرے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر وہ الٹے دروازے کی طرف چلے گئے۔ میں نے اُٹھنا چاہا، لیکن اُس نے اُٹھ کر بالٹی سے گلاس بھر کر مجھے دے دیا۔ کیونکہ جنگ فرش پر اوندھا ہو چکا تھا۔ لہٰذا مجھے نہانے والا پانی ہی پینا پڑا تھا۔

"اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔" اُس نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔ "میں ایک مدفن سے نکل کر دوسرے گڑھے میں نہیں گرنا چاہتی۔"

"میں تمہیں تمہارے خاندان تک پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"میرا اگر کوئی خاندان ہوتا تو میں خان جیسے شیطان کے جال میں نہ پھنستی۔" اُس نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔ "ایک بھائی تھا، وہ بھی اسی آگ میں جل گیا ہے۔ وہ بھی خان کے گروہ میں تھا۔ ماں باہر سے جیا کرتا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اُسے ترکی کی سرحد پر گولی مار دی گئی ہے۔ پھر مجھے اسکول کی چہار دیواری میں استعمال کیا جانے لگا۔ میں ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر تھی۔ خان میرے ذریعے کالج میں ہیروئن پہنچاتا تھا۔ مجھے اتنا معقول کمیشن دیا جاتا تھا کہ میں اس دلدل میں دھنستی چلی گئی تھی۔ میں نے اپنی کلاس کی لڑکیوں کو اس لت میں مبتلا کیا۔ پھر میں نے لڑکیوں کو کالجوں تک استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کتنی معصوم لڑکیوں کو تباہ کیا ہے، مجھے اب یہ احساس کاٹتا ہے۔"

"میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم اپنے گناہوں کا کفارہ خلوصِ نیت سے ادا کرنا چاہتی ہو؟"

"ہاں، اگر مہربان خدا مجھے اس کا ایک موقع عطا فرمائے۔"

"رشیدہ...؟" چکلاتی ہوئی آواز تہ خانے میں اُتری تو ہم دونوں اُچھل پڑے تھے۔ شیر خان اُوپر آ گیا تھا۔ "رشیدہ کہاں ہو؟"

"اب ہم ڈرامہ کھیلیں گے، رشیدہ بیگم۔" میں نے اُس کے لرزتے ہوئے ہاتھ کو تھپتھپایا۔ "تم ایک محبوبہ کا کردار ادا کرو گی اور اپنے محبوب سے زندگی طلب کرو گی۔"

"شیر خان...!" میں نے آواز دی۔ "تمہاری محبوبہ میرے قبضے میں ہے۔"

"نہیں... تم..." اُس نے بڑی گندی گالی نیچے اُتاری۔ "یہ کیا کرتے ہو؟"

"میں... میں یہاں ہوں شیر خان۔" رشیدہ نے سراسیمہ آواز میں کہا۔ "مجھے... مجھے اس درندے سے بچاؤ شیر خان۔"

"اسے اُوپر بھیج دو چوہدری۔ ورنہ میں تمہارے ٹکڑے کتوں کو کھلاؤں گا۔"

"پہلے ٹکڑے کرو گے، شیر خان۔" میں نے قہقہہ لگایا۔ "یا کتوں کو بھی اُتارو گے؟"

اُس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا طوفان اُمڈنے لگا اور میں قہقہے لگاتا رہا۔

"تم شیر خان... ہر چیز کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے۔ رشیدہ جیسی لڑکی جس مرد کو چاہتی ہو، وہ مرد اُس کے لیے دُنیا کے سارے خزانے لٹا سکتا ہے۔ بولو۔ اپنی محبوبہ کی قیمت تم لگاؤ گے یا میں لگاؤں؟"

"بولو..." اُس نے گالی دے کر پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے اپنے ذہن کو ٹھنڈا کرو اور غلیظ زبان کو لگام دو، پھر ہم شرافت سے مول تول کریں گے۔"

"جلدی بکواس کرو۔" وہ دہاڑا۔

"شیر خان...!" رشیدہ ایسے چیخی جیسے ذبح ہونے جا رہی ہو۔ "اس کے ہاتھ میں چاقو ہے، خدارا مجھے بچا لو۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی، اپنے لیے مجھے خرید لو، شیر خان۔"

"بتاؤ چوہدری اور چاقو جیب میں رکھ لو۔" شیر خان کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ "وہ میری برتری تسلیم کر رہا تھا یہ کیا چاہتے ہو؟"

"آزادی شیر خان..." میں نے ٹھہرے انداز میں بتایا۔ "کہ تم رشیدہ کی زندگی کے عوض یہ سودا قبول کرتے ہو؟"

"ہاں چوہدری..." وہ شکستہ آواز میں بولا۔ "تم جیت گئے ہو، میں جانتا ہوں اس سودے پر رنگ باز خان میرے قتلے بنا دے گا، لیکن میں رشیدہ کی خاطر ساری دُنیا سے لڑ سکتا ہوں۔ یہ رسی پکڑو اور اُوپر چلے آؤ۔"

"نہیں شیر خان..." میں نے جواب دیا۔ "کیا میں تمہیں اتنا ہی بے وقوف دکھائی دیتا ہوں۔ کچھ شرائط بھی سن لو۔"

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

"پھر ایسے کرو اپنے دونوں ہاتھ رسّی سے باندھ دو۔"

اُس نے دونوں بندھے ہوئے ہاتھ جب سوراخ سے نیچے جھکا کر دکھائے تو میں نے دوسری ہدایت دی۔ "اب میری طرف دیکھو۔" اُس نے جھانک کر دیکھا۔ میں نے رسّی اپنی کمر کے گرد باندھ لی تھی۔

"میرے ہاتھ میں ریوالور ہو گا۔ اس لیے تم کوئی مکاری دکھانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ چلو، کھینچو اُوپر...."

اُوپر جب میرے ہاتھ تختے کے کنارے سے ٹکرائے تو میں نے ایک ہاتھ سے کنارا تھام لیا اور ریوالور والا ہاتھ نیچے کر لیا تھا... تاکہ پاؤں کی ٹھوکر مار کر شیر خان مجھے ناکارہ نہ بنا سکے۔

جونہی میرے پاؤں اُوپر فرش پر جمے، میں نے رسّی چھوڑ دی، لیکن مجھے اُس نے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا تھا، پتہ نہیں اُس کا دماغ اُلٹ گیا تھا۔ اُس نے میرے پیٹ میں بڑے زور کی ضرب لگائی تھی۔ میں دُہرا ہوتا ہوا کئی قدم لڑکھڑاتا ہوا بمشکل سنبھلا تھا۔

اُس نے ہاتھوں کو ایسے بَل دیے ہوں گے، جو حسبِ خواہش کھل گئے تھے۔ وہ دیوقامت شخص باہیں پھیلاتا ہوا میری طرف بڑھا تھا جیسے مجھے بانہوں میں لے کر کچل دینا چاہتا تھا... لیکن رنگ باز خان نے اُسے صرف نام ہی بتایا تھا۔ اگر محترم سلطان کے بارے میں کچھ اور بھی بتا جاتا تو اُس سے اتنی سنگین غلطی نہ ہوتی کہ خالی ہاتھ کُشتی دینے کا فیصلہ کرتا۔

میں نے اُس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کو دیکھا اور دائیں ہتھیلی کی کھڑی ضرب اُس کی کلائی پر ماری، ہڈی چٹاخ سے ٹوٹی اور شیر خان کے حلق سے بھی دلخراش چیخ بلند ہوئی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے جھولتی ہوئی کلائی تھامنے کی کوشش کو تکمیل تک نہ پہنچائی تھی کہ میری دوستی اُس کے پیٹ میں دھنس گئی تھی۔ وہ ڈکراتا ہوا دُہرا ہوا اور میں نے اُس کی گردن پر آزمودہ ضرب لگائی اور وہ مُنہ کے بَل جب گرا، دھماکے کی آواز رشیدہ نے بھی سُن لی ہو گی۔ وہ فولادی الجثہ شخص کسی تن آور درخت کی مانند کڑکڑاتا ہوا گرا تھا۔

"رشیدہ...!" میں نے سوراخ سے جھانک کر اُسے آواز دی۔ "الماری کھولو اور اُوپر والے خانے کی تمام گڈیاں ٹب میں رکھ دو۔"

"اُوپر کیا ہوا ہے؟"

"سوال جواب نہیں، رشیدہ بیگم۔" میں نے تڑخی آواز میں کہا۔ "جو تم سے کہا ہے، وہ کرو۔" میں دیکھ رہا تھا اور رشیدہ نے تمام پاک کرنسی ٹب میں رکھ دی تھی۔

"اوہ ٹھہرو...!" رشیدہ نے ٹب مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "پہلے مجھے نکالو۔"

"ٹھیک ہے، تم بھی ٹب میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ اُس کا خدشہ ٹھیک ہی تھا۔ اُس نے شاید بچپن میں چور شہزادے کی کہانی سُنی ہو گی۔ اُس نے بھی تو اپنے جگری دوست کو دولت حاصل کرنے کے بعد اندھے کنویں میں چھوڑ دیا تھا۔

"کیا یہ مر گیا ہے؟" رشیدہ نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔

"نہیں، شاید مردہ ہو گا۔" میں نے گڈیوں کا بنڈل رسّی میں باندھتے ہوئے جواب دیا۔ "اب بولو باہر چلو گی؟"

"ہاں...!" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کیا میں نے پہلے ہاں میں جواب نہیں دیا تھا؟"

"جاؤ دیکھو کتے تو نہیں کھلے ہوئے۔"

"مجھ سے اتنے مالوس تو نہیں، لیکن میں کچن میں اُن کو بند کر سکتی ہوں۔" وہ چلی گئی تو میں نے بڑھ کر شیر خان کو سیدھا کیا اور اُس کی نبض پر اُنگلیاں رکھ دیں۔ وہ زندہ تھا لیکن نبض ڈوب رہی تھی۔ میں نے گردن کی ہڈی ٹوٹنے والے کو کبھی زندہ بچتے نہیں دیکھا تھا۔

جب ہم اُترائی اُتر رہے تھے تو میں نے نیچے سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کو بجھتے دیکھا تھا۔ وہی جگہ تھی جہاں رنگ باز خان نے اُس رات کار کھڑی کی تھی، اگر وہی تھا تو ہمیں اُس کی نگاہوں سے بہرطور بچنا تھا۔ دائیں بائیں خاردار جھاڑیوں کا جنگل تھا اور رات اتنی تاریک تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا لیکن دُشمن سے بہرکیف جھاڑیوں کے خار بہتر ہی تھے۔ اسی لیے ہم نے راستہ چھوڑ دیا تھا اور جھاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ جھاڑیاں اس قدر گنجان اور خاردار تھیں کہ چند قدموں کے بعد ہی رشیدہ کی شال اُلجھ گئی تھی اور میرے کپڑے بھی گھاس کے کانٹوں سے بھر گئے تھے۔

ہم اصل راستے سے بیس تیس گز دُور راستے کے متوازی جھاڑیوں میں راستہ بناتے ایک ایک قدم احتیاط سے بڑھاتے چل رہے تھے کہ میں نے راستے پر وہ سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ یقیناً رنگ باز خان تھا۔ ہم اُس وقت تک ساکت و صامت کھڑے رہے تھے، جب تک وہ چڑھائی پر چڑھتا ہوا موڑ نہ مُڑ گیا تھا۔ پھر جھاڑیوں سے نکل کر ہم راستے پر آ گئے اور تقریباً دوڑنے لگے تھے۔

"تم یہاں رُک کر ہیڈ لائٹ جلنے کا انتظار کرو گی۔" میں نے سیاہ مرسیڈیز دیکھ کر سرگوشی کی۔ "ہم بیس کلومیٹر پیدل نہیں چل سکتے، جب کہ تھوڑی دیر بعد خان غراتا ہوا واپس آنے والا ہے۔"

میں خان کی طرح لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا کار کے جونہی قریب پہنچا، ڈرائیور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، اندھیرا جہاں ٹھوکریں دیتا ہے وہاں بعض اوقات چہروں کو چھپا کر ظاہر نہ ہونے والوں پر بڑا احسان بھی کر دیتا ہے۔ ڈرائیور تذبذب میں تھا۔

"واپس چلو...!" میں نے خان کی کھرکھراتی آواز کی نقل کرتے ہوئے کہا اور ڈرائیور نے فوراً دروازہ کھول دیا، دروازہ کھلتے ہی خودکار بلب جونہی روشن ہوا، میں نے ایک دم چہرہ دوسری طرف کر لیا اور اندر بیٹھ کر فوراً دروازہ بند کر دیا۔

ڈرائیور نے یقیناً میری طرف توجہ ہی نہ دی ہو گی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور انجن کی جونہی سرسراہٹ جاگی، میں نے ریوالور اُس کی گردن پر رکھ دیا، اُس کے ہاتھ جہاں تھے، وہیں جام ہو گئے تھے۔

"گاڑی موڑ کر دوسری سواری کا انتظار کرو گے۔"

اُس نے آہستہ آہستہ گاڑی کو یوٹرن دیا اور میری ہدایت پر کار سیدھی کر کے روک دی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ رشیدہ دوڑتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ میں نے اُس کے لیے دروازہ کھولا اور وہ ہانپتی ہوئی میرے اُوپر گری۔

"واپس شہر چلو...!" میرے لہجے میں درندگی تھی۔ "بالکل پُرسکون رہو گے، مجھے تم نے اب پہچان لیا ہو گا؟"

"کیا خان صاحب کے لیے واپس آنے کی اجازت دو گے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں، یہیں شہر پہنچ کر تم جہنم میں بھی جانا چاہو گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

ڈرائیور نے شرافت یا بزدلی کا بہترین ثبوت دیا تھا، ہیل شہر کی حدود میں وہ جگہ پولیس پیٹرولنگ کار کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اگر وہ دلیری کا مظاہرہ کر بیٹھتا تو میرے لیے عورت اور دولت کی وجہ سے خاصی پریشانیاں ہو سکتی تھیں۔

میں نے اسے ریلوے اسٹیشن کے پارکنگ پلاٹ سے واپس کر دیا تھا، مقصد یہی تھا کہ وہ خان کو بتا سکے کہ مسٹر و رریلوے اسٹیشن پر اترے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کا انتخاب اس وجہ سے بھی کیا تھا کہ وہاں سے ہر وقت ٹیکسی مل سکتی تھی۔

میں اور رشیدہ کار سے اتر کر بکنگ آفس کی جانب گئے۔ کوئی گاڑی آنے والی تھی، ٹیکسیاں اور پرائیویٹ گاڑیاں انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے پلیٹ فارم کے دو ٹکٹ لیے اور اندر چلے گئے۔ پلیٹ فارم پر خاصی بھیڑ تھی۔ میں رشیدہ کے ساتھ ایک ستون کی آڑ میں کھڑا آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ دو تین منٹ بعد کراچی سے گاڑی آگئی اور ہم دونوں مسافروں کے دھکے کھاتے ہوئے باہر نکل گئے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

بیگن تیسری گھنٹی پر بیدار ہوا تھا۔ اس نے شاید کی ہول سے مجھے دیکھ لیا تھا، کیونکہ برآمدے میں روشنی تھی اور میں دروازے سے ہٹ کر کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور مجھے داخل ہونے کا راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہو گیا تھا۔

"سوری ماسٹر..." میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "تمہیں ڈسٹرب کیا، خاتون کے لیے دوسرے کمرے میں میرے والا بستر لگا دو۔"

وہ جماہی لیتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"یہ تمہارا گھر تو نہیں ہے۔" رشیدہ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "یہ کوئی تمہارا دوست ہے؟"

"میرا گھر ہے ہی نہیں، رشیدہ بیگم۔" میں نے جواب دیا۔ "پھر کیسے تمہیں یہاں گھر جیسا سکون ملے گا۔"

"بچے کیسے ہیں؟ جب بیگن واپس آیا تو میں نے پوچھا۔

"خوش باش ہیں، تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "خاتون کو بستر تک چھوڑ آؤ۔"

"آؤ رشیدہ..." میں نے ٹوٹلوں کا بنڈل بیگن کی جانب اچھال دیا۔

"اوہ..." وہ سوفے پر بستر دیکھ کر بولی۔ "تم کہاں سوؤ گے؟"

"جاہر ہے یہاں تو گنجائش نہیں..." میں نے ہنس کر صوفے کی طرف اشارہ کیا اور وہ جھینپ کر ہنسنے لگی۔

"میں دوست کے ساتھ رات بسر کروں گا۔ تم چاہو تو اندر سے کنڈی لگا لینا۔"

"کیا تمہاری موجودگی میں اس احتیاط کی ضرورت ہے؟" وہ صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ "اگر چاہو تو ایک پل مجھ سے لے لو اور دوسرے صوفے پر لیٹ جاؤ۔"

"نہیں..." میں نے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔

"یہ ہیروئن تو نہیں ہے؟" بیگن نے زیر لب مسکراتے ہوئے فقرہ کسا۔

"کیوں اتنی بدصورت بھی نہیں ہے؟" میں نے ٹوٹ اُتارتے ہوئے کہا۔ "یہ پیت کا سیاب ہیروئن ہے۔"

پھر میں نے رگ رنگ ہوٹل سے لے کر رنگ باز خان کو آخری چوٹ لگانے تک تمام کارروائی اسے بتائی۔

"لیکن پیارے گودام معلوم کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔" بیگن بولا۔ "جن کرو، صبح اس تہ خانے میں کچھ نہ ہوگا۔ یہ لوگ چوہے کی طرح کئی بل بنا کر بزنس کرتے ہیں۔"

"میں ریڈ تو نہیں کروں گا، ماسٹر۔" میں نے لیٹتے ہوئے بتایا۔ "میرا طریقہ کار بالکل منفرد ہوگا۔"

"کرنسی تو بہت زیادہ ہے، اب تم اس کے سامنے جاؤ گے تو وہ تمہیں دیکھتے ہی ٹوٹ کر دے گا۔"

"میرا خیال ہے وہ مجھے دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائے گا۔"

"چیف...! اگر مناسب ہو تو مجھے اگلے قدم میں شامل کر لو۔"

"اگلے قدم کے لڑکی کردار تم ہی ہو گے، ماسٹر۔" میں نے کروٹ بدل کر اس کی چھاتی پر ہاتھ مارا۔ "مجھے بتاؤ یہاں کی پولیس تمہیں جانتی ہے یا نہیں؟"

"نہیں..." اس نے بتایا۔ "میں نے سیلون گیس میں پس پردہ رہ کر اپنا کردار ادا کیا تھا۔"

"گڈ..." میں نے اسے تھپکی دی۔ "تم مسٹر فرگوسن کے بھیس میں منشیات کے بین الاقوامی بیوپاری کا رول ادا کرو گے۔"

میں نے اسے اپنی آئندہ پلاننگ کے بارے میں بتایا اور اس نے میرے منصوبے کی کھل کر تعریف کی تھی۔ وہ باتیں کرتا رہا تھا اور میرا ذہن آہستہ آہستہ نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا تھا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو رشیدہ اور بیگن ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ رشیدہ چوکی پر بیٹھی گرہستن عورت دکھائی دے رہی تھی۔ بیگن انڈے پھینٹ رہا تھا اور رشیدہ فرائی پین میں سلائس تل رہی تھی۔

میں غسل اور شیو سے فارغ ہو کر جب باہر آیا تو ناشتہ میز پر چنا جا چکا تھا۔ رشیدہ نے ہمارے لیے چائے پیالیوں میں ڈالی اور ایسے کھلانے لگی، جیسے گھر اور وفادار عورتیں اپنے مردوں کو کھلانے میں راحت محسوس کرتی ہیں۔ شاید فطرتاً وہ بھی اور گھریلو لڑکی رہی ہوگی۔ شیطان نے اسے ورغلا دیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر بیگن کرنسی لے کر ایک غیر ملکی بینک میں چلا گیا تھا۔ میں نے دفاتر کھلنے پر وزیر داخلہ کو فون کیا اور مسٹر فرگوسن کے کاغذات تیار کرنے کی درخواست کرتے ہوئے مختصر مقصد بھی بتا دیا۔

"سنو بیٹے..." انھوں نے پیار بھری آواز میں بتایا۔ "فرگوسن اور بیگن میں کوئی فرق نہیں ہے، مسٹر بیگن بھی فرضی نام ہے جسے صرف چند اہم لوگ جانتے ہیں۔ اس لیے دوسرا فرضی نام اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں اسی نام کو چلنے دو۔"

"بہتر جناب..." میں نے ان کی دلیل مان لی اور پھر اس بینک کا نمبر انکوائری سے مانگ کر بیگن سے رابطہ قائم کیا۔ وہ غالباً کاؤنٹر کے نزدیک ہی تھا۔

"ٹھیک ہے، انکل! اپنے نام کا ہی اکاؤنٹ لے لو۔"

"شکریہ..." وہ بولا۔ "کوئی اور بات...؟"

"واپسی پر خاتون کے لیے چند ریڈی میڈ سوٹ اور چار نمبر کے جوتے لیتے آنا۔"

رشیدہ قریب ہی تھی، لیکن میں نے تمام گفتگو چونکہ انگریزی میں کی تھی، اس لیے اس کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔

"خرم...!" وہ ناخن کریدتے ہوئے بولی۔ "تمہارے تمام دوست انگریز ہی ہیں؟"

"ذہن کو پرسکون رکھا کرو، رشیدہ بیگم۔" میں نے اس کے الجھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "تم، مجھے کہن میں کام کرتی بہت اچھی لگتی ہو۔"

"پھر اپنا گھر بناؤ اور مجھ میرے سپرد کر دو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یقین کرو میں تمہاری خدمت کر کے سارے گناہوں کے کفارہ ادا کر دوں گی۔"

"یہی ایک میرے ساتھ بدنصیبی ہے رشیدہ۔" میں اداس ہو گیا۔ "پرندے بھی اپنا آشیانہ بنا لیتے ہیں، مگر میں اپنا گھر نہیں بنا سکتا۔"

"کیوں خرم...؟" وہ تڑپ اٹھی۔ "مجھے اپنی پریشانی بتاؤ... وہ رکاوٹ دکھاؤ، میں شاید تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔"

"کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے جلتی ہوئی سانس لی۔ "جس نے بھی ایسا کرنا چاہا، وہی راکھ ہو گیا۔"

"ان میں خلوص کی کمی ہوگی، اس لیے جل گئے۔" رشیدہ باوقار اور پُریقین آواز میں بولی۔ "خلوص کے پرکھی جلتے ہیں نہ تھکتے ہیں، آزمائش کر لو خرم۔ مجھے ایک موقع دو، گھر بنانے کا۔ میں اس جنت سے آگ دور رکھوں گی۔ وہ تمہارا گھر آباد ہوگا، مہکے گا جس طرح موسم بہار میں باغ مہکتا ہے۔"

"کل کیا ہوگا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔" میں نے رشیدہ کے نرم نرم ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے نرم نرم آواز میں کہنا شروع کیا۔ "پتہ نہیں تم کس موڑ پر جس طرح اچانک ملی ہو، اسی طرح اچانک بچھڑ جاؤ گی، لیکن میری ایک بات یاد رکھنا، مجھ سے محبت نہ کرنا، وہ محبت جو تمہاری اپنے ذہنوں میں شعور کی دہلیز سے لے کر جاگتی ہیں، مجھے وہ محبت راس نہیں آتی۔ ایسی محبت جس لڑکی نے بھی کی وہی مجھ سے ضائع ہو گئی، دور چلی گئی۔ وقت کے ہاتھوں نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ ایسی ایک مثال نہیں، کوئی ایک حادثہ نہیں، ایسا بار بار ہوا ہے، اگر ہمارا ساتھ قائم رہا تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ کس نے مجھے چاہا، کس نے مجھے پوجا اور ان کے ساتھ کیا ہوا۔ میں تمہیں دل کا ایک ایک زخم دکھاؤں گا۔ ہر زخم میں ایک ایسی ہی پیاری اور محبت کی دیوانی لڑکی کی لاش ہے۔ ابھی کل کی بات ہے، میرے گاؤں میرے گھر میں پکے اور مجھے چاہنے والی لڑکی مجھ سے چھن گئی ہے۔"

"مجھے ایک سوال کا جواب دو خرم۔" رشیدہ نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں سے بہ آہستگی نکال لیے۔

"کیا محبت بھی شاپنگ کی طرح اپنے اختیار میں ہوتی ہے؟"

"شاید نہیں..."

"شاید نہیں، بلکہ یقیناً نہیں، خرم۔ بہرکیف میں آئندہ محبت کو زبان نہیں دوں گی۔"

مجھے ایک دم ایڈنا یاد آگئی، صرف وہ ایسی لڑکی تھی، جس نے محبت کو زبان نہیں، بلکہ ایک خاموش احساس اور بھرپور ذائقہ دیا تھا۔ شاید یہی اس کی خوبی تھی، جس نے اسے بچا لیا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے ہمیں جذباتی دنیا سے نکال لیا تھا۔ میں نے اٹھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"کونسز یول رہا ہوں، ماسٹر۔"

"رپورٹ...؟"

"مسٹر ایس کا ایجنٹ کارٹن ہوٹل کے جیل کا چکا ہے، دھوبی اور اداسنگی مارگلہ فلائنگ اسٹیشن پر ہوتی ہے اور اب کارٹن ہاؤس نمبر بی فور فورٹین میں داخل ہو چکا ہے۔"

"نگرانی جاری رکھو..." میں نے حکم دیا۔

"گاڑی کی...؟"

"ہاں..." میں نے کہا۔ "اور فائنل رپورٹ رات سات بجے دو گے۔"

ریسیور رکھ کر میں نے بینک کا نمبر ڈائل کیا اور بیگن کو ہدایت دی کہ فارغ ہو کر کونسز سے ملتا آئے۔ ابھی میں ریسیور رکھ کر بیٹھا ہی تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف ہنٹ تھا۔ لڑکے فیلڈ میں تھے اور اپنی اپنی رپورٹ بیگن کو دے رہے تھے۔

"کون چیف...؟" ہنٹ کی آواز میں حیرت تھی۔

"ہاں... بولو کیا رپورٹ ہے؟"

"انہیں تھری پارسل کے ساتھ ائرپورٹ پر جانا ہے، بنکاک کے لیے روانگی کنفرم ہو چکی ہے۔"

"فلائٹ کا وقت...؟"

"دو گھنٹے بعد چیف..."

"اوکے، میں آرہا ہوں ائرپورٹ کے پارکنگ پلاٹ میں میرا انتظار کرو۔" ریسیور رکھ کر میں نے رشید کی جانب دیکھا۔ وہ بھی حوالدار نشان بنی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔ "میں جارہا ہوں تم یہاں سے باہر نہیں نکلو گی۔ اور نہ ہی کوئی کال وصول کرو گی۔" اس نے آنکھوں کو شہادی جنبش دی اور میں دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

دوسرے منٹ نئی کار سڑک کے سینے پر تیرتی جارہی تھی۔ میں نے مصروف سڑکوں سے بچنے کی خاطر مال روڈ پر گاڑی ڈال دی تھی۔ براستہ کورٹ روڈ... ٹریفک کے رش سے بچتا ہوا، جب ائرپورٹ کی ہیلنگ پوسٹ پر رکا تو میں نے ہنٹ کو ٹیکسی پارک کے فٹ پاتھ پر ٹہلتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے گن ٹیکس دیا اور کار پارک کر کے باہر نکلا تو ہنٹ نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ رکاوٹیں پھلانگتا ہوا میرے نزدیک چلا آیا تھا۔

"وہ ابھی اندر گیا ہے، کل تک وہ دونوں پاؤں پر چلتا تھا۔ آج وہ بیساکھیوں پر آیا ہے۔" ہنٹ جلدی جلدی بتانے لگا۔

"چلو مجھے دکھاؤ۔" میں نے جیب سے ریڈی میڈ ماسک نکالا اور اپنی کار کی جانب پلٹ گیا، اندر جا کر ماسک چہرے پر فٹ کیا اور عقب نما آئینے میں دیکھا۔ میری شکل خاصی بدل گئی تھی۔ رپورٹ کے بعد ہی میں کوئی لائحہ عمل سوچ سکتا تھا۔

وہ بنچ کی اوٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی پشت سے پشت ملائے ایک بھکاری قسم کا بوڑھا بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا، لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر باتیں کر رہے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔

دوسرے چکر میں میں نے فوری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں سیدھا بنچ کی اوٹ پر بیٹھے گیا اور پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ "سرخ آندھی مغرب سے آئی ہے، سفر ملتوی کر دیا گیا ہے۔" اس نے پھرتی سے گردن گھمائی اور میں اٹھ کھڑا ہوا اور گیٹ نمبر کی جانب آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا۔ جب میں ایک ٹونٹی سے پانی پلاسٹک کے گلاس میں گزر رہا تھا تو وہ میرے قریب جھک کر منہ لگا کر پانی پینے لگا۔

"باس نے روٹ بدل دیا ہے، میرے ساتھ آؤ۔" میں نے گلاس سے منہ لگائے لگائے کہا۔

"شناخت...؟" وہ غرایا تھا۔

"جہنم میں جاؤ۔" میں جھٹکے سے مڑا اور پھر تیز شاپ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ میری سماعت سے بیساکھیوں کی کھٹ کھٹ مسلسل ٹکرا رہی تھی۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا، وہ تیزی سے ٹیلی فون بوتھ کی جانب جا رہا تھا۔ کھیل بگڑ چکا تھا۔ میرا تیر نشانے سے کترا تا ہوا اندھیرے میں آگے نکل گیا تھا۔ ضروری تو نہ تھا کہ ہر اندھیرے کا تیر ہدف پر ٹھیک ہی بیٹھے۔ اندازے تو ہوتے ہی اندھے ہیں۔

میں جب انتہائی قدم سے احتراز کرنا چاہتا تھا، وہ ناگزیر ہو گیا تھا اور میں جان کی رکشی میں پولیس اور لوگوں کے درمیان اسے اغوا بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بدک گیا تھا اور اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرنے جا رہا تھا۔ میرا بدن پھٹنے لگا تھا اور ذہن میں واقعی سرخ آندھی در آئی تھی۔ کوئی قابل عمل فیصلہ آخری شکل نہیں پا رہا تھا۔ میرے سامنے دو راستے تھے۔ اس کی بیساکھیوں کو چھین کر ٹکم کے اعلیٰ افسر کے حوالے کر دوں یا انتظار کروں کہ ہیڈ کوارٹر سے کیا کہتا ہے؟

پہلی صورت میں زیادہ سے زیادہ وہ پکڑ لیا جاتا، جیسے عام مجرم پکڑے جاتے ہیں اور پولیس کو دے دیا جاتا، یہ کوئی سزا نہیں تھی۔ میں تو شاخوں کے پتے جھاڑنے کا قائل نہ تھا۔ پتے پھر پھوٹ آتے ہیں، میرا تو اصول تھا کہ جڑ اکھیل دینے والا اور کانٹے بکھیرنے والا درخت جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ تناور محفوظ رہ جائے تو زمین اور نمی اسے پھر ہرا کر دیتے ہیں۔

میں تذبذب کا شکار ہو گیا تھا کہ اس نے بوتھ میں داخل ہو کر سکہ ڈالا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دو منٹ بعد وہ بیساکھیاں کھٹ کھٹاتا ہوا مجھے پارکنگ پلاٹ کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ ہنٹ اس سے چند قدم دائیں جانب چابیاں اچھالتا ہوا چل رہا تھا۔

اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھا، میرا چہرہ اخبار کی اوٹ میں تھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور ٹیکسی نے ریورس گیئر لگایا اور پھر... آؤٹ گیٹ کی جانب بڑھنے لگی۔ میں نے ٹیکسی کا نمبر ذہن نشین کیا اور اخبار کا ڈنڈا پر اچھال کر سڑکوں کی آڑ میں دوڑنے لگا۔ میں نے ہنٹ کو بھی تعاقب میں جاتے دیکھا۔

ٹیکسی نے ٹائی وے اختیار کی تھی، غالباً اسے اسلام آباد کی طرف بلایا گیا ہوگا۔ میری کار لمحہ بہ لمحہ فاصلہ سمیٹ رہی تھی۔ درمیان ہنٹ کی

لگی تھی۔ میں نے ڈھوک حافظ کے قریب ہنٹ کو اوورٹیک کیا اور آگے والی ٹیکسی نے اچانک حائیں ٹرن لیا تھا، وہ شاہ فیصل کالونی کی کچی اور ناہموار سڑک پر چڑھ گئی تھی۔ میرے لیے وہ کالونی نئی تھی، میری ہر ہچکولے کھاتی زیر تعمیر عمارتوں کے سیڑھیل کو روندتی ہوئی جب اترائی میں گئی تو ٹیکسی ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی تھی۔

اس نے باہر نکل کر اطراف کا جائزہ لیا۔ میری کار سائڈ سے گزرتی ہوئی چند گز آگے جا کر رکی۔ اس نے مجھے نہ صرف دیکھ لیا تھا... بلکہ پہچان بھی گیا تھا۔ میں کار سے اتر کر چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ سجائے اس کی جانب بڑھا۔ وہ بیساکھیوں پر جسم کا بوجھ ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔

"شکریہ انکل..." میں نے مؤدب اور شائستہ آواز میں کہا۔ "آپ نے بروقت اور اچھا فیصلہ کیا ہے، میں آپ کے لیے اجنبی ہی سہی... مفادات کے لحاظ سے غیر نہیں ہوں۔"

اس نے جیب سے ہاتھ نکالا اور ریوالور کی نال میرے سینے کی جانب کرتے ہوئے بولا۔ "چلو ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔"

"کار میں کیوں نہیں انکل؟" میں نے بے خوفی سے کہا۔ "انکل سلمان آپ کی غلط فہمی دور کر دیں گے۔"

"ہم ادھر ہی جائیں گے بھتیجے بیٹھو۔"

ہنٹ نے ٹیکسی کہیں دور چھوڑ دی تھی اور کیپ وٹنڈ وال کی آڑ سے اس نے کسی چیتے کی طرح شاندار جست لگائی اور شکار سمیت لڑھکتا ہوا نالی میں جا پڑا تھا۔ اس نے بے مثال حکمت عملی کا مظاہرہ کیا تھا اور جکڑی ہوئی سچویشن سنبھل گئی تھی۔

میں نے جھپٹ کر بیساکھیاں اٹھائیں اور پھر ہنٹ کے اپنے ہاتھوں پر اٹھائے نالی سے نکل آیا۔ اس نے کراہے ہاتھ دکھائے تھے۔ وہ اس کے ہاتھوں میں بے حس حرکت جھول رہا تھا۔

"میں اسے لے جاؤں چیف...؟" ہنٹ نے پوچھا۔

"ہاں اسی ٹیکسی میں..." میں نے خوف زدہ ٹیکسی ڈرائیور کو اشارا کیا۔ اس نے پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔ "سواری کہاں سے اٹھائی تھی تم نے...؟"

"ائرپورٹ سے جناب..." اس نے تھوک نگل کر بتایا۔ "مم... مجھے معلوم نہ تھا، یہ کون ہے؟"

ہنٹ نے اسے اندر ٹھونس دیا تھا۔

"اسے میری کار میں منتقل کر دو۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت ارادہ بدل دیا، میں ممکن تھا کہ ٹیکسی کا تعلق بھی اسی گروہ سے رہا ہو، اس طرح وہ ہنٹ کے ٹکرانے سے آگاہ ہو جاتے۔ ہنٹ اور اس کے دوسرے ساتھی لال کرتی کے فیشن ایبل علاقے میں ایک بڑی کوٹھی میں مقیم تھے۔ اس کوٹھی کے ایک کمرے میں سجاول خان کا بھڑکیلا بیٹا دلاور خان بھی قید تھا۔ جس کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ میں فی الحال دلاور کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ہنٹ کو مزید ہدایات دے کر میں بیگن کے کاٹیج میں لوٹ گیا تھا۔

رشیدہ کچن میں سالن پکا رہی تھی، میری اطلاع پاتے ہی وہ دوپٹہ درست کرتی ہوئی کچن سے نکل آئی تھی۔ ہمارے درمیان صرف مسکراہٹوں کا ہی تبادلہ ہوا تھا۔ میں بیگن کو ساتھ لے کر لان میں نکل گیا تھا۔

*

راگ رنگ کی رونق اپنے عروج پر تھی، لابی میں گاہک بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ڈانسنگ ہال بھی آباد تھا، ویٹر شیشن اِدھر سے اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ مجھ گاہک کو نہ پہچانتے تھے، لیکن کاؤنٹر کلرک میری شکل کیسے بھولتے؟

میں گھومتے دروازے سے اندر داخل ہوا تو ایک کلرک نے مجھے دیکھا۔ اس نے چونک کر دوسرے کو کہنی ماری اور جب میں ٹہلتا ہوا کاؤنٹر تک گیا تو تینوں سارے کام چھوڑ کر میری جانب متوجہ ہو گئے۔

"کیا حال ہے، دوستو؟" میں نے بڑے خوش گوار انداز میں کہنیاں ٹیک کر پوچھا۔ "باس کہاں ہیں؟"

"اندر..." کلرک نے آفس کی جانب ہاتھ بڑھایا اور میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں دوست، میں خود اندر جا رہا ہوں، تم نے اگر اطلاع دی تو..."

اس کا چہرہ خوف سے بجھنے لگا تھا۔ میں نے اسے آنکھ ماری اور مینیجر آفس کی جانب چل پڑا۔ دروازہ نیم وا تھا اور رنگ باز خان ایک فائل پر جھکا ہوا تھا۔

"السلام علیکم خان..." میری آواز اس کے لیے بم ہی ثابت ہوئی تھی، وہ اچھل کر اٹھا اور پھر اسی تیزی سے کرسی پر گر گیا تھا۔ "نہیں خان..." میں نے ریوالور کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کر دیا۔ "ہاتھ اوپر رکھ دو۔" اس نے دونوں ہاتھ فائل پر رکھ دیے۔

"بیٹھ جاؤ، رستم سلطان۔" وہ بھرائی آواز میں بولا اور اس کا تناؤ ٹوٹنے لگا۔

"نہیں خان..." میں نے آواز میں سفاکی برقرار رکھتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔ "ہم یہاں گفتگو نہیں کریں گے، میرے ساتھ چلو۔"

"حکم نہ دو لڑکے..." وہ کندھے اچکا کر بولا۔ "اپنا بھیجہ اور اندازہ درست کرو۔"

"میں تمہیں یہاں سے لے جانے آیا ہوں خان۔" میں نے اس

کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "کیا اب بھی تمہیں شک ہے کہ میں جو کہتا ہوں، وہ سچ ہوتا ہے اور جو چاہتا ہوں، اُسے حاصل کر لیتا ہوں؟"

"ہاں...،" وہ طویل سانس لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ریوالور میں جیب میں رکھ رہا ہوں، خان!" میں نے غراتے ہوئے بتایا۔ "لیکن کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جانا۔" اُس نے ہونٹ بھینچ کر ٹانگیں گردن بلائی اور ہاتھ پشت پر باندھ کر دفتر سے نکل کر میرے آگے آگے چلنے لگا تھا۔

✱

میٹھیوی کے پاس وہ مخصوص جگہ خالی تھی جہاں خان کی کار اُس کے لیے لگائی جاتی تھی۔ وجہ یہی رہی ہوگی کہ خان وقت سے قبل باہر نکل آیا تھا۔ ڈرائیور نے یقیناً اُسے دیکھ لیا ہوگا ورنہ وہ دوڑتا ہوا نمودار نہ ہوتا۔ اُس نے بہ عجلت کار اسٹارٹ کی اور سیڑھیوں کے ساتھ لگا کر، اُسی پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔

خان جُھک کر اندر داخل ہوا اور اُس کے ساتھ ہی میں بھی اندر رینگ گیا تھا۔ اُس نے چہرہ گھما کر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ کیونکہ وہ ڈرائیور کو حسبِ معمول حکم دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"ہم گھر چلیں گے، خان!" میں نے نرم اور فدویانہ آواز میں کہا۔ خان کے چہرے پر اُلجھن کی گہری گہری لکیروں کا جال بچھ گیا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں، خرم سلطان!" وہ بہ دقت اپنی آواز سنبھال کر بولا۔ "بزنس اور گھر کو میں نے الگ الگ خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ کوئی دوسری جگہ بولو۔"

"پھر مجھے شرفِ میزبانی بخشو، خان!" میں نے بدستور لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔ "گو میرا گھر یہاں سے دُور ہے لیکن میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا۔"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر کوئی بٹن دبایا۔ ایک دم ڈرائیور اور ہمارے درمیان، سیاہی مائل شیشے کی ایک اسکرین نیچے سے اُٹھ کر اُوپر تک چلی گئی۔

"اب بات کرو، خرم سلطان!" وہ بولا۔ "ہم دونوں بالکل تنہا ہیں۔" اُس نے ایک اور بٹن دبایا، ایک ریسیور نما آلہ اُبھر کر اُس کے سامنے آگیا۔ "ڈرائیور! دوسرے حکم تک کار، شہر کی سڑکوں پر گھماتے رہو۔" اُس نے ریسیور ایک ہُک کے ساتھ لٹکا دیا اور کار ہلکے سے جھٹکے سے چل پڑی۔

"خان! مجھے وہاں سے نکلنے کی کوئی جلدی نہ تھی لیکن میں آپ کو باور کرانا چاہتا تھا کہ خرم سلطان وہی ہے جو اُس نے ظاہر کیا ہے۔ میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ میں اُدھر سے اپنے ساتھ تجربات اور فن لایا ہوں۔"

"سنو، لڑکے!" وہ پہلو بدل کر بولا۔ "میں تم سے اپنے رویے کی معافی نہیں مانگوں گا کیونکہ میں اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کرتا۔ اب اگر تم میرا لہجہ دوستانہ یا معذرت خواہانہ محسوس کرو تو اُسے میری کمزوری پر محمول نہ کرنا۔ بے شک، میں تمہاری گرفت میں ہوں لیکن شیر پنجرے میں بھی شیر ہی رہتا ہے۔ اگر تم چند ملے اور رُک جاتے وہاں تو آج ہمارے درمیان فضا دوسری ہوتی۔ تمہیں پابند کر کے، میں آرام سے بیٹھ نہیں گیا تھا۔ میں نے پندرہ چوہدریاں سے لے کر، ہانگ کانگ تک معلوماتی رابطہ قائم کر لیا تھا۔ تم چوہدری سلطان کے چھوٹے بیٹے ہو۔ ایک ہوے میں فاروق چوہدری نے تمہارے والد کو ہلاک کروایا پھر تمہاری کزن زینت کو اغوا کر لیا جسے تیسرے دن جرگے کی کوشش سے واپس کر دیا گیا۔ وہ تمہاری منگیتر تھی لیکن حالات کے پیشِ نظر، تمہاری ماں نے دانش مندانہ فیصلہ کیا۔ اسی اثنا، تم واپس آ گئے اور اُسی رات، فاروق چوہدری کے دو گرگے اور تمہارے گاؤں کا ایک بُوڑھا قتل کر دیے گئے۔ فاروق چوہدری ان دنوں ہوا فیملی میں زیرِ علاج ہے۔ پولیس نے نگ پورے کر لیے ہیں... لیکن مجھے معلوم ہے کہ اصل ضارب کون ہے۔ میں نے ہانگ کانگ میں بڑی مشکل سے تمہیں ٹریس کیا اور جینگ کی بیٹی عادم ہوزی نے وہ سب کچھ بتا دیا جو میں جاننا چاہتا تھا۔ کل رات، میں تمہیں پسینے سے نہلانے گیا مگر تم اپنی فطرت کے مطابق ناقابلِ عبور رکاوٹیں توڑ کر نکل چکے تھے۔"

"میں ایسا ہی ہوں، خان!" میں نے مُسکرا کر کہا۔

"اب تم دو باتوں کا جواب دو، خرم!"

"پوچھیے..."

"لڑکی کہاں ہے؟"

"میں نے اُسے پشاور جانے والی گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔"

"تمہارا معاون کون تھا، خرم؟" اُس کا لہجہ بے حد شیریں تھا جیسے کوئی بُزرگ معصوم بچے سے پوچھ رہا ہو کہ بیالی کیسے ٹوٹی؟ "رشیدہ یا شیر خان؟"

"نہ رشیدہ، نہ شیر خان۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے اُن کو بیٹھی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ذرا کہانی سناؤ۔"

"دوسری رات اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ لڑکی دبے پاؤں سیف کی جانب جا رہی تھی پھر اُس نے کی ہول پر ریوالور رکھ کر فائر کر دیا۔ میں نے ہڑبڑا کر اُٹھنے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا اور اُس نے نال کا رُخ میری جانب کرتے ہوئے، مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا... پھر اُس نے بنڈل اُٹھا کر ٹوکری میں رکھے اور شیر خان نے ٹوکری اُوپر اُٹھائی۔ دوسری بار ٹوکری نیچے آئی اور جوں ہی رشیدہ ٹوکری میں بیٹھی، میں نے طویل چھلانگ لگا کر اُسے گھسیٹ لیا۔"

"اوں ہُوں..." خان کی ناک سے غرّاہٹ اُبھری۔ "بولتے رہو، میں سن رہا ہوں۔"

"میں نے لڑکی کے عوض شیر خان سے آزادی طلب کی۔ وہ خاموشی سے نوٹ گیا۔ ایک رات اور ایک دن وہ دکھائی نہ دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے چلا گیا ہوگا... پھر وہ کل رات آیا اور اُس نے میرا مطالبہ پورا کر دیا۔"

"کچھ اُلجھن باقی ہے، خرم سلطان! وہ بھی دُور کر دو۔" خان سرد آواز میں بولا۔ "شیر خان کی موت اور رشیدہ کا فرار کس خانے میں فٹ کرو گے؟"

"میرے اُوپر پہنچتے ہی اُس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "بس، ایک دفاعی ہاتھ اُسے لگانا پڑا۔ لڑکی مجھ بے ہوش ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔ جب میں باہر نکلا تو وہ میری منتظر تھی۔ اُس نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ بھی قیدی ہے۔"

"جانتے ہو، اُن بنڈلوں میں کیا تھا؟"

"ہاں، رشیدہ نے بتایا تھا۔"

"تو تم شیر خان کے قاتل ہو۔"

"نہیں، خان!" میں نے پُرزور الفاظ میں تردید کرتے ہوئے کہا۔ "جب میں وہاں سے چلا تو وہ زندہ تھا۔ وہ تمہارا مجرم تھا، میری اُس سے کوئی دُشمنی نہیں تھی۔"

"میں تمہیں ایک غدّار کو سزا دینے پر انعام دینا چاہتا ہوں، خرم! وہ تمہارے ہاتھوں نہ مرتا تو میں اُسے مار دیتا۔ میں دوستی اور دُشمنی، دونوں جذبوں کے سلسلے میں ذرا دوسری قسم کا واقع ہوا ہوں۔ دوست کے لیے جان تک داؤ پر لگا دیتا ہوں اور دُشمن کی جان لے لیا کرتا ہوں۔"

"میرے بارے میں فیصلہ کرو، خان!"

"اب فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تم ہو، لڑکے!" اُس نے دھڑکتی

کی چھوری بھی ہو سکتی ہے۔ کاش، شیر خان غدّاری نہ کرتا تو میں... وہاں فیصلہ کرتا۔"

"پیش کش تم نے کی تھی، خان! اور پھر تم ہی نے پرکھ کی شرط سنانے میں رُکاوٹ ڈال دی تھی۔ میں نے تو اُسی رات تمہاری پیش کش قبول کر لی تھی کیونکہ میں اب یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ ننگ کو نہ سہی، میرے خاندان کو میری ضرورت ہے اور میں اب پرچون کی دُکان یا ٹیل کی ہتھی کے قابل نہیں رہا۔ مجھے یہاں بزنس کے لیے میدان اور ساتھی درکار ہوں گے۔ میدان اور افرادی قوت آپ کے پاس ہے اور پھر میں باڈی گارڈ کی حیثیت قبول نہیں کروں گا۔ کیونکہ مانتی تو میں نے تب بھی قبول نہ کی تھی، جب میں بے وسیلہ اور ناتجربے کار مسافر نوجوان تھا... اُس وقت بھی میں نے بڑے بڑے شہ زوروں کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ اس لیے اب برابری کا درجہ میری پہلی شرط ہے۔"

"برابری کی بات بہت اُونچی ہے، خرم! کیا تم سرمایہ لگا سکتے ہو؟" خان نے پوچھا۔

"نہیں، خان!" میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "فی الحال، صرف اپنا تجربہ اور زورِ بازو لگاؤں گا۔"

"وضاحت کرو۔"

"میں اپنے وسائل سے مال اور منڈیاں تلاش کروں گا... میرے ساتھ سابقہ ذرائع اور دوست ہیں، میں ان رابطوں سے کام لوں گا۔"

"ٹھیک ہے... لیکن شراکت ہر سودے کی بنیاد پر ہوگی۔ جو مال حاضر اسٹاک میں ہے، اس کا ففٹی پرسنٹ منافع تمہیں ملے گا۔ اس کے بعد سرمایہ کی بنیاد پر۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں، اُصول کی حد تک۔" میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "لیکن میری چند شرائط ہوں گی جن کا تعلق میری ذات اور میری آزادی سے ہے۔ میں آزادانہ کام کروں گا، میرے کام میں مداخلت نہ کی جائے گی۔ میرے کچھ مسائل بالکل ذاتی ہیں۔ میں فاروق چوہدری کے حلق تک اُنگلی لے جا چکا ہوں، وہ صرف اغوا کا مجرم ہے۔ میرے باپ کا قاتل کوئی اور ہے، میں اُس قاتل کو بھی تلاش کروں گا۔ فاروق چوہدری کی قسطیں بھی ابھی مجھ پر قرض ہیں۔ مجھے بہت سے محاذوں پر کام کرنا ہوگا۔ لہٰذا میں چاہوں گا کہ مجھے آزادی دی جائے لیکن میری نگرانی کی حماقت نہ کی جائے، خان! کیونکہ اب تمہیں میری ذات پر یقین کر لینا چاہیے۔ اگر اب بھی کوئی شک ہے تو مجھے بتا دو، میں کسی دوسرے محاذ پر چلا جاؤں گا جب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شک دُور ہو جائے تو مجھے بُلا لینا لیکن یاد رکھو، جس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ تمھارا دل میری طرف سے صاف نہیں تو دوستی دُشمنی میں بدل جائے گی اور میں دُشمن کی تلاش میں زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی پہنچ جاؤں گا... اور پھر بادام جوزی نے تم کو یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں نے اُن دُشمنوں کو بھی اتنی ہی گہرائیوں میں اُتر کر ڈھیر کیا ہے، جن کا نام سُن کر بڑے بڑے جی دار تھرّا اُٹھتے تھے۔"

"بس، سب ٹھیک ہے۔" وہ پُرجوش آواز میں بولا۔ "میں بے حد خوش ہوں۔ میں تنہا تھا لیکن اب میرے اندر نئی طاقت آگئی ہے، مال میرے پاس ہے بلکہ میں کان کا مالک ہوں۔ منٹیاں تم تلاش کرو، کان سے مال میں سپلائی کروں گا۔ اب رابطے کا طریقہ کار طے ہو جانا چاہیے۔ ظاہر ہے، تم میرے ساتھ تو رہو گے نہیں۔"

"ہاں، احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہم دُور رہ کر ایک رہیں۔"

"کل تم میری ایک کوٹھی میں منتقل ہو جاؤ۔" وہ کہنے لگا۔ "وہاں ٹیلی فون ہے جس کا اندراج کسی جگہ نہیں۔ مجھیں خدمت کے لیے ملازمین بھی مل جائیں گے۔"

"کیا اس سیٹ کا رابطہ صرف کسی مخصوص سیٹ تک محدود ہے؟"

"نہیں، تم ہر نمبر پر بات کر سکو گے۔"

"گڈ..." میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ "اب ایک خوش خبری بھی سُن لیں۔ فلپائن کا ایک گریجویٹ ماسٹر ان دنوں مال کی تلاش میں اِدھر آیا ہوا ہے۔ ہم وہاں سے ساتھ ہی آئے تھے۔ آپ زیادہ سے زیادہ مال تیار رکھیں، میں اُسے گھیر لاؤں گا۔ میں بروکر بن کر معاملہ طے کراؤں گا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔"

"واہ... واہ!" خان نے مجھے چھیڑا۔ "لڑکے، تم نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ آؤ اب گھر چلیں۔ میں اپنے اندر تمھارے لیے بڑے نرم گوشے محسوس کرنے لگا ہوں، جیسے کسی بُوڑھے کو مضبوط لاٹھی کا سہارا مل گیا ہو۔" اُس نے ریسیور اُٹھا لیا۔ "ڈرائیور! اب گھر چلو۔"

یقیناً کار اُس وقت خان کی کوٹھی کے قریب رہی ہوگی کیونکہ پانچ منٹ بعد کار رُک کر، ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا تھا۔ خان نے باہر نکل کر ڈرائیور کی جگہ لے لی اور مجھے بصد احترام ہاتھ تھام کر ساتھ لے لیا اور ڈرائیور حیرتوں میں ڈوبا ہوا ایک طرف کھڑا تھا کیونکہ ایک رات قبل خان کو جس شخص نے ضرب لگائی تھی، اُسی شخص کو خان، عزت و احترام سے نواز رہا تھا۔ اُس نے سوچا ہوگا، بڑے لوگوں کے دل بھی بڑے ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ضربوں سے نہ مرتے ہیں،

نہ کسی کو مارتے ہیں۔

نیم وا کواڑوں کو اُس نے ٹھوکر ماری اور میری پُشت پر ہاتھ رکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دستک دینے کا وہ اکھڑ انداز میرے لیے بالکل نیا تھا۔ ایک معمّر خاتون نے بھانک کر دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر ایک طرف ہو گئی۔

اندر سے جو آوازیں آ رہی تھیں، وہ تیلی وژن کی تھیں۔ شاید کوئی انگریزی پروگرام تھا۔ خان مجھے ایک بازو کے گھیرے میں لیے ہوئے اندر داخل ہُوا۔ زیرو پاور کے سبز بلب اور ٹی۔ وی کی روشنی نے مل کر کمرے میں خوش گوار تاثر قائم کیا ہُوا تھا۔ معمّر خاتون نے پہلے دونوں لڑکیوں کو چھپایا پھر اُن کے سروں پر شالیں ڈال دیں۔

"رالبعہ خانم..." خان نے کہا۔ "بچیوں کو لے جائیں۔ اگر کوئی دلچسپ پروگرام ہے تو میرے کمرے میں جا کر دیکھیں۔"

ایک تو وہی تھی جس کی آنکھوں نے میرے بدن میں تھرتھری جگائی تھی، دوسری اُس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں سر جھکائے خاموشی سے باہر نکل گئیں۔ اگر اُن کو روکنے کا میں حق دار ہوتا تو اُن کو نہ جانے دیتا۔ وہ ٹی۔ وی دیکھتی رہتیں اور میں اُن کو دیکھتا رہتا۔ خوش رنگ پھُول کسے اچھے نہیں لگتے۔ میری یہ عادت بُری سہی لیکن میں نے ہمیشہ خوش رنگ اور خوش بُو کا احساس جگانے والے پھُولوں کو صرف شاخ کی حد تک چاہا اور دیکھا ہے۔ میری خواہش کی آنکھیں پھُول کو شاخ پر زندہ رہنے اور مُسکرانے کا حق دیتی رہی ہیں۔ میرے نزدیک پھُول کا مقام شاخ ہی ہے۔ ضروری نہیں کہ خوش نظر پھُول کو توڑ کر ہی دیکھا جائے۔

"بی بی! قہوہ اور ڈرائی فروٹ۔" رنگ باز نے بشاش لہجے میں رالبعہ خانم سے کہا اور ٹی۔ وی کا بٹن آف کر کے میرے قریب بیٹھ گیا۔ ہر کمرے میں چھوٹا سیٹ ہے لیکن بچیاں عموماً بڑے اسکرین پر پروگرام دیکھنا پسند کرتی ہیں۔"

"ہر بچے میں جبلّت ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی فطرت میں یہ ضد ہوتی ہے، اُسے جس چیز سے دُور رکھا جائے، وہ حیلے بہانوں سے اُس چیز کو نزدیک سے دیکھتا ہے۔"

"ہاں، یہ بڑے اور چھوٹے کا کھیل جاری رہتا ہے۔ بڑا اپنا فرض ادا کرتا ہے اور چھوٹا اپنا حق استعمال کرتا ہے۔ مثلاً حیثیت باپ کے میں اپنی بیٹیوں کو ہر اُس آنکھ سے اوجھل رکھنا پسند کرتا ہوں، جو اُن کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہو لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ میری آنکھوں سے اوجھل کھلی فضاؤں میں رہ کر گزارتی ہیں۔"

"اُن میں احساس ذمّے داری اور خود اعتمادی اُجاگر کیجیے۔" خان! میں نے بزرگانہ انداز میں کہا۔ "بے جا روک ٹوک بچّوں میں احساسِ جرم پیدا کر کے اُنھیں دُہری زندگی اپنانے پر مجبور کر دیتا ہے اور بزرگوں کے لیے اُن کا رویّہ اور رُوپ پہلے جیسا ہی ہوتا ہے لیکن باہر نکلتے ہی وہ دوسرا رُوپ اختیار کر لیتے ہیں۔"

"تمھیں زندگی نے بہت جلد بہت کچھ دے دیا ہے خرّم..." وہ پُرستائش نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ "تم اپنی عُمر سے بہت آگے کی باتیں کرتے ہو۔ میں تو احساس کمتری محسوس کرنے لگا ہوں۔ لگتا ہے، مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ میں دراصل کنویں کا مینڈک رہا ہوں۔ برس نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔ علم، کتابوں اور درس گاہوں میں داخل ہو کر حاصل ہوتا ہے اور تجربہ، وسیع و عریض دُنیا کو دیکھنے... خُود کو آزمائشوں میں ڈالنے اور دوسروں کو پرکھنے سے پُختہ ہوتا ہے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا، خان! جب میں یہاں سے اُدھر گیا تو دال کے پتھر بھی مجھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوئے تب میں نے ٹھوکروں کے حوالے کر دیا۔ ہر ٹھوکر نے مجھے نیا تجربہ اور نیا شعور دیا۔ اگر ہمارا ساتھ رہا تو میں آپ کو اُس دُنیا میں لے چلوں گا جہاں لوگ اشاروں سے، بڑے بڑے شکار گرانے کا فن جانتے ہیں۔ میں نے اُڑنے والے فن کاروں سے مقابلہ کیا ہے خان!"

ملازمہ ٹرالی اندر لائی۔ رنگ باز نے اُسے واپس کر دیا اور خود دو بلّوریں پیالیوں میں قہوہ ڈالا۔ پھلوں میں ہر وہ پھل شامل تھا جسے خشک کیا جا سکتا تھا۔ میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا، اس لیے خشک میوے سے پیٹ بھرنے لگا۔ میرا انداز وحشیانہ ہی تھا جو میں نے جان بُوجھ کر اپنایا تھا۔

میں رنگ باز خان پر خود کو ایک وحشی صفت نوجوان ظاہر کرنا چاہتا تھا اور میں اس میں کامیاب بھی رہا تھا کیونکہ وہ دلچسپ نگاہوں سے میرے اس وحشی انداز کو دیکھ رہا تھا۔

"تمھارا وہ دوست پہلے مرحلے میں کس قدر مال اُٹھا سکتا ہے؟" قہوے کا سپ لیتے ہوئے خان اصل موضوع پر آ گیا۔ "اور ادائیگی کی صورت کیا ہوگی؟"

"وہ ایک فلپائنی کا نوڈ خریدنے کی سکت رکھتا ہے... وہاں اُس کا حریف صرف میں تھا۔ میں نے دو بڑے مگرمچھوں کو مار کر، بین الاقوامی گروہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ مسٹر بیگن نے چونکہ بُرے وقت میں میری پُشت پر ہاتھ رکھا تھا، اس لیے میں نے اُسے فلپائن کا ایک جزیرہ دے دیا تھا۔ اب وہاں میرے گروہ کی ماداؤں ایک رحم دل عورت ہے، اس لیے یقیناً بانگ کانگ سے لے کر سارے فلپائن تک بیگن قدم جمانا چاہے گا۔ جتنا وسیع میدان ہوگا، اُسی قدر مال بھی درکار ہوگا، اُسے۔"

"اوہ..." خان ہونٹ چبانے لگا۔ "فی الحال میں زیادہ مال نہیں دے سکتا تم اُسے قابو میں رکھو، خرّم! اِدھر ایک دو اور بھی تیز مارکیٹ میں۔ مجھے سلیمان سے خطرہ ہے، وہ اُسے نہ گھیر لے۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا خان محترم!" میں نے سرد آواز میں کہا۔ "اب چھوٹی مچھلیوں کو خان کے پیٹ میں آنا پڑے گا۔ اس شہر ہی میں نہیں، بلکہ پُورے مُلک میں صرف رنگ باز خان کا نام چلے گا۔ میں نے چھوٹی... چھوٹی دُکانوں کو کبھی نہیں چلنے دیا۔ مجھے ایسی تمام چھوٹی مچھلیاں دِکھا دیں اور اُن کو نگلنے کے لیے اپنا حلق کھلا رکھیں... سلیمان اُسے وار تو فٹ پاتھ پر پیٹ کر فروخت کر سکتا ہے لیکن جہاں رنگ باز نیچے گا، وہ کوئی دوسرا نہیں بیچ سکے گا۔"

"اوہ... اوہ!" خان نے میرا شانہ تھپتھپایا۔ "ابھی نہیں، جلد بازی نہیں۔ ہم آہستہ آہستہ بازو پھیلائیں گے۔ سیمان اتنی چھوٹی مچھلی نہیں ہے جسے میں ایک بار ہی نگل لوں۔ نہیں، پیارے بیٹے! اپنی جگہ اپنے سمندر میں وہ بھی بڑا مگرمچھ ہے۔"

"کوئی بات نہیں، خان!" میں نے بے پروائی سے کندھے جھٹکاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو سلیمان کے ٹکڑوں کی صورت میں پیش کروں گا۔ جس طرح میں نے مچھ جُو اور چنگ چی جیسے بڑے مگرمچھوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نگل لیا تھا۔"

"تم... تم..." وہ ہکلانے لگا۔ "مجھے خوف زدہ مت کرو لڑکے! میں ذرا دوسری قسم کا بزنس مین ہُوں۔ میری ذات کی سطح سمندر کی طرح پُرسکون رہتی ہے۔ یہاں کی فضائیں اُدھر سے مختلف ہیں۔ پہلے ان فضاؤں کا مزہ چکھ لو، پھر تم جو کہو گے، میں وہی کروں گا۔"

"آپ کی سطح پُرسکون ہی رہے گی، خان!" میں نے اُسے تسلی دی۔ "میں آپ سے دُور رہ کر تنہا شکار کھیلوں گا۔ آپ کے نام کی پلیٹ میرے گلے میں نہیں ہوگی۔ آپ کا کام صرف شناخت کی حد تک ہوگا۔"

"ٹھیک ہے خرّم! میں تمھیں سلیمان تک پہنچا دوں گا۔" اُس نے گہری سانس لی۔

"شکریہ، خان!" میں نے قہوے کا آخری گھونٹ حلق میں اُنڈیلتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"اوہ... نہیں، آج رات میرے ساتھ رہ جاؤ۔ اس وقت کہاں جاؤ گے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں گھر جاؤں گا خان، وہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

"سنو پیارے!" اس نے میرے بالوں کو پیار سے بکھیر دیا... "کوئی مالی پریشانی ہو تو بتا دو۔ قرض حسنہ ہی سہی لیکن مجھے خوشی ہوگی۔"

"ابھی نہیں خان، جب کبھی کوئی ایسی پریشانی سامنے آئی تو بتا دوں گا۔"

"چلو، میں تمہیں چھوڑ آؤں۔"

"نہیں خان!" میں نے معذرت کر دی۔ "مجھے کئی ہلوں میں تھانکنا ہے۔ فاروق چوہدری نے کچھ اشارے دیے ہیں اور میں اپنے خانگی معاملات میں آپ کو ملوث نہیں کر سکتا۔ آپ کا اصول مجھے پسند ہے، گھر اور بزنس الگ الگ خانوں میں محفوظ رہتے ہیں۔"

خان گیٹ تک میرے ساتھ آیا۔ اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے مجھے شب بخیر کہا۔ میں نے تقریباً ایک فرلانگ تک پیدل چلتے ہوئے گرد و پیش پر گہری نگاہ رکھی تھی... کیونکہ میں تعاقب کے خطرے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر رنگ باز خان میری چال کے رنگ میں پوری طرح نہ ڈوبا ہوتا تو اسے اپنے خفیہ ذرائع کو متحرک کرنا چاہیے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میرے لیے مشکلات کھڑی ہو سکتی تھیں۔

مجھے اپنے گروہ سے رابطہ ہی نہیں رکھنا تھا بلکہ ان سے کام بھی لینا تھا۔ اگر کوئی خفیہ آنکھ مجھے ان لوگوں سے ملتے دیکھ لیتی تو خان بدک سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے خود کو پاکستان میں تنہا ظاہر کیا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی خطرہ میرے اردگرد نہیں ہے تو میں نے ٹیکسی روکی اور بیگن کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔

مال روڈ تک ٹریفک کے درمیان ٹیکسی چلتی رہی تھی۔ میں عقب نما آئینے پر نگاہیں جمائے، ہر آتی جاتی گاڑی کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ میری کامیابی کا انحصار ہی اس بات پر تھا کہ رنگ باز خان میری نگرانی نہ کرا رہا ہو۔ جب ٹیکسی پشاور روڈ سے دوسری سڑک پر مڑی تو مجھے اطمینان ہو گیا۔ کیونکہ پیچھے آنے والی سرخ کار آگے نکل گئی تھی... پھر میں نے ٹیکسی پانچ چھ سو گز دور چھوڑ دی۔

کاٹیج میں بیگن اور رشیدہ جاگ رہے تھے۔ بیگن نے صرف استقبالیہ مسکراہٹ دی لیکن رشیدہ لپک کر اٹھی اور میرے قریب آ کر مزاحیہ لہجے میں بولی۔ "تمہاری تربیت غلط ہوئی ہے یا تم بڑے ہو کر آوارہ ہونے ہو۔ بھلا یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا؟"

"بڑا ہو کر آوارہ ہو گیا ہوں آپا جی!" میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے مؤدب انداز میں جواب دیا۔ "اماں بی تو سورج ڈوبنے کے بعد آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔"

"سچ، تمہیں بہت پریشان کرتے ہو۔" وہ روٹھے ہوئے انداز میں بولی۔ "انکل بھی پریشان تھے۔"

"بزرگ لوگ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں۔" میں نے تسمے کھولتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ جوانی میں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اب تو کھانا لگاؤں پیاری لڑکی!" بیگن بولا۔ "تم لوگوں نے میرا ٹائم ٹیبل بھی گڑبڑ کر دیا ہے۔"

"یہ تم عورتیں سب ایک جیسی ہوتی ہو۔" میں نے قدرے غصیلی آواز میں کہا۔ "اپنائیت کا بس ایک ہی انداز، آنسو بہانا... اور کھانے کی میز پر انتظار کرنا۔"

"ہمارے بس میں اور ہوتا ہی کیا ہے محترم!" رشیدہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "ایثار اور آنسو ہی ہمارا اثاثہ ہیں۔"

ہم ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ رشیدہ اٹھ گئی۔ میں نے اس کی غیر حاضری میں بیگن کو رنگ باز خان کی رپورٹ دی۔ رشیدہ، انگریزی بول اور سمجھ تو سکتی تھی لیکن بالکل کوری بھی نہ تھی... گفتگو میں رنگ باز خان کا نام آتا تو وہ کوئی سوال کر سکتی تھی۔ میں اسے اب اس دنیا کی باتوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

"ملاقات کا کوئی وقت طے ہوا؟"

"ابھی نہیں۔" میں نے بتایا۔ "اسے دو دن ڈھیل دینی چاہیے۔ کل میں اس کی کوٹھی میں منتقل ہو جاؤں گا۔ سلیمان کے بے بھی حال بچھا آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں دونوں سانڈ آپس میں ٹکرا جائیں۔ اس طرح دونوں کا وقت اور قوت ضائع ہو گی۔"

رشیدہ میرے لیے لانگ سائز مگ میں دودھ اور بیگن کے لیے کافی لے آئی۔ "انکل، محترم کو بتا دیں، نا؟"

"بتانے سے بہتر ہو گا، یہ خود محسوس کر لے۔"

"کیا سازش ہو رہی ہے؟ اچھے لوگو؟" میں نے دونوں کی جانب دیکھا۔ رشیدہ سر جھکائے ناخن کر رہی تھی اور بیگن اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"باپ اور بیٹی، تم جیسے پیارے بیٹے اور بھائی کے خلاف کیسی سازش کر سکتے ہیں۔" بیگن بولا۔ "میں نے رشیدہ کو بیٹی بنا لیا ہے اور یہ میرے ساتھ رہے گی۔"

میں نے رکی ہوئی سانس چھوڑ دی۔ رشیدہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور التجا ساتھ ساتھ تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔

"مسٹر بیگن!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "رشیدہ جیسی نازک اندام لڑکی کے پاؤں، ہماری سنگلاخ اور گرم دنیا کے لیے

موزوں نہیں ہیں۔ میں اس کے لیے ایک پرسکون گھر اور سائے دار درخت کا انتظام کر رہا تھا۔"

"جب بھی ایسا انتظام ہو گا، باپ اپنی بیٹی کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اردو میں کہا اور رشیدہ کا دھواں دھواں چہرہ، ایک دم خوشی سے چمک اٹھا۔

"محترم..." وہ مضبوط آواز میں بولی۔ "میں، رنگ باز کے لیے بہت عرصے تک کام کرتی رہی ہوں۔ اگر میرا اندازہ غلط ہے تو مجھے معاف کر دینا لیکن میرا خیال ہے کہ رنگ باز اور تمہارے درمیان کوئی تعلق ضرور ہے، ورنہ تم تہ خانے میں نہ اترتے۔ اگر تم لوگ اسی دنیا سے تعلق رکھتے ہو تو میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔"

"بس..." میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے جھڑک دیا۔ "دماغ خراب نہ کرو، اپنا۔ اگر یہاں رہنا ہے تو تابعدار بیٹی اور وفادار بہن بن کر رہنا ہو گا۔"

"شکریہ محترم سلطان!" وہ برتن ٹرے میں رکھنے لگی۔ "میں خود کو اس گھر میں باپ اور بھائی کی خدمت کے لیے وقف رکھوں گی۔"

اس نے آنسو شال میں جذب کر لیے اور برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

صبح، رشیدہ نے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو میری آنکھ کھل گئی۔ اس نے ہماری وجہ سے روشنی نہ کی تھی، کمرے میں نیم تاریکی تھی اور اذان کی آواز آ رہی تھی۔ بہت دنوں بعد میرے اندر کا نحیف انسان، اذان کی خوراک سے متحرک ہوا تھا۔ ایسا دورہ کبھی کبھی اچانک ہی پڑتا تھا ورنہ دنیا کے ہنگاموں میں مجھے اس انسان کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔

میں نے اٹھ کر ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ تھوڑی دیر بعد رشیدہ چہرہ پونچھتے ہوئے باہر نکل آئی اور میں اس سے تولیہ لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ پانی ٹھنڈا تھا لیکن مجھے پاک معبود کے دربار میں داخل ہونے کے لیے جسمانی کثافتیں صاف کرنا تھیں۔

غسل سے فارغ ہو کر میں نے دھلی ہوئی بیڈ شیٹ نکالی اور باہر لان میں نکل گیا۔ جب میں قبلہ رخ کھڑا ہوا تو رشیدہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے مجھے دیکھ رہی تھی۔

نماز سے فارغ ہوا تو بیگن اوور کوٹ، شانوں پر ڈالے لان میں ٹہلتا دکھائی دیا۔ "نیک لوگوں کے ساتھ نیکی کے فرشتے بھی گھر میں آنے لگتے ہیں۔" بیگن بولا۔ "تمہیں عبادت کرتے دیکھ کر مجھے عجیب سی راحت محسوس ہوئی ہے۔" رشیدہ نے لان میں آ کر میرے ہاتھ سے بیڈ شیٹ لے لی اور میں بیگن کے ساتھ، لان سے نکل کر سڑک پر چلا گیا۔

دائیں طرف، کوئی ایک فرلانگ دور، کوئی فوجی یونٹ مقیم تھی، جہاں ڈیری فارم کی گاڑی، دودھ کا ڈرم اتار کر واپس جا رہی تھی۔ فوج کا احساس، مجھے کئی دکھ دے گیا۔ ابا جی یاد آ گئے۔ ان کی دلی آرزو نے مجھے تڑپا دیا۔ اگر میں نے ان کی بات مان لی ہوتی تو آج میں پاک فوج کا ایک معزز آفیسر ہوتا۔ ابا جی کی زندگی اگر اتنی ہی تھی تو کم از کم ان کی روح مجھ سے ناراض نہ جاتی۔ دولت نہ سہی... خاندان کا اچھا نام ہوتا، زینت کو کوئی درندہ نہ اٹھاتا۔ وہ میری ہی رہتی۔ میں نے باپ کو ناراض کر کے، خاندان کو کتنی بڑی سزا دی تھی۔

"دلاور کا کوئی فیصلہ کرو، محترم سلطان!" بیگن کی آواز مجھے ماضی کی جلتی وادی سے نکال لائی۔ "وہ لڑکوں کو پریشان کر رہا ہے۔"

"کوئی نئی اطلاع ہے؟"

"ہاں..." بیگن نے بتایا۔ "وہ دروازے توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے دیوار پار رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ماسٹر! میں آج اس سے مل لوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر اس نے میری بات مان لی تو اسے چھوڑ دوں گا ورنہ کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ میں اس پاگل گتے کو بادِ ثوق ضمانت کے بغیر آزاد نہیں کر سکتا۔ وہ میرے خاندان کو پریشان کرے گا۔"

"لیکن اسے آبادی میں زیادہ عرصے قید بھی نہیں رکھا جا سکتا۔"

"میں سمجھتا ہوں، ماسٹر!" میں نے پلٹتے ہوئے کہا۔ "... آج کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔"

رشیدہ نے اجازت لے کر ناشتہ لگایا۔ پراٹھے دیکھ کر بیگن ہنسنے لگا۔ "اب تو مجھے مکمل پاکستانی بننا ہو گا۔"

"نہیں انکل!" رشیدہ بولی۔ "آپ کی پسند کا خیال رکھا جائے گا۔"

"اب میری پسند وہی ہو گی جو میری بیٹی کی ہو گی۔" اس نے پراٹھے کا نوالہ بناتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ "بس، ذرا معدے کو منانا پڑے گا۔"

ٹھیک سات بجے، میں اور بیگن تیار ہو کر جب چلنے لگے تو رشیدہ نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے دیکھا، وہ سودا سلف کی فہرست تھی۔ قہقہہ میرے اندر ہی مچل کر رہ گیا۔ محترم سلطان اب نمک، مرچ اور پیاز خریدنے والا شخص بن گیا تھا لیکن میں اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ہماری ایک ایک ضرورت کو مدنظر رکھ کر فہرست تیار کی تھی۔ وہ ہمیں گھر کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سگون دینا چاہتی تھی، میں نے کاغذ جیب میں رکھ لیا۔

بیگن نے سب کو ایک جگہ جمع ہونے کی اطلاع ٹیلی فون پر دے دی تھی۔ جب ہم لال کرتی والی رہائش گاہ میں داخل ہوئے تو وہ چاروں ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔

"سنا ہے، میرا دوست بہت پریشان کرنے لگا ہے؟"

"جی ہاں، جیف!" کو نزنے جواب دیا۔ "ہمارے ہاتھ پاؤں آپ کے حکم نے جکڑے ہوئے ہیں ورنہ اُس کی خرمستی دُور کر دیتے۔"

"چلو، میں اُس کی مزاج پُرسی کرنے آیا ہوں۔" میں نے بیگن کو مخاطب کیا۔ "ان سے چابی لے لو۔ ہم دونوں اُس سے ملیں گے۔"

بیگن نے جوں ہی دروازہ کھولا، میں اُسے باہر ہی رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دلاور بیڈ پر نیم دراز، اخبار پڑھ رہا تھا۔ اُس نے اخبار سے نگاہیں اُٹھا کر چہرہ گھمایا اور پھر اُس کی آنکھیں جیسے پتھرا کر رہ گئیں۔

"تم... تم..." اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے اور وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"میں خالی ہاتھ تمہارے سامنے آیا ہوں، دلاور بھائی!" میں نے دونوں ہاتھ سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "آرام سے میری ایک بات سُن لو پھر میں تمہیں پوری آزادی دوں گا۔"

اُس نے مٹھیاں بھینچ کر شاید خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تم مجھے اپنے باپ کا قاتل سمجھتے ہو۔" میں نے مضبوط آواز میں کہا۔ "اُس رات تم اپنے باپ کا بدلہ لینے حویلی تک گئے تھے۔ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو بات اُسی رات صاف ہو جاتی میرے بھائی، ہم دونوں ایک ہی تیر کے گھائل ہیں۔ ایک ہی ناگ نے ہم دونوں کو ڈسا ہے۔ تم نے سُنا اور دوڑ پڑے۔ دُشمن کیا چاہتا ہے، تم نے غور نہیں کیا۔ وہ ہماری عدم موجودگی میں کھل کھیلتا رہا۔ پھر جب اُسے معلوم ہوا کہ خرم سلطان واپس آ رہا ہے تو اُس نے اُسی رات اُن تینوں کو قتل کروا دیا جن کا تعلق چوہدری سلطان خان کے قتل سے تھا، اُس کے گرگے قاتل تھے اور چاچا سجاول خان اُس واقعے کا واحد چشم دید گواہ تھا۔ فاروق چوہدری نے دوسری بار بھی ایک تیر سے کئی شکار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خرم سلطان، پاکستان کی زمین پر قدم رکھتے ہی قاتل بنا دیا جائے۔ خرم سلطان گرفتار ہو جاتا تو دلاور کو حویلی پر انتقام کی آگ برسانے پر تیار کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح وہ دو حریف خاندانوں کا صفایا کروانا چاہتا تھا۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟" دلاور نے کھنکھناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ٹکٹ، دلاور بھائی!" میں نے جواب دیا۔ "جس فلائیٹ سے مجھے آنا تھا، وہ فلائیٹ موسم کی خرابی کے باعث ملتوی ہو گئی تھی۔ فاروق چوہدری نے پوسٹ مین سے اطلاعی ٹیلی گرام وصول کر کے پروگرام ترتیب دیا تھا۔"

میں نے وہ ٹکٹ جو رات سونے سے قبل حسبِ ضرورت بدل لیا تھا۔ اُس کی جانب بڑھایا۔ بیس کے صفر کو ہلکی سی روشنائی سے دو بنا کر بائیس تاریخ بنائی تھی۔

"قتل اکیس کی رات کو ہوئے اور میں بائیس کو وہاں سے روانہ ہوا ہوں۔"

اُس نے ٹکٹ کو سرسری انداز میں دیکھا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "لیکن مجھے یہاں کون بلایا تھا؟"

"میرے دوست!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مسٹر جان! اندر تشریف لائیے۔"

بیگن نے اندر آ کر دلاور سے مصافحہ کیا۔ "میں نے ان کو بذریعہ ٹیلی گرام حویلی کی نگرانی پر مامور کر دیا تھا۔ اُنھوں نے خوش اسلوبی سے ناخوش گوار حادثے کا راستہ روک دیا تھا۔ اگر یہ بروقت قدم نہ اُٹھاتے تو آج فاروق چوہدری قہقہے لگا رہا ہوتا اور ہم لوگ مزید تباہ ہو چکے ہوتے۔"

"ٹھیک ہے، خرم!" دلاور دانت پیستے ہوئے غرایا۔ "میری عقل کی آنکھیں اُس نے اندھی کر دی تھیں۔ اُس نے مجھے تمہارا نام بتایا تھا۔ شکریہ دوست! تم دیکھو گے، دلاور اُس مکار لومڑ کا کیسا حشر کرتا ہے۔"

"حشر تو میں کر آیا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "نشر تم کر لینا... میں نے دو قسطیں وصول کی ہیں لیکن یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے۔ میں اُس کا جبڑا، آنکھ اور ایک بازو توڑ چکا ہوں۔ ان دنوں وہ ہوٹل فیملی میں پڑا ہوا ہے۔ اب ذرا اُسے پاؤں پاؤں چلنے دو، دلاور خان یا اس طرح مزا نہیں آئے گا۔ ہر زخم جب مندمل ہو جائے گا تو ہم باری باری نیا زخم لگایا کریں گے۔ اُس کی سزا، ایک بار موت نہیں بلکہ اُسے زندہ رکھ کر ہم بار بار موت دیتے رہیں گے۔"

"یقیناً..." وہ گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ ایسی ہی سزا کا حقدار ہے۔"

"اب کوئی شک؟"

"نہیں..." اُس نے نفی میں گردن ہلائی۔ تب میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُس نے بانہیں پھیلا کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں واقعی اندھا ہو گیا تھا، خرم! مجھے تم معاف کر دو اور گھر والوں تک بھی

میرے جذبات پہنچا دینا۔"

"ہم دونوں بھائی جب شانہ بہ شانہ چلتے گاؤں کی گلیوں سے گزرتے حویلی میں داخل ہوں گے تو تمہارے جذبات پورے علاقے میں محسوس کیے جائیں گے۔" میں نے گردن موڑ کر بیگن کو مخاطب کیا۔ "مسٹر جان! آپ ہمارے لیے گاڑی کا انتظام کریں گے۔ ہم آج ہی گھر جا رہے ہیں۔"

"بہتر جناب!" بیگن نے کسی زرخرید غلام کی طرح گردن کو خم دے کر جواب دیا۔ "میری گاڑی لے جائیں۔"

"شکریہ جان!" میں نے بیگن کے شانے پر تھپکی دی۔ "میں کوشش کروں گا کہ شام تک ہماری گاڑی واپس آ جائے۔ ویسے فکر نہ کرنا۔"

دلاور کو باہر چھوڑ کر میں اندر گیا۔ سلیمان کا ایجنٹ اسٹور روم میں بند تھا۔ میں ملیک اپ میں نہ تھا، اس لیے اُس کے سامنے نہیں گیا... بیگن باتھ روم میں تھا۔ میں نے کونز اور سلوا کو سلیمان کی نگرانی کا حکم دیا اور دلاور کو لے کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔

دلاور خان میرے دشمن کو جانتا تھا مگر میں دشمنی کی جلتی ہوئی رسی کاٹ چکا تھا۔ میں اُن روایات کو جاری رکھنے کے حق میں نہ تھا جو نسل در نسل جلتی ہوئی رسی درمیان رکھتی ہیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ پرانی دشمنیاں ختم ہو جائیں اور لوگ امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔ وہ طاقت جو ایک دوسرے کو گولے مارنے اور تباہ کرنے پر ضائع ہوتی ہے، وہ کھیتوں کی زرخیزی کو دی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے دلاور خان کو دوسرے راستے پر لگا دیا تھا۔

"ایک بات مانو گے، خرم!" اسکول کے گراؤنڈ میں کار رُکتے ہی دلاور خان نے ممنونانہ آواز میں کہا۔

"تمہارے بھائی حکم کیا کرتے ہیں۔" میں نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

"پہلے میرے گھر چلو۔"

"ضرور چلیں گے میرے بھائی۔" میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "جب تمہارا ہونا بھائی جمع ہو گیا ہے تو ہم کسی طرف سے بھی داخل ہو سکتے ہیں۔"

جونہی ہم گلی میں داخل ہوئے جو دیکھتا، وہ ٹھٹک کر رُک جاتا۔ دلاور خان نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا اور جان بوجھ کر بے وجہ قہقہے لگا رہا تھا۔ مقصد صرف دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں کو حیرت زدہ کرنا تھا۔ وہ لوگ جنھوں نے کل دلاور خان کو پاگل ہاتھی کے روپ میں حویلی سے ٹکراتے دیکھا تھا، وہ شخص جس نے خرم سلطان کو قتل کرنے کا اعلان کیا تھا، وہی اب خرم سلطان کا ہاتھ تھامے اُسے اپنے گھر لے جا رہا تھا۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ پہلا باب تھا جس نے لوگوں کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔

دلاور خان کی حویلی میں داخل ہوئے تو وہاں بھی ٹھہری ہوئی زندگی میں وزنی چٹان ٹوٹ گئی تھی۔ دلاور کی بیوی ریشماں صحن میں بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے ہاتھ برتن پر جم گئے اور وہ خوف و حیرت سے پلکیں جھپکانا بھول گئی۔

"سلام بھابی!" میں نے چبوترے پر چڑھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ریشماں کے ہونٹ لرز کر پھیل گئے۔ وہ مسکرائی تھی لیکن ایسے ہی جیسے کسی کو چابک مار کر ہنسنے کا حکم دیا گیا ہو۔

"ریشماں..." دلاور بولا۔ "ہم تیری حویلی جا رہے ہیں۔ بہترین کھانا تیار کر لینا۔"

ریشماں نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور راکھ سے لتھڑے ہوئے ہاتھ لیے اندر بھاگ گئی۔

"چلو، خرم! ماں کے سامنے فی الحال جانا ٹھیک نہیں۔" دلاور نے کہا۔ "اُن کے کان بھی بھرے ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ کچھ کہہ بیٹھیں، اُن کو سمجھانا پڑے گا۔"

میں بھی عورتوں کے بکھیڑوں میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے منہ زور طوفان کا رُخ موڑنا تھا، عورتیں تو سرسراتی ہوائیں ہوتی ہیں... مجھے اُن سے کوئی سروکار تھا نہ خطرہ۔ دلاور میری منتظر میں تھا، گاؤں کے سامنے اُسے لا کر میں نے حویلی کے مخالفین کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ گاؤں میں رابطے کا نظام لاسلکی تھا، خبر چند لمحوں پر سفر کرتی، جنگل کی آگ بن کر ایک سرے سے دوسرے تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔

ہماری خبر بھی ہماری حویلی کی اونچی دیواریں پھاند کر ایک ایک فرد تک پہنچ چکی تھی۔ جب ہم بڑے دروازے سے داخل ہوئے تو اکرم بھائی سامنے کھڑے تھے۔ دلاور خان دو قدم آگے تھا۔ دونوں نے جھک کر خرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔" دلاور نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ "خرم سلطان نے میری غلط فہمی دور کر دی ہے۔"

"سب ٹھیک ہے، دلاور خان!" اکرم بھائی بولے۔ "تم یہاں چلے آئے، سب فاصلے مٹ گئے ہیں... خرم، تم اندر جاؤ۔"

"بہتر بھائی جان!" میں نے جواب دیا۔ "کھانا، دلاور بھائی کے گھر ہوگا۔ میں چائے بھجواتا ہوں۔"

"ہاں، عابدہ سے کہو، بھجوا دے گی۔" اکرم بھائی نے خشک آواز میں کہا اور میرا اٹھا ہوا قدم رُک گیا۔ ان کا چہرہ کسی بشاش انسان کا چہرہ نہ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خیریت تو ہے نا، بھائی جان؟"

"مظفر چوہدری آیا تھا۔"

"اچھا..." میرا سارا وجود پھڑک اُٹھا تھا لیکن دلاور خان کی وجہ سے میں نے ضبط سے کام لیا اور اندر چلا گیا۔ مظفر چوہدری، فاروق کا بڑا بھائی تھا۔ جن دنوں میں اور فاروق دوست تھے، مظفر چوہدری کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ بہت اچھا شکاری اور شہ سوار تھا اور رسہ گیروں کا سرغنہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اُس کا حویلی میں آنا میرے نزدیک دھماکے سے کم نہیں تھا۔

اگر اُسے فاروق چوہدری نے حویلی کی جانب بھیجا تھا... تو وہ دوستی کا پیغام دینے نہیں آ سکتا تھا۔ میں تیز تیز قدم اُٹھاتا، خالی اُجاڑ برآمدے سے گزر رہا تھا کہ ایک دم زینت سامنے آ گئی۔ میں اماں بی کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زینت کو سامنے دیکھ کر رُک گیا۔

"اندر چلو۔" زینت کے لہجے میں حکم کی کرختاہٹ تھی۔ اُس نے ایک طرف ہٹ کر راستہ دے دیا۔ اماں بی اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اُن کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اُن پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔

"اماں بی ٹھیک تو ہیں نا؟" میں نے جھرجھراتی آواز میں پوچھا۔ زینت کے ہونٹ کپکپائے اور پھر اُس کا ہاتھ تڑاخ سے میرے گال پر پڑا۔

"تم مرکیوں نہیں جاتے؟" وہ میرا گریبان پکڑ کر چیخی۔ "تم درندے ہو اور تمہاری تلاش میں درندے حویلی میں گھس کر ہماری چادریں پھاڑ جاتے ہیں۔"

"بس... بس کرو زینت!" اماں بی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "اس بدنصیب کو کیا کہتی ہو؟"

"کیا وہ... وہ اندر... یہاں تک آیا تھا؟" میں نے زینت کے ہاتھ سے گریبان چھڑا لیا۔ "بولو زینت! مجھے بتاؤ۔"

"اس نے... اس نے..." زینت نے ٹوٹتی آواز میں کہا۔

"اماں بی کو دھکا مارا اور کہا کہ خرم سلطان کو یہ نشان دکھا دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنا جھکا ہوا چہرہ جھٹکے سے اوپر اُٹھایا تو میرے آنسو اُچھل کر زینت کے ہاتھوں اور چہرے پر جا پڑے... اس ایڑیوں کے بل گھوما اور پھر دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

اگر دیکھنے والی آنکھیں وہ آگ دیکھ سکتیں تو جب میں حویلی سے نکل رہا تھا تو وہ شعلے، لوگ ضرور دیکھ لیتے جو میرے جسم سے نکل رہے تھے لیکن لوگ تو صرف وہ آگ دیکھتے ہیں جو ماچس کی تیلی سے بھڑکتی ہے۔ وہ شعلے کسی کو دکھائی نہیں دیتے جو انتقام کی چنگاری سے جنم لیتے ہیں۔ میں نے دوسرا دروازہ استعمال کیا تھا۔ بڑے دروازے پر پہرہ تھا۔ اگر میں اُس طرف سے جاتا تو اکرم بھائی روک لیتے... اور پھر دلاور خان کو بھی جواب دینا پڑتا۔

کار تک میرا ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ عقل اور تجربات نے مجھے دن کی روشنی کا حوالہ دے کر احتیاط کا دامن تھامنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں وہی حماقت نہیں کر سکتا تھا جو دلاور خان جیسے جذباتی نوجوان سے سرزد ہوئی تھی۔ وہ بڑکیں مارتا ہوا، حویلی پر چڑھ دوڑا تھا۔ اگر وہ دبے پاؤں آتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

مظفر چوہدری کوئی ریت کا گھروندا نہ تھا۔ وہ گرینڈیل مرد تھا۔ اُس کے ساتھ ایک گروہ تھا۔ علاقے میں اُس کا اثر و رسوخ بھی تھا، برادری کی بے شمار بانہیں اُس کے ساتھ تھیں۔ گولی تو میں، دن کی روشنی میں بھی اُس کے سینے میں اُتار سکتا تھا لیکن مجھے اپنی دوسری حیثیت کا بھی خیال رکھنا تھا۔ بار بار قانون کا ہاتھ مجھے نہیں بچا سکتا تھا اور پھر میں کسی کا احسان مند بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔

شہر میں داخل ہونے تک میں خاصا نارمل ہو چکا تھا۔ میں نے پی۔ سی۔ او سے رنگ باز خان کے ہوٹل فون کیا۔ وہ وہاں نہ تھا پھر گھر سے پوچھا۔ ملازمہ نے بتایا، ایک بجے بچیوں کو لے کر واپس آئیں گے بیگن کی کال ریسیو پاس تھی، اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ لال کرتی والی کوٹھی ہی میں ہوگا۔ میرے پاس وقت تھا اور میں سلیمان پر کچھ کام کر لینا چاہتا تھا۔

سلیمان کا ایک ہیرو، میرے قبضے میں تھا، اُسے بطور سپر ہیرو آزمایا جا سکتا تھا۔ رنگ باز اور سلیمان کے لیے ایک منصوبہ میرے ذہن میں زیرِ غور تھا۔

جب میں کوٹھی میں داخل ہوا تو بیگن اور کونز، بیساکھیوں کا آپریشن کر چکے تھے۔ بہترین قسم کی ایک کلو ہیروئن، بیساکھیوں سے برآمد ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے چہروں کو حسبِ ضرورت بدلنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اسٹور روم کو انھوں نے میک اپ روم بنا رکھا تھا۔ کونز کی یہ خوبی میرے لیے باعثِ اطمینان تھی کہ وہ ایک ماہر میک اپ مین تھا۔ اُس نے دس پندرہ منٹ تک ہمارے چہروں کی مرمت کر کے مجھے اور بیگن کو نئے خدوخال دے دیے تھے۔

میرے منصوبے کے لیے یہ بے حد ضروری تھا کہ سلیمان کا کوئی آدمی، مجھے اور بیگن کو اصل چہروں میں نہ دیکھے۔ کیونکہ مستقبل میں اُن لوگوں سے سامنا ناگزیر تھا۔

نئے چہرے اور بدلی ہوئی آوازیں کر کے میں اور بیگن جب سلیمان کے ایجنٹ سے ملنے گئے تو وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ ٹانگ جو اُس

نے موڑ رکھی تھی، اُس کے جسم کا بوجھ سہارے ٹھیک کام کر رہی تھی۔

"کوئی پریشانی تو نہیں، اکمل؟" میں نے خندہ پیشانی سے پوچھا۔

"اس حال میں یہ سوال غیر ضروری ہے، برخوردار!"

"یہ سرکاری مہمان خانے سے بُری جگہ تو نہیں۔" بیگن نے اُردو میں کہا۔

"ہاں..." اُس نے بھی الجھی نگاہوں سے ہمارا جائزہ لیا۔ "لیکن تم لوگ کون ہو؟"

"کبھی سیٹھ کی زبان سے اسکیمو گروپ کا نام سنا ہے؟" میں نے پوچھا تو اُس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "ہمارا کام اپنے آدمیوں کو خطرے سے بچانا ہے۔ اگر آپ کو ڈرامائی انداز میں وہاں سے نہ ہٹایا جاتا تو سیٹھ کے لیے نقصان کے علاوہ پریشانی کھڑی ہو جاتی۔ گروہ میں کوئی کالی بھیڑ ہے جو پل پل کی رپورٹ اُوپر دے رہی ہے۔"

"لیکن سیٹھ کے جنرل منیجر نے تم لوگوں سے بچنے کی ہدایت کیوں دی تھی؟"

"اس لیے کہ اُسے صورتِ حال کی خبر نہ تھی۔ یہ تو ہم نے اپنے ذرائع سے کام لے کر، بروقت قدم اُٹھایا تھا۔"

"اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"آپ کو یہاں سے خفیہ ٹھکانے تک جانا ہوگا۔ یعنی گودام تک۔ آپ مال وہاں واپس جمع کرائیں گے اور وہیں آپ کو دوسری ہدایت دی جائے گی۔ سیٹھ نے گروہ کو آرڈر دے کر اُنڈا گرا دیا ہے۔"

"اوہ... کچھ زیادہ گڑبڑ ہے؟"

"ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہوگی ورنہ ہنگامی حالات نافذ نہ ہوتے۔"

"کیا سیٹھ سے میری بات ہو سکتی ہے؟"

"نہیں، سیٹھ رات گیارہ بجے شہر چھوڑ گیا ہے۔"

اُس نے آنکھیں موند کر اثبات میں گردن ہلائی۔

"آئیے، آپ کو فی الفور یہ جگہ چھوڑنی ہوگی۔ ہم یہ کوٹھی چھوڑ رہے ہیں۔"

اُس نے جیکٹ اور کوٹ پہن کر جیب سے پرس نکال کر چیک کیا پھر ہمارے ساتھ چل پڑا۔ میں نے خالی بیساکھیاں، اُس کے حوالے کر دیں۔ اُس نے فوراً بیساکھیاں بغلوں کے نیچے دبائیں... اور ٹانگ موڑ کر چلنے لگا۔

کونز، کار میں اُس کا منتظر تھا۔ اُسے میری یہی ہدایت تھی کہ اس شخص کی نگرانی کرے اور اُس کی رپورٹ بیگن کو دے گا۔

میک اپ صاف کر کے میں اور بیگن کوٹھی سے نکلے اور وہ مجھے رنگ باز خان کے گیٹ سے ایک موڑ دُور اُتار کر آگے نکل گیا۔ میں جب گیٹ پر پہنچا تو خان اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ٹیک لگا لیا۔ چھوٹی لڑکی نے خان کی جانب جھک کر کچھ کہا۔ خان نے اُٹھ کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جب میں پانچ دے سے گزر کر لان میں داخل ہوا... تو دونوں لڑکیاں مجھے سلام کر کے برآمدے کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ خان نے والہانہ انداز میں کئی قدم بڑھ کر مجھے بانہوں میں بھر لیا۔ میری دائیں آستین میں ریوالور تھا۔ خان نے اس کو تھپتھپایا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہارا یہ انداز بے حد متاثر کر رہا ہے۔ ریوالور کے لیے یہ جگہ دُنیا میں چند ہی لوگ جانتے ہوں گے۔ بس اشارہ کیا اور الہ دین کے چراغ کا جن حاضر۔" اُس نے ایک کرسی کو ٹھوکر مار کر ہٹایا اور مجھے چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ "مجھے ملازمہ نے بتایا تھا اور مجھے یقین تھا کہ تم ہی ہو سکتے ہو، کیونکہ تم دوسرے شخص ہو جسے میرے گھر کا فون نمبر معلوم ہے... حالانکہ میں نے تمہیں نہیں بتایا۔"

تب مجھے اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے یہ نمبر ڈائل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ رنگ باز خان کا نمبر کسی ڈائریکٹری میں درج نہ تھا اور مجھے خان کی اُس خفیہ فائل سے وہ نمبر معلوم ہوا تھا جو بیگن نے میرے حوالے کیا تھا۔

لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ لہٰذا میں نے کوئی صفائی پیش کرنے کی دوسری حماقت نہیں کی۔ خان اگر پوچھ بیٹھتا تو میں دفتی طور پر اُس پہلے آدمی کا حوالہ ہی دے سکتا تھا لیکن خان بھی گہرے پانی کا مگرمچھ تھا، وہ سرے سے بات ہی گول کر گیا تھا۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، خان!" میں نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔ "لیکن حالات ضروری تھی۔ میں کچھ خانگی معاملات میں اُلجھا دیا گیا ہوں لیکن خاندان کی عزت، یا خصوصی کچھ پیاری اور مقدس ہستیوں کا وقار اتنا عزیز ہوتا ہے کہ انسان مجبور ہو کر رہ جاتا ہے... میں اپنے خاندان کو آگ میں جلتا چھوڑ کر دُنیا کے مفادات کی جانب توجہ نہیں دے سکتا۔ اگر میں نہ آتا تو آپ پریشان ہو جاتے۔ میں آپ کو یہی بتانے آیا ہوں کہ میں ذاتی معاملات سے نمٹ کر حاضر ہوں گا۔"

"سنو خرم سلطان!" خان نے پاؤں ہلاتے ہوئے پُرجوش آواز میں کہا۔ "اب ہمارے مفادات اور معاملات ایک ہیں۔ اگر آنکھ میں بال پڑ جائے تو سارا جسم متاثر ہوتا ہے۔ مجھے بتاؤ، کیا مسئلہ ہے؟ میں اکیلا نہیں ہوں، میرے ساتھ ایک فورس ہے۔ میرے ایک اشارے پر بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بولو، وہ کون ہے اور کہاں ہے؟ بس مجھے بتا کر تم سکون کی نیند سو جاؤ۔"

"شکریہ خان!" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "وہ جو کوئی بھی ہے، میرا مجرم اور دشمن ہے۔ جب تک اُس کے خون کا ذائقہ میں خود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں چکھ لیتا، میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ سرد نہیں ہو سکتی۔"

"ایک دعدہ کرو، بیٹے!" خان اُٹھ کر میرے قریب آگیا... "تم احتیاط سے کام لوگے۔ میں تمھیں پاکر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے دل میں صرف اوفد کو جگہ دی ہے لیکن تم نے بھی اسی دل میں جگہ حاصل کرلی ہے اور یہ احساس میرے لیے بالکل نیا ہے۔"

"میرے لیے بھی یہ اعزاز بہت بڑا ہے خان! اور میں خود کو دل میں رہنے کا اہل ثابت کروں گا۔"

"مجھے یقین ہے اور اسی یقین کے ساتھ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم ہمیں ہمارے ساتھ رہوگے۔ اس فیصلے میں ثمینہ اور امینہ بھی شامل ہیں۔ جو کرسی تمھارے لیے خالی ہوتی تھی، اس کا مکین فادر لوئر پر ہے۔ اس لیے اس کی واپسی تک تم یہاں رہوگے۔"

"بہتر خان!" میں نے ممنونیت سے بھرپور نگاہیں اُٹھا کر کہا۔ "میں کل کسی وقت واپس آؤں گا۔"

میں اُٹھا تو خان نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے بٹھا دیا۔ "کھانا کھا کر جاؤگے۔"

پانچ منٹ بعد ملازم نے آکر کھانے کی اطلاع دی۔ میں اور خان شانہ بہ شانہ چلتے، ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ دونوں ٹرکسیں گربیوں کی پشتوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔ بڑی کا چہرہ سپاٹ اور متین تھا جبکہ چھوٹی کے لبوں پر معصوم سی مسکراہٹ تھی۔

"یہ ثمینہ گل اور یہ سراپا شرارت امینہ گل ہے۔" خان نے تعارف کرایا۔ بڑی نے بوجھل پلکوں کو سرکا کر، ذرا سا گردن کو خم دیا اور امینہ نے پلک جھپکتے سلام کیا۔

میری توجہ اور نگاہوں کا ہدف ثمینہ گل تھی۔ بردبار اور باوقار سنہری لڑکی۔ اُسے دیکھ کر مجھے وہ سنہری مچھلی یاد آگئی جو میں نے فلپائن کے فش فارم میں دیکھی تھی۔ وہی رنگ، اسی جیسی آنکھیں۔ وہ متناسب بدن لڑکی تھی۔

امینہ نے پلیٹیں سیدھی کیں اور ثمینہ نے ایک ڈونگا اُٹھا کر پلکوں کی جھالروں کی اوٹ سے میری طرف دیکھا اور پھر میری پلیٹ میں روسٹ بیف کے ٹکڑے ڈال دیے۔

"ہم لوگ بیف زیادہ پسند کرتے ہیں۔" خان بولا۔

میں نے اپنی پلیٹ خان کے آگے رکھ دی۔ "پسند تو میں بھی کرتا ہوں مگر صرف چند بوٹیوں کی حد تک۔" میں نے خان کے سامنے سے خالی پلیٹ اُٹھا کر ثمینہ گل کے آگے رکھ دی۔ اس کے خوبصورت لبوں پر پہلی بار ہلکی ہلکی چاندنی چٹکی۔

اس نے گن کر پانچ ٹکڑے پلیٹ میں ڈالے اور امینہ ہنس پڑی:

"آپی میٹھے میں بہت تیز ہیں، اس لیے حساب کتاب کا خاص خیال رکھتی ہیں۔"

"تمو جان!" خان پیار سے بولا۔ "کھانے سے فارغ ہو کر، خرم کو کمرہ دکھاؤ۔ اگر کچھ کمی رہ گئی ہو تو کل تک مکمل کرلینا، یہ کل واپس آئے گا۔"

"بہتر ڈیڈی!" ثمینہ گل نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔

"بھائی جان کو یہ نہ بتانا، آپی! کہ ان کے ساتھ والے کمرے میں کون رہتا ہے۔" امینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ خان نے سر پہ بُہر قسم کا قہقہہ لگایا تو اس کا سارا جسم تھل تھلانے لگا تھا۔ اگر وہ منہ کھول کر قہقہہ لگاتا تو بوٹی ثمینہ گل پر جا پڑتی۔

"پیاری سی ہندیا وہاں رہتی ہے۔" ثمینہ بولی۔ "اگر تم نے ان کو ڈسٹرب کیا تو تمھیں خالہ کے کوارٹر میں شفٹ کردوں گی۔"

"اگر خالہ کو ڈسٹرب کیا تو...؟"

"تو میں اپنے کمرے میں بند کردوں گی۔"

ابھی کھانا ختم نہیں ہوا تھا کہ ملازمہ قہوہ لے آئی۔ ہر کھانے کے بعد شاید قہوہ ضروری تھا۔ ثمینہ گل ہی نے قہوہ سرو کیا اور پھر دونوں ہنیں مجھے کمرہ دکھانے لے گئیں۔

تنقیدی نگاہوں سے دیکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی، مجھے کون سا وہاں زیادہ مدت رہنا تھا۔ ویسے کمرے میں کوئی کمی نہ تھی، ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ میں نے سرسری نگاہوں سے تمام پھر کر اوکے کی رپورٹ دے دی۔

"ساتھ والے کمرے میں ڈیڈی ہیں اور آگے میرا کمرہ ہے۔" ثمینہ نے بتایا۔ "اس بھتنی نے اگر آپ کو پریشان کیا تو میں اسے اپنے کمرے میں لے جاؤں گی۔"

"میں پریشان ہونا پسند کروں گا، مس خان!" میں نے امینہ کی جانب دیکھا۔ وہ خالی وارڈروب کو دیکھ رہی تھی۔

"اے بھائی جان! آپ کے پاس اگر ادھر گنجائش ہوئی تو وارڈروب کرایے پر اُٹھا دیجیے گا۔ میرے بہت سے جوڑے الماری میں خراب ہو رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بے بی! میرا وارڈروب میرا جسم ہی رہے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں... آپ کے پاس...؟"

"ہاں بے بی! غریبوں کے پاس فالتو جوڑے نہیں ہوتے۔"

"آپی..." امینہ سنجیدگی سے بولی۔ "آپ نے کبھی اتنا خوبصورت غریب دیکھا ہے؟"

"دولت صورت پر نہیں برسا کرتی بے بی!" ثمینہ گل نے ایک

سینری کا ناداویدرست کرتے ہوئے کہا۔ "صورت، سیرت اور دولت یہ سب کچھ الگ الگ خانوں میں اللہ میاں رکھتے ہیں... ویسے خرم صاحب تمھیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔"

"نہیں مس خان!"

"میرا نام ثمینہ گل ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "ویسے آپ کو اگر پسند نہیں تو مس خان ہی سہی۔"

"مجھے تو وہ نام بھی پسند ہے جو خان صاحب لیتے ہیں، تمو جان۔" میں نے اس کی بھوری آنکھوں میں جھانک کر کہا اور اس نے ایک دم چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"آپ آرام کریں۔ آؤ، امینہ!"

"مجھے واپس جانا ہے، تمو جان!" میں نے اس کا ردِعمل جاننے کے لیے کہا۔

"نہیں، خرم صاحب!" وہ نرم اور مدھم آواز میں بولی۔ "یہ نام صرف ڈیڈی کے لیے ہے۔"

"بہتر ہے ثمینہ گل! میں یاد رکھوں گا۔"

وہ دونوں، خان کی خواب گاہ تک میرے ساتھ رہی تھیں۔

خان: ہماری آواز سن کر خواب گاہ سے نکل آیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک بریف کیس اُٹھا رکھا تھا۔ "کمرہ پسند آیا تمھیں؟" اس نے پوچھا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس نے دروازہ لاک کیا اور ثمینہ، امینہ کو خدا حافظ کہتا ہوا میرے ساتھ چل پڑا۔

"میں نے کچھ مال مقامی مارکیٹ سے خرید لیا ہے۔" گیٹ سے نکل کر وہ بولا۔ "کچھ آدمی آگے بھی بھیج دیے ہیں۔ تمھارا دوست یقیناً کامیاب ٹرپ محسوس کرے گا۔"

"میں نے سلیمان کی جڑوں میں ٹائم بم رکھ دیا ہے۔ کسی بھی وقت دھماکا ہو سکتا ہے۔" میں نے بتایا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو، خرم؟" اس نے چونک کر چہرہ گھمایا تو کار لہرا گئی تھی۔

"اس کا ایک آدمی توڑ لیا ہے، خان!"

"اوہ... شاندار... ویسے تمھیں بتلاؤں، اگر وہ لڑکی تمھاری وجہ سے ضائع نہ ہو جاتی تو میں سیٹھ سلیمان کے دل میں سوراخ کر دیتا۔ وہ لڑکی سلیمان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ میں نے ایک پلاننگ کے تحت رشیدہ کو حاصل کیا تھا اور سیٹھ کی آتش شوق کو بھڑکانا چاہتا تھا لیکن تم نے کھیل کا پانسہ ہی بدل ڈالا ہے لیکن مجھے اس کا افسوس نہیں کیونکہ رشیدہ کا متبادل تم جیسا باکمال نوجوان ہے۔"

"کیا سیٹھ، اس لڑکی کو پسند کرتا تھا؟"

"پسند تو پہلی ڈگری ہے، وہ احمق تو اس کی پرستش کرتا تھا۔"

"اور رشیدہ؟"

"وہ بہت گہری لڑکی تھی۔ من کا بھید کسی کو نہیں بتاتی تھی۔ میں اس سے سودا کرتا تو شاید وہ مان جاتی۔"

رنگ بدلنے میری سوچوں کا دھارا بدل دیا تھا اور میرے اندر شدید جنگ چھڑ گئی تھی۔ میں نے رشیدہ کو پناہ دی تھی اور وہ میرے مقاصد کے لیے اہم بھی ہو گئی تھی۔ اگر میں اُسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتا تو یہ انسانیت اور اصولوں کی توہین ہوتی۔ میں اُسے شرافت اور دیانت کا درس دیتا رہا تھا۔ اگر میں ہی اُسے پھر اسی آگ میں جھونک دیتا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچتی؟

"کوئی بات نہیں، ہم عورت کے سہارے کے بغیر بھی سیٹھ کے دل میں سوراخ کر سکتے ہیں۔ آپ اپنی تمام تر توجہ مال پر رکھیں۔ میرا خیال ہے مسٹر بیگن بہت بڑا سودا کرنے پر تیار ہو جائے گا۔"

"میں اپنا سارا سرمایہ اور ذرائع لگا رہا ہوں، خرم چوہدری!" خان نے کہا۔ "میں خود چھوٹے چھوٹے سودوں سے تنگ ہوں۔"

میں ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے اُتر گیا۔ اس سے قبل خان نے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی میری جیب میں ٹھونس دی تھی۔ میں نے اسٹور سے ایک شکاری چاقو اور ایک ریڈی میڈ ماسک خریدا تھا۔

وقت یوں تو پر لگا کر اُڑتا چلا جاتا ہے لیکن مصیبت کی گھڑیاں نہ جانے کیوں ٹھہر سی ہو جاتی ہیں۔ میں پرکٹے ہوئے تکلے کی مانند شہر کی پٹ پاتھوں، سڑکوں، گلیوں اور ہوٹلوں میں پھرتا رہا تھا۔ مجھے سورج غروب ہونے تک خود کو گاہوں سے دور رکھنا تھا لیکن سورج تو جیسے اڑیل ٹٹو بن گیا تھا۔ میں بار بار گھڑی، در سورج کو دیکھتا تو مجھ پر عجیب سی وحشت طاری ہونے لگتی۔

جب سورج بسورتا ہوا مغرب کے حلق میں ڈوب رہا تھا تو میں برساتی نالے کی چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ گاہوں کا کوئی آدمی بکریاں سمیٹ رہا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر ایسے ہی ایک جھاڑی کی اوٹ میں دبک گیا تھا جیسے متاعِ بیش بہا گڈریے کو دیکھ کر دبک جاتا ہے۔

میں جھاڑی کی اوٹ میں دبکا، گڈریے کو دیکھ رہا تھا کہ میری سماعت سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ٹکرائی... میں نے شاخوں سے جھانک کر دیکھا، دو گھوڑے اپنے سواروں کو اُٹھائے، ترائی سنبھل سنبھل کر اُتر رہے تھے۔

ڈوبتے سورج کی زرد زرد روشنی افق پر پھیلی ہوئی تھی... اور اسی روشنی میں، میں نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ میرا سکڑا ہوا بدن یوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگرنے لگا جیسے بھیڑیے نے شکار کی بُو سُونگھ لی ہو۔ وہ میرا شکار ہی تھا، مظفر چوہدری۔ پتا نہیں، وہ شکار سے لوٹ رہا تھا یا میری حویلی میں کوئی دوسرا پیغام چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔ اس کے شانے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ اس کے ساتھ، اس کی جاگیر کا مستقبل اعلیٰ عادل خان تھا جسے علاقے میں کالا بھیڑیا کہا جاتا تھا۔

میں نے جیب سے ماسک نکال کر چہرے پر چڑھایا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں اس راستے کی طرف بڑھنے لگا جو گاڑیوں اور بار بردار جانوروں کے لیے یونین کونسل نے بنایا تھا۔

مظفر کا گھوڑا آگے تھا اور عادل خان دس قدم پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کے گھوڑے نے پانی پر مُنہ مارا تھا، اس لیے دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔

چڑھائی کی وجہ سے گھوڑوں کی رفتار نہ صرف سست تھی بلکہ وہ پتھروں پر سوچ سوچ کر پاؤں رکھ رہے تھے۔ میں ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں تھا۔ راستہ نیچے سے گزرتا تھا جوں ہی مظفر کا گھوڑا، میری زد پر آیا، میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور مظفر سے ٹکراتا ہُوا، گھوڑے کے اوپر سے دوسری جانب جا پڑا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی رائفل الگ کی تھی اور دوسرا ہاتھ مظفر کی گردن پر مارتا ہُوا گزرا تھا۔ مظفر چوہدری گھوڑے کی پُشت سے ایسے ہی جُدا ہُوا تھا جیسے سر سے ٹوپی اُڑی ہو۔

"نہیں، عادل خان!" میں کالے بھیڑیے کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ میں نے گرتے ہی ریوالور نکال کر عادل خان کے ہاتھ کو نشانہ بنایا اور رائفل اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ مظفر چوہدری پتھروں پر تڑپھا گرا تھا۔

عادل خان کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ گھوڑے سے کُود گیا۔ فائر کی وجہ سے دونوں گھوڑے بدک گئے تھے۔ عادل کا گھوڑا، نالے کے متوازی دوڑنے لگا۔ اور مظفر چوہدری کا گھوڑا، سیدھا اُوپر چڑھ گیا تھا۔

"عادل خان!" میں نے رائفل تان کر کہا۔ "وفاداری سے قطعِ نظر، اگر تم جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

مظفر چوہدری، لٹھ کی کچی مُنڈیر سے ٹیک لگائے مجھے گھور رہا تھا۔ معاً عادل خان نے اپنی رائفل کی جانب چھلانگ لگائی اور میرے ریوالور کی گولی نے اُسے زمین چھونے سے قبل، فضا ہی میں جا لیا تھا۔ وہ ڈکراتا ہُوا، رائفل سے دو گز دُور پتھروں پر جا گرا۔ "تم بھی ایسی حماقت کر سکتے ہو، چوہدری!" میں نے ریوالور لہراتے ہُوئے استہزائیہ انداز میں کہا پھر میں، مظفر چوہدری کو ریوالور کے نشانے پر لیے ہُوئے عادل خان کی رائفل تک گیا... اور اس کی رائفل پاؤں پر چڑھا کر اُتھائی میں اُچھال دی۔

عادل خان پہلے اوندھے مُنہ پڑا تڑپتا رہا پھر گھٹنوں کے بل ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ دبا رکھا تھا اور پتھر اُس کے خون سے سُرخ ہو رہے تھے۔

"تم کون ہو، جوان؟" مظفر چوہدری نے مضبوط آواز میں پوچھا۔

"اور کیا چاہتے ہو؟"

"تمھارا وہ ہاتھ، چوہدری! میرے حلق سے غراہٹ اُبھری...

"وہ گستاخ اور ناپاک ہاتھ جو ایک عفت مآب ماں کے چہرے پر نشان چھوڑ آیا ہے۔"

"اوہ..." وہ چونکا۔ "تو تم ہو۔"

"کیا تم نے مجھے نہیں بُلایا تھا، چوہدری؟" میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ میری آواز میں اتنی عریاں درندگی اُس لمحے بھی نہ آئی تھی جب میں مارشا کی عزت کے قاتل بُوڑھے کے پاس گیا تھا۔ وہ بھی تو میری بہن کا مجرم تھا... لیکن ماں اور بہن کے تقدس میں جو فرق ہوتا ہے، وہی فرق میری آواز میں اُبھر آیا تھا۔

"نہیں..." چوہدری مظفر نے ہاتھ اُٹھایا۔ "نہیں، تم خرم سلطان نہیں ہو۔ اُسے میں پہچانتا ہُوں۔ تم اُس کے کوئی دوست یا کرائے کے قاتل ہو سکتے ہو۔ سُنو، جوان!" اُس کے ہونٹوں پر بے جان سی مُسکراہٹ اُبھری۔ "میں بھی سودا کر سکتا ہُوں۔ اس نے جتنی رقم کا سودا کیا ہے، میں اُس سے دُگنا بلکہ چار گنا زیادہ دوں گا۔ بولو، جوان!"

میں نے رائفل کی نال دھمال اُس کی پیشانی پر رکھ دی۔ تب پہلی بار اُس کی آنکھوں میں خوف در آیا۔ "صرف ہاتھ، چوہدری..." میں نے دہکتی ہُوئی آواز میں کہا۔ "ایک ہاتھ وہ جس سے تم سفید بال پکڑے تھے اور دوسرا ہاتھ وہ، جو اُس خاتون کے مقدس چہرے پر لگا تھا، دو ہاتھ، چوہدری! جان کے عوض دو ہاتھ۔ بولو، سودا منظور ہے تمھیں؟"

"سُنو..." وہ بھرّائی آواز میں بولا۔ "میں یہ ہاتھ، اس خاتون کے پاؤں کو پیش کر دوں گا۔ مجھے وہاں لے چلو۔ اگر اس نے معاف کر دیا تو پھر خرم سلطان بھی مجھے معاف کر دے گا۔ سُنو، جوان! ہر گناہ کی معافی ہوتی ہے۔ معافی سزا سے بہتر ہوتی ہے۔ مجھے ایک موقع دو، میں معافی مانگنا چاہتا ہُوں۔"

معاً ایک تیز سرسراتی ہُوئی سرگوشی، میری سماعت سے ٹکرائی۔ اور میرا تنا ہُوا بدن لرز گیا۔ میں آج بھی یقین سے کہہ سکتا ہُوں کہ وہ سرگوشی ہَوا نے کی تھی۔ ہَوا کو زبان اور زبان کو الفاظ اور الفاظ کو آواز کس نے دی تھی۔ یقیناً اُسی نے جس کا حکم ہر شے پر غالب ہے...

خوشی بالکل واضح تھی۔ کوئی شک نہ رہا تھا۔ میں نے جو آواز سنی تھی وہ سچ مچ ہی آواز تھی۔ آواز اور پیغام دونوں مانوس تھے۔ میں نے گاؤں کی بڑی مسجد میں یہی آواز سنی تھی۔

"اور بُرائی کا بدلہ تو اسی طرح کی بُرائی ہے مگر جو درگزر کرے اور معاملے کو درست کر دے تو اُس کا بدلہ خُدا کے ذمّے ہے۔ اس میں شک نہیں... کہ وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔"

رائفل پر میری گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور پھر رائفل کی نال جُھک گئی۔

"ٹھیک ہے، چوہدری مظفر!" میں نے ٹوٹتی ہُوئی آواز میں کہا۔ "چلو، اس عدالت میں۔ اگر وہاں سے معافی مِل گئی تو خرم سلطان بھی تمھیں معاف کر دے گا۔"

"شکریہ، جوان!" اُس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اصل مجرم ہے تو میں ہی ہُوں لیکن میری بات کی تصدیق وہ خاتون بھی کرے گی کہ چھ سُو عادل خان نے مارا تھا۔ میں تو صرف اُس ماں کا پیغام دینے گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ پیغام سُن کر خرم سلطان ضرور سامنے آئے گا۔ میں بہت بڑا شخص ہُوں لیکن عورت اور پھر کسی بُزرگ عورت پر ہاتھ اُٹھانا، میری فطرت میں کبھی شامل نہیں رہا لیکن معافی میں مانگوں گا۔ عادل میرا کتّا ہے، اس نے میری خوش نودی کے لیے وہ ذلیل حرکت کی تھی۔"

عادل خان، اسی حالت میں گھٹنوں کے بل پڑا ہُوا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر لگائی تو وہ کراہتا ہُوا اُلٹ گیا۔ خون سے اُس کا لباس دامن تک تر تھا۔ اس لیے اندازہ لگانا مشکل تھا... کہ گولی کہاں لگی تھی لیکن اُس نے فوراً بائیں کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے پلٹ کر مظفر چوہدری کی طرف دیکھا، وہ دبے پاؤں رائفل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"رُک جاؤ، چوہدری! ورنہ میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا۔" میری غراہٹ سُن کر وہ ایک دم سکڑتا ہُوا رُک گیا۔ میں نے چاقو نکال کر اُس کی طرف اُچھال دیا۔ "تم گواہ ہو، چوہدری! تمھیں معلوم ہونا چاہیے عادل خان کا کون سا ہاتھ مجرم ہے، اُسے کاٹ کر میرے حوالے کر دو۔"

"یہ رہا ہے، جوان!" مظفر چاقو سنبھال کر منمناتی آواز میں بولا۔ "موت سے بڑی کوئی سزا نہیں۔"

"نہیں، چوہدری! میرے نزدیک موت آسان ترین سزا ہے۔ میں اس ہاتھ کو معاف نہیں کروں گا۔ ہاں، اگر یہ چلنے کے قابل ہوتا اور اپنی خطا کی معافی مانگ سکتا تو میں معاملہ اُدھر کر دیتا... چلو، جلدی کرو۔"

"تم خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتے؟"

"اس کے لیے تمھیں بھی گرنا پڑے گا، چوہدری!" میں نے رائفل سیدھی کی۔ "میں کوئی خطرہ مول نہیں لُوں گا۔"

"میں خالی ہاتھ ہُوں، جوان!"

"ہاں، خالی ہاتھ، پتھر تک تو جا سکتا ہے۔ فیصلہ کرو، چوہدری! میرے حُکم کی تعمیل کرو گے یا...؟"

اُس نے لبیک دیا اور چاقو کھٹاک سے کھل گیا۔ "مجھے معاف کر دینا، دوست!" مظفر چوہدری بھرّائی ہُوئی آواز میں بولا۔ "میں آج وہ ہاتھ خود کاٹ رہا ہُوں جس نے میرے مفاد کے لیے ہمیشہ بڑے بڑے کام کیے ہیں۔"

"پہلے میری شہ رگ کاٹ دو، چوہدری!" عادل خان مضبوط لہجے میں بولا۔ "یہ ہاتھ، میں نے پندرہ برس قبل تمھارے حوالے کر دیے تھے۔ میں انکار نہیں کروں گا، نہ کسی سے رحم کی بھیک مانگوں گا لیکن مجھے اذیت سے بچاؤ، چوہدری! میری تمام خدمتوں کے عوض ایک احسان کر دو۔"

چوہدری مظفر کا ہاتھ اُوپر اُٹھا اور عادل خان کے عین دل میں پیوست ہو گیا پھر اُس نے ہاتھ بلند کیا اور دوسرا وار، عادل خان کی شہ رگ پر کیا۔ عادل خان کے حلق سے خرخراہٹ نکلی اور اُس کا جسم پتھروں پر تڑپنے لگا۔

معاً مظفر چوہدری اُچھلا اور میری لات، اُس کے پیٹ میں لگی۔ میں تیار تھا۔ مجھے اُس کی دہشت نے چونکا دیا تھا۔ جس انداز میں اُس نے اپنے ساتھی کے جسم پر چاقو کے وار کیے تھے، اُس کی ذہنی حالت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ مجھ پر بھی وحشیانہ حملہ کرے۔

اگر میں تیار اور بیدار نہ ہوتا تو وہ شکاری چاقو میرے سینے میں بھی ترازو ہو سکتا تھا۔ فضا میں تیرتے چاقو کو میں رائفل کی گولی سے نہیں روک سکتا تھا۔

چوہدری لات کی ضرب کھا کر، ڈکراتا ہُوا، اوندھے مُنہ پتھروں پر گرا۔ چاقو، اُس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن اب میں اس چاقو کو چھونا نہیں چاہتا تھا جس پر عادل خان کا خون اور مظفر کی اُنگلیوں کے نشان ثبت ہو چکے تھے۔

"اُٹھاؤ، چاقو اور ہاتھ کاٹو۔" میں نے اُس کو دوسری ضرب لگائی۔ وہ اُٹھ کر چاقو تلاش کرنے لگا۔ میں نے رائفل کی نوک چاقو پر رکھ دی۔ اب اگر تم نے حماقت کی تو میں تمھیں گولی مار کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس نے چاقو اُٹھایا اور عادل خان کا دایاں ہاتھ کلائی کے جوڑ سے کاٹ کر میرے پاؤں میں ڈال دیا۔

"چاچو یہاں پھینک دو چوہدری!" اُس نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے چاقو پھینک دیا۔ "اب میرے آگے آگے چلو۔"

جب ہم گنّوں کے قریب پہنچے تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا پھر بھی میں اُسے گھما کر پچھلے راستے سے حویلی تک لے گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی آنکھ گواہ بن جائے۔

میں، چوہدری مظفر کے ساتھ خالی برآمدے سے گزرتا جب ڈائننگ روم کے سامنے پہنچا تو اندر سے خالی برتنوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا، عابدہ بیٹھیں رکھ رہی تھی اور زینت ہر پلیٹ کے ساتھ ایک چھوٹی پلیٹ اوندھی رکھتی جا رہی تھی۔

"زینت..." میں نے آواز دی۔ دونوں ساتھ ہی باہر نکل آئیں۔ چوہدری گردن جھکائے ستون کے ساتھ کھڑا تھا۔ "میں اماں بی کا کمرہ یاجوں۔ اُن سے اجازت لے آؤ۔"

زینت کے حلق سے جو آواز اُبھری تھی، اُس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ جیسے کوئی بھوکی اور غیصلی شیرنی شکار کی بُو پا کر غرّائی ہو۔ وہ مجھے نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ میرے دیہم دشمنان میں بھی نہ تھا کہ زینت، وہ لڑکی جو اپنے سائے سے ڈرا کرتی تھی، اتنی دلیر اور جرأت مند بن گئی ہے۔

اُس نے جھپٹ کر مظفر چوہدری کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ طمانچے کی آواز نے تاریک سناٹے کو بھر بھرا دیا تھا۔

"چھوٹو چوہدری!" زینت کی سفاک آواز سنائی دی "آج چاول تک نہیں ملیں گے۔ اُس بات تم خود آئے تھے، آج لائے گئے ہو۔" وہ اسے گھسیٹتی ہوئی لے جا رہی تھی اور میں حیرتوں میں ڈوبا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

"اماں جانی!" مظفر کو دھکا دے کر اُس نے چیخ کر کہا۔ چوہدری ایک نازک اندام لڑکی کے دھکے سے صرف لڑکھڑا کر سنبھل گیا تھا...

"خرم سلطان، چوہدری مظفر کو لایا ہے۔"

اماں بی نے کھل سے چہرہ نکال کر دیکھا اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا اور عادل خان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے اماں بی کو پیش کر دیا۔

"یہ وہ گستاخ ہاتھ ہے اماں بی! اپنے بیٹے کی عزت سے قبول کیجیے۔"

اماں بی کا سکتہ ٹوٹا۔ ایک سرد آہ بھر کر اُنہوں نے ہاتھ تھام لیا۔ پھر اُسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"خرم سلطان، تم نے آج میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ میرے بیٹے کا بدلہ لے کر تم نے اُس کی روح کو سکون بخشا ہے۔ یہ کون ہے اور یہاں کیوں لائے ہو؟"

"اماں جی!" مظفر چوہدری کی پھنسی پھنسی آواز میں بولتا ہوا آگے بڑھا۔ "میں آپ کا مجرم ہوں۔ میرے ہی ایک کتے نے آپ کو کاٹ لیا تھا۔ ہاتھ خرم نے نہیں، میں نے کاٹا ہے۔ میں معافی مانگنے آیا تھا اماں جی! مجھے معاف کر دیجیے۔" وہ بھی میرے قریب فرش پر گھٹنوں بیٹھ گیا۔

"تو چلا آیا اپنی موت کو۔ یہ اچھا ہی ہوا ہے۔" اماں بی بولیں۔ "چوہدری مظفر! مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ ایک ماں سے وعدہ کرو۔ آئندہ دشمنی کی آگ آگے نہیں بڑھے گی۔ جو ہوا اُسے بھول جاؤ۔"

"ایسا وعدہ خرم سلطان سے بھی لیں اماں جی!"

"سنو چوہدری!" میں نے چہرے سے ماسک اُتار دیا۔ اُس نے چہرہ موڑ کر دیکھا اور اپنے سامنے خرم سلطان کو دیکھ کر وہ اچھل کر اُٹھا۔ میں نے رائفل دیوار کے ساتھ لگا دی تھی جسے نہ جانے کیوں اور کب زینت نے اُٹھا لیا تھا۔

"نہیں چوہدری!" زینت نے اُس کے سینے پر نال رکھ دی۔ "اماں جانی کی شرط تم نے سُن لی۔ فیصلہ کر کے ہی یہاں سے جاسکو گے۔"

"نہیں بی بی!" مظفر چوہدری نے نال کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔ "خرم سلطان کی موجودگی میں کوئی عورت مجھے فیصلہ کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔"

"اماں جانی صرف عورت نہیں ہیں چوہدری مظفر! زینت کے بھیجے میں ہڈیوں کو ٹھنڈا دینے والی کاٹ تھی۔ وہ اس حویلی کی آن اور اس خاندان کی سربراہ ہیں۔"

"چوہدری مظفر!" میں نے زینت کے ہاتھوں سے رائفل لیتے ہوئے کہا۔ "پتھر فاروق چوہدری کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے صرف دیا ہے۔ دوسرا پتھر تم چھوڑ گئے تھے جب بھی اُدھر سے پتھر آئے گا تو اُس کا جواب دیا جائے گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ اسے میرا وعدہ بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"تم نے اُسے توڑ پھوڑ دیا ہے لڑکے!" چوہدری غرّایا۔ "وہ میرا باپ تھا چوہدری!" میں نے جواب دیا۔ "میں نے ایک شخص کو توڑا ہے لیکن اُس نے پورے خاندان کو ایک شجر سایہ سے محروم کر دیا ہے۔ اُس کا جرم ایک نہیں، میں اُسے معاف نہیں کروں گا۔ میں اُسے قسطوں میں مارتا رہوں گا۔ ہاں اگر تم اسی طرح خاموش رہنے کا وعدہ کرو جس طرح اُس کے ہر جرم پر خاموش رہے ہو تو میرے ہاتھوں کا رُخ تمہاری طرف نہیں ہوگا۔"

"کیا میں ایسا کر سکتا ہوں خرم سلطان؟"

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔" میں نے کندھے اُچکا کر جواب دیا۔

"اماں بی کیا اسے واپس کر دیا جائے؟"

"ہاں، حفاظت سے اسے اس کے گاؤں پہنچا دو۔" اماں بی نے کہا۔ "یہ ہمارے گھر چل کر آیا ہے، اس کی حفاظت اس کے گھر تک ہماری ذمے داری ہے۔"

میں نے رائفل کا میگزین نکال کر رائفل اُس کی طرف اُچھال دی۔ "لو چوہدری!" میں نے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ "یاد رکھنا تمہیں معاف نہیں کیا گیا۔"

حویلی کے دروازے سے نکل کر مظفر چوہدری چلتے چلتے رُک گیا پھر اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے میں نے تھام لیا تھا۔ اُس نے گرفت مضبوط کرتے ہوئے ہاتھ دباتے ہوئے سرد آواز میں کہا۔ "خرم سلطان! پہلے آگ صرف فاروق تک محدود تھی۔ میں اُس کی کارروائیوں میں شریک نہیں تھا لیکن اب فاروق کو تنہا نہیں رہنے دیا جائے گا۔ جتنی قسطیں وصول کر چکے ہو اگر ان ہی پر اکتفا کر جاؤ تو میں اس ہاتھ کی گرفت کو دوستی کا پیغام کہوں گا۔ اس آگ سے دونوں خاندان جل جائیں گے خرم... اور راکھ سے کوئی نئی قوت علاقے پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے اُبھر سکتی ہے۔ تیسری پارٹی وہ بھی ہو سکتی ہے جس پر اب تک ہم لوگ حکمران ہیں۔ جوتوں کو پگڑی نہ بناؤ خرم سلطان...!"

"کیا تم مجھے معاف کر دیتے چوہدری... اگر میں نے تمہارے باپ اور تمہاری بہن سے وہی سلوک کیا ہوتا؟"

"شاید نہیں۔"

"پھر مجھے اتنا بے غیرت کیوں سمجھتے ہو؟"

"ٹھیک ہے خرم چوہدری۔" اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میدان ہی اب فیصلہ کرے گا۔"

"ہاں میدان...!" میں نے بھی اُسی لہجے میں جواب دیا۔ "کیا میں تمہارے ساتھ گاؤں تک چلوں چوہدری...؟"

وہ میرا دشمن تھا۔ اُس نے اعلانِ جنگ بھی کر دیا تھا۔ اُس کی پشت میرے سامنے تھی اور میں آسانی سے عق کو چھید ڈالنے والا خرم سلطان چوہدری بے بس تھا کیونکہ پیچھے سے وار کرنا، گھر آئے شخص کو مارنا اور بے خبر دشمن کی پشت میں گولی پیوست کرنا موالگی اور میرے خاندان کی روایات کے منافی تھا۔ گو میں ایک زہریلے ناگ کو بل تک جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ وہ میری مجبوری تھی اگر اماں بی نے حکم نہ بھی دیا ہوتا تو میں اُس رات مظفر چوہدری پر ہاتھ نہ اُٹھاتا۔

ناگ لہراتا ہوا جا رہا تھا اور میں گنگ کھڑا اُسے اندھیروں میں گم ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ بجلت اور جگ میں سب روا ہے۔ میں نے جیب سے شارٹ رینج کا ٹرانسمیٹر نکال کر آن کیا۔

"ہیلو ماسٹر چیف کالنگ یو... ہیلو ماسٹر چیف کالنگ یو؟"

پانچ منٹ میں بیگن کو کال کرتا رہا تھا۔ اسی دوران زینت دبے پاؤں میرے پیچھے آگئی تھی۔ چھپانے کا کوئی فائدہ نہ رہا تھا۔ اُس نے میری آواز اور ٹرانسمیٹر دیکھ لیا تھا۔

"یس چیف!" میں بٹن آف کرنے جا رہا تھا کہ بیگن کی آواز سنائی دی "ہیلو ماسٹر، لیسننگ یو لاؤڈ اور...!"

"سنو ماسٹر! فاروق چوہدری اور میرے گاؤں کے درمیان ایک برساتی نالہ ہے۔ اُس میں ایک لاش پڑی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لاش ہٹا دی جائے۔ فاروق چوہدری کے گاؤں والی چڑھائی کو دیکھ لینا تم فی الفور میرے حوالے سے آئی جی صاحب سے رابطہ قائم کرو۔ عادل خان قتل ہوا ہے اور اُسے فاروق چوہدری کے بڑے بھائی مظفر چوہدری نے قتل کیا ہے۔"

"آپ بخیریت ہیں نا چیف؟"

"ہاں... میں آج رات حویلی میں رہوں گا مجھے رپورٹ ملنی چاہیے!"

"بہت بہتر جناب!"

میں نے ٹرانسمیٹر آف کیا اور زینت نے میرا راستہ روک لیا۔

"خرم... خرم سلطان... تم یہ کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"اپنے پیارے پیارے لوگوں کا دفاع کر رہا ہوں زینی۔"

"کیا واقعی قاتل مظفر چوہدری ہے؟"

"ہاں میرے چاقو سے اُس نے اپنے ساتھی کو قتل کیا ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور وہ ہی جانتے اور محسوس کر سکتے تھے، سب کچھ میں اُس کی داہماندہ دل داریاں، سب کی نگاہیں بچا کر مجھے پیار کی یقین دہانیاں کرانا، میرے وعدے اور میری وجہ سے اُس کے خاندان پر ٹوٹنے والے پہاڑ، وہاں میری وجہ سے کیا کچھ نہ ہوا تھا۔

"جانتی ہو عابدہ میں نے ہی تجوا اور چنگ کا صفایا کر دیا تھا، میں نے اُن سے سارے بدلے، سارے حساب چکا دیے تھے۔"

اُس نے پھر نگاہیں اُٹھا کر دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر کاہ ان مسکراہٹ اُبھر آئی۔ زینت ہولے ہولے نوالہ چباتی عابدہ کو ایک ٹک گھور رہی تھی۔

"خُرم!" زینت بولی۔ "وہ لڑکی مارشا لون ہے؟"

"تم جیسی ایک پیاری اور وفادار بہن۔" میں نے جواب دیا۔

"کاش! اُسے میں یہاں لا سکتا۔۔۔!"

"تم نے جواب نہیں دیا خُرم۔" اکرم بھائی جیسے ہماری گفتگو سن ہی رہے تھے۔

"آپ نے کیا پوچھا تھا بھائی جان؟"

"یہی کہ تم یہاں رہو گے؟ اکرم بھائی بولے۔ "مجھے اور ان لوگوں کو تمھاری ضرورت ہے خُرم۔"

"میں آپ لوگوں سے دُور تو نہیں رہتا بھائی جان۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے پل پل کی خبر رہتی ہے اب میں ایسا انتظام کر کے جاؤں گا کہ میں جہاں بھی ہوں گا حویلی میری نگاہوں کے سامنے رہے گی، آپ آواز دیں گے تو میں فوراً حاضر ہو جایا کروں گا۔"

جب کھانا کھا چکے تو میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "زینت اب تم لوگ آرام کرو۔ اماں بی کو بتا دینا، میں صبح اُن کو سلام کر کے جاؤں گا، میں کچھ وقت اِن بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔" ان ننھے ننھے بچوں نے اُدھر میری بہت خدمت کی تھی۔ میری نگاہیں عابدہ کے گداز سنولے ہاتھوں پر تھیں۔

"ٹھیک ہے، اٹھا لے بستر۔"

"ٹھیک ہے اپنے والے کمرے میں لگا دینا، اب تو وہ خالی ہی ہو گا۔"

زینت نے اپنی پلیٹ اُٹھا کر زور سے اکرم بھائی کی پلیٹ پر رکھ دی اور گہری سی سانس لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اکرم بھائی ایسے سکڑ گئے تھے جیسے پلیٹ اُن کے سر پر گری تھی۔

مجھے بڑا دکھ ہوا، زینت کی زندگی کتنی تلخ ہو گئی تھی۔ وہ اکرم بھائی جیسے وفا شعار شخص کے لیے نہیں بنائی سنواری گئی تھی۔

"عابدہ!" وہ سرسراتی آواز میں بولی۔ "برتن صاف کرنے میں تھوڑی مدد کرنا۔"

"ایسا کیوں بولا تم نے زینت؟" عابدہ شاکی انداز میں بولی۔ "یہ کیا ہمارے لیے کوئی نیا کام ہے، ہم ہر روز ہی تو مل کر کام کرتی ہیں۔"

"اوہ پیاری۔" زینت مخمل سی ہو کر ہنسنے لگی۔ "اس لیے ہم دیا، خُرم تمھاری طرف جا رہا ہے نا، وہ اتنی دیر خالہ جان اور بچوں سے باتیں کرے گا۔"

عابدہ نے نچلا ہونٹ کاٹ لیا اور پھر برتن سمیٹنے لگی۔

"میرے بعد یہ حویلی آسیب زدہ تو نہیں ہو گئی۔" میں نے فیڈ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "ہر شخص ایک دوسرے سے اکتایا اکتایا سا ہمیں کیوں ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں خُرم۔" زینت نے جواب دیا۔ "بہرکیف میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، جاؤ عابدہ۔ برتن ہم صبح مل کر صاف کر لیں گی۔"

"اب کیوں نہیں؟"

"نہیں اب نہیں۔" مجھے زینت کی بات پر غصہ تھا۔ "تم میرے ساتھ چلو گی، مجھے تمھارے شدید طلب محسوس ہو رہی ہے اور تم سے بہتر قہوہ شاید پاکستان میں کوئی نہیں بنا سکتا۔"

"آپ ان کے ساتھ جائیں۔" عابدہ بولی۔ "اُدھر صرف ہم سوتے ہیں کھاتے پیتے اِدھر ہیں۔ میں اماں بی کے لیے دودھ رکھ کر آپ کے لیے قہوہ لے آؤں گی۔"

"چلو بچو لوگ۔" میں نے عابدہ کے بھائی کی پشت پر تھپکی دی۔ زینت ٹیبل پر دونوں ہتھیلیاں ٹیک کر اُٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ عابدہ کی ماں کو جوڑوں کے درد نے مفلوج کر رکھا تھا۔ میں سلام کر کے اُن کی چارپائی پر ہی بیٹھ گیا۔ مجھے اُن کا قرب اور ہاتھوں کا لمس، وہی سکون اور راحت دیتا تھا جو اماں بی کی ذات سے ملتا تھا۔ اُنھوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے اچانک سوال کر کے مجھے بھونچکا کر دیا تھا۔

"بیٹے! اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے کیا تم خوشی سے اجازت دو گے؟"

"کیا۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں اماں بی آپ؟" میری آواز پھٹ گئی۔

"کیوں نہیں رہ سکتے یہاں۔ مجھے بتائیے اماں بی۔"

"بیٹے! مہمان اور میزبان کا ایک رشتہ ہوتا ہے نا، بس وہ اب مجروح ہونے لگا ہے۔"

"کون مجروح کر رہا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں بیٹے، بس میرا احساس ہے، ورنہ یہ لوگ تو روز اوّل کی طرح مہربان ہیں۔"

"اس لیے کہ اماں بی کا اصلی مجرم عادل خان تھا۔"

"اوہ۔۔۔ تو تم نے منظر کو۔۔۔؟"

"بس زیادہ باتیں نہیں بھابی جان!" میں نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے ایک دم میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "آؤ اندر چلیں، مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"

"اپنے بھائی جان سے مل لینا خُرم۔" زینت دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "یہ تم دونوں بھائیوں کی فطرت میں زمین آسمان کا فاصلہ کیوں ہے خُرم؟ وہ تو کسی عورت سے بھی زیادہ کم حوصلہ ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ اُن کا نصف ایمان تو حوصلہ مند ہے۔ تم شیرنی ہو مجھے آج تم نے حیران کر دیا ہے۔"

"کاش! زینت سسک اُٹھی۔ "یہ جوڑا۔۔۔۔"

"بس بس زینت آگے نہیں۔" میں نے تڑپ کر کہا اور اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔ برآمدے میں شاں وڈھے اکرم بھائی بُہ رہے تھے۔ روشنی کے پیشِ منظر میں وہ کسی بے قرار رُوح کی مانند ہولے ہولے ٹہل رہے تھے۔

"مجھے عابدہ نے بتایا تھا، ہم سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو پہلی سیڑھی پر آ کر بولے۔ "تم کہاں چلے گئے تھے تم دونوں؟ عابدہ بے حد پریشان ہے۔" اُس نے بتایا کہ خُرم اور زینت کسی مرد کے ساتھ باہر گئے ہیں۔"

"جی ہاں! ایک مہمان تھا، بھائی جان۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ لوگ تو ویسے ہی پریشان ہو جاتے ہیں، ذرا دل مضبوط رکھا کریں۔ اس حویلی کی روایات بڑی جاندار رہی ہیں۔"

"ہاں!" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے کرب ناک آواز میں بولے۔ "لیکن میں تمھارے غلط جگہ پیدا ہوا ہوں مجھے یہاں اس حویلی میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان روایات کو صرف تم جیسا انسان ہی زندہ رکھ سکتا ہے۔ میں تو، یقین کرو خُرم۔۔۔ بُھوا سرسراتی ہے تو دل دہل جاتا ہے۔ جب سے آپا جان والا حادثہ ہوا ہے، میں ہر وقت ڈرتا ہوں پھر کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔"

"کچھ نہیں ہو گا بھائی جان۔" میں نے چور نگاہوں سے زینت کی جانب دیکھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی تھی۔ وہ اپنے مجازی خدا کی زبان سے ایسی باتیں سُن رہی تھی جن کی وہ شاکی تھی۔

"کیسے نہیں ہو گا۔" اکرم بھائی رو دینے والے انداز میں بولے۔ "کوئی دن بھی تو خیریت کا نہیں آتا۔ دلاور خان آیا پھر تمھیں وہ لوگ اُٹھا کر لے گئے اور کل منظر چوہدری اندر تک چلا آیا تھا۔ آج بھی کوئی ضرور آیا تھا تم دونوں ہی نہیں سب لوگ مجھ سے بہت کچھ چھپاتے پھرتے ہیں بتاؤ کون آیا تھا؟"

"خُرم منظر کو گھسیٹ کر لایا تھا۔" زینت نے تمسخرانہ آواز میں بتایا۔

"اس نے اُسے اماں جانی کے قدموں میں گرایا اور۔۔۔!"

"بھابی! آپ کھانا لگائیں۔" میں نے اُسے گھور کر دیکھا۔

"مجھے بولنے دو خُرم۔" وہ تڑخ اُٹھی۔ "ورنہ یہ حویلی گیدڑوں اور لومڑوں کی شکار گاہ بن جائے گی، کیا تمھیں نہیں معلوم یہ وہی حویلی ہے جس میں آنے کے لیے لوگ پیشگی اجازت نامے حاصل کیا کرتے تھے۔ آج جس کا دل چاہتا ہے اندر گھس آتا ہے۔ ہمارا تحفظ کون کرے گا، کیا حویلی کی اندھی گونگی دیواریں؟"

"ہم زینت، ہم سلطان چوہدری کے بیٹے ہیں۔" میں نے مضبوط اور غصیلی آواز میں اُسے جواب دیا۔

"پھر اپنے بھائی جان سے کہو دو حویلی کا محافظ بنیں۔"

"خُرم!" اکرم بھائی رو پڑے۔ "میں کیا کروں میرے بھائی، تم یہاں مستقل رہ کیوں نہیں جاتے۔ مجھے بس اللہ اللہ کرنے دو۔ میں دُنیا کے بکھیڑوں کا آدمی نہیں ہوں خُرم۔ مجھے اماں بی نے زبردستی۔۔۔"

"اچھا اچھا بھائی جان۔" میں نے اُن کو گھسیٹ کر اپنے نزدیک کر لیا۔ "چلیے پہلے کھانا کھائیں۔"

میں تو ڈر گیا تھا اکرم بھائی ایسی بات کہنے والے تھے جو زینت کو توڑ کر کرچی کرچی کر دیتی، وہ پہلے ہی دُکھی تھی، جو ہونا تھا ہو چکا تھا جس کی کوئی تلافی نہ تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر عابدہ اور اُس کے تین بھائی چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے، میں نے عابدہ کو چھوڑ کر سب کو حسبِ مراتب پیار کیا۔ میں اُن سے پہلی بار ملا تھا کیونکہ اُس رات وہ سوئے ہوئے تھے۔

عابدہ اور زینت نے دو پلیٹوں میں سالن ڈالا اور ایسے سکوت میں کھانا شروع ہوا جیسے دوسرے کمرے میں میّت موجود تھی۔ مجھے بے حد اُلجھن ہو رہی تھی۔ سب کی آنکھوں میں خوف کے سائے لرزاں تھے اور چہروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

"بھئی عابدہ کسی دن ساگ پکاؤ۔" میں نے ناقابلِ برداشت سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ "بخدا مجھے وہ ساگ آج بھی یاد ہے جو تم نے پہلے دن کھلایا تھا، یاد ہے تمھیں، کتنا بھوکا تھا اُس دن۔۔۔؟"

"جی ہاں مجھے سب کچھ یاد ہے۔" عابدہ نے لمحہ بھر کے لیے لانبی لانبی پلکیں اُٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا۔

اُس نے مختصر سے جواب میں اتنا کچھ کہہ دیا تھا جو صرف میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں اماں بی کوئی بات ہے۔ میں نے بھی آج محسوس کیا ہے۔ کچھ ہے اماں بی۔"

"پھر مجھ سے نہ پوچھو بیٹے، کچھ کہہ دیا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گی، احسان فراموشی ہوگی، جس طرح تم نے بھیجا تھا اسی طرح یہاں سے رخصت کر دو۔"

"نہیں۔" میں نے سنجیدہ آواز میں کہا۔ "آپ لوگ یہاں رہیں گے۔ اس حویلی پر میرا بھی کچھ حق ہے، کم از کم اماں بی کی زندگی میں اپنا حق استعمال کروں گا۔"

"نہیں۔" اماں بی بھڑکتی آواز میں بولیں۔ "اگر تم نے کسی سے کچھ کہا تو ہم اجازت بھی نہیں لیں گے۔"

"میں نہیں چاہتی ہماری وجہ سے خاندان بکھر جائے، نہیں خرم سلطان، بس ہمیں یہاں سے لے چلو جہاں چاہو لے جانا۔ میں تم جیسے بیٹے سے محروم تو نہیں ہونا چاہتی۔"

"ٹھیک ہے اماں بی، میں عابدہ سے بات کروں گا۔"

"تو وہ یہاں لائی خرم؟" عابدہ نے جھانک کر پوچھا۔

"نہیں میں اُدھر ہی آ رہا ہوں۔"

عابدہ نے تاں جو مجھ کر تنہائی کا موقع دیا تھا، ورنہ اماں بی سے اجازت لے کر میں اس سے باتیں کرنے کا وقت لیتا، عابدہ اپنے کمرے میں [illegible] کر قہوہ لینے چلی گئی، سائڈ ٹیبل سے سنہرے فریم کو میں نے [illegible] دیکھا کیا۔ وہ کالج کے زمانے کی میری تصویر تھی۔ وہ اندر آئی تو میں نے فریم واپس رکھ دیا۔ کمرے میں کوئی کرسی نہ تھی بس ایک پلنگ ہی تھا۔ "مجھ سے میری تصویر خوش نصیب ہے، یہاں رہتی ہے اور ہر وقت تمہیں دیکھتی ہے۔"

"جانتے ہو کہاں سے اٹھا لائی تھی؟" اس نے پیالی میں قہوہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "جس روز اماں بی نے زینت اور اکرم بھائی کا فیصلہ کیا تھا اسی دن زینت نے یہ فریم اٹھا کر اسٹور روم میں پھینک دیا تھا۔"

[illegible] اچھا فیصلہ [illegible] تھا۔ جب کوئی کسی کی زندگی سے نکلتا ہے تو [illegible] کی ہمارے لیے بے معنی ہو جاتی ہیں۔"

[illegible] ان سانسوں میں شامل کر لیتا ہے تب [illegible] کیا کرتا ہے؟" میں نے پیالی بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ زینت کو لیا ہو گیا ہے۔" میں نے اس کا سوال گول کر دیا۔ "وہ تو ایسی نہ تھی۔"

"وہی جو ہم عورتوں کو اکثر ہو جاتا ہے۔" عابدہ نے جواب دیا۔ "جب سے تم آئے ہو اس کا مزاج بے حد چڑچڑا اور رویہ تلخ ہو گیا ہے، کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے ہم اس در کے بھکاری ہیں۔"

"تمہاری امی جان نے بھی کچھ ایسا ہی شکوہ کیا ہے، میں زینت سے بات کروں گا۔"

"یقین کرو خرم میری وجہ سے امی جان رکی ہوئی ہیں، تمہیں اب کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔"

"تم لوگ یہاں رہو گے عابدہ۔" میں نے قہوے کا سپ لے کر کہا۔ "فیصلے بار بار نہیں کیے جاتے۔"

"لیکن کب تک خرم...؟"

"جب تک ہم لوگ اس حویلی میں رہیں گے۔"

"کوئی حیثیت بھی تو ہونی چاہیے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

عابدہ نے چونک کر دیکھا اور پلکیں جھکاتی ہوئی میرے نزدیک آئی۔ "میں تمہارے وعدے پر زندہ ہوں خرم اور امی جان میری ضد پر یہاں مقیم ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں اماں بی سے بات کروں گا۔" میں نے نگاہیں چراتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن ہمارے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تمہیں کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا، میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا، مگر فی الحال نہیں، میرے ساتھ کچھ مجبوریاں ہیں۔"

"کیسی مجبوریاں خرم؟" وہ رو پڑی۔ "امی جان بیمار ہیں، اگر ان کو کچھ ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی؟"

"ایسا نہ سوچو عابدہ، جب تک اماں بی زندہ ہیں، میں یہاں ہوں تم خود کو تنہا محسوس نہیں کرو گی، ہاں اگر میں نے محسوس کیا کہ یہاں تمہاری عزتِ نفس مجروح ہو رہی ہے تو اس حویلی کے باہر بھی دنیا آباد ہے، بس خوش رہا کرو۔" میں نے پیالی رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا، عابدہ جو کچھ میری زبان سے سننا چاہتی تھی میں وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔

مجھے دو محاذوں پر لڑنا تھا، ایک محاذ منشیات کے خلاف کھل گیا تھا اور دوسرا فاروق چوہدری کا معاملہ تھا، میں تنہا تھا اکرم بھائی تو رنگ آلود کارتوس کی مانند تھے۔ انھوں نے میری پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا، اگر وہ حویلی کی حفاظت کرنے کے قابل ہوتے تو میں کسی نہ کسی طرح سے باہر کے معاملات دیکھ لیتا لیکن انھوں نے واضح طور پر معذوری ظاہر کر دی تھی۔

عابدہ سے جب میں نے وعدہ کیا تھا تو وہ کسی سنجیدہ نوجوان کا وعدہ نہ تھا، وہ تو ایک وقتی اور جذباتی وعدہ تھا، ایسا ہی وعدہ میں نے ایڈنا سے بھی کیا تھا، اگر کوئی تیسری لڑکی مجھے متاثر کرتی اور میرے قریب آ کر وعدہ لیتی تو میں شاید اس سے بھی وعدہ کر لیتا۔

اُن دنوں تو مجھے اپنی زندگی کا بھی یقین نہ تھا، میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں اتنے بھیڑیوں کے نرغے سے بچ کر اپنے ملک جا سکوں گا۔

یہی وجہ رہی تھی کہ میں نے ایڈنا کا دل توڑا تھا نہ عابدہ کی چاہت کو ٹھکرایا تھا پھر اپنی دانست میں میں نے عابدہ کے تمام احسانات اور جذبوں کی قیمت ادا کر دی تھی۔ میں نے اُن کے لیے ایک بہتر ماحول اور گھر کا انتظام کر دیا تھا، دُنیا میں اگر کوئی احسان کا بدلہ چکانا چاہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا کر سکتا تھا۔

وہ رات میں نے سوتے جاگتے اور سوچتے گزاری، لیکن صبح تک میں کسی بھی فیصلے کے قریب نہ ہو سکا تھا، عابدہ سے محبت نہ سہی لیکن اُس کا شمار اُن لڑکیوں میں تو تھا جنھوں نے مجھے متاثر کیا تھا۔ وہ ایک اچھی شریکِ حیات بن سکتی تھی۔

لیکن میں جن راہوں کا مسافر تھا اُن پر کہکشاں کی روشنی نہ تھی بلکہ نوکیلے سنگریزے بچھے ہوئے تھے، میں کیسے کسی نازک اندام لڑکی کو اپنا شریکِ سفر بناتا۔

عابدہ کچن میں تھی اور زینت بھینسوں کے باڑے کی جانب جا رہی تھی، میں ٹہلتا ہوا باڑے میں داخل ہوا، اکرم بھائی باڑے کے باہر ٹہل رہے تھے۔

"آج کل کتنی بھینسیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف تین۔" اکرم بھائی نے بتایا۔ "برکت خان چلا گیا ہے اور کوئی ملتا نہیں، زینت کے لیے تینوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"میں کوشش کروں کاجھائی جان، ایک نگران اور ایک گھر کے کام کے لیے آدمی آپ کو دوں، آپ بالکل ہی دل ہار بیٹھے ہیں، زینت کی خاطر خود کو بدلیے، وہ پریشان ہے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں خرم۔" وہ گہری سانس لے کر بولے۔ "میں اس لڑکی کے قابل نہ تھا، لیکن جب تم نے بھی دامن بچا لیا تو حویلی کی عزت کون بچاتا، سنو خرم جب وہ خطرہ دُور ہو جائے گا تو میں تم دونوں کی راہ سے ہٹ جاؤں گا۔ میں تمام عمر اس کی گرم گرم آہوں میں نہیں جل سکتا خرم، وہ ہر وقت جلتی رہتی ہے، اگر کوئی حل نہ سوچا گیا تو وہ پاگل ہو جائے گی۔"

"دُودھ پیو گے خرم؟" دروازے پر آ کر زینت نے پوچھا۔

اور میں نے کچے دودھ کے کچے بھرے ہوئے ڈانگے کو بلا کرنے کے لیے ہاں کہہ دی۔

دودھ پی کر ناشتے کی حاجت نہ رہی تھی اس لیے میں اماں بی کو سلام کر کے حویلی سے نکل گیا تھا۔ دراصل حویلی کی فضا کچھ اس قدر سوگوار اور ناخوش گوار ہو گئی تھی کہ میں وہاں زیادہ وقت نہیں رہنا چاہتا تھا۔

اڈے سے اُتر کر ٹیکسی پکڑی سیدھا بیگن کے پاس گیا، اُسے میں نے رات مظفر گڑھ روانگی کے لیے جو کچھ کہا تھا اُس نے رپورٹ نہ دی تھی، میں جب کاٹج میں داخل ہوا رشیدہ اور سلوا کیاریوں میں پانی دے رہے تھے، رشیدہ کھرپے سے گوڈی کر رہی تھی اور سلوا فوارے سے پانی ڈال رہا تھا۔

میں گڑبڑا چلتا ہوا اُن کے پیچھے جا رُکا وہ دونوں اپنے اپنے کام میں اتنے محو تھے کہ میرے قدموں کی چاپ نہ سن سکے تھے، سلوا نے فوارے کا رُخ اچانک موڑا اور پانی کی پھوار رشیدہ کے ہاتھوں پر پڑی۔

رشیدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"پھولوں پر بارش کے قطرے اتنے ہی دل کش ہوتے ہوں گے۔" سلوا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چہرے پر انگاروں کی بارش بھی کچھ کم دل کش نہ ہوتی ہوگی۔" رشیدہ نے کھڑکا بھرایا اور سلوا اُچھل کر ہنستا ہوا ایک دم پیچھے ہٹا۔ چونکہ میں اُس کی آڑ میں تھا اس لیے جونہی وہ ہٹا رشیدہ نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ ایسے ہی سہم کر چُپ ہو گئی تھی جیسے کسی بزرگ نے بچے کی چوری پکڑ لی ہو۔

"واہ۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "ماسٹر کا ایک مسئلہ تو حل ہو گیا اب چارا اپنے لان اور پودوں کے لیے فکر مند رہتا تھا۔"

سلوا بھی پشیمان اور نادم سا ہو کر ہنسنے لگا۔

"کیری آن۔" میں آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"ماسٹر باہر ہیں چیف۔" سلوا میرے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ "مجھے مادام کی نگرانی کی ہدایت ملی تھی، مادام نے بتایا ہے وہ بہت جلدی میں تھے۔"

"ٹھیک ہے تم لوگ کام کرو۔" میں نے دیکھا رشیدہ اُسی جگہ اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔

میں نے اندر جاتے ہی آئی جی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری گھنٹی پر بڑی نپی تلی سی آواز سنائی دی۔ "ہیلو آئی جی اسپیکنگ..."

"سلام علیکم سر۔" میں نے مؤدب آواز میں کہا۔

"شناخت؟"

"چیتا..."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہ۔" اُن کے حلق سے غراہٹ اُبھری۔ "رات کہاں تھے تم؟"

"اپنے گھر سر۔"

"تم۔ تم... گھر کو بھول کیوں نہیں جاتے لڑکے؟"

"اس لیے سر کہ اس گھر میں ایک عورت ہے۔ سعیدہ بالوں والی جس نے مجھے جنم دیا تھا، اگر میں اس کو بھول جاؤں تو پھر مجھے میری شناخت کون کرائے گا سر؟"

"تم بہت سی پریشانیاں ساتھ لائے ہو نوجوان۔"

"پریشانیاں میری منتظر تھیں سر۔" میں نے دکھتی آواز میں جواب دیا۔ "میں ساری پریشانیاں اُدھر ہی چھوڑ آیا تھا۔ کیا آپ کو بیگن نے کچھ بتایا ہے؟"

"ہاں، تفصیل تم بتاؤ گے۔"

"مظفر چوہدری میرے گھر گیا اور اس نے میری ماں کو طمانچہ مارا۔ اُس ماں کو جس کے دو نوجوان بیٹے زندہ ہیں۔" میری آواز تھرتھرا کر ڈوب گئی۔

"لیکن عادل خان کو قتل..."

"میں نے مظفر چوہدری سے وہ ہاتھ مانگا تھا سر، میں وہ کلائی سے ہاتھ وہاں کے قدموں تک لے جانا چاہتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ہاتھ عادل خان کا ہے اور عادل خان نے اپنے آقا سے درخواست کی تھی سر کہ پہلے اُسے احساسِ درد سے نجات دلائی جائے۔ تب مظفر چوہدری نے دو وار کر کے اُسے خاموش کیا اور میرے لیے عادل کا ہاتھ کاٹ لیا۔"

"یعنی تم نے کچھ نہیں کیا؟"

"جی ہاں سر۔" میں نے جواب میں بتایا۔ "صرف میں نے ہاتھ مانگا تھا۔"

"ٹھیک ہے نوجوان۔" میں نے ہدایات اُسی وقت جاری کر دی تھیں۔ "میں رات بہت کم سویا ہوں۔ مظفر چوہدری کا رُخ میری ذات اور خاندان کی جانب ہوگا سر۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔ "وہ مغرور قاتل ہے اور کئی قتل کرنا چاہے گا۔ اس لیے..."

"نہیں۔" وہ دہاڑ اُٹھے۔ "اب تم اُدھر نہیں جاؤ گے۔ میں تمہارے خاندان کی حفاظت کا انتظام کر دوں گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ تم اپنے کام پر توجہ دو۔ اگر تم خاندانی سیاست اور علاقائی آگ میں کود پڑے تو جس مقصد کے لیے تمہارا انتخاب کیا گیا ہے وہ پس پشت چلا جائے گا۔ میرے بیٹے! تو دے قوم و ملک کی فلاح مقدم ہوتی ہے۔ تم قوم کے بیٹے اور اللہ کے سپاہی ہو۔ اگر تم نے اب کوئی حرکت کی تو تمہیں تحفظ دینے والے ہاتھوں کو دُکھ ہوگا، یہ مغرب نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھنا۔"

"میں ظلم اور جارحیت کے خلاف جنگ لڑنے میدان میں اتارا گیا ہوں سر۔ ظالم اور جارح جہاں ہوگا۔ میں اُس کے ہاتھ توڑوں گا۔ چاہے وہ مظفر چوہدری ہو یا رنگ باد خان، آپ کو یقین دلاتا ہوں سر، میں پہل نہیں کروں گا۔ ہاں جس گھر اور ہاتھ کی طرف سے پتھر آئے گا اُسے میں تباہ کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اپنے دفاع سے تمہیں کوئی قانون نہیں روک سکتا۔"

"شکریہ، بہت بہت شکریہ سر۔" میں نے تشکرانہ لہجے میں کہا اور انھوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

بڑی خطرناک خبر ملی تھی۔ مظفر چوہدری فرار ہو گیا تھا یا اُسے آنکھیں چُرا کر فرار ہونے کا موقع دیا گیا تھا۔ بہرطور وہ آزاد تھا اور قوم چوہدری کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کر گیا تھا۔ مجھے اُن پر یوں یقین نہ تھا جو اُس کی تلاش میں معروف عمل تھے کیونکہ اُن پیشوں کا رُخ مظفر چوہدری کا اثر و رسوخ اور اُس کی دولت آسانی سے موڑ سکتی تھی۔

لیکن میری حویلی کی طرف جانے والے تمام راستے صاف اور کھلے ہوئے تھے۔ اُسے اُدھر جانے سے کون روک سکتا تھا۔ اگر وہ وہاں چلا جاتا تو حویلی کا دفاع کون کرتا۔ اکرم بھائی، جو ہوائی سرراہٹوں سے سہم کر دُبک جانے والے تھے، زینت ایک نازک سی لڑکی یا میری بوڑھی ماں۔ کوئی بھی نہیں، اُسے صرف محرم چوہدری روک سکتا تھا۔ جسے قانون کے بڑے محافظ نے روک دیا تھا۔

لیکن میں قانون کی بالادستی کے تصور کو نہیں چاٹ سکتا تھا۔ مجھے اپنے خاندان کو بہرکیف بچانا تھا۔ میں نے ٹرانسمیٹر آن کر کے بیگن کو کال کی۔

"ہیلو... ہیلو... یس چیف..." بیگن نے تیسری کال کا جواب دیا۔

"پوزیشن بتاؤ ماسٹر! اوور..."

"برساتی نالہ چیف! پولیس جائے وقوعہ کو دیکھ رہی ہے۔"

"لاش ملی...؟"

"نہیں چیف! یہ لوگ بس پتھر سونگھ رہے ہیں۔"

"تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟"

"میں نے میک اپ میں سب کو آپ کے گاؤں کی نگرانی پر لگا دیا ہے چیف، کونز اکرم صاحب کے ساتھ اندر موجود ہے۔"

"شکریہ ماسٹر!" میرا دل اُس بوڑھے کے احترام سے خوش

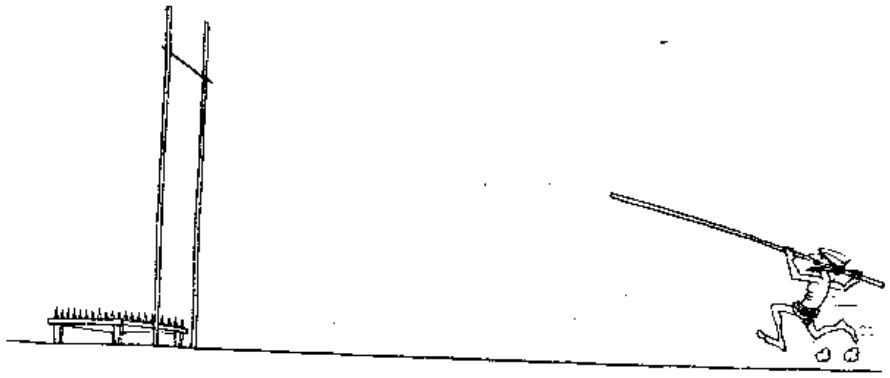

ہو گیا تھا۔ "تم چلے آؤ۔ میں عمیس رائٹ رنگ ہوٹل کے ہال میں ملوں گا۔"

"اوکے چیف..."

میں باہر نکلا۔ برآمدے میں رشیدہ کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ سُتا ہوا اور آنکھیں نم ناک تھیں۔ میں نے اُسے مسکرا کر دیکھا لیکن جواباً وہ مسکرائی نہ تھی۔

"کیا بات ہے، یہ تم بسور کیوں رہی ہو؟"

"خرم! خدا کی قسم میں بے قصور ہوں۔" اُس نے غیر متوقع وہ حرکت کی تھی۔" وہ ہچکیاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کون سی حرکت...؟" میں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"وہی پانی والی۔"

"سنو رشیدہ بیگم!" میں نے آگے بڑھ کر اُس کے شانے کو تھپتھپایا۔ "تم خود مختار اور آزاد ہو، کسی کی کھیل اور دلیل نہیں ہو، رہا ہنسی مذاق تو زندگی میں ذرا سی خوشی کی خاطر ہنس بول لینا میرے نزدیک معیوب نہیں۔ سلوا بہت اچھا نوجوان ہے۔ جاؤ، مزے دار سی چائے بنا کر لاؤ۔ ذرا جلدی، مجھے واپس جانا ہے۔"

"خرم! مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ تم کون لوگ ہو؟"

"اچھے لوگ ہیں۔"

"خفیہ پولیس...؟"

"خفیہ پولیس والے ہم جیسے ہوتے ہیں؟"

"پھر... پھر کون ہو؟ مجھے بتا دو خرم، میں ہر حال میں تم لوگوں کی وفادار رہوں گی۔"

"بس وفاداری بیدار رکھو، ساتھ رہو گی تو جان لو گی۔"

وہ پونٹ چباتی ہوئی کچن میں چلی گئی اور میں نے سلوا کو آواز دے کر بُلا لیا۔ وہ بھی خود کو محرم ہی سمجھ رہا تھا۔

"کونز کو جس شکار کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا اُس کی رپورٹ مجھے چاہیے۔" میں نے خشک انداز میں کہا۔

"کونز نے ماسٹر کو رپورٹ دی تھی۔" سلوا نے جواب دیا۔ "وہ گوالمنڈی کے علاقے میں گیا تھا۔ وہاں سے اُسے کسی دوسری جگہ بھیج دیا گیا تھا۔"

"تم دوسرے حکم تک یہاں رہو گے لیکن محافظ بن کر۔"

"اپنے حکم کی وضاحت کریں چیف!" اُس کے تنفس پھر کھنکنے لگے۔ "سلوا کو آپ نے پہچانا نہیں ہے چیف۔"

"سنو برادر۔" میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ لڑکی میں ایک تہ خانے سے نکال کر لایا ہوں۔ مظلوم ہے اور ہماری پناہ کے سائے میں اسے سکون ملنا چاہیے۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"ہاں، میں خیال رکھوں گا۔"

"سنو!" میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "اگر تم ایک اچھے مرد بن کر اس کا دل جیت سکو تو مجھے خوشی ہوگی لیکن مشرقی روایات کو مجروح نہ ہونے دینا برادر۔"

"اس اجازت کا شکریہ چیف، اگر میرے خلوص میں خوشبو ہوئی تو اسے بھی محسوس ہوگی۔"

رشیدہ چائے لے کر آئی تو سلوا وہاں سے کھسک گیا تھا۔ شاید وہ مجھے سفارش کا موقع دینا چاہتا ہوگا۔ مگر میں ایسی سفارش اُس لڑکی سے نہیں کر سکتا تھا جسے میں شرافت اور انسانیت کا درس دیتا رہا تھا، جس نے دبے دبے الفاظ میں اپنی چاہتوں کا اظہار بھی کر دیا تھا، جو میری ذات کا سہارا پا کر ماضی کو فراموش کرنا چاہتی تھی، میں اُسے کس طرح کوئی دوسری راہ دکھاتا۔

"اگر گھومنا پھرنا چاہو تو میں سلوا سے کہہ دیتا ہوں۔ لیکن کھلے چہرے کے ساتھ نہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں! میں کسی اور کے ساتھ باہر نہیں جاؤں گی۔"

"میں معروف ہوں رشیدہ بیگم!" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں تمہیں لے کر تھوم پھر نہیں سکتا۔"

"میں نے کوئی شکوہ تو نہیں کیا مخدوم۔"

"شکوے آنکھوں اور انداز میں بھی ہوتے ہیں۔"

"آپ میری آنکھوں میں دیکھتے ہی کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ تمہاری آنکھیں خوب صورت ہیں۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "... اور جب اتنی خوبصورت آنکھوں میں غصہ اُتر آئے تو اور بھی قاتل بن جاتی ہیں۔"

"میں سولہ سترہ برس کی جذباتی اور انجان لڑکی نہیں ہوں مخدوم سلطان!" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ "ایسی باتیں اور ان کا خمار میں بہت پہلے خود سے جُدا کر چکی ہوں۔ میں خود شناس ہوں۔ وقت نے مجھ سے اور میں نے وقت سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔"

"اچھا، باقی باتیں پھر کبھی۔" میں نے پیالی اُس کی طرف بڑھائی۔ "ہم لوگ شاید رات دیر سے آئیں۔ سلوا یہاں رہے گا، زندہ دل نوجوان ہے مگر بُرا نہیں۔"

"مجھ میں اتنی جرأت اور عقل ہے، آپ میری فکر نہ کریں۔" وہ روٹھے ہوئے انداز میں بڑبڑائی تو میں نے اُٹھ کر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رشیدہ نے رُک کر چہرہ آہستہ آہستہ گھمایا۔

"میں تمہاری بسورتی صورت ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔"

"پھر مجھے بتاؤ، تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نا۔" اُس کی حرکت میں میرا ارادہ شامل نہیں تھا، یقین کرو۔"

"مجھے یقین ہے، جس دن یقین مر گیا تم یہاں نہیں ہو گی۔"

"شکریہ۔" اُس کے لبوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ "میں پریشان ہو گئی تھی۔"

"ایک بات یاد رکھنا رشیدہ، مخدوم سلطان کوئی خوش باش شخص نہیں ہے۔ خوش رہا کرو، ورنہ میری پریشانیوں میں اضافہ ہو گا۔"

"مجھے... مجھے..." وہ پلٹ کر بولی۔ "تم اپنی پریشانی میں مجھے شامل کیوں نہیں کرتے۔ مجھے بتاؤ مخدوم، میں کمزور سہی لیکن بڑی حوصلہ مند ہوں۔"

"میں تمہارا حوصلہ ضرور آزماؤں گا رشیدہ!" میں نے اُس کے بکھرے ہوئے بالوں پر تھپکی دی اور چل پڑا۔

رائل رنگ ہوٹل کا ہال ویران تھا۔ کاؤنٹر کلرک بھی غائب تھے اور ویٹرز دائرے میں بیٹھے جیسے میٹنگ کر رہے تھے۔ میں بارجس انداز میں پہلے وہاں داخل ہوا تھا، اُن کو وہ انداز، وہ شخص یقیناً یاد رہنا چاہیے تھا۔

دو ویٹرز ایک ساتھ میری طرف لپکے۔ اُن کے انداز میں جارحیت نہیں بلکہ خوف تھا۔ حالانکہ میں نے اُن کو دوستانہ مسکراہٹ دی تھی۔

"میں یہاں خاص کے ایک مہمان کا انتظار کروں گا۔" میں نے بے حد نرم لہجے میں بتایا۔ "اگر آسانی کے ساتھ چائے مل جائے تو ہاف سیٹ لے آؤ۔"

"بہتر جناب!" ایک ویٹر نے سر کو خم دے کر جواب دیا۔

"اور کوئی خدمت جناب؟"

"بس چائے لے آؤ۔" میں نے ایک میگزین اُٹھایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں تیسری پیالی پی رہا تھا کہ بیگن اندر داخل ہوا۔ اُس کے سُرمئی بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ گرد آلود تھا۔ چونکہ وہ روشنی سے اندر آیا تھا، اس لیے فٹ میٹ پر رُک کر اُس نے آنکھوں کو اِدھر اُدھر گھمایا۔ میں نے میز بجا کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"سوری بوائے۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ جب وہ اور میں تنہا ہوتے تو وہ تکلفات کی پروا نہیں کرتا تھا۔ میں نے خود اُسے کہا تھا۔ اُس کی عمر کا بھی یہی تقاضا تھا۔ "گاڑی... راستے میں بگڑ گئی تھی۔" میں نے ویٹر کو میز بجا کر بلایا اور "ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دے دیا۔" وہ پولیس سے بچ کیسے گیا؟"

"اُسے بچایا گیا ہے مسٹر مخدوم۔" اُس نے بتایا اور میرے شک کی تصدیق ہو گئی۔ "میں بحیثیت رپورٹر اُن کے ساتھ ساتھ رہا ہوں۔ ایس ایچ او کا رویہ اور انداز ایسا ہی ہے۔ اس نے ساری فورس نالے میں پھیلا رکھی ہے، جیسے قاتل کسی جھاڑی میں دُبکا ہوا ہو گا۔"

"آپ کب پہنچے تھے انکل؟"

"رات دو بجے لیکن اُس وقت وہ فرار ہو چکا تھا اور پولیس ہوائی فائرنگ کر رہی تھی۔"

"چلو، دونوں پارٹیاں مصروف تو ہو گئی ہیں۔" میں نے بے پروائی ظاہر کی، کیونکہ بیگن مجھ سے بھی زیادہ پریشان تھا۔ "اب ہمیں اپنے فرائض کی جانب توجہ دینی ہو گی۔ آپ کا غائبانہ تعارف ہو چکا ہے اور خان بے تابی سے آپ کے منتظر ہیں۔ آپ کو ایک بہت بڑی آفر دینا ہو گی۔ خود کو ہمیں الاقوامی معیار پر رکھنا ہو گا۔ کم از کم ایک لاکھ کا مال، آپ کی لاگت، آبدوز ہے اور عمران کے ساحلی علاقے میں زیرِ آب کھڑی ہے۔"

"فکر نہ کرو، میں اُسے سنبھال لوں گا۔ بیگن بولا۔ "اتنے مال کی ادائیگی کیسے ہو گی؟"

"ادائیگی کی نوبت ہی نہیں آئے گی ماسٹر۔" میں نے مسکرا کر اُسے مطمئن کر دیا۔ "میں پلاننگ کر چکا ہوں۔ پہلے مرحلے سے گزر کر پھر آپ کو بتایا جائے گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

"بہتر۔" وہ سر کو ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے سیٹھ سلیمان کے معاملے میں تھوڑی سی ترمیم کر ڈالی ہے، میں نے اُسے دوبارہ اغوا کروایا تھا۔"

"اوہ... لیکن کیوں ماسٹر؟"

"اس لیے پیارے!" وہ مسکرانے لگا۔ "ہم سے ایک بھول ہو گئی تھی۔ اگر اُسے جانے دیا جاتا تو سارا کھیل بگڑ جاتا۔ سیٹھ سلیمان ساری کارروائی کو سمجھ جاتا اور مال گودام سے غائب کر دیا جاتا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" میرے مُنہ سے سیٹی کی آواز نکل گئی۔ "واقعی مجھ سے ایک خطرناک غلطی ہوئی تھی ماسٹر! آپ نے بروقت قدم اُٹھا کر بہت اچھا کام کیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں بوائے! بحیثیت انسان، غلطی ہمارا بنیادی حق ہے۔"

میں نے ایک بج کر بیس منٹ پر خان کا مخصوص فون نمبر ڈائل کیا۔ اُس کے معمولات میں ثمینہ اور امینہ کو کالج سے لانا بھی شامل تھا۔ وہ کچھ بھی تھا لیکن بحیثیت باپ وہ بہت مہربان اور اچھا باپ تھا، ورنہ وہ دونوں کو کار بھی دینے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اپنے ذاتی ڈرائیور سے کام بھی لے سکتا تھا۔ مگر اُس نے یہ نازک فرض اپنی مصروف ترین زندگی کے باوجود خود سنبھال رکھا تھا۔

"فہمیدہ گل بول رہی ہوں۔" مترنم سی آواز آئی۔

"السلام علیکم مس ثمینہ گل! میں محترم سلطان ہوں۔"

"آپ کو تو خود آنا تھا۔" اُس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

"ہاں مس خان! لیکن شام سے پہلے نہیں آ سکوں گا۔"

خان صاحب کو میرا سلام کہنا۔"

"رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے نا؟"

"اپنی خوش بختی کو آواز ضرور دوں گا مس۔"

"بہتر ہے، ہولڈ کریں ڈیڈی آ رہے ہیں۔"

"ہیلو... کہاں ہو...؟" رنگ باز خان نے پوچھا۔

"ہوٹل میں خان۔" میں نے جواب دیا۔ "مسٹر بیگن میرے ساتھ ہیں۔"

"اچھا، اچھا۔ تو مل گیا۔ ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔" اُس نے "آپ کے لیے کھانا لگایا جائے جناب؟" کاؤنٹر کلرک نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"خان صاحب آ رہے ہیں، اُن کو آنے دو۔" میں نے جواب دیا اور بیگن کو ایسے تیار کرنے لگا جیسے باکسر کو رنگ میں اُترنے سے قبل مدِ مخالف کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ میری نئی ذمہ داری کا وہ پہلا مقابلہ تھا۔ ہمارا حریف ہر لحاظ سے طاقت ور تھا۔ وہ بھیڑیے سے کہیں زیادہ خطرناک اور گیدڑ جیسا ہوشیار اور محتاط شخص تھا۔ گو مجھے بیگن کی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی پر بھروسہ تھا لیکن کوئی بال برابر چوک بھی شیرازہ بکھیر سکتی تھی۔

پندرہ منٹ بعد خان ہمارے سامنے تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کا استقبال کیا۔ اُس کی عقابی نگاہیں اپنے شکار پر تھیں۔ چند لمحوں میں ہی اُس نے بیگن کے سراپا کا بغور جائزہ لے لیا تھا۔

"مسٹر بیگن فرام فلپائن۔" میں نے مترجم کے فرائض سنبھالتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ خان نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ دو منٹ دونوں حریف ایک دوسرے کو ناپنے میں تولتے رہے تھے۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی خان۔" بیگن نے کہا اور میں نے خان کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم ترجمہ کرو گے مسٹر مخدوم، میں انگریزی نہیں جانتا۔ آیئے آفس میں چلتے ہیں۔"

اُس نے آفس میں بیٹھ کر انٹرکام پر تین بہترین کھانوں کا حکم دیا۔

"گرینڈ ماسٹر مخدوم سلطان۔" بیگن نے میرے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ میں ساتھ ساتھ اُردو میں ترجمہ کر رہا تھا۔ "ہمیشہ میرا پسندیدہ نوجوان رہا ہے۔ میں اسے واپس لے جانا چاہتا ہوں مگر اس کی کوئی خانگی مجبوریاں ہوں۔ اگر آپ پسند کریں خان، تو میں اسے یہاں اپنا نمائندہ مقرر کر دوں گا۔ میرا بزنس تقریباً ساری دُنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ میں بار بار ٹرپ لینے نہیں آ سکتا۔ مجھے یہ سُن کر مسرت ہوئی ہے کہ آپ اعلیٰ پیمانے پر بزنس کرنے کی پوزیشن رکھتے ہیں۔ مجھے مخدوم سلطان پر اندھا اعتماد ہے اور یہ آپ سے معاملہ کرنے کی سفارش کر چکا ہے۔" بیگن نے سانس لی اور پھر بولنے لگا۔ "مسٹر خان! مجھے اعلیٰ کوالٹی چاہیے۔ میں رَف مال کا سوداگر کبھی نہیں رہا۔ اچھا مال اور اچھی قیمت میرا پہلا اصول ہے۔ اب آپ بتائیں مجھے کتنا مال دے سکتے ہیں؟ ہاں، میں نمونہ دیکھنا ضرور پسند کروں گا۔"

"آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے مسٹر بیگن؟" خان نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کم از کم وقت میں کم از کم ایک لاکھ کا مال۔" بیگن نے جواب دیا۔ "ادائیگی جس کرنسی میں چاہیں گے نقد ادا کی جائے گی۔"

رنگ باز خان کی کرنجی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی خوشی کو بمشکل چھپا رہا تھا۔ "ٹھیک ہے مسز بیگن۔" وہ تمتماتی ہوئی آواز میں بولا۔ "لیکن مجھے چند دنوں کی مہلت دیں گے۔ اتنا مال میرے گودام میں نہیں ہے۔" بیگن نے چہرہ گھما کر میری طرف دیکھا۔

"یہ مسٹر خان کی مجبوری ہے گرینڈ ماسٹر۔" میں نے کہا۔ "یہاں اتنے مال کی کھپت نہیں۔ خان کو اُدھر سے مال منگوانا ہوگا۔"

"لیکن پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔" بیگن اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "اگر ایسی بات ہے تو مجھے اُدھر لے چلو۔ وہاں سے میں براہِ راست مال حاصل کر لوں گا۔"

"براہِ راست مال حاصل کرنا آپ کے لیے مشکل اور خطرناک ہوگا مسز بیگن۔" خان نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "ان دنوں ہماری گورنمنٹ الرٹ ہے۔ ملک سے یہ بزنس یا کم از کم یہ روٹ ختم کرنا چاہتی ہے۔ ہمارے اپنے ذرائع اور کچھ رابطے ہیں۔ ہم آج کل مال بذریعہ ٹرک لانے کا خطرہ مول نہیں لیتے میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دوں گا۔"

"پھر آپ جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہ کام کریں۔ میں زیادہ دنوں تک بوٹ نہیں روک سکتا۔" بیگن نے حتمی لہجے میں کہا۔ "اگر کچھ ایڈوانس کی ضرورت ہو تو بتایئے؟"

"نہیں جناب۔" خان نے ہنستے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔ "میرے لیے محترم سُلطان کی ذات ہی بہت بڑی ضمانت ہے۔"

"بے شک۔" بیگن نے میری جانب پیار سے دیکھا۔ "یہ لڑکا اتنا ہی قیمتی ہے۔ کاش یہ واپس جا سکتا۔"

"ہم اُدھر آئیں گے مسز بیگن۔" خان نے میری طرف دیکھا اور میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "آپ سے دوستی ہوئی ہے۔ یہ تعلق ہم گہرا کرنے اُدھر آئیں گے۔"

"موسٹ ویلکم خان! مجھے محترم سُلطان کو اُدھر دیکھ کر بہت خوشی ہوگی۔ اب آپ پہلے منٹ کا طریقہ کار بھی بتا دیں۔ میرا اکاؤنٹنٹ ایک انٹرنیشنل بینک میں ہے۔"

"پاکستانی کرنسی اور کیش پہلے منٹ۔" خان نے بتایا۔ "محترم سُلطان؟"

"یہ آپ دونوں کا معاملہ ہے خان۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "میں تو دونوں کا ہی خواہ ہوں۔"

"کھانا کہاں لگایا جائے جناب۔" کاؤنٹر کلرک نے جھک کر پوچھا۔

"ہال میں لگا دو۔" خان نے جواب دیا۔ "تشریف لے چلیے مسز بیگن۔"

کھانے کے دوران بیگن خاموش ہی رہا تھا۔ میں اور خان مال کے بارے میں تبادلہ خیالی کرنے لگے تھے۔ خان صرف اپنی مالی قوت کے مطابق مال سپلائی کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ میں نے زور دے کر مشورہ دیا تھا کہ ایسا گاہک برسوں میں ہاتھ لگتا ہے۔ مقامی مارکیٹ سے اُدھار اور باہر سے بھی زیادہ سے زیادہ مال منگوایا جائے۔

میں چاہتا تھا کہ پہلی ضرب ہی اُسے اگر قبر میں نہیں تو بستر پر ضرور گرا دے۔ میں اُسے کمر توڑ ضرب لگانا چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنا محفوظ سرمایہ، ذاتی اثر اور تمام ذرائع جھونک دیتا تو اُس کی مالی، ذاتی اور سماجی حیثیت کو خاصی زک پہنچ سکتی تھی۔

"خان! یہاں آپ کا ہم پلہ صرف سیٹھ سلیمان ہے۔ آپ کسی ایجنٹ کے ذریعے اس سے مال کیوں نہیں حاصل کر لیتے؟"

"وہ بڑا کائیاں آدمی ہے محترم سلطان۔" خان نے بتایا۔ "اگر اُسے معلوم ہو گیا کہ رنگ باز خان کے ہاتھ بڑا گاہک لگ گیا ہے تو وہ مسز بیگن کو توڑ لے جائے گا۔"

"آپ کی خاطر میں اُس سے مل سکتا ہوں خان! ایک گاہک کی حیثیت سے۔"

"ہاں تم اُسے جیت سکتے ہو۔" خان کی آنکھوں میں پھر وہی چمک آ گئی۔ "ٹھیک ہے محترم، تم اُس سے مل لو اور جتنا مال اور جس ریٹ پر دینا چاہے خرید لو۔"

"بہتر خان! آپ اُس تک مجھے پہنچا دیں۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ وہ کارپٹ کارپوریشن کے آفس میں بیٹھا ہے۔ اگر تم مسز بیگن سے اجازت لے سکو تو میں ابھی انتظام کر سکتا ہوں۔"

"میں ان سے اجازت لے لوں گا خان۔"

"گڈ۔" خان رومال سے ہاتھ اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے اُٹھا اور اپنے آفس میں چلا گیا۔

"بہت گہرا چکر چلا رہے ہو چیف!" بیگن نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔ "ایک تیر سے دونوں کو مار گرانا چاہتے ہو۔ ہمیں تمہاری ذہانت اور حوصلے پر رشک آتا ہے۔ اگر دوسرے ادارے بھی اس طرح سوچیں تو یہ لعنت چند ماہ بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"ادارے اپنے وجود اور مفادات کا خیال رکھتے ہیں انکل۔" میں

نے کہا۔ "اگر معاشرے سے برائیاں ختم ہو جائیں تو کتنے ہی افراد فارغ ہو جائیں گے۔ جس طرح پولیس مجرم پالتی ہے اسی طرح رفاہی ادارے برائیوں کو دودھ پلاتے رہتے ہیں۔"

"یہ تجزیہ تمہارے اپنے ملک اور قوم تک شاید محدود ہے۔"

"نہیں انکل!" میں نے نفی میں گردن ہلا کر کہا۔ "ہر ملک اور قوم کے بارے میں میری رائے یہی ہے۔ ہاں، کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ یہاں کالی بھیڑوں کی تعداد زیادہ ہوگی اُدھر ہر ادارے میں ایک آدھ ایسی بھیڑ ہوتی ہے، مگر ہوتی ضرور ہے۔ میں نے ہانگ کانگ میں بھی پولیس کو بکتے دیکھا ہے۔ اُدھر فلپائن میں بھی پولیس کچھ بڑے مجرموں کو دودھ پلاتی ہے۔"

خان واپس آیا تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے مجھے بتایا کہ تیار ہو جاؤ۔ کھانے کے بعد چائے آئی اور پھر میں نے چہرے پر معذرتی نقاب چڑھاتے ہوئے بیگن سے اجازت چاہی۔

"ہاں ہاں، تم جاؤ۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "بس خان سے بات ہو گئی۔ جب مال تیار ہو گا تو تم مجھے اطلاع دے دینا۔ ہم لین دین کا معاملہ کسی اور جگہ طے کریں گے۔" اس نے اُٹھ کر پہلے خان سے ہاتھ ملایا اور پھر میرا ہاتھ تھام کر چل پڑا۔ خان بھی باہر سیڑھیوں تک ساتھ گیا تھا۔

"آپ اپنے لڑکوں کو واپس بُلا لیں انکل۔" میں نے کار کے قریب جا کر کہا۔ "وہ سرکاری لوگ ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری ذات کی خاطر وہ اُدھر مارے مارے پھریں۔ میں سیٹھ سلیمان سے مل کر خود اُدھر جاؤں گا۔ گھر کی حفاظت مجھے ہی کرنی چاہیے۔"

"بہتر، میں اُن کو کال کر لوں گا۔"

میں واپس آیا تو خان نے مجھے آفس میں بُلا لیا۔

"میں نے ایک کار منگوائی ہے۔ تم بھی ایک بڑے سیٹھ کی حیثیت سے وہاں جاؤ گے۔"

"اُسے کتنی آفر دوں خان؟"

"میں سمجھا نہیں۔" خان نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"میرا مطلب ہے، لاکھ دو لاکھ؟"

"اوہ... دس لاکھ تک میں مال اُٹھا سکتا ہوں۔"

"میں کوشش کروں گا کہ آپ کو اچھی خبر سنا سکوں۔"

"مجھے یقین ہے، تم میرے لیے خوش قسمتی کا نیا دروازہ کھول دو گے۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے خان صاحب۔" میں نے کسر نفسی سے کہا۔ "میں اس قابل کہاں ہوں۔"

میں نے کہا ہوں تم خود شناس ہو محترم چوہدری۔ تم نے زبانی نہیں بلکہ عمل سے اپنے آپ کو منوایا ہے اور رنگ باز خان جیسے دل سے مان لے وہ معمولی انسان نہیں ہو سکتا ہے۔ میں تو کنویں کا مینڈک رہا ہوں۔ مگر سلیمان کئی کامیاب ٹور کر چکا ہے۔ ہانگ کانگ میں تہلکہ مچانے والا پاکستانی نوجوان، نام کے حوالے سے اُس کے لیے جانا پہچانا ہوگا۔"

"پھر مجھے نام کے ساتھ دوسرا چہرہ بھی اپنے چہرے پر سجانا ہوگا۔"

"کیا تم میک اَپ کے فن سے بھی واقف ہو؟" خان نے حیرانہ آواز میں پوچھا۔

"ہاں، ایک گرینڈ ماسٹر کو کئی رُوپ بدلنے پڑتے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "مجھے یہ فن بھی اچھے فن کاروں نے سکھایا تھا۔"

"یار تمہاری کتاب کا ہر صفحہ ہی نہیں، ہر سطر بھی حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ کیا کیا جانتے ہو مجھے ایک بار ہی بتا دو نا۔"

"نہیں خان۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کتاب زندگی آہستہ آہستہ سوچ سمجھ کر پڑھنی چاہیے۔"

"یہ... یہ... کتاب۔" وہ جذباتی سا ہونے لگا تھا۔ "کہیں میں ضائع نہ کر بیٹھوں۔ وعدہ کرو محترم، مجھے اب کبھی نہیں چھوڑو گے۔ میں انجان سے گوشوں میں بڑی نرمی محسوس کرنے لگا ہوں۔"

"مجھے اب یہاں رہنا ہے محترم!"

"میرے پاس، میرے دل میں، میرے گھر میں محترم سُلطان۔" اُس نے جھک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میرا بیٹا ہے مگر وہ کتابوں کا بن گیا ہے، وہ میرے بزنس کا رکھوالا نہیں بن سکتا۔ مجھے اجازت دو محترم، کہ میں تمہیں دوسرا بیٹا کہہ سکوں۔ ایسا بیٹا جو میرے خاندان، میری بیٹیوں اور میرے بڑھاپے کا سہارا بن سکے۔"

"یہ بہت بڑا فیصلہ ہے خان محترم! اور جذباتی بھی۔ بہرکیف مجھے بھی یہاں آپ جیسے بزرگ کی ضرورت ہوگی۔ میں جس لائن کا شخص ہوں، اُسے صرف آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے مفادات اور احساسات کا خیال رکھیں گے۔"

اچانک آفس کا سُرخ بلب روشن ہوا اور خان نے ریسیور اُٹھا لیا۔ "ٹھیک ہے۔" اُس نے کسی کو مختصر سا جواب دے کر ریسیور رکھ دیا۔ "گاڑی آ گئی ہے۔"

"میں پہلے اپنے ہوٹل سے میک اَپ کر کے وہاں جاؤں گا۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے سلیمان کا پتا دے دیں۔" خان نے ایک پرچے پر ایڈریس لکھا اور نیچے سڑکوں کے نام کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نقشہ بھی بنا دیا۔

✦

کالج کے لان میں بیگن اور رشیدہ چائے پی رہے تھے۔ میں جب لان میں داخل ہُوا تو رشیدہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ بیگن نے اُٹھ کر میرا استقبال کیا تھا۔

"خیریت، اتنی جلدی؟"

"سب ٹھیک ہے۔" میں نے ہاتھ اُٹھا کر بتایا۔ "یہ لڑکی کہاں گئی ہے؟"

"تمہارے لیے چائے لانے۔"

اسی اثنا میں رشیدہ چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے وہاں آ گئی۔ چونکہ کرسیاں دو تھیں اس لیے میں گھاس پر ہی بیٹھ گیا تھا۔

"ارے ارے اُوپر بیٹھو۔" رشیدہ چیخ کر بولی۔

"بس ٹھیک ہے اچھی لڑکی۔" میں نے چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ سے لے لی اور اپنی پیالی اُٹھا کر وہ بھی گھاس پر ہی بیٹھ گئی۔

"میں تکلفات سے معذرت چاہوں گا۔" بیگن ہنسنے لگا۔ "ویسے بھی عمر میں بڑا ہوں۔"

"رشیدہ!" میں نے سپ لے کر پیالی کے اُفق سے اُس کی طرف دیکھا۔ "تم نے چاہا تھا کہ میں تمہیں اپنی پریشانیوں میں شامل کروں۔ میں سوال کروں گا اور تم سوچ کر جواب دو گی۔"

"اپنے سوال سے پہلے میرا جواب ہاں میں لے لو محترم۔" اُس کی آنکھوں میں سچائی روشن تھی۔

"شکریہ۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ سیٹھ سلیمان کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟" اُس نے چائے کی پیالی کو اپنے ہونٹوں سے اتنی تیزی سے الگ کیا کہ چائے چھلک کر اُس کے کپڑوں پر گر گئی۔ اُس کی خوب صورت آنکھوں میں خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات تیرنے لگے تھے۔

"کیا میں سوال دُہراؤں؟"

"یہ نام تم کہاں سے سُن کر آ رہے ہو محترم سلطان؟"

"شہر کی فضاؤں سے۔"

"نہیں کھل کر بات کرو۔ کس نے تمہیں میرے نام کے ساتھ سلیمان کا نام بتایا ہے؟"

"رنگ باز خان نے۔"

"اوہ، تو تم اُس سے دوبارہ مل کر آئے ہو؟"

"ہاں، مجھے اُس نے دیکھ لیا تھا۔"

"پھر... پھر اُس نے میرے بارے میں پوچھا تو ہو گا؟"

"ہاں، پوچھا تھا۔ میں نے بتایا کہ اُسے پٹاور جانے والی ٹرین پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ تب اُس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا کہ..."

"ہاں، میں سلیمان کو جانتی ہُوں، بہت قریب سے۔" وہ خواب ناک آواز میں بولی۔ "وہی مجھے تاریک راہوں سے اُٹھا کر لے گیا تھا لیکن میری ایڑیوں کے ساتھ اتنی علالت چمٹ چکی تھی کہ میں اُس کے ساتھ نہ چل سکی تھی۔" اُس نے اُنگلی کی پور سے آنسوؤں کے قطرے اُچک کر اُچھال دیے۔ "میں بہت بُری ہُوں محترم سلطان! میں حیران ہُوں کہ تم نے کیا پڑھ کر پھونک دیا ہے؟ میری تو سوچیں ہی اُلٹ گئی ہیں۔"

"رشیدہ! اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ محترم اور رنگ باز خان میں صرف ناموں کا فرق ہے تو...؟"

"میں جانتی ہُوں محترم سلطان کہ تم اُسی تاریک دُنیا کے فرد ہو لیکن اس کے باوجود میں تمہیں رنگ باز خان اور سلیمان سے بہتر سمجھتی ہُوں۔ وہ تمہارا برعکس ہے۔ میں تمہارے کردار کی پرستار ہُوں۔ ہر انسان کے اندر ایک اور انسان ہوتا ہے۔ کہیں باہر اور اندر کے درندہ صفت انسان ایک جیسے ہوتے ہیں اور بعض لوگ اپنے اندر کے انسان کو غلاظت سے بچا کر رکھتے ہیں۔"

"کیا سلیمان کا دوسرا انسان بھی غلاظتوں سے پاک ہے؟"

"شاید ہو۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ "میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اُن دنوں میری آنکھیں اندھی تھیں۔ مجھے نوٹوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں یقین نوٹ حاصل کرنا چاہتی تھی جبکہ سلیمان رنگین باتیں کیا کرتا تھا۔"

"میرے لیے، میرے کچھ معاونت کی خاطر اُس سے مل سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں؟" اُس نے بے تامل اثبات میں گردن ہلائی۔ "ہمیں تو تمہارے اشارے پر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آگ میں بھی کود سکتی ہُوں۔ بولو کیا کام لینا ہے مجھ سے؟"

"مال خریدنا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے اپنے نجات دہندہ کے رُوپ میں پیش کرو گی۔ اُس گھر کی چہار دیواری کی قید سے فرار تک اُسے کہانی سُنا دینا اگر اُس نے کہانی نگل لی تو میں اُسے سنبھال لوں گا۔"

"کب جانا ہو گا؟"

"اسی وقت۔"

"چلو، میں تیار ہُوں۔" وہ چائے کی پیالی رکھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری خاطر اگر مجھے اپنا... ...."

"خاموش..." میں نے تڑپ کر اُس کو طمانچہ مار دیا۔ "کیا تم مجھے بے غیرت دلال سمجھتی ہو؟"

"محترم سلطان! ہوش میں تو ہو۔" بیگن بڑبڑاتا ہُوا اُٹھ کر درمیان میں آ گیا۔ "بچی نے تو صرف اتنا ایک بات کی ہے۔"

"نہیں چاہیے مجھے ایسا غلیظ معاوضہ۔" میں نے بھڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بس بھول جاؤ۔"

"یہی تو تمہارے انداز پسند آئے ہیں محترم چوہدری۔" رشیدہ گال سہلاتی ہوئی بولی۔ "چلو حساب برابر ہو گیا، اب غصہ تھوک دو۔ یہ لو۔" اُس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "پلیز، مجھے معاف کر دو۔"

"آئندہ اگر ایسی بات تم نے مُنہ سے نکالی تو..."

"ہاں ہاں، شوق سے ذبح کر دینا۔" وہ چہک کر بولی۔ "چلو اب دیر نہ کرو، ورنہ وہ آفس سے اُٹھ جائے گا۔"

"کیا میں ایسی شکل میں اُس کے سامنے جاؤں؟"

"ہاں۔" رشیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں انکل! اس سے بہتر کوئی شکل آپ نے شہر میں دیکھی ہے؟"

"میری بات کو مذاق میں مت اُڑاؤ رشیدہ بیگم۔ میں میک اَپ میں جانا چاہوں گا۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے اب اسی شہر میں رہنا ہے اور سلیمان کا حریف بن کر رہنا ہو گا۔"

"اگر یہ ضروری ہے تو کر لو میک اَپ۔"

میں اُن کو چھوڑ کر اندر چلا گیا اور میک اَپ کا سامان لے کر باتھ رُوم میں بند ہو گیا۔ میک اَپ کرتے ہوئے میں نے سیٹھ سلیمان سے ملاقات کی ریہرسل بھی کر لی تھی۔ باہر نکلا تو مجھے دیکھ کر رشیدہ نے بُرا سا مُنہ بنایا کیونکہ میرا چہرہ کسی چھٹے ہوئے بدمعاش کے چہرے جیسا تھا۔

"تمہیں تو راستے ہی میں پولیس پکڑ لے گی۔" رشیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بیچ بڑا خوف ناک چہرہ ہے۔ جیسے دس قتل کر کے آئے ہو۔"

"فکر نہ کرو۔" میں نے ریوالور چیک کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تم جیسی حسینہ ساتھ ہو گی تو میری طرف کوئی دیکھ ہی نہ سکے گا۔"

اُس نے شرما کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "عجیب نرالی شے ہو محترم سلطان۔" وہ دھیرے سے بولی اور میرے ساتھ چل پڑی۔ "سُنو! مجھے وہاں تو نہیں چھوڑ آؤ گے؟"

"پھر وہی بکواس۔"

"اُفوہ... پوچھ لیا ہے، بس مطمئن ہو گئی ہُوں۔"

"ویسے اگر تم بہ رضا و رغبت رہنا چاہو اور تمہیں کوئی خطرہ نہ ہو تو مجھے اعتراض بھی نہ ہو گا۔ اچھا ہے میری آنکھیں اور کان سلیمان کے قریب رہیں گے۔"

مری روڈ کے ایک خوب صورت شاپنگ سینٹر کے پارکنگ لاٹ میں کار پارک کر کے ہم اُترے۔ میں نے اُترنے سے قبل کیچنے میں اپنے چہرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور آنکھوں میں کڑوے رُمے کی ایک ایک سلائی پھیر لی۔ آنکھوں سے پانی رُومال میں جذب کیا اور آنکھوں میں سُرخی لیے رشیدہ کے ساتھ چل پڑا۔

رشیدہ جونہی کارپٹ شاپ میں داخل ہوئی سیلز مین نے اُسے شناسا مسکراہٹ دی۔ رشیدہ ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ شیشے کے دروازے پر سُرخ حروف میں "آفس" لکھا ہُوا تھا۔ اُس نے اُنگلی سے شیشہ بجایا اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہُوا خوب رُو اور خوش لباس نوجوان اُچھل کر اُٹھا پھر مجھے دیکھ کر وہ سیدھا ہوتا ہُوا واپس بیٹھ گیا۔ اُس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھوں میں حیرت کی لہریں صاف دکھائی دے رہی تھیں اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

"بب... بیٹھ جاؤ۔" رشیدہ کے سلام کا جواب اُس نے شاید دل ہی میں دیا ہو گا کیونکہ اُس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے تھے۔ "کیا خدمت کروں مس؟"

میں نے ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ اُس نے اُٹھ کر ہاتھ تھام لیا۔

"سر! یہ میرے نجات دہندہ اور محسن سلطان صاحب ہیں۔" رشیدہ نے بھی کپکپاتے ہوئے لہجے میں تعارف کرایا۔

"شرف رکھیے سلطان صاحب۔" وہ رشیدہ کے سراپا کو ہی دیکھے جا رہا تھا۔ "آپ کہاں تھیں مس رشیدہ؟ مجھے بتایئے، میں نے آپ کو بہت تلاش کیا تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تب رشیدہ نے اُسے بھرّائی ہوئی آواز میں روتے روتے ساری کہانی سُنا دی۔ وہ اچھی اداکارہ تھی یا پھر واقعی اُسے رونا آگیا تھا لیکن اُس کے آنسوؤں نے کہانی میں جان ڈال دی تھی۔

"میں... میں اُس خبیث سے جواب طلب کروں گا۔" وہ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اوہ، نہیں سر...!" رشیدہ تڑپ اُٹھی۔ "نہیں، میں آپ کو الجھا نہیں کرنے دوں گی۔ میں دو پارٹیوں کے درمیان نہیں آنا چاہتی۔"

"میں آپ کا بے حد ممنون ہُوں سلطان صاحب۔" وہ میری جانب مشکور نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا سلیمان سیٹھ۔" میں نے کھُردری آواز میں جواب دیا۔ "میں اپنے دھندے کے لیے گیا تھا۔ اُس نے مجھے پنجہ مارا اور جواباً میں یہ لوہا لے کر نکل آیا تھا۔"

"سر! میں سلطان کو اوھر لائی ہوں۔ اسے انتقامی جذبہ ہی کہہ لیں گی۔ مجھے جب معلوم ہُوا کہ رنگ باز خان کے ہاتھ باہر کا کوئی بڑا گاہک لگا ہے۔ میں نے سلطان سے کہا ہے کہ وہ گاہک اُس سے توڑ لیا جائے۔"

"آپ کو کیا پریشانی ہے سُلطان صاحب؟" سلیمان کے انداز میں کاروباری رنگ آگیا۔

"مال کی پریشانی سیٹھ۔" میں نے بتایا۔ "میرا ایک دیرینہ گاہک ان دنوں یہاں ہے۔ وہ مال خریدنا چاہتا ہے اور میرے اسٹاک میں مال کم ہے۔ میں ہی اُسے رنگ باز خان تک لے گیا تھا۔ پھر رشیدہ نے تپ کا نام لیا۔ اگر مجھے مطلوبہ مقدار اور معیار کا مال مل جائے تو میں اُسے واپس لے آؤں گا۔"

"کتنا مال چاہیے آپ کو؟"

"جتنا آپ دے سکیں سیٹھ۔ کم از کم دس لاکھ تک میں جا سکتا ہُوں۔"

"اوہ... خوب..." اُس کے ہونٹ پھیل گئے پھر سُکڑ کر دائرے میں آگئے۔ "دس لاکھ کے مال کا منافع کتنا ہوگا؟"

"سیٹھ!" میرے حلق سے غرّاہٹ اُبھری۔ "آپ جیسے کاروباری آدمی کو ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے۔"

"مجھے غلط نہ سمجھیں سلطان صاحب!" وہ مسکرانے لگا۔ "میں بزنس ہی کی بات کر رہا ہُوں۔ فرض کیجیے آپ کو دس لاکھ پر پانچ لاکھ منافع کی توقع ہے۔ آپ دس لاکھ ادا کریں گے پھر مال اُٹھائیں گے، گاہک کو دکھائیں گے، سودا طے ہوگا۔ ان تمام احوال میں خطرہ بھی درمیان میں آسکتا ہے، آپ یقیناً آگاہ ہوں گے۔ ان دنوں ہماری حکومت اس بزنس کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ بہت سے ادارے بُو سونگھتے پھر رہے ہیں، ہم خطرہ مول کیوں لیں؟ کاروبار کیوں نہ کریں۔ آپ مجھے دس لاکھ دیں گے اور خطرہ بھی مول لیں گے۔ کیوں نہ اُس گاہک کو یہاں لے آئیں، بارہ لاکھ مل جائے گا اور تین لاکھ آپ کو، سوچ لیں۔"

"یعنی کمیشن...؟" میں نے بھڑک کر پوچھا۔ "نہیں سیٹھ، میں ایجنٹ نہیں ہُوں۔"

"میں کمیشن نہیں دے رہا ہُوں دوست!" اُس نے دوستانہ لہجے میں وضاحت کی۔ "میں آسان اور بے خطر طریقہ کار اپنانا چاہتا ہُوں۔ اس طرح ہم دونوں کو فائدہ ہوگا۔ آپ کچھ لگائے بغیر تین لاکھ منافع حاصل کریں گے۔"

"میرا خیال ہے سلیمان صاحب کی پیش کش معقول ہے سلطان۔" رشیدہ بولی۔ "آپ سوچ لیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن مال میں خود اپنی نگرانی میں دوں گا۔"

"شکریہ۔" سلیمان نے کال بیل کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میرا اپنا طریقہ کار ہے۔ میں اُس گاہک کو پہلے چیک کروں گا۔ معاف کرنا دوست! حالات بے حد خراب ہیں، رشیدہ کی وجہ سے میں آپ کی ذات پر تو مکمل بھروسہ کر سکتا ہُوں مگر وہ کوئی سرکاری آدمی بھی ہو سکتا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے پُرزور تردید کرتے ہوئے بتایا۔ "میں اُسے جانتا ہُوں۔ ہم فلپائن کی مارکیٹ میں کام کر چکے ہیں۔"

"پھر بھی آپ مجھے تسلی کا موقع دیں گے۔" وہ بولا۔ "اب آپ بتائیں ٹھنڈا یا گرم کیا چلے گا؟"

"چائے منگوالیں۔" رشیدہ بولی۔

"ایک بات کا خیال رکھیں گے سیٹھ۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "رنگ باز خان کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں دوست اور دُشمن کے درمیان فاصلہ رکھنا پسند کرتا ہُوں سلطان صاحب!" اُس نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔ "خان پہلے میرا کاروباری حریف تھا لیکن رشیدہ کی وجہ سے اب وہ میرا ہے۔ میں اُس سے یہ جنگ دوسرے محاذ پر لڑوں گا۔"

ایک آدمی اندر آیا۔ اُس نے چائے کا آرڈر دے دیا۔

"ہاں مس! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ رہائش کہاں اور آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟"

رشیدہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"فیصلہ تمہیں کرنا ہے رشیدہ بیگم۔" میں نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "اگر سیٹھ کے ساتھ تمہارا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تم خود مختار ہو۔"

"میں سوچ کر جواب دوں گی سلیمان صاحب۔" اُس نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔

"آپ نے اگر اُس وقت میری باتوں کو سچ مانا ہوتا، تو پریشانی نہ اُٹھانا پڑتی۔"

"اب ٹھوکر نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں آپ کی باتوں کو یاد رکھے ہوئے ہُوں اور غور کر کے حتمی فیصلہ کروں گی۔"

چائے سے فارغ ہو کر ہم نے اجازت لی اور سیٹھ سلیمان پارکنگ شیڈ تک ساتھ آیا تھا۔ میں حیران تھا کہ اتنا وجیہہ نوجوان جس کے پاس دولت بھی تھی، سوسائٹی میں اُس کا مقام بھی رہا ہوگا اُس نے اپنا دل رشیدہ جیسی گمنام اور بدنام لڑکی کے لیے کیسے سنبھال کر رکھا ہُوا تھا؟ اُس کے انداز، لہجے اور آنکھوں میں رشیدہ کے لیے والہانہ پن جھلک رہا تھا۔

"آپ سے رابطہ کیسے رہے گا سلطان صاحب؟"

"میں نے آپ کا فون نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ میں خود رابطہ قائم کروں گا۔" میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ابھی اُس شخص کو رنگ باز خان کی جیب سے نکالنا ہے۔ پھر اُسے اِدھر لے آؤں گا۔"

"اور آپ کب تک فیصلہ کریں گی؟" اُس نے رشیدہ سے پوچھا۔

"وقت کی قید نہ لگائیں سلیمان۔" رشیدہ پیار سے بولی۔ "میں اب مزید کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتی۔"

"میں نے بھی یہی کہا تھا رشیدہ! آپ نے میری بات سُنی ہوتی تو فیصلہ اُسی وقت ہو جاتا۔"

"ماضی کو بھول جائیں سلیمان، جو ہونا لکھا تھا وہ ہو کر رہا۔" وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سلیمان نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہاتھ اُٹھایا اور میں نے کار بیک میں ڈال دی۔

"ہاں خُرّم سلطان!" جونہی کار مری روڈ پر چڑھی رشیدہ نے میری طرف گھوم کر پوچھا۔ "کیسا لگا تمہیں سیٹھ سلیمان؟"

"رومانی فلموں کا ہیرو۔"

"صورت سے قطع نظر؟"

"بحیثیت سیٹھ سلیمان بڑا انسان اور بحیثیت محبوب میرا خیال

"میں نے تمہیں جس شخص کی اصل ذات چھپا کر کچھ بتایا تھا، سلیمان وہی شخص ہے۔"

"میں نے بھی کچھ جواب دیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔" رشیدہ نے گہری سانس لی۔ "لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی خُرّم سُلطان، تم نے مجھے ڈرایا تھا، منع کیا تھا اس لیے میں اُس جذبے کو نام نہیں دوں گی۔ اگر تم برداشت کر لو تو میں ہر رشتے کو قبول کر لوں گی۔ بیوی سے خادمہ تک جتنے رشتے ہوتے ہیں، جو میری جھولی میں ڈال دو گے میں خلوصِ دل سے اُس رشتے کو نبھاؤں گی۔"

"بیوی نہ خادمہ۔" میں نے جواب دیا۔ "باقی جو رشتہ تمہیں پسند ہو جو لو۔ میں بھی تا زیست اُس کا احترام کرتا رہوں گا۔"

"کاش میں صاف ستھری ہوتی۔" وہ سسک کر بولی۔

"لیکن خدمت تو کر سکتی ہُوں۔"

"صاف ستھرا تو میں بھی نہیں ہُوں رشیدہ بیگم۔" کردار کے حوالے سے تو میں تم سے بھی بُرا شخص ہُوں۔ تم نے توبہ تو کر لی ہے لیکن میں ابھی اس دروازے سے بھی دُور ہُوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں منحوس ہُوں۔ محبت مجھے راس نہیں آتی۔ جس سے بھی محبت کی وہی مجھ سے جُدا ہو گئی۔ میں تم جیسی لڑکی کا مستقبل تباہ نہیں کر سکتا۔ سلیمان کو آزماؤ۔ ہو سکتا ہے وہ اندر سے بھی ایسا ہی ہو جیسی وہ باتیں کرتا ہے۔ اگر وہ تمہیں اپنانا چاہے تو مجھے خوشی ہوگی۔ پھر تمہیں واپس آنا پڑے گا۔ میں سیٹھ کو چوری چھپے کی شادی نہیں کرنے دوں گا۔ اُسے مروجہ طریقے سے معاشرے کی گواہی میں تمہارا ہاتھ تھامنا ہوگا۔ ہاں اگر وہ صرف محبت کا کھیل کھیلنا چاہے تو اُسے بتا دینا کہ رشیدہ اب آوارہ گرد لڑکی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے خُرّم، میں اچھی بیٹی، نشانی اُستاد تو نہ بن سکی مگر اب اچھی بہن اور وفادار بیوی ضرور بنوں گی۔ کیونکہ میں تھک چکی ہُوں، مجھے بڑی سزائیں دی گئی ہیں۔ شاید کسی کے خلوص کا مرہم میرے زخموں کو سکون دے ڈالے۔ میں سلیمان کو آزماؤں گی اور پھر فیصلہ تم جیسے بھائی کے ہاتھ میں دے دوں گی۔ میں صرف اُس سے ملنے جاؤں گی۔ وہاں اُس کے ساتھ رہوں گی نہیں۔"

"کوشش کرتا رہ، رشیدہ! سلیمان یہ دھندا ترک کر دے، ورنہ تمہارا مستقبل داؤ پر لگا رہے گا۔"

"جو تم چاہو گے، جیسا تم بولو گے وہی میری زبان اور عمل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ہوگا۔"

"اُس کے پاس صاف ستھرا بزنس ہے، پھر وہ کیوں کالے دھندے میں اپنا اور تمھارا مستقبل داؤ پر لگائے۔ اُسے تم مجبور کر سکتی ہو، اگر وہ تمھیں واقعی چاہتا ہے تو تمھاری اس شرط کو قبول کرے گا۔"

میں نے ذہنی طور پر سلیمان کو اس لسٹ سے کاٹ دیا تھا جس میں اُس جیسے سماج دشمن لوگ درج تھے۔ اگر وہ رشیدہ کو بطورِ شریکِ حیات قبول کر لیتا تو میرے لیے وہ محترم بن سکتا تھا اور میرا احترام صرف اُسی صورت میں قائم رہتا کہ وہ منشیات کے دھندے سے نکل جاتا، ورنہ میں اُسے معاف نہیں کر سکتا تھا، اگر اکرم بھائی بھی سماج دشمن ہوتے تو میں اُن کو بھی معاف نہ کرتا، لہٰذا میری دلی خواہش تھی کہ رشیدہ اُسے اپنے ساتھ اس راہ سے موڑ لے جائے۔

میں نے رشیدہ کو چیرنگ کراس سے تھوڑا آگے ڈراپ کیا اور واپس راگ رنگ ہوٹل چلا گیا، چونکہ محترم سلطان کے چہرے پر اجنبی چہرہ تھا اس لیے جب میں خان کے دفتر میں داخل ہونے لگا تو گاؤنٹر کلرک نے مودبانہ انداز میں مجھے روک لیا تھا۔

"آپ خدا انتظار فرمائیں جناب، میں خان صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔"

میں نے ایک ہاتھ سے اُس کا گریبان پکڑا اور پرے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ آوارہ کتے کی طرح چیاؤں چیاؤں کرتا میرے پیچھے ہی آفس میں داخل ہوا تھا۔

"یہ۔ یہ۔ زبردستی جناب۔" وہ گھگیانے لگا۔ "میں نے ان کو روکنا چاہا تھا جناب۔"

"ٹھیک ہے، باہر جاؤ۔" خان نے مجھے لباس سے شاید پہچان لیا تھا۔ "شاندار میک اپ ہے، اگر لباس بھی بدل آتے تو میں بھی کلرک کی طرح شاید گھگیانے لگتا۔" اُس نے جان دار قہقہہ لگایا۔ "اُس کو مرد اس عزیز ہے اور مجھے جان، مل گیا سلیمان؟"

"ہاں۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بس تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ راضی ہو گیا ہے۔"

"کیسی ترمیم؟"

"کیش پے منٹ اور فوری ڈیلیوری۔"

"گڈ، تو یہ دین کا طریقہ کار طے ہو گیا؟"

"ہاں کل دس بجے رات وہ خود جگہ بتائے گا۔"

"یا کہیں پنجہ نہ مار جائے۔" رنگ باز سوچنے لگا۔ ان دنوں پولیس اُس کی مٹھی میں ہے۔ اُن کو خوش کرنے کے لیے کوئی چال نہ چلے، دس لاکھ کا معاملہ ہے تو تم پانچ لاکھ پولیس کو اور پانچ لاکھ خود کر وہ گھاٹے میں نہیں رہے گا۔"

"میں دودھ کی بوتل چھوڑ کر ادھر نہیں آیا خان۔ میں دل ملا اور اپنی وفاداری محسوس کرتا ہوں۔"

"میں نے ایک بات کی ہے۔" خان بولا۔ "مجھے یقین ہے تم سلیمان جیسے درجنوں سیٹھوں سے نمٹ سکتے ہو، ٹھیک ہے کل شام تمھیں رقم مل جائے گی۔"

"میں نے اپنے ذرائع سیٹھ کے گرد پھیلا دیے ہیں، اُس کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھی جائے گی۔"

"آج رات کے کھانے پر بیگن کو لا سکو گے؟"

"ضروری ہو تو، ورنہ مجھے گاؤں جانا ہوگا۔"

"میں صرف اُسے اپنے قریب رکھنا چاہتا ہوں سلیمان کے گرگے بھی مارکیٹ میں پھیلے ہوئے ہیں، اگر وہ اُسے اُدھر لے گئے تو ہمارا کیا دھرا رہ جائے گا۔"

"لیکن میری رہنمائی کے بغیر قدم بھی نہیں اُٹھائے گا خان آپ مطمئن ہو کر اپنی توجہ مال حاصل کرنے پر لگائیں، ہاں اگر مطلوبہ مال ہم نہ دے سکے تو اُسے سلیمان تک جانے سے روک نہ سکیں گے۔"

"پرسوں تک پارٹی واپس پہنچ جائے گی۔" خان نے بتایا۔ "میں نے اپنے تمام ذرائع جھونک دیے ہیں۔ پاؤں اکھڑ گیا تو نہ زندگی جیل یا گمنامی میں بسر کرنا ہوگی، بہرحال خطرات سے کھیلے بغیر کچھ حاصل بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"کل کیا ہوگا، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ہاں اگر قسمت نے ساتھ دیا تو اس سودے کے بعد آپ کا شمار بین الاقوامی ڈیلرز میں ہونے لگے گا، بیگن کے حریف بھی یہ نام لے کر اِدھر آئیں گے۔"

"بس دعا کرو محترم سلطان، میں نے تو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔"

"اب بھی وقت ہے خان، غور کر لیں۔ ابھی گیند آپ کے ہاتھ میں ہے، میں صرف سودے کی حد تک ذمہ داری قبول کرتا ہوں، اپنی حفاظت آپ کو ہی کرنا ہوگی، آپ اس میدان میں نہیں ہیں، فضا خوب اچھی طرح سونگھ لیں، کسی بیرونی مداخلت کی صورت میں مجھے آپ ذمہ دار ہرگز نہیں ٹھہرائیں گے، کیونکہ قسمت بھی آپ کے ساتھ ہوگی۔ میں مال کی ڈیلیوری تک کے شانے سے شانہ ملائے رکھوں گا، رات اور دن بارہ

بجے تک فیصلہ کریں۔"

"فیصلہ ہو چکا ہے میرے بیٹے، اب جو ہوگا اُسے میں اپنے [illegible] کا خاطر قبول کروں گا۔"

رنگ باز کو چاروں کونوں سے فٹ کرکے میں گاؤں کی طرف چل پڑا۔ خان نے مجھ سے گاڑی واپس لی نہ میں نے گاڑی کا کرایہ چھوڑا تھا۔ دورانِ سفر ہی میں نے بیک آپ اُتار لیا تھا ورنہ پولیس سے بھی مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔

حویلی سے باہر ہمارا جو مہمان خانہ تھا اُس میں پولیس نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ایک اے ایس آئی اور تین سپاہیوں کی ذمہ داری حویلی کی نگرانی کرنا تھی، آئی جی صاحب نے اپنا عہد پورا کر دیا تھا اندر کی فضا میں وہی خوف و ہراس رچا ہوا تھا، اکرم بھائی نے حالات سے گھبرا کر پلنگ آباد کر لیا تھا، زینت کا مزاج بھی بگڑا بگڑا سا تھا۔ اماں بی سے میں جان بوجھ کر نہیں ملا تھا، پولیس کی موجودگی اور بہت سے سوالوں کا جواب میرے پاس نہ تھا، میں اُن کو حالات کی سنگین صورت نہیں دکھانا چاہتا تھا، تھوڑا سا سکون کا بچا کھچا حصہ بھی حویلی سے رخصت ہو جاتا۔

"تمھارا کیا خیال ہے پولیس ساری عمر یہاں پڑی رہے گی؟" زینت نے سوال کیا۔ "سنو محترم سلطان! لوگ، لوگ ہوتے ہیں، کیا دوسروں کے رحم و کرم پر اس بدنصیب خاندان کو چھوڑ دے ہو؟"

"ان کو میں نہیں لے جا رہا زینت بی بی۔" میں نے خشک لہجے میں اُسے جواب دیا۔ "مظفر چوہدری ایک قتل کر کے مفرور ہے، اس لیے پولیس اس کی تمام مہربانیوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ ادھر آئے گا۔" زینت بولی۔

"نہیں وہ اتنا احمق نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہاں اگر محترم سلطان حویلی میں ہوتا تو وہ ادھر کا رُخ ضرور کر سکتا تھا۔ میں نے اُس کے قدموں کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا، لہٰذا وہ اب اِدھر نہیں آئے گا۔"

"تمھیں سامنے لانے اور شرائط منوانے کے لیے وہ یہاں سے کسی شے کو بھی تو اُٹھا سکتا ہے۔"

"میں اس خطرے کو رد نہیں کروں گا۔" میں نے ریوالور نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔ "یہ رکھ لو، مجھے صرف تم پر اعتماد ہے، تم اسے کسی کے اُٹھانے نہیں دو گی۔"

"ہاں جیتے جی تو نہیں اُٹھانے دوں گی۔" اُس نے ریوالور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "اس میں کتنی گولیاں ہیں؟"

"بارہ۔" میں نے میگزین نکال کر اُسے بتایا اور ایک فل چیمبر فالتو بھی اُس کے حوالے کر دیا۔ "ابھی تو پولیس ہے، پھر بھی تم بیدار رہنا۔"

"تو تم پھر واپس جاؤ گے؟"

"ہاں، مجھے واپس جانا ہے، میں اُسے تلاش کروں گا، ہم اُس کا خوف زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتے، اگر میں بھی یہاں بیٹھ گیا تو وہ اپنی بکھری ہوئی قوت حاصل کرے گا۔"

"اندر اُس زندہ لاش کو بھی تھپکی کا سہارا دے جانا۔" زینت نے حقارت سے کہا۔ "وہ شخص پہلے تو ایسا نہ تھا۔ اُسے یہ کیا ہو گیا ہے، یقین کرو محترم، وہ تو اب مجھ سے بھی بیزار دکھائی دیتا ہے، کہیں اُن کو اس احساس نے تو نہیں مار دیا کہ اُن کے کندھے پر گناہ کی پوٹ سکھ دی گئی ہے، اُن سے پوچھو محترم، تمھیں پوچھنا ہوگا، میں کہاں تک اُن کو برداشت کر سکتی ہوں۔"

"تم اس حادثے کو بھول کیوں نہیں جاتیں زینت؟"

"ایک حادثہ تو نہیں محترم، پے در پے حادثے مجھ پر ٹوٹے ہیں، میں کس کس کو بھول جاؤں۔ تمھارے بھائی جان لمحہ بہ لمحہ ایسے چراغ کی مانند مدھم ہوتے جا رہے ہیں جس کا تیل ختم ہو گیا ہو، اُن سے پوچھ تو لو، اُن کو کیا ہوا ہے؟"

"حوصلہ ہارو زینت، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پر تھپکی دی۔

زینت نے ٹھیک ہی کہا تھا، اگر ایک حادثہ ہوتا تو وہ بھول جاتی اور میں انتقام کی آگ اُگل کر شانت ہو جاتا مگر حادثے پر نیا حادثہ ہوتا چلا گیا تھا۔ ایک زخم کو دوسرا بھرچ سہرا زخم دیا گیا تھا اور اس حادثہ اماں بی کی عجلت نے دیا تھا، اگر وہ اتنی جلدی فیصلہ نہ کرتیں تو میں زینت کے دُکھ کا مداوا بن جاتا، میں اُسے اپنے مضبوط حصار میں لے کر اس کے سارے درد نچوڑ لیتا اپنی محبت کی سنگت میں اُس کے ذہن سے فاروق چوہدری کا زخم مندمل کر دیتا، وہ مجھے پا کر سب کچھ بھول جاتی۔

اکرم بھائی کا مرض جسمانی نہ تھا بلکہ وہ روحانی کرب کے مریض بن گئے تھے، وہ سب کچھ جانتے تھے، اُن کو ہماری بچپن کی محبتوں اور رفاقتوں کا علم تھا، اُن کو غم اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا کہ چھوٹے بھائی کی محبت پر اُن کو قابض کر دیا گیا ہے۔ وہ ذہنی طور پر یقین رکھنے تھے کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے لیے وہی جذبے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اسی احساس نے اُن کو نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔

وہ زینت سے بیزار تھے تو اس کی تہ میں بھی یہی احساس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ زینت کا اصل حق دار محترم سلطان ہی ہے۔

اُن کے اس احساس اور مرض کا کسی کے پاس کوئی جواب تھا نہ علاج۔ میں اُن کو نہیں بتا سکتا تھا کہ زینت اب میرے لیے محترم اور شجرِ ممنوعہ بن چکی ہے، زینت بھی شاید اُن کو یقین دلانے میں ناکام رہی ہوگی۔ میں مرد ہو کر زبان پر تالے لگا چکا تھا پھر وہ تو عورت تھی۔

مجھ پر پھر اُسی دہشت نے حملہ کر دیا تھا، جس سے گھبرا کر میں حویلی سے ایسے بھاگ جاتا تھا جیسے حویلی کے آسیب مجھے ڈرانے کے لیے چاروں طرف سے گھیرنے ہوئے ہوئے بڑھ رہے ہوں۔ ہاں میرے لیے وہ سب لوگ جو میرے اپنے تھے مجھے عزیز تھے آسیب بن گئے تھے، زینت کی آنکھوں میں آسیب تھا، اماں بی کے رویے میں آسیب سج گیا اور عابدہ کی خواہشوں نے آسیب کا روپ دھار لیا تھا۔

میں اُن آسیبوں سے گھبرا کر کسی اور سے ملے بغیر حویلی سے نکل بھاگا تھا، گاؤں میں کار آئے تو سب کو خبر ہو جاتی ہے، دلاور خان کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہ گلی میں مل گیا اور مجھے اپنے گھر لے گیا تھا۔

اُس دن بھی میں اُسے اپنے گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا، مظفر چوہدری کے پیغام نے مجھے بد حواس کر دیا تھا۔ مجھے دلاور خان سے اس بد اخلاقی کی معذرت کرنا تھی۔

پولیس کی موجودگی سب کے لیے حیران کُن تھی، دلاور نے پہلا سوال ہی پولیس کے بارے میں کیا تھا میں نے اُسے مظفر چوہدری کی پہلی ذلیل کارروائی سے لے کر عادل خان کے قتل تک عزاداری تراہیم کے ساتھ واقعات بتائے، میں نے یہ بات چھپائی تھی کہ میری موجودگی میں عادل خان کو قتل کیا گیا تھا۔

"لیکن وہ تو اُن کا اپنا معاملہ ہے۔" دلاور بولا۔ "عادل کے قتل سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"عادل خان نے ہی میری ماں کے چہرے پر طمانچہ مارا تھا، اُسے پہچان لیا گیا تھا اور جب میں اُن کی تلاش میں نکلا تو مظفر خان نے عادل کو منظر سے غائب کر دیا۔"

"تو اب تمہیں خطرہ ہے کہ مظفر چوہدری ادھر آئے گا۔"

"ہاں پولیس کو بھی یقین ہے۔"

"یہ لوگ جھک مار رہے ہیں۔" دلاور بولا۔ "مظفر شیر نہیں کہ شکار کو پھر کھانے واپس آئے گا۔ وہ انسان ہے۔ وہ جہاں بھی ہے اُسے معلوم ہو گیا ہوگا پولیس جھولیاں پھیلا کر کہاں کہاں بھٹکی ہوئی ہے۔ وہ ادھر نہیں آئے گا چوہدری، اگر آیا تو ہم گاؤں کے نوجوان اتنے بے غیرت اور نامرد نہیں ہیں اب یہ جنگ محترم چوہدری اور فاروق چوہدری کی جنگ نہیں رہی، یہ دو برادریوں کی جنگ ہے اور ہم دفاع کرنا جانتے ہیں۔"

"تم اپنا اور اپنے خاندان کا خاص خیال رکھنا دلاور بھائی، فاروق اور مظفر علاقے میں اقتدار کی جنگ لڑ رہے ہیں پہلے انجانی کو راستے سے ہٹایا گیا، دوسرے نمبر پر سرکردہ آدمی تمہارے والد تھے اُن کو بھی گھناؤنی سازش سے ختم کر دیا گیا، اگر میں ٹھنڈے ذہن سے کام نہ لیتا تو ہم آپس میں ہی ٹکرا کر اُن کا مقصد پورا کر دیتے۔"

"اب میں دشمن کی چال سمجھ گیا ہوں، تم فکر نہ کرو، ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔"

"دلاور!" میں نے دو سرا قدم اُٹھایا۔ "تم گاؤں کے نوجوانوں کو ساتھ لے کر مظفر کو تلاش کرو، میں بھی اُسے تلاش کر رہا ہوں۔ اُس کا آزاد رہنا ہمارے لیے خطرے کا باعث ہوگا۔"

"میں ہم بزرگوں سے بات کروں گا۔"

"ہاں یہ بے حد ضروری ہے، اس کے دو فائدے ہوں گے، ایک پولیس ممنون ہوگی دوسرا مظفر اِدھر کا رُخ نہیں کرے گا۔"

باتوں باتوں میں شام گہری ہو گئی، دلاور کے ساتھ کھانا کھا کر میں جب گاؤں سے نکلا تو اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور میں ہنتا تھا، ریوالور زینت کو دے دیا تھا، راستے میں دو نالے تھے جنہیں عبور کرتے ہوئے گاڑی محتاط رفتار سے چلانا تھی، ایک نالے سے پارہ علاقہ مظفر چوہدری کا تھا مجھے بذریعہ کار دوسرے راستوں کو چھوڑ کر مظفر کے گاؤں کے قریب سے ہی گزرنا تھا۔

دلاور نے دبے دبے الفاظ میں اپنی خدمات پیش کی تھیں اور اُس نے تنہا سفر کرنے کے خطرات کا بھی ذکر کیا تھا لیکن آسیب نما حویلی میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا اور دلاور کے گھر روک کر مزید خلل ڈالنا چاہتا تھا، حالانکہ احساس تھا کہ جنگ کے دوران دشمن کے علاقے سے گزرنا خطرناک ہے۔

دلاور سکول تک میرے ساتھ آیا تھا، جب میں نے اسٹارٹ کی تو اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا وغیرہ تو ہو گا تمہارے پاس؟"

"نہیں دلاور خان۔" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ "ریوالور میں زینت کو دے آیا ہوں۔ میں اب بالکل خالی ہوں۔"

"تو یہ رکھ لو۔" اُس نے سیاہ پستول نکال کر میری سیٹ پر رکھ دیا۔

"شکریہ میرے بھائی۔" میں نے پستول ساتھ والی سیٹ پر رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے جاؤ، ذرا احتیاط سے سفر کرنا، میرا خیال ہے کار کی بتیاں بجھا کر چلو۔"

"اللہ مالک ہے دلاور خان۔" میں نے کار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کچی سڑک پر بتیوں کے بغیر چلنا زیادہ خطرناک ہے۔"

میں نے سفر کے خوف کو جھٹک کر بیگن، سلیمان، رنگ باز کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا، کسی خوف کو یاد رکھنا گویا موت سے قبل مرنے کے مترادف ہوتا ہے، سوچتے سوچتے مجھے خیال آیا کہ رنگ باز کو اصولاً واپس کر دینی چاہیے۔ پھر سوچا اگر میں کار واپس کرنے گیا تو وہ مجھے بھی جکڑ لے گا اور رات اُس کے گھر بسر کرنا پڑے گی۔

میں نے نالے کی اترائی پر کار روک دی اور ٹرانسمیٹر آن کر کے بیگن کو کال کیا۔ "ہیلو ماسٹر ریسونگ یو۔۔۔" اُس کی بھرائی آواز سنائی دی۔

"ماسٹر میں گاؤں سے چل پڑا ہوں اور رات شاید خان کے پاس رہ جاؤں۔"

"بہتر۔ میں نے دس منٹ قبل لڑکوں کو کال کیا تھا۔ اُن کے پاس ٹرانسمیٹر ہیں آپ بھی کال کر کے دیکھیں، شاید وہ قرب و جوار میں ہوں گے۔"

"اُن کے پاس گاڑی ہے نا ماسٹر؟"

"ہاں کونزبجیشیت ڈرائیور ساتھ ہے۔"

"میں نے کہا تھا اُن کو واپس بلا لیں۔"

"کال کیا تھا لیکن وہ ایک مشکوک شخص کا تعاقب کر رہے تھے، بعد میں رپورٹ ملی کہ وہ کوئی بکریوں کا سوداگر تھا۔ اب اُن کو واپس بلا لیا ہے۔"

"لڑکی کیا کر رہی ہے؟"

"وہی جو ایسی لڑکیاں کیا کرتی ہیں، کچن میں ہے۔"

"اچھا۔ شب بخیر۔" میں نے ٹرانسمیٹر آف کیا اور کار اترائی میں ڈال دی۔ بیگن سے باتیں کر کے میرے اندر سے خطرے کا خوف دور ہو گیا تھا، مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بیگن میرے قریب ہے۔ ٹیلی فون یا ٹرانسمیٹر فاصلے کے احساس کو بہت حد تک ختم کر دیتے ہیں جس طرح خط سے آدھی ملاقات کا احساس ہونے لگتا ہے۔

پتھروں پر کار ہچکولے کھاتی لڑھک رہی تھی اور کار کو سنبھالنے کے لیے ساری توجہ اسٹیرنگ پر مرکوز ہو گئی تھی۔ اترائی کے بعد کچھ ٹکڑا ریتلا تھا۔ ریت میں ٹائر دھنس گئے تھے، نیوٹنی کی رفتار تھی لیکن انجن جیٹ ہوائی جہاز کی طرح غرّانے لگا تھا۔

معاً سماعت پاش اور حواس کو معطل کر دینے والا دھماکہ ہوا اور رنڈا سکرین کے بے شمار ریزے مجھ سے ٹکرائے، میرا ہاتھ فیر ارادی طور پر دروازے کی طرف گیا اور دوسرے لمحے میں پتھروں پر کروٹیں لیتا ہوا ڈھلوان میں لڑھکتا چلا گیا تھا۔

ایک بڑے پتھر کی آڑ میں پیٹ کے بل زمین سے چپک گیا تو دیکھا کار اچھلتی کودتی آگے جا رہی تھی پھر دوسرا دھماکہ ہوا اور ہیڈ لائٹیں کے بجھتے ہی گھپ تاریکی چھا گئی تھی۔

"محترم سلطان!" ایک دہاڑتی ہوئی آواز اندھیرے کو لرزاتی سنائی دی۔ "تم چاروں طرف سے گھیرے جا چکے ہو، ہاتھ اُٹھا کر سامنے چلے آؤ۔" میرا خیال تھا وہ مظفر چوہدری ہوگا مگر آواز میرے لیے نامانوس تھی وہ کوئی اور تھا، اگر میرے ہاتھ میں ریوالور ہوتا تو میں اندھیرے میں بھی آواز کے حلق میں گولی اُتار سکتا تھا لیکن پستول کار میں رہ گیا تھا۔

"تمہیں دو منٹ دیے جاتے ہیں۔" آواز پھر پتھروں سے ٹکرائی۔

میں نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا وہ ایک چٹان کی آڑ سے جھانک رہا تھا، فاصلہ پندرہ بیس قدم رہا ہوگا، مگر میں کیا کرتا میرے قریب کوئی ایسا پتھر بھی نہ تھا جو اُٹھا کر مارا جا سکتا اور ایسا پتھر تلاش کرنے کی میں حماقت بھی نہ کر سکتا تھا۔

دو تین منٹ گہرا اور دہشت ناک سناٹا طاری رہا تھا۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل کار کی جانب بڑھتا دکھائی دیا، وہ مینڈک کی طرح کودتا کسی بڑے پتھر کی اوٹ میں دبک جاتا اور پھر چھلانگ لگا کر دوسرے پتھر تک جا رہا تھا۔

اُس نے کار کے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر غائب ہو گیا۔

"احتیاط سے آہستہ آہستہ اوپر بڑھو۔" اُس نے حلق پھاڑ کر کہا۔ "وہ کہیں چھپا ہوا ہے۔"

میں نے گھوم کر نیچے دیکھا، نالے کی طرف سے دو آدمی جھک کر اوپر آ رہے تھے۔ اچانک کار کی آڑ سے وہ بھی سامنے آ گیا تھا اُس کے ہاتھ میں رائفل تھی وہ ایک ہاتھ کو پتھروں پر ٹیکتا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اُس کا رُخ میری جانب ہی تھا، درمیان ایک جھاڑی اور چند پتھر تھے، میں نے اپنے جسم کو آہستہ آہستہ سمیٹنا شروع کر دیا، فاصلہ چند گز ہی رہ گیا تھا اور مجھے خود کو مرنے یا مارنے کے لیے تیار کرنا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دُھت جو بھی کوئی تھا اُس کے ہاتھوں میں
رائفل تھی اور رائفل میں موت کا پیغام تھا

صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اُس نے مجھے زندہ پکڑ لیا تو فاروق چوہدری اور مظفر چوہدری باتوں، ہاتھوں اور لاتوں کے کچوکے دیں گے کیونکہ جو فیصلہ میں نے اُن کے لیے کیا تھا، وہی فیصلہ وہ مجھ پر مسلط کر کے جرعہ جرعہ موت کا ذائقہ دے سکتے تھے۔

اگر موت کا وقت مقررہ آ گیا تھا تو خرم سُلطان کی ذات کا قلعہ مسمار ہو جاتا اور کتنے ہی معصوم لوگ درندوں کے جنگل میں بے آسرا ہو جاتے۔ اکرم سُلطان جیسا سہما ہوا شخص غراہٹیں سُن کر مر جاتا۔ اماں بی کے سفید بال بکھر جاتے۔ زینت پھر درندوں کا شکار ہو جاتی۔ عابدہ کا غریب الوطن خاندان حالات کی چکی میں پس کر برباد ہو جاتا۔ غلامتوں کا نشان بڑی حویلی نشانِ عبرت بن جاتی۔ آنے والی نسلیں حویلی کے کھنڈرات دیکھ کر بزرگوں سے بچھڑنے کی کہانی سُنتیں۔ صرف ایک دیوار گرنے سے خاندان کی پوری تاریخ بدل جاتی۔

وہ قدم قدم سرکتا چلا آ رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں اُس کی نگاہوں کا زاویہ غلط تھا یا میرے لباس کا رنگ زمین رنگ تھا یا اَن دیکھے ہاتھ نے مجھے اوٹ میں لے رکھا تھا۔ اتنے فاصلے سے تو میں زمین پر گری سُوئی بھی دیکھ سکتا تھا مگر اُسے ایک جسم دکھائی نہ دے رہا تھا۔

ہاں اُس کی نگاہوں کا زاویہ ہی پھر دیا گیا تھا۔ اُس کے قدموں کا رُخ بھی ہٹا دیا گیا تھا۔ اُس کے سامنے ایک بڑا پتھر آ گیا تھا۔ اگر وہ پتھر کو پھلانگ جاتا تو سیدھا میری جانب ہی چلا آتا۔ اُس نے پتھر کو بائیں جانب سے کراس کیا تو اُس کا فاصلہ مجھ سے دو قدم بائیں ہو گیا تھا اور اس فاصلے کے درمیان ایک پھیلی ہوئی جھاڑی تھی جس نے مجھے آڑ میں کر لیا تھا۔ وہ جھاڑی سے رگڑ کھاتا میرے پاؤں کے برابر چلا گیا تھا اگر دائیں طرف چہرہ گھماتا تو میری بدنصیبی ہوتی لیکن وہ سُؤر کی طرح سامنے ہی دیکھتا دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا۔

جونہی وہ دو قدم اور بڑھائیں نے بدن کو بے آواز سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے ہتھیلیوں پر جسم کا بوجھ سہارتے ہوئے خود کو سمیٹ لیا مگر ٹانگیں اپنی جگہ بے حس و حرکت ہی رہی تھیں اگر میں ٹانگوں کو حرکت دیتا تو پیچھے دبے ہوئے چھوٹے بڑے پتھر میری حماقت پر ہنس پڑتے اور وہ پلٹ کر میرا جسم اُدھیڑ دیتا۔

میں جب بیٹھا تو میری حالت ایسے بے فکرے مسافر جیسی تھی جو ٹانگیں پسارے آرام کر رہا ہو۔ میرے دائیں ہاتھ کے نیچے وزنی پتھر تھا۔ میں نے ایک لحظہ سوچا، خود آتا ہوا اُس سے ٹکراؤں یا پتھر سے قسمت آزمائی کروں۔ درمیان میں ایک جھاڑی بھی تھی اور وہ اُترائی میں دو دو

رہا تھا اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ وہ ڈوبتا ہی چلا جائے تو میں چُپ بیٹھا رہتا لیکن نیچے سے آنے والے اوپر آ رہے تھے جب وہ تو اُن کو رُخ بدلنا تھا ایسی صورت میرے لیے خطرناک ہی ہوتی دو آنکھیں تھیں، جو مجھے نظر انداز کرتی آگے بڑھ گئی تھیں مگر واپسی پر چھ آنکھیں ہوتیں اور کوئی نہ کوئی آنکھ تو زاویہ درست کر سکتی تھی۔

میں نے پتھر پر گرفت مضبوط کی، گھٹنوں کے بل اُوپر اُٹھا اللہ کا نام لے کر پوری قوت سے پتھر ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ وہ ایک اندھی چال تھی اگر پتھر ہدف سے کترا نا نکل جاتا تو نتیجہ مجھے معلوم تھا۔

میری سماعت سے چُوں ہی ڈکرانے کی آواز ٹکرائی میں اچھل کر اُٹھا اور جھاڑیاں پھلانگتا اُترائی اُترتا چلا گیا تھا۔ میں نے اُسے لڑکھڑاتے ہوئے اور ایک قدِ آدم جھاڑی میں مُنہ کے بل گرتے دیکھ لیا تھا۔

"اشرف خان!" کسی نے آواز دی "یہ کون چیخا ہے، کہاں ہو تم...؟"

اُس کا پورا جسم جھاڑی میں تھا صرف پاؤں باہر تھے، جو زمین پر مرتے سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، اُس کی رائفل ایک پتھر کے ساتھ اوندھی پڑی ہوئی تھی، جو میں نے اُٹھا لی۔

میرے پاس وقت نہ تھا کہ میں اُسے جھاڑی سے نکال کر دیکھتا۔ میرے سامنے ابھی خطرہ تھا، جو پکا تا ہوا چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ وہ دو تھے اور پتھروں کی آڑ لیتے اُوپر آ رہے تھے۔

"اشرف خان! کیا تم نے اُسے گرا لیا ہے، بولتے کیوں نہیں ہو؟" نیچے آنے والوں میں سے ایک نے پوچھا اور میں نے صحرائی پتھر کی آڑ میں پوزیشن لے لی۔ وہ کسی جھاڑی یا پتھر کی اوٹ میں دُبکے ہوئے تازہ صورتِ حال جاننا چاہتے تھے۔

"اُوپر چلے آؤ۔" میں نے حتی الوسع اشرف خان کی آواز میں جواب دیا۔

معاً دھماکا ہوا اور گولی کوئی ہوئی میرے سر کے اُوپر سے گزر گئی۔ یقیناً اُنھوں نے تازہ پوزیشن کو سمجھ لیا تھا اور آواز پر گولی چلا دی تھی۔ میں ایک دم آڑ میں دُبک گیا پھر گولی چلی اور دائیں جانب چار پانچ قدم دُور پتھروں کو بکھیر گئی تھی۔

میں نے بائیں طرف چند گز دُور ایک چٹان کی جانب طویل چھلانگ لگائی کیونکہ صحرائی پتھر محفوظ آڑ نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ میں چاہتا تھا وہ پھر فائر کریں اور میں گولی کی چمکاری سے اُن کی پوزیشن معلوم کر لوں۔ ایک منٹ کی خاموشی کے بعد دونوں نے بیک وقت فائر کیے اور مجھے اُن کی پوزیشن معلوم ہو گئی، وہ بھی ایک چٹان کی آڑ میں تھے۔

ایسی پوزیشنوں سے اگر ہم تمام رات ایک دوسرے پر چاند ماری کرتے رہتے تو کسی کا بال بھی بیکا نہ کر سکتے۔ آڑ چھوڑنا اور پتھریلی زمین پر چلنا موت کو گلے لگانے کے مترادف تھا مگر کسی نہ کسی فیصلے کے لیے رسک تو لینا ہی پڑتا تھا۔

میں بیٹھ گیا اور ایک ایک انچ سرکنے لگا۔ پہلے ہاتھ بڑھا کر پتھروں کو تھپکی دیتا پھر پاؤں بڑھاتا۔ دس منٹ تک میں سرکتا رہا تھا اور اُن کی رائفلیں اندھی کٹیا کی مانند ہوا کو بھونکتی رہی تھیں۔ جب میں نے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی تو پیٹ کے بل لیٹ کر فائر کر دیا۔ پہلی گولی نے مجھے بتا دیا تھا کہ تاریکی میں اُس کی چیخ فضا میں تھرتھری پیدا کر دینے والی تھی۔ ایک سائے کو میں نے اُترائی میں تیرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اگر میں چاہتا تو اُس تیرتے سائے کو بھی شگاف دے دیتا مگر میں صرف اپنی جان کی خاطر لڑ رہا تھا اگر وہ میرا راستہ نہ روکتے، تو میں سیدھا نکل گیا ہوتا۔

وہ جو بھی کوئی تھا اگر میرے راستے سے ہٹ رہا تھا تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں تو چاہتا ہی یہی تھا کہ راستہ صاف ہو جائے اور میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ پتھروں اور جھاڑیوں سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ اندھا دھند بھاگ رہا ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے میں صرف آوازیں ہی سُن سکتا تھا۔ جب آواز بھی معدوم ہو گئی تو میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور چڑھائی چڑھنے لگا۔

میں نے کوشش تو کی تھی لیکن گاڑی کا انجن مجھ سے رُوٹھ گیا تھا۔ کچھ میں بھی اناڑی تھا لہٰذا کار کو وہیں چھوڑنا پڑا تھا اگر اسٹارٹ ہو بھی جاتی تو ونڈ اسکرین اور ہیڈ لائٹس کی عدم موجودگی میں کار کو شہر کی سڑکوں پر لے جانا پیدل چلنے سے بھی کہیں زیادہ پریشان کُن مسئلہ تھا۔

بدنصیبی نے مجھے گھیر لیا تھا اور خوش بختی نے مقابلہ کر کے میدان جیت لیا تھا، ورنہ کہاں ایک نہتا شخص اور تین مسلح شکاری۔ وقت نے بلی چوہے کا کھیل کھیلا تھا۔ ایسا پہلے بھی بارہا کھیل میرے ساتھ کھیلا گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ایسے کھیل کا عادی سا ہو گیا تھا۔ جب کوئی دن بخیریت گزر جاتا تو مجھے یقین ہوتا تھا کہ آنے والی رات ضرور ہنگامہ خیز ہو گی۔

کرال چوک تک مجھے پیدل ہی چلنا پڑا تھا۔ پکی سڑک جان بُوجھ کر میں نے چھوڑ دی تھی کیونکہ گاؤں جانے والی سوزوکیوں میں میرے اور چوہدری فاروق کے گاؤں کے لوگ ہوتے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ مجھے گاؤں سے آتا دیکھیں۔

چوک سے ائرپورٹ تک ایک سوزوکی میں سفر کیا اور وہاں سے یعنی کے ڈی جیک پر پہنچ کے سستے اُترا تو کسی نے بیگن کے کالیج کی بقیہ روکشنی آن کی تھی۔ میں ملٹری پریڈ گراؤنڈ سے گزرتا جب کالیج میں داخل ہوا۔ شیشہ کیبن سے نکل کر ڈائننگ روم میں داخل ہو رہی تھی۔ دوسری بار میں نے وہاں پورا اسٹاف دیکھا تھا۔ غالباً میری حویلی کی نگرانی کرنے والے سپاہی بیگن کو رپورٹ دینے آئے تھے۔

میں نے گڈ نائٹ کی ہانک لگائی تو بیگن کے علاوہ سارے مڑتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ابھی انھوں نے کھانا شروع نہیں کیا تھا، رقیدہ پلیٹیں لگا رہی تھی۔

"دیکھ لو تم سُلطان...!" وہ بشاش لہجے میں بولی "تم نہیں ستھے لیکن میں تمھارے لیے ہی پلیٹ لائی ہوں۔"

"آتے دیکھ لیا ہو گا تم نے...!" میں نے اُسے چڑانے کی خاطر جواب دیا۔

"میرے جذبوں کی کچھ تو قدر کیا کرو۔ یہ قدرے شخص...!" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"اور ان بن بُلائے مہمانوں کے لیے کھانا...؟" میں نے ساتھیوں کی جانب دیکھا پھر انگریزی میں پوچھا "تم لوگ کب آئے ہو؟"

"پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے چیف!" ہارکن بولا "آپ نے جب ماسٹر کو کال کیا تھا ہم لوگ ائی دے پر تھے۔"

"میں تم لوگوں کا مشکور ہُوں، دوستو تم نے دن بھر...!"

"اوہ نہیں نہیں چیف...!" کونسٹیبل ہاتھ اُٹھا کر بولا "آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں، وہ آپ کا ذاتی مسئلہ نہیں رہا چیف، ہمارے مفادات ایک ہیں۔"

"شکریہ کونسٹیبل!" میں کرسی پر بیٹھ کر بولا تو وہ لوگ بھی بیٹھ گئے۔

جب کھانا شروع کیا تو شوربے کو دیکھ کر کوئی نے مسکراتی نگاہوں سے رشیدہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بھی شریر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شوربا کیا تھا جیسے گرم پانی میں نمک مرچ ملا کر بوٹیاں ڈال دی گئی تھیں۔

"میں چھوٹی سی تھی لیکن بزرگوں کی بڑی باتیں مجھے یاد ہیں۔" وہ ڈونگے سے شوربا پلیٹ میں انڈیلتے ہوئے بولی "ایک دفعہ میری ماں دُودھ بلو رہی تھی جب مکھن نکال چکیں تو ایک ساتھ لسی لینے کے لیے چھ لڑکیاں آ گئی تھیں تب جانتے ہو میری سُگھڑ ماں نے کیا کیا تھا؟"

"ہاں، جو سُگھڑ ماں کی سیانی بیٹی نے آج کیا ہے۔" میں نے جواب دیا اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"لیکن میں نے اُنھی سے بیگن کی اجازت لے لی تھی۔"

"ٹھیک ہے، جنگ اور محبت کی طرح ایمرجنسی میں بھی سب روا

ہوتا ہے" سوالوں پڑا۔ وہ واحد شخص تھا، جو اُردو اور پنجابی بولتا اور سمجھتا تھا۔ بیگن بس ایک ہنکارہ کر دُمن اُردو میں گزارا کر لیتا تھا۔

دوسرے ساتھیوں کو میں نے شوربے کے بارے میں بتایا تو وہ ہنسنے لگے تھے اور ہارکن نے گرم پانی کی بھی تعریف کر ڈالی تھی۔ ہنستے کھاتے ختم کیا گیا تو شوربے کی کسر خوشبودار قہوے نے پوری کر دی تھی۔ سب نے ایک ایک سپ کے ساتھ تعریف کی اور رشیدہ پیالی کے اُفق سے مُسکراتی نگاہوں سے میری جانب ہی دیکھتی رہی تھی۔

جب وہ برتن لے کر کچن میں گئی تو میں نے سب کو فان میں چلنے کا حکم دیا۔ مجھے جو کہنا تھا وہ رشیدہ کی موجودگی میں مناسب نہ تھا۔ وہ اُٹھے اور قطار میں چلتے باہر نکل گئے تو کیا مسئلہ ہے بولئے؟" بیگن نے سرگوشی میں پوچھا۔ اُنفس اور گھٹنوں سے لپٹا ہوا کپڑا میں نے آتے ہی دیکھ لیا تھا۔

"موت شاٹے تھپ تھپا کر واپس لوٹ گئی ہے ماسٹر..." میں نے اُٹھتے ہوئے بتایا۔ "مظفر چوہدری کے گرگوں نے تالے میں گھیر لیا تھا۔"

"کتنے تھے؟" اُس کے حلق سے غراہٹ اُبھری۔

"تین..." میں نے تین انگلیاں دکھائیں۔ "نفی دو باقی بچا ایک..."

"گڈ!" اُس نے بڑھ کر میری پشت پر تھپکی دی۔ "تفصیل پھر سنوں گا۔"

ہم دونوں شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے لان میں اُترے۔ وہ نیم دائرے میں کھڑے تھے۔ "آفیسر ڈنر والک نے مائیل..." میں نے ہارکن کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تمھارے بزرگوں نے یہی فرمایا ہے نا؟ چلو چہل قدمی کرتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کچھ آدمیوں کی چہل قدمی فوجی پریڈ دکھائی دے گی۔" بیگن ہنس کر بولا۔ رشیدہ نے آج مجھے ایک کھیل بتایا ہے۔ وہ گول دائرے میں بیٹھے بچوں کے گرد ایک بچہ دوپٹے کا کوڑا لے کر دوڑتا ہے کیا نام ہے اُس کھیل کا چیف؟"

"کوڑا چھپان یا لکن میٹی۔" میں نے بتایا۔ "ٹھیک ہے دوستو دائرے میں بیٹھ جاؤ اور ماسٹر ہمارے گرد دوڑیں گے۔"

بیگن نے قہقہہ لگایا اور پھر کمر ہمارے سیدھے پہلے بیٹھ گیا۔

"چیف!" سولا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بولا۔ "آج ایک اچھی خبر آئی ہے اخبار میں... آج نارکس کنٹرول بورڈ کے تحت ایک بین الاقوامی میٹنگ ہوئی ہے جس میں صدر مملکت نے بھی شرکت کی ہے۔ منشیات کے خلاف ایک متحدہ لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔"

"خبر تو بہت اچھی ہے پیارے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کاش لائحہ عمل پر اس روح اور جذبے کے ساتھ عمل بھی کیا جائے۔ عالمے صدر محترم تو دل کی گہرائیوں سے یہ عزم رکھتے ہیں کہ اس لعنت کو اس پاک دھرتی سے مٹا دیا جائے۔"

"ہم اُن کے نیک عزم کا ساتھ دیں گے چیف۔" کونسر سینے پر ہاتھ رکھ کر پُرجوش آواز میں بولا۔ "یہ مسئلہ صرف اس دھرتی کا نہیں بلکہ پوری دُنیا کا ہے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو دوست۔" میں نے گردن کو اثبات میں ہلایا۔ "ہم، انشاء اللہ اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لے کر ہر نوع انسان کو اس زہر سے محفوظ رکھیں گے۔ میں نے آپ لوگوں کو اس لیے بُلایا ہے کہ اب ہم باتوں سے نکل کر عمل کے میدان میں پہلا قدم رکھیں۔ میں اور ماسٹر اس سلسلے میں کچھ آگے بڑھے ہیں لیکن عمل کے میدان میں آپ لوگ ہماری قوت اور بازو ہیں۔"

"حکم کیجیے چیف۔" ہارکن بول پڑا۔ "ہم جنگ آزما ہوتے جا رہے ہیں۔"

"نہیں پیارے۔" میں نے ستائش بھری نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ "تم لوگ خام مال نہیں ہو، تم اسٹین لیس اسٹیل ہو اور زنگ تم کو نہیں لگ سکتا۔ ذہن کو لگ جایا کرتا ہے۔ بس اپنا ذہن مصروف رکھا کرو۔ میں اور ماسٹر تمھارے جسم کو فعال رکھیں گے۔ کل رات ہم سیٹھ سلیمان کے حلق میں انگلی ڈالیں گے۔ مقامی بہاس میں چہروں پر منڈاسے مار کر... ہتھیار والی میں ریوالور اور چاقو ہوں گے۔ صرف ماسٹر کے ہاتھ میں اسٹین گن ہو گی۔ شام تو بجے ہم لوگ یہاں جمع ہوں گے کوئی تجویز...!"

"کیا سیٹھ کو اغوا کرنا ہے چیف؟" سولا نے مؤدب آواز میں پوچھا۔

"نہیں، اُس کے گودام سے مال اُٹھانا ہو گا۔" ماسٹر نے جواب دیا۔

"کونسر ٹرک چلا لیتا ہے گے۔" میں نے کونسر کی جانب دیکھا تو اُس نے سر کو خم دے کر اثبات میں ہلا دیا۔

"فی الحال نہیں چیف۔" بیگن نے جواب دیا۔ "شہر سے یہ جگہ محفوظ اور پُرسکون ہے۔ ویسے میں نے ایک کوٹھی آپ کے لیے دیکھ لی ہے جس میں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے۔"

"آپ لوگ اپنی موجودہ رہائش گاہ سے مطمئن ہیں؟"

"جی ہاں چیف۔" کونسر بولا۔ "لیکن سیٹھ سلیمان کا آدمی جب آ ملو ہو گا تو...!"

"ٹھیک ہے، کل آپ لوگ کوٹھی میں منتقل ہو جائیں۔ میں کچھ عرصہ اِدھر اُدھر گزارا کر لوں گا۔"

اُن کو رخصت کر کے میں اور بیگن باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو رشیدہ سلیپنگ سوٹ میں ملبوس تھی۔ بیگن نے اس کے لیے بڑا شاندار سلیپنگ سوٹ خریدا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے سلکی لباس میں اُس کا کسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ وہ چند دن پہلے والی لڑکی نہ رہی تھی۔ سکون اور آرام نے اُس کے چہرے کی شگفتگی اور آنکھوں کی چمک بحال کر دی تھی۔

"اگر یہ عارضی کیمپ نہیں تو دو پلنگ اور بیڈ کی ضرورت ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابن اسماک

(ترمذی شریف)

کسی خلیفہ کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ اُس وقت پانی کا پیالہ لیے پی رہا تھا۔ اُس نے عرض کیا۔ "مجھ کو کچھ نصیحت کیجیے۔" آپ نے فرمایا: "فرض کرو کہ یہ پیالہ پانی کا تم کو تمہارے تمام نقدی کے عوض ملتا نہیں تو تم پیاسے رکھتے تو تم نقدی سے دستبردار ہوتے یا نہیں؟" اُس نے کہا: "بے شک سب نقدی دے ڈالتا۔" پھر آپ نے فرمایا کہ اگر اسی کے عوض تمام مُلک تجھ کو دینا پڑتا تب بھی دیتے۔ اُس نے کہا بیشک۔ آپ نے فرمایا کہ پھر ایسے مُلک پر خوشی مت کرو، جس کی قیمت صرف ایک گھونٹ پانی ہے۔"

رشیدہ نے بستر بچھاتے ہوئے کہا۔ "تم نہ... نہ بھی کرتے رہتے ہو اور رات گزرنے بھی چلے آتے ہو!"

"کل آپ کو یہ شکایت نہیں ہو گی رشیدہ بیگم۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا تو اُس نے ایک دم گردن موڑ کر دیکھا۔ "ہاں میں خان کے گھر پے انگ گیسٹ کی حیثیت حاصل کر چکا ہوں۔"

"وہ، تو یہ بات ہے۔" وہ پلٹ کر بولی۔ "بلاشبہ وہ مجھ سے بہتر ہے لیکن ایک مشورہ دوں گی خرم۔ خان اُس پر شیر کی نگاہ رکھتا ہے۔"

"کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ "وہ ہاں تو ایک ملازمہ ہے۔"

"جھوٹ نہیں خرم سلطان۔" وہ میری آنکھوں میں جھانک کر مُسکرائی۔ "میں عاشق نہیں ہوں صرف تمھاری ہمدرد اور خیر خواہ ہوں محتاط رہنا۔"

"کس سے رشیدہ بیگم؟"

"خان سے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"اگر وہاں کوئی قابلِ دید ہے تو میں تمھارا مشورہ یاد رکھوں گا۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا۔ "تم نے سلیمان سے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"فیصلہ تم کرو گے اور عمل میں کروں گی۔"

"نہیں۔ فیصلہ تمھیں کرنا ہو گا اور میں صرف دُعا کروں گا اور فیصلے کی نگرانی بھی کرتا رہوں گا۔ اُسے قریب جا کر سمجھ تو لو اگر وہ اندر سے اچھا ہے تو تمھیں باہر کی تعمیر کرنا ہو گی اگر تم نے اُسے سیدھا راستہ دکھایا تو یہ تمھارے لیے ہی نہیں بلکہ انسانیت پر بھی احسان ہو گا۔ اس طرح میری پریشانی بھی کم ہو جائے گی کیونکہ میں جہاں ہوتا ہوں، خیال میں تم رہتی ہو۔"

"عجیب انسان ہو۔" وہ دُکھ بھری مُسکراہٹ سجا کر بولی۔ "جو لوگ کسی کو خیالوں میں آباد رکھتے ہیں، وہ اپنے خیال کو دوسروں کے حوالے تو نہیں کیا کرتے۔ میں کیا سمجھوں خرم؟"

"جوان بہن کے بھائی کو خیال رکھنا پڑتا ہے نا رشیدہ۔" میں نے نرم نرم آواز میں جواب دیا۔ "پھر بہن کو جس دن کسی کے حوالے کیا جاتا ہے تو بھائی مطمئن ہو جاتا ہے۔"

"لیکن طریقۂ کار ایسا تو نہیں ہوتا خرم۔" وہ کاٹ دار آواز میں بولی۔ اور میں تڑپ سا گیا تھا۔ اُس نے بات کاٹ دی تھی۔ "تو کیا تم مار دیا تھا کو کیا تم جیسا بھائی اپنی بہن کو...!"

"بس... بس اور کچھ نہ کہنا۔" میں ہاتھ اُٹھا کر بھرائی آواز میں چیخا۔ "جو مارتے ہیں اُن کو ضرب سہنے کا بھی حوصلہ رکھنا چاہیے میری محترم بہن...!"

"مجھے معاف کر دو رشیدہ۔" میری آواز درد اور ندامت سے بھر آگئی تھی۔ "مغرب نے مجھے شاید قدرے بے غیرت بنا دیا ہے۔ میں نے سوچا تھا، تم اسے پڑھ لو لیکن اب تم وہاں نہیں جاؤ گی۔ اسے خود رابطہ قائم کرنا ہو گا۔ میں نے قریب بیٹھے بیگن کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ماسٹر کل آپ ایک اور کوٹھی حاصل کریں۔ ٹیلی فون کی سہولت ہونی چاہیے۔ آپ کی بیٹی ایک ملازمہ کے ساتھ وہاں رہے گی۔"

"بہتر جناب!" بیگن نے تھرتھراتی آواز میں جواب دیا۔ "آپ نے میرے اندر بھی سویا ہوا باپ بیدار کر دیا ہے۔ مسٹر خرم، میرے ہاں کوئی اولاد نہیں لیکن اب میرے اندر شفقت پدرانہ لہریں مارنے لگی ہے۔ میں تحفہ اور پوری ذمے داری سے یہ برگشتہ قبول کرتا ہوں۔" وہ ایک کر اُٹھا اور روتی اور مُسکراتی ہوئی رشیدہ اُس کے حصار میں سمٹ گئی۔

"اگر تم دونوں نے مجھے یہ حق اور یہ ذمے داری دے دی ہے تو مجھے حق اور ذمے داریاں استعمال کرنے کی اجازت بھی دو گے۔ میں تمنائی اور اغوازی باپ نہیں بن سکتا۔"

"اوہ... نہیں نہیں پیارے ڈیڈی۔" رشیدہ نے اُس کے ہاتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا "میں بھی اعزازی بیٹی نہیں بنوں گی۔ مجھے تابعدار، وفادار اور صابر بیٹی پائیں گے۔ میں بہت کچھ بھول چکی ہوں میں کون تھی کیا تھی کہاں تھی اب میں صرف یہ یاد رکھوں گی میں ایک معزز باپ کی بیٹی اور شہزاد جیسے بھائی کی خوش بخت بہن ہوں۔ میں نے ایسا نہیں سوچا تھا بالکل نہیں سوچا تھا میں تو۔۔۔!"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو وہ بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ بیگن نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا میں بھی غیر متوقع کال پر چونک کر قریب ہو گیا تھا۔

"ہیلو یس!" بیگن بھرائی آواز میں بولا "کون ہے؟"

"گڈ نائٹ سر!" وہ ہڑبڑا سا گیا اور ریسیور میری جانب بڑھا دیا "ڈی آئی جی۔۔۔!"

"السلام علیکم سر۔۔۔!" میں بیگ کو حیرت سے بچاتے ہوئے بولا کیونکہ یہ نمبر صرف وزیر داخلہ اور آئی جی صاحب کو معلوم تھا۔ "فرمائیے سر۔۔۔!"

"چترا سے بات ہو سکتی ہے؟" محتاط لہجے میں پوچھا گیا۔

"کوڈ کا ورڈ جناب۔۔۔؟"

"چیف!" وہ بولے "وہ آج وزیر اعلیٰ سے ملنے چلے گئے ہیں۔ ان کا قیام طویل بھی ہو سکتا ہے۔ ہیڈ کوارٹر میں لہٰذا آپ کے لیے مجھے ہدایات دے گئے ہیں۔"

"کیا بالمشافہ بات کا وقت دیں گے سر۔۔۔؟"

"ہاں ہولڈ کہاں آؤں؟" ان کی آواز میں اشتیاق جھلک رہا تھا۔ "اور کب وقت دے سکتے ہو؟"

"شرمندہ نہ کریں سر! میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔"

"اوہ شکریہ! چلے آؤ۔" پھر انھوں نے مجھے اپنا ایڈریس بتا دیا۔

میں نے بیگن کو بتایا اور نئی کارلے کر نئے آفیسر سے ملنے چل پڑا۔ مجھے یہ بات کچھ کھل رہی تھی میں نے وزیر داخلہ اور پولیس کے چیف سے درخواست کی تھی کہ میری ذات اور نئی ذمے داری کو صرف اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ انھوں نے وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن آئی جی اپنے ماتحت کو رازدار۔۔۔ بنا کر ہیڈ کوارٹر میں چلے گئے تھے اور ڈی آئی جی صاحب کسی اپنے ماتحت تک بھی مجھے لڑھکا سکتے تھے اور پھر یہ سلسلہ تھانے کے ایس ایچ او اور کانسٹیبل تک بھی جا سکتا تھا۔ میں نے رازداری کی شرط ان کالی بھیڑوں کو مدِ نظر رکھ کر پیش کی تھی جو ضمیر کی آواز کو مار کر بک چکے تھے اور جن کو لقمۂ حرام پسند تھا۔ ایسے لوگ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر قوم و ملک کو بھی داؤ پر لگانے سے دریغ نہیں کرتے میری بساط ہی کیا تھی۔ کوئی بھی بنگ باز خان کرائے کے قاتل سے میرا سینہ چھلنی کروا سکتا تھا۔

مظفر چوہدری کا تازہ ترین واقعہ میرے سامنے تھا۔ اُسے خبر نہ تھی کہ خرم سلطان نے اس کے لیے کیا کارروائی کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اُس نے لاش پہلے ہی ٹھکانے لگا دی ہو مگر فرار تو وہ پولیس ریڈ کے دوران ہی ہوا تھا۔۔۔ اگر پولیس اُسے گرفتار کرنا چاہتی تو اُسے بے خبری میں دبوچ سکتی تھی لیکن ہوائی فائرنگ یا کسی مجمعے کے ذریعے اُسے باخبر کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح کوئی شخص خرم سلطان کا اصل چہرہ بھی بے نقاب کر سکتا تھا۔

میں نے گیٹ پر جا کر ہارن دیا اور فوراً گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ وہ کوئی گھریلو ملازم تھا جسے میرے استقبال کے لیے گیٹ پر چوکس کر دیا گیا تھا میں کار اندر لے گیا۔ پاتھ وے پر وہ آگے آگے دوڑ رہا تھا پھر اس نے پورچ میں ایک جیپ اور کار کے ساتھ میری کار پارک کروائی اور بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں جناب!" ملازم نے تحیر آمیز نگاہوں سے میرے سراپے پر نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا کیونکہ میرا لباس کہنیوں اور گھٹنوں سے پھٹا ہوا تھا۔ اُسے تو کسی شاندار شخصیت کا انتظار ہو گا جس کے لیے اتنا بڑا آفیسر منتظر تھا۔

اس کی رہنمائی ایک دروازے تک میرے ساتھ رہی تھی اس نے گردن کو خم دے کر مجھے داخل ہونے کا اشارہ کیا اور پردہ ہٹا کر ایک طرف ہو گیا۔ میرا ہاتھ جیب میں موجود ریوالور پر جما ہوا تھا کیونکہ میں نے کسی جگہ ڈی آئی جی کی نیم پلیٹ نہ دیکھی تھی۔ مجھے ان کی رہائش گاہ بھی معلوم نہ تھی اور پھر میرا کوئی شکاری جال بچھائے منتظر ہو سکتا تھا۔

میں نے سانس روک کر پاؤں فٹ میٹ پر رکھا اور ایک دراز قامت شخص مسکراتا ہوا اٹھا اور ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔

جب میرا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو وہ ٹھٹک کر رک گیا اور اس کا اٹھا ہوا ہاتھ ایک دم نیچے گرتا چلا گیا تھا۔

"اپنی شناخت کرائیے جناب!" میری سرد آواز ابھری میں اس کی روشن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالنے کے لیے جونہی ہاتھ اٹھایا تو میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "نہیں جناب گھوم کر ہاتھ اوپر کر لیجیے۔"

وہ مسکرایا اور پھر گھوم کر اس نے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لیے میں نے ریوالور اس کی پشت سے لگایا اور جیبوں کی تلاشی لینے لگا اندرونی جیب میں اس کا شناختی کارڈ تھا۔ میں نے نام اور عہدہ پڑھا۔

"ٹھیک ہے سر! امید ہے آپ میری مجبوریوں کو مدِ نظر رکھیں گے۔"

"کیا میں ہاتھ نیچے کر لوں؟"

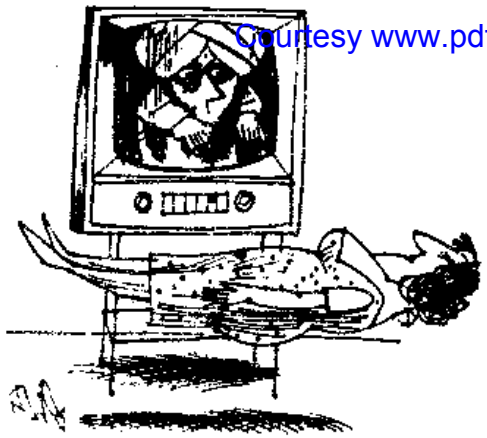

"اور مجھے معاف بھی کریں سر۔"

وہ گھومے اور میرے دونوں شانوں پر ہاتھ ٹیک کر لمحہ بھر میرے چہرے کو دیکھتے رہے پھر مجھے بانہوں میں لے کر صوفے کی جانب چل پڑے۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔

"مجھے تمھاری بے ادبیت پسند آئی نوجوان! بیٹھ جاؤ۔" میں تشکریہ ادا کر کے ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ان کے ہاتھ میری پشت سہلانے لگے تھے۔ جو عہدہ نہیں دیا گیا ہے اس کے اہل تم ہی ہو سکتے تھے۔۔۔ جیف نے تمھاری بہت تعریف کی تھی۔ شوقِ ملاقات اسی اشتیاق نے دلایا ہے۔ اچھا طاہر! اچھی عادت ہے اور تم جیسے شخص کو تو اپنے سامنے پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تم منہ اٹھائے سیدھے میرے ہاتھوں تک چلے آتے تو مجھے مایوسی ہوتی۔ کوئی بھی تمھیں ٹیلی فون پر روک سکتا تھا۔"

"اس خطرے کے پیشِ نظر گستاخی ہوئی ہے سر!"

"یہ گستاخی نہیں ایک ذمے دارانہ کارروائی تھی۔"

"یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے سر!" میں نے ممنون لہجے میں جواب دیا۔ "ورنہ غرور کے حوالے سے یہ گستاخی کے زمرے میں آتی ہے۔ اب بتائیے کیا حکم ہے میرے لیے۔۔۔؟"

"جس وجہ تو ملاقات کی آرزو تھی۔" وہ بولے "میں تمھیں دیکھنا چاہتا تھا کہ کون نوخیز شیر پنجاب کی سرزمین کو مان دینے آیا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اطلاع ملی ہے کہ تم ان ہدایت میں تمھارے گھر کی حفاظت بھی شامل ہے۔ مجھے ابھی ابھی اطلاع دی گئی ہے کہ۔۔۔"

"کیا۔۔۔ کیا میرے گھر۔۔۔؟" میں ہانپ سا گیا۔

"وہ۔۔۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ مظفر چوہدری کے دو آدمی [illegible] نے گئے ہیں۔ پولیس پارٹی فائرنگ کی آواز سن کر محلے [illegible] نے والے میں آئی تو دو ہوائی فائر چلے تھے۔ ایک معمولی [illegible] دو آدمی تھے۔ غالباً مظفر نے باہر سے کوئی پارٹی [illegible] ہوگی۔"

"آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا سر!" میں نے ان کی آنکھوں میں اپنی [illegible] کا ارتعاش دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جو سوچا تھا وہ غلط ہو گیا ہے۔" وہ پُرسوچ اور متفکر آواز میں [illegible] "میرا خیال تھا یہ کارروائی تمھارے ہو [illegible] لیکن تم اپنے ٹھکانے پر تھے۔ اب یہ معمہ کچھ الجھ گیا ہے۔ گرد مظفر [illegible] کے آدمی تھے تو ان کا تعاقب کس نے کیا۔ وہ کون تھا کیا تم نے کچھ دیکھا ہے؟"

"نہیں سر! میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ میں آئی جی صاحب کی یقین دہانی پر مطمئن ہو کر اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔"

"پھر۔۔۔ پھر وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

"دونوں گاؤں کی خونی سیاست عرصہ دراز سے سرگرم عمل ہے سر۔۔۔ وہ کوئی دوسری پارٹیاں بھی ہو سکتی ہیں۔"

"دیکھنا پڑے گا۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولے۔ "کار کی رجسٹریشن بھی نہیں ہوئی۔ اس پر فرضی پلیٹ نمبر درج ہے۔ بچے جو فکر اندھی نہ کاٹ رہی تھی، وہ دُور ہو گئی تھی اور میں پریشان تھا کہ کار کے ذریعے بنگ باز خان سامنے آئے گا اور وہ بالآخر خرم سلطان کا نام لگا دے گا۔ بنگ باز خان واقعی مضبوط شخص تھا اس نے ایسی کار مجھے دی تھی جو اگر سلیمان سیٹر پلیٹ کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش کرتا تو دُھتے ناکامی ہوتی۔ اس نے سلیمان کی خاطر چھپایا تھا جو میرے کام آ گیا تھا۔

"تم اگر چاہو تو تھانے میں لاشیں دیکھ لیناً میں فون کر دوں گا۔"

"شکریہ سر! میں غیر متعلقہ معاملات میں اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا تھا تو انھوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ "مجھے کچھ ضروری کام ہے۔"

"جانتے آ رہی ہے۔" انھوں نے اٹھ کر برقی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ "ہاں تو جیف کی عدم موجودگی کے دوران تم مجھ سے رابطہ رکھو گے۔"

"برا نہ مانیں تو عرض کروں گا سر! مظفر چوہدری کو جن لوگوں نے [illegible] ہے۔ وہ کبھی گرفتار نہیں کریں گے کیا آپ کوئی متبادل فورس اس طرف لگا سکتے ہیں؟"

"نہیں میری جان!" انھوں نے گہری سانس لی۔ "میں فرشتے کہاں سے لا سکتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ میں دوسرے تھانے کو یہ فرض سونپ سکتا ہوں۔ اگر وہ بھی روڈ کوئی پروگریس نہ ہوئی تو میں خود کمان کروں گا۔ کوئی بھی سفارش کسی مجرم کو قانون سے بچا نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکتا۔ ہاں تاخیر کا سبب بن سکتا ہے۔"

وہی ملازم ٹرالی دھکیلتا ہُوا اندر آیا اور چائے سرو کر کے واپس چلا گیا۔ میں نے گرم گرم گھونٹ لے کر زبان تو جلالی تھی لیکن میرے اندر بھی تو آگ بھڑک رہی تھی۔ مظفر چوہدری کا ذکر چنگاریوں کو دہکا گیا تھا۔ ایک ذمے دار آفیسر نے میرے شک کی تائید کر دی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ حویلی کے نگران بھی اپنا کوئی مفاد حاصل کر کے مظفر چوہدری کو اندر جانے کا پروانہ جاری کر سکتے تھے۔ ایک بار تھانے کی پوری فورس کی موجودگی میں وہ فرار ہو گیا تھا۔ اُس کو تنہا ہی کی جواب دہی کس نے کی تھی، کیسے سزا دی گئی تھی، وہ تین آدمیوں کی گارڈ تھی۔ اُس کی غفلت کا نوٹس کون لیتا، اس کا کسی کو علم نہ تھا۔

مجھے رنگ باز خان سے مل کر سلیمان کی ملاقات کا نتیجہ بتا کر دس لاکھ کی رقم وصول کرنا تھی اور پھر اُسے اس کارکی رپورٹ بھی کرنا تھی جو اب پولیس کے قبضے میں چلی گئی تھی۔

میں نے وقت دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہُوا اگر وہ ڈی آئی جی کا گھر نہ ہوتا تو میں رنگ باز کو وہاں سے ہی چیک کر لیتا۔ ٹیلی فون سیٹ سامنے ہی تو تھا لیکن مجھے کسی پر بھی اعتماد نہ تھا کیونکہ بڑے مجرموں کے ہمدرد بھی بڑے ہی ہوتے ہیں۔

"اپنی فیلڈ میں کہاں تک پیش رفت ہوئی ہے؟" ڈی آئی جی نے میرے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے اُوپر جواب دینا پڑتا ہے۔"

"ابھی جال کے لیے سامان جمع کر رہا ہُوں سر!" میں نے گول جواب دیا۔ "یہاں شکار کو چھوٹے چھوٹے شکاریوں نے بدکا رکھا ہے، اس لیے نیا جال اور نئی تکنیک استعمال کرنا پڑے گی۔"

"مجھے اپنی کارروائی میں شامل رکھنا۔"

"ابھی کارروائی کا وقت بہت دُور ہے سر...!"

"تم شاید کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" اُن کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "میں بحیثیت پولیس سربراہ پوچھ رہا ہُوں۔"

"سوری سر!" میں نے بھی سپاٹ سا انداز اختیار کر لیا۔ "میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔"

"یعنی تم مجھے رپورٹ نہیں دو گے؟" وہ کھل کر غرائے۔

"فی الحال تو یہی عرض کر سکتا ہُوں، کوئی رپورٹ نہیں سر...!"

میں نے پہلی سیڑھی پر رُک کر اُن سے ہاتھ ملایا اور سیڑھیاں اترتا ہُوا نیچے آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ برآمدے میں کھڑے یقیناً گھنت نگاہوں سے مجھے گھورتے رہے ہوں گے۔

● میں نے مارکیٹ کے پارکنگ گراؤنڈ میں کار پارک کی اور ایک ڈرگ اسٹور میں داخل ہو گیا۔

"جی فرمائیے۔" ایک نوجوان کاروباری مُسکراہٹ سجا کر بولا۔

"ٹیلی فون کال دو دست!" میں نے بھی مُسکراہٹ کا جواب مُسکراہٹ سے دیا۔ اُس نے ٹیلی فون سیٹ سرکا دیا۔

"مجھے خان سے بات کراؤ، جلدی...!" سلسلہ ملتے ہی میں نے گلفام آواز میں کہا۔

"سوری سر! خان صاحب یہاں سے تشریف لے جا چکے ہیں۔"

"سُنو دوست! میں تمہارے باس کا نیا پارٹنر ہُوں، مجھے بتاؤ وہ کہاں ملیں گے؟"

"ویری سوری سر!" اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔ "میں صرف کاؤنٹر تک محدود رہتا ہُوں۔ آپ جانتے ہوں گے یہاں سے اُٹھ کر خان کہاں جاتے ہیں؟"

"ٹھیک ہے، میں آ رہا ہُوں۔" میں نے کھڑکی اُنگلی مار کر سلسلہ توڑا اور آئی جی صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ یہیں سے دیکھا جا سکتا تھا کہ ڈی آئی جی صاحب کا بیان کہاں تک درست ہے۔ تیسری گھنٹی پر کسی خاتون نے ریسیور اُٹھایا تھا۔

"بڑے صاحب کہاں ہیں خاتونِ محترم؟"

"لاہور! آپ کون صاحب ہیں؟"

"اُن کا ایک نیاز مند ہُوں۔ شکریہ!" میں نے فوراً ریسیور رکھ دیا اور دور دیے کا کاؤنٹر پر رکھ کر شکریہ ادا کرتا ہُوا واپس نکل گیا۔

اگر خان کا دوسرا اڈہ مجھے معلوم ہوتا تو وقت بچ جاتا لیکن مجھے ہوٹل جانا پڑا تھا۔ ہوٹل کا ہال تقریباً خالی تھا۔ دو نوجوان کونے والے میز کے گرد بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ فلش گنز اور کیمروں سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ اخباری رپورٹرز تھے اور کوئی فنکشن کور کر کے اُس کی رپورٹنگ کر رہے تھے۔

"اِدھر اندر تشریف لائیے جناب!" کاؤنٹر کلرک نے مجھے ہی کرسی چھوڑ دی۔

"مجھے خان سے بے حد ضروری کام ہے، دوست!" میں کاؤنٹر پر کہنیاں ٹیک کر بولا۔ "مجھے اُن تک لے چلو۔"

"اگر خان ناراض ہو گئے تو نوکری کون دے گا؟"

"نہیں، میں تمہیں انعام دلوانے کا یقین دلاتا ہُوں۔"

اُس نے ریسیور اُٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔

"باس کو فون پر بلاؤ، میں ہوٹل سے شہزاد بول رہا ہُوں۔" ایک منٹ تک وہ بال پوائنٹ سے کاؤنٹر بجاتا رہا پھر ایک دم تن کر مؤدب ہو گیا۔ "معاف کیجیے گا باس! آپ کے وہی دوست...!" میں نے جھپٹ کر ریسیور لے لیا۔

"اسلام علیکم خان! میں محرم بول رہا ہُوں۔"

"کوئی ارجنٹ کام ہے کیا؟" اُس نے سرگوشیانہ آواز سے پوچھا۔ "میں مصروف ہُوں۔"

"بے حد ضروری خان، ورنہ میں آپ کو ڈسٹرب نہ کرتا۔ اجازت دیں تو میں آ جاؤں۔"

"ٹھیک ہے، اب تم سے کیا چھپانا، شہزاد کو ریسیور دے دو۔"

"یس سر... یس سر جی... بالکل سر...!" شہزاد گھگیانے لگا۔ "میں آ رہا ہُوں سر!"

اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر ایک ویٹر کو بُلایا۔ اُسے کاؤنٹر پر کھڑا کر کے وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ دروازے کے قریب جا کر وہ رُک گیا۔ "گاڑی ہے سر... یا ٹیکسی کرنا ہوگی؟"

میں نے آنکھوں سے اُسے بتایا کہ گاڑی باہر ہے۔

"آپ پہلے کہاں تھے سر؟" ٹرانزٹ کیمپ چوک ٹرن کرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ "باس نے آپ کے بارے میں سخت ہدایات دی ہیں سب کو سر...!"

"خان خود بھی تو خاصی سخت شے ہے۔" میں نے مزاحیہ آواز میں کہا۔ "لیکن آپ سے بہت متاثر ہیں۔ سراہوٹل میں بھی آپ کی پارٹنر شپ ہے؟"

"ہاں، بزنس پارٹنر جب بنا ہُوں تو تمام بزنس میں پارٹنر شپ ضروری تھی نا۔"

"ہوٹل تو سر، بس آڑے خسارے میں جا رہا ہے۔ اصل بزنس تو ہوٹل کے آفس میں ہے یا اڈے پر...!"

"کچھ بزنس آڑے کے بغیر نہیں چلا کرتے دوست!" میں نے جواب دیا۔ "چور کو کوئی نہ کوئی آڑ بنانا پڑتی ہے۔"

اگر میں چاہتا تو وہ اور بھی کھل سکتا تھا لیکن میں جب ہینڈ کوارٹر کا رازداں تھا تو مجھے براہِ راست کوٹھوکنے کی کیا ضرورت تھی۔ شہزاد اتھلے پانی میں تھا۔ ایسے شخص کو خان جیسے دُور اندیش اور کایاں شخص نے نہ جانے کیسے اپنے راز میں شریک کر رکھا تھا۔

وہ عمارت ریسوے روڈ پر تھی۔ سامنے دکانیں تھیں، ایک تنگ سی راہداری سے گزر کر ہم دکانوں کے پیچھے کھلے دالان میں داخل ہوئے۔ دالان میں گتے اور لکڑی کے کارٹن بکھرے ہوئے تھے۔ سامنے خستہ برآمدہ تھا اور ایک ستون کے ساتھ دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے رُکنے کا اشارہ کر کے شہزاد اُن سے ملا اور پھر مجھے ایک شخص کے حوالے کر دیا گیا۔

"آؤ صاحب!" تاریک برآمدے میں اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اُوپر تاریکی اور گہری خاموشی تھی لیکن نہ جانے کی دُنیا روشن تھی۔ قہقہوں اور غراہٹوں کی آوازوں سے آباد ایک وسیع و عریض ہال میں آوازوں کے ساتھ ناقابلِ برداشت دُھواں بھی بند فضا میں تیر رہا تھا۔ چار طوائیاں گرد و پیش سے بے خبر پتوں اور پانسوں کے کھیل میں محو تھیں اور خان اُن کے گرد یُوں ٹہل رہا تھا جیسے بگاری قیدیوں پر سپاہی نگرانی کر رہا ہو۔

خان نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور جُواریوں سے دُور کونے میں لے گیا۔ "خیریت ہے نا پیارے؟" اُس نے دھڑکتی آواز سے پوچھا۔ "تمہیں اِدھر نہ بُلاتا مگر میں ان کتوں کے درمیان سے ہٹ جاؤں تو یہ ایک دوسرے کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔"

میں نے اُسے سلیمان سے ہونے والی گفتگو سے لے کر نالے کے حادثے تک سب کچھ بتایا۔ وہ بے قراری سے ٹہلتا رہا تھا۔

"یہاں ایک پارٹی پشاور کی ہے۔" وہ بتانے لگا۔ "لاکھوں کی بازی لگی ہوئی ہے۔ میں نے نوید گل سے بات کر لی ہے اگر وہ جیت گیا تو چار لاکھ اُدھار دے جائے گا۔ کچھ اور دوستوں نے بھی حامی بھر لی ہے۔ کل بدھ گیارہ بجے تک رقم پوری ہو جائے گی۔"

"ادائیگی کل رات تو بیچے طے پائی ہے خان!" میں نے جواب دیا۔ "وہ اپنا مال میری بتائی ہوئی جگہ لائے گا۔ مال چیک کر کے رقم ادا کی جائے گی۔ ایک اور گڑبڑ ہوئی ہے خان جی! آپ کی کار مقابلے میں تباہ ہو گئی ہے اور اب پولیس کے قبضے میں ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "جس کی ہوگی سپردداری کروا لے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"چوری کی تھی اگر پولیس کے پاس نہ جاتی تو کہیں چھوڑ دی جاتی۔"

"چلیے ایک پریشانی تو دُور ہوئی۔" میں نے اطمینان بھری سانس لی۔ "ورنہ میں شرمندہ اور پریشان تھا۔"

"اگر میری بھی ہوتی تو میں تمہیں شرمندہ کرتا اور نہ ہی پریشان رہنے دیتا۔" اُس نے میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو محرم سلطان! ہم جس بزنس میں ہیں موت، زندگی، نفع اور نقصان ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ یوں کہہ لو شر اور خیر کے فرشتے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ جنگ میں فتح ہی تو نہیں ہوتی شکست کے لیے بھی ایک اچھے جرنیل کو تیار رہنا پڑتا ہے۔ فائدے بھی تو ہمارے ہوتے ہیں جب کوئی نقصان ہو جائے تو ہم کیوں دوسروں کو مورد الزام ٹھہرائیں۔ فائدے کی طرح نقصان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

"شراکتی بزنس میں شریک کار کو یہ احساس تو ہوتا ہے نا خان؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں تم کبھی ایسا نہ سوچنا تم شریک کار تو ہو لیکن تمہیں" میں نے بیٹا بھی تو کہا ہے۔"

"شکریہ خان" میں نے ممنون لہجے میں کہا "اب میں مطمئن ہو گیا ہوں۔"

"بس خوش رہا کرو" اس نے میرا شانہ تھپتھپایا "آؤ تمہیں باہر چھوڑ آؤں۔ تم یقیناً اس لائن کو ناپسند کرتے ہو گے۔"

"جی ہاں میں اس دنیا سے دور رہا ہوں۔"

"ویسے اچھا کھیل ہے اگر ساتھ نبھا رہے تو۔ چاہو تو تمہیں اچھے کھلاڑیوں سے تربیت دلوائی جا سکتی ہے۔ تم اس کھیل کے بادشاہ بن سکتے ہو۔"

"مجھے افسوس ہے خان" میں نے معذرت طلب لہجے میں کہا "میں دیکھا" میں آنا نیچے نہیں گرنا چاہتا۔ میں محنت پر یقین رکھتا ہوں۔"

"گڈ..." آدھ پلیس" اس نے پھر میرا ہاتھ پکڑا۔ ایک راؤنڈ جوا بیوں کے گرد لگایا اور مجھے لے کر باہر نکل گیا چونکہ مجھے لانے والا پھر اپنی پوسٹ پر چلا گیا تھا۔ اس بے خان میرے ساتھ رک گیا تھا۔

"واہ شاندار..." کار دیکھ کر وہ بولا "کیا تمہاری اپنی ہے؟"

"نہیں خان ایک دوست سے مانگ لایا ہوں۔ ویسے مجھے بھی پسند آئی ہے۔ وقت نے اجازت دی تو یہ خرید لوں گا۔"

"خرید لیں گے" خان پُرجوش آواز میں بولا "بلکہ سودا کر لو مسٹر بیگن کو فارغ کر کے ادائیگی کر دیں گے اگر پیسے دانس رہنگے تو کل کچھ رقم دے دینا۔ اُسے..."

"آئی ہوپ نہیں خان ویسے آپ کی مہربانی کا شکریہ" میں نے دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔

دوسرا دن ہم نے تیاریوں میں صرف کیا۔ دو بجے میں سلیمان سے ملنے چلا گیا۔ وہ پُرتپاک انداز میں ملا۔ بچھا جا رہا تھا جیسے میرا دیرینہ ملازم رہا ہو۔ میں خوش فہمی میں نہ تھا۔ اس کا پتاک میری ذات سے نہ تھا میرا پس منظر تھا۔ میری اوقات میں اسے رشیدہ اور میری شخصی میں اسے دس لاکھ کی خطیر رقم دکھائی دے رہی تھی کیونکہ رشیدہ اس کی پسندیدہ لڑکی تھی اور دوست اس کی کمزوری تھی۔

اس نے چائے منگوائی اور خود پیالی میرے سامنے رکھی تھی۔

"بیٹھو..." میں نے اکھڑے لہجے میں مقصد کی بات شروع کی "تب ہمیں بزنس کی بات کر لینی چاہیے۔ میرے پاس وقت نہیں مجھے مال کو باہر لے جانا ہے۔ انتظام بھی کرنا ہے۔"

"ایک بات کہوں سلطان صاحب؟" وہ سیدھے کر بولا۔

"ہزار باتیں کرو لیکن میری بات کا تعلق بزنس سے متعلق ہونا چاہیے۔"

"کیا ہم اس کام نہیں کر سکتے؟" اس کا لہجہ التجائیہ تھا۔ میں شیشے کے جوائے سے میں بات کر رہا ہوں۔ آپ اس کے ہی نہیں بلکہ میرے بھی محسن ہیں مجھے اس فیلڈ کے لیے آپ جیسا ساتھی اگر مل جائے تو ہم دائرہ وسیع کر سکتے ہیں۔ کل آپ اکھڑ گئے تھے۔ مقصد میرا یہی تھا کہ کمیشن پر تو تیسرے درجے کے غنڈے بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ میں آپ کو برابری کی سطح پر ساتھ رکھنا پسند کروں گا۔"

"فی الحال نہیں بیٹھ" میں نے پیپر ویٹ کو گھمایا اور پیپر ویٹ گھومتا ہوا شاید سلیمان کی رانوں سے ٹکرا تا نیچے چلا گیا تھا۔ "میں ٹرپ کے تمام انتظامات مکمل کر چکا ہوں۔ ویسے میں اس امکان کو بالکل رد نہیں کرتا۔ شاید اسی حوالے سے ہم ایک بن جائیں۔ وہ لڑکی مجھے بے حد عزیز ہے بیٹھ۔ اب وہ اسٹریٹ ایجنٹ نہیں رہی۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ اور بھائی کے پیار کی چادر ہے۔ مجھے اس نے آپ کے بارے میں کچھ بتایا ہے۔ اس لیے اب آپ کو مشترکی روایات اور راستے اختیار کرنے ہوں گے۔"

"اگر اس نے سب کچھ بتا دیا ہے تو میں صرف یہ کہوں گا کہ مجھے بھی سیکریٹری ایجنٹ یا سمگلر نہیں بلکہ ایک ایسی لڑکی چاہیے۔ جو میرے گھر کو خوشبو اور سکون دے سکے۔ کیا میں آپ لوگوں کو کسی دن کھانے پر بلا سکتا ہوں؟"

"پہلے ہم ایک دوسرے کو بحیثیت انسان سمجھیں گے پھر آگے قدم بڑھائیں گے۔"

"شکریہ!" وہ گہری سانس لے کر مسکرانے لگا "ہاں اب دوسری باتیں...!"

"مجھے کل رات مال ملے جانا ہے۔ کچھ مال ادھر سے آ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس ٹرک میں آپ کا مال بھی لوڈ کر دوں۔ کچھ رکا وٹ دقم کی بھی ہے۔ آج انتظام ہو جائے گا۔"

"رقم کی فکر نہ کریں سلطان بھائی" وہ آگے جھک کر بولا "میں مال اٹھائیں حساب دوستاں ہوتا رہے گا۔"

"نہیں سیٹھ سلیمان بزنس از بزنس۔ میں اپنے اصولوں پر چلتا ہوں۔"

"آپ کی مرضی" وہ کندھے اچکا کر کرسی کی پشت سے لگ گیا۔ "وقت تھوڑا کریں۔ میرا بھی ایک طریقہ کار ہے۔ میرا بزنس مینیجر مال ہینڈ اوور کرے گا۔"

"اور رقم؟"

"جو مال دے گا وہی رقم بھی وصول کرے گا۔"

"ٹھیک ہے کل رات نو بجے جیٹی۔ اڈہ کے سامنے بس اسٹاپ پر میں خود مال وصول کروں گا۔"

"آپ یوں کریں شام کسی وقت مال اپنے سامنے پیک کروا لیں اور وصول کرتے وقت تسلی دیکھ لیجئے گا۔ اشرف خان سے بھی آپ کا ملوا دوں گا۔"

"اشرف سے تو آپ ابھی متعارف کروا دیں۔ مال میں ان دیکھے کا اعتماد اور آئندہ تعلقات کی روشنی کے لیے تجربہ ہی سہی۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔

"اشرف خان پانچ منٹ کے اندر میرے پاس آئیں۔" ریسیور رکھ کر اس نے تھری فائیو سگریٹ کا ٹن نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"شکریہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔" میں نے جواب دیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اشرف بھی اپنے باس جیسا بانکا اور چاق و چوبند نوجوان تھا۔ چہرے مہرے سے کسی کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا تھا اور باتوں سے اعلیٰ تعلیم کا رنگ بھی جھلکتا تھا۔ میرا خیال ہے۔ اس کا تعلق ان گندے انڈوں سے رہا ہو گا۔ جو غلط تربیت اور آزاد ماحول کی گرمی سے گندے ہو جاتے ہیں۔

اس سے پروگرام طے کر کے میں واپس آیا تو بیگن کا پیغام رشیدہ نے دیا۔ میں نے اس نمبر پر بیگن سے رابطہ ملایا۔ وہ اسی کوٹھی میں تھا جو میں نے ساتھیوں کے لیے مارک کر دی تھی۔

"چیف! کونٹر کی اطلاع کے مطابق شکار نے جگہ بدل لی ہے۔ دین میں کچھ کاٹن وہاں سے لاڑ زار کالونی میں لے جائے گئے ہیں کونٹر اب اس جگہ کی نگرانی کر رہا ہے۔"

"کہیں اسے شک تو نہیں ہو گیا، مسٹر؟"

"بہتر ہے آپ اس سے ملاقات کریں۔"

"ملاقات کر آیا ہوں۔ میں نے کوئی ایسی تبدیلی محسوس نہیں کی۔"

"پھر شاید ان کا اپنا کوئی پروگرام رہا ہو؟"

"کوئی بات نہیں۔ دونوں ٹھکانے چیک کر لیں گے۔"

"میں نے اس کوٹھی کا اوپر والا پورشن بھی حاصل کر لیا ہے۔"

"لیکن میں رشیدہ کو بالکل الگ تھلگ رکھنا پسند کروں گا۔ مائنڈ۔"

"کیا ایک کوٹھی میں دو کرائے دار نہیں رہ سکتے؟"

"دیکھ لو اگر آسانی سے کوئی بہتر جگہ مل جائے تو ٹھیک رہے گا۔"

"میں نے کہہ آگ نیچے لگ جائے تو اوپر والے بھی پریشان ہو سکتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"اوہ... اچھا" بیگن بولا "میں کوشش کروں گا۔"

رشیدہ دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ دیر ہی تھی کہ میں نے گفتگو ختم کر دی تھی۔ میں فی الحال سلیمان کی شخصیت پر کوئی خراش نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ہاں اس کی دوسری حیثیت میں دل سے تسلیم کر چکا تھا کیونکہ رشیدہ کو ایک دشمن سلیمان نہیں بلکہ انسان دوست ساتھی چاہیے تھا۔

"لگتا ہے لاڑ زار کی ریسیور رکھ کر میں نے رعب دار آواز میں کہا "بڑوں کی باتیں بچے اتنی توجہ سے نہیں سنا کرتے۔ جاؤ کچھ کھاؤ آؤ۔ بہت سخت بھوک لگی ہے۔"

"آؤ کچن میں سچ بڑا مزا آتا ہے چوکی پر بیٹھ کر کھانے کا..." اس نے رسان سے کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا "گرم گرم روٹیاں اتر رہی ہوں گی۔"

"لیکن عادت بھی تو خراب ہو گی۔" میں نے جواب دیا "کل جب گرم گرم روٹیاں اتارنے والے ہاتھ مجھ سے دور ہو جائیں گے تو کون اتنے لاڈ کرے گا؟"

"اب ایسی باتیں نہ کیا کرو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "اب میں تم سے کچھ نہیں کہہ سکتی ورنہ کہتی ان باتوں کو کون دور کر رہا ہے کیوں دور کر رہا ہے کیا یہ خود سے دور ہونا چاہتے ہیں لیکن اب تو جانے ہی دیجئے ڈلے میں تم نے... بھائی سے ایسی باتیں کیسے کروں؟" اس نے میرا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگایا تو اس کے آنسوؤں سے میرا ہاتھ بھیگ گیا تھا۔

"میری آنکھیں میں رشیدہ ہاتھوں کو مت بہاؤ۔ ویسے میں رونے والی لڑکی کو کسی بھی روپ میں پسند نہیں کیا کرتا۔"

"آنسوؤں پر بس تو نہیں ہوتا۔"

"ہوتا ہے بہادر لوگ رویا نہیں کرتے۔"

"بہنیں کہاں بہادر ہوتی ہیں میرے بھائی۔" اس نے کچن میں جا کر مجھے چوکی پر بٹھایا اور چولہا جلانے لگی "مجھے پتے گھر نہیں لے چلو گے تم میں اپنی ماں سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی نہیں ہاں تمہاری دکھی ماں کی دعاؤں کی چھاؤں تلے ہی اٹھے گی۔"

"ایک بات پوچھوں خرم برا تو نہیں مانو گے؟" اس نے توا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم کچھ پوچھو مجھے جان گئی ہو گی۔ میں ایسی بات نہ پوچھ لینا جو میں برداشت نہ کر سکوں۔"

"کب تک آخر کب تک تم خود کو بہلاتے رہو گے کیا تمام لڑکیوں کو بہنیں بنا کر دعائیں اٹھا سکتے ہو؟"

"نازک مگر چبھتا سوال ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر جواب کہا "یہ ٹھیک ہے بہن دعا ہوتی ہے جو ماں جائی ہو۔ اسے ہی رشتہ مانتی اور جانتی ہے۔ میں اگر تمہیں بہن بنا کر معاشرے کی عدالت میں جاؤں تو کوئی تعین نہیں کرے گا لیکن میرے ساتھ ایک مجبوری ہے۔ اسے تم بزدلی کہو یا غیرت کا احساس جان لو۔ میں کسی لڑکی کو فرسٹریٹ نہیں کر سکتا۔ دھوکا نہیں دے سکتا۔ جھوٹ بول کر جھوٹے وعدے کر کے میں اپنا جرم نہیں ضائع کر سکا ہوں۔ تم سمجھ گئی ہو گی رشیدہ بیگم جیسے محبت، وہ محبت جو مجنوں کو لیلیٰ سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوچنی کو منہوس سے تھی۔ ایسی محبت صرف ایک لڑکی سے ہی ہوتی ہے اور وہ لڑکی تھی میری کزن زینت... میں اس سے بچھڑ گیا۔ کچھ حالات ایسے آئے کہ مجھے یقین نہ رہا تھا کہ میں حالات کے جبڑوں سے نکل کر پھر اپنی محبت تک جا سکوں گا۔ ان ہی غیر یقینی حالات میں مجھے ایک دوسری لڑکی ملی اس نے مجھے من کے مندر میں بٹھا لیا۔ وہ اتنی مخلص، اس قدر معصوم لڑکی تھی کہ میں اس کا دل توڑ نہ سکا۔ اس سے مجھے محبت تو تھی لیکن وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی اگر میں محبت کے نام پر اسے برباد کر دیتا۔ بھنور بن کر اس کے کناروں میں پیار کی رنگینی انڈیلتا اور پھر مجھے آگے جانا تھا۔ کیا میں اس پھول سے رنگ اور بو باس چوس لے جاتا۔ کیں نے اسے بہن نہیں کہا میں نے اسے برباد نہیں... آباد کیا۔ وہ غریب الوطن تھے بے گھر تھے مصائب میں گھرے ہوئے تھے، میں نے ان کو وطن دیا گھر کا آسرا دیا اور مصائب سے دور کیا پھر اور بھی لڑکیاں میری زندگی میں داخل ہوئیں لیکن میرے دل میں صرف ایک لڑکی آباد تھی۔ مجھے صرف زینت سے محبت تھی اگر میں ہر آنے والی لڑکی کو محبوبہ بنا لیتا تو کیا یہ ان پر ظلم نہ ہوتا۔ بس رشیدہ بیگم اسی ظلم سے میں ڈرتا رہا ہوں جس طرح نماز انسان کو گناہوں سے بچاتی ہے ڈھال بن جاتی ہے اسی طرح میں ہر لڑکی کو رشتے کی ڈھال دے کر بچا لیتا ہوں۔"

"لیکن تم نے ہی بتایا تھا کہ زینت کسی کی ہو گئی ہے۔"

"ہاں... لیکن بے وفائی سے نہیں... پھر محبت پانے کا ہی نام تو نہیں رشیدہ بیگم!"

"جب وہ نہیں رہی تو کسی نہ کسی کو تو وہ خلا پر کرنا ہو گا۔"

"وہ جو کوئی ہے ابھی میرے سامنے نہیں آئی۔" میں نے لاجواب ہونے سے بچنے کے لیے جواب دیا۔ "پھر جن راہوں کا میں مسافر ہوں ایسے مسافر کو منزل کے لیے سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ میری اماں بی کے بقول جوڑے زمین پر نہیں بلکہ آسمان پر بنائے جاتے ہیں۔ وہ لڑکی جو میرے لیے اتاری گئی ہے، نہ جانے کہاں ہے، کون ہے؟ لیکن میرا ایمان ہے وہ خود میرے سامنے آئے گی اور راستے صاف کر کے آئے گی۔"

"اب تو اسے میں بھی تلاش کروں گی۔" اس نے چپاتی اتاری اور سالن کے لیے پلیٹ لینے مڑی تو اس کی آنکھوں کا منجمد زاویہ دیکھ کر میں نے پھرتی سے پلٹ کر دیکھا۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر سلیمان کا نرسنگ سٹیچر اشرف خان کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

میرے حلق سے عجیب سی غراہٹ ابھری تھی۔

"یہ... یہ... یہاں کیسے آ گیا خرم؟" رشیدہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ "کیا تم نے...؟"

میں اچھل کر اٹھا اور پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ غصے سے میرا جسم پھڑکنے لگا تھا۔ سلیمان نے یقیناً میرا تعاقب کروایا تھا اور بے اذن پلٹے منیجر کو داخل ہونے کی اجازت دے دی تھی۔

"او مسٹر سلطان...۔" وہ سیڑھیاں اترتا چلا آیا۔ "مجھے باس نے بھیجا ہے کوئی ارجنٹ کام ہے۔"

"مسٹر اشرف!" میں سرد تر لہجے میں بولا۔ "کیا تم میرا تعاقب کرتے یہاں تک آئے ہو؟"

"او نہیں... نہیں مسٹر سلطان! بخدا ہرگز نہیں بلکہ آپ کی کار کے ساتھ مس شاکرہ آئی تھیں۔ وہ کوہ نور کالونی میں رہتی ہیں۔ باس اس وقت اسی کے گھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسی نے باس کو بتایا ہے کہ آپ کو ایک کانوائے میں داخل ہوتے دیکھا تھا اس نے... وہ میرے ساتھ آئی ہیں۔ باس پشاور جا رہے تھے کہ راستے میں ان کو گل زمان مل گیا ہے۔ وہ مال لایا ہے۔ باس اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ کانوائے میرے ایک بزرگ کا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں مقیم ہیں۔ میں نے مال کا ذکر سن کر اپنے تناؤ کو توڑ دیا تھا۔ مس شاکر کو لے آئیے۔"

"نہیں مسٹر سلطان! باس جلدی میں ہیں۔"

"اچھا آپ چلیں، میں میز بانوں سے اجازت لے کر آتا ہوں۔"

میں نے خود کو گہری گہری سانسیں لے کر پُرسکون کیا اور کچن میں واپس گیا۔ رشیدہ نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے پریشانی کے زیر اثر دوسری چپاتی جلا ڈالی تھی۔

"کیوں آیا تھا اشرف...؟"

"وہی کل والے معاملے پر سلیمان مزید بات چیت کرنا چاہتا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں بتایا۔ "سالن ڈالو مجھے ابھی جانا ہے۔" اس نے پلیٹ میں سالن ڈالا اور میں ایک چپاتی کھا کر اٹھ گیا اور وہ بلاتی رہ گئی تھی۔

مس شاکرہ ادھیڑ عمر باوقار چہرے والی خاتون تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر سلام کیا اور اشرف نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ شاکرہ کو دیکھ کر مجھے یاد آیا تھا کہ میں نے اسے مال روڈ پر پیچھے آتے دیکھا تھا۔ سامنے سلیمان نے کسی کو تعاقب کا اشارہ نہ دیا تھا۔ ہو سکتا ہے اشرف نے اسے تعاقب کا گمان دیا ہو... یا سلیمان کا سٹینڈنگ آرڈر رہا ہو کہ اس مخصوص بزنس سے متعلق جو بھی بات کرنے آئے اس کا مددوار پتہ معلوم کیا جائے۔

ورنہ شاکرہ کو پشاور روڈ پر جانا چاہیے تھا۔ ہمارا کانوائے روڈ سے خاصا دور واقع تھا اگر وہ کسی دوسری وجہ سے اس روڈ پر آئی تھی تو اسے کانوائے کو یاد رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟

کوہ نور کالونی میں وہ ایک آفیسر ٹائپ بنگلہ تھا۔ گو چھوٹا تھا لیکن

صاف ستھرا تھا کار سڑک پر ہی روک کر میں ان کے ساتھ چھوٹے سے گیٹ اور مختصر لان سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔ سلیمان کے ساتھ ایک روایتی لباس والا سرخ و سپید پٹھان بیٹھا تھا۔ میں نے دونوں سے باری باری مصافحہ کیا اور سلیمان نے تعارف کروایا۔

"معاف کریں گے سلطان بھائی! بغیر اجازت آدمی بھیجنا مناسب نہ تھا لیکن خان صاحب کو جلدی تھی۔" سلیمان نادم سے انداز میں بولنے لگا۔ "میں تو پریشان تھا جب میں گل زمان سے آپ کا ذکر کر رہا تھا تو شاکرہ باجی نے میری مشکل حل کی تھی۔"

"ادھر میرے دور پار کے انکل رہتے ہیں۔ ان سے ملنے گیا تھا میں نے بتایا یہ کیا بات تھی؟"

"گل زمان سے میرے دیرینہ کاروباری تعلقات ہیں۔" سلیمان بتانے لگا۔ "بس کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی ان کو... خان رنگ باز خان نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ اس کے لیے مال لاتے ہیں۔ سربراہ ملاقات ہو گئی تو میں نے ان کو روک لیا اور بتایا کہ خان سے بہتر ایک شخص ہے، جو بہتر دام اور نقد پیسے منٹ کرے گا۔"

"ہاں برادر!" گل زمان گلا صاف کر کے بولا۔ "خوام کو تو ڈالر دام دو لیکن ایک دم نقد۔ ہمارے پاس پیچھا تو ٹیم نہیں ہے کہ پاٹیے کے بیچے چکر پر چکر لگائے، مال دیکھو پسند ہے تو اوٹا لو۔ بس ہم دوسرا بات نہیں بولتا۔"

"کتنا مال ہے خان؟" میں نے پوچھا۔

"پورا پانچ کلو پکا بٹہ!"

"چرس یا ہیروئن؟"

"ناں مسٹر! ہم سے کیوں مسخری کرتا، یہ ٹیم چرس مرس کا نہیں ہے۔ ایک دم گولڈن مال ہے۔ ٹنمیر ایک کھود دیک لو پھر تو لوگے کھان اور لاؤ۔"

"دکھائیں خان، ہم سارا مال نقد خرید لیں گے۔"

"اوہ کیسا بولتا جوان، ایدھر ہمارہ پاکٹ میں نہیں ہے، ادھر چلو۔"

"سیٹھ!" میں نے سلیمان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آپ سودا کریں میں جائز منافع پر آپ کے مال کے ساتھ ٹھہرا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" سلیمان کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ "لیکن پے منٹ تو کل ہی کر سکوں گا۔"

"یہ آپ دونوں آپس میں طے کریں۔ میں فی الفور پے منٹ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"گل زمان! اس وقت پے منٹ مشکل ہے۔ ہاں کل کسی بھی وقت ہم سودا کریں گے بلکہ سودا ہو گیا۔ آپ کو آج شام بیعانہ دے دیا جائے گا۔"

"لیکن ریٹ جو ہم نے بولا وہی ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے خان!" سلیمان نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں آپ سے تعلقات بحال ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے رنگ باز کوئی مارہ بھائی نہیں ہے۔"

شاکرہ نے چائے اور بسکٹ رکھے اور اشرف نے اٹھ کر چائے سرو کرنے کی ذمے داری سنبھال لی۔ شاکرہ شاید اپنے گھر میں غیر محرموں کے درمیان بیٹھنے سے اجتناب برتنے پر مجبور تھی۔

"خان آپ مال اگر شام سات آٹھ بجے تک لے آئیں تو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔" میں نے یہ سوچ کر تجویز پیش کی کہ گل زمان کو بھی سلیمان کے ساتھ ہی صاف کر دیا جائے تو دراصل میں نے باہر کا ٹریپ بنایا ہے۔ "ادھر صاف مال کی مارکیٹ ہے۔"

"نہیں برادر! ہم ادھر ہی مال دکھائیں گے۔"

"ٹھیک ہے سیٹھ ہم پہلے چل کر مال دیکھ آتے ہیں۔ میں اندھے سودے نہیں کیا کرتا۔"

"کیوں گل زمان؟"

"بالکل چلو تم سے کیا پردہ ہے۔ جیسا ہم ویسا تم..." گل زمان نے ایک ساتھ دو سالم بسکٹ منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ ہم تو بس رسماً ہی بسکٹ اٹھا رہے تھے۔ تینوں پلیٹیں گل زمان کے پیٹ میں گئی تھیں۔ شاید اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔

سلیمان کی مرسڈیز میں ہم بیٹھے۔ میں اور گل زمان پچھلی نشست پر تھے۔ سلیمان خود ڈرائیو کر رہا تھا اور بول گل زمان رہا تھا۔ وہ اپنی ساکھ اور مال کی تعریفیں کرنے لگا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی اپنی بھٹیاں سامان کرتی ہیں اور مغربی ممالک کے گاہک براستہ افغانستان مال لے جاتے ہیں۔

حسن ابدال اڈے سے دائیں ہاتھ کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر گل زمان نے کار رکوائی اور ہمیں ساتھ لے کر ٹینگ، کچھ زرد گلیوں میں داخل ہو گیا۔ چوتھی گلی میں ایک مقفل دروازہ کھول کر اس نے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ مکان شاید ہپی پارٹیشن کے وقت کسی ہندو سکھ نے بنایا ہو گا۔ صحن میں عشق گھاس کھڑی تھی اور کیاؤنڈوال اندر کی جانب جھکی ہوئی تھی۔

اندر ایک بان کی جھلنگا چارپائی پر برسوں پرانا میلا بستر بچھا ہوا تھا۔ ملیشیا کی رضائی کھول کر گل زمان نے ایک کینوس کا تھیلا نکالا۔ اوپر کے خانوں میں ہینگ، زیرہ اور سبز چائے بھری ہوئی تھی۔ پتیل کا چھوٹا ترازو نکال کر اس نے جوتے کی نوک سے شاپنگ بیگ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا تھا۔

بلاشبہ اعلیٰ کوالٹی کی ہیروئن تھی۔ میں نے چٹکی میں لے کر سونگھی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر ہتھیلی پر پھیلادی حالانکہ کھری کھوٹی کی پہچان میرے نزدیک سے بھی نہ گزری تھی لیکن میں معائنہ ایسے ہی کر رہا تھا جیسے جوہری موتی پرکھتا ہو۔

"ٹھیک ہے خان! ہم منہ مانگی قیمت دیں گے۔" میں نے کہا۔ "یک شرط بھی ہوگی۔ آئندہ بھی مال پہلے ہمیں دکھائیں گے۔"

"ادھر چرس مرس کی طلب ہو تو بول دینا۔ گل زمان جھولے کا منہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "آمادہ دو تین ساتھی کل چرس لے گا۔"

"گل زمان۔" سلیمان بولا۔ "میرا خیال ہے آپ ہینگ زیرہ بیچنے سفر کرتے ہیں۔"

"تو کیا برادر!" اس نے قہقہہ لگایا۔ "ایدھر تمارا گورنمنٹ بوت ہشیار ہوگیا ہے۔ کون مائی کا بیٹا سیدھا گاڑی دان پھنسانے آسکتا ہے؟"

"چرس بھی لے لیں گے خان!" میں نے کہا۔ "تو کچھ لائے گا ہمارا؟"

"ٹیک ٹیک جوان! اتم تیس سال سے یہ دھندہ کر رہا ہے۔ سیٹھ کو مالوم ہے۔ گل زمان کیسا کھرا آدمی ہے۔ جیسا بولے ویسا ہی تولے گا۔"

گل زمان ڈیڑھ بجے واپس ہمارے ساتھ آیا۔ وہ ہینگ زیرہ بیچنے والوں کی طرح باتونی تھا جب کار سے اتارا گیا تب بھی بولے جا رہا تھا۔ ہم نے اس سے اجازت چاہی تو بھی چند قدم کار کے ساتھ ساتھ ہولیا چلا آیا تھا۔

میرے ذہن میں منصوبے کی کھچڑی پک رہی تھی۔ دونوں ٹھکانوں کے درمیان فاصلہ بہت تھا۔ تقریباً تین گھنٹے لگنے تھے۔ کوئی اطلاع کے مطابق الارم کا کوئی میں بھی کچھ ہونا چاہیے تھا۔ کل نے ایک خیال سجھایا اور میں نے بے قراری سے پہلو بدلا۔ کار قطب نما آئینے میں دیکھا۔ پراسیوٹ بس کے پیچھے ایک سرخ کار آرہی تھی۔

"سلیمان!" میں نے مرموز آواز میں بتایا۔ "میرا خیال ہے ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔"

سلیمان نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ پھر وہ ٹوہ کا کوئی سے نگرانی ہو رہی ہے۔"

"کون... کہاں ہے؟" سلیمان نے پوچھا۔

"کار میں ہیں۔" میں نے بتایا۔ "اور جب ہم گل زمان کے ساتھ [illegible] اور کار ایونگ سیٹ پر موجود شخص کو میں نے گل کے قریب کھڑا دیکھا تھا۔"

اسی لمحے... کار اوور ٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔ پیسنجر سیٹ پر ہمارے ہی اتفاق سے ساتھ دے گیا تھا اگر پلیٹ نمبر کسی دوسری گاڑی کا ہوتا تو سلیمان کا ذہن آتی جلدی رنگ باز خان کی طرف نہ جاتا۔ پھر نمبر تو نہ بتا پاتا۔

"کیا ہے تمارے پہچان لیا ہے دوست!" سلیمان سوچتا ہوا [illegible]

"نہیں ایک کمینہ خصلت حریف میری نگرانی کروا رہا ہے۔ اگر اس نے پنجہ مارنے کی حماقت دوہرائی تو میں اس کے لیے یہ خلک نہیں کہ اکر کہ یہ شہر ضرور تنگ کر دوں گا۔ وہ باہر سے آکر ہمیں اپنے گھر کے دروازے پر نہیں روک سکتا سلطان! میں صاف کھیل کا عادی ہوں مگر کوئی گریبان تک ہاتھ لے آئے تو میرا شرافت نہیں نپدلی بن جاتی ہے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو سیٹھ؟"

"رنگ باز خان کی۔" وہ نہتے لہجے میں بولا۔ "ایک بار میں نے اسے وارننگ دے کر معاف کر دیا تھا۔"

"رشیدہ کے معاملے میں سیٹھ؟"

"نہیں۔" اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔ "اس نے مارکیٹ میں میرے کچھ گاہکوں کو ہراساں کر کے خراب مال میرے نام پر سپلائی کرنا شروع کر دیا تھا۔"

"ایسا تو سمجھ ہوتا ہے سیٹھ!" میں نے اس کو مزید بھڑکانے کے لیے کہا۔ "یہ بزنس ہی ایسا ہے۔ جو صرف کاروبار میں حائل ہوتے ہیں ان کو حریف ایسے ہی کنکر کر راہ سے اچھال دیتے ہیں جیسے گندی مکھی کو شہد کے چھتے سے نفی کر دیا جاتا ہے۔ میں کچھ عرصہ ہانگ کانگ رہا ہوں۔ وہاں تو ہر رات کوئی نہ کوئی حریف اپنے ہی حواری کے ہاتھوں قتل ہو کر ہمیشہ کے اندھیروں میں گم ہو جاتا ہے۔"

"اب ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں غرایا۔ "یہ ہمارا اپنا آبائی شہر ہے۔ اس پر اجارہ داری بھی ہماری ہی ہوگی۔"

"اس ہینگ میں میری مدد کی ضرورت محسوس کرو سلیمان سیٹھ... تو مجھے شانے کے ساتھ پاؤ گے۔" میں نے لوہا گرم دیکھ کر ایک ضرب اور لگائی۔ "رنگ باز خان کی بڑھتی ہوئی قوت میرے مفادات کے بھی منافی ہے۔ میں نے بھی اب اسی شہر میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"شکریہ دوست۔" وہ ایک دم خوش ہوگیا۔ "میری پیش کش بدستور قائم ہے۔"

"اوہ نہیں سیٹھ!" میں نے پُرزور انداز میں ہاتھ ہلا دیا۔ "شراکت نہیں۔ میں دوستی اور وہ بھی رنگ باز خان کے معاملے تک محدود ہوگی۔"

"مجھے تمارے دوستی ہر رنگ اور ہر تک قبول ہے۔"

"بس سیٹھ مجھے یہاں تمارا دو چوہڑے کے بس اسٹاپ پر میں کار کو روکنا تھی اگر میں چیک نہ کرتا تو شاید وہ مجھے [illegible] یک ڈراپ کرنے کی سزا دیتا۔

"اوہ مائی گاڈ... وہ [illegible] چونک پڑا۔ "اشرف کا اٹھانا تھا مجھے [illegible]

میں نے نیچے اتر کر ہاتھ ہلایا اور فٹ پاتھ پر چڑھ کر چلنے لگا۔

سلیمان نے آگے جا کر گاڑی موڑ کر دوسری سڑک پر ڈال دی تھی۔

میں نے رنگ باز اور سلیمان کے درمیان جنتی ہوئی گیند پھینکنے کا جو پروگرام بنایا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ دونوں حریف ایک دوسرے سے بدظن ہو جائیں۔ قدرت نے میری مدد کرتے ہوئے شاکر کو میرے تعاقب میں کامیابی تک بھیجا تھا۔ گل زمان بھی اچانک ایک ضروری کردار بن کر درمیان میں کود پڑا تھا اور سرخ کار بھی نہ جانے کتنا فاصلہ مارتی ہوئی ایک معقول جواز دینے چلی آئی تھی۔

جو ضرب میں رات کے اندھیرے میں سلیمان کے دشمن کی ایڑیوں پر لگانا چاہتا تھا اس کا درد صرف سلیمان تک محدود رہتا تو میرا منصوبہ مکمل نہ ہو پاتا۔ میں تو چاہتا تھا کہ سلیمان اپنی لہولہان ایڑیاں لے کر رنگ باز خان کی ذات بھی رنگین کر دے۔

میرا منصوبہ یہی تھا کہ ضرب میرے ہاتھ لگائیں اور جوابی ضرب رنگ باز خان کے ہاتھوں کو سہنا پڑے۔ میرا کام اتنا ہی تھا کہ میں دو خطرناک درندوں کو ہنکارتا ہوا آمنے سامنے لاؤں اور پھر درمیان سے ہٹ کر فیصلے کا انتظار کروں۔

کانیچ میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ بیگن کو آتا دیکھ کر میں گیٹ پر ہی رک گیا۔ اس کے ساتھ سلوا اور ہارکن بھی تھے۔ وہ کار روکنے لگا تو میں نے اشارے سے اسے منع کر دیا لیکن اس نے رفتار کم کر دی اور میں ساتھ چلنے لگا۔

چلتی کار سے ہارکن اور سلوا اتر پڑے تھے۔ بیگن نے کار پارک کی اور میں نے اس کے لیے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ رشیدہ کی پھنکارتی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ تو صرف چونک کر اچھلے تھے لیکن میں دوڑتا ہوا باڑ پھلانگ گیا تھا۔ آواز بیڈروم سے آرہی تھی وہ کسی پر کڑک رہی تھی۔

میں اندر داخل ہوا اور وہ ایک دم اچھل کر پلٹا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے ریوالور نکال لیا تھا پلٹتے ہی اس کے ہاتھ میں [illegible] مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو نشانہ لیتے لیتے ہی ڈھیر کر دیتا۔

"تمارا باس بہت جلد باز اور بودا شخص ثابت ہوا ہے۔" میں نے اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "جاؤ اسے کہہ دینا کہ چوٹ نوٹ کر لی گئی ہے۔"

"وہ نہیں نہیں۔" رشیدہ اس کے عقب میں تڑپ اٹھی۔ "یہ شیطان اپنی آگ میں جلتے جلتے یہ ہے۔ مجھے مستقبل کے سہانے خواب دکھا رہا تھا۔"

"مجھے جانے دو سلطان!" وہ ریوالور لہرانے لگا۔ "یہ میری دیانت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماتحت دلچسپی لگا ہوں سے فائیٹ کو دیکھ رہے تھے۔ ابھی میں خود کو تولی ہی رہا تھا کہ اُس نے چاقو نکال لیا۔ عجیب ساخت کا چاقو تھا جیب سے باہر آتے ہی بے آواز کھل گیا تھا۔ ہلالی شکل کا چمک دار پھل کی دو نوکیں تھیں۔ چاقو پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ ہاتھ اس فن سے بھی آشنا ہیں۔

وہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں چاقو کو لہراتے قدم قدم فاصلہ کم کرتا آ رہا تھا۔

جب فاصلہ خطرناک ہونے لگا تو میں پہلے مسکرایا پھر پیچھے ہٹتا چلا گیا تھا۔

"اسے جانے دو سلطان۔" رشیدہ نے لرزتی چیخ میں کہا۔ "یہ چاقو زنی... میں بڑا خطرناک ہے۔"

"اب تو تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔" اور اُس نے تو اب موت کو آواز دی ہے۔" اس نے دائیں سے بائیں چاقو لہرایا اور میرے عید رکوٹ کی آستین جھر جھری آواز سے کٹ گئی۔ اس نے میرے دل کا نشانہ بنایا مگر میں پیچھے گرتا چلا گیا۔ اُس کے حلق سے قہقہہ اُبل پڑا۔ "پاؤں پر کھڑے رہو سلطان... بزدلوں کی طرح دُبک کر نہ مرو۔" میں قلابازی لے کر جب اُٹھا تو فاصلہ پھر اتنا ہی تھا۔ اُس نے فاصلہ اپنے حق میں رکھا ہوا تھا۔

"رُک جاؤ اشرف۔" رشیدہ دہاڑی۔ اس نے اشرف کا بازو تھام لیا تھا۔ "ورنہ میں گولی مار دوں گی۔" اشرف کی نگاہیں ایک سیکنڈ کے لیے تھرتھراتی ہوئی ہدف سے ہٹ گئی تھیں۔ چاقو کے عین میں سارے کمال نگاہوں کا ہی ہوتا ہے۔ نگاہ چوک جائے تو ہدف بھی یقینی نہیں رہ سکتا اور میں نے اس ایک سیکنڈ کو استعمال کر لیا تھا۔

میری بائیں ٹانگ گھوم گئی اور اشرف ڈگمگاتا ہوا اُلٹ گیا تھا مجھے اپنی ضرب پر ہمیشہ اعتماد رہا ہے اور ضرب کی کارکردگی کا اندازہ اشرف کے دائیں بازو کو پہلو میں لہرانے سے ہو رہا تھا۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے جھولتے بازو کو تھام کر میری جانب دیکھا اور ہاتھ اُٹھایا۔ اشرف خان!" میں نے سفاک آواز میں کہا اور اُس نے گردن جھکا دی۔

میں نے آگے بڑھ کر اُس کا شانہ تھپ تھپایا۔ اُس کا جرم بیباکی تھا اُس نے شکست تسلیم کرنے کا بھی اچھا انداز اپنایا تھا پھر میں نے اُسے اپنے منصوبے میں بھی فٹ کر لیا تھا۔ وہ سلیمان کا سیدھا ہاتھ تھا اگر اُس کا اتحاد ساتھ ہوتا تو چل کود اور ممکنہ نقصان سے بچا جا سکتا تھا۔ میرے مخبر کی اطلاع غلط بھی ہو سکتی تھی اور پھر ہم اندھیرے میں کہاں کہاں جھانکتے پھرتے۔

"ماسٹر! مسٹر اشرف کی مرہم پٹی کر دیں۔ یہ ہمارے کرم فرما سیٹھ سلیمان کا خاص آدمی ہے۔" اشرف نے میرا انداز نگاہوں سے اُوپر دیکھا۔ "بھول جاؤ دوست! بس حساب برابر ہو چکا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ آج رات میں سلیمان سیٹھ کا گودام دیکھ رہا ہوں۔ ہمارے درمیان سودا طے ہو چکا ہے صرف مال دیکھنا ہے اگر تم ساتھ ہو گئے تو آسانی رہے گی۔"

"نہیں! مجھے ایسی کوئی ہدایت نہیں ملی۔" اُس نے ٹوٹے ہوئے بازو کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تمہیں میری شکل دیکھنے کے لیے سیٹھ نے بُلایا تھا؟" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "اگر اُس نے ہدایت نہیں دی تو اب ٹیلی فون پر بات ہو سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس حالت میں اُس کے سامنے جاؤ۔ اگر میں نے شکایت کر دی تو ہدایت دوسری قسم کی ہو گی تمہیں وہ ایک لحظہ برداشت نہیں کرے گا کیونکہ معاملہ کسی اور کا نہیں رشیدہ کا ہے سوچ لو۔"

"ٹھیک ہے ٹیلی فون پر ہدایت مل جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

اُسے بیگن کے حوالے کر کے دوسرے ساتھیوں کو لے کر میں لان میں نکل گیا۔ مار مجھے اور اشرف کو پڑی تھی لیکن ہوائیاں اُن کے چہروں پر اُڑ رہی تھیں۔ وہ میرے ساتھ ایسے چل رہے تھے جیسے تھانے دار کے ساتھ چور چل رہے ہوں۔

"چیف! کیا آپ بلیک بیلٹر ہیں؟" ہارکن متمنائی آواز میں بولا۔ "میں نے اتنے مختصر وقت میں اتنی اچھی فائیٹ کبھی نہیں دیکھی تھی۔"

"بیلٹ نہیں لڑا کرتے دوست! میں نے اُن کی جانب دیکھا۔ "حوصلہ اور قوت میدان میں کام آتے ہیں۔ تم نے مقامی لباس حاصل کر لیا ہے نا؟"

"ہاں چیف!" سلو نے جواب دیا۔ "گاڑی سے ہم نے پرانے کپڑے خرید لیے ہیں۔"

"یہ نوجوان کیوں آیا تھا چیف؟" ہارکن نے مؤدب آواز میں پوچھا۔

"یہ دوسری داستان ہے۔ جس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔" میں اُسے رشیدہ اور سلیمان کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔ "تم لوگ اسے لے کر نیچے کوٹھی میں جاؤ گے۔ اور اس پر کڑی نگاہ رکھو گے۔"

"سلیمان کا ایک ایجنٹ پہلے بھی تو وہاں ہے۔" سلو نے بتایا۔

"دونوں کو الگ الگ رکھا جائے گا۔"

رشیدہ برآمدے میں آئی تو میں اُن کو چھوڑ کر اُدھر چلا گیا۔

"ڈیڈی! پوچھ رہے ہیں۔ صرف مرہم پٹی کروں؟"

"کیا بینڈیج کا انتظام ہے؟" میں نے پوچھا تو رشیدہ واپس اندر چلی گئی۔ "ہاں! اُن کے بکس میں بینڈیج کا سامان ہے۔" ایک منٹ بعد آ کر اُس نے بتایا۔ "وہ پٹیاں جوڑ کر اُس کا بازو باندھ رہے ہیں۔"

"اگر میں نہ آتا تو...؟"

"تو...!" رشیدہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "یقین کرو خرم تمہیں ایک

ٹھکانے لگانا پڑتی میں اُسے ابھی سمجھا ہی رہی تھی۔

اشرف نے صرف ہار ہی نہیں تسلیم کی تھی بلکہ اپنی گردن بچانے کے لیے تعاون پر بھی آمادہ ہو گیا تھا۔ اُس کو یقین تھا کہ اگر یہ بات سلیمان تک پہنچا دی گئی تو وہ تجربیاں توڑ کر اُسے گندے نالے میں پھنکوا دے گا۔

جب بیگن فارغ ہوا تو میں نے اشرف کی شرط پوری کرتے ہوئے ویسے ہی اُوٹ پٹانگ نمبر ڈائل کیے تھے۔

"میں سلطان بول رہا ہوں سیٹھ! آپ سے پوچھنا ہے کہ آپ نے اشرف خان کو مال کے معائنے کی ہدایت کیوں نہیں دی جب کہ ہمارے درمیان یہ بات طے ہو چکی تھی۔" جی ہاں بالکل... ہاں ہاں! میں مال دیکھ کر اپنی موجودگی میں پیک کراؤں گا اور سیل بھی لگے گی کیونکہ تبادلے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ کون؟ اشرف خان؟ وہ اتفاق سے مجھے مل گیا تھا۔ میں نے اُس سے کہہ دیا ہے، وہ مجھے رات آٹھ بجے شالیمار میں ملے گا۔ نہیں سیٹھ میں اب آٹھ بجے سے قبل تو اُس سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا، تعجب ہے میں اُسے لے جاؤں گا۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے آپ بھی ہمیں گے تو اور بہتر رہے گا۔ ٹھیک ہے سیٹھ ہم گودام میں آپ کا انتظار کریں گے۔"

ریسیور رکھ کر میں نے مسکرا کر اشرف کو دیکھا۔ اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ لگ رہا تھا۔ زبان سے بھی اُس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا تھا۔ دراصل اُس کی پوزیشن ہی جارحیت حق میں ہو گئی تھی ورنہ وہ خود بات کرنا پسند کرتا۔

"ماسٹر! مسٹر اشرف کو ساتھ لے جائیں۔" میں نے کہا تو پہلی بار اُس نے استفہامی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ "میں آٹھ بجے شالیمار میں پہنچ جاؤں گا۔"

"نہیں اشرف خان! میں دوسری قسم کا آدمی ہوں۔ میں ہاتھ سے پرندہ چھوڑ کر جھاڑیاں دیکھنے کا عادی نہیں ہوں۔ ویسے بھی تم اس حالت میں کہاں جاؤ گے آرام کرو۔"

یعنی کہ زیرِ حراست ہوں؟"

"جو بھی سمجھنا چاہو۔ میں تمہاری سوچ پر پہرہ نہیں بٹھاؤں گا۔"

"اس طرح اگر میں تعاون کرنے سے انکار کر دوں تب...؟"

"تب میں ابھی سلیمان کو یہاں بلا لوں گا اور پھر تم دونوں سے جواب طلب کر لوں گا۔"

"تم بلیک میل کر رہے ہو سلطان۔"

"ماسٹر! اسے یہاں سے لے جاؤ۔" میں نے کرخت آواز میں کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

●

رنگ باز خان مجھ پر اندھا اعتماد کر بیٹھا تھا لیکن میں نے کسی شرک

اچھی بیوی کی تلاش میں وقت ضائع مت کرو، یہ تو ایک بلاانڈنگ گیم ہے، پتے اچھے ہوئے تو بازی جیت لی ورنہ مات ہو گئی۔

خوشگوار زندگی کا راز صرف یہ ہے کہ تلخیوں کو ایک بار ہی پی جاؤ جبکہ خوشیوں کے جام کو چسکیاں لے کر پیتے رہو۔

غربت ایک ایسا لباس ہے جسے امیروں نے اُتار پھینکا اور راہ چلتوں نے اُٹھا کر پہن لیا — امیروں کے پاس وسائل اور غریبوں کے پاس مسائل ہوتے ہیں۔

کی گنجائش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس کا بزنس مینجر ساتھ رکھ لیا تھا، اسی طرح وہ شخص بھی میری نگاہوں میں آ گیا تھا جو خان کے کالے دھندے کا معاون تھا، خان اُسے پس پردہ رکھتا تھا لیکن معاملہ دس لاکھ کا تھا میں نے جب کسی خاص نمائندے کی تجویز پیش کی تو قدرے مزید پس و پیش کرتے ہوئے اُس نے بزنس مینجر کو میرے ساتھ بھیج دیا تھا۔

اشرف خان کی طرح وہ خوب رُو، اسمارٹ اور تعلیم یافتہ نہ تھا۔ وہ لمبوترے چہرے اور سُرخ آنکھوں کی وجہ سے سرتاپا درندہ ہی دکھائی دیتا تھا جس طرح لوگ خونخوار کتوں کو اندھیری کوٹھریوں میں رکھتے ہیں اور رات دیر سے کھولتے ہیں اسی طرح رنگ باز خان اپنے بزنس مینجر کو عام لوگوں سے کہیں دُور چھپائے رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حیوانیت اور عادات سے خونخوار تھا۔

اُس کی موجودگی میں خان نے نوٹوں کی گڈیاں گن کر چرمی بیگ میں رکھیں۔ میں نے احتیاطاً تین گڈیوں کا معائنہ کر لیا تھا۔ بیگ اُس نے میری جانب بڑھایا تو میں نے اُس کے مینجر کو اشارہ کیا۔

اُس نے نخوت کی نگاہوں سے میری طرف گھور کر دیکھا... لیکن خان کی موجودگی آڑے تھی، ورنہ وہ گرگ اُٹھتا۔ اُس نے کندھے اُچکا کر بیگ اُٹھا لیا۔

"چودھری!" خان نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "یہ پہلا دور اور آخری سرمایہ ہے۔"

"زندگی کے ساتھ میں ضمانت دے سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر میں دوبارہ زندہ آپ کو ملا تو میرے ساتھ مال ہو گا یا آپ کی رقم ہو گی۔"

"میرا یہ قصد نہیں تھا میرے بیٹے!" خان پہلو بدل کر نے قرار سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بجے میں بولا۔ میں تو اپنے سانے کو بھی ٹک کی نگاہ سے دیکھتا آیا ہوں مگر تمہارے میرے اندر سے تمام وسوسے کھرچ ڈالے ہیں، صرف تمہاری ذات کی حد تک۔۔۔"

"تم آپ کا منیجر سلیمان کے ایجنٹ کے حوالے کر کے واپس آ جائے گا ہماں میں وصول کروں گا۔"

"میں نے سب کچھ تمہاری صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔" خان کرسی چھوڑتا ہوا بولا۔

رنگ باز خان تو نہ جانے کون تھا کہاں سے آیا تھا اگر منشیات کے دھندے میں میرا سگا بھائی بھی ملوث ہوتا تو بھی میں خون کے رشتے کو پس پشت ڈال کر اس کا سر کچل دیتا۔

ویسے مجھے دکھ کا احساس ضرور ہو رہا تھا کہ ایک شخص کسی کو بیٹا کہہ رہا ہو اور بیٹا گرل لے کر اس کی قبر کھود رہا ہو۔

"یہ کیا چکر چلا رہے ہو سٹر؟" ولی خان نے غراتی آواز میں پوچھا۔ "دس لاکھ کا مال خان کھپائے گا کہاں، لوکل مارکیٹ بہت محدود ہے۔ مارکیٹ کا شاید تمہیں تجربہ نہیں۔"

"کیا تم مال ہو؟" میں نے ذرا سا چہرہ گھمایا۔

"کاش یہ سوال تم نے تعارف سے قبل کیا ہوتا۔" وہ دبکتی آواز میں بولا۔ "میں مال ہی ہوں لیکن بوتے نہیں گروں گا۔ تم اشتہا ہو۔"

"پھر تو بڑے کام کے آدمی ہو یار۔" میں نے مسخرہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "تمہارے فن سے بھی استفادہ حاصل کروں گا۔ کچھ گر دس مجھے پریشان رکھتی ہیں۔"

"سنا ہے باہر سے آئے ہو؟" وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ "خان تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں، دوستی کرو گے، ولی خان دوستوں کی پریشانیاں دور کر دیتا ہے۔"

میں نے دایاں ہاتھ اسٹیئرنگ سے اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔ "جی پی او کے سامنے کونر مقامی بھیس میں موجود تھا۔ میں نے کار۔۔۔ قریب جا کر روکی۔" اس نے استقبالیہ مسکراہٹ دی، اور اپنی کار سے اتر پڑا۔

"اندر چلے آؤ۔" اشرف نے ڈرامے کا مکالمہ بولا اور کونر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"رقم گن کر رسید دے دو اور تم میرے ساتھ سیٹھ تک چلو گے اور رسید رنگ باز خان تک چلی جائے گی۔ بیوی، ماؤنٹ کا معاملہ ہے دوست برا محسوس نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" کونر نے بیگ کھولتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "جو فیس طے ہونا چاہیے۔"

اس نے پہلے چند گڈیوں کا معائنہ کیا پھر گڈیاں گننے لگا۔ "ٹھیک ہے جناب۔" اس نے نوٹ بک نکالی اور رسید لکھ کر اشرف کے دستخط کروا دیے۔

"رسید تمہارے جاؤ گے یا میں ہی خان تک پہنچا دوں؟" میں نے رسید لیتے ہوئے پوچھا۔ "خان اب مجھے کہاں ملے گا؟"

"ٹھیک ہے میں واپسی پر اس سے مل لوں گا۔" میں نے رسید جیب میں رکھ لی۔ "اب تم اپنی کار لے جاؤ، میں سیٹھ سلیمان سے ملنے جا رہا ہوں۔"

اس گدھے نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر رقم سیٹھ کی تھی تو سیٹھ کے حوالے کیوں نہیں کی گئی تھی۔ شاید سوچ کو اس نے کونر کے سامنے زبان نہ دی تھی۔ میں تو دونوں سانڈوں کے درمیان دنگل کے میدان ہموار کر رہا تھا۔

میں نے بیگ رشیدہ کے حوالے کیا تھا اس نے بیگن کے سیف میں رکھ کر کے چابی بیگن کی جانب بڑھائی تو بیگن نے اس کا ہاتھ روک دیا۔

"میں نے سب کچھ اپنی بیٹی کے سپرد کر دیا ہے۔"

"اوہ نہیں ڈیڈی۔" رشیدہ بولی۔ "آپ کہیں جا رہے ہیں، میں تنہا رہ جاؤں گی۔ مجھے اس جنگل میں نہ ڈالیے پلیز۔۔۔ ہمیں نے اس سے چابی لے لی، ورنہ وہ شاید سکون سے نیند بھی نہ لے سکتی۔

"تمہارے ڈیڈی ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم تمہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔"

"کیا واقعی میری ضرورت نہیں؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اشرف خان نے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔"

"نہیں نرم۔" رشیدہ بول پڑی۔ "اگر گڈیوں کی ضرورت ہے تو ان کو لے جاؤ۔ میں اپنا خیال رکھ سکتی ہوں۔ میں تم لوگوں کی مجبوری بن گئی تو مجھے دکھ ہوگا۔"

"فضول باتیں نہیں۔۔۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

باسر کونز، جنٹ، بارکن اور ساؤ جاق وہیں کھڑے تھے۔ چاروں شلوار قمیص میں ملبوس تھے اور کندھوں پر رومال تھے۔ چونکہ منڈے مارنے کا پروگرام تھا اس لیے ان کو یہ کہہ کر لایا گیا تھا صرف میں سلطان کے روپ میں تھا کیونکہ اشرف اور گل زمان نے مجھے اس چہرے کے ساتھ دیکھا ہوا تھا۔

گل زمان کے پاس مال زیادہ نہ تھا لیکن مال سے کہیں زیادہ اس کی ذات خطرناک تھی۔ وہ ہیروئن، افیم کے تھیلے میں چرس اور ہیروئن یہ سرحد سے پنجاب تک پیدل گاؤں گاؤں پھرتا تھا۔ اس نے بتایا تو نہیں تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ بکاؤں کے نوجوانوں میں یہ زہر تقسیم کرتا رہتا ہوگا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں نے گل زمان کو بھی سٹ میں شامل کر لیا تھا۔ اس کا آزاد رہ کر یوں گھومنا رنگ باز اور سلیمان سے بھی بڑھ کر خطرناک تھا۔

ننھی کوٹھی سے ہم نے اشرف کو اٹھایا۔ وہ بے حد غصہ اور تھکا تھکا سا دکھائی دے رہا تھا حالانکہ میں نے اس کے چہرے پر کوئی ضرب نہیں لگائی تھی لیکن اس کی ناک اور ہونٹ متورم تھے۔ شاید منہ کے بل گرنے کی وجہ رہی تھی۔

جب ہم کار حسن ابدال کے اڈے سے نکال لے گئے تو اشرف خان نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

"کیا تم لوگ مجھے علاقہ غیر میں لے جا رہے ہو؟" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"ایسی کوئی نیت نہیں اشرف خان۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "ہم گل زمان سے مال خریدنے جا رہے ہیں۔ تمہارے باس نے میری ڈیوٹی لگائی تھی۔"

میں نے اپنے ساتھیوں کو گلی کی نکڑ پر ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اشرف کو لے کر گلی میں داخل ہو گیا۔ وہ لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

"یار مجھے بھی تو تم نے شاندار ضربیں لگائی تھیں۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ویسے تم بہت اچھے فائٹر ہو اشرف خان۔ کیا کسی مقامی اسٹاسے تربیت حاصل کی ہے تم نے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں پانچ برس جاپان رہا ہوں۔"

"گڈ۔" میں نے پرستائش انداز میں کہا۔

گل زمان جس مکان میں بند تھا اس کی کنڈی اندر سے چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے کرم خوردہ کواڑوں کی بڑی جھری سے آنکھ لگائی۔ اندر روشنی تھی۔

"دستک میں دوں گا۔ اشرف خان جب وہ آئے تو تم اپنا نام اور سیٹھ کا حوالہ دو گے۔ بولو گے کہ سیٹھ باہر انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے ہدایات دے کر کنڈی بجائی۔ تین چار مرتبہ بجانے پر اندر کا دروازہ کھلا تھا۔ میں جھری سے دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے؟" گل زمان نے نرم آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں اشرف، گل زمان!" اشرف نے میری ہدایات کے مطابق بتایا۔

"اشرف بچہ۔۔۔ کیا بات ہے بھائی؟"

"سیٹھ باہر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" اشرف نے بتایا اور دروازہ کھل گیا تھا۔

گل زمان نے جوں ہی چہرہ آگے بڑھایا، میرا مکا اس کی ناک پر لگا تو وہ خرخراتا ہوا الٹ گیا۔ "اندر چلو۔" اشرف خان، سیٹھ کے لیے مال حاصل کرنا ہے۔" میں نے اشرف کو دھکا دے کر اندر دھکیل دیا کیونکہ وہ ایک دم دو تین قدم دور ہو گیا تھا۔ گل زمان کہنیوں کے بل اٹھ رہا تھا کہ میری ٹانگ گھوم گئی۔ ہدف گردن رہی تھی۔ ضرب لگا کر میں نے اس کے پھڑکتے جسم کو گھسیٹ لیا۔ اشرف اندر سے بیگ لے کر جب نکلا تو میں نے بیگ چیک کیا اور پھر گل زمان کو کندھے پر ڈال لیا۔

چونکہ کار میں گل زمان کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی، اس لیے اسے نشستوں کے درمیان نیچے رکھ دیا گیا تھا۔ اشرف خان کو احتیاطاً فرنٹ سیٹ پر بٹھایا تھا ویسے بھی اس کا بازو درد کر رہا تھا اور پچھلی سیٹ پر اس کا بیٹھنا اذیت کا باعث بن سکتا تھا۔

"آپ لوگوں نے ترنول چیک پوسٹ کے بارے میں کوئی معاملہ طے کر رکھا ہے؟" اشرف نے پوچھا۔

"ہاں اگر درست پیش آئی تو معاملہ کر لیا جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا آپ کے علم میں ہے اسٹاف بدل دیا گیا ہے۔"

"ہاں۔" میں ہنس پڑا۔ "نیا اسٹاف آسمان سے تو نہیں لایا گیا۔ درست اصرف چہروں اور ناموں کا ہی فرق ہوگا۔"

"نہیں۔" وہ پلٹ کر بولا۔ "اس غلط فہمی میں نہ رہنا۔ انسپکٹر ہارون باپ کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔"

"باپ بے چارے عموماً ناکارہ اور بوڑھے ہوتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس لیے بگڑی ہوئی نسل کے بیٹے لحاظ نہیں کرتے لیکن صحت مند نوٹوں اور باپ میں فرق یقیناً انسپکٹر ہارون جانتا ہوگا۔"

"چلو آج یہ بھی تجربہ کر لینا۔" اشرف ناخوش گوار انداز میں بولا۔ "اگر ایسا وقت آ گیا تو میں دو صد ایمان دوں گا۔"

"بھئی ہم سب سیٹھ سلیمان کے آدمی ہیں۔"

"نہیں، میں اپنے باس کا نام نہیں لوں گا۔"

"ٹھیک ہے اپنے والد محترم کا نام لکھوا دینا۔"

وہ پھنکارتا ہوا پلٹا مگر میرا الٹا ہاتھ کی کار فوراً ہی دبک گیا تھا۔ آرام سے بیٹھو اشرف خان، ورنہ میں تمہیں چلتی کار سے نیچے دھکیل دوں گا۔"

دور سے ہی میں نے ٹارچ کی روشنی کا اشارہ دیکھ لیا تھا۔ سڑک بلاک کر کے وہ دونوں کھڑے تھے۔ کونر نے کار بڑے آرام سے ان کے درمیان روک دی تھی۔

"اپنے ماتحت کو بلاؤ۔" کونر نے چہرہ منڈاسے سے آزاد کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"آپ اپنی شناخت کروائیں جناب۔" بہادر ہی نے شائستہ لہجے میں کہا۔

کونر نے میری جانب گردن موڑ کر دیکھا کیونکہ اس کی اردو عاجز ہو گئی تھی۔ تب میں نیچے اترا اور مینٹ کی جانب چل پڑا۔ میں نے ہارکن کا سٹرس کارڈ ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر وہ انسپکٹر ہارون تھا تو اشرف خان نے سچ ہی کہا تھا وہ چہرے سے ہی سخت گیر لگتا تھا کرسی پر بیٹھا وہ لالٹین کی روشنی میں اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔

"السلام علیکم جناب!" میں نے جھک کر خدمتیانہ انداز میں سلام کیا۔

اُس نے چونک کر اُوپر دیکھا "گاڑی پاس کرانی ہے جناب!"

"کہاں سے آرہے ہو؟" وہ میرے سراپے کو گھورتے ہوئے بولا۔

"حسن ابدال سے جناب!"

"ٹھیک ہے چیک کراؤ ہو چلے جاؤ۔" اُس نے پھر اخبار پھیلا لی۔

"اگر چیک ہی کرانی ہوتی تو میں یہاں نہ آتا جناب۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر اُٹھا "یعنی تم... تم... چلو میرے ساتھ...!"

اُس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

"میں لڑنے نہیں بلکہ صلح کرنے آیا ہوں انسپکٹر صاحب!" میں نے اُس کا راستہ روک لیا "پستول واپس رکھ لیجیے۔ دوستانہ باتوں میں ہی سب کا بھلا ہوتا ہے۔"

"ہینڈز اَپ۔" وہ اچھل کر دُور ہوتا ہُوا دہاڑا "شیر علی گاڑی کو گھیرلو۔"

"کمال کے انسپکٹر ہیں آپ بھی۔" میں نے ہنس کر کہا "اِدھر تو ہاتھ جیب میں ڈالنے کی گزارش کی جاتی تھی انسپکٹر اور ہم جیب کا انتظام کر کے اِدھر آئے ہیں۔ بولو ایک کلو کے لیے کیا نذرانہ پیش کروں؟"

"بکواس بند کرو۔" وہ ریوالور تان کر آگے بڑھا اور میں دُبک کر پیچھے ہٹ گیا "میرا نام ہارون ہے، اِدھر آنے سے قبل کسی سے پوچھ لیتے تو بھی بہتر ہوتا۔"

میں نے ہارکن کا کارڈ اُس کے سامنے کر دیا۔ اُس نے کارڈ لے کر دیکھا اور پھر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھرتی چلی گئی تھی۔

"کیا آپ کے دائرہ اختیار میں یہ ڈرامہ بھی شامل ہے مسٹر ہارکن...؟" اُس نے مسکراتے ہوئے کارڈ واپس کر دیا۔

"اگر نہیں تو بھی آپ کو کالی بھیڑوں کی نشاندہی کرنا چاہیے۔ اگر آپ ایک ہفتہ قبل یہاں آتے تو آپ کو ہینڈز اَپ نہیں بلکہ ہینڈز اَن پاکٹ کا حکم دیا جاتا۔"

"مجھے چند منٹ پہلے میرے ساتھی نے انسپکٹر ہارون کے بارے میں بتایا تھا۔" میں اُس کے ساتھ مینٹ سے نکل کر بولا "لیکن مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ گندے تالاب میں اعلیٰ نسل کی مچھلی زندہ رہ سکتی ہے۔"

"خوبصورت تعریف کا شکریہ۔" انسپکٹر ہنستے ہوئے بولا "آپ لوگ بھی تو اسی تالاب میں زندہ ہیں۔ میرا تو ایمان ہے مسٹر ہارکن کہ گندگی ہر انسان کی سوچ میں ہوتی ہے۔"

اُس نے اپنے ماتحتوں کو ہاتھ کے اشارے سے ہٹا دیا اور پھر مجھ سے مصافحہ کر کے پلٹ گیا تھا۔ اشرف خان اُس کی طرف آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا جیسے اُسے یقین ہی نہ آرہا ہو کہ انسپکٹر ہارون بغیر تلاشی لیے کسی گاڑی کو جانے کی اجازت دے چکا ہے۔

"یہ کیوں اشرف خان یہی تھا نا انسپکٹر ہارون؟" میں نے اُس کے شانے کو تھپ تھپا کر پوچھا۔

"تم کوئی جادوگر ہو اور نہ انسپکٹر ہارون تو لاکھوں کو بھی ایک مارنے والا مشہور ہے۔"

"دیکھ لو میں نے تو اُسے صرف باتوں پر خرید لیا ہے۔"

"جب سے یہ اِدھر آیا ہے سڑک کے راستے مال آنا بند ہو گیا ہے۔" اشرف نے بتایا "اب پارٹیاں پیدل مال لاتی ہیں۔"

"اسی لیے تو تمہارے باس نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے۔" میں نے اپنی اہمیت جتائی "اب تم دیکھو گے ہم مال بائی روڈ بھی لایا کریں گے۔"

"پتا نہیں کیا ہو تم؟" وہ کندھے اُچکا کر بولا۔

"یہ آدمی مرگیا ہے چیف۔" سولنے میرے کان میں قدرے سرگوشی کی اور میں نے جھک کر گل زمان کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کی کلائی سرد ہو دھڑکن سے آزاد ہو چکی تھی۔ میرا بدن بھی جھرجھرا گیا تھا اگر انسپکٹر ہارون جھانک کر دیکھ لیتا تو ہارکن کا کارڈ بھی بے اثر ہو سکتا تھا۔ وہ ہمیں قریب تین تھانے میں بند کر دیتا اور بات بڑھ جاتی۔

میں حیران تھا، وہ شخص آنا فانا مر مفلوج ثابت ہوا تھا کہ ایک لات کی ضرب بھی برداشت نہ کر سکا تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر سر کو جھٹکا دیا اور سوچ کو دوسرا زاویہ دے دیا۔ گل زمان انسان نہیں زہریلا ناگ تھا اور ناگ کی موت پر انسان کو کوئی دُکھ نہیں ہونا چاہیے لیکن سوچ کا زاویہ از خود بدل جاتا تھا اور میں پشیمان سا ہونے لگتا کہ ایک زندگی کا چراغ میری پھونک سے بُجھ گیا ہے۔ بُرے انسان کے خاندان میں وفا شعار بیوی ہوگی، معصوم بچے ہوں گے وہ انتظار کرتے رہیں گے لیکن ناگ کو بِل سے نکلتے وقت سوچ لینا چاہیے کہ باہر جن راستوں پر وہ جا رہا ہے اُس راستے پر کوئی انسان اُس کا سر بھی کچل سکتا ہے۔

جب مادام سعدیہ کی سفارش سے مجھے اپنے وطن کی خدمت اور بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے منتخب کیا گیا تو میں نے مسٹر گراہم کو واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر مجھ سے وہی کام لیا جانا مقصود ہے جو وہاں پولیس اور دیگر ادارے سر انجام دے رہے ہیں تو آپ لوگ وقت اور دولت ضائع کریں گے کیونکہ اگر وہ طریقہ کار مؤثر ہوتا تو اسٹریٹ پولیس کے بڑوں کو ایک الگ تنظیم بنانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں نے مسٹر گراہم سے کہا تھا کہ جناب عالی! بیوں کی شاخیں اور پتے ضائع کرنے سے راستے صاف نہیں ہوں گے۔ ہر برسات اور موسم بہار میں نئی شاخیں

پھوٹ پڑتی ہیں اور کانٹے پھر بکھرنے لگتے ہیں اگر مجھے نئے طریقہ کار کے انتظامی کے ساتھ تعینات کیا جا رہا ہے تو میں بیوں کے درختوں کو تلاش کروں گا اور تنے ہی نہیں بلکہ جڑوں سے کھود کر گرا تا چلا جاؤں گا۔ مسٹر گراہم نے مجھ سے اتفاق ہی نہیں بلکہ میرے دائرہ اختیار میں میری تجویز کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ مجھے خاردار درختوں کی بیخ کنی کی مکمل آزادی دے دی تھی۔

اس لیے اگر گل زمان جیسا خاردار درخت میرے ہاتھوں اُکھڑ گیا تھا تو کوئی قابلِ گرفت بات نہ تھی۔

جب کار کینٹ ایریا میں داخل ہوئی تو میرے ذہن سے تاسف کی دُھند چھٹ چکی تھی۔ میں نے خود کو یقین دلا دیا تھا کہ میرے پاؤں میں پڑی ہوئی لاش انسان کی نہیں بلکہ دشمن انسانیت کی نعش اخگر لاش ہے۔

"اشرف خان اب تم گائیڈ کرو گے۔" میں نے التجائیہ انداز... میں کہا "گل زمان کے بارے میں فیصلہ اب تیرا باس کرے گا کیونکہ اُسی کے حکم پر اسے اُٹھانا پڑا ہے۔"

"اگر یہ حکم میرے باس کا ہی ہے تو مجھے تعجب ہے۔" اشرف نے جواب دیا "سیٹھ سلیمان صرف منشیات کے بزنس میں موثر ہے وہ جسم اور دیگر طریقہ کار کو کبھی پسند نہیں کرتا۔"

"حالات کے ساتھ انسان بدلتا رہتا ہے دوست!"

"شاید تم ہی نے اُسے رائے دی ہوگی۔"

"یہی ایک انداز تمہارا دوست ہے اشرف خان واقعی یہ میری ہی تجویز تھی۔"

"تو پھر میری یہ بھی پیش گوئی نوٹ کر لو کہ اس کا چہرہ بہت جلد بے نقاب ہونے والا ہے۔"

"پیش گوئی اُسے سُنانا شاید ڈر جائے۔" میں نے قہقہہ لگایا "میں چہرے پر نقاب چڑھانے کا عادی ہی نہیں ہوں اگر سیٹھ سلیمان کے چہرے پر کوئی نقاب ہے تو اُسے اُترنا چاہیے چہرہ ایک ہی اچھا رہتا ہے۔"

"کیا تم نے لالہ زار کا کوئی دیکھی ہے؟" اشرف نے کونز سے پوچھا اور کونز نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"یہ میرا دوست اور گاہک ہے۔" میں نے بتایا "اسی کے لیے میں تمہارے باس سے مال خرید رہا ہوں۔" پھر میں نے کونز کو انگریزی میں کار روکنے کے لیے کہا۔ اُس نے کار روکی تو میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی حالانکہ کونز اس کی کوٹھی سے بھی واقف تھا لیکن میں اشرف کا ذہن آزاد نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لالہ زار کی اُس کوٹھی تک وہ میں بائیں کے چکر میں ذہنی طور پر مصروف ہی رہا تھا۔

اگر وہ نچلے طبقے کے لوگوں کا کوئی محلہ ہوتا تو کتنے ہی لوگ باہر گھومتے دکھائی دیتے لیکن وہ بڑے لوگوں کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں یہی وجہ تھی کہ سڑکیں ویران تھیں۔

"مسٹر کونز!" میں نے اُترنے سے قبل کہا "اندر صرف ہم تینوں جائیں گے۔ آپ کو کوالٹی دیکھنی ہے اور میں تول کر پیکٹ بنواؤں گا۔"

"میں گیٹ کھولوا تا ہوں۔" اشرف اُترتے ہوئے بولا "میں نے سگریٹ جُنبش دے کر اُس کی تائید کر دی تھی۔

اُس نے گیٹ پر نصب برقی بٹن کو دبایا۔ معلوم نہیں گھنٹی کی آواز پر کتا بھونکنے لگا تھا یا اشرف کو دیکھ لیا گیا تھا۔ ایک بھیڑیا نما السیشن کتا بھونکتا ہُوا گیٹ تک آیا۔ اشرف نے اُسے پچکارا تو وہ پیار سے پُوچھ کپ کرتا گیٹ پر پنجے مارنے لگا۔

تیسری گھنٹی پر اندر سے ایک شخص دوڑتا ہُوا آتا دکھائی دیا۔ اُس کے ہاتھ میں ڈبل بیرل گن تھی اور وہ خود بھی گرم سے متاثر لگتا تھا۔

اس سے قبل کہ وہ گیٹ تک آتا اور اشرف خان سے بات کرتا میں بھی اشرف کے قریب جا کھڑا ہُوا تھا۔ میں اشرف کو کوئی چال کا دکھانے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔

"گیٹ کھولو مولا داد۔" باس نے مال دیکھنے کے لیے کہا ہے۔" میں نے اشرف نے کہا۔

"لیکن مجھے ایسا حکم نہیں ملا اشرف صاحب!"

"کیا میں حکم کا درجہ نہیں رکھتا؟"

"ٹھیک ہے۔" میں فون پر گنگناتا ہُوا مولا داد پہاڑ آواز میں بولا "کیا آپ کو نہیں معلوم کہ کچھ لوگ باس کو پریشان کر رہے ہیں؟"

"ٹھیک ہے برادر۔" میں نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا "آپ اپنا فرض نبھائیں۔" وہ جونہی پلٹ کر دو قدم ہی گیا تھا کہ میں نے اُسے آواز دے کر روک لیا "ایک نمبر لے جائیں اس پر میرا پیغام پہنچا دیجیے گا، ورنہ وہ پریشان ہوگی۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور رسید کا کونہ پھاڑ لیا۔ مولا داد نے چٹ لینے کے لیے گرل سے ہاتھ باہر نکالا تو میں نے اُس کے ہاتھ کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اُس کا جسم گیٹ سے ٹکرایا۔ ابھی اُس کی آواز حلق کی پہنچائی پر ہی تھی کہ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی گردن دبا لی تھی۔ کونز نے سچویشن کو بروقت سنبھال لیا تھا ورنہ اشرف خان کوئی حرکت کر کے کھیل کا پانسہ پلٹ دیتا۔

میں نے اُس کی گردن تب چھوڑی تھی جب اُس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبل اور زبان ہونٹوں سے جھانک کر لٹک آئی تھی جب وہ میری گرفت سے آزاد ہُوا تو گیٹ کے ساتھ ہی اوندھا ہو گیا تھا۔

قفل کی چابی اُس کی واسکٹ کی جیب میں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اب کہتے کو تم سنبھالو گے اشرف خان" میری آواز میں درندگی نمایاں تھی "ورنہ بے زبان کو خاموش کرنے کا فیصلہ میرے لیے تکلیف دہ ہوگا۔"

"نہیں" وہ غرایا "اب میں تمہارا کھیل پوری طرح سمجھ چکا ہوں۔"

"پھر..." میرے حلق سے سفاک غراہٹ ابھری "تعاون کا انعام زندگی ہے اشرف خان۔" میں نے جھپٹ کر اس کی گردن بازو کے شکنجے میں کس لی۔ "اب اگر تم نے آواز نکالی تو گردن ٹوٹنے کی آواز بھی نہ سن سکو گے۔"

کونزنے چابی لے کر تالا کھول دیا تھا۔ کتا بدستور طوفان مچائے ہوئے تھا۔ "مجھے چھوڑو" میں اسے سنبھالتا ہوں۔" اشرف نے کہا۔ "سنو سلطان خان! مجھ جیسے لوگ صرف اپنی ذات کے وفادار ہوتے ہیں مگر مجھے زندگی دے دو تو میں اپنی وفاداری تمہاری طرف کر دوں گا۔ سلیمان کے پاس جانے کے قابل بھی نہیں رہا ہوں۔"

"چلو پہلے وفاداری کا ثبوت دو۔" میں نے اسے دھکیل دیا اور گیٹ کھول کر وہ اندر چلا گیا۔ اس نے کتے کا پٹہ پکڑ لیا۔ ویسے بھی کتا اسے دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

"اس کو کہیں باندھ دو۔" میں نے اندر داخل ہو کر گیٹ بند کرتے کہا۔

کونزنے مولا داد کو گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ کر دیا اور میرے ساتھ چلتا ہوا بولا۔ "اس کا خیال رکھنا چیف۔" میں نے اس کا ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

تمام کمرے تاریک تھے اگر نگران تہ خانے کا دروازہ کھلا نہ چھوڑ جاتا تو ہمیں خاصی پریشانی ہوتی۔ تہ خانہ کچن کے ساتھ تھا مگر اس کا دروازہ بند تھا لیکن نٹ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اندر روشنی تھی۔ کونزنے اشرف خان کے پیچھے میں رہا تھا مگر ریوالور اس نے جیب میں رکھ لیا تھا لیکن اشرف کو معلوم تھا کہ اسے کور کیا ہوا ہے۔ وہ تہ خانے میں اترتا چلا گیا تھا۔

تہ خانے کے فرش پر شاپنگ بیگ بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ گتے کے کارٹن اور ڈبے سیدھے پڑے تھے۔ کونے پر ایک کلو کا پتھر تھا اور دوسرے پلڑے میں چرس کی ٹکیاں تھیں۔ غالباً وہ تول کر پیکٹ بنا رہا تھا۔

"یہ ڈبے؟" اشرف نے پاؤں سے اشارہ کیا۔ "ہیروئن کے ہیں اور ادھر چرس ہے۔" میں نے ایک ڈبہ اٹھا کر کھولا اور سونگھ کر رکھ دیا۔ بند ڈبوں کی تعداد کئی تھی یقیناً پیکنگ ہمارے لیے کی گئی تھی۔ یعنی ایک لاکھ کی ہیروئن کا ایک پیکٹ بنایا گیا تھا۔ مارکیٹ ریٹ ان لوگوں کو ہی معلوم تھا لہٰذا مجھے تردد میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی۔

"سارا مال پیک کرو۔ مائیکل۔" میں نے کونز سے کہا۔ اشرف چپ چاپ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کونز نے تین کارٹنز میں چرس کے بلاک بھرے اور ایک بڑے کارٹن میں ہیروئن کے ڈبے جمانے لگا۔ ایک شاپنگ بیگ میں ہیروئن الگ رکھی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ایک کروڑ کا مال رہا ہوگا۔

"گوالنڈی کے گودام میں کتنا مال ہے اشرف خان؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ تمہاری تنگ ہوں میں آجانے کی وجہ سے خالی کر دیا گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اگر تم دوستی کی باوثوق ضمانت دو گے تو میں دوسرا اسٹاک بھی بتا دوں گا۔"

"کس قسم کی ضمانت چاہتے ہو؟"

"دس پندرہ روز مجھے ساتھ رکھو اور دوستانہ ماحول میں برابری کا سلوک کرو گے تو میں مطمئن ہو سکتا ہوں۔"

"وفاداری کی ضمانت مجھے بھی تو چاہیے اشرف خان! برابری کے سلوک میں تمہیں آزادی بھی دی جائے گی اور آزادی کی نگرانی نہ ہونے کی صورت میں تم بھی تو کچھ کر سکتے ہو۔"

"ہم دونوں کو بہ کیفیت ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایک جتھہ کر دوں گا۔" میں نے ایک متقل الماری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں اس الماری کو دیکھ لوں۔" اشرف بھی دوسری الماری کے نزدیک چلا گیا۔ "الماری مقفل تھی۔ میں نے تالا دیکھ کر الٹی سرکل تالا تھا۔ تب ریوالور نکال کر میں نے تالے کی باڈی پر نال رکھی۔ اسی میری انگلی ٹریگر پر دبی ہی تھی کہ تہ خانہ ایک دھماکے سے گونج اٹھا۔ میں نے پھرتی سے خود کو نیچے گرایا اور پھر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اشرف کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ شاید بائیں ہاتھ سے اس نے پہلی بار فائر کیا تھا اور نہ گولی ہدف سے ہٹ کر لگتی چند سیکنڈ کا ہی وقفہ رہا ہوگا کیونکہ میں نے گرتے ہی پوزیشن سنبھال لی تھی اور اشرف کو نشانہ بنا لیا تھا۔ گولی اس کے حلق میں لگی تھی اور وہ جھرجھری لیتا ہوا دیوار کے ساتھ گرتا چلا گیا۔

جب کونز چونکا تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔ چند سیکنڈ کا ہی تو کھیل تھا مجھے بس اتنی ہی دیر لگی تھی۔ میں برق رفتاری سے نیچے دوبا تھا اور ڈوبتے ڈوبتے فائر جھونک دیا تھا۔ اشرف کی گولی میری گردن کو چاٹتی ہوئی الماری کے پٹ میں پیوست ہو گئی تھی اگر وہ کونز کو نشانہ بناتا تو وہ جھکا ہوا بہترین ہدف ثابت ہوتا۔ وہ اس کے قریب بھی تھا۔ اگر وہ جلد بازی سے کام نہ لیتا تو میں نے اسے کچھ دن ساتھ

رکھ کر آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر واقعی سلیمان سیٹھ کے پاس کوئی اور ڈیل تھا تو میں اشرف کے تعاون سے اس ڈیل میں بھی داخل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس کا وقت مقرر تھا تب ہی اس نے حماقت کر ڈالی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا چیف۔" کونز بولا۔ "اس کا خیال رکھنا۔"

"کیا میں نے خیال نہیں رکھا؟" میں نے الماری کے قفل پر نال رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ الماری کھلی تو میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ سامنے رکھے پینے کا سامان تھا۔

"چلو کونز اب نکل جانا چاہیے۔" ایک کارٹن میں نے اٹھا لیا اور جیب سے راگ رنگ ہوٹل کا بیج نکال کر کونے میں اچھال دیا۔ یہ بیج میں نے رنگ باز خان کی میز سے اٹھایا تھا۔

کارٹن ڈکی میں رکھ کر میں نے اچٹتی نگاہ دائیں بائیں ڈالی۔ ہر سو ویرانی اور خاموشی کا راج تھا۔ کونز سگریٹ کو مقفل کر کے خون ہی چوما کار میں بیٹھ گئی تھی۔

"کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی چیف۔" سلیمانے پوچھا۔ "فائرنگ کی آواز سن کر ہم پریشان ہو گئے تھے۔ بارکن اور میں اندر گئے تھے لیکن بھاگ کر واپس چلے آئے تھے۔"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اشرف کے حلق میں خارش اٹھی آئی۔"

وہ رات میں نے جس رہائش گاہ میں بسر کی تھی۔ کامیاب آپریشن کی رپورٹ ٹیلی فون پر مین کو دے دی گئی تھی۔ مدثر یہ بھی جانتی تھی۔ اس نے میرے لیے پیغام دیا تھا کہ ناشتا سب کے لیے تیار کیا جائے گا۔ لیکن ناشتے کی میز پر صرف میں پہنچا تھا۔ ساتھیوں کی میز ناشتے سے زیادہ ضروری تھی۔ ان کو سوتا چھوڑ کر میں خاموشی سے نکل گیا تھا۔ ان کو اطمینان سے آرام کرتا تھا۔ میں بہت مصروف رہنا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے وزیر داخلہ کو ذاتی فون کیا۔ [illegible] کہ بڑا آدمی سمجھ رہا ہوگا یا ہاتھ روم میں ہوگا لیکن ان کی [illegible] محسن کر خوش ہوئی تھی بڑا آدمی ایسے وقت والے شخص کی [illegible]

[illegible] محترم میں کہ آپ کا خادم محترم سلطان [illegible] میں نے عقیدت [illegible] تھا۔ اتنی سویرے آپ کو زحمت دینے پر شرمندہ ہوں [illegible] کوئی بات نہیں بیٹے۔" انہوں نے پیار سے جواب دیا۔ [illegible] میں نہیں مسلمان ہیں اور قرآن کی تلاوت جماعت کے ساتھ [illegible] وہ دس بجے [illegible] کیسے پوچھا۔

"محترم کی اجازت لینا چاہتا ہوں۔" اب [illegible]

"کیا میری طرف سے یہ پابندی ہے؟"

"نہیں جناب۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن آپ کی مصروفیات کے پیش نظر یہ ضروری ہے۔"

"میرے پاس دو گھنٹے ہیں۔ بیٹے آؤ میں ناشتے پر انتظار کروں گا۔"

"اوہ نہیں سر۔" میں نے بتایا۔ "میں ناشتا کر چکا ہوں۔ آپ میرا انتظار نہ کریں۔ میں آرہا ہوں۔"

میں نے ریسیور رکھا تو رشیدہ نے ناک سے شوں کی آواز نکال کر اپنی موجودگی کا اعلان کیا۔ "کیا بات ہے۔ تمہاری ناک مرچ بنی ہوئی ہے؟" میں نے اس کی سرخ ناک چٹکی میں بھر لی۔ "ہر وقت شوں شوں کرتی رہتی ہو۔"

"نزلہ!" اس نے بتایا۔ "جاؤ پہلے ہاتھ دھو آؤ ورنہ تم بھی شوں شوں میں مبتلا ہو جاؤ گے۔"

"نہیں۔" میں نے اس ہاتھ سے اپنی ناک مسل ڈالی۔ "میں نزلہ پروف ہوں۔"

"تم تو نہ جانے کیا کیا پروف ہو۔" وہ میرا پیٹ اڑاتے ہوئے بڑبڑائی۔ "لیکن میں بزدل سی ہو گئی ہوں۔ میں جیسے اس رشیدہ سے کٹ گئی ہوں جو اُدھر تم نے دیکھی تھی۔ اب تو صرف لڑکی ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہونے والی لڑکی۔ رات تم نہیں آئے اور ٹیلی فون کے پیغام تک میں ڈرتی رہی تھی۔ لوگ کہتے ہیں اصرف اپنے خون کی خوشبو ہوتی ہے۔ اپنا خون ہی جسن محسوس کرتا ہے لیکن میرا تجربہ خون کے رشتوں کی نفی کرنے لگا ہے۔ میں تمہاری کچھ نہیں ہوں۔ میرا تعلق مسٹر بیگن سے بھی خون بازی کا نہیں لیکن محبت کا اور وہ بھی ہے جو بہن اور بیٹی کو ہوتا ہے۔"

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ اتنی گہری گہری سوچوں میں نہ ڈوبا کرو۔ میں بہن اور بیٹی کی طرح خوش رہا کرو۔"

"تم مجھے بتاتے کیوں نہیں ظالم۔" وہ رونے لگی۔ "مجھے بتا دو۔ تم ہمیں ہو جو خاموش کرتے ہو۔ تم جیسا اور ڈیڈی جیسے انسان بڑے نہیں ہو سکتے۔ میں بڑے لوگوں کی ٹھوکروں اور زیادتی سے آشنا ہی ہوں۔ تم لوگ بڑے نہیں ہو سکتے۔"

"ہاں نہیں ہو سکتے مگر صرف اپنوں کے لیے۔" میں نے اس کے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا اور بالوں کو تھپتھپاتا ہوا باہر نکل گیا۔

بیگن حسب معمول تھپے سے گوڑی کر رہا تھا۔ خاکر میں نے کہہ دیا تھا کہ اس کی رہائش ترک کر دی جائے لیکن اسے پودوں سے بڑی محبت تھی اور پولو رول نے بھی اس کی محبت، توجہ اور محنت کو مایوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ کیا تھا۔

"ماسٹر! میں نے قریب جا کر اُسے متوجہ کیا "دس بجے تک آپ کو یہ جگہ بہر صورت چھوڑنی ہوگی۔"

"بہتر!" اُس نے گوڈی کرتے ہوئے جواب دیا "میں بھی الوداعی پیار کر رہا ہوں۔ ہم نے سامان پیک کر لیا ہے صرف برتن باہر ہیں اگر خطرہ نزدیک ہو تو دس بجے سے پہلے ہی نکل جائیں گے۔"

"خطرہ فائر بریگیڈ والوں کی طرح گھنٹیاں بجاتا نہیں آیا کرتا، ماسٹر!" میں نے قدرے ترش روئی سے کہا "سیٹھ سلیمان زیادہ دیر بے خبر نہیں رہے گا۔ ایک لاش کھلی جگہ پڑی ہے کوئی بھی کپاؤنڈ والی یا چھت سے لاش دیکھ سکتا ہے۔ سلیمان تو شاید لاش کا وارث نہیں بنے گا... مگر اُس کا دھیان میری طرف ضرور آ سکتا ہے اور یہ قیام گاہ اُس کی نگاہوں میں آ چکی ہے۔"

"آٹھ بجے ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔" اُس نے کھرپا کیاری میں پھینک دیا "آپ اندر چلیں، برتن پیک کروائیں، میں ٹرک لے کر آتا ہوں۔"

"آپ رشیدہ کو کہہ دیں۔" میں چل پڑا "میں وزیر داخلہ سے ملنے جا رہا ہوں پھر خان سے ملاقات ہوگی اگر سلیمان باخبر ہوگیا تو اُس کو بھی ٹھکیاں دینے جانا پڑے گا۔ منہ چھپانے سے بہتر ہے۔ حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی جائیں۔ رشیدہ کی خاطر سلیمان کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔"

"کیا مطلب؟" مگر چلتے چلتے ایک دم پلٹ کر جھرجھراتی آواز میں بولا "سلیمان اور رشیدہ...؟"

"تعلق ہے انکل!" میں مسکرانے لگا "فارغ وقت میں بتاؤں گا۔" وہ سر کو جھٹکتا ہوا واپس مڑا اور میں لان سے نکل کر پورچ میں داخل ہوگیا تھا۔

میں نے جونہی کار گیٹ کے سامنے روکی، نگران سپاہی کیبن سے نکل کر دوڑتا ہوا آیا۔ وزیر محترم اپنی کار کے قریب کھڑے تھے۔

"آپ کا نام خرم سلطان ہے جناب؟" سپاہی نے جھک کر پوچھا اور میں نے آنکھوں کو اثباتی تھرتھراہٹ دی۔ وہ دوڑتا ہوا واپس گیا اور گیٹ کھول کر مجھے کار بڑھانے کا اشارہ کر دیا۔

میں نے کار چند گز دور روک دی اور جب میں اُترا تو وزیر داخلہ صاحب نے خندہ پیشانی سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہاتھ ملا کر وہ چل پڑے تھے۔ گیسٹ ہال سے گذرتے ہوئے وہ اپنے آفس میں داخل ہوئے تو ٹیبا پر چائے کے برتن سجے ہوئے تھے۔

"بیٹھ جاؤ خرم سلطان اور میرے لیے چائے بناؤ۔ میں جمع صرف دس یا پندرہ منٹ لوں گا۔" وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے کوئی اُتار کر اُن کے لیے چائے تیار کی اور دوسرے کا ڈونگا، پلیٹ اور چمچ اُن کے سامنے رکھ دیے۔ "اب اپنے لیے بنا لو اور بتاؤ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے جب اپنی کارروائی کی رپورٹ شروع کی تو وہ کھانا بھول کر ٹیبل پر کہنیاں ٹیکے بچے گھورنے لگے تھے۔ میں نے صرف طریقہ کار بتایا تھا اُن کو اگر بتا دیتا کہ اس طریقہ کار نے تین جانیں بھی لے لی ہیں تو شاید وہ خوش نہ ہوتے اور مجھ پر کچھ پابندیاں لگا دیتے کیونکہ اُن کی سوچوں کا انداز وہ نہ تھا جو میری سوچوں کا رنگ تھا۔

"حیرت انگیز اور شاندار کامیابی تم نے حاصل کی ہے۔" وہ پُرجوش اور خوش گوار آواز میں بولے "میں نے صدر محترم سے بات کی تھی۔ وہ اس معاملے پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ تم یہ رپورٹ اور آئندہ رپورٹ بھی تحریری دو گے۔ میں ایک کاپی صدر محترم کی خدمت میں پیش کر دیا کروں گا میں حیران ہوں خرم سلطان! تم نے منفرد راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اُن کے اندر جا کر پھٹ رہے ہو۔ یہ لوگ اس طرح تباہ ہو سکتے تھے پولیس اور دوسرے اداروں کا طریقہ کار وہی روایتی رہا ہے۔ تعاقب کرو اور چھاپہ مارو۔ اس طرح ہمیں سوائے بدنامی اور ناکامی کے کچھ نہیں ملا۔"

"بہتر جناب! میں تحریری رپورٹ پیش کروں گا۔" میں نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا "میری درخواست ہے کہ ایک مخصوص بجٹ کے تحت اکاؤنٹ کھولا جائے۔"

"یعنی اس پروجیکٹ کے اخراجات کے لیے؟"

"نہیں سر!" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بتایا "میں اخراجات اپنی مدد آپ کے تحت پورے کر رہا ہوں۔ میرا پروگرام کچھ دوسرا ہے۔ میں چاہتا ہوں جو رقم نقد حاصل ہو اُسے سرکاری خزانے میں نہیں بلکہ ایک فنڈ میں جانا چاہیے اور اُس فنڈ سے منشیات سے متاثر لوگوں پر خرچ کیا جائے۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس ایسے ڈاکٹروں کی کمی ہے جو نشے کے عادی لوگوں کا نفسیاتی اور جسمانی علاج کر سکیں۔ ہم اپنے ڈاکٹروں کو اس فنڈ سے تربیت دلوا سکتے ہیں۔ بے کار اور مفلوج نوجوانوں کو علاج کے بعد کام دے سکتے ہیں۔ یہ دوا ہمارے تعلیمی اداروں میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کا اندراج کیا جا سکتا ہے۔ منشیات کے خلاف اور تباہ کاریوں سے بچنوں کو روشناس کرانے کے لیے درس کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔"

"لیکن فنڈ میں اضافہ کیسے ہوگا کیا تم لوگ ڈاکے مارو گے؟"

"دیکھیے سر! منشیات کا دھندہ کرنے والے کوئی معمولی قسم کے لوگ نہیں ہوتے۔ اس دھندے میں بڑے بڑے صنعت کار، سرمایہ دار اور بین الاقوامی معیار کے غنڈے ہیں۔ ان سے قانون اور رحم جیسے انسانی کو سمجھ روی ہے اور نہ ہی محبت... اگر صفائی سے اُن کو لوٹنا ڈاکے کے زمرے میں آتا ہے تو میں کھلے دل سے اعتراف کروں گا میں ایسے ڈاکے

ضرور ماروں گا۔"

"بیٹے... میرے بیٹے..." وہ بھرائی آواز میں بولے "یہ سوچیں کہاں سے لائے ہو؟"

میں نے مسکرا کر چہرہ جھکا لیا تھا۔ میں اُن کو کیسے بتاتا کہ بُرے راستے کی ٹھوکروں اور انسان نما درندوں کے قلم نے مجھے سوچنے کے یہ انداز دیے ہیں۔ یہ اصول کی نفی تھی۔ لوگ تو نیک، مجلس اور روشن راہوں سے بچ بچ کر نکلتے ہیں مگر مجھے بُرائی کی آگ نے جلا کر نئی شخصیت دی تھی۔

"ٹھیک ہے ہیڈ بھی الاٹ ہو جائے گا اور اکاؤنٹ بھی کھل جائے گا۔" انھوں نے چائے کا سپ لے کر کہا "یہ سب کچھ جان کر صدر محترم تم سے ملنا پسند فرمائیں گے۔ وہ اچھے لوگوں کے بڑے قدر دان ہیں۔"

"مجھے گناہ ہی رہنے دیں سر! ورنہ نشہ میری سوچوں کا رنگ بدل دے گا۔ میں کسی پر احسان کر رہا ہوں نہ مجھے ستائش اور انعام کا لالچ ہے۔ میں نے خود کو انسان دوستی کے لیے وقف کر دیا ہے۔"

"تمھاری مرضی۔ ہاں اب گھر کی طرف سے مطمئن ہو نا؟"

"کیا ایسا شخص مطمئن ہو سکتا ہے سر!" میں نے شاکی لہجے میں جواب دیا "جس کے دشمن آزاد گھوم رہے ہوں۔ فاروق چوہدری کا بڑا بھائی مظفر چوہدری بھی اس آگ میں کود پڑا ہے جناب!"

"ہاں مجھے ملک صاحب نے رپورٹ دی تھی کیا وہ ابھی تک مفرور ہے؟"

"ہاں جناب! میرا لہجہ زہریلا ہوگیا "قانون کے محافظ جسے مفرور رکھنا چاہتے ہوں وہ کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔ اُسے پولیس نے خود فرار ہونے کا موقع فراہم کیا تھا۔"

"اُوہ... ٹھیک ہے خرم سلطان!" انھوں نے دراز سے پنڈ نکال کر کچھ نوٹ کیا "تم بے فکر ہو۔ میں اپنی ذمے داری محسوس کر رہا ہوں اور تم دیکھو گے، قانون کی بالادستی کیسے قائم ہوتی ہے؟"

"شکریہ جناب!" میں نے ممنونیت سے کہا "آئی جی صاحب سے مجھے ایک شکایت ہے انھوں نے میرا ذاتی ٹیلی فون نمبر ڈی آئی جی کو دے دیا ہے اور موصوف نے کچھ نرم نرم دھمکیاں بھی دینی شروع کر دی تھیں۔ ہمارے درمیان ایک بات طے ہو چکی تھی سر! اس طرح تو میری ذات نچلی سطح تک گرتی چلی جائے گی اور شہر کے تمام بڑے عناصر میری تلاش پر لگ جائیں گے۔"

"میں اُس سے جواب طلب کروں گا۔" وہ دھیمی آواز میں بولے "میں نے ملک کو بتا دیا تھا کہ صرف تین آدمی خرم سلطان کے نام اور کام سے آگاہ رہیں گے۔"

"میں خود بھی جوابی کارروائی کر سکتا ہوں جناب... لیکن میں قانون کے بڑے محافظوں کا احترام کرنا چاہتا ہوں اگر ہم آپس میں ہی اُلجھ گئے تو اصل مقصد متاثر ہو سکتا ہے۔ یہاں بہت سے بڑے آفیسر زبان میں کسی کا نام نہیں لے سکتا لیکن سیٹھ سلیمان اور رنگ باز خان جیسے لوگوں سے اُن کے گہرے مراسم ہیں۔ اندر کی باتیں اُن کو بتاتے ہیں، خطرے کے الارم بجا دیتے ہیں اور وہ لوگ بلوں میں دُبک جاتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں بیٹے۔ لیکن مایوس نہیں ہوں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں نیک خو شمر راہ دیا ہے، اس طرح تم جیسے نوجوان بھی اُسی کا انعام ہیں۔ خیر و شر کی جنگ تو ازل سے لڑی جا رہی ہے اور تم اتفاق کر دو گے فتح بالآخر خیر کو ہی نصیب ہوتی رہی ہے۔"

"اب مجھے اجازت دیجیے جناب!" میں اُٹھا تو وہ بھی کھڑے ہو گئے پھر گاڑی تک میرے ساتھ ساتھ گئے تھے اور مجھے احتیاط کی تلقین اور دُعائیں دیتے رہے تھے۔

میرے سامنے دن بھر کی مصروفیات تھیں اور سرفہرست دونوں شکار تھے۔ ایک دس لاکھ کے لیے ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر میری راہ دیکھ رہا تھا اور دوسرا اگر آتا بے خبر نہ تھا تو بوٹیاں نوچ رہا ہوگا۔ مجھے سامنے جا کر دونوں کو مطمئن کرنا تھا۔

گل زمان کی لاش بھی اگر میں سلیمان کی جھولی میں ڈال آتا تو پھر اُس کے لیے جمع تفریق کر کے جواب حاصل کرنا مشکل نہ رہتا کیونکہ گل زمان کے ٹھکانے سے اشرف خان واقف نہ تھا۔ سلیمان مجھے ہی ساتھ لے گیا تھا اگر گل زمان کی لاش اشرف خان کے ساتھ ملتی تو اُس کا دھیان صرف سلطان کی طرف ہی اُٹھ سکتا تھا۔

اس کے باوجود اگر وہ صرف خوب رُو نوجوان ہی نہ تھا تو ذہن سے کڑیاں ملا سکتا تھا جب کہ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے رنگ باز خان سے رہ چکا ہے اور اُس کے نزدیک رنگ باز خان ان دنوں اُس کے اڈوں کی نگرانی کروا رہا تھا۔

میں نے تو منصوبہ بندی میں کوئی جھول اور سوراخ ایسا نہ چھوڑا تھا لیکن جنگ میں حریف کو کمزور سمجھنا ہی دانش مندی نہیں ہوتی۔ میں اگر منصوبہ بنا سکتا تھا تو کوئی دوسرا بھی میرے خطوط پر چل کر منصوبے کے دھاگے بکھیر سکتا تھا۔

بہر طور مجھے دونوں کا سامنا کرنا تھا اور میں نے ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ میں نے جو لائحہ عمل اپنایا تھا۔ اُس میں چھپ کر وار کرنے کی تو گنجائش تھی لیکن وار کر کے روپوش ہونے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ روپوشی کا مطلب تھا اُن لوگوں سے قطع تعلق کر لیا جاتا۔ جب کہ میں بقول وزیر داخلہ اُن کے اندر جا کر پھٹ رہا تھا۔

جب میں کوٹھی میں داخل ہوا تو جن کو گہری نیند میں چھوڑ گیا تھا وہ اُجڑے ہوئے لان کی تدوین میں مصروف تھے، کیاریاں بنائی جا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چکی تھیں۔ کونز کیا دیکھ رہا تھا اور ہارکن پائپ سے پانی دے رہا تھا۔

"کوئی پیغام ہے؟" میں نے کیاریوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ماسٹر کو شٹنگ میں مدد کی ضرورت تھی۔" ہارکن نے بتایا۔ "ہنٹ اور سلو چلے گئے ہیں۔"

"کچھ پودوں کا بھی انتظام کیا تم لوگوں نے...؟"

"ہمارا کام زمین کی تیاری تک ہے۔" ہارکن بولا۔ "پودے وغیرہ ماسٹر لائیں گے۔"

میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اندر گیا۔ ایک کمرے میں گتھن کی لکیروں کے کاغذ بکھرے ہوئے تھے اور اخبار پر ڈبل روٹی کے چند ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے بے سروسامانی کی حالت میں یقیناً مکھن سے ہی ناشتا کر لیا تھا۔

لیسیور اٹھا کر میں نے رنگ باز خان کا ذاتی نمبر ٹرائی کیا۔ اس کی ملازمہ نے کال سنی تھی اور مجھے بتایا گیا تھا کہ خان بچیوں کو کالج چھوڑنے گیا ہے۔ میں نے نام بتائے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا اور سلیمان کا نمبر ڈائل کیا۔ پھر کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ پونے دس بجنے والے تھے۔ سلیمان نو بجے اپنے آفس چلا جاتا تھا۔

"پی اے ٹو ایم ٹی۔ آپ کون ہیں جناب؟" اس کی سکریٹری نے پوچھا۔

"سلیمان سے بات کروائیں۔" میں نے سلطان بول رہا ہوں۔"

"اوہ... سلطان ایک سیکنڈ پلیز...!" اس کی بوکھلاہٹ پر میرا دل دھک سے گرا تھا۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی جس میں سلطان کا نام بھی شریک تھا۔

"ہیلو مسٹر سلطان کہاں ہیں آپ؟" سلیمان کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔

"آپ کے اور اپنے شہر میں بیٹھ کر۔" میں نے کھوکھلی آواز میں جواب دیا۔ "میں ناگزیر وجوہ کی بنا پر فوری ملنا چاہتا ہوں۔ بیٹھ صاحب نے میرے آپ کے اخلاص سے رابطہ قائم کیا تھا۔" وہ بتانے لگا۔ "مسٹر شاکر ابھی ابھی وہاں سے واپس آئی ہیں۔ میں بھی فوری آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"خیریت بیٹھ؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔ میں اچانک ایک نوٹ پر جا رہا ہوں۔" اس نے یقینیات بنائی تھی۔ "پھر کب تک آ رہے ہو؟"

"بولو تو ابھی چل پڑتا ہوں۔"

"شکریہ چلے آؤ۔ میں منتظر ہوں۔" اس نے فی الفور سلسلہ توڑ دیا تھا۔

اگر وہ رابطہ خود قائم نہ کرتا ہوتا تو میں خالی ہاتھ جا کر فوری سودے کی بات کرتا لیکن اب اسے معمولی دس لاکھ کی رقم ہی کر سکتی تھی۔

میں کالج جانے کے لیے باہر نکلا ہی تھا کہ ٹرک گیٹ کے سامنے آ کر رکا تھا۔ کونز اور ہارکن بھی ان لوڈنگ کے لیے دوڑ پڑے تھے۔ میں نے جا کر بیگن سے کیش بیگ لیا اور سلو کو ساتھ لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اسے کار روانی کی سچویشن بتائی۔ وہ اندر سے پنا ریوالور لے کر جیب باہر آیا تو ریشمی دوپٹہ اوڑھے قریب آ کر بولی وہ خندوں والا چہرہ اب آمادہ برخم میں تمہارا پیارا چہرہ دیکھنے کو ترس رہی ہوں۔"

"ابھی کچھ لوگوں کو اس چہرے کی ضرورت ہے جان۔" میں نے کہا اور سلو کو لے کر کار میں بیٹھ گیا۔

میں نے سلو کو پچاس گز دور ہی اتار کر تعاقب کرنے اور نگرانی کی ہدایت دے دی تھی اگر میرے ساتھ صرف میری جان ہوتی تو مجھے کوئی پیش بندی کی ضرورت نہ ہوتی۔ معاملہ دس لاکھ کا تھا اتنی بڑی رقم کسی زیرک کا دماغ بھی الٹ سکتی تھی۔

میں شوکیسوں کو بجاتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا سلیمان کے آفس میں داخل ہو گیا۔ مس شاکر نے مجھے دیکھ کر اپنی بوکھلاہٹ پر مشکل ہی قابو پایا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل کر اور بھی بڑی ہو گئی تھیں۔

"یس کم ان سلطان۔" سلیمان کی آواز بوجھل پردوں سے ٹکراتی سنائی دی اور میں پردہ ایک طرف اچھال کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ شخص آرمر میں ہی تھا لیکن میں نے داخل ہوتے ہی اسے دیکھ لیا تھا لہٰذا میں نے جھپٹ کر اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹ لیا تھا۔

"دوستانہ ملاقات میں نگران کی ضرورت نہیں ہوتی۔" میں نے اسے دھکا دے کر باہر نکال دیا۔

"اوہ... اوہ... یہ میرا باڈی گارڈ تھا۔" سلطان سلیمان نے احتجاجی انداز میں ہاتھ اٹھایا۔

"میں دوست ہوں بیٹھ۔" میں نے بیگ میز پر کھٹ سے رکھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ "اگر دشمن ہوتا تو اس کی گردن باہر جا گرتی۔"

سلیمان اپنی خوبصورت بلوری آنکھوں سے مجھے کئی لمحے گھورتا رہا تھا۔ اس کی سانسوں کا تموج اس کے اندر مچلتے طوفان کا غماز تھا۔ وہ خود پر سکون رہنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ "کیا بات ہے بیٹھ۔" میرا لہجہ بھی کھٹک تھا۔ "تمہاری آنکھوں میں کیا خرابی ہے؟"

"وہ کچھ نہیں۔" وہ جیسے خواب سے بیدار ہو گیا تھا۔ "ہاں بولو کیا بات ہے؟"

میں نے رقم کے آنے، میرا باڈی گارڈ تھا سلطان، سلیمان سے ملاقات اور مجھے بلانا خیر مال کی ڈیلیوری

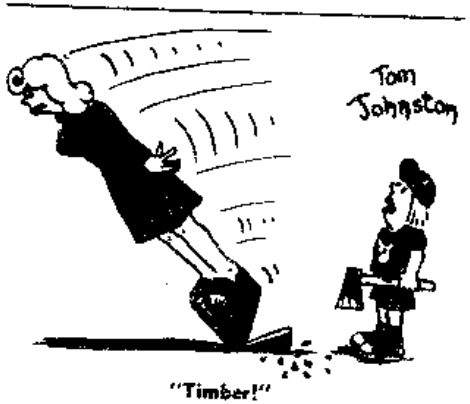

فارغ التحصیل ہے۔ وہ گاؤں کے غنڈوں اور سرحد پاروں کا پشت پناہ اور سرغنہ ہے۔ ایسے برے شخص سے کس اصول اور مردانگی کی توقع کرنا خود کو دھوکا دینے والی بات تھی۔ میں دھوکا کھا گیا تھا۔

اپنے چہرے کا رنگ تو میں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جسم میں جو تھرتھری پیدا ہوئی تھی، اس نے میری آواز میں ورنہ کی لہر دوڑا دی تھی۔ رگوں میں مچلتا ہوا خون، پٹھوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا جیسے فاتح فوجی مفتوح انسانوں کو لاتوں بوٹوں کی ٹھوکریں مار رہے ہوں۔

میری بدلتی حالت دیکھ کر بیگن ایسے میری پشت سہلانے لگا جیسے بھڑکے ہوئے گھوڑے کو سوار تھپکیاں دیتا ہے۔ کونز سلو اور ہارکن شکاری کتوں کی طرح میرے گرد غراتے پھر رہے تھے۔ وہ تربیت یافتہ سولجرز تھے، اس لیے بتائے بغیر سمجھ گئے تھے کہ چیف کسی شکار پر جھپٹنا مارنے کے لیے پر تول رہا ہے۔

"کیا یہاں ہم اپنی بوٹیاں نوچتے رہیں گے چیف؟" کونز کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

"ہمیں بتائیں چیف! کیا ہوا ہے؟ وہ کون ہے؟" ہنٹ بھڑکتی آواز میں بولا۔

"فکر نہ کرو دوستو!" ہارکن ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم چیف کے ساتھ جائیں گے۔"

"سلو، دوستو!" میں نے پلٹ کر ہارکن کے شانے پر ہاتھ رکھ

پہنچے۔ میری پارٹی خطرے کی بو سونگھ کر جلد واپس جانا چاہتی ہے۔"

"اوہ تو یہ بات تھی ٹھیک ہے۔" اس نے انٹر کام کا بٹن دبایا۔ "مس شاکر! آصف کو اندر بھیج دو۔"

"تو آپ مال ابھی دیں گے سیٹھ؟"

"ہاں۔" اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری۔

"یس سر!" کسی نے اندر آ کر پوچھا۔ "کیا حکم ہے سر؟"

سلیمان نے پلکوں کا اشارہ کیا اور سرمئی میسری گردن پر ٹک گئی تھی۔

"اب کوئی حرکت نہ کرنا سلطان۔" سلیمان نے سفاک ترین آواز میں کہا۔ اس نے پھر انٹر کام پر حکم دیا۔ "نوید کو بھی اندر بھیج دو... مس شاکر...!"

"پہلے رقم گن کر تسلی کر لو سیٹھ!" میں نے بے خوف انداز میں کہا۔ "اگر یہ تمہارا طریقہ کار ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ہر شخص کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے۔"

ایک گداز ہاتھ میرے پہلو سے آگے بڑھتا دکھائی دیا جونہی ہاتھ میرے تک گیا میں نے بائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی ماری۔ وہ ٹوکر آتا ہوا تڑپا تھا۔

"قسم میرے سامنے گنو گے سیٹھ!" میں نے اسی ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں؟" سلیمان آگے جھک کر بولا۔ "تمہاری گردن کے ساتھ ریوالور لگا ہوا ہے اور انگلی میرے اشارے کی منتظر ہے۔ اب اگر تم نے دوسری حماقت کی تو میں آصف کو اجازت دے رہا ہوں۔ میں فوراً گولی مار دی جائے۔ نوید بیگ اٹھاؤ۔"

میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی تھی... دشمن اپنی کمینگی اور اوچھی حرکتوں پر اتر آیا تھا۔ اس طرف زینت نے بھی پوری توجہ صوفوں کی گدیوں میں داخل ہو کر اندر وہ لوگ کوئی قیمتی شے اٹھا لے جا سکتے ہیں مگر میں نے اس کے خدشے کو مسترد کر دیا تھا۔ مظفر چوہدری نے مجھ سے آخری ملاقات میں شریفانہ عہد کیا تھا۔ وہ جنگ کو حویلی سے باہر اپنے تک محدود رکھیں گے۔ میں نے اپنی فطرت اور اصول کے تحت اس پر یقین کر لیا تھا لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ مظفر چوہدری کس مکتبہ فکر کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔" میں اپنی ذاتی آگ اور مقامی سیاست میں تم لوگوں کو ملوث نہیں کرسکتا۔ تم حکومت کے خزانے سے معاوضہ حاصل کرتے ہو پھر تم لوگ بہت قیمتی ہو، تمھارے فرائض ذاتیات سے بالاتر ہیں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے مقامی سیاست میں اُلجھایا جارہا ہے، لہٰذا اپنی آگ میں خود ہی سرد کروں گا۔"

"معاف کرنا چیف!" بیگن بول پڑا۔ "ہم ایک گروپ ہیں سب مل کر اکائی بنتے ہیں، ایک دوسرے کی سلامتی بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ کیا آپ ہم میں سے کسی ایک کو اس لیے بے یار و مددگار چھوڑ سکتے ہیں کہ کوئی ذاتی اُلجھن میں گھر کر تباہ ہو رہا ہے تو ہونے دو... نہیں، چیف! ہمارے مفادات، ہمارے مسائل اور معاملات مشترک ہیں۔ مجھے اس ملک کا قانون نہیں معلوم لیکن میرے ملک کا فوجی اگر گھر سے کوسوں دور ہوتا ہے تو انٹیلی جنس کے خاندانی اور مقامی مسائل کو اس علاقے کا کمانڈر حل کرتا ہے، اس لیے کہ جس فوجی کا اپنا گھر جل رہا ہو، وہ سکون اور یکسوئی سے محاذ پر نہیں لڑ سکتا... خود کو گروپ سے الگ نہ کریں، چیف... ہمیں اپنی ذات میں شامل کرلیں تاکہ مل جل کر معاملہ جلدی نمٹایا جاسکے ورنہ آپ اُدھر اُلجھ جائیں گے تو ہمارا مشن متاثر ہوگا۔ کیا آپ کو احساس نہیں کہ ہم بھیڑیوں کو زخمی کرچکے ہیں اور ناگوں کو بل سے نکال کر لائے ہیں۔ آپ کا فعال اور حاضر رہنا بے حد ضروری ہے۔"

"شکریہ ماسٹر!" میں نے جواب دیا۔ "آپ لوگوں کی ہدایت اور معاونت کی پیش کش نے میرے اندر نئی قوت پیدا کردی ہے میں محسوس کررہا ہوں کہ میں تنہا نہیں ہوں، میری پشت پر میرے پانچ شیر جیسے بھائی ہیں۔ میں انکار نہیں کروں گا، بلاشبہ ہمارے مفادات مشترک ہیں، ہم ایک ہیں... مگر تم لوگ ایک بات بھول رہے ہو کہ تم لوگ غیر ملکی ہونے کی وجہ سے ہر جگہ پہچان لیے جاؤ گے۔ غیر ملکیوں کی مداخلت اُوپر تک جاسکتی ہے اور ہمارے بڑے باز پرس کرسکتے ہیں، تب میرے پاس کوئی جواز نہ ہوگا، سوائے ندامت کے۔ لہٰذا ہمیں جذبات سے ہٹ کر سوچنا ہوگا۔ میں پہلے ریکی کرنے جارہا ہوں، صورتِ حال دیکھ کر پلٹ آؤں گا اور پھر ہم منصوبہ بندی سے قدم بڑھائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، چیف!" ہنٹ بولا۔ "ہم آپ کی کال کے منتظر رہیں گے۔"

میں نے گروں کو اشاراتی جنبش دی اور بیگن کو ساتھ لے کر لان میں نکل گیا۔ مجھے اُن لوگوں سے زیادہ خطرہ نہ تھا۔ مجھ دار تھے اور میرے ماتحت تھے۔ پیش کش کرسکتے تھے لیکن ضد نہیں کرسکتے تھے۔ مجھے صرف رشیدہ کی فکر تھی، وہ جذباتی لڑکی تھی، میری ماتحت بھی نہ تھی۔ اگر اُسے کچھ معلوم ہوجاتا تو اُسے سمجھانا مشکل ہوتا۔

"ماسٹر..." میں نے ہدایات شروع کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لڑکوں کو کنٹرول میں رکھیں گے۔ دوسرے حکم تک اُن کی نقل و حرکت پر پابندی ہوگی۔ آپ سامان کی فہرست لے کر آج ہی وزیرِ داخلہ سے ملیں گے اور سامان سرکاری تحویل میں دے دیں گے، وزیرِ موصوف کو بتائیں گے... کہ آپ لوگوں کی یقین دہانیوں اور حفاظتی انتظامات کے باوجود مظفر چوہدری پر ضرب لگا گیا ہے لیکن میں اس معاملے میں قانون کی معاونت نہیں پسند کروں گا کیونکہ یہ میرے خاندان کی عزت کا معاملہ ہے۔ کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ بنگ باز خان قریب المرگ ہے... آپ اس کی بڑی بیٹی سے رابطہ قائم رکھیں گے۔ میں ٹیلی فون پر اُسے آپ کے بارے میں بتا جاؤں گا لیکن آپ وہاں نہیں جائیں گے اور رشیدہ کا بھی خیال رکھیں گے، میں آپ سے مواصلاتی رابطہ برقرار رکھوں گا۔"

"میں ایک درخواست کروں گا بیٹے!"

"فرمایئے، ماسٹر؟"

"مجھے ساتھ لے چلو۔ میں میک اَپ کروں گا، بالکل دیہاتی میک اَپ۔ دیکھیے، ماسٹر! ایک اکیلا اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔ آپ کا مقابلہ کسی بہادر دشمن سے نہیں بلکہ علاقے کی سیاست سے ہے۔ وہ لوگ آپ کو اُلجھا کر ناکارہ کرسکتے ہیں۔"

"شکریہ ماسٹر!" میں نے جواب دیا۔ "اگر ضرورت پڑی تو آپ کو کال کرلوں گا۔ فی الحال میں گھر جارہا ہوں۔"

رشیدہ ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے، ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکائے دیکھ رہی تھی۔ اس کی خشک زلفوں کی لٹیں، اس کے چہرے پر لہرا رہی تھیں۔ جب میں نے اس کی جانب دیکھا تو اس نے جھٹک کر بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ روٹھی سی لگ رہی تھی لیکن میرے پاس اب اس انجان منانے کے لیے وقت نہ تھا۔ وہ سوال کرتی اور میں جواب دیتا، زندگی میں جُدا ہونا پڑتا۔ مجھے یقین تھا کہ بیگن اس کا خیال کرلے گا۔

میں نے اندر جاکر ریوالور لوڈ کیا، فاضل میگزین ڈالے۔ بیگن نے ٹرانسمیٹر، نوٹوں کی گڈی اور شکاری

سے میری جیبوں میں ڈال دیا تھا۔ وہ ایک ماں کی طرح [illegible] اور سفر پر روانہ ہونے والے بیٹے کی ضروریات کا خیال رکھ رہا تھا۔

چونکہ میں غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار تھا نہیں خبر تھی کہ کس کس دشت میں لہولہان ہونا پڑے گا۔ کتنے دروازے پر دستک دینا پڑے گی کتنے گریبانوں کی دھجیاں بکھیرنا پڑیں گی اس لیے اہم ضرورت کی شے، گاڑی میں ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا کہ مقابلہ ایک بھیڑیے سے تھا اور بھیڑیا مجھے سڑکوں اور میدانوں میں نہیں مل سکتا تھا۔

میں نے صدر سے رنگ باز خان کا نمبر ڈائل کیا۔ ثمینہ کہیں قریب ہی رہی ہوگی۔ کیونکہ پہلی گھنٹی پر ہی اُس نے ریسیور اُٹھا لیا تھا۔ وہ ہیلو ہیلو کررہی تھی اور میں گہری گہری سانسوں کے درمیان ڈوب ابھر رہا تھا۔ ایک نامعلوم سا خوف ایک دم طاری ہوگیا تھا، جیسے رنگ باز خان میرا کوئی عزیز ترین شخص تھا اور میں بُری خبر سننے سے قبل خود کو کنٹرول کرنے لگا تھا۔

"میں ہوں، ثمینہ خان! ڈیڈی کیسے ہیں؟"

"کون... خرم؟" اُس نے چیخ کر پوچھا۔ "کہاں ہیں آپ؟ ڈیڈی ابھی تک آپریشن میں ہیں۔"

"گھبرانا نہیں، ثمینہ!" میں نے اُسے حوصلہ دیا۔ "ہارٹ ٹربل میں وہ ایسا ہی ہوتی ہے۔ خان ٹھیک ہوجائیں گے۔ اُنھوں نے ایک برداشت کرلیا ہے۔"

"ڈاکٹر چپ چاپ بیٹھے ہیں، خرم!" وہ سسکتی ہوئی آواز میں بتانے لگی۔ "جیسے وہ مایوس ہوچکے ہوں، وہ سانسیں گن رہے ہیں، مجھے اندر نہیں جانے دیتے۔ آپ جلدی آئیں، خرم... ثمینہ پاگل ہو رہی ہے۔"

"سنو، ثمینہ!" میں نے کہا۔ "میری امی جان کی طرف سے اطلاع آئی ہے، وہ بیمار ہیں۔ میں اُن کو دیکھنے جارہا ہوں۔ شام تک واپس آؤں گا۔ اس وقت تک میرا پارٹنر، خان کی خیریت مجھ تک پہنچاتا رہے گا۔"

"اوہ، میرے خدا! یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بلک پڑی۔ "ہم کتنے خوش تھے۔ یکایک کیا سے کیا ہوگیا ہے؟"

"آرمش مس خان!" میں نے نرم گداز لہجے میں کہا۔ "اللہ کو یاد کریں اور دعائیں کریں۔"

"آپ امی جان کو شہر لائیں گے نا؟"

"ہاں مس خان!"

"ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ اُن کی عیادت کے لیے

"شکریہ ثمینہ! دعا کرو، اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔" وہ رونے لگی تو میں نے گھبرا کر سلسلہ منقطع کردیا۔

باہر نکل کر میں نے ایک سوزوکی وین کرایے پر حاصل کی۔ ٹیکسی یا کار میں گاؤں جانا، احتیاط کے منافی تھا۔ میرا دشمن شہری نہ تھا۔ وہ دیہات کے آس پاس کہیں بھی گھات میں ہوسکتا تھا۔ پہلے بھی اُس نے میری کار کو نالے میں گھیر لیا تھا۔ چونکہ گاؤں میں سوزوکیاں عام طور پر آتی جاتی رہتی تھیں، اس لیے کوئی آنکھ میری سوزوکی کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اسکول کے عقب میں، جب میں وین سے اُترا تو کھیتوں میں کام کرنے والی عورتیں مڑ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ وہ دل ہی دل میں خرم سلطان کو لعنت ملامت کررہی ہوں گی۔ ان کے نزدیک میں نے حرکت ہی ایسی ذلیل کی تھی کہ پہلے ایک خاندان کو گھر میں پناہ دی اور پھر اس مہربانی کا معاوضہ اُس خاندان کی عزت لُوٹ کر وصول کرلیا تھا۔

حویلی پر حسبِ سابق سکوت طاری تھا۔ پولیس والے باہر درخت کے نیچے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن میں ان کو بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

مجھے اندر جاکر پہلے خود کو امّاں بی اور زینت کی عدالت میں پیش کرنا تھا، عابدہ کی ماں کے سامنے جانا تھا۔ میں جانتا تھا، سب کی نگاہوں میں حقارت اور ہاتھوں میں نفرتوں کے پتھر ہوں گے مجھے دیکھتے ہی چاروں طرف سے مجھ پر سنگ باری شروع ہوجائے گی۔ اُن لوگوں کے نزدیک جرم ہی ایسا تھا۔ تب ہی اُنھوں نے سنگباری کی سزا تجویز کی تھی۔ زینت کی تحریریں سزا کا ہی حکم تھا۔

زینت برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑی، مُرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی پہلے اُس کے چہرے کے عضلات تنے پھر ایک طنزیہ سی مُسکراہٹ اُس کے سراپا پر طاری ہوتی چلی گئی۔

"آؤ، دُلہا میاں!" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ "اکیلے آئے ہو، دُلہن کو بھی ساتھ لے آتے۔ یہاں سب سلامی دینا چاہتے ہیں آپ دونوں کو۔"

"میں اس حویلی کی آبرو اور سلامتی تمھارے ہاتھ میں دے گیا تھا، زینت!" میں نے دکھتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے مجھے یقین دلایا تھا لیکن تم ناکام رہی ہو... یا میں یہ سمجھوں کہ تم نے مجرمانہ چشم پوشی سے کام لے کر اُس معصوم لڑکی کو رقابت کی آگ میں جھونک دیا ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے جواب دو، زینت؟" میں نے تین سیڑھیاں چڑھ کر اس کی موٹی چٹیا کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور اس نے میرے سینے پر مکا مارا۔

"چھوڑو مجھے، ذیشان مگسار!" اس نے میرے گال پر طمانچہ مارا۔ "تم جیسے اس گھٹیا حرکت پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "میں عابدہ کو تمہارے حلق سے نکال کر دکھاؤں گا۔"

"ٹھہرو... وہ پاؤں جما کر بولی۔ "مجھے چھوڑو، وحشی!"

میں نے اسے اٹھا دیا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی ستون کا سہارا لے کر سنبھل گئی۔

"کیا وہ تمہارے پاس نہیں ہے؟" زینت کی آواز میں کپکپی اور آنکھوں میں خوف در آیا تھا۔ "خدا کی قسم، اردوب کے سامنے اس شخص کے ساتھ یہاں سے گئی تھی، اس نے تمہارا تحریری پیغام اور تمہارے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی لی تھی۔"

"کیا تم اندھی ہو گئی تھیں، زینت؟" میں نے دانت پیس کر پوچھا۔ "تم تحریر پہچانتی ہو، کیا وہ میری تحریر تھی؟"

"نہ... مجھے عابدہ نے یہی بتایا تھا۔ اس نے تمہارا پیغام اور تمہارے کارڈ کی فوٹو کاپی دی تھی۔"

"اور وہ شخص کون تھا؟"

"کوئی شہری تھا۔ کرم خود اسے ساتھ اس کی کار تک لے گئے تھے۔"

"زینت... میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہمارے دشمن کی ناپاک چال تھی۔ وہ تمہارے ذریعے مجھے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں۔ انھیں یقین ہے کہ میں ان کی حرکات پہچاننے کے لیے زندہ ہوں۔ میں ان کے ہاتھ سے مرنا نہیں چاہتا۔"

"وہ اماں بی کو بتاؤ، خرم! زینت روہانسی ہو گئی۔ "وہ ہمیں کریدتی رہتی ہیں، ہم سب خانہ جان سے بہت خوف زدہ تھے۔"

"نہیں، میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔" میں نے دانت پیس کر اٹھایا۔ "حضرت ہو یقین کے درمیان جو فاصلہ ہوگا، وہ مجھے مار دے گا۔" زینت! میں نے تمہاری باتوں کا یقین کر لیا ہے لیکن میں کسی نقصہ انگیز ایک لگا بھی نہ سہار سکوں گا۔ تم بتا دیتا، اب تم کو میرے ساتھ ہی ان کے سامنے آنا ہوگا۔ خانہ جان کو بھی حال کچھ نہ بتانا۔ وہ اس خیال سے مطمئن ہوں گی کہ عابدہ یہاں کہیں اپنے خوش اور محفوظ ہوگی۔ وہ مجھے جانتی ہیں۔ اگر ان کو اصل بات بتا دی گئی تو وہ بیچاری عورت بے موت مر جائے گی، اور پھر ہم دونوں مجرم بن جائیں گے۔"

"اب کیا کرنا چاہتے ہو، خرم؟"

"وہی جو ایک غیرت مند مرد کو کرنا چاہیے۔"

"یعنی تم ان کے پیچھے اپنے جال میں جا پھنسو گے؟"

"نہیں! پہلے جال کا جائزہ لوں گا پھر اس جال کو توڑ کر شکاری کی گردن تک جا پہنچوں گا۔"

"فضلو خان کو ساتھ لے لو۔ اگر تم خیر اس قابل ہی نہیں ہو تو زینت کا بچہ زہریلا ہو گیا۔ "کم از کم اس خطرے سے تو باہر ہو جائے گا۔"

"تم اکرم بھائی پر کرم کرو، زینت! مجھ پر یہ احسان بہت بڑا احسان ہوگا۔ اس گرتی دیوار کو اپنی ذات کا سہارا دو۔ اگر وہ دیوار گر گئی تو حویلی کا پرچم سرنگوں ہو جائے گا۔ یہ تو خانی، اعوان میں حویلی کے قابل نہیں ہوں۔ وہ جیسے بھی ہیں، حویلی کی عظمت کے پرچم اور اس خاندان کے سربراہ ہیں۔"

زینت اپنا چہرہ ہونٹ چباتی ہوئی وہاں سے چل پڑی اور میں گہری سانس لے کر سیڑھیاں اتر گیا۔

میرا ارادہ تھا کہ پولیس گارڈ سے ہاتھ دھو کر اس کی کار لے کر ناک کے بچے سے حویلی کو دل دہلا دینے والی خبر سنا دوں گا کہ ان کی بہو کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ حویلی کو دل دہلا دینے والی خبر سنا دوں گا کہ ان کی بہو کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اور وہ ایسے نہ روک سکے تھے۔

لیکن زینت سے جو واقعات سنے تھے، ان کی روشنی میں پولیس کا کوئی قصور نہ تھا۔ جب انہوں نے چپ چاپ اسے ایک اجنبی کے حوالے کیا تھا تو پولیس اسے کیسے روک سکتی تھی۔

دن کی روشنی میرے لیے مفید نہ تھی کیونکہ میں کسی دوست کے گھر نہیں جا رہا تھا۔ کھیتی باڑی کا بھی کام نہ تھا اور مظفر چوہدری سے ملنے کی اوٹ میں بھی نہیں جا رہا تھا۔ مجھے تو شکار کی تلاش تھی جس کے پیچھے کسی بھیڑیے کی طرح جھک جھک کی کھوج سے نکلنا ہے کوئی ہرن چرا رہا ہے کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو اپنے شکار کے لیے جان کا دشمن استعمال نہیں کرتا۔

دین کا ڈائیلاگ مجھے دہرا کر اسنے سے اٹھ کر دین کے قریب پہنچ گیا تھا میں نے کہا تھا کہ اشارہ کر کے کیے کی جھوٹ بول گیا کہ ڈکیتی میں لگے گی کو کال کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ہوا سے وہ بھی ہو چکے تھے اور یہ کسی دیر کسی دن کو نہیں لے سکتا تھا۔

جب میں نے اسے کال کیا تو وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔

لکڑیاں لا رہا تھا، وہ فضلو کہا رہا تھا اور مظفر چوہدری کی زمین سے لکڑیاں لے جا رہا تھا۔ میں دبے پاؤں جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ فضلو نے میری طرف دیکھا اور نظر انداز کر دیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں۔

"چاچا! تم نے یہاں اونٹ تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، بھائی!" فضلو نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "ادھر جو بدیوں کی رکھ میں دیکھو، چرتا ہوگا۔"

"سنا ہے، ادھر بڑا چوہدری رہتا ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ فضلو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"کون بڑا چوہدری؟"

"اپنا مظفر چوہدری... ایک ہی تو شیر ہے، ہمارے علاقے میں جو پولیس کو بھیگی بلیاں دے رہا ہے۔"

"اس کی مت نہیں ماری گئی کہ ایسی جگہ رہے۔" فضلو نے ناگوار لہجے میں جواب دیا۔ "پولیس، رکھ کی تلاشی لے چکی ہے۔"

"اچھا، پھر کسی نے گپ چھوڑی ہوگی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اپنا چوہدری علاقے کا بادشاہ ہے، کسی کے بھی گھر رہ سکتا ہے۔ سنگی ساتھی ایسے ہی وقت پر کھے جاتے ہیں۔"

"بندے تو اس کے بہت ہیں۔" فضلو نے گدھی کو کان سے پکڑ کر لکڑیوں کے گٹھے کے قریب کھڑا کر دیا۔ "ذرا ہاتھ ڈلوانا، بھائی! یہ بڑی اکھڑی ہے، کان چھوٹا تو دور ہٹ جائے گی۔"

میں نے لکڑی کے دونوں گٹھوں کو بازوؤں میں بھر کر گدھی کی پشت پر لاد دیا۔

"واہ بھئی! بڑے زور دار جوان ہو۔ دو من کا بار یوں اٹھا لیا، تم نے۔ کون سے پنڈ کے ہو؟"

میں نے دو تین میل دور ایک گاؤں کا نام بتا دیا۔ اس نے غور سے میرا چہرہ دیکھا۔ کچھ تو اندھیرا اتر رہا تھا اور کچھ فضلو کی نظر کمزور رہی ہوگی ورنہ مجھے تو علاقے کے تمام لوگ جانتے تھے۔

"میں بھی چوہدری کے لیے کام کرتا ہوں، چاچا!" میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ "بڑا جی دار اور یار باش بندہ ہے۔"

"پر چکڑ میں آ گیا ہے۔" فضلو بولا۔ "تگڑے چوہدری کی کرنی اسے بھرنی پڑ رہی ہے۔"

"ہاں، لیکن بھائی ہے، کیا کرتا۔" میں نے مظفر چوہدری کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ وہ لوگ فاروق چوہدری کو بھون کر کھا چکے ہوتے۔ ویسے فاروق دکھائی نہیں دیتا، کہاں ہے؟"

"سیدھے ٹرک آ رہا ہے۔ مال یونیٹی اسٹور میں نیلام ہائے گا۔ صاحب آپ کی کارکردگی پر حیرت و خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ تحریری رپورٹ صدر محترم کو پیش کریں گے... دشمن کی ایک جھڑپ میں زخمی ہو کر پھر فرار ہو گیا ہے۔ سادہ لباس گاؤں کے آس پاس مزدوروں کے بھیس میں سڑک بنا رہے ہیں۔ اس کے لیے کوئی ہدایت؟"

"جی ہاں، آپ کے لیے گاؤں کا علاقہ ممنوع قرار دیا گیا ہے۔"

"اور کچھ...؟"

"نہیں، فرصت پاتے ہی صاحب سے مل لیں۔" بیگن نے کہا۔ "میری درخواست پر غور کیا ہوگا، آپ نے؟"

"ابھی ضرورت نہیں، ماسٹر! شکریہ۔" میں نے ٹرانسمیٹر آف کیا اور کھیت سے نکل کر، وین میں بیٹھ گیا۔

میرے لیے یہ خبر بڑی حوصلہ افزا تھی کہ مظفر چوہدری باہر نہیں گیا۔ اگر وہ یہیں کہیں تھا تو اس نے عابدہ کو بھی اپنے کسی اڈے کے گھر میں بند کر رکھا ہوگا۔

مظفر چوہدری کے گریبان پر براہ راست ہاتھ ڈالنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا کیونکہ وہ ایک گروہ کا سرغنہ اور علاقے کا بااثر شخص تھا۔ اس نے پولیس کے ہاتھ جکڑ کر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اس کے اثر و رسوخ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا... پھر وہ بہت پُر درد کا ہوا شکار تھا۔ اس نے اپنے گرگے نگرانی پر چوکس رکھے ہوں گے... اور میں ان لوگوں کے لیے اجنبی نہ تھا۔ ایک درجن گاؤں نزدیک نزدیک تھے، دوسرے میں کبڈی کا نامور کھلاڑی رہا تھا۔ دس پندرہ میل کے گاؤں مجھے پہچانتے تھے۔

اس لیے میں کسی ہارے کی طرح گاؤں کی گلیوں میں آزادانہ گھوم سکتا تھا۔ مجھے کوئی نہ کوئی میڑھی درکار تھی، کوئی ایسی آڑ، جس کے پیچھے چھپ کر میں شکار تک جا سکتا۔

وہ میڑھی، مظفر چوہدری کا کوئی قریبی ساتھی یا اس کا چھوٹا بھائی اور دشمنی کی بنیاد، فاروق ہی ہو سکتا تھا، جو پولیس کو مطلوب تھا اور جسے اپنے گھر کی رکھوالی کے لیے گھر میں موجود رہنا چاہیے تھا۔ اگر فاروق تک رسائی ہو جاتی تو میں اس کے حلق سے مظفر چوہدری نکال سکتا تھا۔

سورج جب مغرب کے منہ میں گر رہا تھا تو میں چادر اوڑھے کھیتوں میں دبکا ہوا تھا۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو گدھی پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اندر پڑا رہتا ہے۔" اُس نے بتایا۔ "مار کھا کر باہر کیسے نکلے... برادری تھُو تھُو کرتی ہے۔"

میرا مقصد حل نہ ہُوا تھا۔ فضلو، مظفر کے بارے میں یا تو کچھ جانتا ہی نہ تھا یا پھر ہو سکتا ہے کہ بتانے سے گریز کر رہا ہو... میں اُس کے ساتھ باتیں کرتا ہُوا، کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر مظفر چوہدری کے گاؤں میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر میں تنہا ہوتا تو سادہ لباس والے بھی ٹوہ میں لگ جاتے اور گاؤں کے لوگ بھی اجنبی شخص کو غور سے دیکھنے لگتے۔ فضلو کے ساتھ چلتے دیکھ کر کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی کیونکہ میں اُس کے شانے سے شانہ ملائے چل رہا تھا۔

جب میں مرکزی مسجد کے سامنے سے گزرا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی لیکن میں اندر نہیں جا سکتا تھا کیونکہ تمام نمازی مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ میں فضلو کے ساتھ آگے نکل گیا۔

گاؤں سات دھڑوں پر مشتمل تھا۔ سات ہی نمبردار یاں تھیں اور اُن میں سے ایک نمبردار، مظفر چوہدری بھی تھا۔ گاؤں کی سیاست کا محور بھی مظفر کا خاندان تھا۔ اُنھوں نے اپنی مسجد الگ بنوائی تھی، جس کا نام مسجد زیلداراں تھا۔ چونکہ وہ مسجد گاؤں کے سرے پر تھی، اس لیے آباد نہ ہو سکی تھی۔

جب میں اس مسجد میں داخل ہُوا تو چند نمازی انفرادی نماز پڑھ کر فارغ ہو چکے تھے۔ میں بکل میں چہرہ چھپائے، غسل خانے میں چلا گیا۔ جب مسجد خالی ہو گئی تو میں نے نماز ادا کی اور چراغ کی مدھم روشنی میں، ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اللہ کا گھر ہی مجھ جیسے مظلوم کو پناہ دے سکتا ہے۔

بارہ بجے، میں مسجد سے نکل کر دبے پاؤں، سنسان گلیوں میں چل پڑا تاکہ کتے میری راہ کی رکاوٹ نہ بنیں۔ مظفر کا گھر تیسری گلی میں تھا۔ چونکہ فاروق ابھی غیر شادی شدہ تھا، اس لیے وہ نئے مکان میں نہ گیا تھا۔ پرانی وضع کی خاصی وسیع حویلی تھی۔ اگر کتوں کا خوف نہ ہوتا تو میں سامنے کے حصّے سے دیوار پھاند جاتا لیکن مظفر کے کتے علاقے بھر میں مشہور تھے۔

حویلی کے پچھواڑے، لسوڑے کے تین درخت آپس میں جُڑے کھڑے تھے۔ میں ایک درخت پر چڑھا اور چند لمحے جائزہ لینے کے بعد بے آواز اندر کُود گیا۔ بالائی منزل کی کھڑکیاں روشن تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتا ہُوا میں ایک کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ حویلی پرانے زمانے کی تھی۔ شاید مظفر چوہدری کے دادا، زیلدار نذیر چوہدری نے بنوائی ہوگی۔ اُس زمانے میں کھڑکیوں پر گرل یا سلاخوں کا رواج نہ تھا۔ گرمی کی وجہ سے تمام کھڑکیاں کھلی ہُوئی تھیں۔ میں نے لمحہ بھر رُک کر اطراف کا جائزہ لیا، پھر کھڑکی سے کمرے میں رینگ گیا۔

دیوار کے ساتھ پلنگ پر کلثوم سوئی ہُوئی تھی اور اُس کے بال سفید تکیے پر بکھرے ہُوئے تھے۔ دوسری طرف فاروق چوہدری جوانی کی مست نیند میں ڈُوبا ہُوا تھا۔ اُس کے سرہانے ڈبل بیرل کی ایک بندوق رکھی تھی۔ میں نے بندوق اُٹھا کر، فاروق کے پلنگ کو ٹھوکر ماری۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر سرہانے رکھی بندوق کی طرف گیا تھا... پھر جُوں ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ اُچھل کر ساکت ہو گیا۔

"چوہدری..." میں نے سرگوشی میں کہا۔ "یہاں تمھاری بہن سو رہی ہے۔ باہر چلو۔"

اُس نے اپنی سوئی ہُوئی بہن کی جانب دیکھا۔ اُس کے ساتھ ہی میری نگاہ کا زاویہ بھی بدل گیا تھا۔ اسی ایک لمحے کی غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے اُس نے ایک دم تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔

میں تو اُس کے دونوں بازو توڑ گیا تھا۔ میرے نزدیک وہ مفلوج تھا لیکن اس کا بایاں بازو نہ جانے کیسے ٹھیک ہو گیا تھا۔ اسی بازو کے بل پر وہ مقابلہ کر رہا تھا لیکن جب وہ صحیح و سالم تھا تو میں نے اُسے شیر کی طرح بزدل اور خوف زدہ پایا تھا۔

اُس نے میرا نشانہ بھی لے لیا تھا لیکن اُس کی حواس باختگی نے ایک لمحہ مجھے بھی دے دیا تھا۔ اُس نے بوکھلاہٹ میں سیفٹی نہیں ہٹایا تھا۔ جب اُس نے ٹریگر دبایا تو اُسے اپنی غلطی کا احساس ہُوا مگر میں دوسری غلطی نہیں کر سکتا تھا اور انسان ایک دو غلطیوں ہی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

میں نے بندوق کی نال اُٹھنے کی طرح اُس کے ہاتھ پر مار دی۔ وہ ڈکرایا ہُوا، درد کی شدّت سے دُہرا ہو گیا اور ریوالور، اُس کے چھوٹ کر میرے پاس آ گرا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کمرے میں کوئی ایسی آواز ہو جس سے بیدار ہو جائے لیکن اُس کے اپنے بھائی نے میرے جذبات کی دی تھی۔ فاروق کی دہاڑ سن کر، وہ تڑپ کر بیدار ہو گئی تھی اور اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ "اُٹھو فاروق!" میں نے بندوق کی نال اُس کی گردن پر رکھ کر غراتی ہُوئی آواز میں کہا۔ "میں تمھارے معصوم بچّے اور بے گناہ خواتین پریشان ہوں۔ میں تم

سے آخری بار کہتا ہُوں۔"

"کون... خرّم سلطان؟" کلثوم میری آواز پہچان کر بولی۔

"خاموشی سے لیٹ جاؤ، کلثوم بی بی! یہ ہمارا معاملہ ہے۔" میں نے کلثوم کو دبکتے دیکھ کر، نیچے اُتر آئی۔

"تم... تم نے وعدہ کیا تھا، خرّم سلطان!" اُس نے میرے شانے جھنجھوڑتے ہُوئے کہا۔ "پھر کیوں پیچھے آئے ہو؟"

"مگر مجھے اپنے وعدے کا پاس نہ ہوتا تو یہ چوہا اب تک زمین کا بوجھ بن چکا ہوتا۔" میں نے بھڑکتی ہُوئی آواز میں جواب دیا۔ "تمھارے بھائیوں نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔ تمھارے بڑے بھائی نے بھی مجھ سے عہد کیا تھا کہ جنگ گھروں سے دُور، صرف مَردوں کے درمیان لڑی جائے گی۔ میں نے اعتبار کر لیا... مگر جانتی ہو، کیا ہُوا؟ وہ میرے گھر سے میری ایک محترم مہمان کو اُٹھا لایا ہے۔ وہ لڑکی میرے خاندان کی پناہ میں تھی۔"

"کیا مظفر بھائی نے...؟"

"ہاں، مظفر نے..." میں نے فاروق کے بالوں پر ہاتھ ڈال دیا۔ "فاروق، تم مجھے اپنے بڑے بھائی تک لے چلو گے، یا خود... اپنے خاندان کو ملوث نہ کرو، ہم باہر چل کر فیصلہ کریں گے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" فاروق ہاتھ سہلاتے ہُوئے منمنایا۔ "خدا کی قسم مجھے نہیں بتایا گیا۔ میں تو شرم کے مارے گھر سے بہت کم نکلتا ہُوں۔ تم نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے۔"

"خرّم..." کلثوم گڑگڑی گھسیٹ کر بولی۔ "بیٹھ جاؤ، خرّم سلطان! یہیں بیٹھ کر فیصلہ کریں گے۔ میں اس لیے خاموش تھی کہ تم اپنی انا کی بھٹی گرما کر خاموش ہو گئے ہو۔ فاروق بھائی، ہمارے لیے واقعی مر چکے ہیں۔ تم نے عہد تو نبھایا مگر انتقام بھی بڑا سخت لیا ہے۔ فاروق بھائی کو زندگی دے کر انتقام اور ذلّت کی اذیت دے گئے ہو۔ یہ واقعی زندہ درگور ہو چکے ہیں۔ باہر نکلیں تو گاؤں کی لڑکیاں، ان کی حالت پر قہقہے لگاتی ہیں، لوگ طعنے دیتے ہیں۔ کیا یہ عذاب موت سے بدتر نہیں، خرّم؟"

"میں نے اسے معاف کر دیا تھا لیکن مظفر نے اس کی جرأت کا احساس بھڑکا دی ہے۔"

"میری ایک بات پر اعتبار کرو گے، خرّم؟" کلثوم پلنگ کی پائنتی پر بیٹھتے ہُوئے بولی۔

"کلثوم بی بی! میرا صرف تمھارے بھائیوں سے جھگڑا ہے۔ میں اسے کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"جب تمھارے خاندان کی پگڑی میرے بھائیوں کے پیروں میں گر پڑی ہے تو تمھیں بھی اس خاندان کی پگڑی اُتارنے کا حق ملنا چاہیے... اور وہ حق میں تمھیں دوں گی۔"

"تم..." فاروق تڑپ کر چیخا۔ "خاموش رہو، چلی جاؤ یہاں سے۔"

"نہیں، فاروق بھائی!" کلثوم غرّائی۔ "جب کسی جوان بہن کا بھائی، کسی کی بہن کی طرف دیکھتا ہے تو اُسے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ اُس کی بہن بھی کسی دوسرے کی نگاہوں کی زد میں ہو سکتی ہے۔ تمھاری پہلی بے غیرتی کو میں نے معاف کر دیا تھا، اب مظفر بھائی نے دوسرا وار کر کے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں بے غیرت بھائیوں کی بہن نہیں رہوں گی۔ سنو، خرّم سلطان: میں مظفر بھائی تک جاؤں گی، جہاں بھی ہوں گے، میں پہنچوں گی اور اُس لڑکی کو تمھارے حوالے کر دوں گی۔ اگر وہ نہ ملی یا میرے حوالے نہ کی گئی تو پھر یقین کرو کہ اُس کی جگہ فاروق اور مظفر کی بہن اپنا بازو پیش کر دے گی۔"

"میں تمھیں گولی مار دوں گا۔" فاروق دہاڑ کر بولا۔ "نکل جاؤ، یہاں سے بے غیرت عورت! نکل جاؤ۔"

"ہاں، میں بے غیرت ہُوں۔" کلثوم پھنکارنے لگی۔ "لیکن کس نے اپنی نیک سیرت بہن کو گالی دی ہے۔ تم نے... فاروق بھائی، وہ بھی تم ہو جس نے ایک غیر محرم شخص کو یہاں آنے کا راستہ دکھایا ہے۔ میں کہاں میں پڑھا کرتی تھی کہ بد فطرت اور بے غیرت بھائیوں کی بہنیں بھی بالآخر بے غیرت بن جاتی ہیں۔ اگر تم مجھے بچانا چاہتے ہو تو جاؤ، اپنے بڑے بھائی کو بتاؤ کہ لوگ تمھاری بہن کے کمرے تک آنے لگے ہیں۔ اگر تم نے تعمیر نہ کی تو ایک وقت آئے گا کہ لوگ تمھاری بہن کو لاش میں بدل دیں گے۔"

"تم مظفر کا پتا مجھے بتا دو، کلثوم! میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" میں نے نرم آواز میں کہا۔

"کاش! مجھے معلوم ہوتا۔" کلثوم معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ "لیکن میں معلوم کر لوں گی۔"

"تو پھر میں اسے لے جا رہا ہُوں۔" میں نے فاروق کی جانب اشارہ کیا۔ "تین دن کی مہلت ہو گی۔ اگر عابدہ میرے گھر پہنچا دی گئی تو فاروق بھی گھر آ جائے گا، بصورتِ دیگر، چوتھے دن اس کی لاش کسی کھیت سے اُٹھا لینا۔"

"لے جاؤ۔" کلثوم بولی۔ "لیکن اس یقین کے ساتھ کہ مظفر بھائی تمھارا نمونہ ہو گا۔ وہ ناکارہ چیزوں کا خریدار نہیں ہے۔ اگر تم جوابی چوٹ نہ دیتے تو وہ رسمی کارروائی کے بعد خاموش ہو جاتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن اب وہ بہت دُور نکل چکا ہے۔ اُس کے ڈنمے کئی قتل ڈالے جا چکے ہیں، وہ واپس نہیں آئے گا۔"

"تو پھر..." میرے حلق سے غرّاہٹ اُبھری۔ "مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"مجھ پر بھروسہ۔"

"نہیں! میں تمھیں اس آگ میں کُودنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں خود اُسے تلاش کرلوں گا۔"

"پھر مجھے بے چلو، خرّم!" وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ "مجھے یقین ہے کہ بھائی کتنے ہی بے غیرت کیوں نہ ہوں، بہن، خاندان اور برادری کی خاطر وہ تمھارے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے۔"

"شکریہ..." میں ہنس پڑا۔ "اگر میں بھی وہی کچھ کروں تو پھر مظفر چوہدری اور خرّم سُلطان میں کیا فرق رہ جائے گا... نہیں! کلثوم بی بی! میں ایسی ذلیل حرکت نہیں کرسکتا۔ میں عورتوں کو سیڑھیاں بنانے کا عادی کبھی نہیں رہا۔ اگر کرسکو تو معلوم کرلینا کہ وہ کہاں ہے۔"

میں اُٹھا تو فاروق نے گہری سانس لی اور بولا۔ "تم ایک شریف دُشمن ہو، خرّم سُلطان! جو کبھی دوست بھی رہے تھے، تم میں اور کلثوم مظفر بھائی کو مجبور کریں گے۔ یقین کرو، ہم پوری پوری کوشش کریں گے۔"

"مظفر کا کوئی ایسا دوست، جس کے بارے میں تمھیں شک ہو؟"

"ہاں، ایک ہے۔" فاروق بولا۔ "کلثوم! میری ڈائری نکال کر خرّم کو چوہدری زبیر کا فون نمبر دے دو۔ اگر وہاں نہ ملے تو پندرہ مکانوں کے نمبر دا کر دو۔ وہ لاکھ کوشش کرے، اگر مظفر بھائی ادھر ہی ہے تو ان دونوں کے سوا، اُسے کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔"

کلثوم نے ڈائری سے ڈائری نکال کر زبیر کا فون نمبر لکھ دیا اور جواباً میں نے اُسے رنگ باز خان کے ہوٹل کا فون نمبر لکھوایا تاکہ بوقتِ ضرورت وہ مجھے اطلاع دے سکیں۔

کلثوم اور فاروق حویلی کے بڑے دروازے تک میرے ساتھ آئے۔ جب میں نے شب بخیر کہا تو کلثوم نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے روک دیا۔ "تھہرو، خرّم! ہم تمھارے ساتھ گاؤں سے باہر تک چلیں گے۔"

ہائی وے تک پیدل ہی جانا پڑا۔ مظفر چوہدری کی کار تو ملا تھا لیکن میرے سلوک نے فاروق چوہدری کی کھال اُدھیڑ دی تھی، اگر وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا تو اُس کی کھال کے نیچے سے ایک نیا انسان نکل آیا تھا۔ کلثوم نے بھی خود کو پیش کرکے اپنی وفاداری ثابت کردی تھی۔ اب مظفر چوہدری کے گھر میں دو افراد میری مدد پر تیار ہو گئے تھے۔ میری کارروائی کامیاب نہیں تھی تو ناکام بھی نہیں رہی تھی، مجھے مظفر چوہدری کے دو ٹھکانے معلوم ہو گئے تھے۔

ہائی وے سے بذریعہ بس، میں اٹّوکے تک گیا اور ایک ہوٹل میں کمرا لے کر سو گیا۔

صبح ناشتے کے بعد میں نیچے اُترا اور چوہدری زبیر کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو..." کسی خاتون نے کال اٹینڈ کی تھی۔

"السلام علیکم! چوہدری زبیر صاحب سے بات کروائیں۔"

"کون صاحب ہیں؟" شیریں لہجے میں پوچھا گیا۔

"چوہدری فاروق۔"

"ایک منٹ ہولڈ کریں۔ ابّو جان ڈرائنگ روم میں ہیں۔"

دو منٹ بعد کھرکھراتی ہُوئی آواز نے چوہدری زبیر کا غائبانہ تعارف کروایا تھا۔

"کیا بات ہے، فاروق؟ تمھیں بدھ ٹیلی فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ اچھا بولو کیا بات ہے اور آئندہ احتیاط کرنا۔"

"پولیس کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔" میں نے امکان بھر کوشش کرکے فاروق کا لب و لہجہ اپنایا تھا۔ "سُنا ہے کہ کسی بھی وقت وہ خواتین کو حراست میں لے لیں گے۔ میں بھائی جان سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔"

"کہاں ہو، اس وقت؟"

"آپ کے قریب ہوں۔"

"مجھ سے ہی بولو لیکن یہاں نہیں۔ میں الفنور ہوٹل آرہا ہوں۔"

"وہی مری روڈ والا نا؟"

"ہاں، میں ہال میں ہوں گا۔" زبیر نے سلسلہ ختم کردیا اور میں کاؤنٹر کلرک کو کال کا معاوضہ دے کر باہر آ گیا۔

ٹیکسی اپنی رفتار سے چل رہی تھی اور میں اپنی سوچ میں اُلجھ رہا تھا۔ پریشانی کی وجہ زبیر کی شناخت تھی... کیونکہ میں اُسے پہچانتا نہیں تھا۔

کوئی معقول طریقۂ شناخت سمجھ میں نہ آیا تھا کہ ٹیکسی الفنور کے سامنے رُک گئی۔ مجبوراً اُترنا پڑا۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ زبیر کار استعمال کرے گا یا پیدل آئے گا۔ میں نے اندر جا

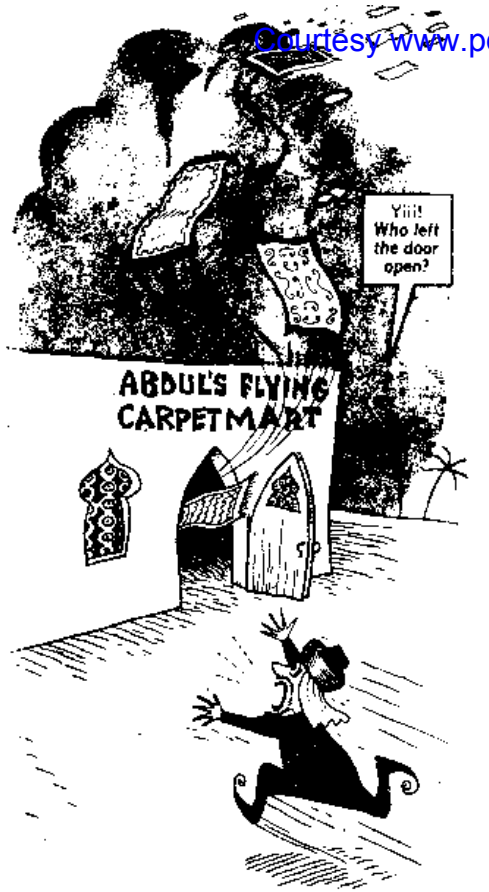

کلرک کو فدویانہ قسم کا سلام کیا۔ اس نے بھی پیشہ ورانہ محبت سے نوازا تھا۔

"سر! مجھے یہاں ایک صاحب نے ملاقات کے لیے بُلایا ہے لیکن میں اُن کو پہچانتا نہیں ہوں۔ اس سلسلے میں آپ میری مدد فرمائیں گے؟"

"ضرور جناب!" اُس نے مؤدّبانہ انداز میں جواب دیا۔ "نام بتائیں۔ ہو سکتا ہے، وہ ہمارے ڈیرینہ کرم فرما ہوں۔"

"چوہدری زبیر۔"

"اوہ، اچھا... اچھا۔ تشریف رکھیں۔ یہ ہوٹل اُنہی کا ہے، بس آتے ہی ہوں گے۔"

"میں اُن کو سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "پلیز، اُن کو بتائیے گا نہیں۔"

"لیکن آپ کو..."

"آپ اُن کو ہاتھ اُٹھا کر سلام کیجیے گا، میں سمجھ جاؤں گا۔"

"آپ بڑے زندہ دل ہیں، جناب!" وہ ہنسنے لگا۔ "بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں۔"

"ابھی نہیں۔ چوہدری صاحب آجائیں تب۔" میں کونے کی ایک میز کی طرف بڑھ گیا کیونکہ میں زبیر سے جس قسم کی باتیں کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے کاؤنٹر سے فاصلہ ناگزیر تھا۔

دس منٹ بعد ایک دُبلے بدن کا طویل القامت شخص اندر داخل ہُوا۔ کاؤنٹر کلرک نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہُوئے اُٹھ کر اُسے سلام کیا اور وہ گردن ہلاتا ہُوا، مینیجر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کاؤنٹر کلرک نے جُھک کر مجھے اشارا بھی کردیا تھا۔

میں لپک کر اُٹھا اور کاؤنٹر پھلانگتا ہُوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ زبیر دراز پر جُھکا ہُوا تھا۔ "السلام علیکم، چوہدری صاحب!" میں نے ٹھوس اور سرد آواز میں کہا تو وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام... فرمائیے۔"

"میرا نام خرّم سُلطان چوہدری ہے۔" میں بولتا ہُوا اُس کے نزدیک ہو گیا۔ "براہِ کرم، چند منٹ دیجیے۔" وہ دانتوں پر دانت جمائے چند لمحوں تک کرخت نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا۔ "ٹیلی فون میں نے ہی کیا تھا، چوہدری! بیٹھ جائیے، میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"ہُوں..." اُس نے ناک سے گہری سانس لی اور کندھے اُچکا کر بیٹھ گیا۔ "تو تم، اُس کی بُو پر لگ چکے ہو۔"

"شکریہ، چوہدری!" میں اُس کے سامنے جم گیا۔ "تم نے تسلیم کرلیا ہے کہ میں صحیح جگہ پہنچا ہُوں۔ براہِ کرم اپنے ہاتھ اُوپر رکھیں، ہم دوستانہ ماحول میں باتیں کریں گے۔ خالی میں بھی نہیں ہُوں۔ اگر آپ نے میرا نام پہلے سُن رکھا ہے تو آپ کو میرے بارے میں کچھ اور بھی بتایا گیا ہوگا۔ جس کا گھر جل رہا ہو، وہ دوسروں کے گھر نہیں بجھایا کرتا۔ میرا گھر جل رہا ہے اور میں دامن میں آگ لے کر گھر سے نکلا ہُوں۔"

"تم یہاں کیسے پہنچے؟" اُس نے ہاتھوں کی اُنگلیاں اُلجھا کر اُوپر رکھتے ہُوئے کہا۔ "میرا نام کس نے لیا ہے؟"

"یہ غیر ضروری باتیں ہیں، چوہدری!" میں نے تُرش لہجہ اختیار کیا۔ "بیمار کو لوگ ڈاکٹروں کے نام تجویز کرتے ہیں۔ ایک ہمدرد نے آپ کا نام بھی بتا دیا ہے۔ میں صرف یہ جاننے کے لیے اِدھر آیا ہُوں کہ مظفر چوہدری کہاں ہے اور اُس کے ساتھ جو لڑکی ہے اُسے کہاں رکھا گیا ہے؟"

"سوال ایک، جواب دو۔" وہ بڑبڑایا... پھر پہلو بدل کر مدھم آواز میں بولا۔ "سُنو، عزیزم! مجھے یہ سُن کر دُکھ ہُوا ہے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیونکہ ہم بُنیادی طور پر ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ مظفر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لڑائی جھگڑے اور خاندانی رقابتیں تو ازل سے چل رہی ہیں، چلتی رہیں گی مگر آج تک چوہدری خاندان نے کسی عورت کو ملوّث نہیں کیا تھا۔ چوہدری فاروق اور مظفر نے پہلی دلیل مثال قائم کی ہے۔ اگر یقین کرسکو تو میں بتانا فرض سمجھتا ہوں کہ کچھ بڑے لوگ مظفر چوہدری پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں کہ لڑکی واپس کردی جائے۔"

"بڑے لوگوں سے مُراد؟"

"بزرگ لوگ، جن میں میرے والد محترم اور چوہدری سرور خان سرِفہرست ہیں۔"

"میں اُن بزرگوں کا ممنون ہوں اور وقت نے جب بھی اجازت دی، میں اُن کا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھے صرف مظفر چوہدری تک جانے کا راستہ بتادیں۔"

"وہ کل یہاں تھا، اسی شہر میں۔" زبیر بتانے لگا۔ "اُس نے مجھ سے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ وہ علاقہ غیر میں جانا چاہتا ہے اور مجھ سے تعاون کی درخواست کررہا تھا۔ میں نے ایک شرط رکھی تھی کہ لڑکی میرے حوالے کردو اور میں تمھیں خان دوراں کے سپرد کردوں گا مگر اُس نے میری پیش کش مسترد کردی تھی... وہ لڑکی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"

"تو تم نہیں بتاؤ گے، چوہدری؟" میں نے ریوالور نکال کر اُس کے دل کا نشانہ لے لیا۔ "تم واحد وہ شخص ہو جو مظفر چوہدری کا ٹھکانہ جانتا ہے۔ میں یُوں ہی اندھیرے میں ٹٹولنے اِدھر نہیں آیا ہوں۔"

"یہ خطرناک کھلونا جیب میں رکھو، خرم چوہدری۔" وہ میری آنکھوں میں جھانک کر غرّایا۔ "تمھیں بتانے والے نے صرف میرا نام ہی بتایا ہوگا۔"

"میری بات کا جواب دو، چوہدری! ہاں یا نہ۔"

"سنو، لڑکے!" وہ آگے جُھک کر سرد لہجے میں بولا۔ "میں احمق نہیں ہُوں اور نہ ہی تم پاگل ہو۔ دن کی روشنی، مصروف ہوٹل اور سڑکیں، تم نظرانداز نہیں کرسکتے۔ پُرسکون ہو کر میری باتیں سنو۔ مظفر چوہدری بہت آگے نکل چکا ہے۔ جانتے ہو، اُس نے اپنی حفاظت کا کیا انتظام کررکھا ہے۔ اُس نے لڑکی کے جسم پر بمفٹ کردیا ہے جو ریموٹ کنٹرول کے نظام سے منسلک ہے۔ جب بھی کوئی ہاتھ لڑکی کے قریب پہنچے گا تو مظفر کی انگلی بٹن دبادے گی اور اُس ہاتھ کو انسانی جسم کے بکھرے ہُوئے لوتھڑے سمیٹنے پڑیں گے۔ میں نے ایک کوشش کی تھی۔ میری پُشت پر بزرگوں کی رضامندی تھی لیکن جب مجھے صُورتِ حال سے آگاہ کیا گیا تو میں لڑکی تک پہنچ کر بے بس ہوگیا تھا۔ اگر تمھیں اُس کی جان عزیز ہے تو میرا مشورہ ہے کہ جذبات سے ہٹ کر قدم اُٹھاؤ ورنہ اُسے ضائع کر بیٹھو گے۔"

"تم نے تاریخ میں ایسے واقعات نہیں پڑھے، چوہدری! جب کسی کی آبرو خطرے میں پڑ گئی تو غیرت مند مردوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی خواتین کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ایسا ہوتا رہا ہے، چوہدری! میں صرف اپنی عزت اُس درندے سے بچانا چاہتا ہُوں۔ اگر میرے سامنے وہ لوتھڑوں میں بدل گئی تو میں اللہ کا شکر ادا کروں گا۔"

"ہمارے ساتھ مل کر سلامتی کا راستہ کیوں نہیں اختیار کرتے، چوہدری؟"

"وہ راستہ طویل ہے، چوہدری! اور میں اس احساس کے ساتھ زندہ نہیں رہنا چاہتا کہ میرے خاندان کی ایک عفت مآب لڑکی کسی درندے کی کھوہ میں سسک رہی ہے۔ مجھے اس تک لے چلو۔ میں اُسے مجبور کردوں گا کہ وہ ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبادے۔"

"جذباتی نہ بنو، خرم سلطان! ہمیں چند روز کی مہلت دو، کوئی نہ کوئی آبرومندانہ راہ نکل آئے گی۔ ہم اسے باہر نہیں جانے دیں گے، یہ میرا وعدہ ہے۔"

"اور میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا، یہ میرا فیصلہ ہے۔" میں اُٹھا اور گھوم کر ریوالور، اُس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ "میں مصروف ہوٹل، سڑک اور روشنی کو مدِنظر نہیں رکھوں گا۔ چوہدری زبیر! یہ کوئی دھمکی نہیں ہے لیکن کسی خوش فہمی کا انجام دیکھنے کے بعد تمھارے پاس محض چند سانسیں رہ جائیں گی۔"

"اب کیا چاہتے ہو؟"

"رہنمائی..." میرے حلق سے غرّاہٹ اُبھری۔ "تم میرے ساتھ مظفر چوہدری تک چلو گے۔"

"بصورتِ دیگر..."

"ایک گولی اور بس..."

"ہُوں..." وہ ہونٹ چبانے لگا۔ "تو تم بھی پاگل ہو چکے ہو۔ چلو۔" وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "صرف خلوصِ نیّت کی خاطر، ورنہ میں ان دھمکیوں سے خوف زدہ نہیں ہُوں۔ ہم دوستانہ انداز میں باہر جائیں گے۔"

"لیکن تم میرے ریوالور کی زد پر ہوگے۔" میں نے پیچھے

ہٹ کر اُسے راستہ دیا۔ جب وہ آگے بڑھا تو میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔

باہر اُس کی سوزوکی کار کھڑی تھی۔ اُس کا انداز بڑا پُرسکون تھا۔ یہی وجہ میرے لیے باعثِ اُلجھن تھی۔ وہ جو بھی کوئی تھا، فاروق اور کلثوم نے اُس کے بارے میں جس وثوق سے باتیں کی تھیں، وہ مظفر چوہدری کا خاص آدمی تھا۔ دوست، رشتے دار یا شریکِ کار... لیکن وہ پُرسکون تھا۔ اپنے دوست کو دُشمن کے حوالے کرنے کا احساس اُس کے چہرے پر نہ تھا۔ حالانکہ مظفر کی ہار، کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ قاتل تھا، اُس نے ایک خاندان کی لڑکی اغوا کرلی تھی۔ ان جرائم کی اُسے جو سزا مل سکتی تھی، زبیر چوہدری اُس سے بے خبر نہ تھا۔

"تمھاری ضد اور جذبات کی خاطر میں بھک مار رہا ہُوں..." وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔ "ورنہ مجھے ایک فی صد بھی اُمید نہیں کہ مظفر اب وہاں ہوگا۔"

"دیکھ لینے میں حرج بھی تو نہیں، چوہدری!" میں نے جواب دیا۔ "وہ نہ ملا تو اُس کے نقشِ پا تو ہوں گے۔"

"وہ کوئی اناڑی مجرم نہیں ہے، خرم سلطان!" زبیر نے کار بیک کرتے ہُوئے کہا۔ "جب اُس نے پہلا ڈاکا مارا تھا تو اُس کی عُمر صرف چودہ سال تھی۔ وہ چار بار جیل جاچکا ہے اور اُس کے ساتھ تیس غنڈوں کا گروہ ہے۔ سات آدمی تو ہر وقت اُس کے ساتھ سائے کی طرح رہتے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہوگا، مضبوط قلعے میں بند ہوگا۔"

"آپ کو میں قلعے تک نہیں لے جاؤں گا۔ آپ مجھے دُور سے صرف قلعہ دکھا دیجیے گا۔" اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کار، ویل سڑک پر ڈال کر زبان بند کرلی تھی۔

کنری روڈ پر چند فرلانگ چل کر اُس نے کار کچے میں اُتار دی تھی، ناہموار اور کیچڑ زدہ سڑک، ایک آبادی تک جارہی تھی۔ وہ آبادی دس پندرہ گھروں پر مشتمل تھی، زیادہ تر جھونپڑے تھے اور میدان میں بھینسیں چر رہی تھیں۔ ایک مجرم کو ایسی ہی بے نام آبادی میں پناہ مل سکتی تھی۔

"اب تمھیں مجھ پر بھروسہ کرنا ہوگا۔" زبیر، کار روک کر بولا۔ "اگر مظفر یہاں ہے تو تمھیں میرے ساتھ دیکھ کر اُسے کیا کرنا چاہیے، اس سے تم انکار نہیں کرسکتے۔ وہ مفرور قاتل ہے اور اُس کے پاس دستی بم اور دُور مار رائفل ہے۔ مجھے جانے دو، اگر موجود ہُوا تو میں واپس آکر تمھیں بتادوں گا۔"

اُس کی بات معقول تھی۔ واقعی اگر مظفر موجود ہوتا تو مجھے ساتھ دیکھ کر، وہ میرا استقبال، اکیس دھماکوں سے بھی کرسکتا تھا۔ میں اُس کے نزدیک اتنا ہی اہم تھا لیکن زبیر پر بھروسہ کرنا، ایک اور دھوکا... کھانا اور ہاتھ آئے شکار کو چھوڑنے کے مترادف تھا۔ وہ غائب ہوجاتا تو میں کیا کرسکتا تھا۔

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا، چوہدری! میں چہرہ چادر میں چھپا کر، آپ کی آڑ میں چلوں؟"

"لیکن کیوں؟"

"میں اُس کی پناہ گاہ دیکھنا چاہتا ہُوں اور پناہ دینے والوں سے چند باتیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، آؤ، چلتے ہیں۔"

میں نے اپنا چہرہ چادر میں اس طرح چھپا لیا کہ پہچانا نہ جاسکوں پھر ہم کیچڑ اور گندے پانی سے بھرے ہُوئے گڑھوں سے بچتے بچاتے، تنگ گلیوں سے گزرتے، ایک پختہ مکان کے سامنے جا رُکے جس کا دروازہ ٹین کا تھا۔ چوہدری زبیر نے پاؤں کی ضرب سے دستک دی تھی۔

میرا ہاتھ ریوالور کے دستے پر جما ہُوا تھا اور نگاہیں ٹین کے دروازے پر مرکوز تھیں۔ میرے سامنے چوہدری زبیر کھڑا تھا، پردۂ غیب میں کیا تھا، اسی کا انتظار تھا۔

"کون ہے؟" آواز انسان کی تھی لیکن بولنے کا انداز بلڈاگ سے مشابہ تھا۔

"دروازہ کھول، اشرف! میں چوہدری زبیر ہُوں۔"

کواڑ کھڑکھڑاتے ہُوئے کھل گئے۔ سامنے ایک دیو قامت، سیاہ رُو شخص، مُٹھیاں پھیلائے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر افقی زخم کا نشان تھا جیسے کسی نے دائیں آنکھ سے ٹھوڑی تک پیمانہ رکھ کر گہری لکیر سے چہرہ دو حصّوں میں منقسم کردیا ہو۔

"ساتھ کون ہے، چوہدری؟" اُس نے بھرائی ہُوئی آواز میں پوچھا۔

"اپنا ہی آدمی ہے۔ اندر چل، میں چوہدری سے ملنے آیا ہُوں۔"

"چوہدری رات گیارہ بجے یہاں سے نکل گیا تھا۔"

"اوہ... لڑکی بھی؟" زبیر نے پوچھا۔

"لڑکی تو پہلے ہی یہاں سے ہٹا دی گئی تھی۔"

"میں یہی بتانے آیا تھا، اُسے۔" پولیس سے کسی نے مخبری کردی ہے۔ اب اُسے اِدھر تلاش کیا جارہا ہے۔"

"چوہدری باخبر ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔ حالانکہ اس میں ہنسی کی کوئی بات تھی نہ جواز۔ "کل شام وہ یہاں سے روانہ ہوجائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گا۔ دس ہزار میں بات ہوئی ہے۔"

"ساتھ اور کون جائے گا؟"

"مجھے زیادہ معلوم نہیں، چوہدری! میں نے اُس کی بات خان سے کروادی تھی۔"

معاً میری گدّی کی بند آنکھیں کھل گئیں لیکن دیر ہو چکی تھی۔ اگر میری توجہ اُن کی باتوں پر نہ ہوتی تو آنکھیں اتنی دیر نہ لگاتیں۔ سرد شے کا جانا پہچانا دباؤ تھا۔ تب ہی مجھے اس شخص کی ہنسی کا جواز مل گیا۔

"بھائیوں کے لیے راستہ چھوڑ دو، بُولی!" آواز بھی مانوس تھی جو میری ریڑھ کی ہڈی میں اُترتی چلی گئی تھی۔ چوہدری زبیر بھی آواز کا چابک کھا کر پلٹا تھا... مگر میں پلٹنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔

"یہ اپنا آدمی ہے، مظفر!" زبیر بولا۔ "رائفل نیچے کرلو۔"

"مجبوری ہے، برادر!" مظفر نے جواب دیا۔ "اپنا ہُوا تو معافی مانگ کر سینے سے لگالوں گا۔"

موت شہ رگ پر اُنگلی رکھے کھڑی تھی اور میں خوش تھا۔ ایسے ہی جیسے کوئی مہم جُو شخص، سونے کی کان میں، چٹان لڑھکنے سے بند ہوگیا ہو اور اُس کے سامنے سونا بکھرا ہُوا ہو، سونے کے ڈھیر پر موت کا احساس جتنا خوش گوار ہوتا ہے، اُتنا ہی خوش گوار احساس میرے اندر لہریں مارنے لگا تھا۔ شاید بے خوفی کی وجہ وہ یقین ہی رہا تھا جو ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، اس سے مفر نہیں۔

اُس نے دباؤ بڑھایا اور میں چوہدری زبیر سے رگڑ کھاتا ہُوا اندر چلا گیا۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ چوہدری زبیر کی ذات، اُس شخص کے نزدیک محترم اور قیمتی ہے تو میں زبیر کو ڈھال بنالیتا مگر کھیل بگڑ بھی سکتا تھا۔ چوہدری زبیر نے میری ہر خواہش کا ساتھ دیا تھا۔ اگر وہ میری وجہ سے نقصان میں رہتا تو مجھے دُکھ ہوتا۔

چوہدری زبیر بھی اندر آگیا تھا۔ اُسے اس گینڈے نے سنبھال رکھا تھا ورنہ وہ ضرور مظفر چوہدری پر اپنا اثر و رسوخ زائل ہوتا دیکھ کر کوئی دوسری کارروائی کرتا۔

میں نے اندر داخل ہو کر عابدہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔

"چہرہ دکھاؤ، برادر!" مظفر نے ایک دم رائفل کی نال سے چادر کو جھٹکا دیا اور پھر اُس کے حلق سے اُبھرنے والی دہاڑ نے اُس مکان کی دیواروں کو لرزا دیا تھا۔ جب اُس کی آواز کی گونج معدوم ہُوئی تو میرے قہقہے چھت اُڑانے لگے۔

"زبیر خان!" وہ پھر دہاڑا۔ "تم نے... تم نے یہ خنجر میری پیٹھ میں گھونپنا چاہا تھا۔"

"ہاں، مظفر خان!" زبیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جس طرح تم اس شیر کو چوہا بنا کر اندر لے آئے ہو، اسی طرح اس نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ مظفر جیسا محتاط اور پُرانا شکاری آواز نکال کر اپنا ٹھکانہ نہ بدلے گا۔ میرے ساتھ کوئی دوسری طاقت بھی اِدھر آسکتی تھی۔ چوہدری! کیا تمھیں حالات کی سنگینی کا احساس نہیں۔ پورے ضلعے کی پولیس چہرہ چہرہ اور گھر گھر چھان رہی ہے اور تم اُن کی ناک کے نیچے آدم کر رہے ہو۔"

"یہ بھی ایک نفسیاتی چال ہے، زبیر خان!" مظفر بولا۔ "پولیس سوچ بھی نہیں سکتی مظفر خان، پنڈی میں ٹھہر سکتا ہے۔ اُنھوں نے باہر جانے کے تمام راستے بلاک کر رکھے ہیں۔ میرے ہمدردوں نے پولیس کو دوسری لائن پر لگا دیا ہے۔ اُن کے خیال میں مظفر، علاقہ غیر میں جا چکا ہے یا جانا چاہتا ہے۔ اس لیے، میرے لیے محفوظ پناہ گاہ شہر ہی ہو سکتی ہے۔"

وہ مناسب فاصلے پر تھا اور رائفل کی نال اور نگاہیں مجھ پر جما کر وہ زبیر چوہدری سے باتیں کر رہا تھا۔ اشرف کے ہاتھ میں بھی اعشاریہ چار پانچ کا سیاہ پستول دبا ہُوا تھا۔ لہٰذا میں اُن کو چڑانے کی خاطر قہقہے ہی لگا سکتا تھا۔ مظفر چوہدری میرا دُشمن ہی نہیں بلکہ برادری کے حوالے سے شریک بھی تھا۔ میں اُسے احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ خرم سلطان موت کی جھانکتی آنکھوں سے خوف زدہ ہے۔

"اب مجھ سے بات کرو، چوہدری! میں بڑی مشکل سے تم تک پہنچا ہُوں۔" میں نے بھڑکتی آواز میں اُس کی توجہ کو للکارا۔

"ہاں، پیارے!" وہ ہنس پڑا۔ "تم سے تو سینہ مِلا کر باتیں کروں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمھیں زبیر تک کس نے پہنچایا تھا؟"

"گھر کے کسی بھیدی ہی نے یہ کرم کیا ہوگا۔"

"نام نہیں بتاؤ گے؟"

"نام سُن کر تمھیں خوشی نہیں ہوگی، مظفر خان!" میں نے اُس کو رگیدنا شروع کیا۔ "اس لیے کہ وہ نام اور رشتے سُن کر تم خود پر بھی اعتبار کرنا ترک کر دو گے۔"

"انگارے کو آگ اور کیا جلائے گی، خرم سلطان؟" وہ دبک کر بولا۔ "میں سارے رشتے پھلانگ آیا ہُوں۔ میرے پیچھے آگ اور خون کا سمندر ہے میں پلٹنا بھی چاہُوں تو آگ کے

جوا کچھ نہیں پا سکتا۔"

"زندگی پلٹنے کا نام نہیں، چوہدری!" میں نے کہا۔ "سمندر عبور کر کے لوگ آگے بڑھا کرتے ہیں اور پھر منافعے کے ساتھ خشکی کے رستے اپنے گھر جاتے ہیں۔ میں تمھارے لیے ایسا ہی راستہ لایا ہُوں۔ تم مال فروخت کر کے دوسرے راستے سے گھر جا سکتے ہو۔"

"پہلے مجھے اس شخص کا نام بتاؤ جس نے تمھیں راستہ دیا ہے۔"

"اگر بضد ہو تو سُن لو۔" میں نے کندھے اُچکا کر کہا۔ "فاروق درکھوم۔"

"نہیں..." وہ رائفل لہرا کر چیخا۔ "بکواس۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"سُنو، چوہدری! نیکی اور احسان کے اندر بھی ایک طاقت ہوتی ہے جو پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔ میں نے اُن کو پیسے اور بندوق سے نہیں بلکہ اپنے کردار سے شکست دی ہے۔ میں گزشتہ رات وہاں گیا تھا۔ وہ دونوں گہری نیند سوئے تھے۔ میں نے صرف فاروق کو جگایا تھا، میری کوشش تھی کہ وہ معصوم لڑکی بیدار نہ ہو لیکن فاروق نے اُسے بھی جگا دیا تھا۔"

"پھر... پھر... تم نے... بولو، خبیث! بولو۔" مظفر ہانپنے لگا۔ "کھوم کہاں ہے؟"

"اپنے گھر میں مظفر خان! جہاں وہ پلی بڑھی، اُسی گھر میں۔ کیونکہ میں مظفر چوہدری نہیں ہُوں۔ میرے باپ کے خون میں لذتِ جراثیم نہ تھے۔ میں نے ایک پاکباز ماں کا دودھ پیا ہے... چوہدری! میرے اندر سے احترامِ انسانیت ابھی مرا نہیں ہے۔ مجھے احساس ہے کہ عورت خاندان کی خوشبو ہوتی ہے۔ میں نے اُس پھول کو نہیں توڑا۔ حالانکہ تمھارا مفلوج بھائی، گھٹنوں میں سر دے کر رُو پڑا تھا۔"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں، مظفر خان!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں جھوٹ بول کر، تمھاری رائفل کا رُخ نہیں موڑ سکتا کیونکہ تم جیسے لوگوں میں ایسے جذبوں کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔"

"سُنو، خرم سلطان!" وہ جھرجھراتے لہجے میں بولا۔ "اگر یہ سچ ہُوا، تم نے میرے خاندان کی عزت کو نقصان نہیں پہنچایا تو میں زبیر خان کو ضامن بنا کر عہد کرتا ہُوں کہ میں عابدہ کو آج رات ہی حویلی میں پہنچا دوں گا لیکن تمھیں میرے پاس رُکنا ہوگا۔"

"اگر تم، عابدہ کو دیکھنے اور اُس سے باتیں کرنے کا موقع فراہم کرو تو میں ایک ماہ رُک سکتا ہُوں۔"

"یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ مگر اُس کی عزت کا دامن محفوظ ہے یا نہیں۔"

"کیا یہ میرا حق نہیں، چوہدری؟"

"بے شک ہے۔" اُس نے اشرف کی جانب دیکھا۔ "جاؤ، اُسے یہاں لے آؤ۔ کہنا، خرم سلطان آیا ہے۔ ورنہ وہ نہیں آئے گی۔ بے حد غصیلی اور جی دار لڑکی ہے۔"

"اب پیچھے کی اجازت دے دو، مظفر!" زبیر بولا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم ابھی پورے نہیں جلے۔"

زبیر، بان کی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مظفر نے ٹھوکر مار کر ایک کُرسی میری جانب کھسکا دی لیکن میں کُرسی کی پُشت پر کُہنیاں ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ میری نگاہیں صحن کی جانب لگی ہُوئی تھیں۔ حالانکہ صحن دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن احساس کی آنکھیں توسات سمندر پار سے بھی دیکھتی رہی تھیں، اُس لڑکی کو جو لائی جانے والی تھی۔

قدموں کی چاپ سُنائی دی تو میں میکانکی انداز میں سیدھا کھڑا ہو گیا پھر غیر ارادی طور پر میرے قدم اُٹھتے چلے گئے لیکن مظفر نے ایک دم میرے سینے پر نال رکھ کر مجھے روک لیا تھا۔

"نہیں، خرم سلطان! تم باہر نہیں جا سکتے۔"

وہ سیاہ چادر میں لپٹی ہُوئی اندر آئی۔ اُسے اشرف خان نے سہارا دے رکھا تھا۔

"خرم..." وہ تڑپ کر چیخی اور میں نے رائفل کی زد سے نکل کر اُسے تھام لیا۔ "خرم سلطان! مجھے... مجھے یقین تھا۔" وہ میرے بازو پر چہرہ رگڑتے ہُوئے بلکتی آواز میں بولی۔ "تم ضرور آؤ گے... تم نے ایک بار اُدھر بھی مجھے درندوں سے نجات دِلائی تھی۔"

"میں آگیا ہُوں، جان!" میں نے اُس کے بالوں پر چہرہ رکھ دیا۔ آہ... کیسا سکون مِلا تھا مجھے۔ حالانکہ اُس کے بال گرد آلود، خُشک اور بکھرے ہُوئے تھے لیکن پاکیزگی کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ وہ پاک تھی، اس لیے اُس کے بدن کی پاک خوشبو میری رُوح کو سرشار کر گئی تھی۔ میں نے اُسے سنبھال کر کُرسی پر بٹھا دیا۔

"اس سے پُوچھ لو، چوہدری!" مظفر بولا۔ "میں نے بُری نیت سے اس کے بال کو بھی نہیں چھیڑا ہے۔"

"ہاں، خرم! یہ اچھا آدمی ہے۔ اسے معاف کر دو۔" عابدہ نے مظفر کی سفارش کی اور میں اُس کی سادگی پر مُسکرا کر رہ گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ صورتِ حال کیا ہے۔

"اشرف! تم رات کو چھپ چھپا کر گاؤں جاؤ گے اور خرم سلطان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بیان کی تصدیق کرو گے۔"

"سُنو، مظفر!" زبیر بولا۔ "تم نے مجھے ضامن بنایا ہے... تو لڑکی میرے حوالے کر دو، خرم تو کم رکھ لو۔ جب اشرف تصدیق کرے گا تو میں یہ خوش گوار فرض ادا کروں گا۔"

"نہیں، زبیر!" مظفر نے نفی میں گردن ہلائی۔ "معاملہ صرف لڑکیوں کا نہیں، خرم سلطان نے میرے دو آدمی قتل کیے ہیں جن کا خون میرا نام بول رہا ہے۔ میں اس کا بیان ریکارڈ کروں گا... اسے مجبور کروں گا کہ قتل کا اعتراف کرے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو کاغذ قلم لاؤ۔ میں زبیر کی گواہی میں اپنا اعتراف نامہ تحریر کروں گا۔"

"اشرف..." مظفر جلدی سے بولا۔ "جاؤ، کاغذ اور قلم لے آؤ، چوہدری کی گاڑی لے جاؤ۔"

اشرف نے پستول واسکٹ کی جیب میں رکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں مظفر چوہدری کی حماقت پر دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ گدھے کو یہ بھی خیال نہ آیا تھا کہ ایسی تحریروں کی عدالت میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی جو بندوق کی چھاؤں میں لکھوائی جائیں۔

میں نے اس کی پہلی پیش کش قبول کر لی تھی کیونکہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ فاروق کچھ بھی کہتا تاہم کلثوم میری سفارش ہی کر سکتی تھی... لیکن مظفر نے دو منٹ بعد ہی اپنی نیت ظاہر کر کے خود کو بے نقاب کر دیا تھا۔ اس جیسے شخص پر اعتبار کرنا حماقت ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اشرف کو وہاں سے ہٹانے کی چال چلی تھی کیونکہ اس خالی گھر میں مجھے کاغذ قلم کی کوئی شے ملتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

"اب ہمارے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا ہے، چوہدری!" میں نے مصالحانہ لہجے میں کہا۔ "میں گزارش کروں گا کہ معاہدے کے بعد، زبیر کے ذریعے، دونوں خاندانوں میں بھڑکتی ہوئی آگ سرد ہو جانی چاہیے۔ میں راضی نامے کی بات کر رہا ہوں، چوہدری! دشمنی کی آگ جلتی رہی تو دونوں خاندان جل کر ختم ہو جائیں گے... اور تیسرا گروپ مفاد حاصل کرے گا۔"

"پولیس کو کون راضی کرے گا، چوہدری؟" مظفر نے پوچھا۔

"اگر ہمارے راضی نامے کو پولیس قبول کرے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"جب ہم راضی ہو جائیں گے تو پولیس کو دست اندازی کا حق نہیں رہے گا۔"

"کیوں، زبیر!" مظفر نے پوچھا۔ "کیا ایسا ممکن ہے؟"

"اگر مقتولین کے لواحقین بھی تمہیں معاف کر دیں تو۔" زبیر نے جواب دیا۔ "کچھ لوگ تمہارے حلقۂ اثر میں ہیں... اور کچھ کو میں مناؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میں خرم سلطان سے راضی نامہ کر لوں گا۔"

"اب ہمیں دلوں سے کدورتیں نکال کر اچھے وقت کی ابتدا کرنی ہوگی۔" میں نے دوسری کرسی مظفر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ، چوہدری!"

"شکریہ، دوست!" وہ رائفل زمین پر ٹیک کر، ابھی کرسی کی جانب جھک ہی رہا تھا کہ میری ٹانگ بجلی کی مانند لہرائی اور مظفر چوہدری ڈکراتا ہوا الٹ گیا۔ وہ پہلو کے بل گرا تھا۔ میں دوبارہ اچھلا اور دونوں پاؤں جوڑ کر اس کی پسلیوں پر مارتا ہوا زبیر کی جانب گھوم گیا کیونکہ وہ میرا نہیں، مظفر کا آدمی تھا... لیکن وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔

"نہیں، خرم سلطان!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "میں ریفری کے فرائض انجام دوں گا۔"

میں نے لپک کر رائفل اٹھالی اور لاٹھی کی طرح گھما کر مظفر چوہدری کے سر پر دے ماری۔ وہ پھڑک کر فرش پر گرا... اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ آدھے منٹ میں کھیل ختم ہو گیا تھا۔

"عابدہ! کیا تمہارے جسم پر کوئی ہم ہے؟" میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا تو عابدہ نے نفی میں سر کو ہلا دیا۔ میں نے خشمناک نگاہوں سے زبیر کی جانب دیکھا۔

"کیا اس نے بم باندھا نہیں تھا؟" زبیر نے تڑپ کر عابدہ سے پوچھا۔

"ہاں... لیکن آج صبح اس نے کھول لیا تھا۔" عابدہ نے بتایا۔

"اب نکل چلو، چوہدری!" زبیر اچھل کر اٹھا۔ "وہ بوکھلا آگیا تو اسے بھی قابو کرنا پڑے گا۔"

"کیا اسے یہاں چھوڑ دیا جائے؟"

"تو کیا اسے بھی...؟"

"ہاں، چوہدری! یہ میرا دشمن ہی نہیں بلکہ قاتل بھی ہے۔"

"لیکن اسے کار تک کیسے لے جائیں گے؟" زبیر بولا۔ "یہ تو زخمی ہے۔"

"فکر نہ کرو، چوہدری! لوگ ہمارے نزدیک نہیں آئیں گے۔" میں نے مظفر کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ اس کے سر کے

زخم سے خون روانی سے بہہ رہا تھا لیکن مجھے اس کی پروا نہ تھی۔

وہ آبادی یقیناً مزدور پیشہ لوگوں کی رہی ہوگی جن کے پاس گیلوں میں پھرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ صرف ایک عورت نے اتفاقاً دیکھ لیا تھا۔ وہ جھاڑو پر کوڑا کرکٹ رکھے، گلی میں اچھالنے کے لیے دروازے پر آئی تھی لیکن ہُو ہان مظفر کو دیکھتے ہی اُسے چھٹکا سا لگا اور وہ جھاڑو، دروازے ہی میں پھینک کر اندر بھاگ گئی تھی۔

"تم چلو، میں ان کو مطمئن کر دوں گا۔" زبیر صورتِ حال سمجھ گیا تھا۔ اگر اندر مرد ہوتے تو وہ باہر آکر زخمی کے بارے میں سوال اور جواب کرتے، ہمارا وقت ضائع کر سکتے تھے۔

میں نے مظفر چوہدری کو پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا اور دوسری طرف اپنے ساتھ عابدہ کو جگہ دے دی۔ اگر اشرف گاڑی لے جاتا تو اس کا ستارہ بھی گردش میں آجاتا لیکن اس نے پیدل جانے کا فیصلہ کر کے اپنی جان بچالی تھی۔

اسے کسی بھی قریبی تھانے میں دیا جا سکتا تھا لیکن میں بادلِ نخواستہ ضمانت لے کر اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اگر میں اسے براہِ راست پولیس اسٹیشن لے جاتا تو پولیس کی ابتدائی کارروائیوں کا جال مجھے جکڑ لیتا جبکہ میں نہ تو پولیس کی نگاہوں میں آنا چاہتا تھا اور نہ ہی میرے پاس وقت تھا اور پھر عابدہ کی ذات بھی خوف ہو سکتی تھی۔

زبیر چوہدری کا رویہ معاون اور متاثر کن تھا۔ اس نے ایک تابعدار کا کردار ادا کر کے اپنی ذات شکوک سے دور کر لی تھی۔ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔

"چوہدری! اب ہم پہلے ہوٹل چلیں گے۔" میں نے مؤدب و دوستانہ انداز میں کہا۔ "میں ڈی۔ آئی۔ جی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"بات ناحق ہے، خرم سلطان!" وہ پشیمان لہجے میں بولا۔ "لیکن اس کارروائی میں میری ذات بھی ملوث ہو چکی ہے۔ مظفر چوہدری میرا بہت پرانا دوست ہے۔ دوستوں میں میرا نام، دوست مار کے حوالے سے لیا جائے گا۔ تم اسے میرے حوالے کر دو۔ میں ضمانت دوں گا، چوہدری! کہ اب یہ لوگ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے۔ مجھے معلوم ہے، خرم سلطان! وہ دونوں آدمی تمہارے ہاتھوں ہی مارے گئے تھے۔"

"لیکن اس نے ایک شخص کو میرے سامنے قتل کیا تھا، چوہدری!" میں نے جواب دیا۔ "میں دشمن نہیں بلکہ ایک قانون پسند شہری کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔"

"اگر تمہارا آفیسر..." "زبیر کاروباری آدمی تھا... دوست سے بزنس مین بن گیا۔ "تو یہ سعادت مجھے دے دو۔ میں پولیس ریکارڈ میں صاف نہیں ہوں۔ شاید اس طرح میرا دامن صاف ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اسے پولیس کے حوالے کر دیں لیکن میں ڈی۔ آئی۔ جی کو آپ کا حوالہ ضرور دوں گا۔"

"تمہیں بتانا ہوگا کہ مظفر چوہدری کو زبیر خان نے پکڑا ہے۔"

"بالکل، جناب! یہ سہرا آپ ہی کے سر رہے گا۔"

ہوٹل کے دروازے پر کار کھڑی کر کے میں، عابدہ اور زبیر کو کار میں چھوڑ کر اندر گیا۔ کار میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ زبیر کو بھی کاؤنٹر کلرک نے دیکھ لیا تھا۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر سامنے رکھ لیا تاکہ کار اور زبیر میرے سامنے رہیں۔ میں نے ڈی۔ آئی۔ جی کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ کسی خاتون نے بتایا کہ صاحب، آفس کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔

آفس فون کیا تو ان کے پی۔ اے نے میرا نام پوچھ کر کال ان تک بڑھائی تھی۔

"ہیلو، بوائے! کہاں ہو؟" ڈی۔ آئی۔ جی نے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

"کچھ ذاتی مصروفیات تھیں، سر! اس لیے قدم بوسی کے لیے حاضر نہ ہو سکا۔"

"تم یقیناً مظفر خان کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو گے؟"

"پوچھنا نہیں، سر! بتانا چاہتا ہوں۔"

"اوہ! تو تم بھی اس کو تلاش کر رہے ہو؟" وہ چونک کر بولے۔ "تمہارے لیے میرے پاس دوسری ہدایات ہیں، خرم سلطان! تم اپنے کام تک محدود رہو گے۔ یہ ہماری دردسری ہے۔"

"دردسری اور فتے داری کے احساس میں فرق ہوتا ہے، سر!" میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ بھڑک اٹھے۔ "مجھے طعنہ دے رہے ہو؟"

"نہیں، سر!" میں نے نرم آواز میں کہا۔ "ایک حقیقت عرض کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر اتنا پریشان نہیں ہوتا جتنا پریشان مریض کے لواحقین ہوتے ہیں۔ خیر چھوڑیے۔ میں نے آپ کی دوسری خدمت کر دی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق مظفر چوہدری کو اس کے دوست نے پکڑ لیا ہے، نام نوٹ کر لیں، سر!"

"اوہ، ٹھہرو۔" ان کی آواز میں بوکھلاہٹ تھی۔ "ہاں، بولو۔"

"زبیر چوہدری، مالک النور ہوٹل، مری روڈ۔" میں نے نام بتایا۔

"وہ مظفر کو متعلقہ تھانے میں لے جا رہا ہے۔ آپ ایس۔ ایچ۔ او کو ہدایات جاری فرمادیں' سر اکھوئی جانب داری نہیں ہونی چاہیے۔"

"میں خود وہاں جا رہا ہوں۔ تم بھی چلے آؤ۔"

"سوری' سر!" میں نے صاف انکار کر دیا۔ "میں بے حد مصروف ہوں۔ کسی وقت گھر پر حاضری دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' فرصت ہو تو شام کی چائے میرے ساتھ پیو..." انھوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے واپس جا کر زبیر کو بتایا۔ "میں نے ڈی۔ آئی۔ جی کو بتا دیا ہے۔ آپ فی الفور اُسے ہمارے علاقے کے تھانے میں لے جائیں' وہ بھی پہنچ رہے ہیں۔"

"شکریہ' چوہدری!" زبیر ممنون آواز میں بولا۔ "تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ مظفر تو اندر چلا جائے گا' فاروق کو میں سنبھال لوں گا۔"

زبیر نے میری چادر سے مظفر چوہدری کے ہاتھ باندھے اور میں نے عابدہ کو اُتار لیا۔

چونکہ عابدہ کمزور تھی' اس لیے میں ٹیکسی والے کو راضی کر کے' اپنے گاؤں کی گلی تک لے گیا تھا۔ اس طرح ہم گاؤں والوں کی نگاہوں میں آئے بغیر اپنی حویلی میں داخل ہو گئے تھے۔ مجھے واپس جانا تھا' اس لیے ٹیکسی کو انتظار میں روک لیا تھا۔

زینت اور اکرم بھائی' مویشی خانے کی طرف سے آ رہے تھے۔ اکرم بھائی نے چارے سے بھرا ٹوکرا اُٹھا رکھا تھا اور زینت کے ہاتھ میں بھینس کی رسّی تھی۔

ہمیں دیکھ کر زینت نے بھینس کو چھوڑ دیا اور دوڑتی ہوئی آ کر عابدہ سے لپٹ گئی۔ عابدہ بھی شاید ضبط کے دھاگے یہاں کے لیے بچا لائی تھی۔ وہ ایسے رونے لگی جیسے زینت کا کوئی رشتے دار فوت ہو گیا ہو۔ اکرم بھائی نے ٹوکرہ ایک طرف رکھا اور عابدہ کو زینت کی بانہوں سے نکال لیا۔

"زینت..." وہ بولے۔ "کیوں بہن کو پریشان کرتی ہو؟ اندر لے چلو' اسے۔"

زینت آنکھیں صاف کرتی ہوئی' عابدہ کے ساتھ جانے لگی تو میں نے اُسے روک لیا۔

"اسے پہلے اماں بی کے پاس لے جاؤ' سہارا دے کر... بیمار ہے۔"

"تم میرے ساتھ آؤ' خرّم!" اکرم بھائی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور میں سر جھکائے ناکردہ جرم کی سزا سننے کے لیے اُن کے ساتھ چل پڑا۔ اُن کا رویہ بتا رہا تھا کہ زینت نے اُن کو صورتِ حال سے بے خبر رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے' اُسے بھی میرے بیان پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"ایسا کیوں ہوا' خرّم سلطان؟" اندر پہنچتے ہی اکرم بھائی رو پڑے۔ "حویلی کے اندر پہلے ہی بڑے دُکھ تھے۔ تم نے کسی سے کہا ہوتا' مجھ سے ہی کہہ دیتے۔ کتنی بُری مثال قائم کی ہے تم نے۔"

"آپ کو زینت نے کچھ نہیں بتایا' بھائی جان؟"

"یہی بتایا تھا کہ خرّم سلطان' عابدہ کو شہر لے گیا ہے۔"

"حالانکہ ایسا نہیں ہوا' بھائی جان!" میں نے اکرم بھائی کو اصل واقعات بتا دیے۔

"کیا زینت ان حقائق سے آگاہ تھی؟" اکرم بھائی نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' میں اُسے کل سب کچھ بتا گیا تھا۔"

"ہوں..." اُن کے اندر سے گہری سانس اُبھری۔ "وہ... وہ مجھے ایک فاتو برتن سے زیادہ اہمیت بھی تو نہیں دیتی۔ تم نے مجھے کس اذیت سے دوچار کر دیا ہے' خرّم؟ آخر کس جرم کی سزا' تم لوگوں نے مجھے دی ہے۔ میں یہاں مجرمانہ زندگی کا احساس لیے پل پل مرتا رہتا ہوں۔"

"آپ خود کو مرد اور چوہدری سلطان کا وارث کیوں نہیں ثابت کرتے؟" میں نے دکھتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ اس حویلی اور خاندان کے سربراہ ہیں۔ آپ کو گاؤں کی قیادت سونپی گئی ہے' آپ ممبر ہیں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ صرف اپنی ذات کے محاذ پر لڑ رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے' بھائی جان؟... آپ کے اندر احساسِ کمتری کیوں ہے؟ آپ جوان اور وجیہہ ہیں... آپ کو دُکھ کیا ہے؟"

"بہت..." وہ سسک اُٹھے۔ "بہت بڑا دُکھ ہے' خرّم... میں نے تم دونوں کو قتل کر دیا ہے۔ میں کہیں باہر تو نہ تھا۔ تم دونوں میرے سامنے' میرے ہاتھوں میں پلے بڑھے اور محبت کے چراغ روشن کرتے رہے تھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ زینت کون ہے؟ کسے خوابوں میں دیکھتی ہے؟ اس کی جاگتی آنکھوں میں کس کا انتظار رہتا ہے...؟ لیکن حالات اور تم لوگوں نے مجھے قاتل بنا دیا ہے۔"

"کیا زینت نے بہ رضا و رغبت آپ کو شریکِ حیات تسلیم نہیں کیا تھا' بھائی جان؟"

"ہاں' کاغذ پر۔"

"نہیں' بھائی جان! وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ اُس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حالات اور خاندان کی عزت پر سب کچھ قربان کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ منافق نہیں ہے۔ آپ ہی فاصلہ رکھے سوچتے رہتے ہیں۔"

"سنو' خرّم سلطان!" وہ ایک قدم آگے بڑھ آئے۔ "مجھے جینے دو۔ میں ذلت کی زندگی اور موت سے خوف زدہ ہوں۔ اگر تم دونوں نے مجھے سہارا نہ دیا تو میں وہ موت مر جاؤں گا جسے اللہ بھی ناپسند کرتا ہے۔ مجھے بچا لو' خرّم سلطان! خدارا' مجھے اس عذاب سے بچا لو۔"

"آپ... آپ..." میں نے لپک کر اُن کے ہاتھ تھام لیے۔ "آپ اتنے مایوس کیوں ہیں؟ میں' آپ کا بھائی ہی نہیں' بلکہ دوست بھی ہوں۔ مجھے بتا دیجیے' کیا زینت...؟"

"خرّم..." اسی وقت زینت اندر آ گئی اور میں نے اکرم بھائی کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ "تمھیں' اماں بی بُلا رہی ہیں۔"

میں نے اس لڑکی کو نفرت اور خشمناک نگاہوں سے دیکھا جو کبھی میری نگاہوں کو چاندنی اور زندگی دیا کرتی تھی لیکن اُس نے میرے بھائی کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ شاید وہ اپنے قاتل سے سرد انتقام لے رہی تھی... لیکن قاتل تو میں تھا' وقت تھا اور اماں بی کا عجلانہ فیصلہ تھا... پھر اکرم بھائی کو سزا کیوں دی جا رہی تھی؟ اُنھیں تو قربانی کی بھینٹ چڑھایا گیا تھا۔

اُس کی نگاہوں میں بھی قہر تھا۔ سدا مسکراتی اور ہنستی آنکھیں مجھ سے ناراض تھیں۔ "جاؤ' عابدہ کی امّی کو بھی اطلاع دے آؤ۔" میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس وقت نہیں' مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

"تم تو ہمیشہ وقت کو باہر چھوڑ کر آتے ہو۔" اکرم بھائی جلے۔ "باہر کیا کرتے ہو' خرّم؟ تمھاری ضرورت یہاں ہے' اس حویلی کی گرتی ساکھ اور اپنوں کو مت جاؤ' خرّم!"

میں اُن کو جواب دیے بغیر تیز تیز قدم اُٹھاتا' اماں بی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ عابدہ' اماں بی کے شانے پر سر رکھے سسک رہی تھی اور اماں بی اُس کا سر سہلا رہی تھیں۔

"بیٹھو' خرّم! اور مجھے بتاؤ' مظفر چوہدری کیا چاہتا ہے' اب تم سے؟" اماں بی نے سرد آواز میں کہا۔

"جو کچھ وہ چاہتا ہے' اُسے مل گیا ہے' اماں بی!" میں نے دو قدم بڑھ کر اپنا چہرہ اُن کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ "وہ اس حویلی کا نام و نشان مٹانا چاہتا تھا لیکن اب وہ خود مٹ چکا ہے۔"

"ہاں' عابدہ نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے اُسے پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔"

"بس' اب امن و امان رہے گا' اماں بی!" میں نے کہا۔ "فاروق چوہدری سلاخوں کے پیچھے ہے۔ مظفر قتل کے کیس میں اندر جا چکا ہے۔ اب آپ لوگوں کو کوئی پریشان نہیں کرے گا۔"

"تم واپس کب آ رہے ہو؟"

"میں آپ کی دعائیں لینے آتا رہوں گا' اماں بی!"

"میں اب تمھارا گھر بسانا چاہتی ہوں' خرّم!" اُنھوں نے عابدہ کی جانب دیکھا۔ "بچی کے دُکھوں کا ازالہ ضروری ہے۔"

"آپ کی آغوش میں کوئی دُکھی نہیں رہ سکتا' اماں بی!" میں نے کہا۔ "حکومت نے میرے کندھوں پر ایک وردی فورس ڈال دی ہے۔ اُدھر سے فرصت پاتے ہی آپ کے قدموں میں سر رکھ دوں گا۔"

"چند دنوں کی چھٹی لے لو' بیٹے!"

"نہیں' اماں بی! فی الحال چھٹی نہیں مل سکتی۔"

"تمھیں نوکری کی ضرورت ہی کیا تھی' بیٹے؟" اماں بی نے پیار بھرے انداز میں کہا۔ "اگر کرنا ہی تھی تو کچھ عرصہ آرام کر لیتے... اُدھر بھی کام کرتے رہے ہو۔"

"اماں جانی!" میں نے اُن کے ہاتھوں پر چہرہ رکھ دیا۔ "اُسی کمپنی کا دفتر اِدھر ہے۔ مجھے افسر بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

"اللہ' تمھیں بہت بڑا افسر بنائے۔" اماں بی نہال ہو گئیں اور جھک کر مجھے چومنے لگیں۔ "زینت کہہ رہی تھی... کہ کسی ٹھیکے دار کے ساتھ مل کر تم نے ٹھیکے داری شروع کر دی ہے۔"

"ایک طرح وہ ٹھیکے داری ہے' اماں بی!" میں نے زینت کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "کمپنی حکومت سے مل کر یہاں سرکاری ملازمین کے لیے کوارٹرز اور کوٹھیاں تعمیر کرتی ہے۔ میں منیجر ہوں۔"

"منیجر..." اماں بی حیرت سے بولیں۔ "منیجر سب سے بڑا افسر ہوتا ہے' نا؟"

"جی ہاں' اماں بی!" سب سے بڑا۔" میں نے کن انکھیوں سے عابدہ کی جانب دیکھا۔ وہ اماں بی کے شانے سے مسکراتی نگاہوں سے' میری اداکاری کی داد دے رہی تھی۔ حویلی میں صرف وہی ایک لڑکی تھی جو میرے ماضی اور حال کی رازدان تھی' وہی جانتی تھی کہ خرّم سلطان وہاں کیا کرتا رہا ہے اور یہاں کون سی ٹھیکے داری کر رہا ہے۔ میں نے اُسے فاروق چوہدری سے لے کر اپنی موجودہ ڈیوٹی تک سب کچھ بتا دیا تھا۔ اُسے مطمئن کرنا ضروری تھا۔ ورنہ ان حالات کے بعد وہ فیصلہ کن انداز میں اپنی قسمت کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عورتوں کی سی تھی۔

عابدہ کی امّی کو زینت نے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ جوڑوں کے درد کی وجہ سے بہت کم اپنے کمرے سے نکلتی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر اُن کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ جواب میں اُنھوں نے میری پیشانی پر محبت کی مہر ثبت کی تھی۔ عابدہ اُٹھی لیکن ایک قدم چل کر اُس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ حالانکہ میں نے اُسے بہت کچھ پڑھا دیا تھا لیکن معصوم لڑکی، ماں کے سامنے کیسے اداکاری کرتی۔

"تم نے اسے کیوں بلایا تھا، خرّم بیٹے؟"

"آپ تشریف رکھیں خالہ جان!" زینت نے اُن کو دوسرے پلنگ پر بٹھا دیا۔

"ایک مجبوری تھی خالہ جان!" میں نے مؤدّب لہجے میں جواب دیا۔ "میرے بڑے صاحب کی بیٹی پاکستان آگئی تھیں۔ اب دیکھے نا، میں تو اُن کے ساتھ نہیں گھوم پھر سکتا تھا اس لیے عابدہ کو بلانا پڑا تھا۔"

"کیا وہ چلی گئی ہے؟"

"نہیں... لیکن عابدہ کو فلو ہوگیا ہے۔" میں نے بتایا... "انگریز لوگ بیماری سے بہت ڈرتے ہیں، اس لیے مجھے دوسری لڑکی کا انتظام کرنا پڑا ہے۔"

"لیکن یہاں تو کچھ دوسری باتیں بن رہی تھیں بیٹے...!" اُنھوں نے شاکی لہجے میں کہا۔ "اگر ایسی بات تھی تو تمھیں خود آنا چاہیے تھا۔ ہم غریب لوگ بدنامی کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔"

"کس نے آپ کو بدنام کیا؟" زینت بھڑک کر بولی۔ "لوگوں کی زبان تو ہم نہیں پکڑ سکتے تھے۔"

"ہاں..." وہ کراہتے ہوئے بولیں۔ "اپنی زبان چل پڑے تو قابو میں نہیں رہتی، لوگ تو پھر پرائے ہوتے ہیں۔"

"بھول جاؤ خانم!" اماں بی نے نرم آواز میں کہا۔ "غلط فہمی ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ بچی بخیریت آگئی، بس ہمارے لیے یہی بہت ہے۔ ویسے خرّم کی غلطی تھی اُسے پوری بات بتانا چاہیے تھی۔"

"میں نے جس آدمی کو بھیجا تھا، اُسے بتا دیا تھا لیکن وہ، آپ لوگوں کو نہیں بتا سکا۔"

"چلو، مٹی ڈالو۔" اماں بی بولیں۔ "آیندہ احتیاط لازم ہے۔"

"اماں بی! مجھے واپس جانا ہے۔" میں نے منمناتی آواز میں بتایا۔ "آج رات بڑے صاحب کی بیٹی کے اعزاز میں سرکار، پارٹی دے رہی ہے، میری شرکت بے حد ضروری ہے۔"

"پھر کب آؤ گے؟" اماں بی نے اپنے بڑے افسر بیٹے کو اجازت دیتے ہوئے پوچھا۔

"آتا رہوں گا، اماں بی! کون سا دُور ہوں۔" میں اُٹھا اور زینت مجھ سے پہلے باہر نکل گئی۔

وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے اُسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اکرم بھائی نے میرے اندر آگ سی بھڑکا دی تھی، زینت کے خلاف۔

"دروازے تک میرے ساتھ چلو، زینت!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں بہت کچھ کہتا۔"

"تم بزدل ہو، خرّم!" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "لیکن کب تک روپوش رہو گے؟ کبھی نہ کبھی تو تمھیں احساس ہوگا کہ حویلی میں زندگی کے آثار کیوں مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔"

"سنو، لڑکی!" میں نے اُس کے نرم و نازک شانے پر ہاتھ مارا اور اُس کے مُنہ سے سسکاری نکل گئی۔ "تم آگ سے کھیل رہی ہو۔ تمھیں ایک زندگی سے کھیلنے کا کوئی حق نہیں۔"

"اور تم لوگوں کو زندگی کی شہ رگ کاٹنے کا پرمٹ کس نے دیا تھا؟" وہ بھڑکتی آواز میں بولی۔

"تم... تم چاہتی کیا ہو؟"

"جو نہیں ملا اور نہ کبھی ملے گا۔"

"پھر حالات سے سمجھوتا کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"یہ اپنے اس چہیتے بھائی سے پوچھو، جو مجھے دیکھ کر دُبک جاتا ہے۔"

"سنو، زینت!" میں نے ہونٹ کاٹ کر کہا۔ "وہ نفسیاتی مریض ہیں۔ اُنھیں یقین دلاؤ، اُنھیں اپنی محبت اور خدمت سے واپس اُبھارو، ورنہ وہ کسی بھی وقت خودکشی کر لیں گے۔ اس گرتی دیوار کو صرف تم سہارا دے سکتی ہو... وہ احساسِ جرم کے نیچے سسک رہے ہیں۔"

"کیا اُسے دوبارہ باور کرانا پڑے گا، خرّم، کہ زینت، اُس کی بیوی ہے؟" زینت نے جلتی نگاہوں سے دیکھ کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اوہ... تو کیا...؟"

"ہاں، خرّم! اس کو یقین ہی نہیں آتا۔"

"اس کا انجام کیا ہوگا، کنزن!" میں رو پڑا۔ "خدارا، کچھ سوچو۔ اُن کو بچانا ہوگا۔"

قدموں کی چاپ سُن کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اکرم بھائی کسی ہارے ہوئے جواری کے قدموں سے ہماری طرف آ رہے تھے۔

زینت نے فوراً آنسو پونچھ لیے لیکن اکرم بھائی اُسی کو دیکھ رہے تھے... پھر ہم دونوں ستونوں کی آڑ میں تھے۔ وہ بہت کچھ سوچ سکتے تھے بلکہ سوچ رہے تھے۔ ماضی کی روشنی، اُن کے ساتھ تھی و حال کی ہتھیلی پر اُنھوں نے ہم دونوں کو سب سے چھپ کر روتے دیکھ لیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ ہم سے کچھ باتیں کریں گے۔ اسی لیے میں مؤدب ہوگیا تھا لیکن وہ اسی طرح سر جھکائے ہمارے قریب سے گزر گئے۔

"دیکھا، تم نے خرّم!" زینت گلوگیر آواز میں بولی۔ "وہ خود کو نہیں بلکہ مجھے مجرم سمجھتے ہیں۔ اُن کی نگاہوں میں اُتری ہوئی نفرت صرف میں محسوس کرتی رہتی ہوں لیکن چپ رہتی ہوں۔ میرے پاس اپنی صفائی میں کچھ کہنا مشکل ہے، میں انکار نہیں کر سکتی کہ میں کسی اور کی تھی، کسی اور کو چاہتی ہوں۔"

"اس کا ایک حل ہے، زینت! کہ میں یہاں نہ آیا کروں اور تم اپنا رویہ بدل ڈالو۔"

"یقین کا زہر، اکرم کے خون میں شامل ہو چکا ہے، خرّم..." زینت بولی۔ "ہاں، اگر میں مر جاؤں تو..."

"ہاں، ایک کو تو مرنا ہی ہوگا۔"

"کیا تم بھی یہی چاہتے ہو، خرّم؟" زینت نے تڑپ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ "کیا مجھے اجازت دیتے ہو؟"

"ایک سے مفر ہے، میں اور اکرم بھائی ہیں۔"

"نہیں..." وہ میرے سینے سے سر ٹکرانے لگی۔ "مجھے قربانی دینے دو، خرّم! میں تو ویسے بھی بے نام و نشان ہوں۔ تم لوگ اس حویلی کی آن ہو۔ میں مر گئی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا دونوں زندہ ہیں، زینت؟"

"نہیں..." زینت نے نفی میں سر ہلایا لیکن یہاں زندگی چلتے پھرتے جسم کو کہا جاتا ہے۔"

"بس پھر، اس مٹی کی امانت کو سنبھال کر رکھنا۔" میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر ہٹایا اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں حویلی سے ایک نیا زخم اور دُکھ لے کر نکلا تھا۔ اکرم بھائی کی مایوسانہ باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ایک پیار کرنے والا بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کی محبت پر غاصبانہ قبضے کے احساس میں مبتلا ہے لیکن زینت نے اس اندازے کی دھجیاں بکھیر دی تھیں... پھر اکرم بھائی ہمیں دیکھ کر جس انداز کو اپنائے ہوئے گزر گئے تھے، اس سے زینت کی باتوں پر شک و شبہ نہ رہا تھا۔ وہ احساسِ جرم نہیں بلکہ رقابت کی آگ میں بھسم ہو گئے تھے۔ اُن کے خیال میں خرّم جیسا بے غیرت شخص، اب بھی اُس لڑکی سے محبت کی رسمیں ادا کر رہا ہے جو رشتے کے حوالے سے اُس کے لیے شجرِ ممنوعہ بن چکی ہے۔

میرے لیے یہ احساس ناقابلِ برداشت تھا لیکن بقول زینت، ہم اپنی صفائی میں کون سا ثبوت پیش کر سکتے تھے۔ ہمارے پاس جو جذبے تھے، جو سچائی تھی، وہ دلوں میں تھی اور دلوں کے بھید صرف خُدا جانتا ہے۔

وہ اس قدر بدظن تھے کہ اُنھوں نے زینت کو اپنی بیوی تسلیم ہی نہ کیا تھا۔ وہ ایک کشتی میں اجنبی مسافروں کی مانند زندگی کا سفر طے کر رہے تھے۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ آیندہ حویلی میں نہیں جاؤں گا۔ اگر جانا ناگزیر بھی ہوگیا تو اماں بی تک محدود رہ کر واپس نکل آیا کروں گا۔

جی۔ پی۔ او بس اسٹاپ پر میں ٹیکسی چھوڑ کر شالیمار میں داخل ہوا۔ اب تک صبح کے ناشتے پر چل رہا تھا۔ دوسرے، مظفر چوہدری کے بارے میں ڈی۔ آئی۔ جی صاحب سے پوچھنا تھا... زبیر کا ذہن کسی وقت بھی پھر سکتا تھا۔ کاؤنٹر کلرک سے اجازت لے کر میں نے ڈی۔ آئی۔ جی کا ذاتی نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو... کون؟" اُن کی آواز میری جانی پہچانی تھی۔

"خرّم چوہدری بول رہا ہوں، سر!" میں نے آواز میں تعظیم رچاتے ہوئے کہا۔ "مظفر چوہدری سے ملاقات ہوئی، سر؟"

"ہاں، دیکھا تھا۔" اُنھوں نے جواب دیا۔ "اُسے اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ سر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

"بس، سر! یہی معلوم کرنا تھا۔"

"شام کو آ رہے ہو نا پھر؟" اُنھوں نے پیار سے پوچھا... "تم سے دوسرے معاملے پر بھی بات کرنی ہے۔"

"ابھی میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے، سر!"

"آدھے شہر کو تباہ کرنے کے بعد بھی تم کسر نفسی سے کام لے رہے ہو۔" اُن کا لہجہ عجیب سا تھا جیسے طنز کر رہے ہوں۔

"میں سمجھا نہیں، سر!"

"تم بہت کچھ سمجھ رہے ہو، یہ کہو کہ مجھے کچھ سمجھانا نہیں چاہتے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں، سر!" میں محتاط ہوگیا تھا۔ "اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں ابھی حاضر ہو سکتا ہوں۔"

"تمھارے لیے وقت نکال لوں گا، چلے آؤ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شکریہ، سر!" میں نے ریسیور رکھ کر گہری سانس لی اور ایک میز کی جانب بڑھ گیا۔

کھانے کا بل ادا کرتے ہی میں ہوٹل سے نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا کیونکہ بڑے صاحب کی باتوں کے انداز نے میرے ذہن میں جو پھانس توڑی تھی، اُس خلش کو میں اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں اُن سے مل کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کن ذرائع سے وہ اتنا کچھ جان چکے ہیں۔ میں نے تو صرف وزیرِ داخلہ کو تمام کارروائی کی رپورٹ پہنچائی تھی۔

وہ اپنے ذاتی آفس میں تھے۔ مجھے فوراً ہی اندر طلب کر لیا گیا۔

"بیٹھو، خرم سلطان!" اُنھوں نے ہاتھ ہلا کر، کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ میں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک بجھے ہوئے سگار کو دانتوں سے کچلتے کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے تھے۔

"میں ایک ضروری کال کا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ خاموشی کا جواز دیتے ہوئے بولے۔ "پھر آرام سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

ٹیلی فون کا بزر گنگنانے لگا تو ڈی۔ آئی۔ جی صاحب نے ریسیور اٹھا لیا۔ "اوہ! کیا رپورٹ ہے؟" پھر پانچ منٹ تک وہ خاموشی سے سنتے رہے تھے۔ "میٹنگ نہیں ہونی چاہیے... اوکے!" اُنھوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور ریسیور رکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "آؤ، چوہدری! اُدھر چل کر بیٹھتے ہیں۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

ڈرائنگ روم میں دو بچے، قالین پر کہنیوں کے بل جھکے، ہوم ورک کر رہے تھے۔ جب وہ ہماری طرف متوجہ نہ ہوئے تو صاحب نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ "میرے نواسے ہیں۔" تب دونوں نے چونک کر دیکھا اور اپنی کاپیاں اُٹھا کر خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"اب سناؤ۔" وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ کر بولے... "دو ہاتھیوں کے درمیان گنّا کس نے پھینکا تھا؟"

"کن ہاتھیوں کی بات کر رہے ہیں، جناب؟" میں نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"رنگ باز خان اور سلیمان!" وہ میری آنکھوں میں جھانک کر بولے۔ "کیا یہ نام تمھارے لیے اجنبی ہیں؟"

"نہیں، جناب!" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "مجھے جو فہرست دی گئی ہے، اس میں یہ دونوں نام موجود ہیں۔"

"سرِفہرست..."

"جی ہاں..."

"صرف میں نے ہی نہیں، صدرِ محترم تک نے تمھاری کارروائی کو پُرستائش الفاظ میں سراہا ہے۔ تم نے اپنی ذہانت سے چند دنوں میں اتنا کچھ کر ڈالا ہے جو ہم گزشتہ دس برسوں میں کر پائے تھے۔ تم نے ایک طرف مجھے حیرت انگیز خوشی دی ہے تو دوسری طرف سرِندامت سے جھکا بھی دیا ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا ہے، خرم سلطان! کہ جو کام ایک باقاعدہ فورس انجام نہ دے سکی، وہ ایک نوعمر شخص نے تنہا کیسے کر ڈالا ہے؟ میرے پاس سوائے ندامت اور اعترافِ ناکامی کے کچھ نہ تھا۔"

"غالباً آپ مجھے میری کوتاہی پر سرزنش کر رہے ہیں، سر!" میں حتی الوسیع اپنی زبان سے کچھ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ کیونکہ میرے معاملے میں صرف دو اشخاص ایسے تھے جو مجھ سے باز پُرس کرنے اور رپورٹ طلب کرنے کے مجاز تھے، تیسرا آدمی مجھ سے کوئی کھیل نہیں کھیل سکتا تھا۔

"کیا میں سرزنش کر رہا ہوں؟"

"یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے، سر! لیکن میں مجبور تھا۔ میرا خاندان غیر محفوظ تھا۔ میری تمام تر توجہ مظفر چوہدری کے تعاقب میں رہی تھی۔"

"اوہ..." وہ ہنس پڑے۔ "شاید تم مجھے غیر متعلقہ شخص سمجھ رہے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں، سر!" میں نے نرم اور مؤدب آواز میں جواب دیا۔ "آپ پولیس کے سربراہ ہیں۔"

"مجھے ہوم منسٹر نے کال کیا تھا۔ میں اُدھر ہی سے آ رہا ہوں۔" وہ بتانے لگے۔ "میں اس حال کا جائزہ بھی لے آیا ہوں جو تم نے رنگ باز کے گودام سے برآمد کیا تھا۔ ہوم منسٹر نے صدرِ محترم تک رپورٹ پہنچا دی ہے اور میرے ذمے تمھارے تحفظ کی ذمے داری ڈالی گئی ہے۔ بولو، میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"صرف دعا، سر!"

"میں پاور نہیں؟"

"فی الحال نہیں، سر!" میں نے جواب دیا۔ "میں پاور کی ناکامی کا آپ خود اعتراف کر چکے ہیں۔ یہاں کی مین پاور اپنی تمام تر پاور اپنے ذاتی مفادات پر لگائے ہوئے ہے۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے، سر! کہ جہاد بے لوث مجاہد ہی کر سکتے ہیں۔"

"ہاں!" اُنھوں نے مُنہ بنا کر اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر یہ بیماری صرف نچلی سطح تک ہے۔"

"کیا ایس۔ ایچ۔ او بھی نچلی سطح میں آتے ہیں؟"

"کیا تمھاری نگاہ میں ایسا کوئی پھوڑا ہے؟" اُنھوں نے دھواں اُگلتے ہوئے پوچھا۔

"تجربے کے لیے ایک مریض پیش کروں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا... پھر میں نے انسپکٹر رانا کے بارے میں اُن کو بتا دیا۔ میں بول رہا تھا اور وہ بیجانی انداز میں سگار کے کش لگا رہے تھے۔

"کل اس پھوڑے کا حال دیکھ لینا، برخوردار!" وہ غراتی آواز میں بولے۔ "میں بھی تجرباتی آپریشن کروں گا۔"

"شکریہ، جناب!" میں نے ممنونیت سے کہا۔ "اگر ایسے پھوڑوں کا آپریشن ہوتا رہے تو قوم کا چہرہ بہت جلد صاف ہو جائے گا۔"

"لیکن تشخیص کرنے والے کہاں سے آئیں گے، میرے بیٹے؟ تم یا میں کس کس کا گریبان کھول کر دیکھ سکتے ہیں؟"

"چلتے چلاتے کوئی نہ کوئی گریبان کھلا دکھائی دے ہی جاتا ہے، سر!"

"ٹھیک ہے، ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولے۔ "لیکن بعض اوقات مجھ جیسا انسان بھی مجبور کر دیا جاتا ہے۔ میں نے جو کال سنی ہے، جانتے ہو، کس کے حکم پر مجھے ایک غیر آئینی حکم دینا پڑا ہے؟ ایک بہت معروف سیاسی لیڈر جو مستقبل کی سیاست پر قابض ہونے والا ہے... اس کا ایک حریف آج میٹنگ کر رہا ہے، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ یہ میٹنگ نہیں ہونی چاہیے۔"

"یعنی، آپ نے اپنے مستقبل کی خاطر حکم کی تعمیل کی ہے؟"

"ہاں... اگر میں معذرت کر دیتا تو جانتے ہو، کیا ہوتا؟ میرے پیٹے جو اس وقت اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں، اپنے مستقبل کی خاطر، میرا حال پریشان اور مستقبل تاریک کر دیتے۔ یہاں سب آنے والے وقت سے خوف زدہ رہتے ہیں۔"

"کل کوئی ایسا ہی خوف زدہ شخص، میرا راستہ بھی روک سکتا ہے۔" میں نے جھرجھراتی آواز میں کہا۔ "لیکن آپ دیکھیں گے، سر! کہ میں قوم کے مفادات اپنے حال اور مستقبل پر قربان نہیں کروں گا۔ ایسی غیر آئینی رکاوٹوں کو ٹھوکر لگانی چاہیے۔"

"یہ تم کہتے ہو، شاید کر بھی سکتے ہو۔" ڈی۔ آئی۔ جی شکستہ لہجے میں بولے۔ "کیونکہ تم صرف کسی کے بیٹے اور بھائی ہو... جب تمھارے گھر میں بیوی اور جوان بیٹیاں ہوں گی تو تمھارے پاؤں اس جرأت سے محروم ہو جائیں گے جو کسی چٹان کو ٹھوکر لگانے کا عزم رکھتے ہیں۔ باپ کے ساتھ بڑی مجبوریاں ہوتی ہیں، بیٹے!"

"معاف کیجیے گا، سر!" میں نے نگاہیں جھکا کر جواب دیا... "میری عمر، تجربہ اور علم، سورج کے سامنے چراغ کی مانند ہے لیکن آپ تسلیم کریں گے کہ اصل قربانی جان اور اولاد کی ہوتی ہے۔"

"میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش جاری رکھوں گا۔"

"جناب! میری اطلاع کے مطابق پلیس رنگ باز کے اڈے والے معاملے کو بے رنگ کہہ رہی ہے۔"

"ہاں، ایسا ہی ہے لیکن اس کی وجہ بھی ہے... کوئی آدمی اپنے باس کا نام نہیں بتانا چاہتا۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں، اس لیے فی الحال اُن کو ڈھیل دینے ہی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔"

"اب مجھے اجازت دیں، سر!" میں نے ٹرالی کی کھڑکھڑاہٹ سن کر کہا۔ "رنگ باز خان اپنی ہی دیوار کے نیچے موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے، میں عیادت کرنے جاؤں گا۔"

"بے حد ذہین ہو۔ خدا تمھیں نظرِ بد سے بچائے۔ اس عمر میں اتنی ذہانت، ہم سب کے لیے باعثِ افتخار ہے۔"

"یہ آپ لوگوں کی ذرّہ نوازی ہے جو مجھے آگے بڑھاتی ہے۔" میں نے سرِنفسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

ملازمہ نے چائے کی پیالیاں تپائی پر رکھیں اور سر جھکا کر ہاتھ ملنے لگی۔

"کیا بات ہے، خانم؟" صاحب نے نرم آواز میں پوچھا۔

"کچھ پتی چاہیے؟"

"نہیں، صاحب! میرا آدمی باہر کھڑا ہے۔ آپ نے بلایا تھا، نوکری کے لیے۔"

"اچھا، اچھا... بلاؤ، اُسے۔" صاحب نے کہا اور ملازمہ نے باہر جھانک کر، اشارے سے اُسے اندر بلا لیا۔ اندر آنے والا ایک قوی الجثہ شخص تھا۔ اس کا چہرہ درندگی کی علامت تھا۔ حتیٰ کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کی رسم کا بھی خیال نہ رکھا تھا۔ نہ جانے کیوں، وہ شخص مجھے اپنے مطلب کا دکھائی دیا تھا۔

"ہُوں... کیا کام جانتے ہو؟" صاحب نے اُس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"دفتر کے علاوہ، دُنیا کا ہر کام کر سکتا ہوں، جناب..." اُس نے ایک پاؤں پر جھکولتے ہوئے جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہوائی جہاز اُڑا سکتے ہو؟" صاحب نے قہقہہ لگا کر پوچھا۔

"کوئی مشکل نہیں جناب!" اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اسے میرے پاس بھیج دیں سر!" میں نے انگریزی میں کہا۔

"یہ اُسی دُنیا کا آدمی دکھائی دیتا ہے۔"

"اَن پڑھ ہے، کیا کرو گے؟"

"آزمانے میں کوئی حرج نہیں۔"

"ٹھیک ہے، لے جاؤ۔" اُنھوں نے اُس کی طرف دیکھا۔ "ان صاحب کے ساتھ جاؤ۔ اگر تمھیں آگ میں کُودنے کا حکم ملے... تو تم دائیں بائیں دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کرو گے۔"

"بہتر جناب!" اُس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جب میں اُسے لے کر باہر جا رہا تھا تو ملازمہ ہمارے پیچھے پیچھے گیٹ تک آئی۔ اُس نے گھور کر ملازمہ سے کہا۔ "واپس جاؤ۔ میں اپنے مالک کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

میرے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔ اور اس منصوبے کی پہلی کڑی یہی شخص تھا۔ میں مقامی نوجوانوں پر مشتمل گروپ قائم کر کے، اُن سے نگرانی کا کام لینا چاہتا تھا کیونکہ میرے تمام ساتھی غیر ملکی تھے، ہر بار میک اَپ کرنا پڑتا اور پھر زبان کا بھی مسئلہ تھا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا، بڑے بھائی!" میں نے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے پوچھا۔

"اکبر خان، جناب!" اُس کا لہجہ مؤدبانہ مگر آواز میں گھُردراپن تھا۔

"اکبر خان!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اگر میں بُرا آدمی ہوا... میرا مطلب ہے چور، ڈاکو... تو؟"

"میں آپ کے اشارے پر ایک قدم آگے رہا کروں گا جناب!"

"اس لائن کا کوئی تجربہ رکھتے ہو؟"

"دس برس سے اسی لائن میں ہوں، جناب!" اُس نے بتایا۔ "اپنا چوہدری بھاگ گیا ہے اور اُس کے ساتھیوں کو پولیس پکڑ رہی ہے، اس لیے میں اِدھر آ گیا ہوں۔"

"کون چوہدری؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "مظفر چوہدری کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں صاحب! اگر آپ پولیس کے افسر ہیں تو بھی انکار نہیں کروں گا۔"

"وہ کیوں بھاگ گیا ہے؟"

"ہو گئی کوئی بات جی: بندہ دا وَ دا تیا تھا۔" اُس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "آپ اُسے کیسے جانتے ہیں؟"

"اپنا ہی بھائی بند تھا، پیارے!" میں ہنس پڑا... اور سوچا بندہ تو کام کا ہے لیکن دُشمن کا ساتھی رہ چکا ہے۔ اگر مظفر چوہدری گرفتار بچا کر باہر نکل آیا تو وہ اکبر خان کو مجھ پر وار کرنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

ڈھلتے سُورج کے ہم، کوٹھی میں داخل ہوئے۔ بیگن کی کمان میں تیم لان کی تدوین میں مصروف تھی۔ بیگن پھُولوں کا پرستار تھا، جہاں رہتا تھا، اپنے گرد رنگ و بُو بکھیر لیتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ لوگ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بیگن کے قریب چلے آئے تھے۔

"میں تمھارے لیے ایک اور بھائی لایا ہوں۔" میں نے اکبر خان کے شانے پر تھپکی دی۔ "تم لوگ اس سے مقامی زبان سیکھو گے اور اسے اپنی لائن کے لیے مکمل کرو گے۔"

سب نے باری باری اکبر خان سے مصافحہ کیا۔ وہ نو گرفتار دندے کی طرح بدک رہا تھا یا اس کی فطرت ہی ایسی رہی ہو گی... حالانکہ اُن کے چہروں پر دوستانہ بشاشت تھی لیکن اکبر خان، تنے پھُولا پھُولا کر اُنھیں گھُور رہا تھا۔

"سلوا! میں اسے تمھارے سپرد کر رہا ہوں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "اسے تم نے باور کرانا ہے کہ ہم اسمگلر ہیں۔"

"بہتر چیف!" سلوا نے آگے بڑھ کر، اکبر خان کا ہاتھ تھام لیا۔ "آیئے، اکبر بھائی! آپ کو، آپ کا کمرا دِکھا دوں۔"

جب سارے لوگ بچھڑ گئے تو میں نے بیگن سے پوچھا۔ "ہاں، ماسٹر! کوئی خبر، خان کے گھر سے کوئی اطلاع؟"

"ثمینہ گل کئی بار فون کر چکی ہے۔" بیگن نے بتایا۔ "خان کو پولی کلینک میں داخل کر دیا گیا ہے، جہاں اس کی حالت نازک بتائی جا رہی ہے۔"

"سیٹھ سلیمان کی کوئی خبر؟"

"نہیں..." بیگن نے نفی میں سر ہلایا۔ "چونکہ آپ نے اجازت نہیں دی تھی، لہٰذا رابطہ قائم نہیں کیا گیا۔"

میں نے اندر جا کر ثمینہ گل کا نمبر ڈائل کیا۔ چوتھی گھنٹی پر کال اٹینڈ کی گئی۔ "کیا بات ہے، بے بی! تم شاید روتی ہوئی آئی ہو؟"

"نہیں، بھائی جان!" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اب تو آنسو بھی ختم ہو گئے ہیں، شاید۔"

"تمھارے ڈیڈی ٹھیک ہو جائیں گے بے بی جان! میں ڈاکٹروں سے مل کر آیا ہوں، ثمینہ کہاں ہیں؟"

"وہ ڈیڈی کے پاس ہیں۔" اُس نے بتایا۔ "کیا آپ اُن سے نہیں ملے؟"

"میں نے فون پر خان صاحب کی خیریت معلوم کی تھی، بے بی! اب وہیں جا رہا ہوں۔"

"مجھے بھی لے چلیں، پلیز!"

"ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔" میں نے ریسیور رکھ کر بیگن کی جانب دیکھا۔ "میں اسپتال جا رہا ہوں۔ رشیدہ کو گاڑی میں بھیج دیں۔"

رشیدہ، میرا پیغام سُنتے ہی پورچ میں پہنچ گئی تھی۔ جب میں پارکن سے باتیں کرتا ہوا، پورچ میں پہنچا تو وہ گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پارکن اُسے دیکھ کر دس قدم دُور ہی رُک گیا تھا۔ میرے ساتھیوں نے میرا خاموش عندیہ قبول کر لیا تھا، ہو سکتا ہے کہ بیگن نے اُنھیں، رشیدہ سے دُور رہنے کی ہدایت کر دی ہو۔

میں نے کار اسٹارٹ کی تو بیگن پیچھے ہٹ گیا۔ رشیدہ چُپ چاپ تھی۔ ارادہ تو یہی تھا کہ جب تک وہ نہ بولے گی، میں بھی چُپ کا روزہ نہیں توڑوں گا... مگر اب خاموشی بُری طرح کھلنے لگی تھی۔

"پیٹ میں کوئی تکلیف ہے، کیا؟" میں نے چہرہ گھُمائے بغیر پوچھا۔

"ہاں، شاید... جیسے باؤلے کُتے نے کاٹ کھایا ہو۔" وہ تپیدہ آواز میں بولی۔ "اگر تم آج واپس نہ آتے تو بیچ میں باؤلی ہو جاتی۔"

"کیا ہمارے درمیان کوئی ایسا معاہدہ ہے، رشیدہ بیگم؟"

"ہاں ہے۔" وہ بھڑک کر بولی۔ "تم نے مجھے بہن کہا ہے اور میں جھُوٹے بھائی کے غم میں پاگل ہو سکتی ہے۔"

"کیا تمھیں ماسٹر نے نہیں بتایا کہ خرم سلطان کسی اور کا بھی بھائی لگتا ہے۔"

"تم خود کیوں نہیں بتا کر گئے؟"

"اس لیے کہ کچھ سفر غیر یقینی ہوتے ہیں۔"

"کیا کامیاب لوٹے ہو؟"

"کیا تم میری کامیابی کے لیے دُعائیں کرتی رہی ہو؟"

"ہاں، میرا اور ہے کون، جس کے لیے دُعائیں کروں؟" وہ یک لخت رو پڑی۔ "مجھے پریشان نہ کیا کرو، خرم!"

"یار! یہ روتی ہوئی لڑکیاں مجھے زہر لگتی ہیں۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "بس، بند کرو، یہ بھوں بھوں۔"

"ڈیڈی بھی تمھارے لیے بے حد پریشان تھے۔" وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "میں نے رات بھر اُن کو ٹہلتے دیکھا تھا۔ اُن کی پریشانی نے مجھے بھی خوف زدہ کیے رکھا تھا۔ بتاتے کیوں نہیں، وہ کون تھا؟ کس کے لیے گئے تھے؟"

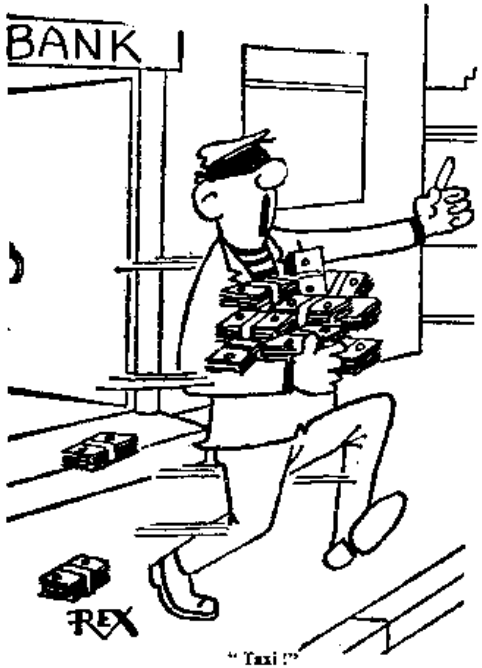

"برادری کا معاملہ تھا، رشیدہ! اب سیٹل ہو گیا ہے۔"

میں نے کار، رنگ باز خان کی کوٹھی کے پورچ میں روک کر بریان دیا۔ "تم پیچھے چلی جاؤ۔ ایک لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی۔" میں نے رشیدہ سے کہا۔

"کیوں، اُسے ساتھ بٹھاؤ گے؟"

"وہ تو میرے دل میں بیٹھ سکتی ہے لیکن کار میں تمھارے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے گی۔"

"چلو، آج تمھاری پٹائی بھی دیکھ لوں گی۔" وہ اُترتے ہوئے بولی۔

امینہ دوڑتی اور سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی آئی لیکن رشیدہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ میں دزدیدہ نظروں سے رشیدہ کا جائزہ لے رہا تھا جو پُراشتیاق نگاہوں سے اُس سُنہری پری کو دیکھ رہی تھی۔

"کم آن، بے بی!" میں نے چہرہ باہر نکال کر اُسے پچکارا۔ اُس نے قریب آ کر پہلے مجھے اور پھر رشیدہ کو سلام کیا۔ رشیدہ نے بڑھ کر اُسے بانہوں میں لے کر چُوم لیا۔ "یہ مس رشیدہ ہیں۔"

"گڑیا کا نام...؟" رشیدہ نے اُس کے لیے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"جی، امینہ نگل!" امینہ بولی۔ "پہلے آپ باجی!"

وہ دونوں مجھے نظر انداز کرتے ہوئے باتیں کرنے لگیں۔ زیادہ امینہ ہی بول رہی تھی۔ اُسی نے اپنے باپ کی بیماری کے بارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بس بھی رشیدہ کو بتا دیا تھا۔

رنگ باز کو حفاظتی کمرے میں رکھا گیا تھا، اس لیے ڈاکٹر نے ملاقات کی اجازت نہ دی تھی۔ البتہ ٹیلی فون کے ذریعے ثمینہ گل کو باہر بلا دیا گیا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ایک ہی دن میں وہ کملا مُرجھا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہونے لگے تھے۔ زندگی سے بھرپور خوبصورت آنکھیں متورم اور سُرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے رسمی کلمات کے بعد تعارف کی رسم ادا کرتے ہُوئے ۔ ۔ ۔ ثمینہ کی توجہ دوسری جانب مبذول کر دی تھی۔ مجھے سامنے پا کر اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔

میں اُن تینوں کو وہیں چھوڑ کر، ڈاکٹر کی طرف چلا گیا۔ متعلقہ ڈاکٹر تو چھٹی کر گیا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے جو کچھ بتایا وہ مایوس کن ہی تھا۔ رنگ باز آکسیجن ٹینٹ میں سانسیں لے رہا تھا اور اس پر خارج کا بھی اٹیک ہو چکا تھا۔

"کیا اُن کی صاحبزادی کو سب کچھ بتا دیا گیا ہے؟" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"سوری! مجھے نہیں معلوم۔" ڈاکٹر نے معذرت کی۔

میں واپس نکلنے لگا تو وہ تینوں آ گئیں۔ امینہ کو رشیدہ نے بانہوں میں سنبھال رکھا تھا اور اُسے سمجھا رہی تھی۔

"بس، ایک نظر ڈیڈی کو دیکھوں گی۔" امینہ بلک کر بولی۔۔

"ڈاکٹر! پلیز، مجھے اجازت دے دیجیے۔"

"بے بی جان! ضد نہیں کرتے۔" میں نے اُسے سنبھال لیا۔ "اُن کے لیے آرام بے حد ضروری ہے۔ اگر ہماری وجہ سے ان کی آنکھ کھل گئی تو اُن کو جو تکلیف ہو گی، اس کی ذمے داری ہم پر ہو گی نا۔"

میں اُسے سہارا دے کر باہر لے گیا۔ ثمینہ نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ بہن کی وجہ سے شاید وہ مُسکرانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

"ثمینہ! آپ بھی ہمارے ساتھ گھر چلیں۔ آپ دو راتوں کی جاگی ہُوئی ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہاں کسی کا ہونا ضروری ہے، خرم صاحب!" وہ ٹھہرے ہُوئے لہجے میں بولی۔

"آپ جائیں، ثمینہ بہن!" رشیدہ بولی۔ "میں یہاں رہوں گی۔"

میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی روشنی تھی۔ "ہاں، خرم! میں رہ جاؤں گی۔"

"شکریہ، جان برادر!" میری آواز جذبات سے بھر گئی۔ "ہم باری باری ڈیوٹی دیں گے۔" میں نے کاؤنٹر سے ایکسرے کور کا گتا پھاڑ کر اپنا اور ثمینہ کا ٹیلی فون نمبر لکھا اور چٹ رشیدہ کو دے دی۔

میں نے دونوں بہنوں کو اُن کے گھر ڈراپ کیا۔ دونوں ہی اندر آنے پر اصرار کرتی رہی تھیں لیکن میں گیٹ ہی سے پلٹ گیا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ میں اندر جا کر ثمینہ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے نیند کی ضرورت تھی، دوسری وجہ سلیمان سے ملاقات تھی۔ اس نے اپنا ایک گواہ بچا رکھا تھا اور میں اس پر مسلسل دباؤ ڈالنا چاہتا تھا کہ مجھے فوری طور پر مال کی ضرورت ہے۔

میں اس سے نمٹ کر، کرم شاہ کے بے تاج بادشاہ فضل کا پنجہ بھی مروڑنا چاہتا تھا جو دیسی شراب کا زہر نوجوان نسل کے خون میں شامل کر رہا تھا۔

سلیمان گھر میں تھا، نہ آفس میں۔ میں نے فون پر دونوں نمبر ٹرائی کر لیے تھے۔ وہ نہیں تھا اور میرے پاس وقت تھا، سوچا کہ بدیدت سے بچنے کے لیے کوئی کام کر لیا جائے۔

کرم شاہ میرے ذہن میں کنکھجورے کی طرح رینگ رہا تھا۔ ماضی کی یادداشت میں افیون کا ٹھیکہ محفوظ تھا۔ میں مال روڈ سے اُتر کر ایک تنگ سڑک پر ہو لیا۔ کئی گلیوں سے گزرتا جب اُس جگہ پہنچا تو ایک میلے سے کاؤنٹر کے سامنے چار بُوڑھے کھڑے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے بھی بوڑھا ہی تھا۔ میں بھی اُن کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"کیا شاہ جی کی دُکان یہی ہے؟" میں نے ایک بُوڑھے سے پوچھا تو وہ بغور مجھے دیکھنے لگا۔

"کون شاہ جی؟"

"کرم شاہ۔"

"نہیں، یہ دراز خان کا ٹھیکہ ہے۔"

"اوہ! مجھے پھر غلط جگہ بتائی گئی ہے۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"کیا بات ہے، جوان؟" دراز خان نے پوچھا۔ "کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"کرم شاہ سے ملنا تھا، جی!"

"اچھا۔ وہ ادھر نہیں ہوتا۔ لال کُرتی چلے جاؤ۔ کچھ لینا ہے یا دینا ہے؟"

"مجھے رنگ باز خان نے بھیجا ہے۔" میں نے کہا۔ "مال کی اطلاع دینی ہے شاہ جی کو۔"

"اندر آ جاؤ۔ خان ہمارا بھی کرم فرما ہے۔" اس نے کاؤنٹر کا پٹ ہٹا کر مجھے اندر بلا لیا۔

میں نے سوچا، چلو اسے بھی چھانک لوں۔ جس طرح علم کا چراغ چراغ سے روشن ہوتا ہے۔ اسی طرح جرم کی کڑی بھی دوسری کڑی

سے ملتی ہے۔ اگر دراز خان صاف ستھرا بزنس کرتا ہوتا تو مجھے اندر آنے کی دعوت ہرگز نہیں دیتا۔ مال کے نام پر ہی اس کا رویہ مہربان ہُوا تھا۔

اُس نے جلدی جلدی گاہکوں کو نمٹایا اور پھر گدی پر بیٹھ گیا۔ "کیا پیو گے، برخوردار؟ بوتل منگواؤں؟" وہ آنکھوں سے چرس کی میل کریدتے ہُوئے بولا۔

"شکریہ خان! کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے بھی اپنا دھندا کرنا ہے۔"

"اوہ! اچھا۔۔۔ پھیری لگاتے ہو۔" وہ کھوکھلے انداز میں ہنس کر بولا۔ "یہ خان نے اتنا چھوٹا دھندا کب سے شروع کر دیا ہے؟ وہ تو بادشاہ ہے، اس شہر کا۔"

"جی ہاں، مہربان بادشاہ۔" میں نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "جو غریب رعایا کا خیال رکھتا ہے۔ میں اُن کے بڑے کام کرتا ہُوں اور وہ مجھے چھوٹے دھندے کے لیے مال دے دیتے ہیں۔"

"ویسے تم۔۔۔" اس نے میرے سراپا کو گھورتے ہُوئے کہا۔ "چھوٹے دھندے کے آدمی لگتے تو نہیں ہو۔"

"شو، شا نہ ہو تو کابینٹ لڑکے گھاس نہیں ڈالتے، خان!"

"ہُوں، تو تم کالجوں میں مال سپلائی کرتے ہو؟"

"بس، جی! اپنی شکل و صورت سے نادیدہ اٹھا رہا ہُوں۔"

"اُدھر مانگ کیسی جا رہی ہے؟"

"بہت اُونچی، خان! مجھے مال پُورا نہیں ملتا ورنہ۔۔۔"

"سُنو، کل شام میرے پاس آنا۔ ہاں، نام بتا دو۔ میں خان سے تصدیق کر لوں گا۔"

"خان بیمار ہیں۔ آپ ابھی جا کر اُن کے گھر کے فون پر پوچھ لیں۔ مجھے تو اُس کی بیٹیاں بھی جانتی ہیں۔"

"اچھا، کیا نام ہے اُن کا؟" وہ مُسکرانے لگا۔

"بڑی کا ثمینہ اور بے بی کا امینہ۔"

"ٹھیک ہے۔ اب بزنس کی بات کرو۔ کتنا مال۔۔۔ اور کس کمیشن پر؟"

"مال کیا ہو گا، خان! میرے گاہک افیون اور چرس سے اُوپر کا مال مانگتے ہیں۔"

"ملے گا، ملے گا۔۔۔ ہر قسم کا مال دوں گا، اے جوان۔"

"میں کمیشن پر کام نہیں کرتا، خان لالہ! مال اچھا ہُوا تو اچھی قیمت دے کر خرید لوں گا۔"

"ہیروئن؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن اے۔ ون۔" میں نے چٹکی بجائی۔ "کتنا دے سکتے ہو؟"

"تم کتنا خرید سکتے ہو؟"

"پانچ ہزار، فی ٹرپ۔"

"کیا اتنا مال روز کھپا لیتے ہو؟"

"مال ہو گا تو کمیشن پر لڑکے، لڑکیاں بھی مل جائیں گی۔"

"سُنو۔۔۔" وہ آگے جھک کر سرسراتی آواز میں بولا۔ "تمھارا نام راشد تو نہیں؟" میں جواب میں صرف مُسکرا کر رہ گیا۔ "اگر تم راشد ہی ہو تو ایک طرح سے میرے ہی آدمی ہو۔ ممتاز سیکم میرا ہی مال سپلائی کرتی ہے۔"

"نام میں کیا رکھا ہے، خان؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "کام اور دام ہی کا نام ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، جوان! بات پکی۔۔۔ لیکن میرا ایک کاروباری اصول ہے، میرا گاہک دوسری دُکان پر نہیں جایا کرتا۔"

"پیٹ بھرا رہے تو دوسرے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، خان جی! اگر آپ میرے مانگ کے مطابق مال سپلائی کریں گے تو میں بڑے خان کو بھی چھوڑ دوں گا۔ وہ روپے کا کام کرواتا ہے اور چار آنے دیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے سر کو اثباتی انداز میں جنبش دیتے ہُوئے پوچھا۔ "کب ڈیلیوری لو گے؟"

"رات دس بجے یا صبح چھ بجے۔" میں نے جواب دیا۔ "میرا دھندہ دن کی روشنی میں چلتا ہے۔"

"نو بجے آ جانا۔ اس وقت تک میں دُکان بند کر کے فارغ ہو جاتا ہُوں۔"

"گودام کہاں ہے؟"

"اس سے تمھیں کیا مطلب؟ تمھیں مال مل جائے گا۔"

"اگر میں اپنا آدمی بھیج دُوں تو۔۔۔؟"

"نہیں، اب تم نام بتاؤ۔ میں تصدیق کے بعد ہی تمھیں مال دُوں گا۔"

"خرم سلطان۔" میں نے نام بتا دیا اور رنگ باز خان کا ٹیلی فون نمبر بھی۔ کیونکہ وہاں خان نہ تھا۔ اگر دراز خان میرے بارے میں پُوچھتا تو دونوں بہنیں اُسے مطمئن کر سکتی تھیں۔ ایک بات کا خیال رکھنا، لڑکیاں اپنے باپ کے دھندے سے ناواقف ہیں لہٰذا آپ صرف میرا نام پوچھیں گے۔"

وہ فٹ پاتھ تک میرے ساتھ آیا تھا۔۔۔ پھر ہم نے گرم جوشی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے مصافحہ کیا۔ وہ بے حد خوش اور پُرجوش تھا۔ پھیری والوں کو... سینکڑوں کا مال دینے والوں کو ایک دم ہزاروں کا گاہک مل گیا تھا اور میں بھی خوش تو تھا لیکن حیران بھی تھا کہ دراز خان جیسا معمر کاروباری شخص ایک اجنبی نوجوان پر کیسے اعتبار کر بیٹھا تھا۔ یقیناً رنگ باز خان کے حواسے ہی نے اُسے مارا تھا۔

ریلوے اسٹیشن کے ٹیلیفون بوتھ سے میں نے اپنا نمبر ڈائل کیا۔ دراصل میں اُن چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں سے اُلجھ کر بڑے ناگوں کو بلوں میں چھپنے کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ دراز خان جیسے لوگ صرف بچھو تھے جن کے کاٹنے سے صرف درد ہوتا ہے۔ مجھے صرف ایک شہر کی رگوں سے زہر نہیں نچوڑنا تھا... بلکہ میرے کندھوں پر سرزمین پاک کو منشیات کی لعنت سے پاک کرنے کی مشکل ترین ذمے داری تھی۔ اگر میں چھچھوڑوں اور کیڑے مکوڑوں کی صفائی شروع کر دیتا تو اگلی برس تک شہر کے ایک محلے کو بھی صاف کرنا مشکل تھا۔

"ماسٹر..." بیگن کو میں نے مختصر سا پیغام دیا۔ "اکبر خان کے ساتھ لال کرتی کی سابقہ رہائش گاہ کے سامنے میرا انتظار کرو۔"

کرم شاہ کے بارے میں لوگوں سے پوچھ گو یا کسی ممنوعہ علاقے میں داخل ہونے کے مترادف تھا۔ میں جس سے پوچھتا وہی عجیب نگاہوں سے میرے سراپا کو گھورنے لگتا کیونکہ کسی نوجوان کا چرس اور افیون کے بارے میں پوچھنا، اُن کو حیرت میں مبتلا کر دیتا۔ نشے باز تو ٹھکراتے ہانپتے چلتے ہیں اور میں نئے ماڈل کار میں بیٹھا چرس کی باتیں کر رہا تھا۔

ایک کیمسٹ نے میری راہنمائی کی تھی۔ اُسے میں نے بتایا تھا کہ میری والدہ کو حکیم نے افیون تجویز کی ہے۔ اُس نے بتا تو دیا تھا لیکن افیون کے نقصانات پر لیکچر بھی دیا تھا۔

کرم شاہ کی دُکان صاف ستھری تھی جیسے انجمنی کے آفس ہوتے ہیں۔ کاؤنٹر کے سامنے کرسیوں کی قطار تھی اور اُن پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ "جی فرمائیے، کیا چاہیے؟" اُس نے پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔

"ایک ذاتی کام سے حاضر ہوا ہوں جناب!" میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور جیب سے رنگ باز خان کی وصیت نکال کر اُس کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے دراز سے عینک نکال کر لگائی اور پڑھنے لگا پھر عینک اُوپر اُٹھا کر میرے چہرے پر کچھ پڑھنے لگا۔

"ہوں، جلدی تو نہیں؟"

"آپ کتنی دیر تک فارغ ہوں گے جناب؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ اُٹھا اور مجھے لے کر دُکان کے پیچھے چلا گیا۔ "ہاں، اب بولو۔ خان کو کیا ہوا... اور تم کیوں آئے ہو؟"

"خان پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ میں اُن کا قریبی عزیز ہوں۔ گزشتہ روز خان نے مجھے فضل خان سے ملایا تھا۔ چونکہ اب خان کے مفادات کی نگرانی میں کر رہا ہوں، اس لیے گاہکوں کو سنبھالنا بھی میری ذمے داری ہے۔ ایک پارٹی شراب خریدنا چاہتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، بھیج دو۔"

"شاہ صاحب! کچھ بونس سیکرٹ ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ پارٹی صرف خان تک محدود رہنا چاہتی ہے۔"

"اچھے جانثین بنو گے لڑکے۔" کرم شاہ مسکرانے لگا۔ "فضل خان اُوپر ہے۔" اُس نے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا اور میں شکریہ ادا کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

فضل خان تہمانہ تھا۔ اگر مجھے بتا دیا جاتا تو دوسری ملاقات بھی ناخوشگوار نہ ہوتی۔ میں نے دستک دی تو اندر سے ایسے آواز آئی جیسے بلڈاگ آواز سن کر غرایا ہو۔ پھر دو منٹ بعد دھڑکے دروازہ کھل گیا تھا۔

"او تم...؟" فضل خان کے حلق سے جیسے دھماکا پھوٹا تھا۔

"پیچھے جاؤ۔"

"فضل خان! مجھے اُوپر بھیجا گیا ہے۔" میں نے بھی سرد لہجے میں جواب دیا۔ "بے حد ضروری کام ہے۔ خان قریب الموت ہے اور میں اُس کے مفادات کا نگران ہوں۔"

اُس نے کندھے اُچکا کر راستہ دے دیا۔ سیاہ چادروں لپٹی ہوئی وہ عورت مجھے دیکھ کر مسکراتی ہوئی دیوار کی جانب مڑ گئی تھی۔ قبول صورت لڑکی تھی لیکن جلد اور کردار نے اُس کی شخصیت کراہیت انگیز بنا دی تھی۔ میں عورت کے معاملے میں ہمیشہ بڑا حساس ہوں۔ میرے نزدیک قابلِ احترام عورت صرف ماں، بہن، بیٹی اور وفا شعار بیوی ہی ہے۔ ان رشتوں کی چہار دیواری سے باہر عورت اور غلیظ گٹیا میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

"ہاں کیا پیغام ہے؟ بولو اور چلے جاؤ۔" فضل خان اکھڑ آواز میں بولا۔

"خان نے کسی پارٹی سے شراب کا سودا کیا تھا۔ وہ پارٹی مال اُٹھانا چاہتی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں خان سے خود مل لوں گا۔"

"وہ ملنے کی پوزیشن میں نہیں رہا فضل خان! فالج اور

ہارٹ اٹیک کا مریض اب کاروباری ملاقات کے قابل نہیں رہا۔"

"کس اسپتال میں ہے؟"

"پولی کلینک۔" میں نے بتایا۔ "لیکن پارٹی آج مال اُٹھانا چاہتی ہے۔"

وہ لحظہ بھر سُرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا پھر موچھیں پھڑکاتا ہوا ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے اُسے خان کے ہوٹل کا نمبر ڈائل کرتے دیکھا تھا۔

"ولی خان سے ملاؤ۔" اُس نے سرد آواز میں کہا۔ پھر لڑکی کی طرف چہرہ گھما کر بولا۔ "تم جاؤ، جمال خان سے میں خود معاملے پر بات کروں گا... ہیلو ولی خان! میں فضل بول رہا ہوں۔ خان کہاں ہیں... اوہ کیا واقعی حالت نازک ہے؟ میری پاس جو ہدایت کھڑ ہے۔ ہاں ہاں وہی... ٹھیک ہے میں پھر رنگ کروں گا۔"

ریسیور رکھ کر اُس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور لڑکی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہی تھا کہ ولی خان نے اُسے میرے بارے میں کیا ہدایت دی ہوں گی۔ بہرکیف خان کی بیماری کا حوالہ اُس نے تصدیق کر لیا تھا۔

چند منٹ بعد جب وہ اندر آیا تو اُس کے چہرے پر طاری درشتی خاصی نرم ہو چکی تھی لیکن قدرت نے بُرائی کی چھاپ جو لگائی تھی اُسے اُس کا خوش پوش اور مُوڈ بھی سنوارنے سے قاصر رہا تھا۔ ہر بُرے شخص کے چہرے پر نحوست کی ایک چھاپ لگ جاتی ہے، جو اُس کی شناخت ہوتی ہے۔

"خان کو شکست کی ضرب بڑی کاری لگی ہے۔" فضل خان الماری سے بوتل اور گلاس نکال کر بولا۔ "خان انفرادی قوت اور ایک اڈے سے محروم ہو گیا ہے۔ سلیمان نے بڑا اندوہناک حملہ بولا تھا۔"

"خان کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو سلیمان نے اسی رات گودام بھی لوٹ لیا ہے۔"

"ہاں! ولی خان نے مجھے بتایا تھا۔" فضل خان نے شراب گلاس میں اُنڈیلی۔

"میرے لیے نہیں فضل خان۔" میں نے دوسرے گلاس پر ہاتھ رکھ دیا۔ فضل خان نے متعجب نگاہوں سے دیکھا۔

"مجھے ڈاکٹروں نے منع کر دیا ہے، گردہ متاثر ہو چکا ہے۔"

"دیسی نہیں ہے چوہدری؟"

"میں بدیسی ہی کا مارا ہوا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "میں غیر ممالک میں رہا ہوں۔"

"سروس؟" اُس نے گلاس سے ہونٹ لگا کر پوچھا۔

"ہم جیسے لوگ سروس کا جُوا کب برداشت کر سکتے ہیں برادر۔"

"ہاں..." وہ مسکرانے لگا۔ "اچھا پارٹی کہاں ہے اور کتنا مال اُٹھانا چاہتی ہے؟"

"آپ فوری طور پر کتنا مال دے سکتے ہیں؟"

"بیس ڈرم بالکل تیار ہیں اور اتنا ہی مال کل رات تیار ہو گا۔"

"سنو فضل خان!" میں نے کاروباری انداز میں کہا۔ "میں لاٹ میں نیا نہیں ہوں مگر اس شہر میں اجنبی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگ لین دین کس طرح کرتے ہیں، میرا مطلب کمیشن سے ہے فضل خان!"

"میں اپنے ڈیلروں کو پندرہ سے بیس فی صد کمیشن دیتا ہوں۔"

"ادائیگی؟"

"یہ ڈیلر کی ساکھ پر منحصر ہے۔ ایڈوانس بھی اور اُدھار بھی چلتا ہے۔"

"بات میری کرو فضل خان!"

"پارٹی سے رقعے کرا کر اپنا کمیشن وضع کر لینا۔"

"شکریہ!" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "میں بھی نقد معاملات کا قائل ہوں۔ اس طرح تعلقات متاثر نہیں ہوتے۔ میں پارٹی سے بیس ڈرم کا سودا طے کر لیتا ہوں، کل وقت اور جگہ بتا دیں۔"

"کل دس گیارہ بجے رات یہاں ہی آ جانا۔"

"بہتر!" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کو بھی حسبِ سابق ہمارے مال کا بھی خیال رکھنا ہو گا۔ اب خان کے حلیے پر میں نئی عمارت تعمیر کر رہا ہوں۔ مجھے اس کی اشد ضرورت پڑ چکی ہے۔"

اُس نے گلاس بائیں ہاتھ میں لے کر ہاتھ ملایا اور دروازے تک میرے ساتھ گیا تھا۔

ایک فیصلہ میرے ذہن میں بگولے کی طرح چکرانے لگا تھا۔ دراز خان اور فضل خان نشانے کی زد میں تھے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ان دونوں کو عمل مکافات کے پاؤں میں دے کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے یا قانون کے ہاتھوں میں دیا جائے۔ ملکی قوانین کا میں احترام کرتا تھا لیکن قانون کے محافظوں پر میرا ایمان راسخ نہ تھا، کیونکہ یہ ہاتھ میں نے بارہا مفلوج ہوتے دیکھے تھے۔ اگر ان کو سزا ہو بھی جاتی تو پانچ، دس سال بعد باہر آ کر پھر دھندہ شروع کر سکتے تھے جبکہ میں بُرائی کے درخت کو جڑوں سے اُکھیڑنے پہ یقین رکھتا تھا۔ کوئی فیصلہ نہ ہو پا رہا تھا اور میں قتل و غارت گری سے بھی دامن بچانا چاہتا تھا۔

بیگن اور اکبر خان کار میں میرے منتظر تھے۔ میں نے کار کے قریب پہنچا تو بیگن باہر نکل آیا تھا۔ اکبر خان سے حد مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے پہلی بار ہاتھ اُٹھا کر مجھے سلام کیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے دراز خان اور فضل خان سے ملاقات اور تمام حالات بیگن کو بتائے اور اس سے راہنمائی طلب کی۔ میں اپنا فیصلہ صادر کر کے کسی کا خون اپنے نامۂ اعمال میں درج نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ جیسے بھی تھے اپنے تھے، مسلمان تھے۔ ہائنگ کانگ اور فلپائن کے غنڈوں اور ان میں فرق تھا۔ میں اپنے لوگوں کو تباہ نہیں بلکہ سنوارنا چاہتا تھا لیکن باغ کی نشوونما اور دیدہ زیبی کے لیے جھاڑ جھنکاڑ اور خار دار جھاڑیوں کو اچھے اور ثمر بار پودوں سے دُور کرنا بھی ضروری تھا۔ شاخ تراشی ہی بہتر نتائج کی حامل ہوتی ہے۔

"ان چھوٹی چھوٹی نالیوں کو رہنے دو چیف۔" بیگن نے مشورہ دیا۔ "ایسی نالیاں ہر گلی میں ہوں گی۔ ہمارا کام بڑے دریاؤں کا رُخ موڑنا ہے۔ جب دریا رُخ موڑیں گے تو یہ نالیاں خود بخود سوکھ جائیں گی۔"

"آپ نے یہ نہیں سُنا ماسٹر۔" میں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ "قطرے مل کر سمندر بنتے ہیں، درختوں کو چھوٹی چھوٹی جڑیں سہارتی ہیں اور تن آور درخت بناتی ہیں۔ اگر یہ نالیاں چل کر نالوں، نالے دریاؤں اور دریا سمندر تک نہ جائیں تو سمندر وجود میں کیسے آسکتا ہے یہی لوگ جن کو چھوٹے سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سلیمان اور . . . رنگ باز خان کے دست و بازو ہیں۔ اگر مارکیٹ نہ ہوگی تو بڑے تاجر ماں کہاں کھپائیں گے۔ جب مال نہیں کھپے گا تو اور نہیں لائیں گے۔ یہ چھوٹی چھوٹی دُکانیں ہی اس بزنس کو پھیلاتی ہیں۔ لہٰذا میں ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

"تم واقعی ذہین و فہیم ہو لڑکے۔" بیگن نے پُرستائش آواز میں کہا اور میرے شانے پر تھپکیاں دینے لگا۔ "میں نے اتنی گہرائی میں اُتر کر مشورہ نہیں دیا تھا۔ ٹھیک ہے ان کو ختم ہونا چاہیے۔ اسی طرح جیسے سانپوں کو ختم کیا جاتا ہے۔"

"شکریہ ماسٹر۔" میں نے ممنونیت سے کہا۔ "آپ نے میری اُلجھن دُور کر دی ہے۔" میں نے اکبر خان کو سر کے اشارے سے بُلایا وہ اُتر کر میرے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

"تمہیں صاحب نے کیا کہا تھا اکبر خان؟"

"جگ میں کُود نے کا حکم ملے تو دائیں بائیں نہ دیکھنا۔" اکبر نے جواب دیا۔ "کیا کہیں آگ لگ گئی ہے جناب؟"

"ہاں پیارے۔" میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "تمہیں ایک شخص دکھایا جائے گا تم اس کا تعاقب کرو گے۔ وہ گودام میں جائے تو اُس سمیت ہر چیز جلا دو گے . . . کوئی شک . . .؟"

"نہیں۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں اگر وہ اپنے گھر جاتا ہے تو تم واپس چلے آؤ گے۔"

"بہتر جناب۔" وہ بولا۔ "ثبوت کے لیے سر لانا ہوگا جناب؟"

"نہیں پیارے، ہم اپنے دوستوں کی زبان کو ہی ثبوت مان لیا کرتے ہیں۔" میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ "ہاں اگر زبان جھوٹ بولے تو اُس زبان کو ہم دانتوں کے درمیان سے کھینچ لیتے ہیں۔"

"جس دن ایسی مشکل پیش آئی تو میں اپنی زبان تشتری پر رکھ کر پیش کروں گا۔"

"تم یقیناً ایسا ہی کرو گے اکبر۔" میں نے اُسے چلنے کا اشارہ کیا۔ "میں نے تمہیں دیکھ کر ہی پہچان لیا تھا آدمی کھرا اور نڈر ہے۔"

اُسے میں نے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا اور بیگن ہمارے تعاقب میں رہا تھا۔

دراز خان کی دُکان پر قطار لگی ہوئی تھی۔ شرفا بوڑھے شام کی تاریکیوں میں شرافت چھپائے چلے آتے تھے۔ کچھ جن کو نہ سر نے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا دیوار کے ساتھ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ عجب معاملہ تھا۔ لوگ سانپ دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں ہمت والے سانپ کا سر کچلنے دوڑ پڑتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی احمق ہوتے ہیں جو زہر بانٹنے والے ہاتھوں کے پاس دُودھ سے چل کر آتے ہیں اور زہر خرید تے ہیں۔

وہ مصروف تھا۔ اس لیے اکبر خان کے ساتھ مجھے نہ دیکھ سکا تھا۔ میں نے اکبر خان کو قطار میں لگا دیا اور خود آگے نکل گیا تھا۔ کیونکہ میرا کام نہ رہا تھا۔ فضل خان نے اپنی زندگی کو ایک رات اور بڑھا لیا تھا ورنہ اُس کی طرف خود مجھے جانا پڑتا۔

گزشتہ رات چوہدری مظفر جو مدرسی کی ندر ہوئی تھی۔ اس لیے کھانا کھاتے ہی نیند نے شدید حملہ کر دیا تھا۔ حالانکہ بیگن آئندہ کے لائحہ عمل کے لیے میٹنگ کرنا چاہتا تھا لیکن میں معذرت کرتا ہوا لیٹ گیا تھا تھکے اعصاب اور پریشان ذہن کو نیند نے پروں تلے لے کر صبح تک آنکھ نہ کھولنے دی تھی۔

صبح جب ہم ناشتا کر رہے تھے اکبر خان اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ نگاہوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ اُس نے او۔کے کا اشارہ کر دیا تھا۔ حالانکہ کسی سے پردہ نہ تھا لیکن میں چاہتا تھا اکبر خان آرام سے ناشتا کر لے اور پھر سکون سے اُس کی کارروائی سُنی جائے۔

اُس نے صرف چائے پی تھی۔ ناشتا باہر سے ہی کر آیا تھا۔ "ہاں اکبر خان! اب سُناؤ کیا کر آئے ہو؟" جب ہنٹ برتن سمیٹ کر لے گیا تو میں نے پوچھا۔

"حکم کی تعمیل جناب۔" اکبر مستعدی سے بولا۔ "لو بجے اُس نے دُکان بند کی۔ تمام رقم ایک تھیلے میں رکھ کر وہ پیدل ہی چل پڑا تھا۔

خان ہوٹل میں گیا باقی گوشت کا آرڈر دیا۔ میں نے بھی دوسرے ٹیبل پر کھانا کھایا پھر اُس نے قہوہ منگوایا۔ ٹھیک دس بجے وہ کھانے سے فارغ ہو کر گودام کی طرف روانہ ہُوا۔ پھر اُس نے ایک دربان سے دستک دی اور چابی لے کر گودام میں داخل ہو گیا۔ میں نے اندر جا کر بس اُسے دبایا جناب! پھر گتے کے ڈبوں کو ایک جگہ رکھا اُوپر اُسے اوندھا کیا اور آگ لگا دی۔"

"مال اندازاً کتنا تھا وہاں؟" بیگن نے پوچھا۔ چونکہ بیگن نے رومن اُردو میں سوال کیا تھا لہٰذا مجھے اُس کا سوال دُہرانا پڑا تھا۔

"صابن کے چھ ڈبے تھے۔" اکبر نے بتایا۔ "لیکن جب آگ لگی تو میں نے دیکھا تھا ڈبوں میں چرس تھی۔ میرا خیال ہے پورے محلے کو مفت کا نشہ مل گیا ہوگا۔"

"صبح تک کہاں رہے، چلے آتے۔"

"او جی میں نے سوچا صاب کو بے آرامی ہوگی۔" اکبر شرمائے انداز میں بتانے لگا۔ "میڑھیوں والے پُل پر گدا گروں کے درمیان بیٹ گیا تھا۔ پولیس گشت کر رہی تھی وہاں ٹھٹھوٹھ جگہ تھی۔"

"اب تم آرام کرو۔" میں نے کہا۔ "ماسٹر آپ اکبر خان کو ایک کمرا دے دیں۔"

اگر ہیروئن یا چرس کا معاملہ ہوتا تو میں وہی چال دُہراتا جس نے رنگ باز خان کو بے رنگ کر دیا تھا لیکن بیگن عزیز تھی اور فضل خان اتنا بھی بدھو نہ تھا کہ بیگن کو گاہک تسلیم کر لیتا۔ کیونکہ ڈرم نہ تو کسی دوسرے ملک میں اسمگل کیے جا سکتے تھے نہ ہی باہر دیسی شراب کی مانگ تھی۔

اکبر خان اَن پڑھ دیہاتی تھا وہ آنکھ کے اشارے سے شکار کا زخمہ تو بجا سکتا تھا لیکن فضل خان جیسے گھاگ کے سامنے اداکاری نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا فضل خان سے پنجہ آزمائی کا فیصلہ میں نے اپنی ذات تک محدود کر لیا تھا۔

ثمینہ اور امینہ کو گھر سے لیا۔ ثمینہ تو اپنے خول میں بند رہنے والی لڑکی تھی۔ جب اس کا باپ ٹھیک ٹھاک تھا تب بھی وہ ثوب ناپ تول کر بولتی تھی اور سوچ سمجھ کر نگاہوں کی جھالر اُٹھاتی تھی لیکن بُھبل کی مانند چہکنے والی امینہ سوگواریت کے خول میں بند ہو گئی تھی۔ میں اسپتال تک اُن کو حوصلے کی دیواریں مضبوط کرنے کی تلقین کرتا رہا تھا۔

رنگ باز ہوش میں تھا۔ رشیدہ اُس کی بغل سے لگی اُس کا دایاں بازو دبا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ہمیں چند منٹ کی اجازت دیتے ہوئے خاموشی کا وعدہ لیا تھا۔ ثمینہ فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی بیڈ پر امینہ ٹوپ کر میرے پہلو سے نکل کر باپ کے سینے سے جا لگی تھی۔ خان کی کھلی آنکھوں نے ردِعمل ظاہر کیا تھا۔ آنکھیں اُبل پڑی تھیں۔ وہ تو پتھر بن چکا تھا۔ جب وہ رو رہا تھا تو اُس کا چہرہ بے حس و حرکت ہی رہا تھا۔

میں نے امینہ کو نوچ کر الگ کیا اور رشیدہ اُسے باہنوں میں سمیٹ کر باہر لے گئی تھی۔ خان ایک ٹک کبھی ثمینہ کو اور کبھی مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ڈاکٹر پُر اُمید ہیں انکل۔" میں نے اس کا بے جان ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ گھر، بچیوں اور بزنس کا فکر نہ کریں۔ میں نگرانی کر رہا ہوں۔ میں نے گودام کا مال واپس حاصل کر لیا ہے۔ دوسرے معاملات بھی دیکھ رہا ہوں۔"

میں ایسا قاتل تھا جو مقتول کی رُوح کو دُنیا سے خوش اور مطمئن رخصت کرنا چاہتا تھا۔ خان کو جس دُکھ نے جاں بلب کر دیا تھا، میں چاہتا تھا کہ مرتے وقت وہ دُکھ لے کر نہ جائے۔ اگر اُس کی زبان قوتِ گویائی سے محروم نہ ہوتی تو شاید وہ اطمینان کا اظہار کرتا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُس کی قوتِ سماعت بھی زندہ تھی یا اُس پر بھی فالج گر چکا تھا۔

نرس نے مؤدب انداز میں چلے جانے کی درخواست کی تھی۔ میں ثمینہ کو چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ ایمرجنسی وارڈ کے سامنے رشیدہ اور امینہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ رشیدہ نے اُس معصوم بچی کو سنبھال رکھا تھا۔

"فرحم۔" رشیدہ بولی۔ "اگر تم اجازت دو تو میں امینہ کے ساتھ اُدھر رہ جاؤں؟"

"اجازت کی ضرورت نہیں وہ بھی اپنا گھر ہے۔ آؤ چلیں۔" میں نے سوچا تھا اگر رشیدہ اُسے اپنے گھر لے جانے کی بات کرتی تو میرا جواب یقیناً دوسرا ہوتا۔ کیونکہ میں امینہ کو اُس گھر میں نہیں لے جانا چاہتا تھا جہاں میرے ساتھی تھے۔

خان کے گھر سے جب میں نے سلیمان کو کال کیا تو کال براہِ راست سلیمان نے ہی ریسیو کی تھی۔ شاید اُس کی سیکرٹری براہِ راست رابطہ منقطع کرنا بھول گئی تھی۔

"کیا بات ہے سلیمان؟" میں نے بے تکلفانہ لہجے میں پوچھا۔ "کئی بار ٹرائی کر چکا ہوں۔"

"ایک منٹ چوہدری۔" اُس نے کال ہولڈ پر لگا دی تھی۔ اُس نے بیل بجانے کے بعد ہی ماؤتھ پیس پر ہتھیلی رکھی ہوگی۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم دیا اور میں نے فوراً ریسیور رکھ دیا تھا۔ اگر رابطہ قائم رہتا تو سلیمان، خان کا نمبر ٹریس کروا سکتا تھا۔ حالانکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رنگ باز نے یہی بتایا تھا کہ ٹیلی فون کا کہیں اندراج نہیں لیکن میں کوئی ایسا رسک نہیں لینا چاہتا تھا جو میرا تعلق خان سے ثابت کر دیتا اور میرے پاس کوئی جواز نہ ہوتا۔

دوسری بار میں نے اُسے ایک بوتھ سے کال کیا تھا۔

"فون کیوں چھوڑ گئے تھے چوہدری؟" سلیمان نے تُرش آواز میں پوچھا۔

"ایک خاتون کو ضروری کال کرنا تھی سیٹھ" میں نے جواب دیا۔ "یہ پبلک پلیس ہے میں زیادہ دیر ٹیلی فون مصروف نہیں رکھ سکتا تھا۔"

"احتیاط اچھی عادت ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسنے لگا۔ "آؤ تم سے ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

"بہتر سیٹھ" میں آہستہ بولا۔ میں نے ریسیور ہک سے سٹکایا اور باہر نکل گیا۔

*

اس نے جھک کر والہانہ انداز سے معانقہ کیا تھا۔ چہرے پر بھی دوستانہ مسکراہٹ تھی لیکن اُس کے انداز سے اُس کی آنکھیں میل نہ کھا رہی تھیں۔ مائل بہ سُرخ آنکھوں میں اضطراب اور بے نام سا خوف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھیں ہی کسی کی شخصیت اور دلی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ انسان چہرہ، آواز اور حرکات وسکنات کے انداز سب کچھ بدل سکتا ہے لیکن آنکھوں پر پٹی تو باندھ سکتا ہے وہ آنکھوں کو کوئی دوسرا رُوپ نہیں دے سکتا۔

"خان کی کوئی خبر؟" اُس نے کہنیوں کے بل آگے جھک کر پوچھا۔

"اپنی دیواروں کے بھی تنے ایڑیاں رگڑ رہا ہے"

"بڑا کم حوصلہ ثابت ہُوا۔" سلیمان نے قہقہہ لگایا۔ "بڑے چرپے تھے اس کے شہر میں۔"

"ہاتھی جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی کم حوصلہ بھی ہوتا ہے سیٹھ" میں نے کہا۔ "سُنا نہیں آپ نے چیونٹی بھی..."

"ہاں۔" سلیمان بھڑک اُٹھا۔ "لیکن اُس کا مقابلہ چیونٹی سے نہیں تھا۔"

"کیا میں آپ کو بھی ہاتھی کہوں سیٹھ؟"

"چھوڑو۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "اپنی بات کرو، میں نے مال کا انتظام کر لیا ہے۔"

"شکریہ سیٹھ۔" میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ "اب میں ضرورت مند نہیں ہُوں، میری پاری جا چکی ہے۔"

"کتنا مال لے کر؟"

"کیا جواب ضروری ہے سیٹھ؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"ہاں۔" وہ غرایا۔ "تمہیں جواب دینا ہوگا مسٹر خرم سلطان۔ اس لیے کہ تم نے خان سے مل کر مجھے لوٹا ہے۔"

"بڑی دل خوش کُن خبر ہے میرے لیے۔" میرے لبوں پر مسکراہٹ اُبھرنے لگی۔ سرد اور سفاک مسکراہٹ۔

سلیمان سیٹھ جیسے بڑے ہاتھی سے مجھ جیسا بے نام بے حیثیت دانا گنا چھین لے گیا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو اصول اور عزت کا تقاضہ یہی ہے کہ اب تمہیں اس بزنس سے ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ جس معروف اسمگلر کو کل کے لونڈے لوٹ لیں اُسے آلو پیاز کی ریڑھی لگا لینی چاہیے۔"

"یہی فیصلہ کرنے کے لیے تمہیں بُلایا ہے چوہدری۔" اُس نے روشن دان کی جانب دیکھا۔ "اگر تم اعتراف کر لو تو پھر فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"کاش ایسا ہوتا تو میں اعتراف کر کے ایک سیٹھ کو اپنی بوٹیاں نوچتے دیکھتا لیکن جھوٹ کی تائید کر کے شرمندگی ہوگی۔"

"ایسا ہُوا ہے چوہدری۔" وہ نرم و درد آواز میں بولا۔ "میرے پاس ثبوت ہیں۔"

"اچھا..." میں ہنس پڑا۔ "کوئی ایک ثبوت دکھاؤ، شاید حالتِ خواب میں مجھ سے اتنا بڑا کارنامہ ہو گیا ہو۔"

"تم اُس رات میرے مینیجر اشرف کے ساتھ حسن ابدال گئے تھے۔"

"چلو مان لیا گیا تھا۔"

"کیوں؟"

"سُنو سیٹھ! میں فرض کر لیتا ہُوں کہ گیا تھا لیکن میں گیا نہیں تھا۔"

اُس نے کال بیل بجائی اور ایک آدمی اندر آ گیا۔ "انسپکٹر کو اندر بھیج دو۔" سلیمان نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور انسپکٹر کا نام سُن کر میرے اندر فائر بریگیڈ کے سائرن چیخنے لگے تھے۔ آگ بھڑک اٹھی تھی لیکن میں بے بس تھا۔ کیونکہ میں نے سامنے دونوں... روشن دانوں سے جھانکتے پیرل دیکھ لیے تھے۔ سیٹھ سلیمان نے ماضی کی روشنی میں میرے استقبال کا شایانِ شان انتظام کر رکھا تھا۔

"آیئے انسپکٹر۔" ادھم سامنے۔" میں نے پلٹ کر نہ دیکھا تھا جو آیا تھا، جو ہونے والا تھا اُسے سامنے تو آنا تھا۔ پھر میں گردن کو گھمانے کی زحمت کیوں دیتا۔ "آپ ان سے واقف ہوں گے یقیناً..."

انسپکٹر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ کیونکہ اُسے میں

نے اپنا آفیشل عہدہ بتا دیا تھا۔ سیٹھ سلیمان اُمید و بیم بھری نگاہوں سے انسپکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے انسپکٹر کو آنکھ کا اشارہ دے کر زبان بندی کا حکم دے دیا تھا۔

"نہیں سیٹھ! میں نے صرف اشرف خان کو سہارا تھا کار میں روشنی تھی اس لیے..." انسپکٹر نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔ "جو نوجوان باہر آیا تھا اُسے میں شکل سے نہیں پہچان سکتا۔"

"قد اور جسامت؟" سیٹھ اُسے کُریدنے لگا۔ "یاد کرو انسپکٹر! تم سے اُس نوجوان نے باتیں کی تھیں، آواز تو تمہیں یاد ہونی چاہیے ہیں خرم سلطان، تم بولو۔"

"شکر ہے، گانے کی فرمائش نہیں کر دی آپ نے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں، میرے لیے ان کی آواز غیر مانوس ہے۔"

سیٹھ سلیمان نے پھر گھنٹی بجائی اور دھاڑ کر بولا۔ "اُس بوڑھے کو لے آؤ۔"

دو منٹ بعد قدموں کی چاپ کے ساتھ ایک بوڑھا کراہتا ہُوا میز سے ٹکرایا تھا۔ "بوڑھے!" سلیمان ظالیاں توڑنے والے انداز میں بولا۔ "کیا تم نے اس نوجوان کو حسن ابدال کی اُس گلی میں دیکھا تھا؟ تم بتا چکے ہو کہ کسی انسان کو کاندھے پر ڈالے گلی میں سے گزرتے تم دیکھ چکے ہو۔"

"اندھیرا تھا جناب۔" بوڑھا گلوگیر آواز میں بتانے لگا۔ "دو تھیلے میں اپنی چھت پر تھا جناب! ہاں قد اور جسم اسی نوجوان سے ملتا جلتا تھا۔ جب وہ اسٹریٹ لیمپ کے نیچے سے گزرے تو میں نے دیکھا تھا۔ شاید یہی نوجوان تھا۔"

"آپ جبراً اقرار کروا رہے ہیں سیٹھ۔" انسپکٹر بول پڑا۔ "بزرگ نے اندھیرے کا ذکر کر کے اپنے بیان کو مشکوک کر دیا ہے۔"

"یہ قاتل ہے انسپکٹر۔" سلیمان تُند انداز میں بولا۔ "اس نے میرے دو آدمیوں کو قتل کیا اور گودام سے مال لوٹ لیا تھا۔ اگر بات صرف ڈاکے کی حد تک رہتی تو میں شک کا فائدہ دے سکتا تھا لیکن قاتل کو معاف کرنا قانون اور انصاف سے غداری ہوگی۔"

"مال کی نوعیت بھی انسپکٹر کو بتا دو سیٹھ۔" میں نے بے خوف لہجے میں اُسے چڑایا۔ میں انسپکٹر کی موجودگی میں خود کو خطرے سے باہر جان کر جرأت و رعب پر قادر ہو گیا تھا۔ سیٹھ یہ ایک انسپکٹر کی موجودگی اور گواہی کو نظر انداز کرنے کی حماقت نہ کر سکتا تھا۔

"یہ بات تم عدالت میں بتا دینا چوہدری۔" سلیمان نے جواب دیا۔

"وہاں گواہ کہاں سے لاؤ گے سیٹھ؟" انسپکٹر نے پوچھا۔ "میں

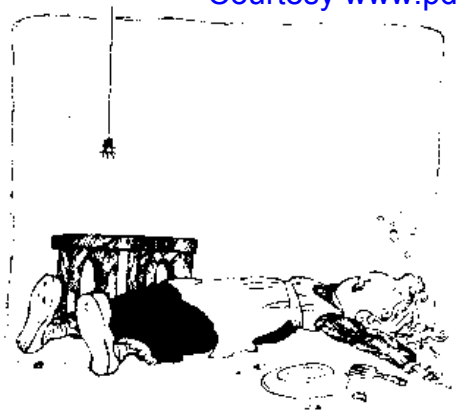

انکار کر چکا ہُوں، بوڑھا یہاں خوف زدہ ہے۔ وہاں اندھیرے کا ذکر ضرور کرے گا۔"

"تو پھر...؟" سلیمان رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "تو کیا اسے شک کی بنیاد پر چھوڑ دیا جائے؟"

"ہاں سیٹھ! یہ تمہاری مجبوری اور میرا فرض ہے۔" انسپکٹر بولا۔ "آیئے مسٹر، میں آپ کو باہر تک چھوڑ آؤں۔"

"شکریہ انسپکٹر۔" میں ہتھیلیاں ٹیک کر اُٹھا۔ "سُنو سیٹھ! یہ پہلا راؤنڈ ہے۔ میں اسی شہر میں ہُوں۔ ہم دوسرا راؤنڈ بھی کھیلنا پسند کریں گے۔"

میں نے کُرسی کو بیک کِک ماری اور انسپکٹر کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ میرے ستارے اچھے تھے۔ اُس نے انسپکٹر کو بطور گواہ طلب کر رکھا تھا۔ اگر صرف بوڑھا پیش کیا جاتا تو نوبت ہنگامہ آرائی تک پہنچ جاتی۔ کیونکہ اُس نے مجھے گھیرنے کا مکمل انتظام اپنے گرد پھیلا دیا تھا۔

"آپ کو ان پاگل سانڈوں سے ہوشیار رہنا چاہیے تھا خرم صاحب۔" انسپکٹر نے دوستانہ پیرائے میں کہا۔ "سیٹھ سلیمان جیسے لوگ اندر جا کر پھٹتے ہیں۔ ان کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگ سکتا۔ میں تمہارے سامنے ہُوں، مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے لیکن میں کچے دھاگے سے بندھا یہاں پہنچا دیا گیا ہُوں۔"

"آپ نے کسی سے ذکر کیا تھا؟"

"میں نے نہیں دوست۔" انسپکٹر نے نفی صفائی میں بتایا۔ ڈیوٹی کانسٹیبل نے اشرف کو پہچان لیا تھا۔ پھر سلیمان نہ جانے کیسے اُس تک جا پہنچا تھا۔"

"ٹھیک ہے انسپکٹر! آپ واپس جائیں۔" میں نے اپنی کار کے قریب جا کر کہا۔ "آپ کی سروس کا معاملہ ہے۔ میری ہمدردی کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر آپ کو سزا ملی تو مجھے دکھ ہوگا۔"

"سچائی کی خاطر میں بڑی سے بڑی سزا ہنس کر جھیل لوں گا۔" وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔ "آپ اپنی حفاظت کا خیال رکھیں گے۔ مجھے سلیمان کے تیور اچھے نہیں لگے۔ یہ بڑا کینہ پرور اور بااثر شخص ہے۔"

"آپ سے ملاقات تو ہوتی رہے گی نا انسپکٹر؟"

"کیوں نہیں! لیکن فی الحال نہیں۔ آپ سیٹھ کی نگاہوں میں آچکے ہیں۔ یہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

"میں تو چاہتا ہوں انسپکٹر۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھے مکّا مارے۔"

"خود نہیں مارے گا پیارے۔" انسپکٹر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھ جیسے درجنوں انسپکٹر اس کی جیب میں پڑے رہتے ہیں اور غنڈوں کی فوج الگ ہے۔"

"اتنا کچھ جاننے کے باوجود آپ لوگ اب تک کچھ نہیں کر پائے؟"

"ہاں دوست۔" اس نے گہری سانس لی۔ "سیٹھ سلیمان کی ذات سے کئی نہریں نکلتی ہیں جو چھوٹے بڑے صحراؤں کی پیاس بجھاتی ہیں۔ پانی اُن خشک صحراؤں کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس دریا کو کوئی بند نہیں کرنا چاہتا۔"

"انسپکٹر!" میں نے اچانک خیال کو زبان دی۔ "آپ اس جہاد میں مجاہدین کا ساتھ دینا چاہتے ہیں؟"

"دلی وجدان سے۔" انسپکٹر نے ٹھوس آواز میں کہا۔ "لیکن میں وہی کچھ کرنے پر مجبور ہوں جو افسرانِ بالا چاہتے ہیں۔ آپ کو شاید یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ مجھے چیک پوسٹ سے ہٹا کر ہیڈ کوارٹر حاضر کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ میں نے دریاؤں کا راستہ روک دیا تھا۔ اب مجھے آفس میں فائلیں چاٹنے پر لگا دیا گیا ہے۔ اگر میں اُدھر رہتا تو نہریں خشک ہو جاتیں اور پیاسے صحرا بنجر بن جاتے۔"

"میرا وعدہ یاد رکھیے گا انسپکٹر۔" میں نے ہاتھ بڑھایا اور اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔ "میں جیند ولوں کے اندر اندر آپ کو اپنی ٹیم میں شامل کر لوں گا۔"

"اگر ایسا ہوا تو یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری آرزو پوری ہوگی۔"

"آپ ذہنی طور پر تیار رہیے گا۔" میں نے کہا اور وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ہم دونوں نے سیٹھ سلیمان کو بالائی منزل کی کھڑکی سے جھانکتے دیکھ لیا تھا۔

انسپکٹر اپنی لینڈ روور کی جانب بڑھتا چلا گیا تھا اور میں نے کار کو یوٹرن دیتے ہوئے ہاتھ لہرا کر سلیمان کو خدا حافظ کہا تھا۔ وہ عقب نما آئینے میں مقید تھا اور میں دیکھ رہا تھا اس نے میرے ہاتھ کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

کرم شاہ مجھے گاڑی سے نکلتے دیکھ کر دکان سے باہر نکل آیا تھا۔ بزرگ کے ناتے جُھک کر مجھے ملنا چاہیے تھا لیکن اُس نے ادب سے سر جُھکا دیا تھا۔ حالانکہ گزشتہ ملاقات میں اُس کا رویّہ کچھ خشک ہی رہا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اُس کے رویّے کو نظر انداز کر دیا تھا کہ فضل خان نے بھاری سودے کی بات کر کے میری اہمیت بڑھا دی ہوگی۔

"فضل خان کہاں ہے جناب؟" اندر جا کر میں نے پوچھا۔

"آپ کے لیے کہہ گیا ہے عزیزم۔" وہ پیچھے پیچھے لہجے میں بولا۔ "کہ جونہی آئیں اُسے بُلا لیا جائے۔ آپ تشریف رکھیں، میں اُسے فون پر اطلاع کرتا ہوں۔ دراصل ایک اور پارٹی مال اُٹھانا چاہتی ہے لیکن ہمارا اصول ہے، جو پہلے آئے وہی مال کا حق دار ہوگا۔ آپ اگر پسند فرمائیں تو دوسری پارٹی سے سودا کر لیں۔ کیونکہ ہم آپ سے وعدہ کر چکے ہیں۔"

"فضل خان سے بات کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے محترم۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر چلا گیا۔

کرم شاہ بچھا جا رہا تھا جیسے کوئی اہم شخصیت اچانک اُس کی بدنُما دار دکان میں آگئی تھی۔ اُس نے میرے انکار کے باوجود کوک منگوا لیا۔ وہ فضل خان کی دیانت داری اور وفاداری کے گیت گانے لگا۔ باتوں باتوں میں ترغیب دے رہا تھا کہ ہمیشہ مال فضل خان سے ہی خریدا جائے۔ کوالٹی اور کمیشن پر بھی اُس نے روشنی ڈالی تھی۔ میں کوک پیتے ہوئے بوڑھے کی شاطرانہ باتوں پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ وہ مُہلک بم کو اپنے برنس کے جسم پر باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس طرح سلیمان اور رنگ باز نے جماعت کی تھی۔

فضل خان سُرخ ٹیوٹا میں طوفانی رفتار سے آیا اور دکان کے سامنے گاڑی روک کر ایسے اُترا جیسے چھاتہ بردار جہاز کریش ہونے سے قبل کودتا ہے۔ وہ اندر آیا تو میں نے اُٹھ کر مصافحہ کیا۔ کرم شاہ بھی میرے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"بہت اچھے وقت پر آئے آپ۔" وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ "میں پریشان تھا آپ کو کہاں تلاش کیا جائے۔ ایک احمق پارٹی..." اُس نے بات روک کر قہقہہ لگایا۔ "نئے نئے یتیم ہوئے ہیں شاید ولایتی مال کی قیمت لگا رہے ہیں۔ آپ کی پہلی پارٹی کے لیے میں ہنگامی بنیادوں پر اور مال سپلائی کر

دوں گا۔ ان احمقوں کو ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے۔ میں اگر آپ سے بات نہ کر چکا ہوتا تو اب تک گودام خالی ہو چکا ہوتا لیکن اصول ہمارا پہلا نصب العین ہے۔ دولت سے دولت کے ذرائع بہتر ہوتے ہیں۔ اچھی ساکھ ہی باوثوق ذریعہ ہوتی ہے..."

"کیا یہی اصول میں توڑ دوں برادر؟" میں نے زیرِ لب مُسکرا کر پوچھا۔ "نہیں دوست اگر ہیروں کا مول لگائیں تب بھی میں اس پارٹی سے معاملہ نہیں کروں گا۔ میں تو اپنی پارٹی سے زیادہ بیعانہ بھی لے چکا ہوں۔"

"میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔" فضل خان بولا۔ "ٹھیک ہے چلیے مال دیکھ لیں۔ میرا طریقۂ کار ذرا اوروں سے مختلف رہا ہے۔ میں اندھیروں کو دھوکا دیتا ہوں اور مال دن کی روشنی میں نکال دیتا ہوں۔ اندھیرے میں جو آنکھیں بیدار ہوتی ہیں وہ نگران ہوتی ہیں۔ جب کہ روشنی میں لاکھوں آنکھیں اپنے مسائل کو پڑھتی رہیں۔"

میں نے لحظہ بھر سوچا اور پھر گودام دیکھ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بکرا منڈی اور دسیال کیمپ کے درمیان گنجان آبادی میں اُس کا گودام تھا۔ باہر ایک آدمی ایک ڈیزل ڈرم صاف کر رہا تھا۔ فضل خان نے اُس سے کچھ پوچھا اور پھر تالا کھول کر مجھے اندر لے گیا۔ کمرے میں چھوٹے بڑے ڈرم اوندھے سیدھے بکھرے ہوئے تھے۔ بظاہر یہی دکھائی دیتا تھا کہ بالٹیوں کے لیے پرانے ڈرم اسٹاک کیے گئے ہیں۔

"اصل جگہ تہ خانہ ہے۔" فضل خان نے ایک ڈرم کو ٹھوکر رستے ہوئے بتایا۔ "ایک بار چھاپہ پڑا تھا۔ وہ خالی ڈرم دیکھ کر شرمندہ ہوئے تھے۔" اُس نے ایک بٹن پُش کیا اور فرش سے لوہے کی چادر آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔ جب خلا نمودار ہوا تو تہ خانے کی آہنی سیڑھیاں اُوپر... آکر لگ گئی تھیں۔

تہ خانہ تاریک تھا۔ جب میں آخری قدمچے سے نیچے اُترا تو باہر سے آتی روشنی بھی معدوم ہو گئی تھی۔ خلا بند ہو گیا تھا۔ اُسی لمحے ٹارچ کی آواز کے ساتھ تہ خانہ روشن ہو گیا اور میں اُٹھا ہوا قدم جام ہو کر رہ گیا تھا۔ دائیں بائیں چار مسلح آدمی کھڑے تھے اور اُن میں رنگ باز کا میجر ولی خان بھی شامل تھا۔

پہلی ہدایت ہے جس کا ہاتھ پتھر مارتا ہے اُس کے سر کو پتھر کھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے... پھر میرے ہاتھ نے تو بیک وقت دو خوابیدہ بھیڑیوں کو پتھر مار کر جگا دیا تھا۔ جب میں نے پتھر مارنے کا فیصلہ کیا تھا، اُس وقت بھی مجھے احساس تھا کہ یہ بھیڑیے انگلیوں میں سونے والے آوارہ کتوں کی طرح چوٹ کھا کر جیالوں جیالوں کرتے، آگے آگے بھاگنے والے نہیں ہیں۔ جب میں نے پتھر اُچھالے، تب بھی مجھے جوابی کارروائی اور خطرات سے دوچار ہونے کا یقین تھا۔

میں پتھر مارنے کا اور میرا سر جوابی چوٹیں سہنے کا عادی تھا۔ میری خوبیوں کا آپ بیتی پڑھنے والے اُس خرم سلطان چوہدری سے کوئی واقف ہوں گے جسے پتھر مارنے کے جرم میں بیک وقت کئی بھیڑیوں نے گھیر لیا تھا۔ ہانگ کانگ کے آباد جنگل میں بھی میرے تعاقب میں چنگ چی اور می جو جیسے خونخوار درندے تھے۔ جب میں پتھر مارتا ہوا، فلپائن کے آباد جنگل میں داخل ہوا تو دونوں درندے وہاں بھی پہنچ گئے تھے... ایک استقبال کے لیے دانت نکوسے ساحل پر کھڑا تھا اور دوسرا اپنی بیٹی... بدام جوزی کے ساتھ میرے تعاقب میں تھا۔ اب اگر میں ترازو کے ایک پلڑے میں چنگ چی اور می جو کو اور دوسرے پلڑے میں رنگ باز اور سیٹھ سلیمان کو رکھ کر موازنہ کرتا تو یہ دونوں اُن کے مقابلے میں چوہے ہی تھے۔

ولی خان اور کرم شاہ کا گرگا فصل اُنھی چوہوں کے پروردہ تھے لیکن اُن کے ہاتھوں میں دبے ریوالور یقیناً ویسے ہی تھے جیسے چنگ چی اور می جو کے ہاتھوں میں ہوا کرتے تھے اس لیے مجھے سوچنا پڑا تھا کہ چوہوں کو تو کوئی بھی پیروں تلے مسل سکتا ہے مگر ریوالور سے نکلنے والی گولیاں یہاں اور وہاں ہر جگہ ایک جیسی طاقت رکھتی ہیں۔

وہ دونوں مجھے کینہ توز نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ فضل خان پہلو کی طرف کھڑا تھا اور ولی خان سامنے ٹانگیں پھیلائے کھڑا زیرِ لب مُسکرا رہا تھا اور میرا ذہن تیزی سے اُن سے نمٹنے کی حکمتِ عملی تیار کر رہا تھا کہ اُن درندوں کے سامنے کیا پھینکا جائے؟ کوئی ترکیب، کوئی بھانسا، کوئی ٹرک، کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ میرا ریوالور جیب میں تھا اور فاصلہ کم ہونے کے باوجود ہاتھ قاصر تھا کہ آٹھ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ جونہی ہاتھ اُٹھتا، کسی بھی طرف سے آنے والی گولی، ہاتھ کا سفر روک دیتی۔

ولی خان: "بالآخر میں نے زبان کو بڑھایا تھا۔ بعض اوقات زبان سے نکلی ہوئی بات ایٹم بم سے کہیں زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے۔ زبان کا لگایا ہوا زخم مہلک بھی ہوتا ہے اور زبان ہی تیر بہدف مرہم بھی بن جاتی ہے۔" ایک ہی ترکش کے تیر، ایک کمان اور ایک ہی حرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے ہوتے ہیں۔ تمھارے تیور کسی اور طرف اشارہ کرتے ہیں مگر تمھارے بارے میں خان کے جذبات جو مجھ تک پہنچے ہیں' ان تیوروں کی نفی کرتے ہیں۔ جانتے ہو' ولی خان! تمھارے اور میرے آقا نے تمھارے لیے کیسے خوبصورت اور باوقوق الفاظ کا انتخاب کیا تھا..."

میں نے رُک کر' اُس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اُس کی مُسکراہٹ دھیرے دھیرے معدوم ہو رہی تھی۔ باتوں کا اثر' اُس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ تب میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑا۔ "اُس نے کہا تھا' اگر میرا بیٹا ہوتا یا کوئی سگا بھائی ہوتا تو بھی میں آنکھیں بند کر کے اُسے وفادار نہ کہتا لیکن ولی خان بیٹا ہے نہ بھائی مگر میں بلا توقف کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرا جاں نثار اور وفادار ہے۔"

"تم اپنی بات کرو' نوجوان!" اُس کے حلق سے کھرکھراتی آواز نکلی۔ "میں اور خان یک جان' دو قالب ہیں۔ جان' قالب کی شکر گزار نہیں ہوتی اور قالب' جان کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ لہٰذا ہماری بات چھوڑو' ہماری وفاداری غیر مشروط ہے۔"

"کیا خان نے تمھیں نہیں بتایا تھا' ولی خان؟" میں نے بدستور اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بتایا تھا۔" اُس نے زہریلی آواز میں کہا۔ "لیکن جو کچھ میرے مشاہدے میں آیا ہے' وہ اور پھر حالات و واقعات کی روشنی' خان کی باتوں کی نفی کر رہی ہے۔"

میرے ہونٹوں پر اُبھرنے والی مُسکراہٹ دوستانہ ہرگز نہ رہی ہوگی لیکن میں اُسے تاثرِ دوستی ہی کا دینا چاہتا تھا۔ میرے ہونٹ مُسکرا رہے تھے اور دماغ سوچ رہا تھا کہ مدِمقابل نے جو تجزیہ کیا ہے' جو نتیجہ اخذ کیا ہے' وہ سو فی صد حقائق پر مبنی ہے۔ مجھے ولی خان کی علمی قابلیت اور ذہنی سطح معلوم نہ تھی لیکن بظاہر وہ چاق و چوبند تھا۔ اُس کی سبزی مائل بھوری آنکھوں میں ذہانت کی چمک نمایاں تھی۔ ایسے میں تو معمولی ذہن کا آدمی بھی حالات کا تجزیہ کر کے اصل حقائق تک پہنچ سکتا تھا کہ ناکامی کا دور' ایک اجنبی نوجوان کی اچانک آمد کے بعد کیوں شروع ہوا ہے؟ ولی خان تو پھر بھی اسی فیلڈ کا آدمی تھا اور اُس کے لیے ان سوالات کے جواب حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

"کیا وضاحتیں اجنبیوں کے درمیان بہتر ہوں گی' ولی خان؟" میں نے فضل خان کی جانب اشارہ کیا۔ "جہاں تک خان نے مجھے کچھ شارے دیے تھے' اُن کے مطابق کرم شاہ آن کال قسم کا معاون ہے' تم سے پوشیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہر بزنس مین کے کچھ بزنس سیکرٹ ہوتے ہیں۔ کیا ہم' خان کے وفادار' اُس کے راز' دوسروں کے سامنے زیرِ بحث لا کر' وفاداری اور دانش مندی کا ثبوت دیں گے؟"

"فضل خان..." میرا مدِمقابل لڑکھڑا گیا۔ "تم ذرا اُوپر چلے جاؤ' میں اس کے دانت دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ میرا مجرم ہے' ولی خان!" فضل دکھتی آواز میں بولا۔ "تم صرف باتوں تک محدود رہو گے۔" اُس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں... اور ان آنکھوں میں سفاکی کے سوا اور کچھ نہ تھا پھر وہ ایڑیوں پر گھوما اور سیڑھیوں کی جانب مُڑ گیا۔

"تم بھی' دوستو!" میں نے سُکڑے سہمے دونوجوانوں کو اشارہ کیا۔ "اُوپر چلے جاؤ۔" میری بات سُن کر اُنھوں نے حُکم طلب نگاہوں سے ولی خان کو دیکھا تو اُس نے گردن کے اشارے سے میرے حُکم کی تائید کر دی۔ ولی خان کا اشارہ ملتے ہی اُن کے زرد چہرے کھل اُٹھے اور وہ ایسے ہی سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے جیسے موت نے اُن کو مٹھی سے آزاد کر کے لحظہ بھر کی مُہلت دے دی ہو۔

اُوپر جا کر فضل خان نے آخری قدمچے پر رُک کر' نہ خانے کی جانب دیکھا اور پھر شرمگراتا ہوا داخل ہو گیا۔ میں کن انکھیوں سے ولی خان کی آنکھوں کو دیکھتا رہا تھا اور ہر لمحے اُسے چوکنا ہی پایا تھا۔

"ہاں' اب بات کرو' چوہدری!" وہ بیک ڈرم سے ٹیک لگا کر غرایا۔ "لیکن جھوٹ نہیں۔ کیونکہ میں حقائق کی گہرائیوں سے واپس آیا ہوں۔"

"کہاں سے بات شروع کروں' دوست؟" میں بے خوف لہجے میں بولا۔ میں کسی طرح بھی خود کو بے بس ظاہر کرنا... نہیں چاہتا تھا۔

"اپنی ذات سے اور خان کی دلچسپی سے۔"

"پھر سوال تم کرو اور جواب میں دوں گا۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟ میرا مطلب ہے' نام کی اوٹ میں تم اصل کیا ہو؟"

میں ہنس پڑا اور ولی خان نے اپنا نچلا ہونٹ' سوار زدہ دانتوں میں دبا لیا۔

"ہو سکتا ہے' میرا نام بھی اصل نہ ہو۔" میں نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔ "جو لوگ ذات کو نقاب پہناتے ہیں' نام بھی نقاب کی تہ میں چھپا لیتے ہیں۔ بالفرض' میں خرم سلطان نہیں' ایڈورڈ ہوں تو تم کیا کہو گے؟"

"تو..." اُس کے حلق سے غرغراہٹ اُبھری۔ "تو میں تمھیں اسی طرح اُدھیڑ ڈالوں گا جس طرح کہ میں اون جوتے کسنے والے

اُدھیڑ کر مال برآمد کر لیا کرتے ہیں۔"

"مجھے یقین ہے' تم ایسا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہو' ولی خان!" میں نے پُرستائش نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "خان کے وفاداروں کو ایسا ہی ہونا چاہیے ورنہ مجھے مایوسی ہوتی کہ خان نے تم نکمے کو مکمل مرد سمجھ رکھا ہے۔ ویسے میرا خیال تھا کہ خان نے تمھیں میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ تم جیسے شخص کو... وہ تاریکی میں تو نہیں رکھ سکتے یا شاید خان کو تفصیلی گفتگو کی فرصت نہ ملی ہو۔ بہرحال' میں خان کا بھانجا ہوں۔ چوہدری کیوں ہوں؟ اس کے لیے مجھے ماضی میں جانا ہوگا۔ یہ ایک الگ اور گرد آلود... داستان ہے کہ خان کی بہن میری ماں کیسے بنی۔ میں خود اس داستان سے ایک ماہ قبل تک بے خبر تھا لیکن جب میرے باپ کو ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا تو میں اُن دنوں فلپائن میں تھا اور میری ماں خود کو اُس مسافر خاتون کی طرح تنہا اور بے آسرا سمجھنے لگی جسے جنگل میں درندوں کے درمیان خاندِ جیسی پناہ گاہ سے محروم کر دیا گیا ہو۔ تب اس بے سہارا عورت نے برسوں کی گرد کو صاف کیا اور اپنے بھائی کو پکارا۔ اُس بھائی کو جو اُس کے وجود کو بھی فراموش کر چکا تھا لیکن ماں کا دودھ اور رگوں میں گردش کرتا ہوا خون ایک تھا۔ خان اس دودھ کی خوشبو اور خون کی پکار پر تڑپ اُٹھا اور بہن کی دُھائی بن گیا۔ اُنھی دنوں میں بھی اُڑتا ہوا وطن پہنچ گیا۔ میرے بیان کی تصدیق خان کے علاوہ میرے تھانے کا ریکارڈ اور میری فون میں تعینات پولیس کر سکتی ہے۔"

"اچھے داستان گو ہو' چوہدری!" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ اُس نے میری کہانی پر یقین نہیں کیا ہے۔ "اگر تمھیں خان نے میری وفاداری کے علاوہ رشتے داری سے بھی آگاہ کر دیا ہوتا تو تم یقیناً کوئی دوسری کہانی سناتے۔ میں خان کا بھتیجا ہوں اور میری کسی چھوٹی کو میری دادی نے جنم نہیں دیا تھا۔"

"خدا مجھے معاف کرے۔" میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کربناک آواز میں کہا۔ "ماں کیسی بھی ہو' رشتے کے حوالے سے مقدس ہوتی ہے' جس طرح میرے والدین نے مجھ سے یہ بات چھپائے رکھی تھی' اسی طرح تمھارے والدین اور قبیلے نے اُس باغی بیٹی کو بھی آنے والی نسل سے چھپا لیا ہوگا۔ میری ماں کا تو بہ حیثیت بہن اور بیٹی قابلِ فخر نہ تھا' ولی خان!"

"شاید ایسا ہی رہا ہو۔" ولی خان اُلجھ سا گیا۔ "اب تم بتاؤ گے' چوہدری! تمھارا تعلق سلیمان سیٹھ سے کیا ہے؟ کیا وہ تمھارا چچا زاد ہے؟ اُس کے بارے میں بھی کوئی داستان سُنا دو۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ خان کا گودام کس نے لُوٹا ہے؟ اور اڈے پر حملہ کس نے کروایا ہے؟ تیسرا سوال بھی سُن لو' کرم شاہ سے مال کا سودا کس کے ایما پر کرنا چاہتے تھے؟"

"سلیمان سیٹھ سے میرا تعلق وہی ہے جو کسی حریف کا حریف سے ہوتا ہے۔ چونکہ اُس کے نزدیک میں اجنبی تھا' اس لیے خان نے مجھے آگے بڑھایا تھا' جس طرح ایک کمانڈو دُشمن کے علاقے میں جا کر شب خون مارتا ہے اور دُشمن کے راستے میں بارودی سُرنگیں بچھاتا ہے' میرے ذمے بھی یہی فرض تھا' باقی دونوں سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ خان اور تمھاری طرح میں بھی اُس خفیہ ہاتھ سے لاعلم ہوں لیکن اس کے باوجود' میں دُشمن کے بہت قریب ہو چکا ہوں۔ میں نے اُس کا اعتماد بھی حاصل کر لیا ہے۔ اگر وہ ہاتھ سلیمان کا ہوا تو میں وہ ہاتھ پلیٹ میں سجا کر خان کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت ضرور حاصل کروں گا۔" میں نے رُک کر گہری سانس لی۔ "تیسرے سوال کا جواب دینے کے لیے میں نے فضل خان کو یہاں سے ہٹایا ہے۔ یہ حُکم خان کا ہے لیکن مال کی پے منٹ ہمارے پاس نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر... ہم پے منٹ نہیں کریں گے اور مال ہمارے گودام میں منتقل ہو جائے گا۔ میں فضل خان کو اسی مقصد کے لیے گھیر لایا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ بے یقینی سے بولا۔ "خان' یار مار نہیں ہے۔ کرم شاہ ہمارا دوست ہے۔"

"سنو' ولی خان!" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "اس بزنس میں دوستی اور دُشمنی کے پیمانے بدلتے رہتے ہیں۔ ہمیں بھی کسی دوست نما دُشمن ہی نے زک پہنچائی ہے۔ ہمارا گودام خالی ہے۔ ساکھ کے لیے ہی خان نے یہ فیصلہ کیا ہوگا۔"

"سُنا ہے' خان نے اپنی عظیم بہن کے بیٹے کو انعام میں اپنا وارث قرار دے دیا ہے۔" ولی خان نے ایک دم دوسری پٹری پر بات چڑھا دی۔ "جبکہ وراثت کے قانون کی رُو سے حق دار بھتیجا ہوتا ہے۔"

"تمھیں غلط اطلاع ملی ہے' دوست!" میں نے جواب دیا۔ "وارث نہیں' بلکہ سرپرست بنایا گیا ہے۔"

"وصیت نامے میں اور کیا ہے؟"

"پڑھ لو۔" میں نے جیب کی طرف ہاتھ اُٹھایا لیکن ولی خان کافی چالاک آدمی تھا اور مجھے جیب تک ہاتھ لے جانے کی مُہلت بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

"نہیں' ہاتھ نیچے رکھو۔" اُس نے ریوالور میرے سینے سے لگا دیا۔ "خان مرض الموت میں مُبتلا ہے اور میں تم جیسے گم نام شخص کو اپنے خاندان کا سرپرست تسلیم نہیں کر سکتا۔ وصیت نامہ ضائع ہو گیا تو تم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خان کے بعد بے رنگ ہو جاؤ گے۔"

"نہیں میرے بھائی" میں نے اُسے مشتعل کرنے کی خاطر ایک بم چھوڑا۔ "خان مجھے ایک اور رنگ دے گیا ہے... جو مجھے وحشت ناکے کی عدم موجودگی میں بھی بہت کچھ بنا دے گا۔ ثمینہ گل کی اُنگلی میں میرے نام کی انگوٹھی..."

"بکواس بند کرو۔" وہ دہاڑا اور اُس کے ساتھ ہی اُس کا بایاں ہاتھ گھوما اور میں لڑکھڑاتا ہوا دائیں جانب جھک گیا۔

اُس نے میری حسبِ منشا ہی قدم اُٹھایا تھا۔ اس طرح میں ریوالور کی زد سے نکل گیا تھا۔ اُس کا دھیان میرے ہاتھوں اور بدن کے بالائی حصّے پر تھا۔ میں نے سنبھل کر دائیں ٹانگ جوڈو کے مؤثر اور آزمودہ انداز میں لہرائی۔ ضرب ولی خان کی پسلیوں پر لگی تھی۔ وہ ڈگمگاتا ہوا اُلٹ گیا۔ ریوالور والا ہاتھ اُس کے نیچے دب گیا تھا۔ اگر میں ایک سیکنڈ بھی سوچ کے حوالے کر دیتا تو دوسرے سیکنڈ میرے حلق میں ولی خان گولی اُتار سکتا تھا۔ چنانچہ میں ہاتھ پھیلا کر اُڑتا ہوا، اُس کے اوپر جا گرا اور ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔

ایک تو وہ ضرب کھا کر گرا تھا، دوسرے اُسے مجھ سے اس قدر پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط نہ رکھ سکا تھا۔ جوں ہی ریوالور میری گرفت میں آیا، میری ناک پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ولی خان نے اُلٹی ٹکر مار کر مجھے ایک لمحے کے لیے مفلوج سا کر دیا تھا۔

میں پھسلتا ہوا، اُس کے پہلو میں گرا لیکن بدحواسی کا وقفہ چند سیکنڈ سے زیادہ نہ رہا تھا۔ جب میں رُولنگ سے اُبھرا تو ولی خان بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے سر جھٹکا تو میری ناک سے بہتے خون کے چھینٹے ولی خان کے لباس کو رنگین کر گئے۔ وہ بھی میری طرح اپنے حواس میں نہ تھا یا اُسے یہ توقع نہ تھی... کہ ریوالور چھیننے والے ہاتھ نے ریوالور، اُس کے پاؤں میں ڈال دیا ہوگا۔

وہ پھنکارتا ہوا میری جانب بڑھا اور پھر جونہی میرے قریب ہوا، میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور فلائنگ کک لگاتا ہوا، اُس کے عقب میں جا پڑا اور ریوالور اُچکتا ہوا ڈرم سے جا ٹکرایا۔ شراب سے لبالب بھرا ہوا ڈرم میرے وجود کا بوجھ نہ سہار سکا... اور اُلٹ گیا۔

ولی خان بھی دو ڈرموں کے درمیان گرا تھا اور اُس کا سر کسی ڈرم سے ٹکرا گیا تھا۔ کِک کی ضرب اور سر کی چوٹ نے اُسے ناکارہ بنا دیا تھا... لیکن وہ صرف غنڈہ نہ تھا بلکہ میرے مستقبل کا ایک مضبوط حریف بن چکا تھا۔ اگر وہ صرف خان کا ملازم ہوتا تو میں جنگ کے میدان میں اُسے شکست سے دوچار کر کے نوٹ جاتا لیکن وہ خان کا بھتیجا تھا۔ اُس کی زندگی نہ صرف میری فات کے لیے باعثِ زحمت ہوتی بلکہ وہ خان کے بعد، اُس کا بلیک بزنس سنبھال لیتا۔ ایک ناگ کے بعد، دوسرا ناگ، انسانوں کی رگوں میں زہر اُتارنا شروع کر دیتا۔ اس لیے میں اُس کا سر بھی کچلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں ناگ کو مار کر اُس کے انڈے سلامت نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ولی خان کل کو رنگ باز بن سکتا تھا۔ میں رنگ باز اور اُس کے انڈوں بچوں کے درمیان کچھ کر دوسرے پلوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری میانہ روی نے پہلے ہی خاصا وقت رنگ باز اور سلیمان پر ضائع کر دیا تھا۔ مجھے تو بیگن کی جارحانہ پالیسی پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ اُس کا اصول تھا کہ ناگ کو بِل سے نکالو اور فی الفور اُس کا سر کچل دو۔ لیکن میں خطرناک زہریلے ناگوں سے کھیل رہا تھا۔ میرا طریقۂ کار تھا کہ ناگ کو بِل سے نکالو، مشتعل کرو تاکہ وہ بار بار غصّے سے اپنا پھن زمین پر مارے اور زخمی ہو کر چیونٹیوں کی خوراک بن جائے۔

وہ کہنیوں کے بل اُٹھا پھر گرا۔ اُس نے ٹانگیں سمیٹ کر گھٹنوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کی پھر دونوں ہاتھوں سے ڈرم کا سہارا لیا۔ میں تین قدم دُور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جونہی وہ نیم استادگی کی پوزیشن میں آیا، میں نے اُچھل کر دونوں پاؤں اُس کی کمر پر مارے۔ بڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز اور اُس کے حلق سے اُبھرنے والی چیخ تہ خانے کی دیواروں نے جذب کر لی تھی۔

مر نہ سہی، ناگ درمیان سے ضرور ٹوٹ چکا تھا۔ یہ موت سے بڑھ کر اذیت ناک موت تھی۔

میرا خیال تھا کہ آواز تہ خانے سے باہر نہ جا سکے گی لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ شٹر اُٹھنے کی آواز کے ساتھ ہی میں نے طویل چھلانگ لگائی اور ڈنڈوں کی آڑ میں ہو گیا۔ فضل خان پہلے قدمچے پر کھڑا متجسّس نگاہوں سے نیم تاریک تہ خانے کو دیکھنے لگا تھا۔ وہ روشنی سے آیا تھا، اس لیے آنکھوں کو اندھیرے سے مانوس ہونے میں کچھ وقت درکار تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کولٹ ساخت کا لانگ بیرل ریوالور تھا جس کی گولی ہاتھی کو بھی اُلٹ دیتی ہے۔ اگر وہ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید میں اُس کی پروا بھی نہ کرتا لیکن وہ عام آدمی نہیں تھا، مکہ ولی خان کی جماعت کا آزمودہ غنڈہ تھا... اگر اُسے صورتِ حال کا ادراک ہونے کی مہلت دی جاتی تو وہ بہتر پوزیشن میں تھا۔ جی دار ہوتا تو مقابلہ کرتا، بصورتِ دیگر مجھے تہ خانے میں بند کر کے مدد کے لیے چلا جاتا۔ دونوں صورتیں میرے لیے خطرناک ہی تھیں۔

میں نے جھانک کر ہاتھ تھوڑا سا باہر نکالا اور اُس کا نشانہ لیا۔ فضل خان کے جسم کو بھرپور جھٹکا لگا۔ میں اُس کے چہرے پر پھیلنے والے حیرت کے تاثرات کو نیم تاریکی میں بھی واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک لمحے تک اپنی جگہ کھڑا جھومتا رہا۔ پھر اُس کے گھٹنے دُہرے ہوئے اور وہ لڑھکتا ہوا آخری سیڑھی پر آ کر ڈھیر ہو گیا۔ ولی خان پورے اہتمام کے ساتھ آیا تھا۔ اُس کے ریوالور پر سائلنسر فٹ تھا۔ اس لیے فائر کی آواز زیادہ نہ تھی۔ میں نے دیگر تین چیک کیے۔ گیارہ گولیاں باقی تھیں۔ میں نے ایک ڈرم کا نشانہ لیا اور پھر ٹریگر سے اُنگلی ہٹالی... تمام ڈرم ابھی سیل نہ ہوئے تھے۔ مقصد صرف شراب ضائع کرنا ہی تھا اس لیے گولیاں ضائع کرنا حماقت ہی ہوتی۔

جب میں تہ خانے سے روانہ ہوا تو ولی خان اور فضل کی لاشیں آئے سامنے شراب میں تیر رہی تھیں۔ زندگی میں شاید اُنھوں نے اتنی نہ پی ہوگی مگر مرنے کے بعد غرقِ شراب ہوئے تھے۔ البتہ اُن کے باقی دو ساتھیوں کا عمارت میں کہیں بھی نام و نشان نہ تھا۔ گروں کے رزالے متفق تھے اور برآمدے سنسان تھے۔ پھر میں نے پوری احتیاط سے دس قدم کا فاصلہ طے کیا تھا۔ وہ کہیں دُبک گئے تھے یا فرار ہو چکے تھے۔ میں نیم وا گیٹ سے نکل کر بازار میں نکل آیا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ حالانکہ خونی ڈراما قریب ہی زیرِ زمین کھیلا گیا تھا لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔

میں جس مقصد کے لیے کرم شاہ اور پھر فضل خان تک پہنچا تھا۔ وہ شاید کچھ دقت اور لیتا مگر فضل خان اپنی موت کو خود گھسیٹ کر تہ خانے تک لے گیا تھا۔ اگر وہ ولی خان کی حمایت کے لیے جلد بازی سے کام نہ لیتا تو میرا مشن صرف شراب کا اسٹاک ضائع کرنے تک ہی محدود رہتا مگر اُس نے کل کا کام آج کے مصداق کیے، [illegible]

مشن کی کامیابی اور موت کے حلق سے نکلنے کی خوشی نے میرے اندر خود اعتمادی بڑھا دی تھی۔ میں حمایت بھرے احساس کے ساتھ گنگناتا، سیڑھیاں چڑھتا جب کمرے میں داخل ہوا تو بیگن نے میرے سلام کا جواب بھرائی ہوئی آواز میں دیا تھا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تو نہ تھا لیکن رنجیدہ ضرور تھا۔

میں نے اُسے متجسّس نگاہوں سے دیکھا لیکن اُس نے نگاہیں چرا لیں۔

"کیا بات ہے، ماسٹر؟" میں نے خود کو ہر قسم کی خبر سننے کے لیے تیار کرتے ہوئے پوچھا۔ یہ اور بات تھی کہ میرا دل، خدشے وسوسوں سے اُچھل رہا تھا لیکن میں خود کو کسی طرح بھی کمزور اعصاب کا مالک ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"خان چل بسا ہے۔" اُس نے کرب میں ڈوبی آواز میں بتایا۔ بیگن وہ شخص تھا جس نے پہلے دن ہی مجھے چارج کے ساتھ مشورہ بھی دیا تھا کہ تمھیں یہاں ہر مجرم کو اپنی عدالت سے سزا دینی پڑے گی، وہی شخص ایک مجرم کی موت کی خبر پا کر رنج و الم کا اظہار کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی میری طرح حساس انسان تھا اور انسان کی موت پر شادیانے بجانا توہینِ انسانیت سمجھتا تھا۔ میں نے توسیف الملوک کے خالق میاں محمد کا مشورہ پڑھا ہوا تھا ؎

"دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے کل سجناں وی مرجانا"

گو رنگ باز خان میرا ذاتی دشمن نہ تھا لیکن میں نے اُسے دشمن جان کر دشمن بن کر مارا تھا کیونکہ وہ ایک شخص کا نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کا دشمن تھا اور ایک اتھارٹی نے بنی نوعِ انسان کی بھلائی اور اُس کے دشمنوں کی تباہی کے لیے مجھے مقرر کر رکھا تھا۔

"اطلاع کا ذریعہ؟" میری آواز میں بھی غم در آیا تھا۔

"ہسپتال سے رشیدہ نے فون پر بتایا ہے۔" بیگن نے جواب دیا۔ "وہ ڈیڈ باڈی لے کر شاید خان کے گھر پہنچ چکی ہوگی۔ اگر اُس نے مجھ پر پابندی نہ لگا دی ہوتی تو میں بھی جا چکا ہوتا۔ اُس نے صرف مجھے بُلایا ہے۔"

"اُس نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، ماسٹر۔" میں نے کہا۔ "آپ کا اُدھر جانا کسی لحاظ سے بھی بہتر نہیں۔ ایک غیر ملکی وہاں ہر نگاہ کا ہدف بن جائے گا۔ ہاں، البتہ آپ لوگ جنازے کی تقریب میں شریک ہو سکتے ہیں۔ لیس چہروں اور لباس کے انتظام کے بعد۔ مجھے یقین ہے کہ جنازے میں سلیمان بھی شریک ہوگا۔ اُس کی نگاہوں سے آپ لوگوں کو بچنا ہوگا۔"

بیگن نے الماری سے پانچ ہزار کی گڈی نکال کر میرے حوالے کر دی تھی۔ وہ مسلمان تو نہ تھا لیکن ایک اچھا انسان ضرور تھا اور ہمارے مُلک کے رسم و رواج بھی جانتا ہوگا کہ ہم لوگ شادی و مرگ... دونوں حالتوں میں نام و نمود کا بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کرتے ہیں۔ اندر کہرام بپا ہوتا ہے اور باہر ہاؤ ہو اور قہقہوں کی خوشبو اُٹھ رہی ہوتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ خان کی موت کے ابتدائی تمام اخراجات خرم سلطان ہی برداشت کرنے ہوں گے۔

جب میں کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تو وہاں خاموشی اور ویرانی تو تھی لیکن دو لکھ روپے کا ہدایتی منظر بھی پیش نہ کر رہا تھا... وردی پوش مرد لان چیئرز پر چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے اور اندر سے صرف امینہ کی آواز... سنی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں لوگوں کے سلام کا جواب دیتا ہُوا، کاریڈور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کیونکہ مجھے صرف رسمِ دُنیا کے لیے وہاں حاضری تک محدود نہیں رہنا تھا۔ خان مرتے مرتے مجھ جیسے شخص پر ایک ایسی اخلاقی ذمّے داری ڈال گیا تھا جسے طوعاً و کرہاً نباہنا فرض تھا۔ اگر وہ صرف رنگ باز خان ہی ہوتا تو میں کاغذ کے اُس پُرزے کو پھاڑ کر نالی میں پھینک دیتا، لیکن وہ ثمینہ گُل جیسی بُردبار حسینہ اور امینہ گُل جیسی ایک معصوم لڑکی کا باپ بھی تھا۔ ایک دل کے تاروں کے سازمیں دھڑک رہی تھی اور دوسری شاید اسی حوالے سے عزیز ہو گئی تھی۔

ڈائننگ ہال کو خالی کر کے میّت وہاں رکھ دی گئی تھی... میّت کے گرد بھی پندرہ بیس خواتین رہی ہوں گی جو چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ امینہ گھٹنوں کے بَل فرش پر بیٹھی، باپ کے سرد چہرے پر جھکی بلک رہی تھی۔ ثمینہ اور رشیدہ سرہانے کی جانب... دائیں بائیں بیٹھی، تلاوتِ کلام اللہ میں مصروف تھیں۔ میں نے کھڑکی کے شیشے پر دستک دی۔ رشیدہ نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا اور پھر کتابِ مقدس کو چوم کر کھڑی ہو گئی۔ امینہ اور ثمینہ نے بھی دیکھ لیا تھا۔ رشیدہ کے ساتھ وہ دونوں بھی باہر چلی آئی تھیں۔ ثمینہ ایک قدم دُور رُک کر رونے لگی لیکن امینہ چیخ مار کر میرے کندھے سے لگ گئی۔ میرے سینے میں بھی پتھر تو نہیں تھا، گوشت کا نرم لوتھڑا تھا جس میں درد بھی تھا۔ امینہ نے میری آنکھیں بھی چھلکا دی تھیں۔

کوشش اور رشیدہ کے اصرار کے باوجود، جنازہ شام چار بجے سے پہلے نہ اُٹھایا جا سکا تھا۔ وجہ یہ رہی تھی کہ اُس روز اُس قبرستان کے خان سمیت چار، اور افراد بھی مہمانِ بنائے جا رہے تھے... گورکن بے حد مصروف تھے۔ خان کے لیے جو جگہ تیار کی گئی تھی وہ ساڑھے تین بجے مکمل ہُوئی تھی۔

میں قبر پر مٹی ڈال کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا... اور میاں جی نے بچپن میں مار مار کر جتنی سُورتیں حفظ کروائی تھیں، پڑھنے لگا۔ تقریباً دس پندرہ منٹ کے بعد معاً میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا، میری بند آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا، تین چار قدم پیچھے تین آدمی کھڑے تھے۔ ان میں ایک سلیمان سیٹھ بھی تھا۔

میری حیرت بجا ہی تھی۔ سلیمان سیٹھ اور دو ریوالور بدست آدمی۔ میں نے کن انکھیوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ گورکن کدالیں سمیٹے، جنازہ گاہ کے اسٹور میں داخل ہو رہے تھے۔ جنازہ پڑھنے والے قبرستان کے کمپاؤنڈ سے نکل چکے تھے۔ اگر صرف سلیمان ہوتا یا اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ریوالور نہ ہوتے تو میں یہی سمجھتا، سلیمان رسمِ دُنیا نباہنے کے لیے رُک گیا ہوگا لیکن قبر کے سرہانے بیٹھے شخص کو ہتھیاروں کی زد میں لینے کا جو مقصد تھا، وہ میری سمجھ سے بالاتر نہ تھا۔

سلیمان گھوم کر قبر کی پائنتی گیا... اور خان کی قبر پر دایاں ہاتھ رکھ کر بولا۔

"رنگ باز خان، تم میرے دُشمن تھے لیکن نہایت اصول پسند اور بہادر دُشمن۔ ہمارے درمیان جو معاہدہ طے پایا تھا، تم نے ہمیشہ اُس کی پاس داری کی تھی لیکن جب ہار سے ہو تو ایسے کہ جان بھی ہار بیٹھے۔ میں نے تمھارے لیے دُعائے مغفرت کی ہے، خان۔" وہ جب سیدھا ہُوا تو اُس کی مُٹھی میں مٹی بھری ہُوئی تھی۔ "خرم سلطان!" اُس نے مٹی میرے اُوپر اُچھال دی۔ "میں تمھیں بُزدل کہوں گا، نہ بہادر۔ ہاں، تم ایک اچھے شکاری اور ماہر حربہ جرنیل ہو۔ تمھارے اندر یقیناً جنرل رومیل کی رُوح ہے۔ مکار لومڑی کی تمام خصلتیں تمھاری ذات میں موجود ہیں۔"

"سُنو، سیٹھ!" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "یہ وقت اور جگہ ایسی باتوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ میں لومڑی ہُوں یا شیر مگر فی الحال میں ایک افسُردہ انسان ہُوں۔ یہاں سے چلے جاؤ اور جب میں فارغ ہُوں گا تو جہاں بُلاؤ گے، چلا آؤں گا۔"

"فاتح جنرل کو افسردہ تو نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے بھرپور جنگ لڑی ہے، چوہدری! یہ کامیابی یہ دن اور رنگ باز خان کا تخت یوں ہی تو تمھیں نہیں مل گیا، تم اس کے حق دار ہو۔"

"چلے جاؤ، سیٹھ!" میں کرخت آواز میں بولا۔ "تم جو بھی ہو، نام کے حوالے سے مسلمان ہو اور تمھیں معلوم ہونا چاہیے، اس وقت مرنے والے کی رُوح کو ہمارے زور دار مکالموں کی نہیں بلکہ کلام اللہ کی ضرورت ہے۔ چل میں اور تم بھی بھرے خزانے چھوڑ کر، اسی طرح خالی ہاتھ یہاں آئیں گے۔ زمین کا یہی ٹکڑا ایسا ہے، جہاں تمام جاہ و جلال، دوست، عزیز اور دولت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ میں خان کو وہی دولت دینے یہاں بیٹھا ہُوں جو اُس نے کسی بزنس سے نہیں کمائی تھی۔ وہ جو کچھ کماتا رہا ہے، وہیں چھوڑ آیا ہے۔ جاؤ، مجھے اس شخص کے لیے کچھ کرنے دو۔"

"اچھے بزنس مین بھی ہو۔" سلیمان استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگا۔ "دُنیا کی دولت کے بدلے دین کی دولت دے رہے ہو، مرحوم کو... لیکن یقین کرو، چوہدری! رُوح سب کچھ جان گئی ہوگی جس خرم سلطان کو رنگ باز کی عقل نہ پہچان سکی تھی، اُسے رُوح نے پہچان لیا ہوگا۔"

"سلیمان..." میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "یہ بکواس بند کرو۔ میں کہہ چکا ہُوں، یہ جگہ ایسی باتوں کے لیے موزوں نہیں ہے... اور میں خرم سلطان نہیں ہُوں۔"

"ہاں، میں جانتا ہُوں، تم رنگ باز خان کے وارث ہو۔"

"چاہتے کیا ہو، سیٹھ؟" میرے اندر کے خرم سلطان نے انگڑائی لی اور سلیمان دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "چلو، یہاں نہیں، میں قبرستان کی بے حُرمتی نہ کروں گا، نہ ہونے دُوں گا۔ ہم بھی زندہ ہیں، اس بے زندوں کے مقام پر ایسی باتوں کا فیصلہ کریں گے۔"

"اسے لے چلو۔" سلیمان نے حُکم دیا اور ابھی میں پوری طرح بات بھی نہ سمجھا تھا کہ وہ دونوں میرے دائیں بائیں آ گئے۔ فاصلہ میرے حق میں تھا نہ وہ لوگ اناڑی تھے۔ سلیمان، خرم سلطان کو اپنے آفس میں دیکھ چکا تھا، اس لیے وہ اناڑی گرگے ساتھ نہ لا سکتا تھا۔

"انھیں ہٹا دو، سلیمان! میں نہتا ہُوں اور لڑنے بھڑنے کے مُوڈ میں بھی نہیں ہُوں۔"

"فی الحال، انھیں اپنا باڈی گارڈ سمجھ کر قبضوں کر لو، چوہدری!" سلیمان مُسکراتے ہُوئے بولا۔

"کیا تمھیں یقین ہے، سلیمان! کہ تم خرم سلطان کو زبردستی لے جا سکو گے؟" میں نے اُسے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے پوچھا۔

"ہاں، آج ہی تجربہ کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔" وہ بدستور مُسکراتے ہُوئے بولا۔ "کوشش کر دیکھو۔"

"لیکن یہاں نہیں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "چلو، باہر چل کر۔"

میں نے بڑک تو ماردی تھی لیکن صُورتِ حال میرے خلاف تھی اور میں اتنا بھی احمق نہ تھا کہ محض کوشش، راحت رسانی کے لیے زندگی خطرے میں ڈال دیتا۔ میرا ارادہ ایسا خطرناک تجربہ کرنے کا نہ تھا۔ میں نے تو ایک چال چلی تھی، دُشمن کو پینے دَرائیے نہ دے تو خود ڈر جائیے۔ اُسے دُشمن نہیں چاہیے تھا کیونکہ دو بندوق بردار اُس کے ساتھ تھے اور آتشیں اسلحے سے میں تھا۔ لہٰذا میں اپنا بھرم رکھنے کی خاطر خالی خولی پھنکاریں مارتا، ان دونوں کے درمیان چل پڑا تھا۔

لیکن وہ بُزدل تھے یا نہیں، سلیمان نرا سیٹھ ہی ثابت ہُوا تھا۔ وہ میری بڑک اور پھنکاروں سے اس یقین کے باوجود تو سہ ہو گیا تھا کہ مدِمقابل نہتا ہے... پھر بھی وہ بُزدلی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اُس نے اپنے ریوالور کے دستے سے میرے سر پر زوردار ضرب لگائی تھی اور دہاڑ، میرے حلق کی چڑھائی پر ہی ہانپ کر دم توڑ گئی تھی۔ میں غالباً جھاڑی میں گرا تھا۔ بس مجھے اتنا ہی یاد ہے، کوئی شے میرے بوجھ تلے آئی تھی پھر ذہن کے چراغ میں روشنی نہ رہی تھی۔

روشنی جب واپس ملی تو ایک لمحے کے لیے ہر شے دُھندلی دُھندلی تھی۔ حتیٰ کہ سفید دیواریں اور چھت بھی دُھندلی تھی پھر قدموں کی چاپ سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے چہرہ گھمایا تو درد کی لہر سسکاری بن گئی۔ درد ہی نے دُھند کو یادداشت کی روشنی دی تھی۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ یاد ہی نہیں بلکہ کُرسی پر براجمان مُسکراتے شخص کو پہچان لیا تھا۔

"اسے تم زبردستی کہو گے، چوہدری یارضامندی؟" سلیمان نے طنزیہ آواز میں پُوچھا۔

"صرف بُزدلی۔" میرے مُنہ سے پھنکار نکلی اور جواباً سلیمان کے حلق سے ایک بے ساختہ قہقہہ نکل گیا۔

"نہیں، پیارے! جنگ اور محبت میں جو بھی ہو جائے، جائز ہوتا ہے۔"

"پیچھے سے وار کرنا بھی، سیٹھ؟"

"ہاں..." اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "شب خُوں، جنگ کی ایک اہم اور تسلیم شدہ چال ہے۔"

"اب یہاں لانے کا مقصد بھی بتاتے چلو۔"

"کچھ تو دل کے معاملات ہیں۔" سلیمان بولا۔ "... اور کچھ بزنس کی باتیں۔"

"دل کے علاوہ تمھاری ہر بات زیرِ بحث آ سکتی ہے۔"

"نہیں، میرے ایجنڈے میں سرِفہرست دل کی بات ہے۔"

"چلو، بات کرو۔"

"پہلے یہ بتاؤ، تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے یا وہ لڑکی... جو تمھاری کچھ نہیں لگتی؟"

"اُس کی عزت اور حُرمت کے بدلے میں ایسی ہزاروں زندگیاں قربان کر سکتا ہُوں۔"

"سُنو، خرم! میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہُوں۔ آج ہی اور تم اُسے بذریعہ ٹیلی فون ایسا کرنے کا حُکم دو گے۔ تم اپنے بزنس کا حوالہ دے کر اُسے بتاؤ گے کہ تم فوری کال پر ہانگ کانگ جا رہے ہو۔"

"میں ایسا نہ کروں تو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو..." وہ غرایا۔ "تو تمہیں اذیت ناک موت کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"تو میں انکار کرتا ہوں۔ بلاؤ اس اذیت ناک موت کو۔"

"ضرور بلاؤں گا۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "ریاض چابک لاؤ۔"

اگر بے ہوشی کے دوران میرے پاؤں جکڑ نہ دیے گئے ہوتے تو شاید میں اتنی بے بسی محسوس نہ کرتا۔ سلیمان نے چابک لے کر لہرایا اور تڑاخوں سے مجھے یوں دھمکانا شروع کر دیا جیسے سرکس کا ٹرینر پنجرے میں بند شیر کو اکھاڑے میں نکالنے کے لیے چابک بار بار لہرا رہا ہو۔

"اب میں سوال کروں گا اور تم جواب دو گے۔" سلیمان چارپائی کے گرد چکر لگاتا ہوا بولا۔ "میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے مجھے اور رنگ باز کو آپس میں کیوں لڑایا اور نہ ہی میں یہ سوال کروں گا کہ تم نے مال خریدنے کا جھانسا دے کر مجھ تک رسائی کیوں حاصل کی تھی، کیونکہ ولی خان کے ذریعے مجھ تک ساری باتیں پہنچا دی گئی ہیں۔ تم نے ایک چلاک سیاست داں کی پالیسی اپنا کر مجھے اور خان کو ایک دوسرے پر حملہ کرنے پر اُکسایا۔ اُدھر خان کے ساتھی تیار تھے۔ اِدھر میں تیاریوں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ ہم نے کیا کھویا، کیا پایا، یہ بحث فضول ہے۔ میں صرف ایک سوال کروں گا، ایک مطالبہ کروں گا کہ تم نے میرے گودام سے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ مجھے واپس کر دو۔"

"اگر تمہیں یقین ہے کہ میں نے ایسا کیا ہے تو پھر یہ یقین بھی کر لو سیٹھ! کہ مال نہ تو واپس کرنے کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور نہ ہی میرے پاس ہے۔ اگر مال حاصل کیا تھا تو ٹھکانے لگا دیا گیا ہوگا۔"

"تو تم اعتراف کرتے ہو؟"

"اگر انکار کرتا تو تم یقین کر لیتے؟" میں نے اُلٹا اُسی پر سوال جڑ دیا۔

"نہیں۔۔۔ اس لیے کہ میرے پاس ناقابل تردید شواہد ہیں۔۔۔ تم نے ہی حسن ابدال جا کر خان کو ہلاک کیا۔ اشرف خان تمہارے ساتھ تھا۔ انسپکٹر ہارون نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے یہاں سے جاتے ہی استعفیٰ پیش کر دیا تھا۔ جب استعفیٰ منظور نہ کیا گیا تو وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دے کر گھر بیٹھ گیا ہے۔ تم نے اُسے خرید لیا ہے یا کوئی دوسری بات ہوگی۔ میرے گودام میں ہوٹل راگ رنگ کا مونوگرام بھی تم نے اسی لیے پھینکا تھا کہ میں رنگ باز پر چڑھ دوڑوں۔ تم اپنے کھیل میں کامیاب رہے، چوہدری! اور ہم دونوں تباہ ہو گئے۔" یہ کہہ کر وہ ایک ثانیے کے لیے رُکا اور مجھے کینہ توز نگاہوں سے گھورتا ہوا دوبارہ بولنے لگا۔ "رنگ باز تو تمہارے حلق میں اُنگلی ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں ہے لیکن میں زندہ ہوں۔ تم نے مجھے میدان میں نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں نے تمہارا مشورہ قبول کر لیا ہے۔ اگر مجھے اس بزنس میں رہنا ہے تو سیٹھ سلیمان کا لبادہ اُتارنا ہوگا۔ آج میں سیٹھ سلیمان نہیں بلکہ دس برس قبل کا سلیمان غنڈہ ہوں۔"

"میں تمہارے آفس آ کر تمہیں مبارک دوں گا، سلیمان! اور پھر تمہاری پیش کش قبول کروں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہاری پیش کش صرف۔۔۔ اس لیے مسترد کر دی تھی۔۔۔ کہ خرم سلطان کسی ہیجڑے کا بزنس پارٹنر نہیں بن سکتا تھا۔ اب اگر تم نے لبادہ بدل لیا ہے تو میں غور کروں گا۔"

"میں تمہیں فاکس آف دی ڈیزرٹ تسلیم کر چکا ہوں۔۔۔ چوہدری!" اُس نے بھڑکتے لہجے میں کہا۔ "لہٰذا اب تمہاری کسی چال میں آنے کا مقصد یہ ہوگا کہ سلیمان نہ صرف اندھا ہے بلکہ دیوار بھی ہے بار بار دھوکا کوئی دیوانہ ہی کھا سکتا ہے۔ میں رشید کو چاہتا ضرور ہوں چوہدری! لیکن اس چاہت پر اپنی زندگی، اپنا مستقبل قربان نہیں کر سکتا۔۔۔ پھر جب تم نہ رہو گے تو اس کے مکان کی چار دیواری خود بخود ٹوٹ جائے گی۔۔۔ پھر جب اُسے کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی تو وہ ٹوٹی ہوئی دیوار سے نکل کر سیدھی سلیمان تک چلی آئے گی۔ میں نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ پہلا فیصلہ سلیمان سیٹھ کا تھا۔ لیکن اب میں اپنے پرانے خول میں داخل ہو چکا ہوں۔ سلیمان مستاد ہی سلیمان سیٹھ کے مفادات کی حفاظت کر سکتا ہے۔"

"کاش! عقل تمہیں یہ بھی بتا سکتی کہ جرم کو نہ کوئی استاد چھپا سکتا ہے، نہ سیٹھ۔"

"واہ۔۔۔" اُس نے قہقہہ لگایا۔ "چور کو چوری نہ کی کا درس دے رہا ہے۔"

"کوئی بھی انسان بنیادی طور پر چور نہیں ہوتا، سلیمان۔۔۔" میں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "ضمیر چوری کچھ بھی کچوکے مارتا رہتا ہے۔ میں اگر بُرا ہوں تو برائی کو کبھی نہیں کہہ سکتا۔"

"باس! یہ وقت ضائع کر رہا ہے۔" اُس کا گرگا بول پڑا۔ "لے ہاتھ پیچھے کرو۔"

"ٹھیک ہے، اگر یہ استاد سلیمان کو دیکھنا چاہتا ہے تو ابتدا اسی سے ہوگی۔" سلیمان نے چابک لہراتے ہوئے کہا۔ "چوہدری۔۔۔ ہاتھ پیچھے کرو۔ میں کوشش کروں گا کہ تم اس خوش رنگ اور وجیہ چہرے کے ساتھ ہی اُدھر جاؤ۔ شاید تمہاری کسی نیکی کے عوض تمہیں جنت مل جائے۔ میں کسی حور کو تمہارا رنگی چہرہ نہیں دینا چاہتا۔"

"شکریہ سلیمان!" میں نے نرم آواز میں کہا اور دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے۔ جونہی ریاض نے میرے ہاتھوں کو چھوا، میں نے ایک

دم اُس کے پنجے جکڑ لیے اور وہ میرے جسم پر گر گیا۔ میں نے اُسے میرے سینے سے گزر رہا تھا تو میں نے اُسے دونوں ہاتھوں پر اُٹھا لیا اور پوری قوت سے سامنے والی دیوار پر دے مارا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز اور کربناک چیخ، کمرے میں اُبھر کر دیواروں میں جذب ہو گئی تھی۔ اُس کی گردن ٹوٹی تھی یا سر خربوزے کی طرح پھٹا تھا، کچھ ہوا ضرور تھا کیونکہ نہ تو وہ اُوپر اُٹھا تھا اور نہ ہی اُس کی آواز سنائی دی تھی۔

"اب دوسرے کو آگے بڑھاؤ، سلیمان اُستاد!" میرے حلق سے سفاک غراہٹ اُبھری۔ اُس کے ساتھ ہی چابک ہوا میں سیٹیاں بجاتا ہوا، میری آنکھوں کے سامنے لہرایا اور مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی نے میرے سینے پر انگارے رکھ دیے ہوں۔۔۔ دوسرا پھر تیسرا چابک۔۔۔ آگ کی تین سلاخیں دے کر، جب وہ رُکا تو اُس کی آواز سنائی دی۔

"میں تمہاری ہڈیوں سے کھال اُدھیڑ دوں گا خرم سلطان! اب بھی مجھے بتا دو، مال کہاں ہے؟"

"اُستاد بنو، سیٹھ! اُستاد بنو۔" میں نے ہونٹ چباتے ہوئے اُسے اشتعال دلایا۔ "تین ضربیں تو تیسرے درجے کا بدمعاش بھی ہنسی خوشی برداشت کر سکتا ہے۔"

"چلو، اعتراف ہی کر لو۔" وہ ہانپ کر بولا۔

"میں جھوٹ اور بزدلی کا بیوپاری نہیں ہوں اُستاد!" میں بمشکل اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

"اتنا ہی بتا دو، چوہدری! صرف اتنا کہ تم کس گروہ کے ماسٹر ہو؟"

"ہاں، ہوں۔"

"ملک نواز کو جانتے ہو؟"

"کئی ملک نواز ہوں گے، کس ملک کی بات کر رہے ہو؟"

"ملک نواز، جس کی رضامندی اور راہداری کے بغیر، اس ملک میں کوئی بھی بلیک بزنس نہیں کر سکتا۔"

"نہیں، میں آج پہلی بار اُس کا نام سن رہا ہوں۔"

"پھر تمہارا شمار، اسٹریٹ ہاکرز میں ہوگا۔" سلیمان بولا۔ "اُسے رنگ باز نے بتا دیا ہوگا کہ ایک نوجوان بحیثیت ہاکر کام کر رہا ہے، ورنہ وہ تمہیں جواب دہی کے لیے ضرور طلب کر لیتا۔"

"اگر ایسا ہوا تو میں اُس کے درشن ضرور کروں گا۔۔۔ وہ کہاں ملے گا؟"

"شیطان کہاں نہیں ہوتا۔" سلیمان نے جواب دیا۔ "وہ بھی اس ملک کا شیطان ہے۔ ہر جگہ ہوتا ہے اور دکھائی بھی نہیں دیتا۔ تم چاہو تو میں اس کا پتہ بھی تمہیں دے سکتا ہوں۔ اگر میں بھی اس سے ملنا چاہوں تو نہیں مل سکتا لیکن اگر وہ ملنا چاہے تو مجھے شارٹ نوٹس پر طلب کر لیتا ہے۔"

"اُس کی چھاؤں میں مجھے بھی لے چلو اُستاد!" میں نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"اب نہیں۔" سلیمان نے نفی میں گردن ہلائی۔ "کیونکہ اُس نے تمہارے بلیک وارنٹ پر دستخط کر دیے ہیں۔"

"اپیل کا حق بھی نہیں دیا گیا؟"

"میں تمہاری درخواست اُس تک پہنچا دوں گا۔۔۔ لیکن ایک شرط پر۔ مجھے میرا مال واپس کر دو۔ میں خود مختار نہیں ہوں۔۔۔ رنگ باز بھی اُسی کی سند پر بزنس کر رہا تھا۔ میرا نقصان، ملک نواز کا نقصان ہے۔ نقصان کی تلافی کر دو تو میں سفارش کر دوں گا اور پھر ہم مل کر کام شروع کریں گے۔"

"مال میری جیب میں نہیں ہے اُستاد! اعتماد کرو گے تو مال بھی مل جائے گا۔"

"نہیں، تم نشان دہی کرو، میں مال حاصل کر لوں گا۔"

"تمہیں صرف اپنا مال چاہیے، جبکہ گودام میں تمہارے مال کے ساتھ رنگ باز خان کا مال غنیمت بھی ہے۔"

"میں گھسیارہ نہیں ہوں پیارے! بزنس مین ہوں۔ منافع میرا حق ہے۔ خان کا مال منافع ہوگا۔"

"تو کیا میں صورت سے گھسیارہ معلوم ہوتا ہوں؟"

"تم باتوں کی بات ہی سمجھو گے۔" اُس نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور پھر جیسے اُس پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ وہ اندھا دھند چابک برسانے لگا تھا۔ میں نے چہرہ موڑ کر بازو کا ماس دانتوں تلے دبا لیا تھا۔ درد دانتوں کے راستے پھر بدن میں جذب ہونے لگا تھا۔ آخر میں انسان تھا۔ ہر ضرب پر روح تک چیخ اُٹھتی تھی لیکن میں سیمان سے یہ تو رحم کی بھیک مانگنا چاہتا تھا اور نہ ہی حوصلے کی دیواروں سے اُس کی خوشی کو اندر داخل ہونے کی اجازت دے سکتا تھا۔ انسان نارمل مزاج بھی ہوتا ہے اور اگر چاہے تو اُس کے حوصلے پر پہاڑ بھی رشک کرنے لگتے ہیں۔"

سلیمان نے مجھے پاؤں سے گردن تک دُھن کر رکھ دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے درد اور آگ کا لباس پہنا دیا گیا ہو۔ البتہ اُس نے عہد نبھاتے ہوئے چہرے کو کوئی خراش نہ دی تھی۔

"ہاتھ نہ روکو سلیمان!" میں نے تھکھراتی آواز میں کہا۔ "سرور تو اب شروع ہوا ہے۔ تشدد میری روح اور جسم کو نئی قوت اور حرارت

دیتا ہے:

"تم... تم..." وہ ہانپتا ہوا بولا۔ "ملک نواز سے بھی بڑے شیطان ثابت ہوئے ہو۔"

"پھر اُسے میری شاگردی میں لے آؤ، سلیمان!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں اُس سے تمہارے حوصلے کی تعریف کروں گا۔" سلیمان نے چابک ایک طرف اُچھال دیا۔ "روشن خان! میں جا رہا ہوں۔ تمہاری مدد کے لیے چند آدمی بھیج دوں گا۔ اسے تہ خانے میں ڈال دینا۔"

"سنو، سلیمٹھ!" میں نے بے خوفی سے کہا۔ "اگر بلیک وارنٹ جاری ہو چکے ہیں تو تبغلانے کا کیا مطلب ہے؟"

"تم ایک گولی کے اہل نہیں ہو، چوہدری! تمہیں تڑپا تڑپا کر سزائے موت دی جائے گی۔"

معاً دروازے پر دستک کا دھماکا ہوا اور سلیمان اُچھل پڑا۔

"دروازہ کھولو، سلیمان!" آواز میری رُوح کو نہال کر گئی تھی۔ "کھول دو، ورنہ دروازہ اُکھڑ کر تم پر گرے گا۔"

"میں اسے دیکھوں، باس؟" روشن خان ریوالور تان کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"نن... نہیں۔" سلیمان تڑپ کر بولا۔ "مم... میں خود اُسے یہاں سے ہٹائے جاؤں گا۔ تم چارپائی گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔"

روشن خان میری جانب بڑھا اور سلیمان نے ابھی دو تین قدم ہی اُٹھائے تھے کہ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ اندر آ پڑا۔ اگر سلیمان دو قدم اور اُٹھا لیتا تو رشیدہ کی بات سچ ثابت ہو جاتی۔ سلیمان کود کر ایک طرف ہو گیا تھا۔

رشیدہ ایسے ہی میری جانب بڑھی تھی جیسے ماں کی عیادت کو آئی ہو۔ سلیمان تو خالی ہاتھ مل پتھر ہو گیا تھا لیکن روشن خان نے چھلانگ لگا کر اُس کا راستہ روک لیا تھا۔

"سلیمان! اپنے کتے کو روکو۔" رشیدہ نے تحکمانہ آواز میں کہا۔

روشن خان نے رشیدہ کی گردن پر ریوالور رکھ دیا تھا۔ رشیدہ ایک دم پیچھے ہٹی اور میں نے اُس کی دائیں ٹانگ گھومتے دیکھی۔ اس نے نہایت ہی احمقانہ حرکت کی تھی۔ ریوالور کی زد میں تو بڑے بڑے خونخوار ماسٹر نوگ بھی منجمد ہو جایا کرتے ہیں۔ روشن خان پیروں سے اُکھڑتا ہوا، چارپائی کی پٹی سے جا ٹکرایا اور رشیدہ نے اُس کے ریوالور والی چیل کی طرح جھپٹا مارا تھا۔ وہ ریوالور لیتی ہوئی چارپائی پھلانگ

کر دوسری جانب جا پڑی تھی۔

روشن کی مردانگی کو نصب تو ملی تھی یا اپنے باس کی موجودگی اُسے حواس سے بیگانہ کر گئی تھی۔ وہ اُٹھے ہی دفناتا ہوا رشیدہ پر جھپٹا تھا... رشیدہ نے پھرتی سے جھکائی دی اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے شاندار کٹ مارا۔ روشن خان کُرسی سے ٹکراتا ہوا فرش پر جا گرا۔

رشیدہ نے بڑے آرام سے اُس کی کنپٹی پر پاؤں کی ٹھوکر ماری اور اُس کے سینے پر پاؤں رکھ کر بولی۔ "سلیمان! تم نے خرم سلطان کو ہاتھوں سے باندھا تھا اور میں تمہیں حکم دیتی ہوں، دانتوں سے کھولو۔"

"بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، رشیدہ!" سلیمان شکستہ آواز میں بولا۔ "میں کوشش کروں گا، تمہیں ساری بات..."

"بکواس نہیں، سلیمان!" رشیدہ دہاڑی۔ "آگے بڑھو اور دانتوں سے رسی کھولو۔"

"کیا میں ایسا کر سکتا ہوں، رشیدہ خانم؟"

"تم..." رشیدہ غرائی۔ "ہاں، سلیمان! تم اس عظیم شخص کے پاؤں بھی چاٹ سکتے ہو۔"

"کیا میں ایسا ہی ہوں؟"

"اس سے بھی کہیں زیادہ بُرے اور ذلیل انسان۔ تمہیں سب کچھ معلوم تھا، سلیمان! کہ خرم سلطان کون ہے۔ رشیدہ کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے... پھر بھی تم نے احمقانہ قدم اُٹھا لیا۔ اب اگر تم رشیدہ سے کسی نرمی کی توقع کرو گے تو یہ رشیدہ کی نہیں بلکہ ایک بہن کی محبت اور مقدس رشتے کی توہین ہو گی۔"

"اسے معاف کر دو، رشیدہ!" میں نے دروازے میں کھڑے بیگن کو دیکھ کر کہا۔ "سیٹھ لوگ عموماً بھولے ہوتے ہیں۔"

"نہیں..." رشیدہ جھڑک کر بولی۔ "تم چپ رہو۔ اس نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ تم نے اگر اسے معاف کیا ہوتا تو صرف میری وجہ سے۔ آگے بڑھو، سلیمان! خرم سلطان سے معافی مانگو۔ اسے میں خود آزاد کروں گی۔"

سلیمان نے گہری سانس لی اور ہوئے ہوئے میری جانب بڑھنے لگا۔

"کیا تم واقعی مجھے معاف کر دو گے، خرم؟" سلیمان نے پاؤں پر جھکتے ہوئے پوچھا۔ "اگر نہیں تو محض زبان سے رسم ادا کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔" وہ رسی کی گرہ کھولنے لگا پھر معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ "چاقو کے بغیر میں نہیں کھول سکتا۔" بیگن نے خاموشی سے چاقو نکالا اور رسی کاٹنے لگا۔ اُس نے میری شلوار کا پائنچہ اُٹھایا تو ٹانگوں پر چپ چپ کے خون آلود نشانات سامنے آ گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ نے چابک کھائے تھے، چیف؟" سلو نے پوچھا۔

بیگن نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ ہنٹ اور ہارکن بھی مستعد کھڑے تھے... وہ سب چیف کے اپنے تھے۔ سلو، چابک لہراتے ہوئے سلیمان کو گھورنے لگا۔ رشیدہ نے اُس کے ہاتھ سے چابک لے لیا... اور تڑاخ کی آواز پر سب ہی ہکا بکا رہ گئے تھے۔

"نہیں، رشیدہ!" میں نے جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے چابک چھین لیا۔ "یہ میرا مجرم ہے اور میں اسے معاف کر چکا ہوں۔" سلیمان پر چابک کھا کر دھیرے دھیرے مسکرانے لگا تھا۔

"تم نے مجھے بڑا دکھ دیا ہے، سیٹھ!" رشیدہ کی آواز بھرا گئی۔ "میرے دل میں تمہارے لیے نرم گوشے تھے۔ ہم بہن بھائی جب بھی مستقل کوٹھیر بھٹ اٹاتے تھے تو اُس میں تمہارا نام ضرور شامل ہوتا تھا لیکن آج تم نے خود سارے دروازے بند کر دیے ہیں... کہاں، شمار، ان خود غرض لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے مفادات کی خاطر میں عزیز ترین لوگوں کو بھی جھونک دیتے ہیں۔ اب میں جب بھی تمہیں یاد کروں گی، اپنے بھائی کے دشمن کے حوالے سے یاد کروں گی۔"

"کیا تم مجھے وضاحت اور صفائی کا ایک موقع نہ دو گی؟"

"نہیں..." رشیدہ نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ "میں تمہیں پہچان چکی ہوں۔"

"چیف! اس کے لیے کیا حکم ہے؟" سلو نے پوچھا... چونکہ سارے ساتھی مقامی میک اپ میں تھے، اس لیے بول کر میک اپ کا بھرم توڑنا نہیں چاہتے تھے۔

"کیا تم لوگوں نے سُنا نہیں؟" میں نے کرخت آواز میں کہا۔ "میں اسے معاف کر چکا ہوں۔ ہم یہاں سے دوستوں کی طرح جائیں گے۔ چلو سیٹھ!"

"شکریہ چوہدری!" سلیمان بولا۔ "میں تمہارے اس احسان کو یاد رکھوں گا۔ تم لوگ جاؤ۔ مجھے اس لاش کو ٹھکانے لگانا ہے۔"

باہر گلی میں دو کاریں کھڑی تھیں۔ ایک خان کی تھی اور دوسری بیگن کی پرانی کار تھی جب میں سلیمان کے ظلم کا ہدف بنا ہوا تھا تو میرے ذہن میں نہ جانے یہ بات کیوں نہ آئی تھی کہ میرے ساتھی جس جنازے کے ساتھ آئے ہوں گے۔ میں نے بیگن سے کہا تھا کہ وہ لوگ میک اپ میں جنازے کی آخری رسم میں شریک ہو سکتے ہیں لیکن رشیدہ کو دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اُن لوگوں نے اگر مجھے اغوا ہوتے دیکھ لیا تھا تو راستے میں کوئی کارروائی کیوں نہ کی تھی اور رشیدہ کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟

"ہماری کوشش تھی کہ راستے ہی میں مُٹھ ماری جائے۔" بیگن بتانے لگا۔ "لیکن ایک تو فاصلہ زیادہ تھا، دوسرے آپ کو خطرہ تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اغوا کرنے والے کون لوگ ہیں۔ اس لیے میں نے سلو کو لقب اور نگرانی کی ہدایت دی اور خود رشیدہ کو کال کر لیا۔ میں نے نہیں، ہنٹ نے سلیمان کو پہچان لیا تھا... اگر ہم براہ راست کوئی قدم اُٹھاتے تو وہ گھبرا کر آپ کو نقصان پہنچا سکتے تھے جس طرح سانپ بوکھلاہٹ میں ہر قریب ترین شے کو ڈس لیتا ہے، رشیدہ کی آواز اور موجودگی ایک نفسیاتی ردِعمل کی حامل تھی جو درست ثابت ہوئی۔"

"اگر ہم لوگ نہ آتے تو وہ کیا کرتا؟" رشیدہ نے پوچھا۔

"وہی جو دشمن، دشمن کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر بتایا۔ "وہ مجھے تہ خانے میں بند کرنے جا رہا تھا۔"

"تم نے اُسے معاف کیوں کر دیا، خرم؟" وہ شاکی آواز میں بولی۔

"کام کا دشمن ہے، جان برادر!" میں نے اُس کے ہاتھوں پر تھپکی دی۔ "آج مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ تو خود رو جھاڑیاں ہیں... اصل درخت تو ملک نواز ہے۔ ان سب کا گرو۔"

"مجھ سے پوچھا ہوتا۔ اُسے تو میں بھی جانتی ہوں۔"

"دراصل ہمارے چہرے آج ہی تم پر بے نقاب ہوئے ہیں۔" بیگن بول پڑا۔ "میری پیاری بیٹی! ہم ملک نواز کے سامنے تنے گئی ہوئی جھاڑیاں نہیں ہیں، ہم تو..."

"مجھے یقین تھا، ڈیڈی!" رشیدہ کی آواز میں احترام اور فخر تھا... "آپ اور خرم بُرے انسان ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ میں نے ہوش کی آنکھیں کھلنے سے ہوں کی وادی میں کھولی تھیں۔ انسان اور شیطان کی آنکھوں میں جو فرق ہوتا ہے، میں پہچان سکتی ہوں۔ میں اب بھی کہوں گی کہ سلیمان کو بحیثیت انسان میں نے ہمیشہ متاثر ہی پایا تھا لیکن انسان کو بدلتے دیر بھی تو نہیں لگتی ڈیڈی!"

"اگر اُسے اب بھی کوئی اچھا انسان مل جائے تو وہ سُدھر سکتا ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

رشیدہ نے خشمناک نگاہوں سے جواب دیا۔ اُس کا گھناؤنا چہرہ غصے سے دمک اُٹھا تھا لیکن بیگن کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ بولی تھی۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی جو کچھ میں نے کہا تھا، نگاہوں کی زبانی ایک دوسرے کو جواب مل گیا تھا۔ اُس نے سلیمان کے سامنے نرم گوشوں کا اعتراف کر کے ماضی کے گھاؤ کا اظہار کیا تھا، میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سُنا پڑھا تھا کہ عورت صرف ایک بار محبت کرتی ہے جسے وہ مجبوریوں اور مصلحتوں کی نذر میں دبا تو سکتی ہے مگر بھول نہیں سکتی۔ باقی تمام عمر سسکتی رہتی ہے' اسی خیال کے تحت میں نے اُسے اشارہ دیا تھا۔

بیگن گیٹ پر اُتر گیا تھا۔ میں نے کار پورچ میں کھڑی کی۔ کچھ تعزیت دار واپس جا رہے تھے۔ چونکہ ہم اُن کے لیے اجنبی تھے' اس لیے رسمی سلام دُعا کا تبادلہ ہُوا تھا۔ رشیدہ آگے نکل گئی تھی لیکن مجھے ڈرائنگ روم میں جانا پڑا تھا۔ دس بارہ مرد قالین پر بیٹھے ہُوئے تھے' ان میں کرم شاہ بھی تھا۔ جونہی اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی' اُس کے جسم کو بھرپور جھٹکا لگا تھا جیسے اُس کے اندر کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ میں اُس کے پہلو ہی میں بیٹھا تھا۔

"میں خان کی بیٹیوں سے ملنا چاہتا ہُوں' چوہدری صاحب!" اُس نے میرے کان میں غراتی سرگوشی اُتاری۔ "میں اُن کو بتانا چاہتا ہُوں کہ خان کا ایک وفادار ساتھی ہلاک ہو چکا ہے۔"

"اوہ..." میں نے چونک کر کہا۔ "کون...؟"

"اچھے اداکار ہو' خرم سلطان!" اُس کے حلق سے خرخراہٹ اُبھری۔ "مجھے لے چلو' اُن کے پاس۔"

"وہ کئی راتوں کی جاگی ہُوئی ہیں' شاہ صاحب! اور اب سو رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' میں پھر کسی وقت مل لُوں گا۔" وہ اُٹھا اور جُوتے پہن کر چلا گیا۔

اُسے توقع نہ رہی ہوگی کہ خان اور ولی خان کا قاتل اتنی دیدہ دلیری سے مقتولین کے گھر گھس آئے گا۔ دوسری حیرت اُسے یہ رہی ہوگی کہ خرم سلطان' سیٹھ سلیمان کی گرفت سے زندہ کیسے نکل آیا ہے... گو سلیمان نے ایسا کوئی اشارہ نہ دیا تھا جس سے سازش میں کرم شاہ کا ہاتھ دکھائی دیتا مگر کرم شاہ بقول خان مرحوم' بظاہر سلیمان کا آدمی تھا۔

جب میں تعزیت داروں سے فارغ ہو کر اُدھر گیا تو رشیدہ نے واقعی دونوں بہنوں کو سُلا دیا تھا۔ میں کھانا کھانے کے بعد کافی دیر تک رشیدہ سے گفتگو کرتا رہا۔ وہ ہمارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لیے اصرار کرتی رہی۔ جب اُس کا اصرار بڑھا تو بالآخر مجھے بھی اُس کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ تب جا کر اُس نے میری جان چھوڑی اور میں سونے کے لیے اُٹھ کھڑا۔

نیند کی تمام تر خصلتیں محبوب جیسی ہوتی ہیں۔ مہربان ہو تو رُوئیں رُوئیں میں جذب ہو کر سرشار کر دیتی ہے۔ رُوٹھ جائے تو کسی طور مانتی ہی نہیں۔ کچھ تو جسم کی خراشوں کا درد تھا کچھ دیگر سوچوں نے بے سکون کر دیا تھا۔ ان سوچوں میں رنگ باز خان کی بیٹیوں کے مستقبل اور نگہداشت کی سوچ بھی شامل تھی۔ رشیدہ کو گروپ میں شامل کر کے چلانے کی فکر تھی۔ سلیمان سے فیصلہ کُن جنگ اور ملک ناز کی تلاش اور نہ جانے کیا کچھ ذہن کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس لیے نیند مجھے مصروف پا کر رُوٹھ گئی تھی اور میں بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔

ٹیلی فون کا بزر گنگنایا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر رسیور اُٹھا لیا اور کلاک کی جانب دیکھا۔ گیارہ بج کر پچاس منٹ ہُوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ بیگن کی کال ہوگی۔ گو خان کا گھر اور فون نمبر کوئی راز نہ رہا تھا۔ لیکن آدھی رات کو کوئی متعلقہ شخص ہی فون کر سکتا تھا۔

"جناب! میں ہوٹل کا سیکورٹی گارڈ بول رہا ہوں۔ کیا آپ خرم سلطان ہیں؟"

"ہاں' کیا بات ہے؟"

"جناب! خان مرحوم کے گاؤں سے اُن کے چند عزیز آئے ہیں۔"

"اُن کے لیے کمرے کھول دو۔ صبح اُن کو یہاں بھیج دینا۔"

"یہی تو مشکل ہے جناب!" گارڈ نے بتایا۔ "بالائی منزل کا مین ڈور بند ہے اور تمام چابیاں سیف میں بند ہیں۔"

"یہاں لے آؤ' مہمانوں کو۔"

"جناب! اگر میں کچھ کر سکتا تو آپ کو زحمت نہ دیتا۔ مجھے خان کا گھر نہیں معلوم۔ مہمانوں میں عورتیں بھی ہیں... یہ بات کریں۔"

"ہالو..." کھرکھراتی آواز سُنائی دی۔ "بھائی! ہمارا پریشانی دُور کرو۔ زنانہ لوگ بہت پریشان ہے۔ میں رنگ باز خان کا بڑا بھائی نارنگ خان ہُوں۔"

"میں حاضر ہو رہا ہُوں' خان چاچا!"

"شکریہ..." اُس نے سلسلہ توڑ دیا۔ میں نے گاؤن اُتارا اور کار کی چابیاں لے کر کمرے سے نکل گیا۔ اگر میرا ارادہ مہمانوں کو گھر لانے کا ہوتا تو میں رشیدہ کو انتظام کے لیے کہہ جاتا مگر میں مہمانوں کو کسی دوسرے ہوٹل میں ٹھہرانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اتنے مہمانوں کا گھر پر فوری طور پر انتظام کرنا مشکل تھا۔ ثمینہ اور امینہ کے لیے نیند' میزبانی سے کہیں زیادہ اہم تھی۔

سیکورٹی گارڈ ہی کو اُصولاً میرا استقبال کرنا چاہیے تھا لیکن وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا رہا تھا۔ کاؤنٹر کے سامنے تین مرد' نیم دائرے میں بیٹھے ہُوئے تھے۔

میں سیدھا اُدھر ہی بڑھا اور وہ تینوں اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ میں نے اُن کو پوری تعظیم دی۔ جب درمیان والے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ گیا تو میری گردن پر مانوس سا دباؤ پڑا اور سانس میرے حلق سے خارج ہو کر سینے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ مجھ جیسے شخص کے لیے یہ اخذ کرنے میں تاخیر کا سوال ہی نہ تھا۔ ریوالور کی سرد نال نے ذہن کو فوراً روشن کر دیا تھا۔ سیکورٹی گارڈ کا پیغام سُن کر مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ رنگ باز خان کے گاؤں کون گیا ہوگا؟ کس نے اطلاع دی ہوگی۔ اگر کوئی گیا ہوتا تو ثمینہ یقیناً پہلے مجھ سے مشورہ لیتی یا کم از کم بتا دیتی۔ اُس نے تو کسی عزیز کے وجود سے بھی ناواقفی کا اظہار کیا تھا۔

"ہاں میں چلو' خرم سلطان!" ایک شخص نے سرد آواز میں کہا۔

"پہلے تعارف کی رسم ادا ہونی چاہیے۔" میں نے خود کو بے خوف ظاہر کیا تھا۔

"میں ولی خان کا بھائی ہُوں۔"

"اور میں فضل خان کا بھتیجا ہُوں۔" وہ نوجوان پھنکارا' جس نے میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ "اور یہ میرا دوست ہے۔"

"اے' تم بھی ہال میں چلو۔" ولی خان کے بھائی نے چاقو ہمارے سیکورٹی گارڈ سے کہا۔

گارڈ نے ہال میں داخل ہو کر کرسیاں سیدھی کیں۔ ولی خان کے بھائی نے ایک کرسی فاصلے پر رکھ دی اور صدارت مجھے پیش کرتے ہُوئے بولا۔

"ہم کوئی بات نہیں کریں گے لڑکے! بس' خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ خوشت تم ٹیلی فون کال سُنو گے۔"

"اچھا تو تمہاری ڈوریاں کسی اور کے ہاتھ میں ہیں۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"بکواس نہیں۔" ولی خان کے بھائی نے تڑاخ سے ایک طمانچہ میرے گال پر جڑ دیا۔ "سلیمان سیٹھ' تم سے آخری کوئی بات کرنی چاہتا ہے۔"

"تو پھر انتظار کیوں کرتے ہو؟ اُس سے رابطہ ملاؤ' میں بات کر لیتا ہُوں۔"

"نہیں' وہ خود رابطہ ملائے گا۔"

"بوریت دُور کرنے کے لیے ہی کوئی بات کرو۔" میں نے ہونٹ کا بسیترواچ کی چال کھیلتے ہُوئے کہا۔ گو بارہ بجے بیگن تک واپس پہنچ جانے کی کوشش حماقت ہی تھی لیکن کچھ ہونے سے بہتر تھا۔ بعض اوقات اتفاق ہمارا مدد کر دیتا ہے۔ یہ سوچ اور سوچ بھی کہ میری آواز میرے کسی ہمدم تک جا رہی ہے۔

"چند منٹ اور برخوردار! پھر تم سے ولی خان اور فضل خان نمٹیں گے۔ ہم نے اُن کی رُوحوں کو پیغام دے دیا ہے کہ خرم سلطان کو روانہ کیا جا رہا ہے۔"

"نہیں چاچا!" میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "وہ تو میرے تصور سے قبروں میں کانپ رہے ہوں گے۔ اُن کو وہاں تو سگون کی نیند سونے دیتے۔"

دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی نے سب کی توجہ ایک لمحے کے لیے اُدھر کر دی تھی لیکن فاصلہ زیادہ تھا اور ایک شخص میرے سر پر مسلط تھا۔ اس لیے میں صرف جسم سکیڑ کر ہی رہ گیا تھا۔

"یس' سر! معزز مہمان آگیا ہے۔" شوکت نامی نوجوان نے بتایا۔

"جی بہتر' سر!" اُس نے رسیور کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ "اسے لاؤ' سیٹھ بات کرنا چاہتا ہے۔"

مجھے دائیں' بائیں سے کور کر کے کاؤنٹر تک لے جایا گیا۔ شوکت' سیکورٹی گارڈ کو کور کرنے ہال میں چلا گیا۔ ولی خان کا بھائی دائیں جانب اور فضل خان کا بھتیجا میرے بائیں شانے سے لگ گیا تھا۔ ولی خان کا بھائی تجربے کار تھا جب ہی اُس نے مناسب فاصلہ برقرار رکھا ہُوا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا... اور رسیور اُٹھا لیا۔

"گڈ نائٹ' سیٹھ!" میں نے سرد اور مضبوط آواز میں کہا۔ "آج واقعی تم نے خود کو بدلنے کا مجھے یقین دلا دیا ہے' ورنہ اتنی رات گئے کوئی سیٹھ بیدار نہیں رہ سکتا۔"

"بہت چہک رہے ہو۔" وہ غرایا۔ "لیکن پیارے! اب میں نے حماقت کا کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا۔ اگر تم اپنی بہن کو بتانے ہو' تب بھی وہ خان کے گھر سے قدم نہیں نکال سکے گی۔ خان کے گھر پر میری آنکھیں نگراں ہیں۔"

"میں نے ابھی عورتوں کو سیڑھیاں اور بیساکھیاں بنانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے' سلیمان!"

"اوہ..." اُس نے قہقہہ لگایا۔ "حالانکہ اگر وہ بیساکھی نہ ہوتی تو تم باہر نہیں جا سکتے تھے۔"

"چھوڑو' اب کی بات کرو۔"

"ولی خان اور فضل خان کو قتل کرنے کے جرم میں' ہمارے گروپ نے تمہیں غیر ملکی موت سُنا دی ہے۔"

"اور تم نے توثیق کر دی ہوگی؟"

"ابھی نہیں چوہدری! اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ خان کے گھر جا کر تمہیں ہلاک کر دیتے۔ میں نے ابھی تمہارے لیے دو راستے کھلے رکھے ہُوئے ہیں۔ اُن راستوں سے تم زندگی کی طرف لوٹ سکتے ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شکریہ..."

"پہلی ضرورت یہی ہے۔ تم فرضی طور پر یہاں سے ہانگ کانگ چلے جاؤ گے اور رشیدہ کے لیے تحریری پیغام دو گے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"آگے بکو۔ میں سن رہا ہوں۔"

"تمھیں چند دن میرے ریسٹ ہاؤس میں قیام کرنا ہوگا۔"

"وہ ریسٹ ہاؤس کس قبرستان میں ہوگا؟"

"اوہ... نہیں... خدا کی قسم نہیں... مجھ پر اعتماد کرو چوہدری! میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔"

"چند دنوں میں تم کیا حاصل کر لو گے سلیمان؟"

"رشیدہ اور تمھارے تمام خفیہ ٹھکانوں سے مال۔"

"زندگی کی ضمانت سیٹھ؟"

"میری زبان..."

"اوکے سلیمان!" میں نے گہری سانس لے کر جیسے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"شکریہ دوست!" وہ چہک اٹھا۔ "مجھے یقین تھا۔ کہ تم دانش مندانہ فیصلہ کرو گے۔ علی خان کو ریسیور دے دو اور مجھ پر اعتماد رکھنا۔ خرم سلطان!"

"مجبوری ہے سیٹھ!" میں نے علی خان کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ "تم علی خان سے بات کر لو۔"

چونکہ میں نے واضح طور پر اپنی شکست کا اعتراف کر لیا تھا، میری آواز بھی شکستہ اور تھکی تھکی تھی۔ اس لیے علی خان کی احتیاط اونگھ گئی تھی۔ اس نے ریوالور بائیں ہاتھ میں لے لیا اور جونہی اس کا دایاں ہاتھ ریسیور لینے کے لیے بڑھا، میری دونوں کہنیاں دائیں بائیں چھٹیں۔ اور دونوں ایک ساتھ دشمن ہوتے چلے گئے تھے۔ میں نے چشم زدن میں دونوں کے ہاتھ خالی کر دیے تھے۔ دو تین سیکنڈ میں بساط الٹ گئی تھی۔ میں ریوالور لیتے ہی کاؤنٹر کی آڑ میں کود گیا۔ کیونکہ شوکت کی گولی مجھے چاٹ سکتی تھی۔

اس نے حسب توقع فائر جھونک دیا تھا۔ گولی پالائی وڈ کو پھاڑ کر میرے گھٹنے سے ٹکرا کھاتی ہوئی نکل گئی تھی جس جگہ میں دوبا تھا، وہ دوسری گولی بھی وہاں مار سکتا تھا، اس لیے میں تیز رفتاری سے کاؤنٹر کے دائیں کونے پر چلا گیا تھا۔

میں نے جھانک کر دیکھا، وہ دبے پاؤں کاؤنٹر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میرا ہاتھ اٹھا اور شوکت کا منہ کھل گیا۔ گولی اس کی ناک کو اڑاتی اندر گھس گئی تھی۔

"ذرا ماسٹن رہے تھے نا سلیمان سیٹھ؟" میں نے پوچھا۔ "کاش تم دیکھ بھی سکتے۔ بہرحال اب میں جا رہا ہوں سلیمان! اپنے شکاریوں کو یہاں سے لے جاؤ... یا میں ان کو ٹھکانے لگاتا جاؤں؟"

"کتنی لاشیں ہیں؟"

"صرف ایک..!"

"ٹھیک ہے میں اٹھوا لوں گا۔" اس نے افسردہ آواز میں کہا اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔ گارڈ سر جھکائے قریب کھڑا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی تو وہ بھرائی آواز میں بولا۔

"جناب! ان لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔"

"بھول جاؤ۔ ہاں اگر لاش کوئی اٹھانے نہ آئے تو صبح مجھے پہنچا دو گے۔ یہ لوگ میرے جانے کے بعد خود چلے جائیں گے۔ کیا تمھارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے؟"

"نہیں جناب! کبھی ضرورت ہی نہ پیش آئی تھی۔"

میں نے ایک ریوالور اس کے حوالے کر دیا اور ہوٹل سے نکل گیا تھا۔

سلیمان کو میں شانوں سے پکڑ کر اپنے راستوں سے ہٹاتا رہا تھا نہ جانے اندر کون سی گرہ تھی، جو سلیمان کے حق میں تھی کہ جب بھی اس نے میرا راستہ روکا تو میں اسے ہٹا کر خاموشی سے آگے نکل جاتا تھا جبکہ ایک شخص رنگ باز خان تھا جس نے ایک بار بھی میرا راستہ نہ روکا تھا لیکن میں نے اسے ایسی جان لیوا ضرب لگائی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہ رہ سکا تھا۔ ولی اور فضل نے بھی صرف ایک دفعہ راستہ روکنے کی کوشش میں جانیں گنوا دی تھیں... لیکن سلیمان کینہ پرور اونٹ کی طرح میرے پیچھے پڑا ہوا تھا اور میں مسلسل اسے ڈھیل دے رہا تھا۔ شاید وہی جذبہ راسخ ہو گیا تھا جو کبھی رشیدہ کے حوالے سے میرے دل میں بیدار ہوا تھا۔ ایک یقین یہ بھی رہا تھا کہ عورت پہلی محبت کو نہیں بھولتی۔ گو رشیدہ نے کبھی اقرار نہ کیا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ اس نے کبھی اسے چاہا ہوگا اور حالات اسے اقرار کرنے سے روکے ہوئے ہیں... اگر سلیمان میرے ہاتھوں مارا جاتا تو وہ لڑکی جو مجھے واقعی عزیز تھی عمر بھر کے لیے دکھی ہو جاتی۔ میں نے ایک تجربے کی خاطر ہی فیصلہ کیا تھا کہ ماضی کا ایک محبوب، حال کی محبوبہ کے سامنے لایا جائے گا اور میں کسی غیر جانب دار ریفری کی طرح دیکھوں گا۔ عورت ماضی کی محبت سے کس طرح پیش آتی ہے لیکن اب رشیدہ نے بھی واشگاف الفاظ میں اس سے اپنی نفرت کا اظہار کر دیا تھا۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی میں نے بستر چھوڑ دیا۔ میں نماز ہوتے

کا دعویٰ تو نہیں کرتا البتہ صبح کی نمازیں بہت کم قضا ہوئی ہیں۔ اس صبح بھی کہ جب لان میں نماز کے لیے جا رہا تھا تو میں نے تینوں لاشوں کو سجدہ ریز پایا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف دل خوش کن تھا کہ رنگ باز جیسے باپ کی بیٹیاں بھی عبادت گزار ہیں لیکن خان کو بحیثیت باپ میں پہلے ہی خراج عقیدت کا سرٹیفکیٹ دے چکا تھا۔ وہ برا انسان بہت اچھا باپ تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے خود کو تقسیم کر لیا تھا۔ وہ برے انسان کو ایسے ہی ہوٹل میں چھوڑ آتا تھا جیسے موٹر مکینک تیل گریس میں لتھڑی ڈانگری و کشاپ میں اتار کر صاف ستھرے لباس میں گھر آتا ہے۔

میں جب نماز سے فارغ ہوا تو وہ دونوں اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ میں نے حسب معمول کچن میں ہی بیٹھ کر ناشتا کیا۔ میں جونہی حلق میں چائے کا آخری گھونٹ اتارتا ہوا اٹھا، رشیدہ نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر پوچھا۔

"رات کہاں گئی تھی سواری؟"

"اچھا یہ بات ہے؟" میں اسے گھورنے لگا۔ "تو تم میری نگرانی کرنے لگی ہو؟"

"ہاں، لوگ قیمتی شے کی نگرانی سے غافل نہیں ہوتے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں گاڑی کی آواز سن کر باہر نکلی تھی لیکن تم گیٹ سے نکل چکے تھے۔"

"سلیمان اب میری جدائی برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔" میں نے بتایا۔ "یہ دل کے سلسلے بھی عجیب ہوتے ہیں کچھ لوگ بتوں کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی نسبت کعبے سے رہی ہے اور کچھ محبوبہ کے کتے کو گلے سے لگا کر روتے ہیں کہ وہ محبوبہ کے گلی کے قریب رہتا ہے۔"

"اب بکواس ہی کرو گے؟" وہ مصنوعی لہجے میں بولی۔ "سیدھی بات بتاؤ۔"

اگر وہ نہ پوچھتی تو بات ٹل جاتی لیکن بات تو ٹل سکتی تھی وہ جو سلیمان کے لیے کہہ دیا گیا تھا اسے کون مٹاتا۔ میں نے رشیدہ کو ٹیلی فون کال سے خونی ہنگامے تک ساری باتیں بتا دی تھیں۔ وہ گال پر ہاتھ رکھے چپ چاپ سنتی رہی تھی جیسے کوئی انجان بچی دادی اماں سے طلسمی کہانی حیرت و انہماک سے سن رہی ہو۔

"اب اس کے لیے کیا سزا تجویز کرو گے؟"

"تمھاری معرفت اسے ایک موقع اور دوں گا۔ وہ اس بزنس سے توبہ کر لے۔"

"میں اس سے بات کروں؟"

"اس کی ضرب وقتی طور پر تو بے شک ہاتھی کو بھی مفلوج کر دیتی ہے مگر اثر عارضی ہوتا ہے۔ میں صرف شوکت کی وجہ سے آڑ میں ہو گیا تھا ورنہ ان دونوں کو چند ضربیں اور دے کر مکمل مفلوج کر دیتا۔ جب شوکت کا خطرہ گرا تو میں اچھل کر اٹھا... علی خان پیٹ دبائے اٹھ رہا تھا، اور دوسرا نوجوان پاؤں پر کھڑا شوکت کے پھڑکتے جسم کو دیکھ رہا تھا۔

علی خان کی نظر جونہی مجھ پر پڑی، وہ ایک دم سیدھا ہو گیا تھا اور پھر اس کے ہاتھ خود بخود اوپر اٹھ گئے تھے۔ البتہ مجھے اس کے ساتھی کا سر سہلانا پڑا تھا۔

"سیٹھ... سیٹھ..." علی خان ہکلانے لگا۔ "درست کہا تھا کہ تم انسان نہیں ہو۔"

"ہاں، شیطانوں کے لیے میں انسان نہیں ہوں۔" میں نے بے ہوش نوجوان کے جسم کو ہلانا گتے ہوئے کہا۔ "اب تم بتاؤ گے کہ سیٹھ سلیمان نے تمھیں کیا حکم دیا تھا؟"

"نن... نہیں... وہ مجھے مار دے گا۔"

"تو کیا میں پیار کروں گا؟" میری لات اس کی پنڈلی پر لگی اور وہ کراہتا ہوا جھک گیا۔ "بولو، جلدی بولو۔ اس نے کیا کہا تھا؟" میں دہاڑا... اور دنیا جہاں کا خوف اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا...

"کیا قتل...؟"

"ہاں... اس نے یہی حکم دیا تھا۔"

میں نے ایک قدم اٹھایا اور علی خان کی توند پر سیدھا ہک مارا۔ وہ آٹے کی بوری کی مانند گر گیا۔ مزید مار سے بچنے کی خاطر ہو سکتا ہے اس نے بے ہوش ہونے ہی میں عافیت سمجھی ہو کیونکہ جب میں نے اس کے پاؤں پر ضرب لگائی تو اس کا ساکت جسم پھڑک اٹھا تھا۔ چونکہ وہ سنتا ہو چکا تھا، اس لیے میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو... لیکن یہ فون پر...!"

"آؤ، یہ فیصلہ بھی ہو جانا چاہیے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "اگر اس نے مشروط توبہ کا وعدہ کیا تب...!"

"ہم یقین ہونے تک اسے غیر مشروط توبہ کے لیے مجبور کر سکتے ہیں۔" رشیدہ نے ٹیڈ اٹل کیا اور میں کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"صبح بخیر سلیمان! میں رشیدہ بول رہی ہوں۔ کیا بات ہے آپ کی آواز..." اوہ یہ بے خوابی کا مرض خطرناک ہے۔ کون... خرم سلطان نہیں نہیں سلیمان صاحب وہ مرض نہیں بلکہ مرہم ہے درد کا مداوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے آپ کو غلط فہمی ہے۔" رشیدہ نے آنکھ دبا کر میری جانب دیکھا۔
"جی جی سُن رہی ہُوں بلکہ خُرم سلطان کی زبانی بہت کچھ سُن چکی ہُوں اور اپنی آنکھوں سے بھی بہت کچھ دیکھ چکی ہُوں۔ جارج کون ہے؟ آپ یا خُرم؟ آپ نے کل شام اُسے اغوا کیا، رات پھر چڑھ دوڑے کیں اُسے جارحیت کا مُجرم کیسے قرار دے سکتی ہُوں؟" جی... بالکل یہ اُس کا حق تھا جو اُس نے استعمال کیا ہے۔ کہئے سیٹھ سلیمان! مصالحت ہو سکتی ہے، بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن صرف ایک شرط پر... آپ اس دھندے کو ترک کر دیں۔" میں خُرم سلطان کے دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھوں میں دینے کا وعدہ کرتی ہُوں... جی... اچھا... ہُوں، اصولی بات یہ ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ پہلے خُرم سلطان اس بزنس سے دستبرداری کا اعلان کرے گا تو... نہیں نہیں یہ میرا وعدہ ہے آپ! ہاں سہ آنکھوں پر... ہم ڈنگ باز خان کے گھر ہیں، تشریف لے آئیں جی ہاں خُرم میرے شانے سے شانہ ملائے بیٹھا ہے۔" رشیدہ نے ریسیور میری جانب بڑھا دیا۔

"السلام علیکم بُرے بھائی! مَیں نے خوش گوار آواز میں کہا۔
"چوہدری! میں نے کچھ اور فیصلہ کیا تھا لیکن قدرت کو شاید کچھ اور منظور ہے۔ مَیں تم لوگوں سے ملنا چاہتا ہُوں۔ یہاں آ جاتے تو سکون سے بات ہوتی۔"
"یہاں بھی ایسی سہولت ہے سیٹھ۔"
"نہیں مَیں خان کے گھر نہیں آنا چاہتا۔ آخر میری بھی اپنی اہمیت اور ساکھ ہے۔"
"کیا ہماری اہمیت تم سے کم ہے سیٹھ؟" مَیں نے تیز لہجے میں جواباً کہا۔
"اوہ نہیں، یہ بات نہیں ہے لیکن مَیں... معاف کرنا چوہدری مجھے تم پر اب بھروسہ نہیں رہا۔"
"اوہ... ڈرتے ہو تُم؟" مَیں نے قہقہہ لگایا۔ "ٹھیک ہے سیٹھ ہم آ رہے ہیں تم چاہو تو آخری راؤنڈ کھیلنے کا انتظام کر سکتے ہو، مَیں سیٹھ نہیں ہُوں۔"
"شرمندہ نہ کرو چوہدری! تمہارے ساتھ جو ہستی ہوگی وہ اس گھر کے لیے بڑی محترم ہے۔"
"ایک منٹ سیٹھ!" مَیں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر رشیدہ سے پوچھا۔ "اس کی دعوت قبول کرنی ہے رشو! وہ یہاں آنے سے کچھ اتا سے کیا تھیں اُس کا گھر معلوم ہے؟"
"مَیں تمہیں روک کر بُزدلی کا راستہ نہیں دکھاؤں گی خُرم۔" رشیدہ بولی۔ "لیکن تم نے اچھا فیصلہ نہیں کیا۔ مجھے اُس حیثیت پر اعتماد نہیں رہا۔ بہرکیف اب جانا پڑے گا، تمہیں لے چلوں گی۔"
"اگر مَیں انکار کر دیتا تو پھر سیٹھ سلیمان اور خُرم چوہدری میں کوئی فرق نہ رہتا جان برادر!" یہ کہہ کر مَیں نے سلیمان کو اپنی آمد کا پروگرام بتایا اور ریسیور رکھ کر پھر اُٹھا لیا اور بیگن کو کال کرنے لگا۔ گو سلیمان کے انداز میں خطرے کا کوئی الارم نہ تھا پھر بھی سابقہ تجربات اور احتیاط مدِنظر تھی۔ کم از کم میرے گروپ کو تو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اُن کا لیڈر کہاں جا رہا ہے۔
"یس چیف! کیا حکم ہے؟" بیگن نے پوچھا۔
"مَیں اور رشیدہ سلیمان کے گھر جا رہے ہیں، واچ ٹرانسمیٹر آن رکھنا۔"
"یس اور سلوا آپ کے قریب رہیں گے چیف!"
"کیا سیٹھ کا گھر جانتے ہو؟"
"یس چیف!" بیگن نے جواب دیا۔ "آپ بے فکر ہو کر جائیں، ایک اطلاع اور بھی ہے رات دس بجے سیٹھ نے ایک ٹرک سے تین بیگ وصول کیے ہیں، ٹرک چیس پاؤڈر لے کر لاہور گیا ہے۔"
"گودام کی نگرانی کون کر رہا ہے؟"
"ہنٹ اور اب ہارکن اُس کی جگہ لینے جا رہے ہیں۔"
"گڈ ماسٹر! اور کوئی خبر...؟"
"سلیمان نو بجے اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل میں گیا تھا... جب وہ واپس نکلا، اُس کے ساتھ اس مُلک کا ایک ممتاز سیاستداں، صنعت کار اور اسمگلر نواز ملک بھی دیکھا گیا تھا۔ نواز ملک کے اعزاز میں ایک وزیر نے ڈنر دیا تھا لیکن سلیمان وہاں نہیں گیا۔"
"ویری گڈ ماسٹر! آپ بہت تیز اور بہتر جا رہے ہیں۔" مَیں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "نواز ملک کل رات میرے علم میں لایا گیا ہے اور آپ نے اُسے ٹریس بھی کر لیا، خیر ہم سلیمان سے نمٹ کر اُس پر توجہ دیں گے بلکہ میری کوشش ہوگی سلیمان ہی ہماری سیڑھی بنے۔"
"کوشش کر دیکھیں چیف! لیکن مجھے اُمید نہیں۔" بیگن نے رائے دی۔ "بُزدل دُشمن بہت کمینہ ہوتا ہے۔"
"ہاں، یہ تو ہے بے وقوف دوست اور بُزدل دُشمن خطرناک ہوتے ہیں۔ اوکے ماسٹر! خدا حافظ...!"
میرا خیال تھا رشیدہ تیاری میں خاصا وقت لے گی۔ لیکن وہ پانچویں منٹ پر چادر اوڑھے میرے سامنے آ گئی تھی۔ عورتیں زیادہ وقت میک اپ اور لباس کے انتخاب میں لگاتی ہیں۔ رشیدہ نے نہ تو میک اپ کیا تھا اور نہ ہی لباس بدلا تھا حالانکہ وہ اُس شخص کے گھر جا رہی تھی، جو اُسے چاہنے کا دعویٰ رکھتا تھا۔

"لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟" مَیں نے ریوالور میں میگزین چڑھاتے ہوئے پوچھا۔
"تلاوت!" رشیدہ مختصر سا جواب دیتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑی۔
"تمہیں ریوالور کی ضرورت تو نہ ہوگی؟"
"تمہارے سائے اور سہارے کی موجودگی میں مجھے کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔"

**

سلیمان کی کوٹھی تقریباً سات کنال رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ عمارت تھی، بائیں جانب سوئمنگ پُول، بارہ دری اور باغ تھا۔ گیٹ سے پورچ تک سرمئی بجری بچھی ہوئی تھی اور سلیمان برآمدے کی پہلی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ جونہی کار پورچ... میں داخل ہوئی، دو ملازم دائیں بائیں ساتھ دوڑنے لگے تھے۔ پھر ایک مؤدب کھڑا ہو گیا اور دوسرے نے دروازہ کھول دیا۔
سلیمان نے سیڑھیوں سے اُتر کر ہمارا استقبال کیا۔ رشیدہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے آداب کہا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ اس طرح چل رہا تھا جیسے ہمارا اولین غلام ہو۔
"آج کا دن میرے اور اس گھر کے لیے یادگار دن رہے گا۔" سلیمان نے ڈرائنگ روم کے دروازے پر رُک کر کہا۔ "اندر تشریف لے چلیے۔"
ڈیکوریشن اور اعلیٰ جدید فرنیچر کی تعریف ایک سیٹھ سے مذاق بلکہ توہین تھی۔ وہ سیٹھ تھا اور سیٹھ کا ڈرائنگ روم اگر ایسا نہ ہوتا تو تعجب ضرور ہوتا۔ میں تو کچھ مرعوب ہو گیا تھا لیکن رشیدہ کی آن بان اور انداز استغنائی کسی شہزادی جیسا تھا۔ اُس نے نگاہ بھر کر بھی کسی چیز کی طرف نہ دیکھا تھا جیسے سب کچھ اُس کے معیار سے کم تر رہا تھا۔ سلیمان نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا گانگ بجایا اور ابھی وہ سونے پر بیٹھا بھی نہ تھا کہ ایک نوخیز لڑکی اندر آ کر جھک گئی۔
"خاتونِ محترم کو امی حضور کی قدم بوسی کے لیے لے جاؤ...!" سلیمان شاہانہ لہجے میں بولا پھر لہجے میں یکایک نرمی رچاتے ہوئے بولا۔ "مس رشیدہ آپ امی حضور کو سلام کر آئیں۔"
رشیدہ نے اجازت طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور مَیں نے سر کے خفیف اشارے سے اُسے اجازت دے دی۔ اُس نے اُٹھ کر چادر درست کی اور متوازن قدم اُٹھاتی باہر نکل گئی۔
"خُرم سلطان!" سلیمان دوستانہ انداز میں بولا۔ "گفتگو میں رشیدہ کی شرکت ضروری ہے اور وہ چند منٹ امی حضور کے پاس رہے گی۔ آؤ میں تمہیں کوٹھی کی سیر کراؤں۔ دراصل میں دوستی اور مخاصمت کی بنیاد اعتماد پر رکھنا چاہتا ہُوں۔ رشیدہ کی زبان سے جو کچھ تم نے کہلوایا ہے، اُس پر میں غور کر چکا ہُوں اور جو شبہات میرے ذہن میں ہیں، ہم افہام و تفہیم سے دُور کر لیں گے۔ مَیں نے بلیک بزنس میں ایک انفرادیت رکھی ہوئی ہے اور یہی میری کامیابی اور سلامتی کا راز ہے۔ جو دوستی کے نام پر تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہُوں۔" اُس نے اُٹھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ چونکہ اُس کے سارے انداز اور کس بل ٹوٹے ٹوٹے محسوس ہو رہے تھے، باتوں میں نرمی اور ہمدردانہ رویہ رچا ہُوا تھا، اس لیے مَیں نے اُس کی نرم گرفت کو قبول کر لیا تھا۔
"میرا گودام اور ہیڈ کوارٹر میرا گھر ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ دور میں چلتے ہوئے بولا۔" حالانکہ لوگ یہ آگ اپنے گھروں سے دُور رکھتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں۔ میں نے قانون کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے لیے باہر بھی چھوٹے چھوٹے اڈے قائم کر رکھے ہیں۔ جب بھی چھاپہ پڑتا ہے۔ کلو بھر چرس لے جاتے ہیں کوئی یقین نہیں کرتا۔ ایک سیٹھ ایک کلو چرس اسمگل کر سکتا ہے لہٰذا ہر بار میرا کوئی وفادار دو چار ماہ کے لیے اندر چلا جاتا ہے۔"
"تمہاری ذہانت کی داد دی جا سکتی ہے سیٹھ!" مَیں نے اندر کی آگ دباتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔
"تم نے ایک بار مجھے بزدل کہا تھا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "لیکن مَیں نے تمہیں جواب نہ دیا تھا حالانکہ جواب تھا کہ اپنا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔ کچھ لوگ زور بازو سے اپنی دھاک بٹھاتے ہیں کچھ سیاست سے اور تم میں تینوں خصوصیات ہیں۔"
"تعریف کا شکریہ۔" مَیں بھی ہنس پڑا۔ "شاید یہی وجہ ہے کہ ٹھوکروں کا مدفن بن گیا ہُوں۔"
"نہیں چوہدری تم ٹھوکر ہو شاطر ترین، جس نے اس پُرسکون فضا کو خوفناں سے آشنا کر دیا ہے۔ ہم لوگ بڑے سکون سے اپنی اپنی فیلڈ میں کام کر رہے تھے تم چٹان بن کر گرے ہو۔"
معاً مجھے احساس ہُوا کہ ہم آباد حصے سے نکل کر غیر آباد کوارٹر کے درمیان چل رہے ہیں کوٹھی اور کوارٹروں کے درمیان لکڑی کی جالی دار دیوار راستہ دیتی اور دیوار پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ آگے پھول دار جھاڑیوں کا جنگل تھا۔
ہر کوارٹر کا دروازہ مقفل تھا اگر رات کا سماں ہوتا تو میں اڑیل گھوڑے کی طرح اُٹھی قدموں پر اڑ جاتا لیکن دن کی روشنی تھی اور سلیمان خالی ہاتھ اور تنہا میرے ساتھ تھا اگر میں آگے بڑھنے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انکار کرتا تو وہ بزدلی پر محمول کرتا۔ خطرے کی بھی بظاہر کوئی علامت تھی نہ وجہ... اسی لمحے ایک کوارٹر کا دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھا جھانک کر اندر ہو گیا۔

"کیا بات ہے طفیل بابا؟" سلیمان نے نیم وا دروازے کو پاؤں کی ٹھوکر لگائی "باہر آؤ۔" طفیل تو باہر نہ آیا لیکن سلیمان اندر کود گیا تھا اور عین اسی وقت میری پشت اور پہلو سے تین بیرل چمک گئے تھے۔

میں نے چہرہ گھما کر دیکھا، وہ تین تھے اور جدید ترین رائفلوں کے بیرل میرے جسم سے لگائے خونخوار نگاہوں سے گھور رہے تھے پھر دھڑا دھڑ دروازے کھلنے لگے اور میرے آگے پیچھے مسلح آدمیوں کی قطاریں لگ گئیں۔

"اب باہر چلیے آقا بزدل چوہے!" میرے حلق سے دبا دبا سا بھری "اس کی تلاشی لے لو۔" کوارٹروں کے عقب سے سلیمان نے انھیں حکم دیا۔

ایک شخص پستول تانے میرے سامنے آیا اور پیچھے کھڑے کسی شخص نے میری جیب خالی کر دی۔

"سب اچھا ہے۔" کسی نے ہانک لگائی۔ انداز فوجی تھا جیسے کوئی جونیئر اپنے سینئر کو اوور کے رپورٹ دے رہا ہو۔ دروازہ کھول کر جب سلیمان سامنے آیا تو وہ سر تا پا قہقہہ بنا ہوا تھا۔

"عیار بھیڑیا بھی بالآخر شکاری کے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔" وہ میرے گرد چکر لگاتے لگا رہیں پیدائشی سینئر نہیں ہوں، جو صرف کچھ تک محدود ہوتے ہیں۔ میں گرد آلود گلیوں اور تاریک راستوں کے ظلم برداشت کرتا ہوا اس بلندی تک پہنچا ہوں چوہدری! تم نے میرے لیے جو ریشمی اور رنگین جال بچھایا تھا، اس میں کوئی بھولا پنچھی ہی پھنس سکتا تھا لیکن میں نے تمھیں بتا دیا تھا کہ سلیمان سیٹھ نے کینچلی بدل لی ہے۔ اب میں ماضی کا درندہ صفت سلیمان استاد نہیں۔"

"سنو سلیمان!" میں نے نہایت ہی پرسکون آواز میں کہا "یہ ہماری جنگ ہے، ہم لڑتے رہے ہیں اور لڑتے رہیں گے۔ میں تم سے صرف یہ کہوں گا کہ رشیدہ کو باعزت طور پر واپس بھیج دو۔"

"درخواست ہے یا حکم؟"

"حکم نہ درخواست، صرف بات کر رہا ہوں۔" میں نے اسی دھیمے انداز میں جواب دیا "میری بات حکم کا بھی درجہ رکھتی ہے۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب اس جنگ کا فیصلہ ہو گا تو اس میں صرف ہماری ذات ہونی چاہیے ورنہ...!"

"ورنہ کیا؟" اس نے اچھل کر طمانچہ مارا "وہ اب رشیدہ نہیں، تمھاری پارٹنر ہے۔ وہ کل شام تک میرے لیے بہت کچھ تھی لیکن اس نے چاقو مار کر اس مرد کو ہلاک کر دیا تھا جو اسے من میں بسائے ہوئے تھا۔ اسے لے چلو ادھر۔"

"اپنے لیے گنجائش رہنے دو سلیمان۔" میری آواز میں درندگی عود کر آئی تھی۔

"کیا کہنا چاہتے ہو چوہدری؟" سلیمان سامنے آ کر غرایا "گنجائش سے تمھاری مراد کیا ہے؟"

میں نے بدستور تھپیلی اس کی کھڑی ناک پر ماری اور وہ ڈکراتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا، اس کے حکم پر ہی کوئی گولی چل سکتی تھی اگر اسے مارنا ہوتا تو اتنی فوج میرے لیے نہ منگواتا۔ انسان تو ایک گولی سے ہی ہلاک کیا جا سکتا ہے۔

گولی تو چلانے کی کسی نے جرأت نہ کی تھی لیکن بٹ سے میری کھوپڑی میں تاریکیاں ضرور انڈیل دی گئی تھیں۔ ضرب زوردار تھی۔ میں منہ کے بل سیٹھ سلیمان پر جا گرا تھا۔

بے ہوشی غالباً دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ رہی تھی کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو سلیمان کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور ایک آدمی رومال سے ٹکور کرتے میں مصروف تھا مگر جگہ بدل گئی تھی۔ راہ پر بے رنگ چھت تھی اور دائیں بائیں بے روغن دیواریں کھڑی تھیں یقیناً وہ کوئی تہ خانہ تھا۔ میرے پیروں پر ایک شخص بیٹھا تالے توڑ رہا تھا۔

"تم نے سلیمان استاد کو خوش کر دیا چوہدری۔" وہ ناک سہلاتا ہوا بولا "کاش میں تمھیں اپنے ہاتھ سے ہلاک کر سکتا۔ میں نے تم جیسا پھرتیلا اور نڈر شخص آج تک نہیں پایا لیکن تم حریف بن کر مرے ہو۔ یہ افسوس رہے گا۔"

"میں نے تمھیں فاضل نیت سے روشن راستے کی جانب بلایا تھا۔ سلیمان! تم مجھے سمجھ ہی نہیں سکے۔"

"روشنی مجھے راس نہیں آتی چوہدری۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "روشنی نے مجھے زخموں اور ٹھوکروں کے سوا کچھ نہیں دیا مگر اندھیروں نے مجھے خاک سے اٹھا کر عرش تک پہنچایا ہے۔ میں دشمن کو پھر گلے کیسے لگاتا۔ اب تو اندھیرا ہی میرا حال اور مستقبل ہے۔"

"ہاں تم نے ٹھیک کہا ہے سلیمان! تمھارے مقدر میں اب تاریکی رقم ہو چکی ہے۔" میں نے خود کو سمیٹ کر آزمایا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اتنا تو بتا دو سلیمان! رشیدہ کہاں ہے؟"

"پردہ ہٹا دو۔" سلیمان نے اشارہ کیا اور میرے عقب کی دیوار ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ منشق ہو گئی اور خلا میں آہنی گرل دکھائی دینے لگی تھی۔

"رشیدہ بیگم اپنے بھائی کو اپنا چہرہ دکھاؤ۔" سلیمان استہزائیہ انداز میں بولا۔

"نہیں... نہیں..." نیم تاریکی سے رشیدہ کی چیخ ابھری "مت دیکھنا خرم سلطان... آنکھیں بند کر لو، میرے بچے...!"

میں آج بھی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا۔ وہ کون سی طاقت تھی، قدرت کا ان دیکھا ہاتھ تھا یا غیرت کی للکار تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے پہلے اوپر اٹھا اور پھر دھماکے سے سلیمان سے جا ٹکرایا تھا۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا جیسے بینائی رشیدہ کی چیخ نے سلب کر لی تھی۔ نہ دیکھنے کے باوجود میرے ہاتھوں نے سلیمان کی گردن کو گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ میرے جسم تلے پھڑک رہا تھا اور اس کے ساتھی میرے بدن کے ہر مسام پر ضربیں لگا رہے تھے۔ لاتیں، گھونسے، رائفلوں کے بٹ ہر ضرب پر میری گرفت پہلے سے کہیں اور مضبوط ہوتی چلی گئی تھی۔

سلیمان کا پھڑکتا ہوا جسم آہستہ آہستہ ساکت ہو رہا تھا اور میری گرفت بھی ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے سانس سنگھنے والی آخری ضرب پر ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھولی تھیں۔ سلیمان کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں، زبان میری کلائی تک لٹک آئی تھی اور میرے ہاتھ سے اس کا چہرہ سرخ رنگ میں ڈوب گیا تھا۔

نرم نرم لمس کے احساس نے زندگی کی بشارت دی تو میں نے آنکھوں کی جھریوں سے دیکھا، سبز باریک پردہ دکھائی دیا۔ پس منظر میں سفید چھت اور دیواریں تھیں۔ نرم و گداز ہاتھ میری کلائی... تھپک رہا تھا پھر جیسے بھڑنے ڈنک مارا تھا، میں نے پوری آنکھیں کھول دی تھیں۔ ایک سانولا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ وہ لڑکی سفید لباس میں ملبوس تھی۔ دھیرے دھیرے میرے حواس بیدار ہونے لگے۔ میرے اردگرد میرے اپنے، میرے پیارے کھڑے تھے۔ اُفق میں رشیدہ بھی تھی۔ وہ جھک کر مجھ پر گرنے ہی کو تھی کہ اسے لپک کر بیگن نے سنبھال لیا۔

"مس آپ لوگوں نے خاموش رہنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔" نرس نے روئی سے ٹکور کرتے ہوئے کہا "میرے رونے کا نہیں سجدۂ شکر کا وقت ہے۔ مسٹر خرم اب خطرے سے نکل گئے ہیں۔"

"خرم!" رشیدہ کی ہکی آواز ابھری "میرے بھائی آنکھیں کھلی رکھو۔" میں نے نہ صرف آنکھیں کھول دیں بلکہ ہونٹوں کو بھی مسکراہٹ دے دی۔

"سسٹر...!" میں نے ہونٹ تر کرتے ہوئے کہا "میں اب ٹھیک ہوں براہ کرم مجھے باتیں کرنے دیں۔"

"اجازت ڈاکٹر ہی دیں گے مسٹر!" نرس نے جواب دیا اور ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔

"پیارو!" میں نے انگریزی میں کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے دایاں ہاتھ رشیدہ کی جانب بڑھایا اور وہ بیگن کی بانہوں سے تڑپ کر نکلی اور میرا ہاتھ چومنے لگی۔

نرس اور ڈاکٹر اندر آئے تو رشیدہ ایک طرف ہو گئی۔

"سب لوگ باہر چلے جائیں۔" ڈاکٹر نے معذرتی لہجے میں کہا۔ "شام تک آپ لوگوں کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

ڈاکٹر نے نرس سے کچھ کہا اور وہ دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رشیدہ کے بالوں پر بیگن نے تھپکی دی، وہ ایک دم اٹھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ ڈاکٹر نے ان لوگوں کو روکنا چاہا تھا لیکن پھر عقیدت اور وفاداری کے اظہار اور انداز نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ بیگن نے ہاتھ اور پیشانی پر عقیدت کے پھول برسائے تھے جب کہ دیگر ساتھیوں نے ہاتھ کی پشت چومی تھی۔ سلوانے آنسوؤں کا بھی نذرانہ پیش کیا تھا۔ وہ شیر جیسا نوجوان میرے ہاتھ پر جھک کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ میرا دل اور آنکھیں نمخوار انبساط سے نمناک ہو گئی تھیں۔ جس کے چاہنے والے اتنے پیارے اور وفادار ہوں اسے کون شکست دے سکتا ہے۔ نرس نے میرے دوسرے بازو میں انجکشن دیا۔ ابھی وہ لوگ کھڑے ہی تھے کہ میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ ان کے پاس یہی چارہ تھا کہ مجھے بیگانہ سوشن کر دیں۔

شام پانچ بجے وزیر داخلہ اور ڈی۔ آئی۔ جی دونوں ڈاکٹروں کی سرکردگی میں کے ساتھ آئے تھے چونکہ خون کی بوتل لگی ہوئی تھی، اس لیے میں نے ان کو آنکھوں اور مسکراہٹ سے ہی تعظیم دی تھی۔

خان صاحب نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "مجھے ڈاکٹرز پل پل کی رپورٹ دیتے رہے ہیں۔ ویسے بھی مجھے یقین تھا تم اپنی قوت مدافعت سے جلد ہی نمبل جاؤ گے، ویل ڈن بوائے۔"

میں نے ڈی۔ آئی۔ جی صاحب کی جانب دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولے "سوری خرم سلطان! میں اسے شاید پہچان نہ سکا تھا۔"

"ہم نے اپنی سی کوشش کی تھی سر!" میں نے نحیف آواز میں جواب دیا "لیکن قدرت کو یہی منظور تھا۔"

"بہرکیف مجھے افسوس ہے اگر میں ثانی کی حمایت نہ کرتا تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔" خان صاحب نے گھور کر انھیں دیکھا اور ان کو بھی ڈاکٹروں کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ معذرتی نگاہوں سے دیکھ کر ایک طرف ہو گئے۔

"تمھارے لیے ہر وہ شخص دعاگو ہے خرم! جو اس ملک میں امن و سکون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی روشنی چاہتا ہے۔" خان صاحب ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے ان کی ہر حرکت سے محبت اور شفقت ٹپک رہی تھی "میں حوصلے کی تلقین نہیں کروں گا۔ تم حوصلوں کی زندہ علامت ہو۔ مجھے یقین ہے دو چار روز بعد تم فٹ ہو جاؤ گے۔"

ان کے ساتھ وہ ڈاکٹر بھی واپس چلے گئے۔ ایک دروازے سے پلٹ آیا تھا۔ اس نے میرا چارٹ اٹھایا اور پھر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"آپ کا یہاں کوئی عہدہ درج نہیں ہے۔ کیا آپ خان صاحب کے عزیز ہیں؟"

"میں بے رنگ لفافہ ہوں۔" ڈاکٹر! میں نے جواب دیا۔ "خان صاحب سے صرف تعلق انسانیت ہے۔"

"آپ شاید بتانا نہیں چاہتے۔" ڈاکٹر قدرے شاکی لہجے میں بولا۔ "بہرکیف آپ بے رنگ ہیں نہ عام شہری ہیں۔ کل سے مسلسل مختلف کے آفیسرز پر پے در پے اچانک حملے کی زد میں ہے۔ رات ایک بجے تک میڈیکل بورڈ کی قیادت ایم۔ ایس صاحب کرتے رہے ہیں۔"

"سب نے اپنا فرض ادا کیا ہے ڈاکٹر!"

"آ۔ کو خانا...!"

وہ۔ زہ گھلنے کی آواز سن کر ہم دونوں نے ادھر دیکھا۔ رشیدہ، بیگن اور نیکٹر ہارون اندر آ گئے تھے۔ رشیدہ کے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ بیگن تھرماس، فروٹ جوس لایا تھا۔ ہارون نے میرا فارغ ہاتھ تھام کر نرمی سے دبایا اور بھرائی آواز میں بولا۔

"میرا انتظار تو کرتے دوست!"

"ہمارے کسی کا انتظار نہیں کرتے پیارے۔" میں نے اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "ویسے کس منصب کے؟"

"مجھے آج دو بجے کال کر کے ایک سیلوٹ لگانا دیا گیا تھا۔ بڑے صاحب کو رپورٹ دی تو انھوں نے بتایا۔"

"ڈاکٹر پیزا!" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "آپ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں گے۔" وہ خاموشی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

"باس! یہ ہمارے نئے ساتھی ہارون ہیں۔" میں نے انھیں بڑی مشکلوں سے مانگا ہے۔" بیگن نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا... ہارون یہ ہمارے گروپ کے منیجر میر ہیں اور یہ ہیں میری منہ بولی بہن رشیدہ۔" ہارون نے سر کو خم دے کر رشیدہ کو آداب کیا۔

"باس! حسب روایت قائم مقام چیف ہارون ہوں گے لیکن میں ہارون کو مشورہ دوں گا کہ چیف ہونے کے باوجود آپ سے مشورہ لیتے رہیں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں چیف!" بیگن بولا۔ "لیکن روایات کے ساتھ اصول بھی ہوتے ہیں۔ اصولی طور پر رشیدہ، مسٹر ہارون سے سینئر ہیں اس لیے..."

"نہیں ڈیڈی!" رشیدہ بولی۔ "بڑی خورم نے بہتر فیصلہ کیا ہے اگر کوئی اصول ہے بھی تو میں بہ رضا و رغبت ہارون صاحب کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔"

"محسوس نہ کرنا مسٹر ہارون۔" بیگن نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے ایک اصول کی بات کی تھی۔"

"نہیں محترم!" ہارون نے جواب دیا۔ "میں خاتون اور خورم سلطان دونوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اصول کو تسلیم کرتا ہوں۔ میں عہدہ چھوڑ کر صرف خدمت کا جذبہ ساتھ لایا ہوں لہٰذا رشیدہ صاحبہ ہماری چیف ہوں گی۔"

"جان برادر!" میں نے رشیدہ کی جانب دیکھا۔ "ایک تجربہ ہی سہی۔ آج سے تم ان کی مدام ہو۔"

"اگر بہ حیثیت چیف تمھارا حکم ہے تو میں حکم عدولی نہیں کروں گی۔"

"تھینک یو۔" ہارون مؤدب آواز میں بولا۔ "میں رنگروٹ ہوں مجھے آپ لوگوں سے تربیت حاصل کرنا ہوگی۔"

"اب مجھے تم دونوں بتاؤ کہ سلیمان کا کیا بنا اور میں یہاں کیسے پہنچا؟"

"اس نے جھوٹ بولا تھا خورم!" رشیدہ ہونٹ چبانے لگی۔ "اس کی ماں گھر پر موجود تھی۔ جونہی میں ایک کمرے میں داخل ہوئی مجھے دبوچ لیا گیا تھا۔ وہ چار تھے۔ انھوں نے میرے منہ پر ٹیپ چپکا دی اور اٹھا کر تہ خانے میں لے گئے جہاں ترکیوں نے میرا لباس نوچ لیا تھا۔ سلیمان یقیناً کوئی بڑی شرط تسلیم کروانا چاہتا ہوگا۔"

"پھر کیا ہوا؟" غصے سے خون میرے دماغ پر ہتھوڑیں مارنے لگا۔

"تمھارے ساتھ جو ہوا تم جانتے ہو۔" رشیدہ بولی۔ "اور باہر ڈیڈی تھے، ان سے پوچھیے۔"

"ہم ابھی راستے میں تھے کہ وائرلیس پر معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ آپ کی بے ہوشی اور ہر لمحے تک میں تمام کارروائی سنتا رہا تھا پھر جب میں باغ میں داخل ہوا تو... فیس شاید ختم ہو چکا تھا۔ بے شمار مسلح لوگ ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ میرا انھوں نے پوری گوشمی کو گھیرے میں لے لیا تھا۔" بیگن نے شیشی انداز میں بولتے بولتے رک کر گہری سانس لی۔ "میں نے صورت حال کے پیش نظر اپنے فیصلے پر فوری عمل کرتے ہوئے وزیر داخلہ کو حالات سے آگاہ کر دیا۔ آدھے گھنٹے میں ڈی آئی جی کی قیادت میں چھاپہ مار پارٹی کوٹھی میں داخل ہوئی۔

سلیمان چونکہ مر چکا تھا اس لیے مقابلے کی نوبت ہی نہ آئی۔ تہ خانے سے سلیمان کی لاش کے ساتھ دس کلو ہیروئن، چھ بیگ پرس اور بے شمار اسمگل شدہ مال بھی برآمد کیا گیا۔ اس نے اپنی تباہی کو خود دعوت دی تھی، ورنہ ہم اس کے چھوٹے چھوٹے اڈوں تک ہی محدود رہتے۔"

"چلو اچھا ہوا جس کم بخت ناپاک میں نے ساری روداد سن کر اطمینان کی سانس لی۔ "اب ہم اس شہر سے باہر پھیلے ہوئے شیطانوں کی طرف توجہ دیں گے۔"

"نہیں خورم صاحب!" ہارون بول پڑا۔ "رنگ باز اور سلیمان تو چیلے تھے۔ اصل شیطان، جو ان سب کا گرو ہے، وہ ابھی زندہ ہے جو اپنی ذات میں منشیات کا سمندر ہے۔ تمام ندیوں اور دریاؤں کا رُخ اسی طرف ہے۔"

"ہماری ہٹ پر اس کا بھی نام ہے۔" ہارون!" میں نے جواب دیا "لیکن ہم نے اسے خشک کرنے کی خاطر نالوں، ندیوں اور دریاؤں کا رُخ موڑنے کی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ جب اسے معاون دریاؤں سے پانی نہیں ملے گا تو اس کی سطح خود بخود اترتی چلی جائے گی۔ اس کی طوفانی لہروں کی قوت کم ہوگی۔ تب ہم اس سمندر میں اتریں گے۔"

"معاف کرنا خورم!" ہارون معذرت خواہانہ آواز میں بولا۔ "میں آپ کی پالیسی سے متفق نہیں ہوں۔ ہم اگر ملک کو مارکیٹ یا منڈی قرار دیں تو ہیوپاریوں کا راستہ روکنے کی طویل اور تکلیف دہ پالیسی سے بچ سکتے ہیں۔ مارکیٹ نہ ہوگی تو ہیوپاری مال لے کر نہیں آئیں گے۔ ان کی مرکزیت ختم ہو جائے گی۔ وہ انفرادی طور پر مال کھپانے کی راہیں نئے سرے سے تلاش کریں گے اور ہم ایک ایک کر کے راستے بلاک کرتے چلے جائیں گے اگر ہم موجودہ پالیسی پر گامزن رہتے ہیں تو بیک وقت ہم سب کو نہیں روک سکتے۔ ہم ایک کا رُخ موڑیں گے تو وہ دوسروں سے سیراب ہوتا رہے گا۔"

"ہارون صاحب کا نکتہ نظر ٹھیک ہے خورم!" رشیدہ نے تائیدی انداز میں کہا۔ "صحرا میں سوئیاں تلاش کرنے کا عمل واقعی غیر یقینی اور طویل ہوگا۔"

"بہتر مادام!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے تو شاید کچھ دن آرام کرنا پڑے۔ تم لوگ ملک بدر کا کام شروع کر دو۔"

"ملک کو چھوڑنے سے قبل میں ایک اور تجویز سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔" ہارون نے محتاط نگاہوں سے رشیدہ کی جانب دیکھا۔ رشیدہ بڑے انہماک سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ "چونکہ میں گھر کا بھیدی ہوں۔ ایسا بھیدی جس کے ہاتھ پاؤں اور زبان پر پہرے رہے ہیں لیکن اب میں آزاد ہوں۔ میں چند بار اعلیٰ آفیسرز کی نشاندہی کروں گا جن کی ذاتی گاڑیاں منشیات سرحد سے لاتی ہیں۔ ان کے نمبر پر چیک پوسٹ کمانڈر کو بتا دیے جاتے ہیں لہٰذا وہ او کے کا سرٹیفکیٹ لیتی ہوئی نکل آتی ہیں۔"

"لیکن ہارون صاحب!" رشیدہ متردد لہجے میں بولی۔ "اس طرح ہم دو محاذوں میں گھر جائیں گے۔ انتظامیہ بہرکیف اپنے ساتھ کچھ طاقت رکھتی ہے اگر ہماری جنگ، انتظامیہ کے اہم پرزوں سے شروع ہو گئی تو ہمارے لیے نئے مسائل اور الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔"

"معاف کیجیے گا مادام!" ہارون بھڑکتے لہجے میں بولا۔ "میں انتظامیہ کی بات نہیں کر رہا۔ میں چند غداروں اور مفاد پرست اہل کاروں کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اگر کسی مشین کے کچھ پرزے مشین کو متاثر کر رہے ہوں تو ان کو تبدیل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ انتظامیہ بھی ایک مشین ہے۔ ہم صرف چند پرزے تبدیل کریں گے۔"

"جان برادر! ہارون ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم فعال اور تحریک وطن انتظامیہ کی عدم موجودگی میں کماحقہٗ مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔ ناکارہ پرزوں کی تبدیلی ناگزیر ہے۔ میں ہارون کو اجازت دیتا ہوں دوسرے محاذ پر بھی جنگ شروع کر دیں۔"

"لیکن آپ اپنا روحانی سرپرست ماسٹر کو تسلیم کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ماسٹر ہمارے روحانی باپ ہیں۔"

"فکر نہ کرنا خورم!" رشیدہ عقیدت مندانہ آواز میں بولی۔ "میں بیٹی ہوں، ایسی بیٹی، جو باپ کو روشنی کا مینار سمجھتی ہے۔"

ابھی ہم گفتگو ہی کر رہے تھے کہ ڈاکٹر اور نرس نے اندر آ کر مؤدب انداز میں بڑے ڈاکٹر کا حوالہ دیتے ہوئے ملاقاتیوں سے چلے جانے کی درخواست کی اور وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ نرس ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اوور آل سے سرنج نکالی جس میں زرد دوائی بھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کی آنکھوں میں کوئی ایسی چمک رہی ہوگی جس نے میری چھٹی حس کو جھنجھوڑ دیا تھا اور خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے سرنج آنکھوں کے سامنے کر کے نیڈل کو چیک کیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش محسوس کی تھی... تبھی میرا ایک بازو خون کی بوتل نے جکڑ رکھا تھا اور دوسرے پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔

"ڈاکٹر!" میں نے نرم آواز میں کہا۔ "پلیز میرا دایاں پاؤں دیکھیے کوئی چیز چبھ رہی ہے۔"

"دیکھتا ہوں۔" اس کی آواز میں بے نام سا خوف تھا۔ پہلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انجکشن نے لو۔"

"نہیں ڈاکٹر کوئی چیز کاٹ رہی ہے۔"

ڈاکٹر نے سرنج بائیں ہاتھ میں رکھ لی اور کمبل ہٹا کر جونہی پاؤں پر جھکا، میں نے گھٹنا اُس کے ناک پر مار دیا، وہ کراہتا ہوا کُرسی سے ٹکرایا اور سرنج فضا میں قلابازیاں کھاتی فرش پر جا پڑی تھی۔ کُرسی اُلٹنے کی آواز سُن کر ہی ایک اے۔ایس۔آئی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

"اسے پکڑو۔" انسپکٹر نے تحکمانہ آواز میں کہا اور انسپکٹر نے بھاگتے ڈاکٹر پر چھلانگ لگا دی۔ تین سپاہی بھی اندر آ گئے تھے۔ انسپکٹر نے ڈاکٹر کا بازو موڑ کر اُس کی پُشت سے لگا دیا تھا۔

"چھوڑ دو۔ یہ پاگل ہے۔" ڈاکٹر دہاڑ کر بولا۔ "کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟" انسپکٹر نے تنبیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ میں اسے انجکشن دینے لگا تھا۔ مجھے سرنج اٹھانے دو۔"

"نہیں انسپکٹر۔ بڑے ڈاکٹر کو آنے دو۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "تم میں سے ایک سپاہی سرنج اپنے قبضے میں کر لے۔"

معاً ڈاکٹر نے فارغ ہاتھ سے ریوالور نکال لیا اور میری طرف فائر کر دیا لیکن ایک تو اُس کا رُخ بگڑا ہوا تھا، دوسرے انسپکٹر نے ریوالور دیکھ کر اُسے جھٹکا دے دیا تھا گولی میرے چہرے سے صرف چند انچ دُور نکلے میں پیوست ہو گئی تھی اگر دونوں سپاہی انسپکٹر کے حکم پر ڈاکٹر سے پٹ نہ جاتے تو شاید وہ دوسری کوشش بھی کرتا۔

بڑا ڈاکٹر جب اندر داخل ہوا تو ہانپ رہا تھا۔ "یہ... یہ... کیا ہو رہا ہے؟" خوف سے اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ "ڈاکٹر زمان کیا بات ہے؟"

"مریض کا دماغ اُلٹ گیا ہے سر۔" ڈاکٹر زمان بولا۔ "اس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔"

"اور اس نے پاگل مریض پر گولی چلائی ہے ڈاکٹر۔" میں نے تکیے کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا آپ کو یقین ہے سر کہ یہ ڈاکٹر زمان ہی ہے؟"

"ہاں!" ڈاکٹر نے تھرتھراتی آواز میں جواب دیا۔ "زمان! تم نے... تم نے گولی چلائی تھی؟"

"حفاظت... بسلیف ڈیفنس کی خاطر سر!"

"ڈاکٹر! یہ میک اَپ میں ہے۔ آپ انسپکٹر اس کا چہرہ چیک کریں۔"

اچانک ڈاکٹر زمان نے انسپکٹر کو ٹکر ماری اور چشم زدن میں کمرے سے نکل گیا۔ سپاہی ایک لمحے کے لیے ہکا بکا کھڑے رہ گئے اور انسپکٹر جب چہرہ ہاتھوں میں لیے سیدھا ہوا تو پاگل بڑبڑاتے ہوئے دوڑے لیکن کھیل تو ڈاکٹر زمان جیت چکا تھا۔ وہ یقیناً کوئی ماہر کھلاڑی تھا جس نے ایک بازی ہار کر دوسری جیت لی تھی۔

میرے ہمدردوں نے میری حفاظت کا اپنی طرف سے خاصا انتظام کیا تھا لیکن وہ خطرے کا اور اک رکھنے کے باوجود غوش فہمی میں تھے۔ اُنھیں انتظامات کا حکم دیتے وقت خرم سلطان کی اُس اہمیت کو مدِنظر رکھنا چاہیے تھا جو دشمن کی نظر میں اختیار کر گئی تھی۔ سلیمان میری شناخت کروا گیا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ ملک نواز نے ہی خرم سلطان چوہدری کی موت کا پروانہ جاری کیا تھا۔ وہ ان دنوں اسلام آباد میں موجود تھا۔ اس نے سلیمان اور خرم سلطان کی جنگ کا فیصلہ بھی سُن لیا ہو گا۔ اُس نے اس طوفان اور خطرے کے قدموں کی چاپ بھی سُن لی ہو گی، جو حصار توڑتا ہوا اُس کی جانب بڑھ رہا تھا اگر ڈگ باز اور سلیمان اُس کے قبضے کے محافظ تھے تو اُن کی ہلاکت کی خبروں نے اُسے حواس باختہ کر دیا ہو گا، جس طرح چہار دیواری کی دیواریں گرنے کی دھمک کوئی جوان ہو یہ اپنے دل پر محسوس کرتی ہے۔

اُس نے سب اپنے ذرائع سے یہ جان لیا ہو گا کہ قلعے کی دیواروں اور محافظوں کا قاتل اپنی تمام بے بسی اور معذوری کی پٹیوں میں جکڑا ہوا ہے تو اُس کے لیے انتقام لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ بس آدمی اُسے کمرے میں داخل کرنا تھا کسی ڈاکٹر کا۔ ڈپ دے کر یا کسی ڈاکٹر کو قاتل کی رُوح دے کر۔ ملک جیسے بااثر اور مال دار کے لیے دونوں کام مشکل نہ تھے۔ ماسک چہرہ بدل سکتا تھا اور دولت روح خرید سکتی تھی۔

باہر پچھلی مچی ہوئی تھی۔ فرش ایڑیوں سے بج رہے تھے اور بڑا ڈاکٹر سنگی بت کی طرح بے حس و حرکت سرنج کو گھور رہا تھا۔

"ڈاکٹر!" میں بولا تو ڈاکٹر پھریری لے کر بیدار ہو گیا۔ "سرنج اٹھائیں۔ میرا خیال ہے زہر ہو گا۔"

"لیکن... لیکن..." ڈاکٹر ہکلانے لگا۔ "ڈاکٹر زمان نے ایسا کیوں کیا؟"

"اگر وہ ڈاکٹر زمان ہی ہے تو جواب دینے کی اُسے مہلت نہیں دی جائے گی۔"

ابھی میرے الفاظ کی بازگشت کمرے کی دیواروں سے ہی ٹکرا رہی تھی کہ نرس چیختی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ "ڈوڈا... ڈاکٹر... کسی نے... اوہ... مائی گاڈ! کسی نے ڈاکٹر زمان کو گولی مار دی ہے... اُدھر آپریشن تھیٹر کے سامنے...!" ڈاکٹر نے سرنج اٹھائی اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ نرس بھی دوڑی تھی لیکن میں نے اُسے آواز دے کر روک لیا۔ میرے اندر خطرے کا الارم مسلسل چیخ رہا تھا۔ پولیس اور عملہ ڈاکٹر زمان کے گرد کھڑے کر دیے گئے تھے۔ خرم سلطان تک آنے کا راستہ صاف تھا اگر میں خلافِ معمول پر اُتر رہا ہوتا تو اس راستے اور بہترین موقعے سے ضرور فائدہ اُٹھاتا۔ مجھے یہی تربیت دی گئی تھی کہ ہمیشہ دشمن کے ذہن سے سوچنا چاہیے۔

"سسٹر!" میں نے رُعشتی آواز میں کہا۔ "ٹیبل اُتارو۔ جلدی۔"

نرس نے لپک کر سُوئی نکال لی اور میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "پلیز مجھے اُس کھڑکی تک لے چلو۔" میں اُٹھا تو درد سے چیخ نکل گئی۔ لیکن سینے میں اُترنے والی گولی کا احساس اُس درد سے کہیں زیادہ دردناک تھا جب میں نے قدم اُٹھایا تو یہ احساس باعثِ تقویت ہی تھا کہ میری دونوں ٹانگیں فعال تھیں۔ میں دو الماریوں کے درمیان خلا میں گھس گیا تھا۔ "سنو سسٹر! اگر کوئی اندر آئے تو تم اِدھر نہیں دیکھو گی۔ اُسے باتھ رُوم کا اشارہ دو گی۔" میں نے ڈاکٹر زمان کا ریوالور اُٹھا لیا تھا۔ خوفزدگی میں کسی نے نہ اُٹھایا تھا۔ گو میرا دایاں ہاتھ مفلوج تھا لیکن مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر بھی اعتماد تھا۔ میری چھٹی حس نے جیسے میں آج بھی قدرت مہربان کا عطیہ سمجھتا ہوں۔ مجھے خطرے کے قدموں کی چاپ سے آگاہ کر دیا تھا۔ شاید کوئی دوسرا میرے اس قدم کو حفظِ ماتقدم کا نام دے لیکن میں نے وہ آواز باطنی کانوں سے سُن کر آدمی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایک منٹ سے بھی کم وقت گزرا ہو گا کہ نرس خون کی تھیلی کا منہ بند کر رہی تھی کہ میں نے دروازے کی چرچراہٹ سُنی پھر قدموں کی مدھم مدھم چاپ سُنائی دینے لگی۔ وہ ایک طویل قامت بھرے بدن کا نوجوان تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سیاہ پستول دیکھ کر

"مریض کو کہاں لے جایا گیا ہے؟" اُس کی آواز میں دھمکی تھی۔ نرس کا منہ کھل گیا تھا اور آنکھیں خوف سے اُبل آئی تھیں۔

"جلدی بتاؤ۔" اُس نے پستول لہرایا۔

"ب... باتھ...!" نرس کے حلق سے خرخراہٹ اُبھری۔

وہ ایک قدم باتھ رُوم کی جانب بڑھا پھر پھرتی سے پلٹ کر غرایا۔ "تم دروازہ کھولو گی لڑکی ورنہ میں لمحہ بھر کے لیے تذبذب میں لڑکھڑا گیا تھا۔ وہ کوئی سیکیورٹی کا نمائندہ بھی ہو سکتا تھا لیکن میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ میرا ہاتھ سیدھا ہوا اور کمرے میں صرف اُس نوجوان کی چیخ نما دہاڑ گونجی تھی۔ اُس کا پستول والا ہاتھ ایک جھٹکے سے نیچے ڈھک گیا تھا اور پستول بیڈ پر جا گرا تھا۔

"دوسرا ہاتھ اوپر اُٹھا لو دوست!" میں نے ریوالور اُس کی گردن پر رکھ دیا۔ وہ دیوانگی کی حد تک دلیر تھا یا درد نے اُس کی ہمت مار دی تھی۔ وہ ایک دم پلٹ کر مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ مجھے اُس سے ایسی جرأت اور مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ میں تو نہ جانے کس طرح پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کے نزدیک میں ڈی۔ای۔ٹی بیڈ پر تھا۔ میرا لاابالی جسم ٹوٹا پھوٹا ہوا تھا۔ میرا اپنا خون جس پر مجھے ہمیشہ ناز اور مان رہا تھا، سلیمان کے تہ خانے میں نچوڑ لیا گیا تھا۔ میں اُس شخص کو نہ روک سکا تھا نہ اُس کا مقابلہ کرنے کی سکت تھی پھر بھی میں نے اُس کی ناک پر ٹکر مار کر اُسے ایک قدم پیچھے ہٹنے اور ایک موقع حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن ایک قدم کا فاصلہ اور چند سیکنڈ کا وقفہ مجھے کہاں تک اپنی آڑ میں چھپاتا۔ وہ پھنکارتا ہوا بڑھا تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ گردن کی جانب بڑھتے دیکھے اور بالکل غیر ارادی طور پر دائیں ٹانگ اُٹھ گئی تھی۔ اُس طرح اندھا دیکھ کر نہیں، محض دیرینہ یادداشت کی روشنی میں قدم بڑھاتا ہے۔ ٹانگ کے ساتھ ماضی کی یادیں اور عادتیں تھیں۔

اُس کے حلق سے اُبھرتی پھنکار کراہ میں بدل گئی تھی، وہ ضرب کھا کر کئی قدم لڑکھڑاتا ہوا چلا گیا تھا۔ تب میں نے اُس فوری اور ناگزیر فیصلے پر عمل کر ڈالا جسے میں روک چکا تھا۔ گولی اُس کے چوڑے سینے میں پیوست ہوئی تھی۔ اُس کا پورا بدن کپاس کی سوئی کی مانند تھرک کر گھوم گیا تھا لیکن دوسرے قدم پر ہی منہ کے بل گر گیا تھا۔

"سسٹر!" میں بیڈ پر ہاتھ ٹیک کر ہانپنے لگا۔ "دروازہ لاک کر دیں پلیز۔" ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہو گی کہ دروازہ کھل گیا... انسپکٹر بوکھلائے انداز میں اندر داخل ہوا اور لاش پر نظر پڑتے ہی وہ فٹ میٹ پر جام ہو گیا۔

"یہ... یہ کون ہے؟"

جسے آپ لوگوں کی حماقت سے فائدہ اُٹھانے کا موقع مل گیا تھا۔" میں نے تُرش آواز میں کہا۔

مجھے بات کرنے نے روک لیا تھا اور سپاہی قاتل کو تلاش کر رہے تھے۔ انسپکٹر نے آگے بڑھتے ہوئے اپنی حماقت کا جواز پیش کیا... "یہ ہمارا شبہ تھا۔ اگر وہ داخل ہوتا تو باہر بھی دو پارٹیوں کے درمیان مقابلہ ہوتے۔"

"جاؤ انسپکٹر معلوم کرو دوسری پارٹی کون تھی اگر وہ میرے دوست کی امداد کو آئے تھے تو مجھے اُن سے ہمدردی ہے۔"

"باہر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ بس فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا۔ دونوں پارٹیاں نکل گئی ہیں۔"

کیا وہ لوگ ان حالات میں یہاں سے جا سکتے تھے۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خود سے سوال کیا دشمن کی موجودگی اور میری بے بسی اُن کو معلوم رہی ہوگی پھر وہ مجھے چھوڑ کر کیسے چلے گئے ہیں۔

"وہ ڈاکٹر زمان نہیں تھا۔" انسپکٹر نے بتایا۔ "اُس کے چہرے پر ڈاکٹر زمان کا ماسک آپ تھا۔"

"کیا وہ زندہ ہے؟"

"ہاں اُسے بچانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر مقتول کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "سوری سر۔" انسپکٹر نے گہری سانس لے کر گردن نفی میں ہلائی۔ "یہ مر چکا ہے۔"

دستک کی آواز سُن کر انسپکٹر نے جلدی سے ریوالور نکال لیا اور دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا پھر اُس نے دروازہ بند کردیا۔ اور میری طرف چہرہ موڑ کر بولا۔ "سر۔۔۔! مسٹر ہارون آپ کی خیریت پوچھنے آئے تھے۔"

"اندر آنے دو اُن کو۔۔۔!"

"وہ چلے گئے ہیں سر۔" انسپکٹر نے بتایا۔ "اُن کے ہاتھ خون آلود ہیں۔"

"جاؤ۔" میں حق پھاڑ کر چیخا۔ "اُن سے معلوم کرو کوئی اپنا آدمی زخمی تو نہیں ہوا؟"

انسپکٹر ہونٹ چباتا ہوا نکل گیا تو میں نے اپنا گھومتا ہوا سر ہاتھوں میں لے لیا۔ نرس نے بڑھ کر زخمی سے مجھے سنبھال کر بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ نہ جانے کیوں رو رہی تھی۔ موت کے جبڑے سے نکلنے کی خوشی کا اظہار تھا یا کوئی دوسری وجہ رہی ہوگی۔ عورتیں بھی رونے کے معاملے میں عجیب ہوتی ہیں۔ خوشی سنبھال سکتی ہیں نہ دکھ برداشت کرتی ہیں۔ ہر دو جذبوں کا اظہار آنسوؤں کی زبانی ہی ہوتا ہے۔

انسپکٹر جب واپس آیا تو اُس کے ساتھ ہارون اور رشیدہ تھے۔ ہارون کے ہاتھ ہی نہیں، دونوں آستینیں بھی خون آلود تھیں۔ قمیص کے دامن پر بھی بڑا سا سُرخ داغ تھا چونکہ وہاں لاش تھی۔ اس لیے وہ دونوں ادھم متوجہ ہوگئے تھے۔ رشیدہ نے جھک کر دیکھا پھر پرس سے رومال نکال کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ لاش کا آدھا چہرہ خون کی تہہ میں چھپا ہوا تھا۔ رشیدہ نے خون صاف کیا اور پھر بولی۔

"یہ راجو ہے۔ سلیمان کا پروردہ بھیڑیا۔" وہ اُٹھی اور میرے قریب چلی آئی۔ "تم نے مارا ہے نا خرم؟"

میں نے ہونٹ بھینچ کر سر کو اثباتی جنبش دی۔

"ہارون! دیکھا تم نے میرے شیر کو۔۔۔!" رشیدہ کے لہجے میں فخر کی بلندیاں رچی ہوئی تھیں۔ "میرا بھائی ناقابلِ تسخیر ہے۔"

"اچھا یہ باتیں چھوڑو، مجھے بتاؤ یہ خون کہاں سے لگا لائے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔" ہارون نے بتایا۔ "ماسٹر کی کلائی زخمی ہوئی ہے کسی نے عقب سے فائر کیا تھا۔۔۔ وہ ڈریسنگ روم میں پٹی کروا رہے ہیں۔"

"کتنے تھے؟"

"دو۔" رشیدہ نے جواب دیا۔ "فائرنگ کرتے ہوئے کپاؤنڈ والی پھاند گئے تھے۔ ہم نے تعاقب کیا لیکن مصروف سڑک کی وجہ سے فریدی نے ہمیں روک دیا تھا۔"

"سنو دوستو! اب تم لوگ اُن کی لگاہوں میں آچکے ہو وہ یقیناً دوگرد موجود ہوں گے لہٰذا تم لوگ اب بیک ڈور استعمال کرو گے۔ میں انچارج ڈاکٹر سے کہہ دوں گا ایک ایک کرکے یہاں سے نکلیں اور کوئی پوائنٹ مقرر کریں۔"

"ہم تو اُن سے نمٹ لیں گے۔" اور رشیدہ بولی۔ "لیکن تمہاری طرف سے میں مطمئن نہیں ہوں اگر وہ ڈاکٹر کے رُوپ میں داخل ہو سکتے ہیں تو کوئی نرس کی یونیفارم میں بھی یہاں آسکتی ہے۔ میں اپنے آدمیوں کا یہ ہرگز نقصان نہیں چاہتی ہوں۔"

"اگر پھر دھوکا کرو رشیدہ جان۔" میں نے کچلیاں دباتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پوری قوت سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ پہلے محض چھپ چھپا رہی تھی، اب اُنھوں نے اعلانِ جنگ کردیا ہے۔ تمہارے نازک کندھوں پر گراں قدر ذمے داری ڈال دی گئی ہے کڑی آزمائش سے تمہیں گزرنا ہوگا۔ ہر قدم باہمی مشورے سے اُٹھانا۔ تم بعض اوقات جذباتی ہو جاتی ہو ایک اچھے کمانڈر کو ٹھنڈے دماغ سے فیصلہ کرنا چاہیے۔ تمہارے وفادار جانثار اور امین ترین لوگ ہیں۔"

"میں جب تک تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہوں گی کچھ بھی نہ کرسکوں گی۔ میرا دھیان تمہاری جانب لگا رہے گا۔ یہ پیغام سے کسی کو بھی کوئی روک ٹوک نہیں سکتا۔ ہمارا تعاقب شاطر شخص سے ہی نہیں بلکہ ایک بااثر سیاست داں سے ہے۔ اُسے اگر ضرورت محسوس ہوئی تو وہ یہاں اپنی پسند کا عملہ تعینات کردے گا۔ لہٰذا مجھے یہاں رہنے کی اجازت دو اگر نہیں تو میں ہارون سے درخواست کروں گی۔"

"ٹھیک ہے مادام! میں یہاں رہوں گا۔" ہارون نے کہا۔ "آپ ماسٹر کے ساتھ فی الحال اپنے آدمیوں کو محفوظ رکھیں۔"

"اگر تم لوگ جذباتی نہ کردو گے تو میں چارج اپنے پاس ہی رکھوں گی۔۔۔۔۔۔ اور پھر دیکھوں گا کون حکم عدولی کرتا ہے۔" میں نے اشارے سے انسپکٹر کو بلایا۔ اُس نے ہتھکڑیاں جوڑیں تو انسپکٹر لاش

یہاں سے ہٹا دو اور بڑے ڈاکٹر سے کہو کہ یہ فون یہاں منگوا لو۔ بیگم! تم صرف اب صبر ہو۔ جاؤ اور ماسٹر کو حفاظت گھر لے جاؤ۔۔۔ ہارون! تم مجھ سے فون پر رابطہ قائم رکھو گے میں یہاں سے بھی تم پر نظر رکھ سکتا ہوں۔"

"بہتر سر۔" ہارون نے گردن کو خم دے کر کہا اور مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہنے لگا۔ "آیئے نہیں رشیدہ۔۔۔" رشیدہ نے گہری سانس لی اور ہارون کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

ڈاکٹر درانی نے حالات کی سنگینی اور اپنی ذمے داریوں کے پیشِ نظر میرے کہنے کے گرد دو پہرہ گنوا دیا تھا۔ اب کھڑکیوں کے سامنے لوہے کی سلاخیں اور الماریاں رکھ دی گئی تھیں اور ایک مسلح انسپکٹر میرے بیڈ پر تعینات تھا۔ نائٹ میل نرس کی جگہ دو میل نرسیں مقرر کردیے گئے تھے اور ساتھ والے کمرے میں تین ڈاکٹروں کو چوکس کردیا گیا تھا۔

رات نو بجے وزیر داخلہ نے فون پر خیریت پوچھی تھی۔ اُنھوں نے خونی ہنگامے کے بارے میں کوئی بات نہ کی تھی۔ البتہ ڈی۔ آئی۔ جی دس سے ساڑھے دس بجے تک میرے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

"اب تم کوئی راز نہیں رہے خرم سلطان!" اُنھوں نے کہا۔ "حالانکہ ہمارا عہدہ راز تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گا، تم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو لوگا۔ ہر قدم باہمی مشورے سے اُٹھانا۔ تم بعض اوقات جذباتی ہو جاتی ہو ایک اچھے کمانڈر کو ٹھنڈے دماغ سے فیصلہ کرنا چاہیے۔ تمہارے وفادار جانثار اور امین ترین لوگ ہیں۔"

"میں جب تک تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہوں گی کچھ بھی نہ کرسکوں گی۔ میرا دھیان تمہاری جانب لگا رہے گا۔ یہ پیغام سے کسی کو بھی کوئی روک ٹوک نہیں سکتا۔ ہمارا تعاقب شاطر شخص سے ہی نہیں بلکہ ایک بااثر سیاست داں سے ہے۔ اُسے اگر ضرورت محسوس ہوئی تو وہ یہاں اپنی پسند کا عملہ تعینات کردے گا۔ لہٰذا مجھے یہاں رہنے کی اجازت دو اگر نہیں تو میں ہارون سے درخواست کروں گی۔"

"ٹھیک ہے مادام! میں یہاں رہوں گا۔" ہارون نے کہا۔ "آپ ماسٹر کے ساتھ فی الحال اپنے آدمیوں کو محفوظ رکھیں۔"

"اگر تم لوگ جذباتی نہ کردو گے تو میں چارج اپنے پاس ہی رکھوں گی۔۔۔۔۔۔ اور پھر دیکھوں گا کون حکم عدولی کرتا ہے۔" میں نے اشارے سے انسپکٹر کو بلایا۔ اُس نے ہتھکڑیاں جوڑیں تو انسپکٹر لاش ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اپنا اپنا طریقہ کار اور نظریہ ہوتا ہے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں گا۔ اب بھی پولیس کو اپنی صف سے باہر رکھو گے؟"

"ضرورت کی بات ہے سر۔ جہاں ضرورت ہوگی وہاں پولیس خود صف میں شامل ہو جائے گی جیسے آج ضرورت نے پولیس کو شامل کرلیا تھا میں نہیں بلاؤں گا۔"

"اب آرام کرو۔ سکون کی نیند سوؤ۔ ہم نے پورے اسپتال کو نگرانی میں لے رکھا ہے۔ کوئی نیا مریض بھی۔۔۔ پتہ تال کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔"

"ایک منٹ سر۔" میں نے انسپکٹر کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ اُٹھایا۔ "انسپکٹر! آپ دو منٹ باہر جائیں۔" انسپکٹر نے ایڑیاں بجا کر ٹرن لیا اور باہر نکل گیا۔ "سر آپ با اعتماد آنکھیں ٹک نواز پر لگا دیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو انڈر گراؤنڈ کردیا ہے۔ ٹک نیز سر ٹکرانی رہنا چاہیے۔ اُس کی معلومات کی رپورٹ آپ کی دسترس سے مجھے بھی چاہیے۔"

"گویہ کام ذاتی طور پر میرے لیے خطرناک بھی ہوسکتا ہے لیکن میں قومی اور ٹیک مفادات کی خاطر اپنی ذات کو پس پشت ڈال دوں گا۔ تمہیں مکمل طور پر آگاہ رکھا جائے گا۔"

"شکریہ سر۔" میں نے ممنون آواز میں جواب دیا۔ "اس طرح ٹک کو ٹریس کرنا نہیں پڑے گا۔ میں یہاں سے فارغ ہو کر تلاش میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔"

ساتویں دن مجھے ایک بند کمرہ کار میں رات دس بجے اسپتال سے رخصت کیا گیا۔ میں نے ڈاکٹر درانی اور وزیر داخلہ کو فرداً فرداً درخواست کی تھی کیونکہ ٹک نیز کی نقل و حرکت کی جو رپورٹیں مجھے مل رہی تھیں اُس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ہمارے خلاف کوئی فیصلہ کن کارروائی کرنا چاہتا ہے یا پھر جرم کے تمام نقش پامٹا رہا تھا۔ اور یہ دونوں صورتیں۔۔۔ تشویش ناک تھیں۔

جب آدھے گھنٹے بعد گاڑی رکی اور انسپکٹر نے مجھ سے اُترنے کی درخواست کی تو مجھے پتا چلا کہ میں اپنے ساتھیوں کے ٹھکانے پر نہیں ہوں۔ وہ کوئی سنگ کپاؤنڈ کا پرانا بنگلہ تھا جسے قدآور درختوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پورچ میں تین مرسیڈیز کاریں پارک تھیں۔

"کشریف نے چلیے مسٹر خرم۔" ایک شخص اچانک سامنے آگیا۔ "مسٹر صاحب آپ کے منتظر ہیں۔" میں کندھے اُچکا کر چل پڑا۔ پہلے ہی کمرے میں وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کمرا ڈرائنگ روم نہیں بلکہ آفس تھا۔ بڑی میز کے پیچھے وزیر داخلہ صاحب ریوالونگ چیئر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر براجمان تھے۔ دیوار کے ساتھ کرسیوں کی قطار تھی۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دونوں نوجوان میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے سلام کیا اور سیدھا وزیر صاحب کی جانب بڑھ گیا۔ وہ آگے جھکے اور میرا ہاتھ تھام کر تھپتھپانے لگے۔

"دوستوں سے بھی مل لو۔" میں نے پلٹ کر دیکھا، دونوں نوجوان مؤدب کھڑے تھے۔ "بلال احمد۔" ایک نوجوان نے مصافحہ کرتے ہوئے بتایا۔ "ریاض۔" دوسرا بولا۔

"بیٹھ جاؤ محترم۔" وزیر صاحب نے کہا۔ "ان دونوں کا تعلق... فیڈرل سیکیورٹی سے ہے۔" میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ کوئی جواب نہیں سوجھا تھا اگر وہ موجود نہ ہوتے تو میں جواب دیتا میں پوچھتا کہ معاہدے کی رُو سے گورنمنٹ کسی کو گروپ میں تعینات کرنے کی مجاز نہ تھی۔ گروپ سے کسی کو خارج کرنا اور نئے لوگوں کو شامل کرنا گروپ چیف کی صوابدید پر تھا اگر یہ روایت چل پڑتی تو اس اسپیشل گروپ کی حالت بھی معاشرے کے رنگ میں سیاہ ہو جاتی۔

"میں تمہارے جذبات اور خیالات محسوس کر رہا ہوں۔" وزیر داخلہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولے۔ "یہ تعینات نہیں ہوئے بلکہ انٹرویو اور سلیکشن کے لیے کال کیے گئے ہیں۔ بلال احمد مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ رکھتا ہے اور ریاض حال ہی میں کمانڈو فورس سے حاصل کیا گیا ہے سب سے بڑھ کر میرے نزدیک دونوں قابلِ بھروسہ ہیں۔"

"اگر آپ انتخاب کر چکے ہیں اور مطمئن ہیں تو میں معزز دوستوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

"نہیں برخوردار!" وزیر داخلہ ہاتھ لہرا کر بولے۔ "میں تجویز کنندہ ہوں، فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" میں نے دونوں کی جانب دیکھا۔ "یہ فیصلہ آپ کی تجویز کی روشنی میں بعد میں کیا جائے گا فی الحال میں صرف آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ لوگ باہر انتظار کریں۔" وہ بولے اور وہ دونوں خاموشی سے باہر نکل گئے۔

"پہلی بات یہ معلوم کرنا چاہوں گا جناب عالی۔" میں نے آواز میں حلاوت شامل کرتے ہوئے کہا تاکہ میرے اندر کی کڑواہٹ محسوس نہ کی جا سکے۔ "جو کچھ اسپتال میں ہوا اس کی تفتیش اگر ہوئی تو کارروائی کیا کی گئی ہے۔"

وزیر صاحب بال پنس سے ٹیبل گلاس بجاتے رہے۔ میں نے یہی سوال ڈی آئی جی صاحب سے بھی کیا تھا لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"مشکل سوال کا جواب تو میں بھی نہ دے سکوں گا۔" وہ افسردہ آواز میں بولے۔ "ہمارے سامنے اس ہنگامے کے دو مجرم آئے ایک زخمی اور دوسرا مُردہ... ہم نے رائج ہر حربہ استعمال کر لیا ہے لیکن وہ شخص دانتوں پر دانت جمائے خاموش ہے۔ اس کی زبان سے صرف ایک نام حاصل کیا گیا ہے، وہ نام ہے مقتول سلیمان کا۔ اب تم بتاؤ، ہم ایسے شخص کے خلاف کیا کارروائی کریں، جو بڑی عدالت میں پیش ہو چکا ہے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ ایک مُردہ چیف کے گُرگے اس قدر وفادار ہو سکتے ہیں؟"

"تمہارا کیا خیال ہے اب اُن کی پُشت پر کون ہے؟"

"کیا آپ نہیں جانتے سر؟" میں نے گستاخ نگاہیں اُن کی نگاہوں میں ڈال کر پوچھا۔

"جانتا ہوں۔" انھوں نے گہری سانس لی۔ "لیکن میرے ساتھ تو ایک نہیں کئی مجبوریوں کی جونکیں چمٹی ہوئی ہیں۔"

"پھر وہ نام کس کی زبان پر آئے گا محترم؟" میرے لہجے میں باپ تلخی اُتر آئی تھی۔ یہ سوال وہ شخص کر رہا تھا جس کے ذمے ملک میں امن و امان قائم رکھنے کا کام تھا۔

"وہ تم ہو محترم سلطان!" وزیر داخلہ پُرزور لہجے میں بولے۔ "اس لیے کہ تم سیاست اور حکومت کی دیواروں کے قیدی نہیں ہو تم ذاتی مفادات سے بھی بالاتر ہو۔ تمہارا نام اس کے ریکارڈ میں بحیثیت بزنس مین لایا گیا ہے۔ اس لیے تمہارے درمیان لڑی جانے والی جنگ کا سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں جوڑا جائے گا۔"

"کیا آپ جانتے تھے سر کہ وہ منشیات اور دیگر غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہے؟"

"دُکھ اور ندامت کے ساتھ بیٹے۔" اُن کی نگاہیں جُھک گئیں۔

"بلکہ میرا تعلق اُسی پارٹی سے رہا ہے جس کا وہ نمائندہ تھا۔" میں نے اپنی سیاسی زندگی میں سیاسی وفاداری کبھی نہیں بدلی تھی لیکن شخصی تعمیر کی آواز پر میں نے کوئی نہ کوئی جواز بنا کر اُس کی پارٹی چھوڑ دی تھی میں نے صرف خود کو مطمئن کیا تھا، اُس کے خلاف کچھ نہ کر سکا کیونکہ اُس کی پُشت پر ایک طاقت ور سیاسی پارٹی ہے۔ اُس کے اشاروں پر بہت کچھ ہوتا ہے اس لیے بھی وہ قانون کی دسترس سے محفوظ رہتا ہے کہ وہ تمام ایسے کام جدید طریقوں پر کرتا ہے جس طرح خلائی جہاز فضا میں محوِ پرواز ہوتا اور ایک شخص تجربہ گاہ میں بیٹھا انگلی کے اشاروں سے اُسے کنٹرول کرتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ گورنمنٹ اس جنگ میں غیر جانب دار

رہے گی؟"

"ہاں بظاہر۔۔۔!"

"تو پھر میں رپورٹ دینے کی ذمے داری سے بھی۔۔۔!"

"نہیں عزیزم!" انھوں نے میری بات کاٹ دی۔ "میں نے بظاہر کہا ہے، پوشیدہ طور پر گورنمنٹ کی تمام ایجنسیاں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ گورنمنٹ کسی فرد کے خلاف نہیں بلکہ مجرمانہ کارروائیوں کا سدِباب چاہتی ہے۔ صدرِ محترم ذاتی طور پر وطن کی سرزمین کو منشیات کے زہر سے پاک کرنے کے آرزومند ہیں کیونکہ نہ صرف قومی سطح پر یہ زہر نقصان دہ ہے بلکہ بین الاقوامی طور پر بھی ہمارے ملک کو منشیات کا اڈہ کہا جا رہا ہے۔ ہم اپنی پیشانی سے یہ بدبودار دھبہ دھونا چاہتے ہیں۔"

"میں کوشش کروں گا سر کہ اس دھبے کو ہمیشہ کے لیے صاف کر دیا جائے۔"

"بیگن نے جدید آلات اور آرمز کی ڈیمانڈ کی تھی۔" انھوں نے بریف کیس کھولتے ہوئے بتایا۔ "تمہاری آمد سے قبل... لیکن ان لوگوں کی پیش رفت غیر تسلی بخش تھی۔ اس لیے اُن کی طلب کٹھائی میں ڈال دی گئی تھی۔ اب میں نے تمام مطلوبہ سامان اس عمارت میں پہنچا دیا ہے۔ اس عمارت کو تم اپنے خفیہ ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرو گے۔ باہر ہیوی کنسٹرکشن کمپنی کا سائن بورڈ لگا دیا گیا ہے۔" انھوں نے تین چابیاں بریف کیس سے نکال کر میز پر رکھ دیں۔ "اسلام آباد میں تمہارے لیے ایک کوٹھی حاصل کر کے ڈیکوریٹ کر دی گئی ہے۔ جہاں تم ایک ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے رہو گے۔ یہ سب کچھ صدرِ محترم کی ہدایات پر کیا گیا ہے۔"

"میں اُن کا شکر گزار ہوں سر۔۔۔ لیکن مجھے یہ آسائشیں شاید راس نہ آئیں گی۔"

"نہیں بیٹے۔" وہ شفقت آمیز آواز میں بولے۔ "کام اور آرام دونوں لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ صرف کام بھی انسان سے تنگدلی اور نرمی نچوڑ لیتا ہے۔ انسان گھر سے محبت اسی لیے کرتا ہے کہ کام کے بعد اسے ایک گوشۂ سکون کی ضرورت ہوتی ہے اور سکون صرف گھر کی چھت کے نیچے ہی ملتا ہے۔ میں مشورہ دوں گا کہ آج سے تم سلطان زہری زندگی بسر کرے۔"

"کیا یہ دونوں بھی میرے ساتھ رہیں گے؟"

"تم چاہو تو۔۔۔ ورنہ کوئی مجبوری نہیں۔"

"میں ان کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کروں گا۔"

فیصلے میں ایک بات تو مدِ نظر رکھنا بلال احمد کا نام ملک نواز کی گڈ بک میں ہے۔ وہ اسے اپنا آدمی سمجھتا ہے۔"

"یہ انکشاف بے حد دل خوش کُن ہے جناب! یہ خوبی اگر گدھے میں بھی ہوتی تو میں اُسے جُھک کر سلام کرتا۔"

میری بات سُن کر وزیر داخلہ بے ساختہ ہنسنے لگے۔ "بلال احمد بلڈوزر کی طرح میرے راستے کی رکاوٹیں صاف کرے گا اور میرا سفر آسان ہو گا۔ ایسا کارآمد شخص دینے کا بہت بہت شکریہ۔"

"اب تو تمہارا ذہن میری طرف سے صاف ہو جانا چاہیے۔"

"بے شک سر!" میں نے نگاہیں جُھکا لیں۔ "خیر! اب میں اپنے ہیڈ کوارٹر کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"آؤ، دیکھ لو اور اگر کسی چیز کی کمی محسوس کرو تو بتا دو۔" وہ اُٹھے اور بغلی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

اُس کمرے میں صرف ایک میز اور کرسی تھی۔ میز پر ایک ٹائپ رائٹر، وائرلیس سیٹ اور کچھ فائل پڑے ہوئے تھے۔ "یہ تمہارے سیکرٹری کا آفس ہے۔" وزیر صاحب نے بتایا۔ "جو کبھی یہاں نہیں آئے گا۔" انھوں نے دراز سے ریموٹ کنٹرول انسٹرومنٹ نکال کر بٹن دبایا۔ دیوار دائیں جانب سرکنے لگی۔ جیسے ہی سوراخ پیدا ہوا تو انھوں نے داد طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھا حالانکہ مجھے حیرت نہ ہوئی تھی لیکن آنکھیں اور چہرہ حیرت زدہ بنانا پڑا تھا۔ اب اپنا خفیہ ہیڈ کوارٹر دیکھ لو۔" دروازے سے اندر داخل ہو کر انھوں نے سوئچ بورڈ کا ایک بٹن آن کیا تب واقعی مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ شیشے کی دو بڑی الماریوں کے اندر دنیا کا جدید ترین اسلحہ سجا ہوا تھا۔ ہر سائز اور ساخت کے ریوالور، سٹین گنیں، رائفلیں، دستی اسموکنگ اور فائر بم، ہر خانے پر چٹیں لگی تھیں۔ میں نے ہر ایک سُوئیاں فائر کرنے والا چھوٹا سا ریوالور اُٹھا لیا۔ ساتھ ہی سُوئیوں کا پیکٹ تھا۔

میں دل ہی دل میں بیگن کی ذہانت کو سراہنے لگا تھا جس نے ضرورت کی ہر چیز کا خیال رکھا تھا اور وزیر صاحب کی کارروائی پر افسوس ہوا تھا جنھوں نے بیگن کی ڈیمانڈ کو کٹھائی میں ڈالے رکھا تھا یعنی وہ پہلے سپاہی کی کارکردگی دیکھنا چاہتے تھے مگر یہ بھول گئے تھے، نہتا سپاہی صرف اپنا سر ہی پیٹ سکتا ہے۔ بیگن کی ناکامی میں اس کا قصور نہ تھا۔ جب اُسے گولی ہی نہ دی گئی تھی تو وہ دشمن کو کیا دیتا۔ گو میں نے بھی بے سروسامانی کی حالت میں دشمن پر حملہ کر دیا تھا لیکن میرے تجربے اور بیگن کے تجربے میں فرق تھا۔ وہ گہرا اور پُرسکون سمندر تھا اور میں پہاڑی راستوں کا پُرشور دریا تھا۔ کوئی بھی تجربہ بے کار کا کباڑ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رسد کی عدم موجودگی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پہلے گوئے بارود کا انتظام کرتا ہے پھر حملے کا حکم دیتا ہے۔ میں نے تو نا تجربہ کاری اور اپنی سہل فطرت سے مجبور ہو کر خود کشی کا راستہ اختیار کیا تھا میرے اندر خود اعتمادی تھی۔ میں اس محاذ پر سرکاری ایجنسی کی شراکت اور داخلت کا قائل نہ تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ بیگن اپنے گروپ سمیت ایک برس سے بھیڑیوں کی نگاہوں سے اوجھل رہا تھا اور میری عاجلانہ اور احمقانہ روش نے مجھے کچھ ہی عرصے میں بے نقاب کر دیا تھا۔ بیگن احتیاط کے مورچے میں دبک کر دشمن کی صرف نقل و حرکت دیکھتا رہا تھا جب کہ میں نے میدان میں اتر کر دشمن کو نہ صرف للکارا تھا بلکہ وار کرتا ہوا لوٹ پڑا تھا۔

"کوئی ضرورت کی شے رہ تو نہیں گئی محترم سلطان؟" وزیر صاحب نے دریافت کیا۔

"میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا جناب! یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"

"چلیں اب؟" انھوں نے پوچھا اور میں سر کو ہلاتا ہوا چل پڑا تھا۔ بلال احمد اور ریاض برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کے انداز سے بیقراری ہویدا تھی۔ میرے سرد اور مشک آمیز انداز گفتگو نے یقیناً انھیں متاثر کیا ہوگا۔ سرکاری مہمان سے ہی مجھے ان کے آفیشل قد کا اندازہ لگا لینا چاہیے تھا۔ جو شخص ملک نواز کے نزدیک بااہمیت تھا، وہ معمولی کارندہ نہیں ہو سکتا تھا پھر فائٹر اور کمانڈوز ویسے بھی اکھڑ مزاج ہوتے ہیں۔

میں نے چہرے پر ملائمت اور دوستانہ مسکراہٹ کا ماسک چڑھایا اور خود ان کی جانب بڑھا۔ اپنے سابقہ نازوانہ سلوک کی تلافی مشکل نہ تھی۔ بلال احمد کی آنکھوں میں سرخ ڈوریاں اتری ہوئی تھیں البتہ ریاض نے جواباً مسکراہٹ دی تھی۔ میں نے بلال کے چوڑے شانے پر دوستانہ دستک دی۔ اس کی چنگاڑتی سانس میں جذب ہو گئی تھی۔

"میں محسوس کر رہا ہوں میرے دوست! اپنے ہی قدم پر مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ میں نے دوسرا ہاتھ ریاض کی طرف بڑھایا "میں جن حالات سے گزرتا ہوا آپ کے سامنے آیا ہوں آپ....."

"ہم جانتے ہیں سر....." ریاض نے میری بات کاٹ دی۔ "ہم خفا نہیں بلکہ اپنی نااہلی کی وجہ سے مایوس ضرور ہوئے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں میرے دوستو!" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "مایوس تو میں تھا لیکن آپ آن ملے ہیں اب میں خود کو مکمل اور چاق و چوبند محسوس کرنے لگا ہوں۔ آپ نے میرے حوصلے کو نئی قوت اور روشنی دی ہے۔ ہم کل کسی وقت میٹنگ کر لیتے آپ کو دوسرے ساتھیوں سے ملایا جائے گا۔ ہم مل کر نئے سفر کی تیاری کریں گے اور منزل کو یقینی بنانے کے لیے نئے راستے بنائیں گے۔"

"شکریہ سر!" بلال احمد کا تناؤ ٹوٹ گیا۔ "ہم اطلاع ملتے ہی حاضر ہو جائیں گے۔"

"کل دوپہر یہاں ہی میٹنگ ہوگی۔" میں نے بتایا۔ "یہ ہمارا خفیہ ہیڈ کوارٹر ہے۔" پھر میں نے دونوں سے گرم جوشی اور محبت سے ہاتھ ملایا اور وزیر داخلہ صاحب کی جانب چل پڑا۔ ان کے قریب وہ لوگ کھڑے تھے، جو مجھے اسپتال سے لائے تھے۔ ان کی موجودگی مانع تھی۔ اس لیے خاموشی سے پورچ تک گئے۔ وزیر صاحب نے ہاتھ ملایا اور اپنی کار میں بیٹھ گئے۔

"میں تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔ ڈرائیور نے میرے لیے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ میں نے کہا۔ "تمہیں راستہ بتانا پڑے گا۔"

"آپ ایڈریس بتائیں سر!" ایکسکٹر نے مؤدب آواز میں کہا...

"آپ کو پیچھے بیٹھنا پڑے گا۔" میں نے اسے راستہ سمجھایا اور اندر بیٹھ گیا۔ پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے گیٹ پر گاڑی اور ایکسکٹر کو خدا حافظ کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ رشیدہ کو اس وقت جگانا مناسب ہوگا یا ڈرائنگ روم کھول کر سو جاؤں۔

ان کی بے آرامی کا بھی خیال تھا۔ صرف رشیدہ ہی نہ جاگتی بلکہ ساتھ ثمینہ سسٹر بھی جاگ اٹھتیں۔ وہ تو خدا سلام تک ہی محدود رہتیں مگر رشیدہ کی زبان کھل جاتی تو صبح تک جواب اور وضاحتیں کرنا پڑتیں۔ ایک ہفتے کی جدائی اور میری لگائی ہوئی پابندی ایسی نہ تھی کہ وہ لڑکی آسانی سے مطمئن ہو جاتی۔

سات دنوں میں صرف بیگن ہی فون پر میری خیریت دریافت کرتا رہا تھا۔ رشیدہ نے ایک بار فون کیا تھا مگر میں نے میل نرس کے ذریعے اپنی خیریت بتا دی تھی۔ مجھے یقین تھا اسے میری سرد مہری نے دکھ دیا ہوگا لیکن میں ان لوگوں کو دشمنوں کی نگاہوں اور ہاتھوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ میرے گرد و پیش دشمن تھے لیکن وہ لوگ غیر محفوظ تھے۔

میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ آزمایا، غیر متوقع طور پر پٹ ذرا سے دباؤ سے کھل گئے تھے۔ فٹ میٹ سے پاؤں پونچھا اور عین اسی وقت کمرا روشن ہو گیا۔ روشنی کمرے کی برقی رو کی نہ تھی بلکہ دائیں بائیں دو ٹارچیں روشن ہوئی تھیں اور سامنے ایک شخص ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا ہوا تھا۔

شکاری

جب درندے کو چاروں طرف سے گھیر لیا جاتا ہے تو درندہ حواس باختہ ہو جاتا ہے اور حملہ کر دیتا ہے مگر انسان اپنی فطرت میں کتنا ہی خونخوار کیوں نہ ہو، ایسے لمحات میں کبھی بپھرتا اور کبھی حملے سے نکتا ہے۔ میں اگر عقل کا دامن چھوڑ دیتا تو نتیجہ میرے خلاف ہی ہوتا۔ وہ چار تھے اور چاروں آنے والے لمحے کے لیے تیار تھے جب کہ میں تنہا تھا اور بے خبر تھا۔

حساس آنکھوں نے عقب میں کھڑے شخص کو بھی محسوس کر لیا تھا۔ اسی نے اندر آ کر سوئچ آن کیا تھا۔ کمرے میں دودھیا روشنی پھیل گئی تو میں نے دیکھا، تین ریوالور مجھے گھور رہے تھے۔

"مجھے احساس ہے محترم سلطان!" کرسی پر بیٹھے شخص نے ہونٹوں کو جنبش دی۔ اس کا لہجہ کافی نرم تھا۔ "میری جگہ تمہیں ہونا چاہیے تھا۔ اتفاق نے یہ الٹ پھیر کر دیا ہے۔ میرا بال کو مہمان خوش آمدید کہتے ہیں۔ میں تمہیں دل کی گہرائیوں اور خلوص دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ دراصل ہمیں مغالطہ ہوا ہے۔ ہمارے ذرائع نے بتایا تھا کہ محترم سلطان اسپتال سے روانہ ہو چکا ہے ہم اسی اندازے سے یہاں آئے تھے کہ تم میزبان ہو گے اور ہم مہمان۔ لیکن تمہیں پکڑ دھکڑ کر یہاں پہنچایا گیا ہے۔" وہ اچھل کر اٹھا اور بانہیں پھیلا کر سیدھا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"سوری!" اس نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں گھات میں بیٹھے دشمن کو دوست کا درجہ کبھی نہیں دیتا اور نہ ہی مہمان اچھے دروازے سے آیا کرتے ہیں۔"

"میں وضاحت اور معذرت کر چکا ہوں چوہدری!" وہ پیچھے ہٹ گیا۔ "بہرحال فی الحال دوست نہ سہی، چوہدری ان لوگ تو ہیں۔" وہ اٹھے قدموں چلتا ہوا پھر بیٹھ گیا۔

سیٹلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے چونک کر ٹیلی فون سیٹ کی جانب دیکھا۔

"یقیناً تمہارے لیے کال ہوگی۔" اس نے ریسیور اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ "تم انجان نہیں ہو۔ تمہیں جو انداز اختیار کرنا ہے، میں نہیں بتاؤں گا۔ میں کہہ چکا ہوں فی الحال ہم دشمن نہیں ہیں۔ اگر یہ کسی قیمتے تک ہم دوستانہ ماحول برقرار رکھنا پسند کریں گے۔"

جب میں نے ریسیور پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے ماؤتھ پیس سے ہتھیلی ہٹا لی۔

"یس... ہیلو کون ہے؟"

"گڈ نائٹ چیف!" بیگن کی مؤدب آواز سنائی دی۔ "میں اسپتال سے بول رہا ہوں۔ میرے ساتھ مسٹر... ہیں۔"

"وہ آپ کا کارندہ تھا۔" میں نے بتایا۔ "ابھی پہنچا ہوں۔"

"جیسے چند منٹ دیر سے چیف؟"

"ہاں... اسٹوڈنٹ آپ کی صاحبزادی کہاں ہیں؟"

"کون رشیدہ؟" بیگن کے حلق سے کھرکھراتی آواز ابھری۔ "کیا وہاں نہیں ہے؟"

"نہیں ہے۔" اوئے! مسٹر باتیں بالکل غلط ہوں گی۔ وہ ہیلو ہیلو کر رہا تھا اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اگر اس میں ایک اچھے اسٹر کی سمجھ تھی تو اسے میرا اشارہ سمجھ لینا چاہیے تھا۔

"کون تھا؟"

"میرا ایک شریک کار۔" میں نے جواب دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ "اب اپنے آنے کا مقصد بیان کرو اور رخصت ہو جاؤ۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"تمہیں ملک نواز نے بلایا ہے۔"

"کون ملک نواز؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں یہ نام پہلی بار سن رہا تھا۔

"نہیں عزیزم!" وہ مسکرانے لگا۔ "یہ نام تم سیٹھ سلیمان کی زبان سے سن چکے ہو۔"

"اچھا وہ ملک نواز صاحب!" میں نے کہا۔ "لیکن نہ تو میں پاکستان ہوں اور نہ ہی میرا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق ہے پھر ملک صاحب مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے مقصد نہیں بتایا گیا۔ چوہدری اور ہم جیسے لوگ صرف سنتے ہیں اور عمل کرنے دوڑ پڑتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے مجھے ایڈریس دے جاؤ۔ میں آ جاؤں گا۔"

"نہیں برخوردار!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "تمہیں ساتھ چلنا ہوگا۔ میں دوستی کا یہ معیار برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"کیا لباس تبدیل کرنے کی اجازت دو گے؟"

"سوری!" اس نے فیصلہ کن انداز میں گردن ہلائی۔ "اس سے قبل کہ تم اشارہ کرو گے، میرا آدمی تمہارے حال متاثر کر دے گا۔ میں نہیں چاہتا ہوگا۔"

"وہ یہاں نہیں آئے گا۔" میں نے جیب کی طرف ہاتھ لے جاتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" وہ چیخا اور اس نے جھپٹ کر میرا ہاتھ روک دیا۔ "میرا مشورہ مان لو ملک صاحب سے ایک بار مل لو۔ وہ بہت اہم شخصیت ہیں۔ شناسائی سے تم یقیناً اس کو پسند کرو گے۔" اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ تینوں پھرتی سے بڑھے اور تین ریوالور میرے جسم کے ساتھ لگ گئے۔

بے بسی اور خطرناک سچویشن اپنی جگہ تھی لیکن فطرتاً میں ہاتھ پاؤں ڈالنے کا قائل کبھی نہ رہا تھا، جس طرح ہر تہ خانے اور سُرنگ کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوتا ہے، اسی طرح ہر مشکل کا حل بھی اس کی دیواروں میں ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ پوشیدہ حل تلاش کیا تھا مگر ہاتھ پاؤں ڈالنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی مجھے بالآخر ملک نواز تک جانا تھا خود جانا یا کسی ساتھی کو داخل کرنا جب وقت نے مجھے ہی اشارہ کر دیا تھا اور حالات نے راستہ دکھا دیا تھا تو میں اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا ملک نواز نے اپنا ارادہ بدل لیا ہوگا۔ اُس نے جب میرے لیے موت کا پروانہ جاری کیا ہوگا تو اُسے میری ذات کی اہمیت کا احساس نہ رہا ہوگا۔ اُس نے سیٹھ سلیمان کی زبانی سُنا ہوگا کہ کوئی نوجوان حرکتیاں کرتا پھر رہا ہے تو سلیمان کی سفارش پر اُس نے پر ولنے پر دستخط کر دیے ہوں گے۔ پھر پے در پے ناکامیوں نے اُسے چونکا دیا ہوگا۔ اُس نے سلیمان کی تباہی اور اپنے گرگوں کی ہلاکت کے بعد از سرِ نو اپنے ذہن سے خرم سلطان کے بارے میں تجزیہ کیا ہوگا اگر اُسے اپنے سابقہ فیصلے پر ہی عمل کروانا ہوتا تو چار آدمی بھیجنے کے لیے نہ بھیجتا ایک ہی قاتل اندھیرے میں انتظار کر سکتا تھا۔

"چلیے!" میں نے بے پروائی سے کہا "میں بھی ہنگامہ مول لینا نہیں چاہتا کروں گا۔"

"شکریہ چوہدری" اُس نے میری پُشت پر تھپکی دی "تم طاقت کے ساتھ ذہانت بھی رکھتے ہو۔ یہ خوبی ہماری دُنیا کے بہت کم لوگوں کے حصّے میں آتی ہے۔"

جب تک میں نے ملک نواز سے ملنے کا فیصلہ نہ کیا تھا میں جیسے بہانوں سے وقت حاصل کر رہا تھا کہ ہیگن اور ہارون آنے والے تھے لیکن جب میں باہر نکلا تو میرے دل سے یہی دُعا اُٹھ رہی تھی کہ وہ نہ آئیں۔ میں واقعی کوئی ہنگامہ کھڑا کرنے کے موڈ میں نہ تھا اگر وہ آجاتے تو مُڈبھیڑ ناگزیر ہو جاتا اور جنگ کی صُورت میں نقصان کسی پارٹی کا بھی ہو سکتا تھا۔

اُن کی سیاہ وین کوٹھی سے پانچ چھ سو گز دُور کھڑی تھی میں پچھلی سیٹ پر درمیان میں بٹھایا گیا تھا۔ صولاً یہ بات غلط تھی کیونکہ دائیں بائیں والے میری زد میں تھے اور اگلی سیٹوں والے پُشت سامنے رکھتے تھے اگر میں ملک نواز کو ایک اور حیرت ناک چوٹ دینا چاہتا تو زہریلی سوئیاں استعمال کر سکتا تھا مگر میں خود ملک نواز سے ملنے چاہتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھتا۔

اسلام آباد ایف آٹھ کی کوٹھی کے روشن پورچ میں ایک مرسیڈیز اور تین کروسا کھڑی تھیں۔ جب مجھے اُتارا گیا تو ایک شخص نے پارٹی لیڈر سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہولے ہولے سہلانے لگا۔

"ملک صاحب تک جانے کے لیے تم تنہا سفر کرو گے۔ ایک گائیڈ تمہاری رہنمائی کرے گا اور دوسرے آدمی نے مرسیڈیز اسٹارٹ کر کے میرے قریب لا کر ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ دی۔

"انیشرنگ سنبھال لو چوہدری! میں دُعا کرو ں گا کہ تم جب دوبارہ ملو تو ایک دوست کی حیثیت سے ہاتھ ملاؤ۔"

میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے پہلے اسٹین گن کی جھلک دکھائی پھر مسکراتا ہوا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اسلام آباد کی تمام سڑکوں سے تو آپ واقف ہی ہوں گے جناب! گیٹ سے نکل کر گائیڈ نے مؤدب لہجے میں بولا "بس ہمیں ذرا فتح چوک تک ہی جانا ہوگا۔"

"رہنمائی کے بغیر شاید دقت ہوگی" میں نے جواب دیا "میں پسٹر مارکیٹ تک جا سکتا ہوں۔"

"اوہ نہیں جناب! وہ راستہ طویل ہے چلیے میں بتاتا چلوں گا۔"

"ملک صاحب یہاں سے کیوں چلے گئے؟"

"احتیاط جناب" اُس نے بتایا "شاید وہاں سے بھی کوئی گائیڈ ہمیں تیسری جگہ لے جائے۔"

"کیا وہ اپنے گھر میں بھی اتنے ہی محتاط ہوتے ہیں؟"

"جی ہاں، وہاں بھی کئی ٹھکانے ہیں کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہاں ہوں گے؟"

"ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

"اوہ جی دُشمن داری ہے اُن کی، سیاسی لیڈر ہیں۔"

فتح چوک سے پھر زیرو پوائنٹ کی جانب دو فرلانگ چلنا پڑا تھا زیرِ تعمیر عمارت کے سامنے اینٹوں کا ڈھیر تھا، اس لیے کار روک کر مجھے پیدل لے جایا گیا تھا تین آدمی گیٹ پر کھڑے تھے، تینوں مسلح تھے اُن میں سے ایک میرے ساتھ چل پڑا تھا مجھے فرنیشڈ ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر اُس نے انٹر کام پر کسی سے بات کی۔ دو منٹ بعد ایک پہلوان فرش کو مٹاتا ہوا اندر آیا۔

"خرم سلطان چوہدری! ملک صاحب اپنی خواب گاہ میں تمہارے منتظر ہیں براہِ کرم تلاشی کی اجازت دیجیے!"

"کیا ملک صاحب کے کارندے اتنے ہی احمق ہیں؟" میں نے کہا "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" وہ تھوڑا سا گیا "وضاحت کیجیے۔"

"میری تلاشی لے لی گئی ہے بھائی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہ..." وہ مسکرانے لگا "تشریف لائیے" اُس نے گردن کو جُھکا کر ہاتھ بڑھایا بغلی دروازہ دھڑ سے کھل گیا میں نے پھرتی سے ہی گردن موڑی تھی۔ ایک طویل قامت بُوڑھا پگڑی گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتا ہُوا اندر آ رہا تھا۔

"خوش آمدید چوہدری!" اُس کے حلق سے کھرکھراتی آواز اُبھری "تم جا سکتے ہو" دوسرا جملہ اُس نے پہلوان نما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہتر جناب!" وہ پلک جھپکتے باہر نکل گیا۔ بُوڑھا برہنہ پا تھا۔ وہ میرے دھیرے سے آواز چلتا ہُوا میرے قریب آ گیا۔ میں اعتراف کرتا ہُوں کہ اُس کی اندر دھنسی ہوئی، مگر نُمایاں آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا بے حد مشکل کام تھا۔ میرے بدن کو جھٹکے لگتے محسوس ہو رہے تھے جیسے اسٹیٹ کی نوک میں پھنسی سوئی مقناطیس کی زد میں آ گئی ہو کوئی قوت مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھی اور میں پاؤں جمانے کی کوشش میں مشکل محسوس کر رہا تھا۔

"شاندار! سُننے اور دیکھنے کے درمیان جو فرق ہوتا ہے وہ تم میں بدرجۂ اتم موجود ہے، بیٹھ جاؤ" دھیمے نیازی سے پلٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب فاصلہ بڑھا تو میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

"تم غلط ملک اور غلط پیشے میں ہو لڑکے! تمہیں تو ولی عہد ہونا چاہیے تھا۔ اچھی شہرت اور طویل عمر پاتے۔ یہاں اندھیروں میں گمنامی اور صلے میں ایک گولی... صرف ایک گولی ہی مل سکتی ہے۔"

"کیا میں ملک نواز کے روبرو ہُوں؟" میں نے آواز کو سمیٹ کر دریافت کیا۔

"ہاں یہ تمہاری خوش بختی کی علامت ہے تم زندہ آنکھوں سے ملک نواز کو دیکھ رہے ہو" اُس نے بُجھا ہُوا سگار نکال کر ہونٹوں میں داب لیا اور کہا "اور یہ زندگی میں نے دی ہے۔"

"جی ہاں، جس طرح موت کا فیصلہ آپ نے دیا تھا" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"موت میری انگلی کے اشارے میں ہے لڑکے!" وہ غرّایا اور لائٹر سے سگار کو شعلہ دکھایا "میں نے فیصلہ واپس نہیں لیا صرف ہاتھ اُٹھا کر روک دیا ہے۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا بلکہ تم نے یہ خواہش دی ہے کیونکہ آج تک میری انگلی کا اشارہ شرمندہ کبھی نہیں ہُوا تھا اور شاید میرا فیصلہ کبھی دوبارہ غور کرنے کی درخواست نہ کر آیا تھا لیکن تم نے میرے اشارے کو شرمندہ کر دیا ہے اور میں نے کھلے دل سے اپنے ہی فیصلے کی درخواست قبول کر لی ہے۔"

"اس کی وجہ محترم!"

"یہی معلوم کرنا چاہتا ہُوں" اُس نے دُھواں اُگل کر کہا۔

"اس لیے ملک نواز..." میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں "میرا ایمان ہے کہ زندگی اور موت صرف اپنے مالک کا اشارہ قبول کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ زندگی دینے والا ہی زندگی کو واپس آنے کا اشارہ کر سکتا ہے۔ آپ نے غلط فیصلہ کیا تھا۔"

"شاید ایسا ہی رہا ہو" اُس نے پہلو بدل کر کہا "وہاں یہ بتاؤ اس پیشے میں کب سے ہو؟"

"نو دو ردہُوں جناب! ابھی رنگروٹی کر رہا ہُوں۔"

"اُستاد کے بغیر؟"

"نہیں جناب!" میں نے ناخن کریدتے ہوئے جواب دیا "میں نے اُستاد...!"

"جھوٹ نہیں چوہدری!" وہ پھنکارا "میرے ذرائع اتنے محدود نہیں ہیں تم ایک گروہ کے چیف ہو۔ تم نے اس شہر کے دو اُستادوں کو کٹر دیا ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہاں سے بھیجے گئے ہو؟"

"بھیجا نہیں بلکہ آیا ہُوں کیونکہ یہ مُلک میرا وطن ہے۔ میں ملازمت کے سلسلے میں باہر تھا جب میرے باپ کو قتل کر دیا گیا۔ میں خاندان کی حفاظت کے لیے لوٹ آیا تو قاتل میرے پیچھے پڑ گئے۔ تب سے بھاگتا پھر رہا ہُوں۔"

"میری آفر کو قبول کرو گے چوہدری؟"

"وعدہ نہیں کروں گا جناب! ہاں اگر آفر میرے مزاج کے مطابق ہوئی تو سوچوں گا ضرور...!"

"اپنے سارے دُشمن میرے حوالے کر دو اور اپنی تمام تر صلاحیتیں میری نگرانی میں دے دو۔"

"دُشمن تو اب کوئی نہیں رہا" میں نے بتایا "اگر مجھ میں کوئی صلاحیت ہے تو اُس کی بات کریں۔"

"بولو تنخواہ پر کام کرو گے یا شراکت؟"

"بزنس یا کوئی...؟"

"یہ سوال قبل از وقت ہے خرم سلطان! میرے ساتھ رہو، مجھے دیکھو، پرکھو پھر کوئی فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔"

"میں ملازمت نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے تمہیں ملازم نہیں سمجھا جائے گا" میں نے جب ملک سے مل لینے کا فیصلہ کیا تھا اُس وقت جو اندازہ قائم کیا تھا، ملک عین اُسی طرح چل رہا تھا۔ فیصلے کی تہ میں یہی اندازہ تھا کہ ملک نواز مجھ جیسے شخص کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرے گا۔ اُسے سیٹھ سلیمان اور دوسرے مرنے والوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ایسے لوگ تو اپنے باپ کے بھی نہیں ہوتے جو میرے ہاتھوں مر چکے تھے۔ وہ اُس کے نزدیک ناکارہ پُرزے تھے۔ ایسے لوگوں کو مر جانا ہی چاہیے تھا۔ اُس نے سگار کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھرپور کش لیا اور پھر بولنے لگا۔

"لیکن میری کچھ شرائط ہوں گی۔ بڑی رقم اور بے ضرر اجیت تک تم وفادار اور تابعدار رہو گے۔ کوئی شرط تمہیں نہیں کاٹے گی۔ میں بزنس مین ہوں اور میرے کاروبار سیلز ایجنٹ ہیں اور سیلز ایجنٹ کا کوئی نہ کوئی ضامن ہے کیا تم سے ذرہ ضمانت طلب کروں گا۔ شخصی ضمانت ہوگی۔ جانتے ہو تمہارا ضامن کون ہوگا؟"

"میں نے نفی میں گردن ہلائی تو اس نے بتایا محمد نگ باز خان کی دونوں بیٹیاں ...!"

"نہیں ...!" میرے حلق سے توپ کا گولہ نکلا اور میں اُڑتا ہوا اس کے گریبان تک چلا گیا۔ "نہیں ملک نواز مردِ ن کر گم کھیلو تم جیسے ذلیل حیثیت اور قدآور شخص کو عورتوں کی ضمانت زیب نہیں دیتی۔"

"آرام سے بیٹھو لڑکے۔" میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اس نے مجھے نوچ کر واپس اُچھال دیا تھا۔ "میں بندر کی اُچھل کود پسند نہیں کیا کرتا۔"

"مجھے ... مجھے بتاؤ ملک نواز لڑکیاں کہاں ہیں؟" میں پھر اس کی جانب بڑھتا چلا گیا تھا۔

"کہاں ہیں بھئی اپنے گھر میں۔" میں نے انھیں یرغمال نہیں بنایا۔ نہ ہی کوئی ایسی حرکت کروں گا۔ وہ بس میری نگرانی میں رہیں گی لیکن انھیں نگرانی کا کبھی احساس تک نہ ہوگا۔ ایک طرح سے وہ نگراں آنکھوں کے سائے تلے رہیں گی۔"

"میں کیسے یقین کر لوں؟"

"جیسے پسند کرو۔ اگر اُن کے کمرے میں فون ہے تو فون کر لو ورنہ واپس جا کر میری بات پر یقین کر لینا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"میں انتظام کر دیتا ہوں۔" اس نے اُٹھ کر ایک بٹن پر انگلی رکھ دی۔ دور کہیں بیزر کی ہیل بج اُٹھی۔ اگلے ہی لمحے وہی شخص اندر آ گیا۔ جو مجھے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ "تم سلطان کے لیے واپسی کا انتظام کر کے رپورٹ دو۔"

"بہتر جناب۔" وہ گردن جھکا کر اُلٹے پاؤں واپس نکل گیا۔

"خرم چوہدری پر کی ناکامیاں اور خطائیں درگزر کر دیتا ہوں۔ بحیثیت انسان بعض اوقات مجھ سے بھی غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں لیکن غدار کو میں دوسرا سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دیا کرتا۔ بس میرے وفادار رہنا۔"

"کیا آپ کے ماتحت وفادار نہیں؟"

"وہ زندہ ہیں فی الحال شک و شبہے سے بالاتر ہیں۔"

"مجھ جیسے خطرناک قاتل کو اپنے مالک تک پہنچانے سے پہلے اُن لوگوں کو کس بات کا خیال رکھنا چاہیے تھا؟"

"وضاحت کرو چوہدری!"

میں نے ریوالور نکال کر لہرایا اور ملک نواز کا بدن ایک دم اکڑ گیا۔

"اس میں زہریلی سوئیاں ہیں ملک صاحب۔ اگر میں چاہتا تو آپ کی لاش پر پاؤں رکھ کر نکل سکتا تھا لیکن میں بلاوجہ کسی کا دشمن نہیں بنتا۔" میں نے ریوالور اُس کے پاؤں میں پھینک دیا۔ "دوستی اور وفاداری کے نام پر۔"

"شکریہ۔" ملک نے ریوالور اُٹھا کر دیکھا اور پھر میری جانب اُچھال دیا۔ "مجھے ایسے ہی شاطر نوجوان کی ضرورت ہے جو بازی پلٹنے کا فن جانتا ہو۔ تم نے مجھے متاثر کیا ہے لڑکے۔ میں تمہیں دوست رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

"گاڑی تیار ہے جناب۔" ایک آدمی نے جھانک کر اطلاع دی۔

"شب بخیر چوہدری۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں کل واپس جا رہا ہوں۔ دس بجے پھر ملاقات ہوگی۔"

"کیا مجھے یہاں حاضری دینا ہوگی؟"

"تو بجے تیار رہنا۔ میں اپنا آدمی بھیج دوں گا۔" اس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور نچلی دروازے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

پورچ میں بیگن کی کار پارک تھی۔ اس لیے میں نے ملک نواز کے ڈرائیور کو پیچھے ہی روک کر واپس کر دیا تھا۔ گاڑی کی آواز سن کر بیگن، ہارون اور رشیدہ دوڑتے ہوئے سیڑھیوں تک چلے آئے تھے۔ وہ تو برآمدے میں ہی رُک گئے تھے لیکن رشیدہ سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آ گئی تھی۔ اُس کے پاس محبت اور آنسو تھے۔ عورت ہر لمحے اور ہر جذبے کا اظہار آنسوؤں سے کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے رشیدہ کو روتے سے نہ روکا۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا تھا خرم؟"

"اندر چل کر جواب طلبی کرنا۔" میں نے اُسے ہٹاتے ہوئے کہا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں نے دونوں سے باری باری ہاتھ ملایا۔ مرد اور عورت میں فرق تھا۔ بیگن اور ہارون نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔

"مینہ، مینہ ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں ثمینہ چند منٹ قبل یہاں تھی۔" رشیدہ نے جواب دیا۔ "اب بتاؤ واپس کہاں چلے گئے تھے؟"

"چلا نہیں گیا تھا بلکہ لے جایا گیا تھا۔"

مجھے پہلے ہی شک تھا۔" بیگن بولی۔ "میں نے ہارون سے بھی یہی کہا تھا۔ کون لوگ تھے؟"

"ملک نواز نے طلب کیا تھا۔"

"اوہ اتنی جلدی۔" ہارون بولا۔ "میرا خیال تھا وہ کچھ دن اندر گراؤنڈ چلا جائے گا۔"

"اُس کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے بردار۔" میں نے بتایا۔ "وہ ایسا سرکاری سانڈ ہے جو ہر سمت سے روک ٹوک سکتا ہے۔"

"ملاقات ہوئی؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اُن کو ملاقات کی تفصیل بتا دی۔

"پھر تو ماننا پڑے گا قدرت کا ہاتھ آپ کی پشت پر ہے۔" ہارون بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں بولا۔ "ملک نواز سے پانچ منٹ ملنے کے لیے میں نے بڑے بڑوں کو ہفتوں ٹائم میں انتظار کرتے دیکھا ہے۔"

"میرے ساتھ کون جائے گا؟"

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو خرم۔" رشیدہ نے ہلک کر کہا۔

"فی الحال نہیں جان برادر۔ پہلے ہمیں زمین ہموار کرنا ہوگی۔ اس کا انحصار صرف باتوں سے نہیں بلکہ عمل سے حاصل کرنا پڑے گا۔ میں صرف ہارون کو لے جاؤں گا۔ بشرطیکہ ملک نواز سے بحیثیت انسپکٹر نہ پہچانا جاؤں۔"

"مجھے وہ جیسی طرح جانتا ہے چیف۔" ہارون نے متاسف انداز میں بتایا۔ "ایک بار مجھے بھی اسی طرح طلب کیا گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم لوگ دوسرے پروجیکٹ پر کام شروع کر دو۔"

"دوسرا پروجیکٹ؟" بیگن نے استفسارانہ نگاہوں سے دیکھا۔ "میں سمجھا نہیں چیف۔"

"ہارون کی اطلاع ہے کہ کچھ بڑے لوگوں کی ذاتی گاڑیاں مال کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔"

"اوہ ... مجھے یاد ہے۔" بیگن نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے چیف ہم کل سے کام شروع کر دیں گے۔"

"ہارون گھر کا بھیدی ہے اس لیے لیڈ کرے گا۔ میں نے تحکمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "رشیدہ پاشا اور سیدہ کے درمیان رابطہ قائم رکھے گی۔ چونکہ ہارون کسٹم کا جانا پہچانا کردار ہے اس لیے میک اپ ضروری ہوگا۔"

میں ہارون کی تجویز کی تائید کرتی ہوں۔" رشیدہ نے ہاتھ اُٹھایا۔ "میں انسپکٹر ہارون کی حیثیت سے فائدہ اُٹھاؤں گا۔ بیرونی پوسٹوں کے لوگ انسپکٹر ہارون کو ہی پوسٹ میں داخل ہونے اور اندر کے راز معلوم کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ میں صرف گاڑیوں کی نشاندہی کروں گا۔ میرے اور محترم رشیدہ کے پاس ایک ہی فرنٹیئر کے ٹرانسمیٹر ہوں گے۔ میں بذریعہ ٹرانسمیٹر ان کو گاڑی نمبر اور روٹ بتاؤں گا اور یہ پارٹی کو کنٹرول کریں گی۔"

"اب طریقہ کار طے کریں۔" میں نے رائے طلب کی۔

"ایک طریقہ قانونی ہے۔ ایسی گاڑی پکڑ کر پولیس کی تحویل میں دی جائے۔ دوسرا طریقہ مجبوری والا ہے جس پر ہم پہلے ہی عمل کر رہے ہیں۔ یعنی اپنی عدالت سے مجرم کو سزا دی جائے۔ پہلے طریقے کی صورت میں آپ لوگ صرف شکار ہانک کر دوسروں کے سامنے کر دیں گے۔ وہ گولی ماریں یا شکار کو کنٹرول کریں۔ آپ لوگ بے بس ہوں گے۔ ہماری پوزیشن کا کردار اور مجبوریاں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہر گاڑی کے مالک کا آفیشل اور سماجی قد ناپا جائے گا اور اس کی روشنی میں فیصلہ ہوگا۔ آپ گاڑیاں پکڑتے رہیں گے۔ اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرتے رہیں گے اور پولیس سفارش اور تعلق مضبوط کرتی رہے گی۔ کینسر کا چھوٹا قوام کے بدن میں بدستور زہر پھیلاتا رہے گا۔ دوسرا راستہ غیر قانونی ہے۔ یعنی ہم ایک نیک مقصد غیر قانونی طور پر حاصل کریں گے۔ اب دونوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنے کے بارے میں اپنی اپنی رائے دیں۔"

"میری رائے آپ جانتے ہیں چیف۔" بیگن نے مسکرا کر کہا۔ "میں تو مجرم اور سانپ کو دوسروں کے لیے نہیں چھوڑا کرتا۔ مجھے یہاں آئے ایک برس سے اوپر ہو گیا ہے چونکہ میں خود مختار نہ تھا اس لیے مجبوری تھی۔ جب آپ نے اقتدار سنبھالا تو دوسرے طریقے کے نتائج آپ کے سامنے ہیں جبکہ میں نے ایک برس میں ایک چوہا بھی تلف نہ کیا تھا۔"

"ہارون! آپ کی رائے پر فیصلہ ہوگا۔"

"آپ ڈی آئی جی صاحب سے کھل کر بات کریں۔" ہارون نے مشورہ دیا۔ "اگر انھوں نے یقین دہانی کرائی تو ہم تجربہ کر دیکھیں گے اگر نتیجہ وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے تو ہم راستہ بدلنے میں حق بجانب ہوں گے کل ہم سے نہ اپنا ضمیر کوئی سوال کرے گا اور نہ کوئی دوسری اتھارٹی باز پرس کر سکے گی۔"

نے ملامت بھری نگاہوں سے ہارون کی طرف دیکھا۔ ہارون نے فوراً ہی نگاہوں کو بچا کر جھکا لیا تھا لیکن اُس کے چہرے پر فتح مندی کی سُرخی صاف جھلک رہی تھی۔ اُن دیکھے ہاتھوں نے ایک دوسرا کھیل شروع کر دیا تھا۔ خالی اسٹیج پر ہارون ایک کردار بن کر اُبھرا تھا۔ ایسے کردار کی ضرورت بھی تھی۔ یہی ضرورت تجھے بار بار سلیمان تک لے جا رہی تھی۔ جوان بیٹی اور بہن کی نتے داری انسان کو وہ کچھ کرنے اور برداشت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے متعلق وہ کبھی سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

ہارون کی مردانہ وجاہت کسی بھی لڑکی کی نیندوں میں مخل ہو سکتی تھی۔ وہ صرف خوب رُو ہی نہ تھا بلکہ ایک مہذب اور جرأت مند نوجوان بھی تھا اگر رشیدہ اُس کے لیے دل میں نرم گوشہ محسوس کرنے لگی تھی تو یہ کوئی حیران کُن بات نہ تھی۔ میری عدم موجودگی میں بیگن کی نتے داری بھڑک سکتی تھی کیونکہ ہارون اُس کے نزدیک صرف ایک ممبر تھا۔ اس لیے میں نے دوسری ہدایات کے ساتھ ایک ہدایت رشیدہ اور ہارون کے بارے میں بھی ذہن میں جمع کر لی تھی۔

اُس رات مجھے مارشا اور گوتھم بہت یاد آئے تھے۔ مارشا نے بھی پہلے میری آنکھوں دل میں جگہ بنائی تھی اور میں نے شدید محسوس انداز میں اُس کو پیارے گوتھم کے حوالے کر دیا تھا۔ ہارون بھی بالکل اُسی طرح وقت کی ہتھیلی پر اُگ آیا تھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ رشیدہ اندھیروں اور گرد آلود راستوں پر ٹھوکریں ہارون کے لیے ہی چلتی رہی تھی۔

"ہارون ہماری ٹیم میں ایک اچھا اضافہ ہے۔" اُن کی روانگی کے بعد میں نے دل کی بات کو زبان دی۔ "کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی نظر میں ہی قلب و نظر کو متاثر کر دیتے ہیں۔ ہارون بھی انھی لوگوں میں سے ہے۔ جب اسے میں نے چیک پوسٹ پر دیکھا تھا تو اس نے اپنے کردار سے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔"

"تو یہ بات ہے۔" رشیدہ نے بات اُلٹ دی۔ "تو ہارون تمہارا مطلوب ہے۔"

"سچ بتاؤ رشیدہ تمھیں کیسا لگا؟"

"بھائی بنے ہو تو بھائیوں کی نتے داری اور بات کرنے کا سلیقہ بھی سیکھو۔" وہ تیوری چڑھا کر بولی لیکن اس کا لہجہ چُغلی کھا رہا تھا کہ یہ غصہ مصنوعی ہے۔

"بہر کیف جو اچھا ہے وہ اچھا دکھائی بھی دیتا ہے۔" میں نے اُس کا ہاتھ تھپتھپایا اور جو اچھا دکھائی دیتا ہے اُس کا عکس کسی کی خوابصورت آنکھوں میں جھلکنے لگتا ہے۔"

"سچ میں مار بیٹھوں گی۔" اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ٹھیک ہے جان مستقبل قریب میں تم لوگوں سے سفارشیں کرواتی پھرو گی اور میں مان کے نہیں دوں گا۔"

"مجھے منانا آتا ہے۔ دیکھوں گی تم کیسے مان کے نہیں دو گے۔"

"یعنی اعتراف کر رہی ہو۔" میں نے قہقہہ لگایا اور وہ مجھے دھکیل کر دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

صبح فجر کی نماز کے بعد کاریڈور میں ثمینہ سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے چاہا تھا کہ کترا کر نکل جاؤں۔ سویرے سویرے باتوں کا موڈ نہ تھا لیکن اُس نے راستہ روک لیا تھا۔ سیاہ دوپٹے کی بُکل میں اُس کا چہرہ پورے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

"ہم آپ سے ناراض ہیں۔" اُس نے پلکیں جھکا کر کہا۔

"ہم میں اور کون کون شامل ہے؟"

"جسے آپ نے اسپتال جانے اور ملاقات کی اجازت نہیں دی۔"

"پھر آپ کا دعویٰ داخل دفتر کرنا پڑے گا کیونکہ پابندی ڈاکٹروں نے لگا رکھی تھی۔"

"صرف وہ دونوں پر۔" اُس کا لہجہ شاکی تھا۔ "دوسرے لوگ تو جاتے رہے ہیں۔"

"یقین کرو ثمینہ کوئی بھی نہیں گیا۔ ہاں ٹیلی فون پر رابطہ قائم رہا ہے۔"

"باجی تو ہر روز ہی بتا کر جاتی تھیں۔"

"کیا روز جاتی تھی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "کس وقت جایا کرتی تھی؟"

"صبح شام دونوں وقت۔"

"جاتی رہی ہو گی لیکن اُسے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔"

"رات بھی آپ آئے اور پھر چلے گئے۔ ہم لوگ بے حد پریشان تھے۔"

"چھوڑو بے ان باتوں کو آؤ لان میں چلتے ہیں اسپتال میں لیٹے لیٹے جسم اکڑ گیا ہے۔" میں نے ہاتھ بڑھایا تو وہ سمٹ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"آپ چلیں میں جا نماز امینہ کو دے آؤں۔" میں شرمندہ سا ہو کر باہر نکل گیا تھا۔ حالانکہ میں نے ہاتھ اشارتاً آگے کیا تھا نہ جانے اُس محتاط لڑکی نے کیا سمجھ لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناشتا رشیدہ نے تیار کیا تھا۔ دونوں بہنیں بلاوے تک میرے دائیں بائیں ٹہلتی رہی تھیں۔ ثمینہ کاروباری باتیں کرتی رہی تھی۔ جب کہ امینہ اپنے باپ کی باتیں یاد کر کے رو پڑی تھی۔ ثمینہ نے اکاؤنٹ سے متعلق بھی سوال کیا تھا۔ روزمرہ کی ضروریات کے لیے بھی اُس کے پاس کچھ نہ تھا۔

"تم دونوں صرف نصابی کتابوں پر اپنی توجہ رکھو۔" میں نے جواب میں کہا تھا۔ "بزنس اور تمام اخراجات مجھ پر چھوڑ دو۔"

"لیکن کیوں خرچ؟" ثمینہ بولی۔ "ہم کب تک آپ پر بوجھ بنی رہیں گی؟"

"اگر ایسی بات ہے تو ہم آج ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ قانون آپ کو سب کچھ حوالے کر دے گا۔"

"ناراض ہو کر؟"

"نہیں۔ ہم کون ہیں آپ کے۔ ناراض تو اپنے ہوا کرتے ہیں۔"

"باجی کی بات آپ سمجھتے کیوں نہیں بھائی جان۔" امینہ نے پُرزور انداز میں کہا۔ "آپ کا یہ احسان کیا کم ہے کہ ہمیں بروں تلے رکھا ہوا ہے۔ جب اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے تو وہ ہم استعمال کیوں نہ کریں۔"

"میں تو فارغ نہیں ہوئی بے بی۔ البتہ رشیدہ سے کہہ دوں گا۔"

"کچھ وقت ہمارے لیے آپ کو نکالنا ہو گا بھائی جان۔" امینہ بولنے لگی۔ "میں تو سب کے سامنے رو لیتی ہوں لیکن باجی چُپ چُپ کر روتی ہیں۔ آپ اسپتال میں تھے تو۔۔۔"

"نہیں مینا۔ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔" ثمینہ نے تڑپ کر اُسے روک دیا۔

"فائدہ ہو یا نقصان۔" امینہ بھرائی آواز میں بولی۔ "جس کے لیے آپ روتی ہیں اُسے احساس تو ہونا چاہیے۔"

"مجھے احساس ہے بے بی جان۔" میں نے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ "لیکن تمھارے ڈیڈی مجھ پر کچھ ایسی ذمے داریاں ڈال گئے ہیں جو اس احساس سے بھی نازک اور اہم ہیں۔ میں اگر تم لوگوں سے دُور ہوتا ہوں تو یہ دوری تمھارے مفادات اور مستقبل کی خاطر ہی ہوتی ہے۔ اگر میں بھی تمھارے ساتھ آنسو بہانا شروع کر دوں تو تمھارے ڈیڈی کی رُوح ناراض ہو جائے گی۔ اُن کا بکھرا ہوا بزنس اور کچھ ادھورے کاموں کی تکمیل کے لیے ہی مجھے باہر رہنا پڑتا ہے۔"

"آپ اس کی باتوں پر دھیان نہ دیں خرم۔" ثمینہ بولی۔ "یہ تو پگلی ہے۔ آپ جو کچھ کرتے ہیں مجھے یقین ہے ہمارے لیے ہی ہے۔ بس جب فرصت ہُوا کرے تو گھڑی پل کے لیے آ جایا کریں۔ مجھے احساس تنہائی ڈسنے اور ڈرانے لگتا ہے۔"

"ایک بات تم دونوں غور سے سُنو۔ تمھارے ڈیڈی کے کچھ حریف ہیں۔ تم لوگ محتاط رہو گی۔ کسی بھی اجنبی شخص کی بات اور گمنام ٹیلی فون کال پر بھروسہ نہیں کرو گی۔ یہ گھڑی تم باندھ لو ثمینہ یہ ٹرانسمیٹر واچ ہے۔ ایسی ہی گھڑی میرے پاس ہو گی۔ عام حالات میں تم استعمال نہیں کرو گی ہاں کسی بھی مشکل وقت تم اس کی جانی باہر نکال کر مجھے کال کر سکتی ہو۔"

"کیا ایسا خطرہ ہے؟"

"خطرہ بتا کر نہیں آیا کرتا ثمینہ گُل لیکن انسان کو ہر وقت خود کو تیار رکھنا چاہیے۔"

"اگر۔۔۔ اگر مجھے کسی نے پکڑ لیا تب۔۔۔؟" امینہ خوفزدہ آواز میں بولی۔ "مجھے بھی ایک گھڑی دے دیجیے نا۔"

"ارے تم تو ابھی سے گھبرانے لگی ہو۔ خدانہ کرے کبھی ایسا وقت آئے۔" میں نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "نہیں جان برادر میں نے محض احتیاطاً تم لوگوں کو بتایا ہے۔ کوئی ضروری تو نہیں۔"

بیدار ہوتے ہی میں نے ہارون کے لیے بیگن کو پیغام دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا تھا۔ جب شمیمہ نے ٹیلی فون کال کی اطلاع دی تو ہم تینوں لان سے اُٹھ آئے تھے۔ رشیدہ واپس کچن میں چلی گئی تھی۔ کمال ہارون کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ ایک سیکنڈ کے لیے پریشان ہو سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل۔ میں تو ایسی ایسی چیزوں پر پریشان ہوتا ہوں کہ ستمگر سے جواب دیا۔ "ہم...؟"

"آپ کی تجویز کو عملی جامہ پہنانا ہے جلدی کیجیے۔"

"کرنا کیا ہے ہارون بولا۔ "ایک چھلانگ اور آگیا ہے۔"

"کون؟"

"ہمارے سلیم اکبر اسے بلا لیجیے۔"

"گڈ۔ اسے بھی ساتھ لگا لیں۔ جلدی مجھے نیچے تک بہت کچھ کرنا ہے۔"

"او کے چیف" ہارون نے جواب دیا اور میں نے رسیور رکھ دیا۔ رشیدہ نے ناشتا لگانے کے لیے پوچھا تو میں نے دو کپ میں کافی بنانے کی خبر لگا دی اور خود تیار ہونے اپنی خوابگاہ میں چلا گیا۔ جینز شرٹ پہن کر ہارون اور اکبر دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ رشیدہ اس وقت ناشتا لگا رہی تھی۔

"بیس منٹ بعد ہم نیچے ہوں گے۔ مہمان ناشتا کریں گے۔" میں نے ہارون سے کہا۔

"تشریف لائیے ہارون صاحب۔" رشیدہ نے چہرہ گھما کر کہا۔ "آپ کو بلایا گیا تھا اور مجھے غلط کر دیا گیا تھا۔"

"ہارون!" میں نے ٹیبل کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ ہمارے محسن خان کی بڑی صاحبزادی شبینہ گل ہیں اور چھوٹی بہن کا نام امینہ گل ہے لیکن ہم سب انہیں ڈیزی بلاتے ہیں۔" دونوں نے ہارون کو آداب کیا اور ہارون نے بھی جواباً سلام کیا تھا۔ "ہاں چھوٹے بھائی اکبر خان! آپ کا نام تو ہم خارج کرنے والے تھے بغیر اطلاع کے آپ کہاں غائب تھے؟"

"معافی چاہتا ہوں جناب۔" اکبر ہکلایا۔ "میں نے بڑی حاضر جوابی سے جناب کو ذاتی حاضر تھا جناب کو تنہائی میں کچھ باتیں سنانی تھیں۔"

"واپس جاؤ گے؟"

"نہیں جناب۔ کام کر کے واپس آیا ہوں۔"

"اکبر بھائی کو ناشتا کرائیے۔" رشیدہ نے حکم دیا۔ "جو بھی خاندان میں شامل ہو جاتا ہے اُس کی ذاتی بات نہیں رہتی۔ ہمارے سکھ دکھ سب مشترک ہوتے ہیں۔ ہم سچے

قاصر تھا کہ دُکھ جو جیسے شخص کے لیے ہے یا ملک نواز کی متوقع تباہی نے اُن کو پریشان کر دیا تھا۔

"میرے لیے دُعا اور میری عدم موجودگی میں گروپ کی سرپرستی فرمائیے گا۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ہارون تجربہ کار ہیں مگر اُن کے ساتھ بھی اپنی شناخت کی مجبوری ہے اور دوسرے لوگ غیر ملکی ہونے کے ناتے غیر موثر ثابت ہو چکے ہیں۔ انھیں ہم ان کے بڑوں اور خلوص نیت کی وجہ سے برداشت کر رہے ہیں۔"

"اپنا خیال رکھنا ترم سلطان۔" انھوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "کاش میں تمھارے لیے کچھ کر سکتا۔ اگر ملک نواز کو ذرا سا اشارہ بھی مل گیا تو وہ تمھیں اُدھیڑ کر رکھ دے گا۔ رنگ باز اور سلیمان اُس کے پالتو تھے۔ اس لیے اُسے ڈیل کرتے وقت اُس کے قد کو نظر انداز نہ کرنا۔"

"میں انشاءاللہ بہت جلد آپ کو اچھی خبر دوں گا۔"

"خدا کرے۔" ڈی۔ آئی۔ جی نے خبر بھرائی آواز میں کہا۔ "اب مجھ سے رابطہ قائم کرنے میں بھی محتاط رہنا۔"

"میں ہر سمت نگاہ رکھوں گا سر۔" میں نے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

"تم... تم... بڑے ظالم ہو ترم سلطان۔" وہ ہنس پڑے۔ "یقین رکھو ایسا نہیں ہوگا۔ البتہ ٹھانچے کو معاہدے کے مطابق خوراک دی جائے گی۔"

"شکریہ سر۔"

"میں آج ملک نواز کی ملامت میں جا رہا ہوں۔"

"کیا؟" وہ اُچھل پڑے۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"رات اُس نے اپنے گرگوں کے ذریعے مجھے بُلایا تھا۔" میں نے رات کی ملاقات کے دوران ہونے والی باتوں سے اُن کو آگاہ کیا۔ اُن کے چہرے کا رنگ کئی بار تبدیل ہوا تھا۔

"اگر میں نے تمھیں کوئی مشورہ دیا تو شاید میری نیت پر بھی شک کرنے لگ جاؤ۔ میں جانتا ہوں تم اپنی ضد سے باز نہ آؤ گے لیکن میں قوم سے تم جیسا ہیرا چھیننے کی کسی کو اجازت نہیں دوں گا۔ ملک نواز انسان کے بھیس میں عفریت ہے۔ عریاں حیوانیت اور دیکھتا ہوا جہنم ہے۔ وہ تمھیں ایسی کڑی اور ناقابل برداشت آزمائشوں سے گزارے گا کہ تمھاری رُوح چیخ اُٹھے گی۔ تم کسی نہ کسی سیڑھی پر پھر ترم سلطان بن جاؤ گے اور دوسرے لمحے اُس کی آنکھ سے سنسناتی ہوئی گولی تمھارے جسم میں پیوست ہو جائے گی۔ اگر اس عفریت کو مارنا ہی چاہتے ہو تو شکاری بنو۔ شکار بن کر نہ جاؤ۔"

"مسئلہ اُس کی ذات کو مٹانے کا نہیں جناب۔" میں نے کہا۔ "اگر میں اُسے ہلاک کرنا چاہتا تو رات مجھے موقع تھا لیکن یہ ذہنیت کے پلڑے ہیں۔ لوگ بھی اپنی اپنی جگہ عفریت سے کم نہیں ہوتے۔ ہم افراد کے قاتل نہیں بننا چاہتے بلکہ اس بدبودار دھندے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ملک نواز اگر مر گیا تو اُس کے گودام اور گوداموں کے نگران اس آگ کو بجھنے نہ دیں گے۔ میں اندر جا کر ہیروئن کی تھیلیاں تلاش کروں گا۔ وہ راستے معلوم کروں گا جن سے برآمد کرتا ہے۔ اگر ملک نواز زندہ بھی رہا تو مجھے کوئی پروا نہ ہوگی۔ دو تجربے آپ کے سامنے ہیں رنگ باز خان اور سلیمان سیٹھ۔ آج میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں دونوں کے پیچھے منشیات کے دھندے کو چلانے والا کوئی ہاتھ نہیں۔ اگر میں اُن کو دیکھتے ہی شوٹ کر دیتا تو ولی خان اور دوسرے لوگ سہولت کاری بحال رکھتے۔"

"ٹھیک ہے میں تمھارے لیے دُعا ہی کر سکتا ہوں۔" ڈی۔ آئی۔ جی صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ دُکھ اُن کی آنکھوں اور چہرے پر بکھر رہا تھا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے

یکسر نہ روکتے ہیں نہ ہنستے ہیں۔"

"میری بہن؟" اکبر نے عقیدت بھری نگاہوں سے رشیدہ کو دیکھا۔ "مجھے حالات نے اپنا دُکھ دکھانے کی مہلت نہیں دی تھی۔"

"اکبر خان! اگر اب بھی کوئی معاملہ ہے تو ہمیں بتا دو۔" میں نے عہد و پیمان لہجے میں پوچھا۔ "ایک سنگین درد محسوس کر رہی ہو تو پورا سسٹم متاثر ہو جاتا ہے۔"

"نہیں جناب اب کوئی مسئلہ باقی نہیں ہے۔"

"اچھا ہم اپنی نئی ذمے داری شن کر آج سے تمھیں ایک ہوٹل چلانا ہوگا۔"

"جو حکم جناب۔" اکبر نے جواب دیا۔ "میں تندہی بھی چلا سکتا ہوں۔"

باتوں باتوں میں ناشتا ختم ہوا تو میں ہارون اور اکبر کو ساتھ لے کر چل پڑا کیونکہ مجھے ڈی۔ آئی۔ جی اور وزیر داخلہ سے ملاقات کرنا تھی۔ اکبر کو ہوٹل کے بارے میں سمجھانا تھا۔ بیگن اور ساتھیوں سے صلاح مشورہ کرنا تھا اور بہرحال نو بجے ملک نواز کے پیغام کا انتظار کرنا تھا۔

✱

ڈی۔ آئی۔ جی صاحب ڈرائنگ ہال میں تھے۔ جب ملازم مجھے اور ہارون کو لے کر گیا تو وہ پیالی ہاتھ میں اُٹھائے دروازے تک چلے آئے تھے شاید وہ بھی کہیں جا رہے تھے۔ غالباً یونیفارم میں ملبوس تھے۔

میں نے بغیر کسی تمہید کے جب ہارون کی تجویز پیش کی تو وہ چائے کا سپ لیتے لیتے رک گئے اور پھر پیالی اُٹھانا تک بھول گئے تھے۔ لمحہ بھر وہ اُلجھ سے گئے تھے۔

"واٹ؟ کیا ایسا ہو رہا ہے؟" اُن کی آواز میں حیرت سے کہیں زیادہ دُکھ تھا۔

"جی ہاں سر۔ مجھے کم از کم دس گاڑیوں کو پاس کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔"

"مالکان کا نام بھی؟"

"نہیں سر۔ صرف گاڑی نمبر۔"

"تم لوگ مجھے ایسی گاڑی کے مالک کا نام اور عہدہ معلوم کر کے بتائے دو گے۔"

"اس حکم کی وضاحت فرمائیں گے سر؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے پوچھا۔ "کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ منہ دیکھ کر طمانچے کا فیصلہ کیا جائے گا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپسی راگ رنگ ہوٹل کے راستے ہوئی تھی۔ ہوٹل بدستور بند تھا صرف چوکیدار موجود تھا۔ میں نے چوکیدار کا تعارف اکبر خان سے کرایا اور اُس سے چابیاں لے کر اکبر کے حوالے کر دیں۔

"ہارون اور ماسٹر بیٹن چند دن تمہاری مدد کریں گے۔ مینجر تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ ہوٹل منشیات کا اڈا تھا۔ کچھ لوگ سابقہ تعلق بحال کرنے شاید آئیں۔ تم کسی کو بھی مایوس نہیں کرو گے۔ اگر ہارون شہر میں ہوں تو تم فی الحال ان کو کال کر لیا کرنا۔ بصورت دیگر ہر پارٹی کا ایڈریس ڈائری میں نوٹ کر لینا۔ تمہیں سب کو بتانا ہو گا کہ خان مرحوم کا بزنس اُن کے بھانجے نے سنبھال لیا ہے اور وہ بزنس ٹور پر ہے۔ اگر کوئی پارٹی ماں کے ساتھ آئے تو ہارون اور بیگن نہ ملیں تو خان کے گھر ایک لڑکی ہے رشیدہ تم پارٹی کا رابطہ اُس سے ملا دو گے۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب۔" اکبر خان نے مونچھیں پھڑکاتے ہوئے یقین دلایا۔ "میرے شکنجے میں جو پھنس گیا وہ کہاں جائے گا۔ میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں جناب۔"

"ہوٹل میں غنڈہ گردی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ شریف لوگ بھی آتے ہیں۔"

اکبر خان کو چھوڑ کر جونہی ہم سڑک پر نکلے ایک مرغ ٹیوٹا کا اٹھا ہوا بونٹ کھٹاک سے گرا۔ کار ہوٹل کے نکڑ پہ تھوہ سے لگی کھڑی تھی۔ ایک آدمی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیور کود کر ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور بہ عجلت تمام کار اسٹارٹ ہو کر ہماری کار کے پیچھے چل پڑی تھی۔ میں نے عقب نما آئینے کا زاویہ درست کیا اور بلاوجہ ہی کار ایک ذیلی سڑک پر موڑ لی۔ مرغ ٹیوٹا بھی تعاقب میں مڑی تو ہارون بول پڑا۔

"احمق لوگ تعاقب کی تربیت حاصل کر رہے ہیں چیف۔"

"اور میرا خیال ہے شروع ہی سے یہ لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔"

"کون ہو سکتے ہیں؟"

"ملک نواز کے گرگوں کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔" میں نے بتایا۔ "اگر انھوں نے مجھے ڈی۔ آئی۔ جی سے ملتے دیکھ لیا ہے تو صفائی مشکل ہو گی اور مجھے وزیر داخلہ صاحب سے بھی ملنا ہے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا آپ کسی موڑ پر اُتر جائیں اور میں انھیں شہر کی سیر کراتا پھروں؟"

"تمہارا تعاقب نہیں کریں گے دوست۔" میں نے آئینے میں دیکھا۔ فاصلہ بہت کم تھا۔ "اُترنے کا موقع دیتے دکھائی نہیں دیتے۔"

"پھر انھیں کسی مضافاتی سڑک پر لے چلیے۔"

"وقت میرے عزیز! اتنا وقت کہاں ہے۔" میں نے طویل سانس لی اور گھڑی دیکھی۔ پونے سات بج چکے تھے۔

"لیکن انھیں ساتھ لے جایا بھی نہیں جا سکتا۔ میں نے گاڑی مال روڈ سے دائیں کاٹ لی۔ نزدیک ترین چکری روڈ تھی۔ سات آٹھ کلومیٹر کے بعد مضافاتی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ بکرا منڈی تک چونکہ ٹریفک تھا اس لیے وہ بالکل ساتھ ساتھ رہے تھے پھر تہ۔ بیچ فاصلہ بڑھنے لگا تھا۔ وہ خوفزدہ تھے یا اُلجھ گئے تھے۔ نہ تعاقب چھوڑ سکتے تھے نہ ہی آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

"چیف! اچھلا شخص ٹرانسمیٹر پر باتیں کر رہا ہے۔" ہارون نے بتایا۔

"اپنے باوا سے پوچھ رہا ہو گا کہ کیا کیا جائے۔" میں نے پختہ سڑک سے دائیں کچے روڈ پر جب کار چڑھائی تو وہ سیدھے آگے نکلتے چلے گئے۔ تب میں نے بھی کار بیک میں ڈالی اور اُن کے تعاقب میں چل پڑا۔ اس میں شک تو نہ تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی تعلق لوگ ہوں گے۔

سامنے سے ایک بس آ رہی تھی۔ چھت پر بھی لوگ سوار تھے اور بیٹھے انداز میں ٹانگیں ڈال رہے تھے۔ ڈھول والا گھٹنوں کے بل کھڑا ڈھول پیٹ رہا تھا۔ شاید کسی میلے پر لوگ جا رہے تھے۔ انھوں نے کار سائڈ میں روک لی اور جب بس کی گرد اُوپر سے گزر گئی تو میں نے بھی کار اُس کے ساتھ لگا دی۔

"چکری روڈ کدھر ہے جناب؟" میں نے چہرہ باہر نکال کر پوچھا اور ہارون نیچے اُتر کر رومال سے چہرہ صاف کرنے لگا۔ ڈرائیور کی توجہ میری جانب تھی۔ ہارون نے ایک دم پلٹ کر دروازہ کھولا اور دوسرے لمحے پیچھے بیٹھے شخص کو گھسیٹ کر باہر لے آیا تھا۔ اگر میں ہوتا تو اتنی پھرتی کا مظاہرہ نہ کر پاتا۔

"خرم سلطان۔" ڈرائیور نے دوستانہ لہجے میں میرا نام لیا۔ "ہم دوست ہیں۔ آپ کی حفاظت کا فرض ہمیں سونپا گیا ہے۔ برائے کرم اپنے ساتھی سے کہہ دیجیے۔"

"ملک نواز صاحب کا شکریہ ادا کر دینا دوست۔" میں نے کہا۔ "ان کو بتا دینا کہ خرم سلطان اپنی حفاظت خود کرنے کا عادی

ہے۔ تعاقب کرنے والے کو میں دوست کا پیغام دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ہم واپس چلے جاتے ہیں۔"

"لیکن کار کے ذریعے نہیں۔" میں نے اُترتے ہی اگلے ڈرائیور پر فائر کر دیا۔ "ہاں اگر تم لوگ شہر تک ہمارے ساتھ چلنا پسند کرو تو ہماری کار کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

"شکریہ جناب۔" وہ بھی اُتر آیا۔ "ہمارے پاس اسٹپنی ہے۔"

"ٹھیک ہے آرام سے پہیہ بدلو۔" میں نے ہارون کو اشارہ کیا اور کار میں بیٹھ کر بیک گیئر میں ڈال دی۔ ہارون نے اُس کا ریوالور سڑک پر اُچھال دیا اور دوڑتا ہوا میرے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"ہمیں راستہ بدلنا ہو گا۔ یہ لوگ ٹرانسمیٹر پر پیغام دے کر دوسری پارٹی بلا لیں گے۔"

"ہمیں چیف!" ہارون نے چھوٹا سا ٹرانسمیٹر سیٹ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ "اب وہ بالمشافہ ہی رپورٹ دیں گے۔"

"شکریہ ہارون۔" میں نے پُرستائش آواز میں کہا۔ "کاش آپ کو میں ساتھ لے جا سکتا۔ اُدھر میرا ایک دوست تھا۔ تم اُس کے بعد تم نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں نے ایک بار سوچا تھا کاش پاکستان میں کسی ماں نے تم جیسا بیٹا جنا ہو تو میں اس دُعا کی قبولیت ہو ہارون۔"

"آپ مجھے مغرور بنا دیں گے خرم سلطان۔" ہارون نے ہنستے ہوئے کہا لیکن میں جواباً خاموش رہا۔

سکریٹریٹ جا کر معلوم ہوا کہ وزیر داخلہ صبح کراچی کے لیے فلائی کر گئے ہیں۔ اس لیے وقت جو بہت کم تھا فالتو ہو گیا تھا۔ میں زیادہ وقت ثمینہ کے قریب نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ اُس کے سامنے جا کر زندہ رہنے کی خواہش شدید ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات تو میں خود سے گھبرانے لگتا تھا۔ نفسی کی شدید خواہش مجھ سے حوصلہ اور خطرات سے کھیلنے کی جرأت چھیننے لگتی تھی جی چاہتا تھا کہ سب کچھ ترک کر کے کسی ایک کے لیے زندہ رہا جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ثمینہ کے لیے جو جذبہ میرے دل میں پل رہا تھا اُسے ہی محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر وہ جذبہ پیار ہی تھا تو میں زینت، عابدہ اور ایمینا کو کن خانوں میں فٹ کرتا۔ ہر ایک نے مجھے ٹوٹ کر چاہا تھا بلکہ چاہ رہی تھیں میں نے بھی اُن کے لیے وہی کچھ محسوس کیا تھا جو ثمینہ کے لیے تھا۔ وہ محبت جو کتابوں اور کہانیوں میں ہوتی ہے جو لیلیٰ اور مجنوں نے کی تھی۔ اگر میں کر رہا تھا تو اس مسلمہ سچائی کی میں نفی کرنا چاہتا تھا کہ محبت صرف ایک سے اور ایک بار ہوتی ہے۔ کیا میں فراڈ کر رہا تھا؟ کھیل رہا تھا یا خود کو دھوکا دیتا رہا تھا جہاں تک فراڈ کا تعلق ہے، میں نے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی، کسی سے کھیل نہیں کھیلا تھا۔ میں نے ہر ایک کو پھول کی طرح پسند کیا اور کسی پھول کو نہیں نوچا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ لیلیٰ مجنوں والی محبت میں نے کسی سے کی ہی نہ تھی۔ بس جو خوب رُو تھی، مخلص تھی مجھے متاثر کر گئی تھی۔

☆

پونے نو بجے جب میں خان کی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تو تینوں لڑکیاں کیاریاں دُرست کر رہی تھیں۔ رشیدہ برہنہ پا اور سر پھاوڑا چلا رہی تھی۔ ثمینہ مٹی ہموار کرتی جا رہی تھی اور ایمینا شاخ تراشی میں مصروف تھی۔ رشیدہ نے سر جھٹک کر بالوں کو پشت پر ڈالا اور پھر لپک کر دوپٹہ اوڑھ لیا۔

"کیا مس ثمینہ اور ایمینا بھی گروپ میں شامل ہیں؟" ہارون نے اُتر کر پوچھا۔

"نہیں پیارے، یہ دونوں میرے ایک جرم کا کفارہ ہیں۔"

"جرم...؟" ہارون نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں ہارون! میں نے ان کے سروں سے باپ کا سایہ چھینا ہے۔"

"آپ... آپ..." اُس کے ہونٹ جذبات سے کپکپانے لگے۔ "ایسا بھی سوچتے ہیں چیف...؟"

"کیا میں انسان نہیں ہوں؟"

"عظیم... انسان..." وہ بڑبڑاتا ہوا میرے ساتھ چل پڑا۔

"ایک مہمان اندر آپ کا منتظر ہے خرم۔" رشیدہ نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے بتایا۔

"ہارون!" میں نے گردن موڑ کر کہا۔ "آپ لوگ لان میں کام کریں۔ میں نہیں چاہتا ملک نواز کی کوئی آنکھ آپ کو میرے ساتھ یہاں دیکھے۔ تم لوگ اب میرے لیے دُعا کرو گے۔"

"حکم و خرم۔" رشیدہ نے پکارا۔ "امام ضامن۔" اُس نے دوپٹے کو بچھا کر پٹی بنائی اور میں نے بازو اُس کی طرف بڑھا دیا۔ جب وہ امام ضامن باندھ چکی تو میں اس کے سر پر تھپکی دے کر آگے بڑھ گیا۔

مجھے دیکھ کر وہ شخص تڑپ کر اُٹھا اور پھر گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا تھا چالیس پینتالیس برس کا وہ گٹھیلے بدن... کا مالک تھا۔ بہترین تراش کے تھری پیس سوٹ نے اُس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی وجاہت میں خاصا اضافہ کر دیا تھا، وہ فطرتاً مہذب تھا یا اُسے مہذبانہ انداز اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ میں نے سلام کی رسم نبھاتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"ملک صاحب نے آپ کو سلام بولا ہے جناب۔" وہ ہاتھ ملاتے ہوئے ممنانی آواز میں بولا۔

"گاڑی لائے ہو۔؟"

"نہیں جناب۔" اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں بتایا۔ "میں ہوٹل سے حاضر ہوا ہوں۔"

"اچھا تو پھر چلیں۔" میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چل دیا تھا۔ میں نے لان میں کھڑے لوگوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ہاتھ دے کی بجری چلتا ہوا گیٹ سے نکل گیا۔

"آپ کے لیے گاڑی حاضر ہے جناب۔" ایک آدمی نے سینے پر ہاتھ باندھ کر بتایا۔ "ہم کچھ لیٹ ہو گئے ہیں شاید۔" ایک سفید رنگ کی سیڈیز کھڑی تھی اُس آدمی نے لپک کر سفید رنگ کی سیڈیز کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ ڈرائیور کسی سنگی بت کی طرح سیٹ پر بے حس و حرکت تن کر بیٹھا ہوا تھا۔

"مسٹر کمال آپ کے لیے دوسرا حکم ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچا دیا گیا ہے۔"

"شکریہ۔" کمال ایک قدم ہٹ کر بولا اور پھر ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا ہوا چل پڑا۔

جونہی دروازہ بند ہوا کار کا انجن جیسے خود کار نظام سے اسٹارٹ ہو گیا تھا، کار کا رُخ ولیسٹرج کی جانب تھا حالانکہ رات مجھے اسلام آباد لے جایا گیا تھا۔

"کیا ملک صاحب اسلام آباد سے تشریف لے آئے ہیں۔؟" میں نے ساتھ والے شخص سے پوچھا۔

"جی ہاں جناب اور دس بجے کی فلائٹ سے کراچی جا رہے ہیں۔"

"آپ کا تعلق مقامی ونگ سے ہو گا۔؟"

"جی ہاں جناب۔" اس نے مختصر سا جواب دے دیا، اُسے کریدنا بے سود ہی تھا۔ ہاں اگر میرا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور مجھے معلوم ہوتا کہ مقامی ونگ سے واسطہ رہے گا تو شاید میں اُسے شیشے میں اتار لیتا، کار بھی ساؤنڈ پروف تھی منزلِ مقصود تک صرف میں اپنی دھڑکنیں ہی سنتا رہا تھا۔

گیٹ ایک باوردی دربان نے کھولا اور جب کار وسیع پورچ میں رُکی تو وہاں بھی باوردی شخص کھڑا تھا اُس نے مؤدب انداز میں پچھلا دروازہ کھولا اور جب میں باہر نکلا تو اُس نے ہاتھ اُٹھا کر سلیوٹ دیا تھا۔ گراسی لان میں ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ساتھ ایک ہرنی بھی ٹہل رہی تھی، لڑکی نے ادائے خاص سے بالوں کو جھٹک کر میری جانب دیکھا اور ہرنی کی پشت تھپتھپانے لگی پتے سفر کا گائیڈ بھی نیا تھا جو لوگ میرے ساتھ آئے تھے وہ کار میں بیٹھے رہ گئے تھے ملک نواز یقیناً مجھے متاثر کرنے کا کھیل رچائے ہوئے تھا ہر مرحلے پر آدمی بدلنے کا اور کوئی جواز نہ تھا اگر کمال ہی میری رہنمائی کرتا تو بھی منزل مل جاتی بند دروازے پر میرے گائیڈ نے ہلکی سی دستک دی اور تین قدم پیچھے ہٹ کر میرے عقب میں چلا گیا۔

دروازہ خود کار انداز میں آہستہ آہستہ وا ہوا تھا۔ پھر ایک خاتون سامنے آئی اُس نے سیاہ اسکارف باندھ رکھا تھا

"خرم سلطان چوہدری۔؟" اُس کے مترنم سوال کا جواب میں نے سر کو اثباتی جنبش میں لا کر دیا۔ "تشریف لائیے" وہ ایک طرف ہٹ گئی، میں اندر داخل ہوا تو اُس نے دروازہ بند کر دیا کمرے میں صرف گداز قالین بچھا ہوا تھا فرنیچر نام کی کوئی شے نہ تھی۔

"ملک صاحب میٹنگ ہال میں ہیں، پہلے اس کمرے میں میٹنگ کا پروگرام تھا لیکن ملک صاحب نے کمرا بدل دیا ہے آپ کو چند منٹ انتظار کی زحمت گوارا کرنا ہو گی۔"

"کیا ہم بند کمرے میں ٹہلنے کے بجائے لان میں نہ چلیں۔؟"

"سوری مسٹر خرم۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں باہر نہیں جا سکتی، آپ کے لیے بھی یہی ہدایت دی گئی ہے۔ البتہ ہم کافی سے شغل کر سکتے ہیں آئیے۔" وہ چلتی ہوئی بغلی دروازے میں داخل ہو گئی۔ وہ باتھ روم رہا ہو گا جسے عارضی طور پر اسٹینک بار میں بدل دیا گیا تھا۔

اُس نے مگ میں کافی ڈال کر مگ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ پاکستان آنے کے بعد پہلی بار کافی ملی تھی وہ بھی مہکتی اور کڑوی۔ میں سپ لیتا ہوا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا وہ بھی مگ لے کر میرے قریب چلی آئی تھی۔

"ملک صاحب کا پسندیدہ برانڈ ہے۔" اس نے سپ لے کر چٹخارہ لیا۔ "میں تو ترس جاتی ہوں جب کبھی ملک صاحب آتے ہیں تو ملتی ہے۔"

معاً مجھے احساس ہوا جیسے خاتون کا بدن پھیلنے اور سکڑنے لگا ہے اُس کا توازن بھی بگڑ رہا تھا وہ دھیرے دھیرے فضا میں تر تھی ہو رہی تھی۔ میں نے سر کو جھٹک کر پھر دیکھا وہ دُھند میں جا رہی تھی اور کافی کا مگ اتنا وزنی ہو گیا تھا کہ سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔

شاید پہلے مگ گرا تھا کیونکہ میرے پاؤں پر گرم گرم چھینٹے پڑے تھے پھر وہ خاتون جیسے فضا میں تحلیل ہو گئی تھی بس ایک دُھندلا سا ہیولا میرے سامنے تھا پھر وہ سایہ بھی تاریکیوں میں گم ہو گیا تھا۔

جب تاریکی چھٹی تو کمرے کا ماحول بدل چکا تھا میرے اردگرد بڑی بڑی آہنی الماریاں استادہ تھیں، الماریوں کے درمیان گتے کے ڈبے قطار میں چھت تک چلے گئے تھے اور میرے نیچے گداز قالین نہیں بلکہ اکھڑا ہوا فرش تھا، میں نے پہلے ہاتھوں کو حرکت دی پھر پاؤں ہلائے اور اٹھ کھڑا ہوا کوئی زخم تھا نہ درد البتہ ذہن بوجھل اور بدن تھکا تھکا محسوس ہو رہا تھا، میں نے ایک کارٹن سے ٹیک لگائی تو ساری کوفت اور تھکن دُور ہو گئی تھی جہاں کے لیے میں نے سفر کا فیصلہ کیا تھا مجھے وہیں پہنچا دیا گیا تھا، الماریاں مقفل تھیں لیکن لفافے سے خط کا مضمون ظاہر تھا، میں ملک نواز کا قیدی تھا اس لیے مجھے یقین تھا کہ الماریوں میں نہ تو فائلیں ہوں گی نہ نوٹ بھرے ہوئے ہوں گے۔

چونکہ کوئی محافظ نہ تھا اس لیے میرا اندازہ یہی تھا کہ اُن لوگوں کو یقین رہا ہو گا کہ جیل سے قیدی فرار نہ ہو سکے گا پھر بھی میں نے گھوم پھر کر فرار کے امکانات کا جائزہ لیا تھا مجھے تو دیوار میں کوئی دروازہ تک نہ ملا تھا جیسے مجھے اندر پھینک کر دیواریں اٹھائی گئی تھیں، دروازہ تو تھا ہونا بھی چاہیے تھا لیکن کہاں تھا اُس وقت تک مجھے دکھائی نہ دیا تھا جب تک انہوں نے خود ظاہر نہ کیا تھا۔

اچانک ہی ایک مقفل الماری کھٹاک سے کھل گئی تھی میں نے جھانک کر دیکھا وہ الماری نہیں بلکہ دروازہ تھا دوسری طرف ایک روشن کمرہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور فرنشیڈ کمرے میں جا نکلا، دائیں جانب میرا میزبان فاریہ کاپ چمکتی میز کے پیچھے بیٹھا سگار پی رہا تھا

"سفر کا طریقہ تمہیں پسند آیا چوہدری۔؟" ملک نواز نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

"شکریہ جناب۔" میں نے ممنون آواز میں جواب دیا۔ "میں سفر سے ہمیشہ الرجک رہا ہوں، آپ نے مجھ پر کرم کیا ہے۔"

"میں اپنے پسندیدہ کرداروں پر اسی طرح کرم کیا کرتا ہوں۔" وہ مسکرایا اور میں قطار میں لگی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "جانتے ہو ایسا کیوں ہوا۔؟"

"عرض کر چکا ہوں میری خوش قسمتی سے۔"

"اگر تمہاری قسمت اتنی ہی شاندار ہے تو تمہیں آئندہ سفر کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔"

"بحیثیت مسلمان میں ہر لمحے اُس سفر کے لیے تیار رہتا ہوں جناب۔"

"تیاری اور روانگی کے درمیان بہت فرق ہوتا ہے لڑکے۔" وہ سگار چکھنے لگا، میرا اندازہ کاٹ رہا تھا شاید "اور اتنا ہی فرق سیٹھ سلیمان اور ملک نواز میں بھی تم محسوس کرو گے۔"

"بے شک جناب سلیمان تالاب کا مچھوا اور آپ سمندر کے مگرمچھ ہیں۔"

"پھر بھی تم نے دشمنی مول لے لی۔؟"

"کافی کے چوتھے گھونٹ تک میرا ذہن بالکل صاف تھا ملک صاحب۔" میں نے آواز میں گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "دشمنی کی ابتدا بلکہ اظہار آپ کی طرف سے ہوا ہے اور میرے نزدیک بلاجواز ہوا ہے۔"

"نہیں چوہدری۔" ملک نے میز پر ہاتھ مارا۔ "تم جانتے ہو فیصلہ بلاجواز نہیں ہوا۔"

"پھر جواز سے مجھے آگاہ کیا جائے۔"

"تم نے روانگی کی اجازت کس سے حاصل کی تھی خرم سلطان۔"

"اپنی ذات سے جناب کیونکہ تا حال میرا کوئی ماسٹر نہیں ہے۔"

"پھر ڈی آئی جی سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔؟"

"وہی جو عوام اور پولیس کا ہوتا ہے۔" میں نے بتایا۔ "آپ جیسے شخص کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہو سکتی، آپ کو یاد ہونا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہیئے تھا کہ میں نے والدِ محترم کے قتل کا ذکر کیا تھا اور قاتل کو پولیس نے نہ صرف تحفظ دیا تھا بلکہ فرار ہونے میں مدد بھی دی تھی، اس سازش میں ڈی آئی جی سے کم عہدے کے تمام افسران شامل تھے تب میں نے ڈی آئی جی سے فریاد کی تھی اور انھوں نے انصاف کا یقین دلایا تھا، میں چونکہ غیر معینہ مدت کے لیے پنڈی سے جا رہا تھا اس لیے ڈی آئی جی کو وعدہ یاد کرانے گیا تھا۔"

"چلو مان لیا۔ لیکن میرے آدمیوں کو۔۔۔؟"

"اگر وہ کارروائی نارمل تھی تو میں معافی مانگ لوں گا۔ لیکن دوستوں کی نگرانی نہیں کی جاتی یہی بات آپ تک پہنچانے کے لیے میں نے بے ضرر سی کارروائی کا فیصلہ کیا تھا، اگر میں چاہتا تو پیکر ٹائر نہیں بلکہ آدھڑے ہوئے جسم آپ کو ملتے۔"

"اوں۔ اوں۔ ٹھیک ہے لڑکے تمھارے جواب نے مجھے مطمئن کر دیا ہے، لیکن تمھیں اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے ابھی کچھ مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اگر تمھارا انتخاب صرف ایک کارندے کے لیے ہوتا تو پرچا شکل ہوتا نہ آزمائش کی ضرورت تھی لیکن میں نے تمھیں دوسری پوزیشن کے لیے منتخب کیا ہے، تمھاری سفارش سلیمان نے کی تھی، مجھے بتایا گیا تھا کہ تم کچھ عرصہ باہر رہے ہو اور وہاں تم نے دو بڑے ماسٹروں کو پچھاڑ کر اپنی مارکیٹ قائم کر لی تھی، میں تمھیں فارن ونگ کا ماسٹر بنا رہا ہوں، اُدھر ایک بوڑھا ہے لیکن وہ ناکام ہے۔ بنکاک سے بوریا بستر لپیٹ کر ہانگ کانگ گیا تھا لیکن وہاں بھی اُسے پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اُس نے اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیا ہے۔"

"یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوتا جناب۔" میں نے ممنونیت سے بتایا۔ "لیکن میں بڑا عہدہ اور باہر جانے کے لیے آپ کو تاریکی میں نہیں رکھوں گا۔ ہانگ کانگ، بنکاک اور فلپائن کا ذرّہ ذرّہ میرا دشمن ہے ونگ ماسٹروں سے لے کر مقامی انتظامیہ اور انٹرپول میری تلاش میں ہے۔ بندرگاہوں، ہوائی اڈوں اور شہر کے چوراہوں پر میری قدِ آدم تصاویر چسپاں ہیں، آپ اپنے ذرائع سے میری باتوں کی یہاں اور وہاں تصدیق کروا سکتے ہیں۔ مجھے اپنی پروا نہیں، لیکن میں آپ کا بزنس اور سیاسی کریئر داؤ پر لگانا پسند نہیں کروں گا۔"

"ہانگ کانگ میں داخل ہونے تک میں تمھیں تحفظ دے سکتا ہوں۔"

"داخل ہونا کوئی مشکل مرحلہ نہیں جناب، اصلی کام تو وہاں پاؤں جمانا اور مارکیٹ بنانا ہے یہ کام چند دنوں میں نہیں ہو سکتا، وہاں قدم قدم پر ٹکراؤ ہو گا، جب وہ لوگ خرّم سلطان کی بُو سونگھ لیں گے تو پھر میں ایک ہی کام کر سکتا ہوں جم کر مقابلہ یا روپوشی کی زندگی۔ آپ مجھے تھائی مارکیٹ پر لگائیں جناب پنڈی اسلام آباد کی مارکیٹ میں نے اپنے لیے خالی کروائی ہے اب آپ کے مفادات کے حوالے کر دوں گا، اسی طرح ہم دوسرے اہم شہروں کو بھی اپنی تحویل میں لے لیں گے۔"

"ابھی ناداں ہو لڑکے۔" ملک غرّایا اور مونچھوں میں مسکرانے لگا۔ "پنڈی اور اسلام آباد کی مارکیٹ میں میرے ایجنٹ بزنس کر رہے تھے تم نے رنگ باز اور سلیمان کو نہیں ملک نواز کو چوٹ دی ہے، یہی حال دیگر شہروں کا ہے ہر جگہ میرا سکّہ چلتا ہے صرف ہاتھ بدلتے رہتے ہیں۔"

"پھر ہڈی کی ایجنسی مجھے دے دیں جناب میرا حق فائق بنتا ہے۔"

"ابھی نہیں۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں پہلے تمھیں فارن ونگ کے لیے آزماؤں گا تم مال لے کر جاؤ گے اور ایجنسی کے حوالے کر کے خاموشی سے واپس آجاؤ گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ملک صاحب، لیکن یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔"

"کوئی سے مراد۔؟"

"کوئی عام کارندہ۔"

"اوہ۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "نہیں برخوردار فی الحال تم خود کو عام کارندہ ہی سمجھو، میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کیا کرتا، خود کو منواؤ گے تو تمھیں جائز مقام ملے گا۔"

"ٹھیک ہے جناب میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔" میں نے دھمک دار آواز میں کہا۔ "لو کل ونگ دیں یا فارن، اب میں زبان سے اُس مقام کا مطالبہ نہیں کروں گا۔"

"گڈ۔" ملک سر ہلانے لگا۔ "کب تک ٹرپ پر روانہ ہو سکتے ہو۔؟"

"اگر باہر رات ہے تو صبح اور اگر دن ہے تو شام تک۔"

اُس نے ذرا سا جھک کر دراز کھولا اور پھر میری طرف

نوٹوں کی گڈی اچھال کر بولا۔ "دو دن گھومو پھرو اور عیش کرو آج پندرہ ہے اٹھارہ کی صبح تمھاری حاضری ہو گی۔" میں نے اچٹتی سی نگاہ گڈی پر ڈالی اور کندھے اچکاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "رقم اٹھا لو چوہدری یہ لاہور ہے اور تمھاری جیب خالی ہے۔"

"گستاخی معاف ملک نواز صاحب۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد آواز میں کہا۔ "ہم اس انداز میں اپنے پالتو کتے کو روٹی دیا کرتے ہیں، رہا خالی جیب کا مسئلہ تو میں جب ہانگ کانگ کے ایک ہوٹل سے نکالا گیا تھا تو اُس وقت بھی میری جیب خالی تھی اور میں گھر سے سات سمندر دُور تھا۔ وہیں مجھ وقت نے خالی جیب کو بھرنے کا گُر سکھایا تھا۔ وقت دیکھ لیں میں کل اسی وقت بھری جیب کے ساتھ حاضری دوں گا۔" میں کھلی الماری کی جانب بڑھنے لگا تو ملک کی دہاڑ سنائی دی۔

"ٹھہرو لڑکے۔" میں نے چہرہ گھما کر دیکھا وہ کرسی چھوڑ چکا تھا۔ "اس کمرے کی دیواروں میں دروازہ نہیں ہے۔" اس نے گڈی اٹھا کر میز پر رکھ دی۔ "مجھے تمھارے انداز پسند آرہے ہیں، کل چار بجے میں تمھاری جیب دیکھوں گا، آؤ میں تمھیں باہر جانے کا راستہ دکھاؤں۔"

"ایک بات پوچھوں جناب۔؟"

"ہاں ہاں پوچھو۔"

"لاہور کو آپ خود کنٹرول کرتے ہیں۔؟"

"نہیں، میں صرف ہر جگہ اپنا حکم چلاتا ہوں۔"

"یہاں کے ماسٹر کا نام۔؟"

"کیا اس سے ملنا چاہتے ہو۔؟"

"نہیں جناب۔" میں نے مؤدب انداز میں سر نفی میں ہلاتے ہوئے بتایا۔ "میں فرصت کے دو روز آپ کے کارندوں کا طریقہ کار دیکھنا چاہتا ہوں، ہر گروہ کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کوئی اچھی بات مل جائے۔"

"لیکن تم خود کو کسی پر ظاہر نہیں کرو گے۔"

"نہیں جناب، میری مت ماری ہے جو میں ظاہر کروں گا۔"

"شاہ زمان پرانی انارکلی میں ممتاز ڈیلر ہے، میں پھر تمھیں حکم دیتا ہوں فی الحال خود کو پوشیدہ رکھنا۔"

"آپ حکم کیوں کرتے ہیں ملک صاحب۔" میں نے کہا۔ "ہاں اگر مجھے لوکل مارکیٹ دی جاتی تو یہاں شاہ زمان رہتا یا خرّم سلطان، ایک جنگل میں ایک شیر ہی رہ سکتا ہے۔"

ملک نواز نے دیوار میں نصب بٹن پر انگلی رکھ دی آدھے منٹ بعد لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔

"جاؤ، اوپر ہوٹل ہے کاؤنٹر پر یہ دکھا دینا۔" اس نے پیتل کی مثلث نما نکل کی پتری میری ہتھیلی پر رکھ دی۔ "جب واپس آؤ گے تو یہی ڈسک لفٹ مین کو دکھاؤ گے۔" میں نے پتری کو الٹ کر دیکھا درمیان میں دُم دار ستارہ کھدا ہوا تھا۔

لفٹ سے نکل کر میں سیدھا کاؤنٹر کی طرف گیا کیوں کہ کاؤنٹر پر کہنیاں ٹیکے ایک ریچھ نما شخص نظر آرہا تھا ڈانسنگ ہال میں دس بارہ افراد رہے ہوں گے، صاف ستھری نیلی یونیفارم میں بیرے کاؤنٹر کے ساتھ اسٹولز پر بیٹھے ہوئے تھے میں نے مٹھی کھول کر ڈسک سامنے کیا۔ کاؤنٹر کلرک نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے مٹھی بند کر لی۔

"نہیں میرے محترم مجھے واپس آنا ہے۔"

"ٹھیک ہے جائیں۔"

باہر نکل کر میں نے ہوٹل کی وسیع اور بلند عمارت دیکھی پیشانی پر رنگ برنگے پرچم لہرا رہے تھے وہ فائیو تو نہیں فور سٹارز ہوٹل ضرور رہا ہو گا باہر لان اور سوئمنگ پول بھی تھا

۲۲

اگر کسی مزدور کی جیب خالی ہو تو اسے بال بچوں کے پیٹ کا احساس کاٹنے لگتا ہے اس احساس میں اُس کی اپنی ذات شامل نہیں ہوتی لیکن اگر مجھ جیسے شخص کی جیب خالی کر دی جائے تو اُسے صرف اپنی ذات کی مشکلات کا احساس ستانے لگتا ہے، میری جیب ہی نہیں پیٹ بھی خالی تھا تاریخ سے معلوم ہو گیا تھا کہ صبح پونے دس بجے سے پونے چار بجے تک بے ہوش رہا تھا۔

لاہور میں نے کتابوں میں پڑھا اور لوگوں سے سنا تھا، لیکن اپنے وطن کا شہر تھا سڑکوں پر، بازاروں میں اپنے لوگ تھے، میں فٹ پاتھ پر ایک طرف منہ کر کے چل پڑا، میرے آگے پیچھے بھی پیدل لوگ تھے ان کی جیبوں میں پیسے بھی تھے لیکن میں کسی کی جیب سے پیسے نکالنے کے فن سے ناواقف تھا، مجھے کسی بازار کی تلاش تھی میری کلائی پر ٹرانسمیٹر واچ تھی کل تک پچاس روپے کے عوض کوئی بھی شریف آدمی گھڑی گروی رکھ سکتا تھا، کیوں کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھڑی کا فریم اور چین سنہری تھا۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد میں ایک شاپنگ سینٹر میں داخل ہو گیا میری نگاہیں کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دکانداروں میں اپنی پسند کا آدمی تلاش کر رہی تھیں۔ ہر کاؤنٹر پر گاہکوں کا رش تھا میں اتنے لوگوں کی موجودگی میں کسی دکاندار سے بات نہیں کر سکتا تھا، پھر میری نگاہ خواجہ ویلج ہاؤس کے بورڈ پر جم گئی جو میں کاؤنٹر پر تین سیلز مین تھے اور صرف چند خواتین شوکیس میں جھانک رہی تھیں میں ابھی اتفاق رول ہی رہا تھا کہ ایک ماڈرن لڑکی ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ "فف .... فون" وہ ہانپ کر بولی "مجھے کال کرنی ہے"۔ سیلز مین نے ٹیلی فون سیٹ دراز سے نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا، وہ مزاحی مخروطی انگلی سے ڈائل کرنے لگی تو میں نے جھک کر کہا۔

"جناب ایک ذاتی گزارش ہے میرا بریف کیس چوری ہو گیا ہے آپ کل شام تک یہ گھڑی رکھ لیں اور صرف پچاس روپے عنایت فرمائیں، مجھے انارکلی تک کرایہ چاہیئے"۔

"کون زرینہ، سنو میں نورین بول رہی ہوں شادمان سے مظفر خان کو چوہدری پلازہ بھیج دو .... نہیں ہے کہاں مر گیا ہے، مجھے اس کی اشد ضرورت ہے باہر اشفاق کھڑا ہے میرا تعاقب کرتا ہوا آیا ہے"۔

"گھڑی رکھ لیں دوست"۔ سیلز مین نے اپنی جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"اگر کبھی ادھر سے گزر ہو تو دے جایئے گا ورنہ ایک دوست کی طرف سے حقیر سی مدد ...."

"اوہ شکریہ میرے بھائی آپ گھڑی رکھ لیں"۔ میں نے نوٹ اٹھا کر گھڑی بڑھا دی۔

"اتنی قیمتی گھڑی میں نہیں رکھ سکتا جناب"۔

"اور ایک اجنبی پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔؟"

"ہاں"۔ وہ مسکرایا "کچھ اجنبیوں پر بھروسہ کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے"۔

"سنیئے"۔ لڑکی قریب آ گئی۔ "مجھے بھی انارکلی جانا ہے میرے پاس اپنی کار ہے، باہر ایک شخص کھڑا ہے اس سے ہماری خاندانی دشمنی ہے آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی"۔

"چلیئے"۔ میں نے گھڑی باندھتے ہوئے کہا "بہت بہت شکریہ دوست میں اس قرض حسنہ اور اخلاق حسنہ کو یاد رکھوں گا"۔

لڑکی میرے پہلو میں دبکی دبکی سیڑھیاں اتری اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ سرخ منزدا میری کار ہے، اشفاق ادھر دوسری طرف کھڑا ہے"۔

"کیا وہ بھی گاڑی میں ہے۔؟"

"جی ہاں، ویسے وہ غنڈہ نہیں ہے بس مجھے ہراساں اور بے عزت کرنا چاہتا ہے"۔

"کیئے غنڈہ بھی ہوا تو ...."

"نورین۔!" اچانک ستون کی آڑ سے وہ سامنے آ گیا تھا، کسرتی بدن اور چھ فٹ سے نکلتا قد بظاہر وہ رومانی فلموں کا ہیرو دکھائی دیتا تھا۔ "میں صرف تم سے دس پندرہ منٹ مانگوں گا"۔

"نہیں۔" نورین میری آڑ میں ہو گئی۔ "میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی، چلے جاؤ"۔

"آپ۔ یہاں سے ہٹ جائیں پلیز"۔ اشفاق نے لجاجت سے کہا۔ "یہ ہمارا خاندانی مسئلہ ہے"۔

"نہیں دوست"۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا "خاندانی مسائل بازاروں میں طے نہیں ہوا کرتے"۔

"میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا"۔ اس نے میری کلائی پر ہاتھ مارا۔ "جاؤ اپنا کام کرو یہ فلم کی شوٹنگ نہیں ہے"۔

"یوں مس نورین آپ انھیں کچھ وقت دیں گی۔"

"نہیں"۔ وہ زہریلے لہجے میں بولی "میں اس کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی"۔

"اس لیے کہ اب تمھیں کوئی دوسرا منہ پسند آ گیا ہے"۔ وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھا، میں نے فوراً نورین کو کور کر لیا وہ الجھ کر رک گیا اور پھر دانت پیس کر پلٹ گیا، آدمی شریف تھا یا محاط بہرکیف میں ناخوش گوار قدم اٹھانے سے بال بال بچ گیا تھا ورنہ پرائے پھٹے میں ٹانگ پھنس جاتی۔

"اب آپ جائیں مس نورین"۔

"اوہ نہیں"۔ نورین التجائیہ آواز میں بولی "پلیز میرے ساتھ چلیے، وہ آپ کی وجہ سے کھسک گیا ہے"۔

"آپ اپنی کار میں بیٹھیں میں ٹیکسی آپ کے پیچھے رکھوں گا"۔

"لیکن میرے ساتھ کیوں نہیں۔؟" وہ متذکر ہوئی۔ "آپ جہاں چاہیں گے میں ڈراپ کر آؤں گی"۔

"دیکھئے مس میں اجنبی شہر میں پہلے ہی مصیبت زدہ

ہوں آپ لوگوں کے ذاتی معاملات میں الجھ کر مزید پریشانی مول لینا نہیں چاہتا"۔

"کوئی پریشانی کی بات نہیں، رہی آپ کی مالی پریشانی تو میں دور کر سکتی ہوں، بلکہ میرے ڈیڈی اپنے محسن کے شکر گزار ہوں گے"۔ اس نے فرنٹ ڈور کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "آپ کا بریف کیس کیسے چوری ہوا ہے؟"

"اگر میں کہوں کہ ماڈرن بھکاری ہوں تو"۔

"تو میں یقین کر لوں گی"۔ وہ ہنسنے لگی۔ "پھر تو آپ خاصے بال دار ہوں گے پچاس سے کم نہ لینے والا بھکاری کوئی معمولی شخص نہیں ہو سکتا، یہاں تو پانچ دس پیسے لینے والے لکھ پتی ہیں"۔

"میں ایک بڑے سیٹھ سے بھیک مانگنے پنڈی سے آیا ہوں، مگر کسی فنکار نے مجھے کرائے سے بھی لاچار کر دیا ہے"۔

"بزنس ٹور۔؟"

"مال بھیک بھی تو ایک تسلیم شدہ پیشہ ہے"۔ میں نے عقب نما آئینے کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ میں اشفاق کو دیکھنا چاہتا تھا جسے توقع اس کی کار تین گاڑیوں کے پیچھے آ رہی تھی۔ "آپ کا دوست آ رہا ہے"۔

"آنے دیں، اب میں خود کو محفوظ سمجھتی ہوں"۔ وہ گیئر بدلتے ہوئے بولی۔ "اس کا گھر بھی انارکلی میں ہے"۔

"آپ پرانی یا نئی انارکلی میں ہیں؟"

"پرانی کیوں آپ کو کس انارکلی کے پاس جانا ہے؟"

"آپ نے کبھی شاہ زمان کا نام سنا ہے، وہ پرانی انارکلی میں بزنس کرتا ہے"۔

"اُن سے کیا کام ہے؟"

"عرض کر چکا ہوں کہ بھیک مانگنے آیا ہوں"۔

"مذاق نہیں .... اوہ نام تو آپ نے بتایا ہی نہیں"۔

"شاہ زمان کی نسبت سے سکندر زمان کہہ لیں"۔

"چلیئے سکندر ہی سہی نام برا نہیں۔ ملں تو سکندر زمان آپ نے کبھی سنا ہے؟ اتفاق سے فلاں شخص سر راہ مل گیا تھا"۔

"جس طرح آپ سے ملاقات ہو گئی ہے۔ یہ اتفاق نہیں تو اور کیا ہے؟ میرے پچاس روپے بچ گئے ہیں"۔

"ہاں خوب صورت اتفاق کہ میں شاہ زمان کی بیٹی ہوں"۔ اس نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھیں مائل بہ قہقہہ تھیں "ہوئی نا افسانوی ملاقات ...."

اتفاق عموماً فلمی کہانیوں میں ہوتے ہیں"۔

"خدا کرے یہ کہانی فلم کی طرح آگے بڑھے"۔

"کہانی بڑھے گی یا نہیں، وہ دن گاڑیاں اور ٹیک کرتا ہوا بڑھتا آ رہا ہے"۔ میں نے اشفاق کو قریب آتے دیکھ کر کہا۔ "اگر اس نے ٹکر مار دی تو فلم سمجھو مکمل ہو گئی"۔ لیکن اشفاق نے ٹکر نہیں ماری تھی، کراس کرتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔

"اگر اس میں ٹکرانے کی جرأت ہوتی تو میں کیوں ٹکراتی"؟ نورین بولی۔ "اُسے مجھ سے نہیں بلکہ ڈیڈی کے بینک بیلنس سے محبت ہے اور ڈیڈی ہیں کہ اسے سمجھتے ہی نہیں"۔

"ڈیڈی لوگ عموماً نہیں سمجھا کرتے، کیونکہ اُن کے ساتھ عملی زندگی کے تجربات ہوتے ہیں"۔

"یعنی وہ ٹھیک کر رہے ہیں"؟ نورین چلا کر بولی۔ "ایک عیاش اور اوباش شخص کو بیٹی اور اپنی زندگی کی ساری تگ و دو دینے کا فیصلہ درست ہے"؟

"مس نورین میں نے تائید تو نہیں کی"۔

"پھر... پھر... آپ نے تجربات کا حوالہ کیوں دیا ہے"؟

"اس لیے کہ میرے ڈیڈی بھی اپنے تجربات کا حوالہ دیا کرتے ہیں"۔ اور وہ قہقہہ لگا کر رہ گئی۔ اُس نے کار موڑ کر ایک گلی میں داخل کر دی، دو تین سو گز آگے ایک نکڑ پر سفید کار کھڑی تھی اور اشفاق ٹیک لگائے سگریٹ کا دھواں اُگل رہا تھا۔

"تو یہ آپ کا پڑوسی بھی ہے"۔

"نہیں ...." نورین نے کار دوسری گلی میں موڑتے ہوئے بتایا۔ "یہاں اس کی خالہ رہتی ہے"۔ پھر تیسرے مکان کے سامنے اُس نے کار روک دی۔ "اُتریے، میں کار گیراج میں بند کر دوں"۔ میں نے اُتر کر اطراف کا جائزہ لیا۔ اچانک میری نظر اُس نیم پلیٹ پر جا پڑی۔ ورنہ میں تو مذاق ہی سمجھ کر بھول گیا تھا میں حقیقی دنیا میں ایسے اتفاقات کا قائل ہی نہ تھا لیکن اتفاق نیم پلیٹ پر ہنس رہا تھا۔ میں واقعی شاہ زمان کے گھر اُس کی بیٹی کے ساتھ پہنچ گیا تھا۔

نورین نے جب گیراج کا شٹر اُٹھایا تو میں ہوش میں آ گیا۔ گلی کی نکڑ پر اشفاق سینے پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ نورین نے کار بند کر کے کال بیل بجائی۔ ایک خاتون نے صدر دروازہ کھولا تھا۔ نورین نے مجھے اشارہ کیا۔ صدر دروازے سے اندر کھلا لان تھا۔ صحن کی طرح بھنگتہ اور صاف ستھرا۔ سبزے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بائیں ہاتھ تین سرونٹس کوارٹرز تھے۔ دروازہ کھولنے والی عورت ایک کوارٹر سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں چلی گئی تھی۔ وہ کمرا کھلیان جیسا گول اور وسیع تھا۔ پرانی طرز کا قیمتی فرنیچر ایک حصے میں لگا ہوا تھا۔ دوسرے حصے میں قالین پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور دیوار کے ساتھ دس گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ مشرق مغرب کو ایک کمرے میں سمونے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔

"ہاں اب مجھے بتائیں ڈیڈی سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" نورین ایک پلنگ پر گرتے ہوئے چہکی۔ "اگر بزنس میٹر ہے تو میری ضرورت کہاں تک ہوگی؟"

"آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا مس نورین۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے آپ کے ڈیڈی کا نام دورانِ سفر سنا تھا۔ میں ملازمت کی تلاش میں پنڈی سے آیا ہوں۔ ایک ہم سفر نے بتایا تھا... کہ شاہ زمان صاحب کو ایک نوجوان کی ضرورت ہے لیکن میرے پاس کوئی سفارش اور ضمانت نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ریفرنس کا نام لیا تھا۔ میں صرف اب ہاتھ ہی پھیلا سکتا ہوں۔"

"سنو مسٹر نامعلوم...،" وہ ایک دم بدلے لہجے میں بولی۔ "اگر تم دکان میں میرے بعد آتے تو میں دوسرے انداز میں سوچتی لیکن تم مجھ سے پہلے وہاں موجود تھے۔ تمہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ شاہ زمان کی بیٹی کس دکان میں جائے گی۔ لہٰذا میں اپنی عدالت سے تمہیں بری کرتی ہوں۔ رہا ملازمت کا مسئلہ تو مجھے معلوم ہے۔ ڈیڈی کو کسی نوجوان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں مجھے ایک باڈی گارڈ کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ یعنی تمہاری خاطر ضرورت پیدا کی جا سکتی ہے۔ تم پنڈی کے ایک شخص جہانگیر بدر کا ریفرنس دے دینا اور میں پنڈی کوئی غیر متعلق نمبر ملا کر کنفرم کر لوں گی۔"

"اگر پھر بھی جھولی خالی رہی تب...؟"

"تب میں کسی اور جگہ تلاش کر لوں گی۔"

"میرا مسئلہ جیب کا بھی ہے مس۔"

"اوہ...،" وہ اچھل کر اٹھی۔ "کتنے میں تمہاری فوری پریشانی دور ہو سکتی ہے؟"

"بچاس روپے اُدھار چکانے کے بعد چند دنوں کا خرچہ...."

وہ ترشے ہوئے بال نچاتی ہوئی پردہ ہٹا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور میں خود کو کسی طلسمی کہانی کا کردار سمجھنے لگا تھا۔ میری ہتھیلی پر چراغ بھی نہ تھا اور دروازے کھلتے جا رہے تھے۔ تب ہی مجھے چنگ چی کی بات یاد آ گئی تھی۔ اُسے میری پیشانی میں کوئی روشن رگ دکھائی دیتی تھی اور اُس کے عقیدے کی رُو سے میری رگ وہی اثر رکھتی تھی جو الہ دین چراغ میں بتائی جاتی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ کیا چنگ چی نے جو روشنی میری پیشانی میں دیکھی تھی، وہی روشنی میری محافظ اور رہنما تھی؟

نورین جب واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں پانچ روپے والی ایک نئی گڈی تھی۔ حالانکہ میرا خیال تھا۔ وہ دو تین سو روپے لائے گی۔ ایک اجنبی شخص کے لیے کوئی اتنی ہی رقم دان کر سکتا تھا۔

"فی الحال یہ رکھ لو۔" اُس نے گڈی میری جیب میں ٹھونس دی۔ "اگر ڈیڈی نے ہماری درخواست منظور کر لی تو ایڈوانس اور دے دوں گی۔"

"اگر نہ ہوئی تو قرض کی شرائط...؟"

"دوستی...،" وہ آنکھیں نچا کر بولی۔ "تم اس گھر میں رہو یا لاہور کسی دوسری جگہ ہماری دوستی برقرار رہنی چاہیے۔"

"کیا یہ جنہ لاہور کی مارکیٹ میں قابلِ خرید و فروخت ہوتا ہے؟"

"نہیں...،" وہ چونک پڑی۔ "تم نے ایسا کیوں سوچا؟"

"تھینک یو نورین۔"

"تھینک یو مسٹر نامعلوم...،" وہ ہنسنے لگی۔ "اب تو اپنا نام بتا دو۔"

"زمان ہنشاد۔"

"یعنی واقعی تمہارا نام سکندر ہے؟"

"کاغذی شناخت بریف کیس میں تھی، ورنہ شناختی کارڈ... دکھا دیتا۔"

"چلو اعتبار کر لیتی ہوں۔" اُس نے ٹیلی فون ملا کر ہاتھ میں ڈیڈی کے تھانے میں رپورٹ درج کروا دوں۔ ورنہ اشفاق کی رپورٹ پر باز پرس ہوگی۔" نمبر ڈائل کرتے ہوئے اُس نے بتایا۔ "مس رعنا، ڈیڈی سے بات کرائیں۔" اُس نے ماؤتھ پیس پر ہتھیلی رکھ کر مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ اور بولی۔ "اگر میں ناکام رہی تو رعنا کو بڑھاؤں گی، میرے پاس ٹرمپ کا پتہ ہے۔ ڈیڈی اپنے والد مرحوم کو تو ٹال سکتے تھے، مگر اپنی سیکرٹری کے سامنے نفی میں گردن نہیں ہلا سکتے۔"

"ہر بڑے آدمی کے ہاتھ ایک رگ ایسی ہوتی ہے، جس پر اُنگلی رکھ کر دوسرے لوگ فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔" میں نے کہا تو نورین ہنس پڑی۔

"گڈ ایوننگ ڈیڈ... نو فائن ڈیڈ، آج آپ کے پسندیدہ شخص نے شاد مان تک میرا تعاقب کیا تھا۔ اور ایک شاپنگ پلازہ میں اُس نے مجھے گھیرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ بس اتفاق ہی تھا ڈیڈ کہ عین اُسی وقت سکندر سامنے آ گیا تھا، ورنہ اشفاق... آج مجھے سرِ راہ بے عزت کر ڈالتا... کون سکندر... ارے ڈیڈی آپ کو یاد

ہوگا۔ میں نے وکی کے ایک دوست کا ذکر کیا تھا۔ وہ اصل میں کے گھر پارٹی میں بلا تھا۔ اُف اوہ...،" نورین نے میری جانب دیکھ کر آنکھ دبا کر منہ بنایا۔ "ڈیڈ! آپ بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ اُسے انکل جہانگیر نے بھیجا ہے۔ ہاں تو آپ اشفاق کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں... سرزنش... بس اتنی سی سزا... اوہ نو ڈیڈ، اُس کا جرم ناقابلِ معافی ہے۔ میں آپ کی ملازمہ نہیں بیٹی ہوں ڈیڈ... اور اُس نے سرِ راہ میرا راستہ روکا تھا۔ اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے تو اپنی حفاظت کا انتظام میں خود کر لوں گی ڈیڈ۔" اُس نے ٹھٹ سے ریسیور رکھ دیا۔

"کیسا رہا ڈراما...؟"

"شاندار...،" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "آپ بہت نیچرل اداکاری کر سکتی ہیں۔"

"اب بتائیے چائے چلے گی یا کچھ اور...؟"

"اگر کھانے تک یہاں رہنا نصیب ہو تو صرف چائے، ورنہ کھانا... کیونکہ دن کا کھانا نہیں ملا۔"

"دیکھتی ہوں کیا مل سکتا ہے۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ ایک ملازمہ اور لوازمات کے ساتھ واپس آئی تھی۔ اُس نے صرف چائے پی تھی لیکن میں نے تکلف برطرف کر کے تینوں پلیٹیں صاف کر دی تھیں۔ وہ مجھے ندیدے پن کا مظاہرہ کرتے دیکھ کر مسکراتی رہی تھی۔ اُس کا شمار اُن لڑکیوں میں تھا جو خوبرو ہونے کے باوجود مجھے متاثر نہ کر سکتی تھیں، مجھے تو دھیما دھیما سُلگتا ہوا حسن ہمیشہ پسند رہا ہے۔ جب کہ نورین پُرشور اور تیز رفتار پہاڑی ندی تھی۔

رات آٹھ بجے شاہ زمان کی آمد کا اعلان ہوا، نورین مجھے سہارا دینے کمرے میں موجود تھی۔ وہ ماتھی کی مانند جھومتا جھومتا اندر داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے تین نوجوان تھے، جو دروازے پر ہی رُک گئے تھے۔ میں اور نورین تعظیماً کھڑے ہو گئے تھے۔ جب وہ سیدھا میری جانب بڑھتا آیا تو میں نے دو قدم آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

"بیٹھو نوجوان...،" وہ آنبوسی کاؤچ پر گر کر بولا۔ "سناؤ ہمارے برادر جہانگیر کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہیں جناب۔" میں نے مؤدبانہ آواز میں جواب دیا۔ "انھوں نے آپ کے نام خط دیا تھا، جو بدقسمتی کی نذر ہو گیا ہے۔"

"ڈیڈ... ان کا بریف کیس چوری کر لیا گیا ہے۔" نورین نے لقمہ دیا۔ "یہ اپنی گھڑی گروی رکھ رہے تھے۔"

"پردیس میں انگوٹھی اور گھڑی کام آتی ہیں بیٹے۔" شاہ زمان بولا۔ "ہاں مسٹر سکندر، میرے لائق کوئی خدمت...؟"

"جب آپ کا نام لیا گیا ہے تو میں آپ کی خدمت سے شرمندگی سے نگاہیں جھکا کر کہا۔" انکل جہانگیر نے بتایا تھا، آپ کو ایک ملازم کی ضرورت ہے۔"

"بھئی جہانگیر جانتا ہے، مجھے کس قسم کے نوجوانوں کی ضرورت ہوتی ہے؟ فی الحال لکھے پڑھے نوجوان کی ضرورت نہیں۔ بہرطور میں کسی دوسری جگہ بات کروں گا۔"

"انکل جہانگیر نے میرا انتخاب ایسے ہی کام کے لیے کیا ہے، جناب...."

"اوہ...،" وہ سنبھل کر بولا۔ "پہلے کہاں تھے؟"

"فری لانسر رہا ہوں جناب۔"

"ٹھیک ہے میں جہانگیر سے بات کر کے تمہیں جواب دوں گا۔" اُس نے نورین کی طرف دیکھا۔ "لور... ذرا پنڈی ملاؤ۔"

"جہانگیر انکل کو میں نے کال کیا تھا ڈیڈ۔" نورین نے بتایا۔ "وہ کراچی کے لیے فلائی کر چکے ہیں۔"

"تو تم ضمانت دیتی ہو لور؟"

"صرف شناخت کی حد تک ڈیڈی۔"

"اون... اسے رُوم نمبر فور میں لے جاؤ۔" وہ ہمک کر اُٹھا اور میں بھی نورین کے اشارے پر اُٹھ گیا اور ایک مختصر سی راہداری طے کر کے رُوم نمبر چار میں پہنچ گیا۔ یہ کافی کشادہ اور اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ کمرا تھا۔

"نورین... کیا خیال ہے مجھے رکھ لیا جائے گا؟" میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارے انکل جہانگیر و ماں کیا بیچتے ہیں؟"

"پتا نہیں تم پر اعتبار کرنے کو بے اختیار کیوں جی چاہتا ہے؟" وہ اُلجھی اُلجھی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"اس لیے کہ میں مخلص ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ اگر تمہیں کوئی ایسا کام سونپا جائے، جو قتل نہ سہی جرم ہو تو...؟"

"قتل سے اِدھر اُدھر میں ہر کام کر سکتا ہوں۔"

"بلیک میلنگ بھی...."

"ہاں بڑا دلچسپ کام ہوتا ہے۔"

"منشیات کی اسمگلنگ...،"

"اگر معاوضہ معقول ہو تو برا پیشہ نہیں۔"

"انکل جہانگیر بھی اسمگلنگ میں اور میرے ڈیڈی بھی کسی کے اشاروں پر کبھی کبھی انکل جہانگیر کے لیے کام کرتے ہیں۔"

"دعا کرو نورین مجھے تمہارے ڈیڈی رکھ لیں۔ میں کم سنا

چاہتا ہوں۔ قانون کے احترام اور شرافت نے مجھے بھوک کے سوا دیا ہی کیا ہے۔ دولت ہے تو سب کچھ ہے، ورنہ اپنے بھی پرائے بن جاتے ہیں۔"

"کاش ڈیڈی تمہارے خیالات جان لیں۔ میں تمہاری وکالت کروں گی پھر ہم مل کر جدید بنیادوں براہ راست کام کریں گے۔ مجھے ڈیڈی کا طریقۂ کار کبھی پسند نہیں رہا۔ اندھیرے میں بیٹھا شخص اشارے کرتا ہے اور ہم لوگ کما کر اُس کے حوالے کر آتے ہیں۔ ہم یہ رواج اور مناپلی توڑ دیں گے سکندر۔"

"ضرور... ایک بات یاد رکھنا نورین اگر حالات مجھے یہاں سے نکال بھی لے گئے تو ہم ذاتی طور پر رابطہ قائم رکھیں گے۔"

"کیا تم خلوصِ دل سے وعدہ کرتے ہو سکندر؟" نورین کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔

"ہاں نورین، میں نے اپنا مستقبل تمہاری خوب صورت اور روشن آنکھوں میں دیکھ لیا ہے۔"

جب وہ شرمائی تو میں حیران رہ گیا۔ پھر اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ دروازے پر دستک سُنائی دی۔ غالباً ملازمہ کھانے کی اطلاع دینے آئی تھی۔

کھانے کی میز پر وہ نوجوان بھی موجود تھے، جو شاہ زمان کے ہمراہ آئے تھے اور اب کسی نئی نویلی دُلہن کی طرح سکڑے سمٹے پلیٹوں پر نگاہیں جمائے کھانا کھا رہے تھے۔ شاہ زمان نے مجھ سے تعلیم اور خاندان سے متعلق چند ہی سوال کیے تھے۔ دراصل اُسے مُرغِ مسلم کو ادھیڑنے سے ہی کم فرصت ملی تھی۔ اُس کا انداز وحشیانہ ہی تھا جیسے ہلاکو کی فوج کا کوئی بھوکا جرنیل ہڈیاں چبا رہا ہو۔

"صبح تمہیں ایک بڑے آدمی کے پاس بھیجا جائے گا۔" اُس نے ڈکار کی توپ داغ کر کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا اپنے ہاں کوئی گنجائش نہیں ڈیڈی؟" نورین نے التجائیہ لہجے میں پوچھا۔ "آپ نے ایک بار میرے لیے باڈی گارڈ کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔" شاہ زمان نے تولیے سے چہرہ پونچھتے ہوئے میری جانب گہری نگاہوں سے دیکھا لیکن اُوپر سے اجازت ضروری ہے۔ تم ہی اسے ملک نواز کے پاس لے جانا۔ میں فون پر وقت لے لوں گا۔"

میرے اندر قہقہہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

"تھینک یو ڈیڈ..." نورین ممنون آواز میں بولی۔ "میں اکل سے سکندر کو اپنے لیے مانگ لوں گی۔"

"نہیں..." شاہ زمان ایک دم پلٹ کر جھپٹ پڑا۔ "تم صرف اسے پیش کرو گی۔ جب یہ ہمارے پاس آئے گا تو پھر ہم سوچیں گے... کہ کس کو کہاں فٹ کرنا ہے؟"

"بہتر ڈیڈ..." نورین گہری سانس لے کر کھڑی ہو گئی... "آیئے سکندر کافی آپ کو کمرے میں پہنچا دی جائے گی۔"

میں نے جب ملک نواز سے شاہ زمان کے بارے میں پوچھا تھا تو میرے ذہن میں دُور دُور تک یہ خیال نہ تھا کہ شاہ زمان کے ساتھ کھیل کھیلوں گا۔ میں نے محض معلومات اور مستقبل کی ڈائری میں ایسے شخص کا نام لکھ لیا تھا، جو منشیات کے دھندے میں ملوث تھا لیکن حالات و واقعات نے مجھے یا شاہ زمان کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا تھا، جو صرف آگے قدم اُٹھانے کی اجازت دے رہا تھا چونکہ نورین بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی تھی۔ اُس کی باتوں اور شاہ زمان کے اشاروں سے یہ بات ٹک و ٹبھے سے بالاتر ہو گئی تھی کہ نورین کا تعلق بزنس سے نہ ہو گا۔ وہ اپنے باپ کے دائیں ہاتھ پر تھی لہٰذا مجھے اُس سے بھی کوئی ہمدردی نہ تھی۔

"یہ دو پلے ہوئے سؤر کیا رات کو بھی یہیں ہوتے ہیں؟" میں نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں..." نورین نے ہنستے ہوئے بتایا۔ "کچھ اور نہ سوچنا سکندر، ڈیڈی کے ماتحت میرے نزدیک کتوں کی حیثیت سے بھی کم تر ہوتے ہیں۔ آج شاید ڈیڈی کو کہیں جانا ہو گا۔" میں جواباً کچھ نہ بولا تھا لیکن میری آنکھیں اُس سے ان گنت سوال کر رہی تھیں۔ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور پھر جیسے اُس نے آنکھوں میں چھپے تمام سوال پڑھ لیے ہوں۔

"مجھے ٹک سے بالاتر رکھنا سکندر۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "ورنہ ہمارے درمیان تلخیاں گھل جائیں گی۔ مجھے ڈیڈی کے حکم پر بعض اوقات کسی پارٹی سے گھلنا ملنا بھی پڑتا ہے۔ کبھی کبھی انکل نوذر کی کسی بڑی آسامی کی میزبانی کے فرائض بھی مجھے ہی ادا کرنے پڑتے ہیں لیکن وہ سب اداکاری ہوتی ہے اور ہو گی۔"

"بزنس کی حد تک تو برداشت کر لوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ میں طے کر چکا ہوں، تمہارے ڈیڈی کی ماتحتی میں رہوں گا نہ کسی ٹک کی غلامی قبول کروں گا۔ ہم دونوں مل کر الگ گروپ بنائیں گے۔ تمہارے پاس ذرائع اثر و رسوخ اور سرمایہ ہو گا اور میں ذہن اور جسم کی تمام تر قوتیں لگاؤں گا۔"

"یہ کام اتنا آسان نہیں سکندر۔ تم ملک نواز کی طاقت سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

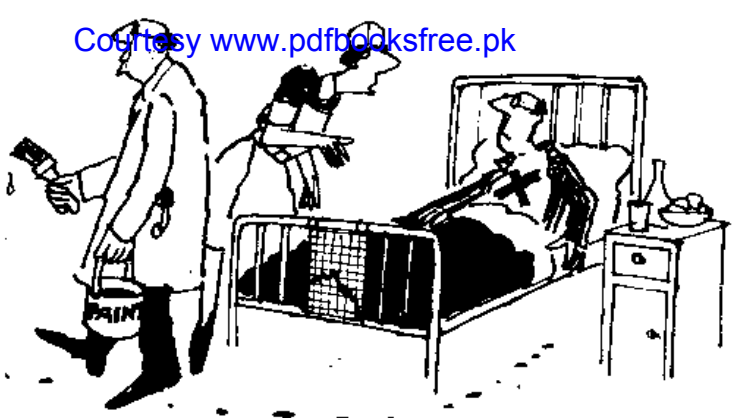

ناواقف ہو۔ وہ متوازی گروپ ایک دن بھی نہ چلنے دے گا۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے، تم یہ بتاؤ کہ ڈیڈی تمہیں سرمایہ تو فراہم کر سکتے ہیں نا؟"

"پاکٹ منی صرف..." نورین نے بیزاری سے بتایا۔ "ڈیڈی میری خاطر اپنی آنکھیں اور کھال تو دے سکتے ہیں، مگر پیسے کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔"

"اُوں..." میں سوچنے لگا۔ "گودام میں مال ملک نواز کا ہے یا تمہارے ڈیڈی مالک ہیں؟"

"ہم صرف کمیشن پہ کام کرتے ہیں۔"

"گڈ... سُنو نورین اگر کسی چور کا مال کوئی دوسرا چور لے جائے تو اُسے کیا کہتے ہیں؟"

"مور..."

"تو ہم مور بن کر چور کا مال اُڑایا کریں گے۔"

"اوہ... نہیں..." وہ چیخ پڑی۔ "گودام پر ہر وقت دو مسلح گارڈ پہرہ دیتے ہیں۔"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم صرف گودام دکھا دینا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں تمہاری خاطر پہاڑوں کی تہ سے بھی گوہرِ مقصود نکال لاؤں گا۔ سوچو، نورین ہم اپنے خاندان سے کٹ کر بھیک تو نہیں مانگ سکتے۔ ہمیں اپنا مستقبل خود تعمیر کرنا ہو گا۔"

"تم... تم..." اُس کی آنکھوں میں خوف در آیا۔ "سکندر تم کون ہو؟"

"چار بجے تک صرف سکندر تھا، جس کی جیب میں پھوٹی کوڑی ٹک نہ تھی لیکن اب نورین کے مقدر کا سکندر ہوں۔"

"اوہ... خدایا، تم نے تو مجھے ڈرا دیا ہے سکندر۔"

"ڈرنے کی وجہ بتاؤ گی نورین؟"

"میرا خیال تھا، تم کسی حریف کے جاسوس یا سرکاری آدمی ہو۔ کیونکہ ایک عام آدمی ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تم بھول رہی ہو مس نورین۔ میں نے تمہارے ڈیڈی کو بتایا تھا کہ میں فری لانسر ہوں، پیشہ یہی تھا۔ میں عام آدمی نہیں ہوں۔"

"اب یہ بھی بتا دو، تم ڈیڈی سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"ندیاں دریاؤں اور دریا سمندر کا رُخ کیوں کرتے ہیں؟" میں نے ہولے ہولے انداز میں سوال کیا۔ "ہر انسان جو ترقی چاہتا ہے اُسے اُوپر والی سیڑھی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ میں اپنی آرمی اسٹریٹ ٹاکر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا، شاہ زمان کھرا مال لیتا ہے اور معقول معاوضہ دیتا ہے۔ میرے پاس ایک سپلائر ہے۔ میں شاہ زمان سے یہی سودا کرنے آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سکندر، میں صبح ڈیڈی سے تمہاری بات کرا دوں گی اور فی الحال ہمارے درمیان یہی معاملہ چلے گا۔ اس طرح ہم ملتے رہیں گے اور ڈیڈی شاید تم میں جوہر دیکھ لیں۔"

"میں تو اب صرف تمہارا قرب اور خوشنودی چاہتا ہوں... صورت کوئی بھی ہو۔"

ایک ملازمہ نے دستک دے کر اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ وہ ہمارے لیے کافی لائی تھی۔ ٹرے میں دو مگ تھے۔ ایک سفید اور دوسرا بھورا۔ ملازمہ نے ٹرے بڑھائی تو میں نے سفید مگ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ملازمہ کو چونکتے اور پھر ٹرے یک دم پیچھے ہٹا کر رکھتے دیکھ کر ہاتھ روک لیا۔ "میں پیش کروں گی جناب۔" ملازمہ کی آواز میں لرزش تھی اور میرے اندر نصب خطرے کا الارم بجنے لگا۔ اُس نے بھورا مگ اُٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ سفید مگ نورین نے اُٹھا کر ہلکا سا سپ لے کر تپائی پر رکھ دیا تھا۔

"ایک بے ہودہ سی آرزو ابھی ابھی بیدار ہوئی ہے۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ڈرتا ہوں تم بُرا نہ مان جاؤ کتنی عجیب خواہش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے میری ؟"

"بھئی سسپنس نہیں، بتا دو۔" نورین ٹھنک کر بولی۔

"ہیں... ہیں... تمہاری جھوٹی کافی پینا چاہتا ہوں۔"

"افوہ... گندی بات..." نورین ہونٹ سکوڑ کر مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں خواہشیں ہوتی ہی مرنے کے لیے ہیں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اپنا مگ اٹھا لیا۔ "محبت انسان کو ذلیل کر دیتی ہے۔"

"ارے تم تو واقعی سنجیدہ ہو گئے ہو۔" اس نے اپنا مگ میری طرف بڑھایا۔ "اتنی ہی بات پر ناراض نہیں ہوا کرتے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ لو اب تم ایک سپ لے کر اپنا مگ مجھے دے دو۔"

میں نے سپ لینے کے لیے صرف ہونٹ کافی سے لگائے اور مگ بدل لیا۔ ملازمہ کے چہرے اور بولوں کے انداز نے مجھے چونکا دیا تھا۔ مجھے یقین نہ تھا لیکن رسک لینے کی بھی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ شاہ زمان ایک اجنبی نوجوان کی اچانک اور ڈرامائی ملاقات پر سوچ سکتا تھا۔ نورین اگر مجھے جاسوس یا سرکاری آدمی سمجھ سکتی تھی وہ بوڑھا بھیڑیا تو کچھ بھی نتیجہ نکال سکتا تھا۔

اگر میں صرف ایک رات بسر کرنے کا ارادہ رکھتا تو خواب آور کافی پی لیتا اور رات گہری نیند سو جاتا لیکن میرے پروگرام میں صرف نیند ہی نہ تھی۔ میں جب سمندر میں اترا گیا تھا تو لہروں کے دوش پر ہلکورے لینے سے بہتر تھا گہرائی میں اتر کر بند سیپی سے موتی نکال لوں۔

"مجھے تو نیند آ رہی ہے۔" نورین نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "تم بھی آرام کرو۔" وہ اچھل کر اٹھی تھی اور میرے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ وہ انجان لڑکی نہ تھی، کافی پیتے ہی نیند کا حملہ اسے بہت کچھ بتا گیا تھا لیکن وہ میرے کمرے میں ہی غافل نہیں ہونا چاہتی تھی۔

"زرینہ..." باہر نکل کر اس نے چیخ کر ملازمہ کو پکارا اور پھر گہری خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

میں اٹھ کر شاہ زمان اور اپنے کامن باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ ادھر کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے کواڑ کی جھری سے آنکھ لگائی۔ کمرے میں دودھیا روشنی تھی۔ شاہ زمان کا پلنگ خالی تھا۔ روشنی نے ڈھارس بندھائی تھی۔ اگر وہ رات بھر کے لیے باہر جاتا تو روشنی بجھا کر جاتا۔ روشنی کا مطلب یہی تھا کہ اسے کسی نہ کسی وقت واپس آنا ہے۔

ٹھیک بارہ بجے میری سماعت سے دروازہ کھلنے کی آواز ٹکرائی تھی۔ میں دم سادھے کروٹ کے بل لیٹا رہا۔ اگر کافی میں بے ہوشی کی دوا اس کے حکم سے ملائی گئی تھی تو اسے اپنے شکار کی صحیح حالت معلوم کرنے آنا ہی چاہیے تھا۔ ابھی میں اندازے ہی لگا رہا تھا کہ باتھ روم کا دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ ابھری اور پھر کمرے کا دروازہ سرسراتا ہوا کھل گیا۔ زیرو پاور بلب کی ملگجی سبز روشنی میں شاہ زمان دروازے سے نمودار ہوا، وہ شیروانی میں ملبوس تھا اور سر پر قراقلی ٹوپی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا میرے قریب آن رکا۔ آنکھوں کی جھریوں سے میں اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ میرا جسم کمبل کے نیچے تنے ہوئے رسّے کی طرح سخت ہو گیا تھا۔

"سکندر..." اس کی کھرکھراتی آواز ابھری۔ "سو گئے ہو سکندر؟" پھر دو قدم آگے بڑھا اور مجھ پر جھک گیا اور میں اپنے چہرے پر اس کے سرد ہاتھ کا لمس محسوس کرنے لگا۔ "اوں... آرام کرو نوجوان..." اس نے میری پیشانی پر تھپکی دی۔

وہ پلٹ کر ابھی دو قدم باتھ روم کی طرف چلا تھا کہ میں اُڑتا ہوا اس سے ٹکرایا۔

"بس آپ کا کھیل ختم ہو چکا ہے شاہ زمان۔" میرے حلق سے غراہٹ ابھری۔ "خاموشی سے اپنے کمرے میں چلو۔"

"ٹھیک ہے بختور دار۔" وہ پُرسکون آواز میں بولا۔ "میں بھی تمہیں تھیلے سے نکالنا چاہتا تھا۔ کوئی حماقت نہ کرنا۔ ہم اُدھر چل کر دوستانہ ماحول میں بات کریں گے۔ میرے بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔ میں نے تمہیں پہچان لیا تھا۔"

کمرے میں جا کر اس نے ٹوپی اتار کر پلنگ پر اچھال دی اور پلٹے بغیر بولا۔ "میری تلاشی لے لو لڑکے، میں شب خوابی کا لباس پہننا چاہتا ہوں۔"

"اس لباس میں آپ زیادہ پُروقار دکھائی دیتے ہیں انکل۔" میں نے ریوالور کا دباؤ بڑھا دیا۔

"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"کیا کھڑے کھڑے مکالمے بازی کرو گے؟"

"نہیں محترم، آپ اگلے قدموں اس صوفے پر بیٹھ سکتے ہیں۔"

"سیدھے قدموں کیوں نہیں؟" وہ ایک دم آگے بڑھا اور پھر پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں غیر مسلح ہوں نوجوان۔ میں ایک رفاہی ادارے کی تقریب سے آ رہا ہوں۔ ہم جیسے آدمی ڈبل زندگی کا عذاب سہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔" وہ گھوم کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "تم بھی سامنے آرام سے بیٹھ جاؤ اور بتاؤ اس ڈرامے کا مقصد کیا ہے؟"

"دولت ٹیکس وصول کرنا جناب۔" میں نے زیرِ لب مسکرا کر جواب دیا۔ "میں نے آپ کی صاحبزادی کو یہی بتایا تھا کہ میں ماڈرن بھکاری

ں ڈاکو اور بلیک میلر کہا جاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کے پاس غیر قانونی دولت ہے۔ لہٰذا میں آپ تک آ گیا ہوں۔"

"تم ڈاکو ہو یا بلیک میلر..." شاہ زمان بھی مسکرانے لگا۔ "لیکن ہو پرلے درجے کے احمق۔"

"بجا ارشاد ہوا جناب، میں واقعی پرلے درجے سے بھی اوپر کا احمق ہوں۔ اگر عقل نام کی کوئی شے میرے پاس ہوتی تو گریجویشن کے بعد اسی جگہ کلرک بھرتی ہو جاتا اور اذیت ناک زندگی بسر کرتا۔ احمق نہ ہوتا تو دولت کا پجاری ہو جاتا۔ دولت کافی آپ کی ملازمہ میرے لیے لائی تھی، وہ بس نورین کو نہ پلاتا۔ پلا تب بھی میں احمق ہوں اور جناب احمق لوگ انجام سے بھی بے خبر ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ نے میری بات نہ مانی تو میں دوسری حماقت کر بیٹھوں گا اور میری حماقت سے آپ کی جان ضائع ہو جائے گی۔"

"اوں تو تم..."

"جی جناب میں ایسا ہی احمق ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آپ نے میرے ریوالور کو پہچان لیا ہو گا کہ اس سے گولی نہیں بلکہ بے آواز زہریلی سوئی نکلتی ہے۔"

شاہ زمان کے چہرے پر خوف کا سایہ لرزنے لگا۔

"میرا مطلب تھا لڑکے، آج کل لوگ قانونی اور غیر قانونی دولت گھروں میں نہیں رکھتے۔ میرے پاس بھی کیش نہیں ہے۔"

"پھر..." میں بجھ گیا۔ "یہ تو بڑی خطرناک بات ہو گی جناب، میں یہاں سے کیش لے کر یا آپ کی لاش چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ یہ میرے بزنس کا بنیادی اصول ہے جناب۔ اگر میں خالی ہاتھوں جانے لگا اور جان بخشی کی عادت پڑ گئی تو لوگ بھکاری کی طرح مجھے دھتکار دیا کریں گے، کچھ کریں جناب۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ اٹھا اور آہنی سیٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ شیروانی کی جیب سے اس نے چمڑے کا پروفی ہوئی تین چابیاں نکال کر سیف کے نمبر ایڈجسٹ کیے اور ساری باری تینوں چابیاں لگا کر سیف کا ڈنی پٹ نیم وا کر دیا۔

"پورا پٹ کھولیے جناب، پھر جو کچھ دان کرنا ہے کیجیے۔"

میں نے ریوالور اس کی گردن سے لگا کر ہٹا لیا۔ اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ نیچے گرتا چلا گیا تھا۔ پھر اس نے چہرہ موڑ کر کہا۔

"مجھے غریباں نہ کرو لڑکے، بھرم قائم رہے تو بات بنی رہتی ہے۔ تمہارے مطلب کا جو کچھ اندر ہوا وہ میں نکال دوں گا۔"

"مطلب کا کوئی خود کار ہتھیار بھی نکل سکتا ہے جناب۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر جھٹکے سے پٹ کھول دیا اور میں غلیل

ں، غیر قانونی دولت سے ٹیکس حاصل کرنے والے ادارے کا

بھرے ہوئے تھے۔ کتنی بوتلیں نکالوں؟" اس نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

"منی بکس کھولیے جناب۔"

"تم بہت بڑے شاطر ہو۔" اس نے بوتل ہٹا کر ایک چابی اٹھائی اور دوسرے لمحے ایک چوکور خانہ کھول دیا۔ تب ہی میں نے دائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی کا آزمودہ کٹ اس کی چہیلی گردن پر مارا۔ تھی تو کہیں بہت نیچے تھی۔ پھر بھی وہ بے آواز گھٹنے موڑتا ہوا ڈھیر ہو گیا تھا۔ میں نے خانے میں ہاتھ ڈال دیا۔ نئے اور پرانے نوٹوں کی چار گڈیاں اور ایک ڈائری تھی۔ میں نے ڈائری کے چند اوراق دیکھے، ٹیلی فون نمبر اور نام درج تھے۔ کچھ ناموں کے سامنے بڑی بڑی رقمیں درج تھیں۔ میں نے سے لیدر فائل کیس اٹھا کر اس میں نوٹ بھر لیے اور ڈائری جیب میں ڈال لی۔ شاہ زمان ایک ہی ضرب سے بے سدھ ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی قوتِ مدافعت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ بعد بھی ہوش میں آ سکتا تھا۔ اس لیے اس گھر میں ٹھہرنا اور صبح کا انتظار کرنا خود کو خطرات کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔

گھر کا واحد نگران گیٹ کے پائے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ فاصلے کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سو رہا ہے یا بیدار ہے۔ کمپاؤنڈ وال مکانوں کی بلندی کے برابر تھی اور درخت نام کی کوئی شے پوری حویلی میں نہ تھی۔ میں ٹہلنے کے سے انداز میں لان کی طرف نکل گیا۔ مقصد یہی تھا کہ اگر نگران بیدار ہوا تو ایک مہمان کو ٹہلتا دیکھ کر کوئی نہ کوئی فدویانہ حرکت کرے گا۔ میں نے لان کے تیسرے چکر میں قریب جا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند اور منہ کھلا ہوا تھا۔ میں گرہ پا چلتا ہوا اس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ پھر گیٹ کی جانب دیکھا۔ بینک لگا ہوا تھا۔ تب مجبوراً مجھے ناخوش گوار فیصلے پر عمل کرنا پڑا تھا۔

کنپٹی پر الٹا مکا کھا کر وہ تڑپ کر ساکت ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی جیب سے بڑی چابی نکال کر تالا کھولا اور گیٹ باہر سے لاک کر کے گلی میں نکل گیا۔ سڑک پر دو آوارہ کتے آمنے سامنے کھڑے غرا رہے تھے۔ سرگوشیوں میں کون سے سٹیلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں نے چونک کر میری جانب دیکھا اور ایک دوسرے کو شب بخیر کہتے ہوئے الگ ہو کر درختوں میں غائب ہو گئے تھے۔ آخری شو دیکھنے والے چند بے فکرے فلم کی کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے سامنے والے فٹ پاتھ سے گزر رہے تھے۔ مجھے توقع تھی کہ کوئی نہ کوئی خالی ٹیکسی سواریوں کی تلاش میں بھٹکتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ تھی یا شاید راستے میں ہی شبنم گل نے خیال کی لہروں کو اپنی طرف موڑ لیا تھا۔ میرے تصور کی گلیوں میں وہ ایسے ٹہلنے لگی تھی، جیسے بادِ صبا بیمار کے تپتے چہرے کو سہلاتی ہوئی گزر رہی ہو اور بیمار کو بے وجہ قرار اور فرحت کا احساس ہونے لگے۔

کار جب رُکی تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، پارکنگ پلاٹ میں بے شمار گاڑیاں پارک تھیں اور لوگ آجا رہے تھے۔ وہ کوئی پلازہ تھا۔ سامنے ہی ٹیلی فون بُوتھ کا سُرخ کیبن دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اُتر کر ڈرائیور سے سکّے مانگے اور بُوتھ خالی ہوتے ہی اندر چلا گیا۔ سکّہ ڈال کر شاہ زمان کے گھر کا نمبر ڈائل کیا، نہ جانے کیوں میری دھڑکنیں کچھ بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ جب تک کوئی جواب دیتا، میں نے گہری گہری سانسیں لے کر منتشر اعصاب پُرسکون کر لیے تھے۔

چوتھی گھنٹی پر ایک منمناتی آواز سُنائی دی جیسے کوئی ناک میں بول رہا ہو۔

"میں مس نورین سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون صاحب؟ بے بی سو رہی ہیں۔"

"اُن کو جگائیے، میں پنڈی سے بات کر رہا ہوں۔" اُس نے بغیر کچھ بتائے ریسیور رکھ دیا تھا۔

"ہیلو کون...؟" نورین کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری اور میں نے طویل سانس لی۔ "کون ہے، بولیے؟" جواباً میں نے پھر ایسی ہی سانس ریسیور کو دی۔ "کیا میں ریسیور رکھ دوں، میں سر دا ہیں سُنتے نہیں آتی؟"

"میرے پاس آہوں کے سوا ندامت اور بے نام سا خوف ہے نورین۔"

"اوہ... اوہ... کون... تت... تم..."

بار انکار کر دیتا تو شاید وہ یہاں تک چلا جاتا کہ ہمارے ملک کی تمام کاریں بوقتِ ضرورت فضا میں بھی بلند ہو جاتی ہیں۔

کار میں بیٹھ کر ہی میں نے سوچا تھا کہ ہار جاؤں گا۔ ڈرائیور کو منزلِ مقصود کے بارے میں بتانا ضروری تھا۔ خرچے کا کوئی خیال نہ تھا۔ ملک نواز کے جُوتے اُسی کے سر پر بجا رہا تھا۔

"داتا دربار...،" بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا اور میرے گنہگار جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ کہاں مجھ جیسا بدکار گناہوں کی پوٹلی اور کہاں وہ جلیل القدر اور پاکیزہ ہستی۔ میں ڈرائیور کو منع کرنے جا رہا تھا کہ اچانک خیال نے زبان پر پہرہ لگا دیا۔ میں نے سوچا صحت مند تو کسی مسیحا کے در پر نہیں جاتا۔ بے غرض کسی تونگر کے دروازے پر دستک نہیں دیا کرتا۔ بیمار و غرض مند ہی جاتے ہیں۔ اس خیال نے ایسے ہی تقویت دی تھی، جیسے کسی بیمار کو یقین ہو جائے کہ جس مسیحا کے پاس جا رہا ہے، اُس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔

رونے کے سامنے میں میں ہمیشہ عورت کا تمسخر اُڑایا تھا لیکن داتا دربار میں قدم رکھتے ہی میرا پورا جسم آنسوؤں اور سسکیوں میں ڈھل گیا تھا۔ میں ہی نہیں میرے جیسے بے شمار دُکھیارے دھاڑیں مار رہے تھے۔

میں دیوار سے لپٹ کر بلک بلک کر رویا تھا۔ جب دل کی کائی آنسوؤں میں مل کر صاف ہوئی تو مجھے ایسے ہی سکون اور قرار محسوس ہونے لگا تھا، جیسے رُوح کی ہتھیلی میں چُبھے ہوئے سارے کانٹے نکل گئے ہوں۔ ایک شخص قرآن چُومتا ہوا جونہی اُٹھنے لگا، میں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ اُس نے کلامِ پاک میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ فجر کی نماز تک میں گردوپیش سے یکسر بے خبر تلاوت کرتا رہا تھا۔

ڈرائیور سیٹ پر سویا ہوا تھا، میں نے اُس کو جگانے کے لیے شیشے پر اُنگلی کی ٹک ماری۔ اُس نے بڑبڑا کر دروازہ کھول دیا۔

"جی صاحب کہاں چلوں؟"

"کوئی جلدی نہیں دوست، خود کو بیدار کر لو۔"

"کوئی بات نہیں صاحب، میں ٹھیک ہوں۔" اُس نے آنکھیں دھڑکاتے ہوئے مستعد لہجے میں جواب دیا۔

"شالیمار...،" میں نے بتایا۔

"ہوٹل یا باغ...؟" ڈرائیور نے کار بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"باغ...،" میں سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ "اور راستے میں جہاں ٹیلی فون بُوتھ آئے مجھے بتا دینا۔" جونہی آنکھیں بند ہوئیں ایکدم جیسے حال کے ملبے سے کسی نے اُچھال کر ماضی کی وادی میں پھینک دیا تھا۔ ماضی بعید نہیں بلکہ ماضی قریب، ذہنی جست اتنی طویل

"نہیں پنڈی سے...،" میں نے تھیلے سے نوٹوں کی گڈی نکالتے ہوئے بے پروائی سے بتایا۔ کاؤنٹر کلرک نے حیرانہ نگاہوں سے نوٹوں کو دیکھا اور معذرتی تاثر چہرے پر طاری کر لیا۔

"مجھے افسوس ہے جناب! شناخت کے بغیر ہم خدمت سے قاصر ہوں گے۔"

"سنو میں تھکا ہوا ہوں۔ صبح تک مال میں کسی میز پر لیٹنے کی اجازت دے دو۔"

"اوہ... نہیں جناب!" وہ کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا۔ "بس جی ذرا مالکان کا ڈر ہے، ورنہ..."

میں نے پچاس کا نوٹ گڈی سے نوچ کر اُس کی جانب سرکا دیا۔ "اس کے علاوہ کرایہ بتاؤ۔"

اُس نے نوٹ درازیں لڑھکا دیا اور رجسٹر کھول کر غدودیانہ آواز میں کوائف پوچھنے لگا۔ کرایہ دے کر میں نے دیکھا، ڈرائیور کاؤنٹر پر کہنیاں جمائے کھڑا تھا۔ اُس کی طرف بھی دس کا نوٹ پھینک کر کلرک کے پیچھے لفٹ کی جانب بڑھتا چلا گیا تھا۔

گیارہ بجے تیار ہو کر رُوم سروس کو ناشتے کا آرڈر دیا۔ میں نے تمام کوائف غلط لکھوائے تھے۔ اس لیے ریکارڈ سے پہچان لیے جانے کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ بس خطرہ تھا تو اُس کاؤنٹر کلرک سے تھا، جس کی ڈیوٹی دن کو شروع ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے تہ خانے سے مخصوص اجازت نامے کے ساتھ نکلتے دیکھا تھا۔

"کیا رات والا ڈیوٹی کلرک موجود ہو گا؟" بیرے سے میں نے پوچھا۔

"نہیں سر...،" بیرے نے بتایا۔ "آٹھ گھنٹے بعد ڈیوٹی بدل جاتی ہے۔"

"میرا مقصد حل ہو گیا تھا۔ کل چار بجے میں تہ خانے سے نکلا تھا۔ ڈیوٹی کے لحاظ سے کاؤنٹر پر نئے کلرک کو ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ چھوٹے بڑے نوٹ جیب میں رکھے اور لفٹ کے ذریعے نیچے آیا۔ کاؤنٹر پر تین کلرک تھے اور تینوں نئے تھے۔ میں نے کاؤنٹر پر چابی رکھی اور ایک کلرک نے سر کو خم دے کر چابی اُٹھا لی۔

"آپ لنچ کس وقت لیں گے سر؟" کلرک نے پوچھا۔ "سروس رُوم کو آرڈر دینا پڑتا ہے سر!"

"تین بجے...،" میں نے پلٹ کر بتایا اور صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔ میٹر ہیوں کے ساتھ بائیں ہاتھ کار بُوتھ تھا۔ میرا دل ہے کار لینے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مگر ایک ایجنٹ نے مجھے گھیر ہی لیا تھا۔ اُس نے کار سروس کی ایسی تعریفیں کی تھیں، اگر میں ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ملن نورین" میں نے گہری گہری سانسیں لینا شروع کر دیں۔ "میں تمہارا... اوہ... کیا... کیا اور کیسے کہوں کہ تمہارا..." میں نے سسکی لی۔ "نہیں کہہ سکتا... ملن تمہارا مجرم ہوں۔"

"سنو سکندر..." اُس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ "کہاں ہو... اگر ابھی ہو میں ہی تو بتاؤ۔ پلیز... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کاش مجھے یقین ہو جائے کہ تم ملو گی۔" میری آواز میں لرزش تھی۔ "پھر... پھر بے شک موت مل جائے لیکن پہلے میں صرف ایک بار تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"یقین کرو سکندر، یقین کرو میں ملوں گی۔"

"ٹھیک ہے نور... اگر یہ سچ ہے تو پھر میں پولیس یا تمہارے ڈیڈی کے غنڈوں کا سامنا کرنے کو بھی تیار ہوں لیکن پہلے ایک لمحے کے لیے تم مل لو۔"

"کہاں ہو سکندر۔ میں بے حد پریشان ہوں اور تم سے فی الفور مل لینا چاہتی ہوں۔"

"شاہ یمار چلی آؤ نورین۔ میں بھی کچھ کم پریشان نہیں ہوں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"میں آ رہی ہوں، پارک میں میرا انتظار کرو۔" اُس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"ہم انارکلی سے کتنی دور ہیں؟" میں نے واپس آ کر ڈرائیور سے پوچھا۔

"ہم اس وقت اُردو بازار میں ہیں جناب۔"

"ٹھیک ہے اُدھر سے چلو۔ ہمیں ایک کار کو دیکھنا ہے جو انارکلی سے شاہ یمار کے لیے روانہ ہونے والی ہے۔" میں نے اُسے کار کا رنگ اور نمبر بتا دیا۔

"دیکھ لوں گا جناب۔" ڈرائیور نے مستعدی سے جواب دیا اور کار موڑ کر ایک تنگ سڑک میں گھس گیا۔ میں بھی چوکنے انداز میں دائیں بائیں ہر گزرتی کار کو گھورتا جا رہا تھا۔ پھر ایک چوک میں ٹریفک کے ریوڑ میں وہ بھی کھڑی دکھائی دی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں نے متعین نگاہوں سے دوسری کاروں میں بیٹھے لوگوں کو دیکھا لیکن کسی کے چہرے پر غنڈہ گردی کا بورڈ نہ تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا، نورین کے ساتھ کتنے غنڈے ہیں۔

شاہ یمار کے پارک میں اُس نے کار پارک کی اور کود گئی۔ باہر نکل کر اُس نے متلاشی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ میں اُس کے بعد آنے والی گاڑیوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ کوئی بھی مشکوک شخص نہ دکھائی دے رہا تھا اگر ہوتا بھی تو خود کو ظاہر نہ کرتا۔

"اُن کو شاید آپ کی تلاش ہے جناب۔" ڈرائیور نے بے تکلفانہ انداز میں بتایا۔

"تم نہلتے ہوئے چلے جاؤ دوست۔" میں نے بھی وقت کو اُستاد مان کر لہجہ دوستانہ بنا لیا تھا۔ "اُس کے قریب جا کر سکندر کا نام لے کر اُدھر کی جانب بڑھ جانا۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں جناب؟"

"گڑبڑ ہوئی بھی تو میرے ساتھ ہوگی۔"

"بہتر جناب..." اُس کی ساری اکڑفوں جھاگ بن کر پھٹ گئی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے اُس کے قریب سے گزرا۔ میں نے نورین کو چونکتے پھر لپکتے دیکھا تھا۔ اُس نے ایک دم ڈرائیور کا راستہ روک لیا اور ڈرائیور نے خوف زدہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا تھا۔ نورین نے بھی اُس کی نگاہوں کا تعاقب کر کے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی تھی۔

"باہر کیوں نہیں آتے سکندر، شاید تمہیں یقین نہیں آیا۔ آؤ میں تنہا آئی ہوں۔" اگر وہ تنہا نہ بھی ہوتی تو چھپنا اور محتاط رہنا بزدلی کو ظاہر کرنے کی بات تھی کیونکہ میں دیکھ لیا گیا تھا۔ اگر اُس کے ساتھ کوئی اور آیا تھا تو وہ کار میں بھی مزاج پرسی کر سکتا تھا۔ دروازہ اُس نے کھولا تو مجبوراً باہر نکلنا پڑا تھا۔

"کار کو واپس کر دو سکندر، ہم کچھ وقت یہاں گھومیں پھریں گے۔" اُس نے ڈرائیور کو اشارہ کر دیا۔ "شاید رات تک، کیا فائدہ کرایہ بڑھانے کا۔"

"کار کی ایڈوانس پے منٹ کی جا چکی ہے، رات بارہ بجے تک کے لیے۔" میں نے بتایا اور وہ ننھے بچے کا کر خاموش رہی تھی۔ "دیکھیے میں تمہارے ساتھ جہاں چاہو چل سکتا ہوں۔"

"اب مجھے بیساکھی بنا کر کہاں تک جانا چاہتے ہو؟" اُس نے کاٹ دار آواز میں پوچھا۔ "تم نے زندگی میں پہلی بار مجھے ایک حیرت ناک تجربے اور شکست سے دوچار کیا ہے، ڈیڈی کے سامنے میری ذہانت کا جو ایک قد تھا بھرم تھا، بالکل چکنا چور ہو گیا ہے۔"

میں چپ چاپ کسی مفرور نالائق بچے کی طرح سر جھکائے اُس کے ساتھ چل رہا تھا۔ حوض کے قریب جا کر وہ رُک گئی۔

"تفریح کا موڈ نہیں ہے نہ پروگرام لہٰذا اُدھر گھاس پر بیٹھیں۔"

"نورین..." میں نے بہتر تکا چاہتے ہوئے کہا۔ "میں صفائی پیش نہیں کروں گا صرف اس کارروائی کی وجہ بتاؤں گا۔ یقین کرنا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ میں نے رات جو کچھ بتایا تھا یہاں آنے کے مقصد تک سب کچھ سچ تھا، لیکن مجھے پتھر مارا گیا، کان پکڑ کر میرا رُخ موڑا

گیا تھا تب میں نے اپنی ذہانت اور ذات کا قد سلیم کروانے کا فیصلہ کیا۔ میں بھیڑ کی طرح سر جھکائے کسی بھیڑیے کو ناشتا کرنے کی اجازت کیسے دے دیتا نورین، کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ بلاوجہ مجھے بے ہوش کیوں کیا جا رہا تھا اور کس کے اشارے پر ایسا ہوا تھا؟"

"اسی بات نے مجھے بھی جواز دیا تھا سکندر۔" نورین قدرے نرم اور دبے دبے لہجے میں بولی۔ "میں نے ڈیڈی سے یہی سوال کیا تھا۔ اُن کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ شاید تمہیں کوئی دوسری قسم کا شکاری سمجھ رہے تھے، اُنہیں شک تھا کہ نورین ایک شاطر لوجوان کی مردانہ وجاہتوں سے متاثر ہو کر گھر تک لے آئی ہے۔ اُن میں اگر اخلاقی جرأت ہوتی تو روکنے کا دوسرا طریقہ بھی تھا۔ وہ حق بھی رکھتے تھے، لیکن اُنھوں نے بزدلانہ راستہ اختیار کر کے مجھے بھی دُکھ دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں اسی دُکھ کا سہارا لے کر ہی سرخرو ہوئی ہوں۔"

میں نے بیگ کھول کر نوٹ اُسے دکھائے اور پھر زپ بند کرتے ہوئے کہا۔ "نورین... میں کچھ رقم مجبوراً خرچ کر چکا ہوں۔ وہ ہمارے درمیان ادھار ہوگا۔ باقی رقم حاضر ہے۔ میں چور، ڈاکو نہیں ہوں، رقم کے ساتھ اپنے ڈیڈی کو بتا دینا۔"

اُس نے ہاتھ سے بیگ روک دیا۔ "نہیں سکندر، اب یہ رقم تمہاری ہے تم نے محنت کی ہے، یہ بھیک اور قرض نہیں بلکہ تمہارا حق ہے۔ ہماری دُنیا میں کچھ لیا دیا نہیں بلکہ چھینا جاتا ہے۔ کافی پیتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا گو اُس وقت میرا ذہن بوجھل ہو چکا تھا لیکن میں نے بے ہوش ہونے سے قبل تمہاری ذہانت کا اعتراف کر لیا تھا۔ مجھے بتاؤ سکندر تمہیں کیسے پتا چل گیا تھا؟"

"مگ کی رنگت..." میں نے جواب دیا۔ "اگر میں کسی مزدور کے گھر ہوتا تو اس بدسلیقگی پر توجہ نہ دیتا۔ مگر ایک کروڑ پتی کے کچن میں دو مگ ایک رنگ کے نہ تھے، یہ بات ناقابلِ یقین تھی۔ پھر ملازمہ جو جرم کر چکی تھی۔ اُس کا احساس اُس کی نگاہوں میں تیر رہا تھا۔"

"اب کیا پروگرام ہے تمہارا؟"

"تمہیں رقم لوٹانے اور معذرت کرنے رُک گیا تھا۔ واپس جاؤں گا۔"

"ڈیڈی سے اگر میں تمہاری صلح کروا دوں تو...؟"

"نہیں نورین، مجھے افسوس ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں ایسے اوچھے شخص کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ میں لوٹروں اور گیدڑوں کے گروہ میں شامل ہو کر اپنی شناخت گنوانا نہیں چاہتا۔ میں اپنا الگ گروہ ترتیب دوں گا۔"

"میرے بارے میں جو تم نے فیصلہ کیا تھا؟"

"وہ... وہ... برس سے الگ ایک جذبہ ہے نورین۔ پہلے میں خود کو سیٹ کروں گا، پھر آؤں گا تمہیں لے جانے کے لیے۔"

"کس راستے سے سکندر...؟"

"پہلے سیدھے راستے کوشش کروں گا۔ اگر کسی نے روک دیا تو پھر ریک ڈور سے..."

"میری ایک درخواست پر غور کرو گے سکندر؟"

"آنکھیں بند کر کے مان لوں گا۔" میں نے عاشق صادق کی طرح پیچھ کر کہا۔ "لیکن میری عزتِ نفس کا خیال رکھنا۔"

"اپنے گروہ میں مجھے بھی شامل کر لو۔"

"کیا میں اپنے بخت پر فخر کروں نورین۔" میری آواز جوشِ مسرت سے کپکپانے لگی۔ "اوہ، میرے خدا تو کتنا مہربان ہے۔ ٹھیک ہے نور، ہم ایک ہیں، یہاں تم وہاں میں... ہم دونوں اپنی محبت کو مرکزِ مان کر اس مرکز کے لیے کام کریں گے۔ میں اُدھر گروہ تیار کرتا ہوں۔ تم یہاں وفادار اور جی دار لوگوں کو جمع کر لو۔ میرا فوننگ، ہیلپائی ڈنگ ہوگا اور یہاں مارکیٹ ہوگی۔ ہم مال اُدھر سے لایا کریں گے اور یہاں گروہ کی مادام نورین مال کھپانے گی۔"

"ڈیڈی سے تعاون کی حد تک شراکت قبول کر لو گے؟" اُس نے التجائیہ انداز میں پوچھا۔

"ہم ایک ہونے کے باوجود خود مختار ہوں گے، نورین تم ایک خود مختار سربراہ کی طرح جو فیصلہ کرو گی، میں معترض نہ ہوں گا، لیکن میری ذات فی الحال پوشیدہ رہنی چاہیے۔"

"بہتر..." وہ جھکی اور میرا ہاتھ مصافحے کے انداز میں تھام کر بولی۔ "اپنا وعدہ یاد رکھنا سکندر، میں تمہارے باپ کی بڑی بیٹی سہی، مگر میرا دوسرا روپ بھی ہے، میں ایک لڑکی بھی ہوں، چاہنے اور چاہے جانے کے جذبوں سے آشنا اور آرزومند جذباتی لڑکی... اپنا فون نمبر دے جاؤ۔"

"سنا نہیں تھا تم نے میں اسٹریٹ ہاکر ہوں۔ دھندہ کر کے گاڑی چلانے والا ٹاکر..."

"اپنی کار کے قریب رُک کر اُس نے اپنی لانبی پلکیں جھپکائیں اور جب آنسو اُبل پڑے تو ایک دم پلٹ کر وہ کار میں بیٹھ گئی تھی۔ میں ہاتھ پیچھے باندھے ٹہلتا ہوا کار کی کھڑکی پر کہنیاں ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اسٹیرنگ وہیل پر سر ڈالے ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ اگر اداکاری تھی تو بڑی ہی نیچرل تھی۔ شاہ زمان کی شاطر بیٹی بڑی کامیاب اداکارہ تھی۔

ڈرامے کا رومانی اور جذباتی سین جب مکمل کر کے میں کار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی جانب چلا تو نہ جانے عجیب سے احساس کا پھندہ گلے میں کیوں پھنس گیا تھا، حالانکہ مجھے اس لڑکی سے محبت تو دُور کی بات تھی۔ کوئی ہمدردی بھی نہ تھی، مَیں ایک زہریلی ناگن سے کیسے ہمدردی کر سکتا تھا۔ نورین کا شمار بھی اُن بُرے اور ظالم لوگوں میں تھا، جو میری قوم کو بدنام اور انسانوں کو مفلوج بنا رہے تھے۔ مَیں کسی غدار قوم اور دشمن انسانیت سے دوستی نہیں کر سکتا تھا، پھر میری ذمّے داریوں میں یہی فرض شامل تھا کہ ایسے لوگوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

مَیں نے وقت دیکھا پونے چار بجنے والے تھے اور ٹھیک چار بجے دوسرا سین فلمایا جانا تھا، ملک نواز نے مجھے چار سے چار بجے تک آزادی دی تھی اور مَیں نے اُس سے ایک وعدہ بھی کیا تھا۔ ایک بازار سے گزرتے ہُوئے معاً میری نگاہ پی سی او کے بورڈ پر جا پڑی تھی۔

مَیں نے اندر جا کر ڈیوٹی آپریٹر کو بیگن کا نمبر دیا۔ "ارجنٹ کال" میرے لہجے نے آپریٹر کو چونکا دیا تھا۔ "فار انٹیلی جینس بزنس"

"اوہ... رائٹ سر" آپریٹر نے محفوظ ٹیلی فون سیٹ گھسیٹ لیا تھا۔

"رنگ جا رہی ہے سر" اُس نے کیبن کی جانب اشارہ کیا اور مَیں اُس کا شکریہ ادا کرتا ہُوا کُوتھ میں داخل ہو گیا۔

"ہیلو ماسٹر گڈ ایوننگ" بیگن کی آواز پہچان کر مَیں نے کہا۔

"سُنائیے سب ٹھیک ہے نا...؟"

"بالکل خیریت ہے چیف۔ آپ بتائیں ملاقات کیسی رہی؟" بیگن مطلب کی طرف آ گیا۔

"پہلا مرحلہ کامیاب رہا ماسٹر اور دوسرا چار بجے شروع ہو گا" مَیں نے بتایا۔ "دوسرا مرحلہ ہو سکتا ہے کہ فیصلہ کُن ہو۔ اس لیے آپ تیز رفتار ذرائع سے ہارون کو یہاں بھیج دیں، مکمل تیاری کے ساتھ۔ ہمیں راستے کی چٹان کو پلاسٹ کرنا ہو گا۔ لہٰذا بلاسٹنگ کا تمام سامان ہارون کے پاس ہونا چاہیے۔ ویسے سٹرک ٹھیک چل رہی ہے۔ اگر یہ چٹان ٹوٹ گئی تو پھر ہم وقت سے بہت پہلے یہ پروجیکٹ مکمل کر لیں گے"

"اگر مزید افرادی قوت کی ضرورت ہو تو...."

"نہیں ماسٹر صرف ہارون اور پتا نوٹ کر لیں" مَیں نے ہوٹل کا نام بتایا۔ "اُسے یہاں کمرا لینا ہو گا۔ مسٹر اظہر ہارون کے نام سے ملاقات کا وقت نہیں دے سکتا۔ چار بجے کی میٹنگ کے بعد ہی کچھ واضح ہو سکتا ہے۔ اگر مَیں فارغ ہُوا تو ڈائننگ ہال میں ہُوں گا"

"کیا اظہر ہارون عام لباس میں ہو گا؟" بیگن نے میک اَپ کے لیے پوچھا۔

"نہیں... اُسے دوسرا لباس پہن کر آنا ہو گا"

"اوکے چیف... اور کوئی حُکم...؟"

"اُدھر ہمارا ایک کلائنٹ ہے جہانگیر بدر... اُس کا پتا نوٹ کر لیجیے اور کوائف معلوم کر لیجیے گا"

"بہتر چیف..." بیگن نے جواب دیا اور مَیں نے ریسیور رکھ دیا۔

جب مَیں دندناتا ہُوا ہوٹل کی لابی میں داخل ہُوا تو چار بج کر دو منٹ ہُوئے تھے۔ کاؤنٹر کلرک کل والا آن ڈیوٹی تھا اور رجسٹر پر جھکا لکھ رہا تھا۔ مَیں نے جیب سے ڈسک نکال کر کاؤنٹر بجایا۔ اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا اور مُسکرانے لگا۔

"جی فرمایئے...؟" اُس نے پیشہ وارانہ لہجے میں پوچھا۔ مَیں نے ڈسک ہتھیلی رکھ کر کہا۔

"مجھے چار بجے حاضر ہونا تھا" اُس نے گردن موڑ کر وال کلاک دیکھا اور ریسیور اُٹھا لیا۔ میری نگاہیں اُس کی اُنگلی پر جمی ہُوئی تھیں لیکن اُس نے صرف زیرو سیون نمبر ڈائل کیا تھا۔

"مس چار بجے کے کتنے ملاقاتی ہیں؟ اور وہ ایک کاؤنٹر پر کھڑے ہیں؟" اُس نے ریسیور رکھ کر دوستانہ مُسکراہٹ دی۔ "آپ اسٹول پر تشریف رکھیں سر" مَیں شکریہ ادا کرتا ہُوا اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اُس نے کوک کی بوتل میرے سامنے رکھ دی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ دو تین منٹ بعد بزر کی گنگناہٹ اُبھری تو اُس نے بن دیکھے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"بہتر مس..." ریسیور کریڈل پر رکھ کر اُس نے نیچے سے سُرخ ٹیلی فون سیٹ نکال لیا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ شاید نمبر مصروف تھا۔ بار بار وہ کھڑی ہتھیلی کی ہلکی سی ضرب کریڈل کو مارتا رہا تھا۔ "ڈیوٹی ڈرائیور کو فی الفور کاؤنٹر پر بھیج دو"

پانچ منٹ ایک شخص نے آ کر چھوٹی سی نوٹ بک کھول کر کاؤنٹر کلرک کے سامنے رکھی۔ اُس نے ایک صفحے پر کچھ لکھا اور پھر پنسل سے میری جانب اشارہ کیا۔

"تشریف لائیے سر..." ڈرائیور نے گردن کو خم دے کر دوستانہ آواز میں کہا۔ مَیں کوئی سوال کیے بغیر اُس کے ساتھ چل پڑا تھا۔

اُس نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور جب میں بیٹھ گیا تو بڑے آرام سے دروازہ بند کر کے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کتنی دُور جانا ہے؟" مَیں نے خاموشی سے اُکتا کر پوچھا۔

لاہور کے اندر ہی سر" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

مَیں نے بھی زبان اور آنکھیں موند لیں... پونے پانچ بجے کار ایک وسیع و عریض کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہُوئی۔ اگر محلوں کا رواج ہوتا تو میں اس عمارت کو محل ہی کہتا۔ جو سطح زمین سے دس بارہ فٹ بلند پلیٹ فارم پر کھڑی ہُوئی تھی۔ پورچ میں ایک ملازم منتظر تھا۔ اُس نے ہی میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔ ہر کام مشینی انداز میں ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے وہی نوٹ بک اُس شخص کے سامنے رکھی اور اُس نے پنسل سے دستخط کر دیے تھے یعنی ڈرائیور نے قیدی وصول کر لینے کی رسید حاصل کر لی تھی۔

"تشریف لے چلیے جناب" اُس نے مؤدب لہجے میں بڑھنے کا اشارہ کیا۔

کئی غلام گردشوں سے گزرتا ہُوا وہ ایک کمرے کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑا ہو گیا تھا، جیسے کہہ رہا ہو جناب آگے مَیں نہیں جا سکتا۔ مَیں نے دروازے پر دستک دی اور دروازے کی پیشانی پر نصب چھوٹا سا بلب روشن ہو گیا۔ وہ بلب سُرخ تھا پھر سُرخ بلب بجھ گیا اور سبز روشنی مُسکرانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ دائیں بائیں سرکتا چلا گیا تھا۔ جب دونوں کواڑ دیواروں میں غائب ہو گئے تو میرے سامنے ایک بُوڑھا کھڑا تھا۔ سفید بالوں سے ہی اُسے بُوڑھا کہا جا سکتا تھا، ورنہ وہ کسی جوان پہلوان جیسا چاق و چوبند تھا۔

"خوش آمدید مسٹر مُحترم سلطان" اُس نے بشاشت سے کہا اور مصافحے کے لیے چوڑا ہاتھ پھیلا دیا۔ مَیں نے قدرے جُھک کر اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ گرفت دوستانہ ہی رہی تھی۔ اُس نے ہاتھ چھوڑا نہیں تھا۔ وہ گھریلو تھی لیکن کمرے جتنی ہی وسیع تھی۔ دائیں ہاتھ ایک دروازہ تھا جس پر سبز رنگ کا ریشمی پردہ ہلکورے کھا رہا تھا۔

اندر ملک نواز موجود تھا۔ میرے سلام کا جواب اُس نے سر کی جنبش سے دیا اور ہاتھ کے اشارے سے صوفے پر بیٹھنے کے لیے حُکم دیا گیا تھا۔

"سلطان تم اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو جاؤ" ملک نواز کی سرسراتی ہُوئی آواز اُبھری۔

"بہتر جناب..." بُوڑھا گردن جُھکا کر بولا اور پھر پلٹ کر باہر نکل گیا۔

"وقت کیسے گزرا مُحترم سلطان؟"

"دیارِ غیر میں جس طرح ایک مسافر کا گزرتا ہے جناب"

"اپنے گزرے وقت کی ڈائری دیکھو گے مُحترم سلطان؟"

"میرے لیے اپنی کارروائی دیکھنا ضروری تو نہیں ملک صاحب"

"بھلا اچھا جواب ہے" وہ پہلو بدل کر مسکرایا۔ "کیا تمہیں احساس تھا کہ میری آنکھیں تمہیں دیکھ رہی ہیں؟"

"نہیں جناب" مَیں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مَیں اتنا اچھا اداکار نہیں ہُوں۔ اگر مجھے احساس ہو جاتا کہ کیمرے کی آنکھ مجھ پر جمی ہُوئی ہے تو شاید گھبرا جاتا"

"نہیں چوہدری تم گھبرانے والے نہیں ہو۔ تم نے عمل سے مجھے متاثر کیا ہے۔ مَیں خود عملی انسان ہُوں۔ مَیں نے کبھی تاریخ نہیں پڑھی۔ اس لیے کہ تاریخ کے واقعات میری آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ مَیں صرف اُس واقعہ پر یقین کرتا ہُوں جسے میری آنکھیں دیکھ رہی ہوں اور کان سُن رہے ہوں۔ وہی واقعہ سچا ہوتا ہے۔ باقی جھوٹ یا رنگ آمیزی ہوتی ہے۔ مَیں نے تمہارے بارے میں سلیمان سے اور دیگر ذرائع سے بہت کچھ سُنا تھا لیکن یقین اب ہُوا ہے کہ مَیں نے تمہیں دیکھا اور سُنا ہے"

مَیں نے اُٹھ کر بیگ اُس کے سامنے رکھی ہُوئی تپائی پر رکھ دیا۔ اُس نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"کل مَیں نے ایک بڑھ ہانکی تھی" مَیں اُلٹے قدموں پلٹتے ہُوئے بولا۔ "بیگ میں آپ کے دستِ راست اور رنگ ماسٹر شاہ زمان کی پرسنل ڈائری اور اُس کے سیف سے حاصل کردہ رقم ہے۔ مَیں اگر رقم کسی دوسرے ذرائع یا شخص سے حاصل کرتا تو شاید آپ یقین نہ کرتے، اس لیے مَیں نے شاہ زمان کا انتخاب کیا تھا" ملک نواز نے بیگ کھول کر رقم دیکھی اور پھر ڈائری نکال کر پڑھنے لگا۔

"ثبوت کی ضرورت نہ تھی مُحترم سلطان" اُس نے ڈائری جیب میں رکھ لی "تمہاری کارکردگی ہی ثبوت ہے۔ تم نے جس ذہانت اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے، اُس کی مَیں داد دے چکا ہُوں۔ تم نے اپنی ہر صلاحیت سے کام لیا ہے، مردانہ وجاہت سے تم نے شاہ زمان کا جُوتا حاصل کیا... اور پھر جرأت سے اُسی کا جُوتا اُس کے سر پر مارا۔ نورین وقت اور شہر کی شاطر ترین لڑکی سمجھی جاتی ہے لیکن تم نے اُسے بے ضرر کھلونا بنا دیا ہے"

"اب میرے لیے کیا حُکم ہے جناب" مَیں نے اُس کی بک بک سے بور ہو کر پوچھا۔

"ابھی کچھ اور امتحان باقی ہیں ہر آسمان کا ایک امتحان"

ملک نے جواب دیا۔

"آپ اپنا وقت اور میری انرجی ضائع کر رہے ہیں جناب" مَیں نے کرخت آواز میں کہا۔ "بزنس میں کھیل کی گنجائش نہیں ہوتی"

ملک نے دبا دبا قہقہہ لگایا اور بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بزنس چل رہا ہے، چلتا رہے گا لیکن ایسے کھلاڑی روز روز نہیں ملتے۔ تم نے کبھی آدم خور درندے کا تعاقب کرتے شکاریوں کو دیکھا ہے خرم؟"

"نہیں جناب..." میں نے نفی میں گردن ہلا کر جواب دیا۔

"میں انسانوں کے جنگل کا شکاری ہوں۔"

"میں نے ایسے ہی ایک کھیل کا انتظام کیا ہے۔" ملک نے زیرلب مسکراہٹ میں بتایا۔ "تم آدم خور درندے کا رول ادا کرو گے اور شاہ زمان شکاری ہوگا اور میں وقت کے کوہان پر بیٹھ کر تماشا دیکھوں گا۔ شاہ زمان اپنی تمام فورس کے ساتھ انسانوں کے جنگل میں ہانکا لگانے میں مصروف ہے اور درندہ میری ذات کی غار میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے سلطان کو بھیج دیا ہے، وہ لوگ ناکہ بندی کر رہے ہوں گے۔ پھر میں درندے کو غار سے نکال دوں گا۔" ملک نواز نے قہقہہ لگایا۔ "کتنا شاندار کھیل ہوگا؟"

"کھیل...؟" میرے حلق سے زخمی درندے کی غراہٹ ابھری۔

"کھیل نہیں، ملک صاحب یہ ایک بزدلانہ فعل ہوگا، سلیمان نے مجھے بتا دیا تھا کہ ملک نواز، خرم سلطان کے بلیک وارنٹ جاری کر چکا ہے۔ قانون کی رو سے سزائے موت کی کوشش صرف ایک بار کی جاتی ہے اور وہ آپ سلیمان جیسے جلاد کے ذریعے کر چکے ہیں۔ میں نے خود کو پھانسی کے پھندے سے بچا لیا تھا۔ اصولاً میری سزا معاف ہو جانی چاہیے تھی لیکن نہیں کی گئی۔ میں درخواست نہیں کروں گا صرف یہ کہوں گا۔ مجھے بھی حفاظتِ خود اختیاری کا حق دیا جائے۔ مچانوں میں شکاری بٹھا کر درندے کو ان کے سامنے بے دست و پا کر کے کھڑا کر دینا انصاف ہے نہ شکار کا اصول ہے۔ اس طرح تو اناڑی بھی درندے کو ہلاک کر سکتا ہے۔"

"تمہیں کھلا میدان اور مقابلے کے لیے ہتھیار ملے گا خرم۔"

ناریکی کا حملہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا

کہ ایک لمحے کے لیے میں بدحواس سا ہو گیا لیکن نامعلوم وہ کون سی قوت تھی جس نے مجھے ذہن میں در آنے والی اس تاریکی کے خلاف مزاحمت پر مجبور کر دیا... میں جو ایک لمحہ پیشتر بے ہوشی کی طرف گامزن تھا اب دھیرے دھیرے ہوش کی دنیا میں واپس آنے لگا۔ میری سماعت سے بہت سے لوگوں کی باتیں کرنے کی بھنبھناہٹ ٹکرانے لگی پھر یہ بھنبھناہٹ تیز آوازوں میں تبدیل ہو گئی۔ لوگ اس حادثے کے بارے میں طرح طرح کی رائے کا اظہار کر رہے تھے لیکن کوئی شریف آدمی آگے بڑھ کر مجھے ٹٹولنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا کہ مبادا پولیس اسے ہی اس حادثے کا ذمے دار نہ قرار دے دے۔

اگر ذہن میں در آنے والی تاریکی گہری اور دیرپا ہوتی تو فیصلہ یقیناً نواز ملک کے حق میں ہی ہوتا لیکن تاریکی ایسے ہی آگے جا کر مجھے روشنی کے حوالے کر گئی تھی جیسے اڑتی چیل کا سایہ اوپر سے گزر گیا ہو۔ دفعتاً مجھے اس بیگ کا خیال آیا جس میں ریوالور اور شاہ زمان کے حلق سے نکالی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جیپ میں وہ بیگ میری گود میں ہی رکھا ہوا تھا اور پھر جس انداز میں مجھے جھٹکا لگا تھا اس سے اس بیگ کو بھی میری ہمراہی میں سڑک پر آنا چاہیے تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے ارد گرد کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا سا لگا کہ وہ بیگ میرے پہلو ہی میں رکھا ہوا تھا۔ شاید کسی اللہ کے بندے نے اسے سڑک سے اٹھا کر میرے قریب رکھ دیا ہو۔ میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

نواز ملک کے کھیل کا انداز مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ کسی بین الاقوامی شہرت یافتہ کھلاڑی سے ہارتے ہوئے دکھ نہیں ہوتا جتنا کہ کسی تیسرے درجے کے کھلاڑی کے ہاتھوں شکست کھانے میں ہوتا ہے۔ اس نے جو کہا تھا کر دکھایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کیمپاؤنڈ وال کے باہر شکاری اپنی اپنی مچان پر بیٹھے ہیں اور تمہیں باہر لے جا کر آزاد کر دیا جائے گا۔

ایسا ہی تماشا ایک دفعہ میں نے ان دنوں دیکھا تھا جب ایام جوم کا شمار علاقے کے بڑے شکاریوں میں ہوتا تھا۔ ہمارے گھر تین اعلیٰ نسل کے شکاری کتے ہوا کرتے تھے۔ کوڈو شاہ کے میلے پر ہر برس شکاری کتوں کی ریس ہوا کرتی تھی اور دور دور سے کتے مقابلے میں حصہ لینے آیا کرتے تھے۔ مقابلے کے لیے تین چار خرگوش جال سے پکڑے جاتے تھے اور دس

کتوں کی ٹیم کے لیے ایک خرگوش کھلے میدان میں کتوں سے چالیس قدم دور آزاد کر دیا جاتا تھا۔

نواز ملک بھی وہی تماشا دیکھنا چاہتا تھا لیکن میں خرگوش نہ تھا اس لیے میں نے حق انسانیت استعمال کرتے ہوئے نواز ملک ... کو گرفت میں لے لیا تھا لیکن میں بھول گیا تھا وہ تیسرے درجے کا نہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت رکھنے والا شکاری ہے۔ اس نے اپنے تجربے کی بھرپور ٹھوکر لگا کر مجھے کھلے میدان میں شکاریوں کی زد پر گرا دیا تھا اور شاید میری خوش قسمتی ہی تھی کہ میں ٹوٹ پھوٹ سے بچ گیا تھا اور اب ایک جم غفیر کے درمیان لیٹا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنے ہجوم میں کوئی بھی شکاری مجھے شکار کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ میں نے ایک نوجوان کو کار سے کودتے دیکھا اور بے ہوش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر میں آنکھیں موند لیتا تو وہ شخص سوال و جواب اور اظہارِ ہمدردی میں وقت ضائع کر دیتا ٹریفک جام ہو جاتا اور راہگیروں کا جم غفیر جو اس وقت مجھ سے قدرے فاصلے پر تھا اپنا گھیرا تنگ کر لیتا اور ان ہی ہمدردوں میں کوئی وقت شناس شکاری بھی ہو سکتا تھا اور وہ دردمندی کا پُرجوش مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔

نوجوان نے تیزی سے بڑھ کر مجھے بانہوں میں بھر لیا اور اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ میں آنکھوں کی جھریوں سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ سیٹ پر بیٹھا بھی نہ تھا کہ سیٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ کار کے دائیں بائیں کچھ لوگ بھی آن کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہی کسی نے میرا بیگ بھی سیٹ پر لڑھکا دیا۔

"کیا ہوا؟ کیا چکر ہے یہ؟" کسی نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ بولنے کا انداز پولیس والوں کا سا تھا۔

"ایک شخص اسے جیپ سے گرتا ہوا آگے نکل گیا ہے۔" میرے محسن نے جواب دیا۔

"کیا زندہ ہے؟" وہی آواز دوبارہ گونجی۔

"ہاں... اور آپ زندگی کا دروازہ روکے کھڑے ہیں۔ اسے فوراً میڈیکل ایڈ چاہیے۔" نوجوان نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے جی۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "آپ لے جائیں۔"

"ٹھہریے۔" ایک گہری آواز ابھری۔ "یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ ہم دونوں انٹرویو دینے آئے تھے، ہمارے پاس اپنی گاڑی ہے۔"

"جلدی کرو۔" میرا محسن بولا۔ "تم گاڑی میرے پیچھے لے آؤ۔" میرے فیصلے کا ہاتھ بند دریچوں کے پیچھے ہو گیا تھا۔ میں آنکھیں کھول کر ان لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ یہ میرا بھائی نہیں بلکہ نامعلوم دشمن کا ساتھی ہے لیکن اس سے قبل کہ میں زبان کھولتا یا شکاری کوئی دوسرا حربہ استعمال کرتا کار نے جھٹکا لگائی اور میرے سینے میں گھٹی ہوئی سانس رواں ہو گئی۔

چونکہ میں لیٹا ہوا تھا اس لیے یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کار کے تعاقب میں کتنے شکاری دوڑے چلے آ رہے ہیں مگر مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے دور نہیں ہوں گے اور کسی بھی وقت کوئی کارروائی کر سکتے ہیں اور اگر وہ اپنی کھوپڑی میں دماغ نام کی کوئی چیز رکھتے تھے تو انھیں ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔

لیکن مجھے نہ تو اسپتال جانا تھا اور نہ ہی میں شکاریوں کی زد میں رہنا چاہتا تھا۔ آنکھیں تو بند تھیں لیکن ذہن کار کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ کسی اسپتال میں داخل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ میں پھر چار دیواری میں قید ہو جاتا اور وارڈ جیسی غیر محفوظ جگہ رکھا جاتا۔ وہ لوگ جو دن کی روشنی میں مصروف سڑک پر شکار پر جھپٹنے کا فیصلہ کر چکے تھے ان کے لیے وارڈ سے اپنے شکار کو حاصل کرنا کوئی مشکل نہ ہوتا۔ خاص طور پر ملک نواز جیسے بااثر آدمی کے لیے۔

معاً میں اٹھ بیٹھا اور نوجوان کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہک گیا۔ اس نے عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسے ممنون نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"شکریہ دوست۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کی بروقت مدد نے مجھے نئی زندگی دی ہے ورنہ وہ لوگ مجھے اٹھا لے جاتے۔"

"اب آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟" وہ اپنے سینے سے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"بہتر۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے تعاقب میں یقیناً کچھ لوگ ہوں گے۔ کیا آپ ایسی گاڑی کی شناخت کر سکتے ہیں جو شروع سے تعاقب کر رہی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے جواب میں بتایا۔ "ایک سفید کرولا ساتھ آ رہی ہے۔" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دس پندرہ قدم پیچھے بلیک کار آ رہی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک شخص تھا۔

"کسی شاپنگ سینٹر میں کار لے چلیے گا دوست۔" میں نے التجائیہ آواز میں کہا۔ "میں خود کو بچانے کی کوشش کروں گا۔" میں کسی مظلوم شخص کی بھرپور اداکاری کر رہا تھا تاکہ مجھے فیصلہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے لیے چند لمحے میسر آسکیں۔

"میں آپ کو اپنے گھر کہیں نہ لے جاؤں۔" اُس نے پلٹ کر مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"نہیں بھائی۔" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں اپنے محسن کو کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کر سکتا۔"

"میرا خیال ہے وہ کھلی جگہ کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔" اُس نے کہا۔ "مگر وہ کچھ کرنا چاہتے تو اب تک کر چکے ہوتے۔ میں گھر لے جا کر آپ کو بیک ڈور سے نکال دوں گا۔"

میں نے اُس اجنبی محسن کی پیش کش کو مدافعتی جان کر قبول کر لیا۔ گو میرے سامنے دوسرا راستہ بھی تھا لیکن جو راستہ اُس نے دکھایا تھا وہ قدرے بے خطر تھا۔ جبکہ دوسرے راستے پر قدم رکھتے ہی کئی طوفان راستہ روک سکتے تھے۔ وہ دونوں میری محبت میں مبتلا تو ہرگز نہ تھے۔ اُن کا تعلق اس پارٹی سے تھا جو میرے جانی دشمن شاہ زمان نے ترتیب دی تھی۔ سڑک پر وہی کار نہ تھی اُس کے پیچھے بھی کئی گاڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ اُن میں بھی کئی گاڑیاں شکاریوں کی ہوں گی لیکن وہ تمام گاڑیاں عام گاڑیوں کی مانند ہی تھیں۔ کسی پر بھی ایسی کوئی علامت نہ تھی جس کی بنیاد پر میں یہ جان سکتا کہ اس میں کوئی عام آدمی سوار ہے یا میرے شکاری۔

میں اگر پارکنگ شیڈ سے کسی دکان تک فرار کا موقع حاصل کر بھی لیتا تو یہ بات یقینی نہ تھی کہ اُس دکان کا بیک ڈور بھی ہو گا اور دوسری جانب کوئی گلی یا سڑک ہو گی۔ ویسے بھی یہ پارکنگ گائک نہیں لاہور کی دکانیں تھیں جن کی تعمیر میں اس قسم کی باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ایسی غیر یقینی صورت سے بہتر یہی تھا کہ میں خود کو اس اجنبی مہربان کے سپرد کر دیتا۔

"یہ لوگ کون ہیں محترم؟" نوجوان نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"شہریوں کے لیے انسان اور میرے لیے بھوکے درندے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ میرے دشمن ہیں۔"

"دشمنی کی وجہ؟"

"زر۔"

"اوہ۔" وہ ہنس پڑا۔ "آپ کی محبوبہ۔۔۔"

"محبوبہ نہیں بیوی۔" میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "جسے میں طلاق دینا چاہتا ہوں۔ اُس کے والدین میری کروڑوں کی جائداد سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔ اس لیے اُسے بیوہ بنانا چاہتے ہیں۔"

"دن دہاڑے۔۔۔؟"

"نہیں میرے بھائی۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بیان دیا۔ "وہ شخص جس نے مجھے جیپ سے دھکا دیا تھا میرا فادر ان لاء ہے۔ وہ پہلے زخمی کرنا چاہتا تھا اور پھر۔۔۔"

مغا کا لہر گئی۔ میں نے دھماکے کی آواز سن لی تھی تعاقب کرنے والوں نے پہیے کو نشانہ بنایا تھا۔ میں نے خود کو ایک دم نیچے گرا لیا۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا اور کار لڑکھڑانے لگی۔ غالباً دوسرا پہیہ بھی ناکارہ کر دیا گیا تھا۔

"گھبرانا نہیں دوست۔" اُس نے کار روکتے ہوئے کہا۔ "میں اُن لوگوں سے بات کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے تھوڑا سا اُبھر کر دیکھا۔ سفید کار آگے جا کر رُک گئی تھی اور ایک شخص اسٹین گن تانے واپس آ رہا تھا۔ نہ جانے لاہور کی وہ تنگ اُکھڑی ہوئی سڑک ویران کیوں تھی۔ میرے محسن نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لیے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا میرا بیگ سیٹ کے کونے میں رکھا ہوا تھا اور پھر جیب ٹٹولی۔ پستول بھی موجود تھا۔ وہ صرف دو تھے اور پستول میں قاتل سوئیاں بہت تھیں۔

لیکن میرا ہاتھ پستول پر جم کر رہ گیا تھا۔ میرا دوست مسکراتا ہوا واپس آ رہا تھا اور گن بردار شخص تیز تیز قدم اُٹھاتا اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا تھا۔

"کوئی شریف انسان ہے۔" میں نے کہا۔ خاموشی سے آپ کی بات سن کر چلا گیا ہے۔"

"اب وہ شریف شخص میرے گھر کے دروازے تک شرافت برقرار رکھے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے آپ کو پچاس ہزار میں خرید لیا ہے۔" اُس نے قہقہہ لگایا۔ "آپ کو کوئی اعتراض؟"

"بہت سستا سودا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے تو سلمیٰ کے واند کو دو لاکھ کی آفر دی تھی۔"

"یہ لوگ کرائے کے قاتل ہیں دوست! جا کر بول دیں گے فرار ہو گیا۔"

"آپ واقعی اُن کو رقم دینے کے موڈ میں ہیں؟"

"ارے نہیں۔" وہ مضحکہ اُڑانے والے انداز میں بولا۔ "آپ کو اندر بھیج کر پچاس ہزار گالیاں اور چند دھکے دینے کا موڈ ہے۔ وہاں یہ لوگ چوہے بن جائیں گے۔"

اُس کی باتوں کے انداز نے پہلی بار مجھے چونکا دیا تھا۔ خوابوں

فلموں اور کہانیوں میں ہر قسم کے جھوٹ اور واقعات چل جاتے ہیں۔ فلم کی فائٹ میں مدِ مقابل فائیٹر کا ایک مکہ کھا کر بلند مینار کی چوٹی پر جا پڑتا ہے اور تماش بین کوئی اعتراض نہیں کرتے بلکہ خوشی سے تالیاں بجانے لگتے ہیں لیکن جاگتی اور روشن زندگی میں اگر کوئی غیر معمولی اتفاق سامنے آ جائے تو وقت کا ڈسا ہوا انسان سوچنے لگتا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔

وہ غیر متعلق نوجوان تھا جس نے انسانی ہمدردی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس کی جگہ اگر کوئی بوڑھا بھی ہوتا تو یہی کچھ کرتا لیکن آگے چل کر وہ جو کچھ کر گزرا تھا اور جو کچھ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا وہ میرے حلق میں پھنس گیا تھا۔ کسی غیر متعلق شخص کے ساتھ کیا مجبوری تھی کہ وہ ایک اجنبی کی خاطر کرائے کے خطرناک قاتلوں سے ٹکر لینے کا فیصلہ کرے۔

بہرکیف میں ایسا مسافر تھا جس کے دائیں بائیں گہری کھائیاں تھیں اور پیچھے کا راستہ پانی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ صرف سامنے ہی راستہ تھا۔

اُس نے خاکروبوں کی کالونی کے درمیان سے کار گزاری اور ایک شکستہ مکان کے سامنے کار روک کر بولا۔ "آپ کے لیے عارضی پناہ گاہ۔ میں اپنے خاندان کو اس جھگڑے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کمینہ پرور لوگ ظاہر ہے مجھے معاف نہیں کریں گے۔" وہ مضروب کار کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر گیا۔

"میں گزارش کروں گا آپ بھی اس جھگڑے میں نہ پڑیں۔" میں نے اُترتے ہوئے کہا۔ "آپ آگے نکل جائیں تو میں اُن سے خود نمٹ لوں گا۔"

"آپ میری ہی نہیں بلکہ ایک مسلمان کی توہین کر رہے ہیں۔" وہ بھڑک اُٹھا۔ "میں نے آپ کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ اب اپنی جان کی خاطر آپ کو درندوں کے حوالے کر دوں؟"

سفید کار دوسری گلی سے نکل کر تھوڑی دُور جا کر رُک گئی اور ایک شخص اسٹین گن چادر کے اندر چھپائے لہراتا ہوا قریب آ گیا۔

"میں اپنے مہمان کو اندر چھوڑ کر واپس آ رہا ہوں۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گا۔" وہ سرد آواز میں بولا۔

"چلو۔" میرے میزبان نے کندھے اُچکا کر کہا۔ "دوسرے کو بھی لے آؤ۔ میں چاہتا ہوں تمہاری واپسی دوستانہ جذبات کے ساتھ ہو۔ ہم چائے کی ایک ایک پیالی پئیں گے۔"

اُس نے پلٹ کر اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور پھر ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ تالا نہ تو لگا ہوا تھا لیکن پرانا ضرور تھا۔ جسے میرے ساتھی نے پاؤں کی ٹھوکر مار دی تھی تالا کھل گیا تھا۔ صحن میں خشک گھاس زمین پر بے ترتیب بکھری ہوئی تھی۔ صدر دروازے سے اندر کے دروازے تک ایک سیدھی لکیر گواہ تھی کہ یہاں آنے والے وائیں بائیں دیکھے بغیر ٹانک کی سیدھ میں چلتے رہے ہوں گے۔ اُس لکیر پر گھاس اُگی ہی نہ تھی۔

اندر جو فرنیچر بکھرا ہوا تھا وہ یقیناً ایک صدی پہلے کسی خوش ذوق نے بنوایا ہو گا۔ نقش و نگار صد سالہ بوڑھے کے چہرے کی طرح دُھندلے تھے۔ بڑی بڑی کرسیوں کی سیٹیں اور پُشتیں پٹوائی وڈ کی تختیوں کی تھیں۔

"تشریف رکھیے دوستو۔" میزبان خوش دلی سے بولا۔ "یہ گھر میرے دادا مرحوم کی نشانی ہے۔ دادی اماں کی زندگی میں ہم اس کی شکل نہیں بدل سکتے۔"

"مسٹر! گن بردار غرایا۔ "وقت ضائع نہ کرو۔ اُدھر جاؤ اور ہمیں رقم لا دو۔"

"جاتا ہوں بھائی۔" وہ ہنس پڑا۔ "لیکن تم بھی بھائیوں کی طرح رہنا۔" وہ ہنستا ہوا بغلی دروازے سے اندر چلا گیا۔ گن بردار نے میری جانب کڑی نگاہوں سے دیکھا اور میں نے تھوک نگل کر دانت نکال دیے۔ جیسے کمزور کتا دو کتوں کے درمیان مسکرا کر دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ مجھے خوفزدہ دیکھ کر وہ دونوں ہنستے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

مغا کلائی پر گھڑی نے چوٹ ماری اور میرا جسم سرسرانے لگا۔ بے خیالی میں ثمینہ گل نے کال کی تھی۔ بڑے مشکل وقت اُس نے مجھے یاد کیا تھا۔ میں اجل کے فرشتوں میں گھرا ہوا تھا۔ اُسے کوئی نہ کوئی جواب دینا ضروری تھا۔ میں نے چابی باہر کھینچ کر فدویانہ صورت بناتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی لوگو وقت کیا ہو گا؟" میں نے گھڑی کو جھٹکا دے کر کان سے لگا لیا اور پھر جو آواز میرے کانوں نے سُنی اُس نے رگوں میں خون منجمد کر دیا تھا۔

وہ کیسا اتفاق تھا کہ میرے دشمن نے تیس فریکوئنسی پر اپنے آقا سے رابطہ قائم کیا تھا وہی فریکوئنسی میری اور ثمینہ کی تھی۔ دوسرے کمرے میں میرا محسن مخالف دشمن بول رہا تھا۔

"میں کمال بول رہا ہوں ماسٹر۔" ہاں آپ نے ٹھیک سُنا۔ میں نے جھپٹ کر اُسے سڑک سے اُٹھایا تھا۔ پانچ نمبر دو کے دو ممبر تعاقب میں تھے بمشکل اُن کو یقین دلا سکا ہوں۔ وہ دونوں باہر موجود ہیں اور مجھے اپنے ماسٹر تک لے جانا چاہتے ہیں شکریہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماسٹر میں انتظار کروں گا۔"

میرے سوال پر گن بردار نے واسکٹ کی جیب سے گھڑی نکال کر وقت دیکھا۔ دوسرا ایزی چیئر میں دھنسا ہُوا چھت کے کرم خوردہ بلے گن رہا تھا۔ میں نے جیب سے پستول نکال کر ایک سیکنڈ میں دونوں کو ایک ایک سُوئی گھونپ دی۔ پرانے وقتوں کی جادوگرنیاں جادوئی سوئی گھونپ کر جنس تبدیل کر دیا کرتی تھیں لیکن جدید دور کے جادوگروں نے زندگی چھیننے والی سُوئیاں ایجاد کر لی تھیں۔

دونوں نے ایک ایک چیخ ماری تھی اور اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے جیسے کھلونے کا بیٹری سیل اپنی برقی قوت زائل کر چکا ہو۔

میں اُچھل کر اُٹھا اور بغلی دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گنگناتا ہُوا جوں ہی اندر داخل ہُوا میرا آہنی مُکّہ اُس کی کنپٹی پر پڑا اور وہ لڑکھڑاتا ہُوا اوندھے مُنہ گرتا چلا گیا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ سنبھلتا میں نے چھلانگ لگائی۔ اُس کی پُشت پر دونوں پاؤں مارتا ہُوا گن بردار کے بے جان ہاتھوں سے گن لیتا ہُوا دروازے میں جا رُکا تھا۔

"مجھے یقین ہے دوست۔" میں اُس کی حیرت زدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بشاش لہجے میں بولا۔ "تم شکوہ نہیں کرو گے حالانکہ میں فیئر کش نہیں ہُوں۔ گینگ اور جنت کے کھیل میں سب روا ہوتا ہے۔"

وہ گھٹنوں کے بل اُوپر اُٹھا اُس کی آنکھوں میں سوال تھا کہ اُٹھنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے بھی آنکھوں سے ہی اثبات میں جواب دیا تھا۔ "لیکن تم ہاتھ گردن میں ڈال لو گے۔ میں تمہیں انسان نوازی کی دوسری کوشش کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

اُس نے خاموشی سے ہاتھ گردن پر رکھ لیے۔

"کیا تمہیں ان لوگوں نے بھروسا دیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں پیارے۔" میں نے مُسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر... پھر... تمہیں شک کیسے ہُوا؟" وہ ہکلانے لگا۔ "کیا تم نے میری آواز سن لی تھی؟"

"میرے ساتھ میرا ہمزاد چلتا رہتا ہے۔" میں نے ہنس کر بتایا۔ "میرا خیال ہے ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ تمہارے ماسٹر کی آمد سے قبل مجھے یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ گے تمہارا تعلق شاہ زمان سے ہے یا ملک نواز کے گروہ کے آدمی ہو؟"

"اگر میں نے سچ سچ سب کچھ بتا دیا تو پھر کیا صلہ دو گے؟"

"تم بتاؤ فیصلہ میں خود کروں گا، بہرصورت تمہیں زندگی کی ضمانت دے سکتا ہُوں۔"

"میرا ماسٹر شاہ زمان ہے نہ ملک نواز۔ میں داؤد خان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہُوں۔ شاید شاہ زمان نے ماسٹر سے تعاون کی درخواست کی ہوگی۔"

"شکریہ۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "ماسٹر داؤد کا بزنس؟"

"بظاہر وہ کمیشن ایجنٹ ہے غلّے کی آڑھت ہے اُس کی مگر درپردہ وہ ہمارے ذریعے منشیات کا بزنس کرتا ہے۔"

"کیا وہ تنہا آ رہا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم اُس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ وہ آ رہا ہے۔"

"زندگی کی قیمت ادا کرو گے۔ آخری سوال تمہاری زندگی سے متعلق ہے مجھے داؤد کا گودام بتا دو۔"

"میں کوئی وعدہ نہیں لوں گا دوست۔" وہ مُسکرانے لگا۔

"تم غیر مشروط تسلیم کرنے کی پوزیشن سے اُوپر ہو۔ اُس کا گودام الگ نہیں ہے، غلّے کی بوریوں میں ہی منشیات کے تھیلے رکھوا دیتا ہے۔ غلّہ منڈی کا وہ بادشاہ ہے۔"

"کار کی چابیاں میرے حوالے کرو اور اوندھے لیٹ جاؤ۔"

"لک... کیا... تم..."

"نہیں دوست صرف مُشکیں کس دوں گا۔"

اُس نے چابیاں نکالنے کے لیے ہاتھ گرائے اور میں نے اسٹین گن اُس کی گردن سے لگا دی۔ چابیاں میرے ہاتھ میں دے کر وہ اوندھا ہو گیا اور میں نے ایک لاش کی گردن سے مفلر کھینچ لیا اور اُس کے ہاتھ پُشت پر باندھ دیے۔ اُس نے ہر سوال کا جواب دے کر خود کو رعایت کا مستحق بنا لیا تھا۔

تینوں کی تلاشی سے تین بہترین قسم کے بھرے ہوئے ریوالور اور کچھ کرنسی نوٹ ملے تھے۔ تالا خود کار رسی تھا چابی کے بغیر کھل گیا اور جب میں نے بند کیا تو آرام سے بند بھی ہو گیا تھا۔ اطراف میں خاموشی کی حکمرانی تھی۔ اس لیے مجھے دو منٹ کی کارروائی کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے شاہ زمان کے گرگوں کی کار کے انجن میں تین گولیاں پیوست کیں۔ اگر وہ تباہ نہیں تو وقتی طور پر ناکارہ ہو گئی تھی۔

چونکہ میں سڑکوں سے ناواقف تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ مجھے کس علاقے میں لایا گیا ہے، اس لیے جدھر سڑک فارغ ملتی اُدھر ہی کار دوڑا لیتا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد مصروف سڑک

ملی تھی اور وہیں میں نے اُس کار کو کچے میں چھوڑ دیا تھا۔ میں خطرے کی گود میں زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ شکاری چھپے ہوئے مجھے کوئی بھی اس کار کو پہچان کر مجھے گھیر سکتا تھا۔

خونی کھیل شروع ہو چکا تھا اس لیے میں اپنے لیے کوئی منزل مارک نہ کر سکتا تھا۔ سب سے اہم مسئلہ خود کو کسی آڑ میں چھپانے کا تھا۔ اگر خرگوش کی طرح محض شکاری کتّوں کی نگاہوں سے چھُپنا ہی مقصود ہوتا تو کسی تیسرے درجے کے ہوٹل میں کمرا لے کر دبک جاتا لیکن میں خود کو ایسا درندہ محسوس کر رہا تھا جو شکاریوں کے تعاقب کو ڈاج دے کر آبادی میں داخل ہو گیا تھا۔ میرے سامنے اپنی جان کی سلامتی کا سوال نہ تھا بلکہ شکاریوں پر جھپٹنے کا عزم تھا۔ میں ملک نواز کے سامنے بحیثیت بھگوڑا نہیں جانا چاہتا تھا۔

غروبِ آفتاب کی زردی سڑکوں، درختوں اور عمارتوں پر طاری تھی۔ میں نے فٹ پاتھ پر رُک کر مغربی اُفق کو دیکھا۔ میناءِ پاکستان کے پس منظر میں زرد رو سورج اُفق کے حلق میں اُتر رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی اُداسی تیر رہی تھی یا میں ہی اُداس تھا اور میری اُداسی فضا پر طاری تھی۔

ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ ہارون اگر بائی ائر بھی آتا تو اُسے تیاری اور ائرپورٹ تک جانے میں وقت درکار تھا۔ پھر سرِ شام میں ملک نواز کی کچہار میں داخل ہونے کی جماقت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سڑک پر چیختی چلّاتی تیز رفتار زندگی کا طوفان اِدھر سے اُدھر دوڑ رہا تھا۔ جانے لوگوں کو کہاں جانے کی اتنی جلدی تھی۔ پیدل چلنے والے بھی ایک دوسرے سے ٹکراتے پھر رہے تھے۔ اور میں اس شور کے درمیان چُپ چاپ سنگی بُت کی طرح کھڑا تھا۔ ہر آنے والی ٹیکسی کے لیے ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے رُک جاتا تھا کیونکہ ہر ٹیکسی مصروف گزر جاتی تھی۔

معاً اس دُنیاوی طوفان پر اذان کی وجد انگیز آواز حاوی ہو گئی اور میرے قدم خود بخود متحرک ہو گئے۔ میں ٹریفک کے اژدہام سے بچتا ہُوا سڑک پار کر گیا تھا۔

میں شاید آخری نمازی تھا جس نے مسجد چھوڑی تھی۔ میں عبادت میں نہیں ڈوبا۔ ہاتھ بلکہ وقت گزارنے کے لیے مسجد کی فضا بے حد پُرسکون اور محفوظ تھی۔

میری گھڑی میں ٹھیک نو بجے تو میں ایک چلڈرن پارک سے نکل کر جنرل اسٹور کی تلاش میں گردش کرنے لگا۔ چوتھے اسٹور میں نے میرا مطلوبہ سامان نکال کر کاؤنٹر پر رکھا تھا۔ اس میں ریڈی میڈ سوٹ اور میک اَپ کا جدید ترین سامان تھا۔ پھر میں نے ٹیک شاپ سے انگلش میگزین خریدا اور ڈکانوں کے بورڈ پڑھتا ہُوا چل پڑا۔ چھوٹے سے غلیظ بازار میں وہ ہوٹل تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ چند مزدور پیشہ نوجوان ہوٹل کی میلی میز کے گرد بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے ایک دم کھیل بند کر دیا اور انگڑائی لیتا ہُوا ایک کسرتی بدن کا لڑکا تلق چھاڑ کر دہاڑا۔ "شیدے چار چائے مارو اُستاد اِکّی کے نام کی۔"

میں گردن جُھکائے دُھواں اُگلتے چولھے کے قریب جا کھڑا ہُوا۔ "چارپائی بستر چاہیے چاچا۔" چاچے نے مجھے گھُور کر دیکھا اور گردن نفی میں ہلا کر چولھے میں ہَوا بھرنے لگا۔

"آپ نے سُنا نہیں چاچا۔"

"سُنا ہے بھتیجے۔" وہ دیکھے بغیر بڑبڑایا۔ "مگر تیرے مطلب کی یہ جگہ نہیں ہے۔ آگے چلا جا برلاس ہوٹل میں۔"

"وہ... وہ... کرایہ زیادہ مانگتے ہیں چاچا اور میرے پاس صرف سفید پوشی ہے۔"

"اچھا۔" وہ پلٹ کر بولا۔ "اوئے شیدے چل مہمان کو میرے والے رُوم میں چھوڑ آ۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "رات میرے ساتھ گزار لینا۔ میں دو تین پیگ جوڑ لوں گا۔"

"اوہ نہیں محترم۔" میں دو قدم ہٹ کر بولا۔ "میں آپ کو تکلیف نہیں دے سکتا۔" میں چل پڑا تو اُس نے آواز دے کر روک لیا۔

"نہیں چاچا جی، آپ کی بڑی مہربانی۔ میں کوئی دوسری جگہ دیکھ لوں گا۔"

وہ مجھے پکارتا ہُوا ہوٹل کے صحن سے باہر تک چلا آیا تھا لیکن میں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا کیونکہ مجھے خلوص کی نہیں بلکہ ایک بند کمرے کی ضرورت تھی جو اُس بھلے آدمی کے پاس نہ تھا۔ حالات انسان کو اپنی گرفت میں اس قدر بے بس کر دیتے ہیں کہ اُسے گرگٹ کی طرح اپنی فطرت کا رنگ بھی بدلنا پڑتا ہے۔ جب شیشۂ حیل کے مکین کو خلوص کی پیاس ستاتی ہے تو اُسے کوئی مخلص نہیں ملتا اور وہ خود کو مضبوط چہار دیواری کا قیدی سمجھنے لگتا ہے اور بعض اوقات خلوص کی صاف بے داغ چادر ٹھٹھرتی ضرورت کو بھی تسکین نہیں دے سکتی۔

برلاس ہوٹل میں مجھے خلوص تو نہیں البتہ ایک صاف ستھرا کمرا مل گیا تھا جس میں ٹیلی فون کی سہولت بھی موجود تھی۔ کچھ دیر میں بیڈ پر بے حس و حرکت بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر لیٹا رہا۔ اس طرح اعصاب پر جو بیمائی کیفیت طاری تھی وہ دُور ہو گئی۔ اس دوران میں میں نے ذہن کے سارے دریچے بھی بند ہی رکھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ بس دھڑکنوں کے حوالے سے میں زندہ تھا۔ یہ تربیت عظیم ماسٹر گابے کی مرہونِ منت تھی۔ اُس شخص نے ایک ناممکن اور سہمے ہوئے نوجوان کو ذہنی اور جسمانی اعتماد دیا تھا۔ ورنہ میں اُن دِنوں بوکھلائے ہوئے گیدڑ کی طرح ہانگ کانگ کی روشنیوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ اُسی نے مجھے روشنیوں کی قوت دے کر اندھیروں سے لڑنے کا فن دیا تھا۔

میں نے اپنی دُہری شخصیت کو تحفظ دینے کی خاطر ڈبل ہیڈ لیا تھا اور دوسرے ساتھی کا نام اظہر ہارون بتایا تھا۔ یہی وجہ سہی تھی کہ جب میں اظہر ہارون کے میک اَپ میں سیڑھیوں کے راستے اُتر کر کاؤنٹر پر گیا تو کاؤنٹر کلرک نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے پذیرائی کی تھی۔

"کیا آپ کے ہاں مسٹر احمد غنی تشریف لا چکے ہیں؟ میرا نام اظہر ہارون ہے۔"

"اوہ! جی ہاں جناب۔" کاؤنٹر کلرک نے جواب دیا۔ "رُوم نمبر ٹریل فور میں تشریف لے جائیں۔"

"تھینک یو۔ میں یہی معلوم کرنے آیا تھا۔ جب وہ نیچے آئیں تو اُن کو بتا دیجیے گا۔"

"بہتر جناب۔" کلرک نے مؤدب ہو کر کہا۔ "آپ چاہیں تو ٹیلی فون پر بات کر لیں۔"

میں شکریہ ادا کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ کمرے میں میری شلوار قمیص تھی حالانکہ بہت کم اُمید تھی کہ کمرا استعمال کرنے کی دوبارہ فرصت ملے گی لیکن میں شلوار قمیص کا پیکٹ ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر میں نے پارکنگ لاٹ میں کھڑی ٹیکسیوں کو تھپتھپایا۔ ایک ڈرائیور لپک کر سامنے آیا تھا۔

"تشریف رکھیے جناب۔" اُس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ "ریلوے اسٹیشن یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟" میں نے اندر بیٹھ کر پوچھا۔

"دس روپے جناب۔" ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے فاصلہ بتایا۔

ریلوے اسٹیشن کا ٹی۔ سی۔ او کافی مصروف تھا۔ مجھے نمبر دے کر پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا تھا۔ "آپ کے ہاں مسٹر اظہر ہارون ٹھہرے ہوئے ہیں۔" کاؤنٹر کلرک سے میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ اس وقت ڈائننگ ہال میں ہوں گے۔ براہِ کرم اُن کو بلا دیجیے۔"

"ہولڈ رکھیے سر۔" دوسری طرف سے جواب دیا گیا پھر دوسرے منٹ پر ہارون لائن پر آ گیا۔

"جی فرمایئے۔" اظہر ہارون بول رہا ہوں۔"

"ریلوے اسٹیشن کے پارکنگ شیڈ میں پہنچیے۔"

"میں آپ کو یہاں تلاش کرتا رہا ہوں جناب۔"

"میں معروف تھا۔"

"کیا میں اپنا سامان لے آؤں جناب؟"

"نہیں۔ کیا مُراد مل گیا تھیں؟"

"جی ہاں جناب۔"

"گڈ... چل پڑو۔"

پی۔ سی۔ او سے نکل کر میں نے پلیٹ فارم ٹکٹ لیا اور ٹہلتا ہوا اندر چلا گیا۔ چند منٹ بک اسٹال پر پرچوں کے رنگین ٹائیٹل دیکھتا رہا پھر فرسٹ اسٹال سے چائے کا مگ لے کر سنگی بنچ پر بیٹھ گیا۔

چائے پیتے پیتے میرے ذہن کے کھلے دریچے سے ملک نواز در آیا تھا۔ میں نے گرم چائے حلق میں اُنڈیلی اور مگ واپس کر کے باہر نکل گیا۔ آپریٹر کو شاہ زمان کا نمبر دیا۔ اُس نے نمبر ڈائل کر کے رسیور میری طرف بڑھاتے ہوئے دلآویز مسکراہٹ بھی دی تھی۔

"ہیلو جی میں مظفر بول رہا ہوں۔ مس نورین کے لیے کال ہے۔"

"نام بتائیں گے جناب۔"

"ہاں لیکن مس نورین کو۔"

"بہتر جناب۔"

"ہیلو کون؟" نورین کی کھرکھراتی آواز سُنائی دی۔

"آپ رو رہی ہیں کیا؟"

"اوہ! تم؟"

"نام نہیں نور۔ میں دوزخ کے دہانے پر کھڑا تمھیں یاد کر رہا ہوں۔"

"کیا میں مل سکتی ہوں؟"

"نہیں جان موسم اور وقت سازگار نہیں ہیں۔"

"تمھیں میری ضرورت ہے سس..." وہ نام لیتے لیتے خاموش ہو گئی۔

"ہاں! جس طرح مرتے شخص کو آبِ حیات کے قطرے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"پھر بتاؤ کہاں ہو؟"

"ریلوے اسٹیشن۔" میں نے ایک دم رسیور رکھ دیا۔ مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ سکندر کو تلاش کرتی رہتی جبکہ میں میک اَپ میں تھا۔

یہی وجہ رہی تھی کہ میں نے ہارون کو پارکنگ شیڈ میں بُلایا تھا۔ اگر پلیٹ فارم پر بُلاتا تو دوسرے لوگوں کے درمیان اُس کی شناخت مشکل ہو جاتی۔ پارکنگ میں آ کر اُسے میری تلاش ہوتی ورنہ اسٹیشن پر آنے والے پارکنگ میں رُکتے ہیں نہ چلتے ہیں۔ یہی بات اُس کی شناخت ہوتی۔

میں ستون سے ٹیک لگائے ہر آنے والی ٹیکسی کے مسافر کو دیکھ رہا تھا کہ ایک دیہاتی نوجوان نے اُتر کر ڈرائیور کو کرایہ دیا اور پھر متلاشی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیتا ہُوا آہستہ آہستہ برآمدے کی جانب بڑھنے لگا۔ اُس کا چہرہ مسلسل دائیں بائیں گھوم رہا تھا۔

"نیمبر میل کتنے بجے آتی ہے برادر؟" میں ستون کی اوٹ سے نکل کر اُس کے سامنے ہو گیا۔

"پلیٹ فارم پر لگ چکی ہے جناب۔" اُس نے میری آواز پہچان کر مُسکراتے ہوئے جواب دیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا "میں لیٹ تو نہیں ہُوا؟"

"آؤ باہر ٹھہرتے ہیں۔" میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ایک اور مہمان کا انتظار ہے۔"

"میں پریشان ہُوں خرم سلطان آپ کو میک اَپ کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟"

"حالات پیارے۔" میں نے ایک کار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آتے ہی کھیل شروع کرنا پڑا تھا۔" پھر میں نے اُسے تمام واقعہ سُنا دیا۔ ہم پارکنگ ایریا میں آوارہ گرد نوجوانوں کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتے باتیں کرتے رہے تھے تیسرا چکر ابھی مکمل بھی نہ ہُوا تھا کہ نورین کی کار طوفانی رفتار سے پارکنگ ایریا میں داخل ہوئی۔ اُس نے کار ٹھیک سے پارک بھی نہ کی تھی یوں ہی ترچھی چھوڑ کر اُتر آئی تھی۔ اُس کی کار کے بعد تین کاریں اور بھی آ کر پارک ہوئی تھیں۔ ایک کار سے عورتیں بچے اور ایک بوڑھا اُترا تھا۔ دوسری میں صرف ڈرائیور تھا۔ وہ دونوں کاریں میں نے نظر انداز کر دی تھیں کیونکہ ڈرائیور چابیاں اُچھالتا ہُوا تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا بکنگ آفس کی طرف چلا گیا تھا۔ البتہ تیسری کار سے دو نوجوان اُترے تھے۔ ایک کار لاک کرنے لگا تھا اور دوسرے نے گہری نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا تھا۔ اُس وقت نورین تقریباً دوڑتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"ہارون، تم اُس لڑکی اور ان نوجوانوں پر نظر رکھو گے۔ ان کے ساتھ اندر چلے جاؤ۔"

تھوڑا وقفہ دے کر میں بھی ٹہلتا ہُوا اندر چلا گیا۔ ہارون اور وہ دونوں نوجوان بک اسٹال پر کھڑے تھے۔ جبکہ نورین پلیٹ فارم کے شمالی سرے تک چلی گئی تھی۔ اُس نے رُک کر پلیٹ فارم نمبر پانچ کی جانب دیکھا اور پلٹ کر چلنے لگی پھر اسی کلاس کے ویٹنگ روم میں داخل ہو گئی۔ میں نے ہارون کے شانے سے شانہ مارا۔ وہ میرے پیچھے چل پڑا تھا۔

"میں لڑکی کو لے جا رہا ہُوں۔ تم ان لوگوں پر نگاہ رکھو گے اگر تعاقب کریں تو ان کے پیچھے چلے آنا اور گرلز ویٹنگ روم پر مجھے رپورٹ دے دینا۔ میں ایک گھنٹے بعد تمھیں اُدھر ڈائننگ ہال میں ملوں گا۔" میں اُسے ہدایات دیتا ہُوا آگے نکل گیا۔ ہارون کو ہوٹل سے بلانے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ چونکہ ہم دونوں میک اَپ میں تھے اس لیے ہوٹل کے ہال میں ایک دوسرے کو تلاش کرنا مشکل تھا... ٹیلی فون پر جو بہانہ چل گیا تھا ہوٹل کے اندر کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

جونہی اُس نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولا میں دروازے کو کراس کرتے ہوئے بڑبڑاتا ہُوا آگے نکل گیا۔ "نورین واپس اپنی کار میں جاؤ۔ میں میک اَپ میں ہُوں۔" ٹی اسٹال پر جا کر میں نے رُخ بدل کر دیکھا وہ آؤٹ گیٹ کی جانب جا رہی تھی۔ میری نگاہیں اُن دو آدمیوں پر جمی ہوئی تھیں جو رسائل کی ورق گردانی میں محو تھے کسی نے بھی اُس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ پھر میں بھی ستونوں کی آڑ میں چلتا ہُوا باہر نکل گیا تھا۔ نورین نے کار موڑ کر روک رکھی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور کھلے دروازے سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

نورین نے فوراً ہی کار بڑھا دی تھی۔

"تم کوئی سوال کرو گے سکندر۔" لاہور ہوٹل کے سامنے جا کر نورین نے پوچھا۔ "اگر تم نے اس لیے مجھے بُلایا ہے کہ میں نے اُن لوگوں کو تمھارے پیچھے لگا دیا ہے تو میں اپنی صفائی کا کوئی ثبوت نہیں رکھتی۔"

"نہیں نور۔" میں نے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ "میں نے تمھیں اس لیے بُلایا ہے کہ جب درد حد سے سوا ہو جاتا ہے تو درد خود ہی مداوا بن جاتا ہے لیکن میں نے درد اُٹھتے ہی مرہم کا انتظام کر لیا ہے۔ آج اس بھرے شہر میں ہی نہیں بلکہ پوری دُنیا میں میرا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔ بس ایک تم ہو اور تمھیں بُلا لیا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس شہر کی تمام سڑکیں میرے لیے کھائیاں بن چکی ہیں۔ نہ جانے کب کس کھائی میں پاؤں چلا جائے اس سے قبل کہ کوئی کھائی مجھے نگل لے میں ہوش و حواس میں کچھ وقت تمھارے قریب گزرنا چاہتا ہُوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم نے ایک بات مجھ سے چھپائی تھی سکندر۔"

"ایک نہیں جان کئی باتیں۔" میں نے رو دینے والے انداز میں بتایا۔ "اتنے مختصر اور ظالم وقت کے دوران میں اپنی زندگی کی کتاب کیسے سطر سطر تمہیں پڑھنے کو دے سکتا تھا۔ میں نے یہ بات بھی اب تمہیں بتائی ہے کہ اس دُنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔"

"تمہیں پنڈی سے ملک نواز اپنے ساتھ لایا تھا اور۔۔۔"

"اور اُسی نے مجھے شاہ زمان کو تھپکی دینے بھیجا تھا۔"

"وضاحت کرو سکندر۔" نورین نے چونک کر چہرہ گھمایا۔

"تھپکی سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"میں نے تھپکی دی تھی حالانکہ اُس نے گولی کا حکم دیا تھا۔"

"اوہ۔۔۔ نہیں۔۔۔" نورین چیخ پڑی۔ "تم۔۔۔ تم۔۔۔"

"نہیں نورین میں قاتل نہیں ہُوں اور نہ ہی قاتل بننا چاہتا ہُوں۔ مجھے اسی حکم عدولی کی سزا دی جا رہی ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ جس کو زندگی دی ہے وہی میری زندگی کا شکاری بن گیا ہے۔"

"تم یہ بات ڈیڈی تک پہنچانا چاہتے ہو سکندر؟"

"نہیں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "اب وقت گزر چکا ہے میری بات پہ کون یقین کرے گا۔ میرے پاس بھی تو کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"بہرصورت۔" وہ پُرجوش انداز میں بولی۔ "میں ڈیڈی تک یہ بات پہنچا دوں گی۔"

"نہیں نورین اپنا بھرم بھی کھو بیٹھو گی۔ مجھے ہی حالات سے نمٹنے دو۔"

"بات بھرم کی نہیں ہے سکندر۔" وہ بھرائی آواز میں بولی۔ "اگر ملک نواز تمہیں گولی دے سکتا ہے تو کسی دوسرے کے ہاتھ سے بھی ہمارا خاندان تباہ کروا سکتا ہے۔ ڈیڈی کو بچانا میرا فرض ہے۔"

"لیکن وہ تو میری تلاش میں نہ جانے کہاں ہوں گے تم کہاں اُن سے ملو گی؟"

"نہیں سکندر، وہ خود محاذ پر نہیں جایا کرتے۔ اُن کی فورس لڑتی ہے۔ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر میں ہوں گے۔"

"اگر تم میری سلامتی کی ضمانت دو تو میں اُن کو ملک نواز کے منصوبے سے آگاہ کر سکتا ہُوں۔"

"تمہاری طرف اُٹھنے والے ہاتھوں کو پہلے میری ذات سے ٹکرانا ہوگا۔ مجھے یقین ہے ڈیڈی جو نئی صف بندی کریں گے اُس میں تمہیں نمایاں جگہ دی جائے گی۔"

"کیا تم اپنے ڈیڈی کو کسی دوسری جگہ بُلا سکتی ہو؟"

"ہاں، اگر ضروری ہو تو۔"

"پھر اُن کو ملک نواز کے ہوٹل میں بُلا لو۔ میں ثابت کرنا چاہتا ہُوں کہ ملک نواز اب شاہ زمان کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر چکا ہے اور سکندر کسی کی خاطر شاہ زمان کا وفادار ہے مجھے وہاں مکرا دیا گیا ہے۔ کمرے میں ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے میں بات کرتی ہُوں۔" اُس نے کار ایک کیباؤنڈ کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ کھلے گیٹ سے اندر لے جا کر کار پورچ سے دُور ہی روک کر وہ کُود گئی تھی۔ وہ رہائشی عمارت تھی۔ چند بچے لان میں رنگین فٹ بال کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

میں نورین کو سیڑھی بنا کر شاہ زمان تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن شاہ زمان تو اُس خاردار درخت کی ایک شاخ تھا جو کانٹے بکھیر رہا تھا۔ میں پتوں اور شاخوں پر وقت ضائع کرنے کا قائل نہ تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں نے بیک وقت نورین اور شاہ زمان کو ملک نواز کے خلاف استعمال کرنے کا فوری فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ ملک نواز کے گودام میں داخل ہونا ہمارے لیے ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ شاہ زمان اگر شیشے میں بند ہو جاتا تو اُسے ہم بطور گیٹ پاس استعمال کر سکتے تھے۔

نورین پانچ منٹ بعد دوڑتی ہوئی واپس آئی تھی۔

"ڈیڈی روانہ ہو چکے ہیں۔ انھیں ملک نے ہوٹل میں کال کیا ہے۔" اُس نے برعجلت کار سٹارٹ کرتے ہی بیک میں ڈال دی۔ اگر وہ مشاق نہ ہوتی تو کار گیٹ کے پائے سے رگڑ کھانے کی بجائے ٹکرا جاتی۔ "میں چاہتی ہُوں وہ اُس درندے کی کھوہ میں گُھسنے سے پہلے اُسے پہچان لیں۔"

"فکر نہ کرو نورین، ملک اتنا احمق نہیں ہے۔" میں نے اُسے تسلی دی کیونکہ وہ بے حد پُرجوش اور نروس ہو رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بدحواسی میں لڑکی کوئی حادثہ نہ کر بیٹھے۔

بلاشبہ وہ ایک ماہر ڈرائیور تھی۔ رفتار نہ تو سُوئی پہ تھی اور نہ توے پر تھرکتی رہی تھی اور بغیر کسی حادثے کے اُس نے گاڑی ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں پارک کر دی تب ہی میں نے سکون کی سانس لی تھی۔

جب ہم ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو لوگ اُٹھتے جا رہے تھے پھر بھی خاصا رش تھا۔ کونے میں ہارون تنہا بیٹھا کافی کی پیالی کو گھور رہا تھا۔

"ہیلو اظہر۔" میں نے ہانک لگائی اور وہ بڑبڑاتا ہُوا اُٹھ کھڑا

ہُوا۔ "ان سے ملیے یہ نورین ہیں۔"

ہارون نے دیہاتی نوجوان کی طرح قدرے شرما کر اُسے سلام کیا۔ "ان کو اپنے کمرے میں لے چلو۔"

"نہیں۔" نورین بول پڑی۔ "میں یہاں رُک کر ڈیڈی کا انتظار کروں گی۔"

"اب یہ فرض مجھے سونپ دو نُور۔" میں نے فدویانہ انداز میں کہا۔ وہ ایک حوالے سے مجھے بھی عزیز ہیں۔ میں اُن کو بہتر تحفظ دے سکوں گا۔" نورین اُلجھی اُلجھی ہارون کے ساتھ چل پڑی تو میں کاؤنٹر کی طرف گیا۔ تینوں کلرک دن کی آمدنی کا حساب کرنے میں مصروف تھے۔

"بابر کے لیے کوئی پیغام۔" میں نے ایک کلرک کے سامنے ہتھیلی پھیلا دی۔ اُس نے ہتھیلی پہ پیتل کا ٹوکن دیکھ کر کنوتیاں کھڑی کرتے ہوئے دوسرے کلرک کو کہنی ماری۔ "میں ساہیوال سے آیا ہُوں۔ مجھے کال کیا گیا ہے۔"

"آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا جناب۔ ملک صاحب آنے والے ہیں۔"

"بہتر، میں انتظار کرتا ہُوں۔" میں نے ٹوکن جیب میں رکھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ میری منزل پہ روم نمبر ٹریپل فور کا دروازہ غیر مقفل تھا۔ میں جب داخل ہُوا تو نورین نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا اور بے قرار آواز میں بولی۔ "تمہیں اوپر نہیں آنا چاہیے تھا خرم۔۔۔" وہ بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گئی پھر ہنس دی۔ "میں نے تمہارے نام کا میک اَپ اُتار دیا ہے۔"

"اچھا ہُوا ورنہ جب میں خود اُتارتا تو بڑی ندامت ہوتی۔ اب تو تمہیں یقین ہو جانا چاہیے کہ مجھے کس مقصد کے لیے نیا نام دے کر تمہارے گھر داخل کیا گیا تھا۔ وہ لوگ تمہاری نگرانی کر رہے تھے۔ انھوں نے ہی تمہیں ہراساں کرنے کے لیے اُس نوجوان کو آگے بڑھایا تھا پھر جو کچھ ہُوا وہ عین منصوبہ بندی کے مطابق ہی ہُوا تھا۔ اگر تم از خود مجھے آفر نہ کرتیں تو تمہیں اغوا کرنے کا ڈرامہ کیا جاتا اور میں تمہارا نجات دہندہ بن جاتا۔"

"جو ہُوا اُسے چھوڑو۔ اب جو ہونے والا ہے اُس کے بارے میں سوچو۔"

"میں نے صرف نشاندہی کر دی ہے۔ اب تمہارے ڈیڈی پر منحصر ہے، وہ کیا کرتے ہیں۔"

"ہم اُن کو جب اصل سازش سے آگاہ کریں گے تو وہ کُل وہی کچھ کریں گے جو ایک دُشمن کو اپنے دُشمن کے ساتھ کرنا چاہیے۔ وہ ملک نواز کی فطرت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے ایجنٹوں کو منظر سے ہٹاتا رہتا ہے۔"

"اب تم دوسری اطلاع تک اس کمرے میں رہو گی۔ اظہر تم خیال رکھو گے۔ یہ میری عزیز ترین امانت ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو خرم؟" نورین ہلکیں جھپکا کر بولی۔

"کہنا نہیں مائی ڈیئر بلکہ کچھ کرنا چاہتا ہُوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہارے ڈیڈی بھڑکے ہوئے ہیں۔ پورا نام سُن کر وہ بم کی طرح پھٹ سکتے ہیں۔ اُن کو یہاں لانا ہے اور تمہاری ذات ہی اُن کو یہاں آنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ پھر ہم بہتر انداز میں اُن کو سازش سے آگاہ کریں گے۔"

"یعنی مجھے خود کو۔۔۔"

"ہاں بظاہر۔" میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔ "تم ہماری قیدی ہو گی۔"

"اگر میں نہ چاہوں تو؟" اُس نے حلق سے بدلی ہوئی آواز نکالی۔

"پھر مجھے مجبوراً گستاخی کرنی پڑے گی۔ اس لیے کہ تم مجھے عزیز ہو۔ میں تمہیں کسی ضد پہ قربان نہیں ہونے دوں گا۔"

اُس نے طویل سانس لے کر خود کو سمیٹ لیا تھا۔ اگر وہ شاہ زمان کی بیٹی اور ملک نواز کے گروہ کی ممبر نہ ہوتی تو بھڑک کر اپنا نقصان کر بیٹھتی۔ وہ ایک تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ اُس نے وقت کی آنکھوں میں لکھی ہوئی تحریر پڑھ لی تھی۔

"ٹھیک ہے خرم سلطان! میں اس تجربے سے بھی گزر کر ایک نیا سبق ضرور حاصل کروں گی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ خرم سلطان بین الاقوامی غنڈہ اور آدم خور درندہ ہے۔ آنے والا لمحہ نہ جانے کیسا ہوگا۔ میں اُس لمحے سے قبل تمہیں بتا دوں کہ تم نے یقیناً اداکاری کی ہوگی لیکن میں لاہور کی شاطر لڑکی اپنا سب کچھ ہار گئی ہُوں۔"

"تکرار کی ضرورت نہ تھی نور۔" میں نے بھرائی آواز میں کہا۔ "ہمارے درمیان قول و قرار ہو چکا ہے۔ میں اگر اداکار ہوتا تو وہی ایکٹ پلے کرتا جس کا مجھ سے معاہدہ ہُوا تھا۔ جو کہانی مجھے دی گئی تھی۔ تم پھر سُن لو نورین۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اپنا حال اور مستقبل داؤ پہ لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"خدا کرے۔" وہ سسک کر بولی۔ "یہ آواز تمہاری بھی ہو۔" اُس نے محبت پاش نگاہیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔

وہ تو شاید نہیں جانتی تھی لیکن میری آنکھیں دُھند سے پرے آنے والے لمحات کو دیکھ رہی تھیں۔ اگر وہ بھی ہر لمحے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاندھے پر لاش دیکھ لیتی، آگ کے شعلے اور دھواں اُسے دکھائی دے جاتا تو وہ مجھے اپنی چاہت کا یقین دوسرے انداز میں دلاتی اور وہ انداز میرے لیے سنبھالنا دشوار ہو جاتا۔

ڈائننگ ہال تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ چند آدمی پودے ہال میں تھے۔ ویٹرز صفائی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ لفٹ سے جونہی میں نکلا کلرک میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"ملک صاحب کا پیغام ہے جناب۔" کلرک نے بتایا۔ "وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ ہاں آپ کو ڈیوٹی پر جانے سے آگاہ کر رہا ہے۔"

"کیا شاہ زمان صاحب بھی نہیں آئے؟"

"کیا آپ کو..."

"جی ہاں۔" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے بتایا۔ "مجھے یہی ہدایت کی گئی تھی کہ دونوں میں سے جو بھی مل جائے۔"

"ایم۔ ڈی کے آفس میں چلے جائیں۔" کلرک نے اشارہ کیا اور میں شکریہ ادا کرتا ہوا کاؤنٹر سے ہٹ گیا۔ سیڑھیوں کے نیچے ایک کمرے کے دروازے ایم۔ ڈی کی پلیٹ پر سنہری حروف چمک رہے تھے۔ میں نے دروازے کو ہلکی سی ٹھوکر ماری کواڑ بے آواز کھل گئے۔ آگے ویٹر پردہ حائل تھا۔ پردہ ہٹا کر میں نے جھانک کر دیکھا۔ شاہ زمان کان سے ریسیور لگائے کسی کال کا منتظر تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔

"السلام علیکم سر۔ جی خادم ہوں اور افسانہ ندامت کے لیے حاضر ہوا تھا سر۔ جی ہاں سر، اگر وقت مل جائے تو شاید... شکریہ سر، میں کل شام تک بھرپور کوشش کروں گا۔ ویسے میرا خیال ہے سر، وہ جال اور شکاریوں کو چیرتا پھاڑتا اس شہر سے نکل گیا ہوگا۔ جی ہاں سر دونوں کاریں بھی ناکارہ ملی ہیں۔ ویسے سر میں فی الحال شکست کا اعتراف تو نہیں کروں گا ہاں اُس شخص کی ذہانت اور خونخواری کو تسلیم کر چکا ہوں۔ جی... جی بالکل سر... اگر وہ تمام گھیرے توڑ کر نکل جائے تو میں بھی سفارش کروں گا۔ وہ ہماری فورس میں قابلِ قدر اضافہ ثابت ہوگا۔ مزید وقت دے کر آپ نے مجھے ذلت کو مٹانے کا موقع دیا ہے سر، میں آپ کا بے حد ممنون ہوں... شب بخیر..." اُس نے ریسیور رکھ کر میری جانب دیکھا اور کھرکھراتی آواز میں بولا۔ "کیا بات ہے نوجوان؟"

"مس نورین کا ایک اہم پیغام لایا ہوں جناب۔"

"اوہ۔" وہ چونک اُٹھے۔ "پہلے اپنا تعارف..."

میں نے جیب سے ہاتھ نکالا تو اُس کی آنکھیں ریوالور پر جم گئی تھیں۔ "خادم کو خرم سلطان چوہدری کہتے ہیں۔" میں نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور شاہ زمان کی کھلی آنکھیں خوف و حیرت سے پھیل گئیں۔ "مس نورین اوپر روم نمبر ٹریپل فور میں آپ کی منتظر ہیں جناب۔"

"تم... تم... کیا چاہتے ہو؟" اُس کی آواز حلق کی چٹھائی چٹھ کر ہانپ گئی۔

"میری درخواست ہے آپ اپنی بیٹی سے چل کر مل لیں۔"

"میں۔" اُس نے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھا کر روک لیا۔ "اگر اجازت دو تو میں اُس سے بات کر لوں۔"

"صرف بات، لیکن کوئی حماقت نہیں۔"

اُس نے ریسیور اُٹھا کر ٹریپل فور سے رابطہ ملانے کو کہا۔ "میں نورین سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اُسے بتاؤ کہ تمہارے ڈیڈی بات کریں گے۔" پھر اُس نے ماؤتھ پیس پر ہتھیلی رکھ دی۔ "کیا کل بھی تم میک اپ میں تھے چوہدری؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میرے بے شمار نام اور چہرے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بے بی میں اوپر آ رہا ہوں۔ ہاں ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اُس نے ریسیور رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"خرم سلطان! میں تعاون کر رہا ہوں۔ اپنے ہاتھ کو بتا دو۔"

"تعاون کرنے والوں سے میرا ہاتھ ہمیشہ دوستانہ سلوک کرتا رہا ہے خرم۔" میں نے ریوالور والا ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔ "اور جو لوگ تعاون کے نام پر ہوشیاری دکھانے کی حماقت کرتے ہیں اُن کو پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملا کرتا۔ مس نورین آپ کو بتائیں گی کہ خرم سلطان کا رویہ کیسا رہا ہے اور کیوں رہا ہے؟"

"میں کاؤنٹر تک جاؤں گا۔" وہ باہر نکل کر بولا۔ "ورنہ لوگ مشکوک ہو جائیں گے۔"

"آپ پولیس اسٹیشن تک بھی جانا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ چلیے۔"

اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا کیونکہ تینوں کلرک کام چھوڑ کر چوکنا ہو گئے تھے۔ اگر وہ میرے آگے آگے لفٹ میں داخل ہو جاتا تو وہ کچھ بھی سوچ سکتے تھے۔

"میں مہمان کے ساتھ اوپر جا رہا ہوں۔ میری کوئی کال آئے تو ٹریپل فور میں ٹرانسفر کر دینا۔"

"بہتر سر۔" کلرک نے مؤدب انداز میں کہا۔ "کوئی اور خدمت؟"

"فی الحال نہیں۔" شاہ زمان نے ہاتھ اُٹھایا اور پلٹ کر میرے ساتھ چل پڑا۔ لفٹ بوائے نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے سلیوٹ

کیا اور پھر ہمارے ساتھ ہی لفٹ میں داخل ہو کر بولا۔ "فلور سر؟"

شاہ زمان نے خود ہی تین نمبر بٹن دبا دیا تھا۔

دروازہ نورین نے کھولا تھا۔ ہارون مینٹل پیس سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میں نے ہیریلو اور نکل لیا۔ نورین نے کڑی نگاہوں سے میری اس حرکت کو دیکھا مگر ہونٹ کاٹ کر رہ گئی تھی۔ میں نے ہارون کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ وہ ایک دم مستعد ہو گیا۔ اتنے میں شاہ زمان صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

"ایک رسمی کارروائی کی اجازت دیں گے آپ لوگ۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "دوستانہ ماحول کے لیے ضروری ہے۔ میرا ساتھی آپ کی تلاشی لے گا۔"

شاہ زمان بے چون و چرا کھڑا ہو گیا اور ہارون نے اُس کی جیبوں کو کھنگال ڈالا۔ ایک ریوالور، سگار اور چند سو کے کرنسی نوٹ تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ریوالور اُٹھا لیا۔ "اب آپ باپ بیٹی باتیں کریں۔ ہم دونوں باہر جا رہے ہیں۔"

"اوہ نہیں خرم۔" نورین ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "آپ بہتر پوزیشن میں ہیں۔ میں ساری باتیں نہیں جانتی۔"

"کیا بات ہے؟" شاہ زمان نے استفہامیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ "کیا ہماری دنیا میں شکوے شکایتوں کی ریت ہے خرم چوہدری؟"

"میں شاکی نہیں ہوں بزرگِ محترم۔"

"ڈیڈی، خرم نے مجھے بتایا ہے کہ ملک نواز نے آپ کو منظر سے ہٹانے کی ذمے داری اس کو سونپی ہے۔"

"اوہ نہیں۔" شاہ زمان کا جسم تھرتھراتا ہوا اُٹھا تھا۔

"بیٹھ جاؤ شاہ زمان۔" میرے حلق سے سرد آواز اُبھری۔ "یہ لڑکی تمہاری خوش بختی کی علامت ہے۔ سنو، یہ بالکل سچ ہے۔ ملک نواز مجھے پنڈی سے اسی لیے ساتھ لایا تھا۔ کیا تم پنڈی کے خان رنگ باز اور سیٹھ دلاور کو جانتے ہو؟ کیا تمھیں پتہ ہے کہ دونوں ملک نواز کے لیے کام کرتے تھے؟"

"ہاں پنڈی کا ایریا اُن دونوں میں تقسیم کرنے کی ذمے داری مجھے ہی سونپی گئی تھی۔"

"وہ دونوں اب کہاں ہیں؟"

"ایک درندے کی درندگی کا شکار ہو چکے ہیں۔"

"اُس درندے کا نام؟"

"خرم سلطان چوہدری۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے تردید کی۔

"ملک نواز۔ یقین کرو اُن دونوں کو ملک نواز نے ہلاک کروایا ہے۔ ہاں ہاتھ بلاشبہ خرم سلطان کے استعمال کیے گئے تھے۔ جس طرح شاہ زمان کو قتل کرنے کے لیے میری خدمات مستعار لی گئی تھیں۔ پنڈی کی مارکیٹ جہانگیر بدر کے لیے خالی کروائی گئی ہے اور یہاں مجھے سیٹ کیا جانا تھا۔ مجھے معلوم نہیں وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ یہاں ہی نہیں بلکہ تمام شہروں کے پرانے ماسٹر لوگ وہ پٹوا رہا ہے۔ اُن کی جگہ نئے لوگ تیار کر رہا ہے۔"

"اگر... اوہ نہیں اگر نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے۔" شاہ زمان مٹھیاں بند اور کھوتے ہوئے بڑبڑایا۔ "بہرکیف میں تمہارا ممنون ہوں خرم سلطان۔ میں زندگی کی کوئی قیمت مقرر نہیں کر سکتا لیکن..."

"ٹھہریے محترم۔" میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش کر دیا۔ "میں نے دولت کی خاطر وفاداری نہیں بدلی۔ میں وقتی آدم خور درندہ ہوں۔ ایک باپ کے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے میں یقیناً ندامت محسوس کر رہا ہوں لیکن مجبوری ہے۔ میں نے نورین کی خاطر ملک نواز جیسے درندے سے شکار چھین لیا ہے۔ میری توقع کے عین مطابق ہی اُس نے میرے لیے سزا تجویز کی ہے۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ میں نے اُسے بتا دیا ہے کہ میں شاہ زمان کو کیوں نہیں ہلاک کر سکا۔ میں نورین کی آنکھوں کو آنسو نہیں دے سکتا۔ تب ہی اُس نے بساط اُلٹ کر بچھا دی ہے۔ وہی شاہ زمان جو شکار تھا اُسے شکاری بنا دیا گیا ہے۔"

"کیا صرف یہی بتانے کے لیے مجھے بُلایا ہے تم نے...؟" شاہ زمان کی آواز میں ممنونیت نمایاں تھیں۔

"نہیں ڈیڈی خرم جوابی کارروائی کرنا چاہتا ہے۔"

"پھر اُٹھو پیارے بیٹے۔" شاہ زمان بولا۔ "میں نے تمہارا اعتراف قبول کر لیا ہے۔ مجھے تم جیسا بیٹا پا کر فخر ہوگا۔ ہم اس باتھی کو کچل کر اپنا اقتدار قائم کریں گے۔"

"نہیں میرے محترم۔" میں نے نرم انداز میں کہا۔ "ملک نواز ایک شخص کا نام نہیں بلکہ ایک تنظیم کا نام ہے۔ اُسے ہلاک کر کے ہم سکون سے بزنس نہیں کر سکیں گے۔ میں اس تنظیم کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینک کروں گا۔"

"جب تک وہ زندہ ہے اُس کی تنظیم ختم نہیں ہو سکتی میرے بیٹے۔"

"آپ جھوٹ رہے ہیں انکل۔" ہارون بول پڑا۔ "جس درخت کی جڑیں کٹ جائیں اور جس دریا کی معاون ندیاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خشک کر دی جائیں وہ زیادہ عرصہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔ تنا کاٹنے سے جڑیں نئے تنے پیدا کرنا شروع کر دیتی ہیں اور دریا کو ندیاں خشک نہیں ہونے دیتیں۔ ہمیں مسز فرحم کی پالیسی پر کام کرنا ہوگا۔ وہ شخص جو آج آپ جیسے شخص کی زندگی موت کا فیصلہ کر رہا ہے، کل لاہور کی سڑکوں پر سپیدل جب جوتے چٹخائے گا تو آپ کو جو خوشی ہوگی، وہ خوشی اُس کی لاش نہیں دے سکتی۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" شاہ زمان نے پُرستائش لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے خرم سلطان، میں اپنی تمام ترتوانائیاں تمہارے حوالے کر دوں گا۔ ملک نواز کی جڑیں اور ندیاں ہم لوگ ہیں۔ وہ لوگ اُسے صرف نام کی حد تک جانتے ہیں جبکہ میں اُن کو فیڈ کرتا ہوں، اُن پر کنٹرول کرتا ہوں لیکن قدم ملانے سے پہلے ہمارے درمیان فیصلہ ضروری ہے۔ اس پہاڑ کو ہٹانے کے بعد ہمارے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہوگی؟"

"آپ کا سوال۔۔۔"

"ڈیڈ!" نورین میری بات کاٹ کر بولی۔ "کیا آپ نے نورین کا جذبہ نہیں سمجھا۔ اُس نے ایک نام لیا تھا ایک اعتراف کیا تھا۔ اُس رشتے سے بڑھ کر بھی کوئی تعلق بہتر اور مضبوط ہو سکتا ہے؟"

"شکریہ نورین۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔ "تم نے میری رُوح کی ترجمانی کر کے ایک مشکل سوال کے جواب سے مجھے بچا لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے بچو۔" شاہ زمان بڑبڑایا۔ "اب مجھے بتاؤ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ملک کو بھرپور چوٹ سے جواب۔" میں نے کہا۔ "میں آج رات ہی اُس کا گودام لوٹنا چاہتا ہوں۔"

"میری موجودگی میں؟" شاہ زمان بولا۔

"نہیں ہم ڈراما کھیلیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ خرم سلطان وہ شخص ہے جسے ملک نواز سزائے موت سُنا چکا ہے۔ ہمارے درمیان جنگ جاری ہے۔ کل اُسے رپورٹ دی جائے گی کہ شاہ زمان کو ریوالور کی زد پر رکھ کر خرم سلطان گودام میں اُترا اور لُوٹ کر فرار ہو گیا۔ کیسا رہے گا ڈراما انکل؟"

"تمہارا کیا خیال ہے وہ مجھے صفائی پیش کرنے کی مہلت دے گا؟" شاہ زمان نے گہری سانس لی۔ "نہیں برخوردار، وہ بس آنکھ کا اشارہ کرے گا اور کسی طرف سے گولی میرا نرخرہ پھاڑ دے گی۔"

"وہ آپ کے بلیک وارنٹ تو پہلے ہی جاری کر چکا ہے ڈیڈی۔" نورین نے دبکتی آواز میں کہا۔ "فرحم کی گولی کا رُخ اگر بدل گیا ہے تو کوئی دوسرا آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ ہم صفائی پیش کرنے اُس کی عدالت میں جائیں گے ہی کیوں؟ وہ دُشمن ہے، ہم جب اُس کے خلاف جنگ لڑیں گے تو ہم اپنی مرضی کا غلاف کھولیں گے۔"

"لیکن۔" شاہ زمان نے تنکے کا سہارا لیتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن نہیں انکل۔" میں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اگر آپ بزدلی کے راستے پر چلنا چاہتے ہیں تو میں آپ کی موت کے بعد اُس سے نمٹ لوں گا۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

"نہیں خرم۔" نورین تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ "میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ہم اپنی بقاء کی جنگ لڑیں گے۔ ڈیڈی نہیں تو میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ ہم راستے کی ہر رکاوٹ پھلانگتے اُس کے گودام میں اُتر جائیں گے۔"

"جوش نہیں بیٹی۔" شاہ زمان مردہ لہجے میں بولا۔ "اگر کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو ہوش سے کام لو۔"

"میں نے ہوش کی رہنمائی طلب کی ہے انکل۔"

"ٹھیک ہے، میں نائٹ کلرک اور سکیورٹی گارڈ کو ہٹاتا ہوں۔"

"میں ساتھ چلوں گا انکل۔"

"اوہ، غالباً تم۔۔۔"

"ہاں انکل۔" میں نے معذرت طلب نگاہوں سے دیکھا۔ "یہ میری مجبوری ہے۔ ہماری دُنیا ہی بے اعتباری ہوتی ہے۔ ہم اپنے سائے کو بھی بعض اوقات شک کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں۔"

"آؤ۔" شاہ زمان نے کندھے اُچکائے۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم نورین کو بھی باہر جانے کی اجازت نہیں دو گے۔"

"ہاں انکل۔" میں نے نورین کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ "لیکن مجھے یقین ہے نورین ناراض نہیں ہوں گی۔"

"میں سمجھتی ہوں خرم ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔" نورین نرم آواز میں بولی۔ "آپ جائیں ڈیڈی میں ان شریف لوگوں کے درمیان خود کو محفوظ محسوس کر رہی ہوں۔"

بلاشبہ نورین ناگن تھی لیکن میری مردانہ جبلتوں اور شاہانہ چاہتوں نے اُس زہریلی ناگن کے سارے کس بل سیدھے کر دیے تھے۔ اُس نے خود بھی اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بُرے باپ کی بُری بیٹی ہونے کے باوجود ایک لڑکی بھی ہے جو چاہنے اور چاہے جانے کے جذبوں سے آشنا ہے۔ میرے ساتھ

بھی ماضی کے تجربات کی روشنی تھی۔ میں نے بہت اچھے آدمیوں کے اندر بُرے آدمی دیکھے تھے اور کتنے ہی بُرے انسانوں کے اندر اچھے انسانوں کو باہر آتے بھی دیکھا تھا۔ اُن میں ایڈنا کا باپ مارشا اور گوتھم جیسے لوگ سرِفہرست تھے۔ اگر میں نے نورین جیسی شاطر اور بُری لڑکی کے اندر سوئی ہوئی اچھی لڑکی یا صرف لڑکی کو بیدار کر دیا تھا تو یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ میں نے رشیدہ کی سنگلاخ اور بنجر ذات سے بھی تو ایک باوقار لڑکی کو دریافت کیا تھا۔

اسی لیے میرا ایمان اس بات پر ہمیشہ راسخ رہا ہے کہ بنیادی طور پر کوئی انسان بُرا اور اچھا نہیں ہوتا۔ بُرے کو کوئی بھی کرن اچھائی کی طرف بُلا لیتی ہے اور اچھے کو کوئی بھی چنگاری بُرائی کے دہکتے جہنم میں دھکیل دیتی ہے۔

شاہ زمان چونکہ گرگِ باراں دیدہ تھا۔ ایسے لوگ حالات کے مطابق اپنا رُخ ہی نہیں شخصیت بھی بدلنے پر قادر ہوتے ہیں۔ وہ ریوالور کی زد پر اُوپر آیا تھا۔ اُس کی بیٹی ہماری قید میں تھی۔ اس لیے میں اُس کے نرم انداز اور تعاون پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔

کاؤنٹر کے پیچھے اسٹولوں پر ایک کلرک لیٹا رسالہ پڑھ رہا تھا اور لفٹ کے کھلے دروازے کے سامنے ایک طویل القامت فائٹر نوجوان کُرسی پر نیم دراز تھا۔ اُس کی گود میں اسٹین گن لیٹی ہوئی تھی۔

"لڑکے کہاں گئے سب؟" شاہ زمان نے کاؤنٹر بجا کر پوچھا۔

"چیف نہ آئے تو تم سب لوگ گاہکوں کو دھکیل کر عجیل کرنے لگتے ہو۔"

"نہیں ماسٹر۔" کاؤنٹر کلرک نے احتجاجی لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کا الزام غلط ہے۔ ہم نے مقررہ وقت پر ہوٹل بند کیا ہے۔"

"چیف تک ایک ارجنٹ پیغام بھجوانا تھا۔ پارٹی آج ہی معاملہ طے کرنا چاہتی ہے۔"

"کیا یہ مہمان ملنا چاہتے ہیں ماسٹر؟" کلرک نے پوچھا۔

"ہاں ایسے کرو تم سیل نمبر چھ میں چلے جاؤ۔ جب چیف اجازت دے دیں تو میں ان کو لے جاؤں گا۔"

"بہتر ماسٹر۔" کلرک نے شوز پہنتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنی گاڑی کی چابی دے دیں۔"

شاہ زمان نے چابی اُس کی طرف اُچھال دی۔ جب وہ باہر نکل گیا تو شاہ زمان ٹہلتا ہوا سکیورٹی گارڈ کی طرف چلا گیا۔

"جاوید میاں! پارٹی کو مال دکھانا ہے تہ خانے کی چابی دے دو۔"

"مجھے افسوس ہے ماسٹر۔" وہ مؤدب انداز میں بڑبڑایا۔ "چابی چیف کی تحویل میں رہتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" شاہ زمان نے بے پروائی سے کہا۔ "ماسٹر کی میرے پاس ہے آؤ نیچے چلیں۔"

"سوری ماسٹر۔" وہ نفی میں گردن ہلانے لگا۔ "میں چیف کی اجازت کے بغیر آپ کو اجازت نہیں دے سکتا۔"

"کیا میں سیکنڈ چیف نہیں ہوں؟" زمان خان تُند آواز میں بولا۔ "چلو میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔"

"میں معذرت کے ساتھ حکم عدولی کرتا ہوں۔" اُس نے اسٹین گن پر تھپکی دی اور انگڑائی لیتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ "برائے کرم آپ مجھے گستاخی پر مجبور نہ کریں۔"

"کوئی بات نہیں جناب۔" میں نے نرم اور دوستانہ لہجے میں کہا۔ "میرا بھائی ٹھیک کہتا ہے۔ ہم چیف کی کال تک انتظار کر لیں گے۔ آپ تشریف رکھیں دوست، مجھے آپ کی مجبوری کا احساس ہے۔"

سکیورٹی گارڈ کا تنا ہوا چہرہ ایک دم نرم ہو گیا اور اُس نے مشکور نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"برائے کرم ہمارے لیے دو کُرسیاں لے آئیں۔"

"آپ ہال میں بیٹھ جائیں۔" اُس نے کہا۔

"بہرصورت۔" شاہ زمان سرد آواز میں بولا۔ "میں چیف سے اپنے اختیارات کے بارے میں ضرور بات کروں گا۔"

"اگر آپ کے دائرۂ اختیار میں گودام تک جانا شامل ہوا تو میں معافی مانگ لوں گا ماسٹر۔" سکیورٹی گارڈ نے گردن موڑ کر جونہی شاہ زمان کو دیکھا میری ٹانگ دائرے میں گھوم گئی۔ مجھے یوں ہی محسوس ہوا تھا جیسے میری ٹانگ کسی تن آور درخت کے تنے سے ٹکرائی تھی۔ وہ جھول کر کُرسی سے ٹکرایا لیکن سنبھل گیا تھا۔

میں دو قدم پیچھے ہٹ رہا تھا تاکہ مناسب فاصلہ طے کر کے اُس پر فلائنگ کِک لگاؤں کہ عقب سے شاہ زمان کی لات میری پُشت پر پڑی اور میں لڑکھڑاتا ہوا جاوید کی طرف گرا۔ عین اُسی وقت جاوید نے پلٹ کر برسٹ مار دیا۔ چونکہ میں گر رہا تھا اس لیے تمام گولیاں میرے بالوں سے رگڑ کھاتی ہوئی شاہ زمان کے پھیلے ہوئے جسم میں پیوست ہو گئی تھیں۔ میں جب ہتھیلیوں کے بل گرا تو میرے کانوں سے شاہ زمان کی کربناک دھاڑ ٹکرائی۔

جاوید کو قدرتی طور پر ایک لحظے کے لیے منجمد ہونا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیونکہ اُس کی گولیاں مطلوبہ ہدف کے برعکس اپنے ہی آدمی کو چاٹ گئی تھیں۔ میں نے اُسی لمحے کو استعمال کرتے ہوئے جاوید کی ٹانگیں گھسیٹ لی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہُوا تڑپھا گرا۔ پہلے کُرسی سے ٹکرایا پھر کوبرے کی طرح خود کو سمیٹ کر مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

چونکہ میرے ہاتھ اُس کی ٹانگوں پر تھے اس لیے اُس نے حیرت انگیز پھرتی سے کام لے کر میری گردن آہنی شکنجے میں کس لی تھی۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اُس کی قوت ناقابلِ تسخیر تھی لیکن مجھے گردن ٹوٹنے کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اُس کا انداز ایسا ہی تھا۔ اگر میں اناڑی ہوتا اور ذرا بھی گردن ڈھیلی چھوڑتا تو وہ ماہرانہ جھٹکا دے کر گردن کی ہڈی توڑ دیتا۔

سانس سینے میں روک کر میں نے نچلا دھڑ ڈھیلا چھوڑ کر اپنی تمام تر قوت گردن کے پٹھوں میں مجتمع کر لی تھی پھر بھی میری آنکھیں آہستہ آہستہ اُبلنے لگی تھیں اور منہ کھل گیا تھا۔ مجھے خود پر اعتماد تھا اگر وہ مزید دس منٹ بھی سانس لینے کی مہلت نہ دیتا تو بھی میں سانس روک سکتا تھا۔ اُسے تو یہ یقین نہ رہا ہوگا کہ کوئی شخص چار منٹ سے زیادہ وقت سانس نہ لے کر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس لیے اُس کی تمام تر توجہ اور قوت گردن نچوڑنے پر مرکوز تھی۔

میں نے تڑپنے کے انداز میں نچلے دھڑ کو پھڑکایا اور گھٹنوں کے بل ہو گیا۔ میرے دونوں ہاتھ فارغ تھے اور پوزیشن بھی بہتر لے لی تھی۔ تب ہی میرے ہاتھ دائیں بائیں پھیلے اور پوری قوت سے کھلی ہتھیلیاں اُس کے کانوں پر جم گئیں۔

اُس کے منہ اور ہاتھوں کی گرفت کو ایک ساتھ ہی جھٹکا لگا تھا لیکن وہ مضبوط انسان تھا۔ اُس نے دوسری متوقع ضرب سے بچنے کے لیے سر جھکا کر میرے سینے پر ٹکر ماری اس طرح وہ دُہرا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہوگا لیکن میں نے پہلی ضرب لگا کر ہی ہدف بدل لیا تھا۔ دوسری ضرب کا اندازہ تو وہی تھا لیکن ہدف پسلیاں تھیں مضبوط جسم کی ہڈیاں بھی مضبوط رہی ہوں گی مگر ضرب کی قوت میں بھی مہارت کا وزن تھا۔ میں نے ہڈیاں کڑکڑانے کی آواز سُنی اور ساتھ ہی اُس کی انگلیاں بے جان ہو کر گردن سے ایسے الگ ہونے لگی تھیں جیسے دم توڑتی سنپولیاں بے دم ہو کر گر رہی ہوں۔

جب وہ دائیں کروٹ گر رہا تھا تو میں نے آخری اور فیصلہ کن ہتھیلی کا کٹ اُس کی گردن پر مارا۔ وہ ایسے ہی تڑپ کر پھڑپھڑانے لگا تھا جیسے مُرغ کی گردن پر چاقو کی دھار چلا کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

مُنا میری چھٹی حس نے تھپکی دی۔ میں نے چہرہ گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ ریلنگ پر ہارون اور نورین جھکے ہوئے تھے۔ یقیناً برسٹ کی آواز نے ہی اُن کو باہر لائی تھی۔

"پہلا راؤنڈ مکمل ہو گیا ہے۔" میں نے اُوپر دیکھتے ہوئے بتایا۔ دوسرے راؤنڈ کے لیے سامان جلدی لے آؤ۔"

ہارون ایک دم پیچھے ہٹا اور غائب ہو گیا۔ میں بھی پھڑکتے ہوئے سکیورٹی گارڈ اور بے حس و حرکت اُدھڑے ہوئے شاہ زمان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ دونوں کھلی جگہ تھے اور وہ راہداری ہوٹل تھا کوئی بھی کسی وقت اندر آ سکتا تھا۔

میں نے دوڑ کر مین ڈور اندر سے بند کیا اور دونوں کو بلی باری گھسیٹ کر سیڑھیوں کے نیچے ڈال دیا پھر کاؤنٹر کے نیچے سے صفائی کرنے والے جھاڑن نکال کر ایک منٹ میں فرش بھی صاف کر دیا تھا۔ جب میں کین کے واش بیسن سے ہاتھ منہ دھو کر باہر آیا تو ہارون کو نہ پا کر خطرے کا احساس ہونے لگا۔ اُسے حالات کے پیشِ نظر ایک دو منٹ میں آنا چاہیے تھا۔

لفٹ سے نکل کر میں دبے پاؤں جب ہارون کے کمرے کے سامنے پہنچا تو اندر خطرہ اُسے گھیر چکا تھا۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا ہارون کمرے کے وسط میں ہاتھ گردن پر رکھے ہونٹ چبا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں میں ایک چرمی بیگ پڑا ہُوا تھا۔ نورین دروازے سے صرف دو فٹ دُور کھڑی تھی۔ اُس کی پُشت دکھائی دے رہی تھی۔ سچویشن کو سمجھنے میں کوئی دُشواری نہ تھی۔ نورین نے اپنے باپ کے قاتلوں کو پہچان کر کھیل کو سمجھ لیا تھا۔

"تم دونوں کرائے کے قاتل ہو۔" نورین بھڑکتی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "اب میں سمجھی ہوں کہ تم نے رات میرے ڈیڈی کو کیوں چھوڑ دیا تھا۔ وہ شیطان اُن کو سیڑھی بنا کر ملک نواز کو بھی ڈسنا چاہتا تھا۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟"

"اس کا جواب تم خود ہی دے سکتا ہے۔" ہارون نے جواب دیا۔ "میں دوسرے درجے کا آدمی ہوں۔ مجھے تم چوہدری نے کرنے پر حاصل کیا ہُوا ہے۔"

"چلو بیگ کو پاؤں سے اِدھر دھکیل دو۔"

"نہیں مس۔" ہارون نے نفی میں گردن ہلائی۔ "بیگ کو اگر ٹھوکر لگائی گئی تو ہم دونوں ملبے میں دب جائیں گے۔"

"بکواس نہیں، بیگ میں کیش ہے۔"

"خود دیکھ لو۔" ہارون بولا۔

میں دو قدم پیچھے ہٹا اور دانت پیس کر رہ گیا کیونکہ میرے ذہن میں جو روشنی کی کرن چُھوٹی تھی، نورین اگر اپنی جگہ سے آگے ہو جاتی تو کمرے کی تاریکی میں ڈوب جاتی۔

فوری قدم ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں اُچھل کر چند قدم پیچھے گیا اور پھر طوفانی رفتار سے کواڑوں پر دایاں کندھا مارا۔ یہ بھی اندھی چال تھی۔ اگر دروازہ اندر سے بند ہوتا تو خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہو سکتا تھا مگر کواڑ میرے ساتھ ہی اندر جا کر نورین کی بے خبر پشت سے ٹکرائے تھے۔ جب میں اُچھل کر اُٹھا تو نورین بھی ہتھیلیاں پر بوجھ ڈال کر اُٹھ رہی تھی۔ ہارون اُڑتا ہُوا میرے قریب سے گزرا اور نورین کے حلق سے دِل خراش چیخ کمرے میں گردش کرتی باہر نکل گئی تھی۔

میں نے پلک جھپکتے دروازہ بند کر دیا تھا۔ نورین کی چیخ کا کوئی بھی ردِعمل ہو سکتا تھا۔

"تم... تم نے ذلیل انسان مجھے دھوکا دیا ہے۔" وہ ناگن کی طرح بل کھا کر چیخی تھی۔ ایک نازک اندام حسینہ اس قدر مضبوط اور دلیر ہو گی، مجھے اُمید نہ تھی۔ دو مہلک ضربات سہہ کر وہ پاؤں پر کھڑی ہی نہ ہوئی تھی بلکہ اُس کے انداز میں مقابلہ کرنے کا عزم بھی جھلک رہا تھا۔

"تم بھی بے حد جلد باز ہو نورین۔" میں نے شاکی لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہارے ڈیڈی کے قاتل کو ہلاک کیا ہے۔"

"نہیں تم جھوٹے اور دغاباز ہو۔" وہ دہاڑی۔ "تم ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہو۔ معاوضہ لے کر تم نے میرے ڈیڈی کو قتل کر دیا ہے اور اس جگہ کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ ملک کا گودام لُوٹ سکو۔"

"مجھے افسوس ہے تم جیسی لڑکی غلط اندازے لگا رہی ہے۔ پہلا حملہ میں اس کمرے میں بھی خاموشی سے مکمل کر سکتا۔ اگر مجھے قتل ہی کرنا ہوتا تو کل کی رات بھی بڑی آسان تھی۔ یقین کرو سکوتو ہمارا تعلق اور جذبہ زندہ رہ سکتا ہے۔ سکیورٹی گارڈ نے اُن کو ہلاک کیا ہے۔"

"جھوٹ۔" وہ جھُول کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "یہ بتاؤ میرے بارے میں کیا فیصلہ کرو گے؟"

"وہی جو پہلی نظر نے کیا تھا۔" میں نے جذباتی آواز میں بتایا۔ "میں جلد باز نہیں ہُوں اور نہ ہی فیصلے بدلنے کا عادی ہُوں۔ تم چاہو تو جا سکتی ہو۔"

وہ لحظہ بھر مُرغِ خوش رنگ آنکھوں سے گھُورتی رہی پھر جیسے غبارے کی ہوا خارج ہونے لگی۔ اُس کا تنا ہُوا جسم پہلے ڈھیلا ہُوا وہ صوفے پر بکھری اور پھر کسی ایسے بچے کی طرح رونے لگی جو حلوائی کی دکان پر ہونے والی فائرنگ سے ڈر گیا ہو۔ طوفان نے اچانک رُخ بدل لیا تھا لیکن میرے پاس کنٹرول کرنے اور طوفان کا نظارہ کرنے کا وقت نہ تھا۔ وہ لوٹ چکی تھی اور مجھے ابھی بہت کام کرنا تھا۔ میں نے ہارون کو اشارہ کیا اور خود بیگ اُٹھا کر باہر نکل گیا۔

لفٹ مال کی گود جیسی میری منتظر تھی لیکن میں اُس گود میں داخل ہونے سے پہلے ہی دوڑتا ہُوا پلٹ گیا تھا۔ اچانک ہی خیال آیا تھا کہ دھماکوں اور آگ سے قبل ہمیں اس ہوٹل سے دُور ہونا چاہیے۔

"آپ لوگ فی الفور کمرا چھوڑ دیں۔" دروازے میں جا کر میں بولا تو نورین نے بھیگا ہُوا چہرہ گھما کر نم نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

"میں فارغ ہو کر پارکنگ میں آ رہا ہُوں۔"

ہارون نے اثبات میں گردن ہلائی اور نورین کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس نے مثبت سماجت سے اُسے منایا تھا یا نورین نے اُسے تعاون دیا تھا، میرے پاس مکالمے بازی سُننے کا وقت نہ تھا۔ اگر گھڑی واپس آ جاتا تو حق اُس سے بھی چھین لیتا۔

جُوں ہی میں اُن کو ہدایات دے کر باہر نکلا، چھلانگ کے لیے اٹھا ہُوا قدم ٹھٹک کر واپس ہو گیا تھا۔ نورین کی چیخ اور دروازے کے دھماکے نے پڑوسیوں کی انسانی ہمدردی اور احساس ہمسائیگی کو بیدار کر دیا تھا۔ دائیں بائیں کے کمروں سے چار آدمی نکل آئے تھے اور ایک دوسرے سے آواز کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

"معاف کیجیے گا جناب۔" میرے چہرے پر یقیناً پریشانی نظر آ رہی ہو گی۔ "ہماری وجہ سے آپ کو زحمت ہُوئی۔"

"کیا آپ کے رُوم میں کوئی حادثہ ہُوا ہے؟" ایک بُوڑھے نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"حادثہ نہیں جناب۔" میں نے ندامت بھرے لہجے میں بتایا۔ "شاید حادثہ ہی ہُوا ہو گا لیکن ہمارے رُوم میں نہیں، سکیورٹی گارڈ نے چند سمگلروں کو دھمکانے کے لیے ہوائی برسٹ مارا ہے۔ اس وقت ہم اُوپر آ رہے تھے، میری بیگم دل کی مریضہ ہے، ویسے بھی عورتیں کہ حوصلہ ہوتی ہیں۔"

"اوہ... بُوڑھا آگے بڑھ آیا۔" اب سب ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں جناب، وہ خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی اب بھی..." دروازے سے وہ دونوں نکل آئے تو میں بولتے بولتے بوکھلا گیا تھا۔ "اوہ وہ تھیں، یہیں حالت میں باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں یہاں نہیں رہ سکتی۔" نورین نے احتجاج کیا اور میرے دل و دماغ میں بجتی خطرے کی گھنٹیاں خاموش ہوگئیں۔ نورین نے میرے بیان کو کمال ذہانت سے سہارا دے کر خود کو منوا لیا تھا۔ اُس نے لوگوں کو دیکھ کر سچویشن جان لی تھی۔ اُس نے وہی انداز اور کردار ادا کیا تھا، جو ہماری دُنیا میں رائج تھا۔ ہم دوسروں کی مداخلت سے بچنے کی خاطر اپنے قاتل کو بھی وقتی طور پر دوست بنا لیتے ہیں۔

"تھینک یو نُور۔" لفٹ میں داخل ہو کر میں نے ممنونیت کا اظہار کیا۔ "تم نے ذہانت اور تعاون سے ایک خطرے کو ٹال دیا ہے۔"

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا محترم چوہدری۔" وہ سرد آواز میں بولی۔ "ان حالات میں جب میرا باپ قتل کر دیا گیا ہے۔ میں پولیس کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہتی۔ یہ بین دین ہمارا اندرونی... معاملہ ہے۔"

"یعنی تمہارا دل ابھی صاف نہیں ہُوا؟"

"دل اور دماغ دو الگ الگ خانے ہیں چوہدری۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "دل تو شاید باغی ہو چکا ہے۔ وہ تمہارے خلاف کوئی بات نہیں سن رہا۔ لیکن ذہن میرے کنٹرول میں ہے۔ فی الحال میں کوئی تبصرہ نہیں کروں گی۔ ہاں ڈیڈی کو آخری منزل پر پہنچا کر ذہن کو اِدھر لاؤں گی اور پھر جو فیصلہ ہوگا تم محسوس کر لو گے۔"

"دل سے بھی مشورہ کر لینا نورین۔"

"نہیں۔" اُس نے سر جھٹک کر فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ "دماغ کے فیصلے میں دل کو شامل نہیں کروں گی۔ دل ایک جذباتی لڑکی کا ہے، مجھے شاہ زمان کی دست راست بن کر فیصلہ کرنا ہوگا کیونکہ نورین کی بقاء دل کی طلب پر نہیں بلکہ ذہن کی روشنی میں مضمر ہے جس طرح زندگی کو بچانے کی خاطر بعض اوقات ڈاکٹر کو اپنی عزیز ترین ہستی پر بھی نشتر چلانا پڑتا ہے۔ میں ہوں تو دل بھی ہے۔ درد کی شدید طلب بھی۔"

"مجھے یقین ہے خلوص کی روشنی تمہیں بہتر فیصلے تک لے جائے گی۔" میں نے لفٹ رُکتے ہی اُس کے شانے پر تھپکی دی اور وہ سُکڑ کر دیوار سے لگ گئی۔ "آنے والا وقت بتائے گا، خرم سلطان کس کا دُشمن اور کس کا دوست ہے۔"

"کیا میں ڈیڈی کی لاش کو ایک نظر دیکھ سکتی ہُوں۔" اُس نے بھرائی آواز میں پوچھا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن وقت نازک ہے، تمہیں یہاں سے دُور نکل جانا چاہیے۔" میں نے تھیلا ہارون کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔ "ہم اندر دس منٹ سے زیادہ نہیں رہیں گے۔ اگر پارکنگ میں انتظار کر سکو تو ساتھ چلیں گے۔ اگر جانا چاہو تو بھی تمہیں اجازت ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گی۔" اُس نے کندھے اُچکا کر اور مین ڈور کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ دروازے پر رُک کر اُس نے گردن موڑی اور بلٹ اُتارنے لگی۔

"لڑکی کے تیور اچھے نہیں چیف۔" ہارون نے کہا۔ "آپ نے اُسے آزاد کر کے رِسک لیا ہے۔"

"زندگی کے کھیل میں رِسک ناگزیر ہوتا ہے پیارے۔" میں نے فلسفے میں پناہ لیتے ہُوئے اپنی کھلی حماقت کا جواز پیش کیا۔ نورین کے تیور مجھ سے پوشیدہ نہ رہے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ان دس منٹوں کے وقفے کو استعمال کر کے میرے لیے کتنی مشکلات کھڑی کر سکتی ہے لیکن میرے ساتھ کئی مجبوریاں اور مصلحتیں تھیں۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کے اور اپنے مستقبل کی خاطر میں ملک نواز کے گودام سے مال اُڑا رہا ہُوں۔ جب وہ گودام کو تباہ کرنے کی کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھتی تو اُس کا ڈانواں ڈول شک مضبوط یقین میں بدل جاتا اور میرے پاؤں کے نیچے سے ایک مضبوط سیڑھی کھسک جاتی۔ میں نے لاہور کی مارکیٹ اور ملک نواز سے جنگ لڑنے کے لیے نورین کو نُچتہ مورچہ بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ میں اُس کی آر اور رہنمائی میں ملک نواز کی پھیلی ہُوئی جڑوں تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر نورین کا شک یقین کے خانے میں کُود جاتا تو نہ صرف ایک شاطر لڑکی میری راہ کی چٹان بن سکتی تھی بلکہ تمام متعلقہ پنچھیوں کو بھی وہ خرم سلطان کے خطرے سے آگاہ کر دیتی۔

وہ خطرناک اور شاطر ہونے کے باوجود ایک جذباتی لڑکی بھی تھی جسے میری مردانہ وجاہتوں نے گھائل کر دیا تھا۔ میں اُسے دھوکا دہی کے زخموں پر مرہم رکھنے کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔

تہ خانے کا واحد راستہ آہنی شٹر اور دُہری گرل نے روک رکھا تھا، لیکن چاروں تالے ہارون کے الیکٹرونک ریوالور کی شعاعوں کا مقابلہ نہ کر سکے تھے۔ تالے کھُلے تھے نہ ٹوٹے تھے بلکہ موم کا گڈا کی طرح پگھل کر بہہ گئے تھے... ترخانہ مرکزی ٹیوب کی دُودھیا روشنی میں نہایا ہُوا تھا۔ میں الماری کا راز داں تھا۔ اس لیے دوسرے پورشن میں داخل ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آئی تھی۔ وہی پورشن ملک نواز کا مرکزی گودام اور سونے کی کان تھا۔

"تم ناممکن حد تک تیز کام کرو گے ہارون۔" میں نے منشیات کے اسٹاک کی جانب نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "بلاشبہ

کروڑوں کا مال رہا ہوگا۔" میں ملک کا ٹیبل دیکھتا ہُوں۔ شاید کوئی کام کی شے مل جائے۔"

"ٹائم کتنا سیٹ کروں؟" ہارون نے بیگ سے ٹائم بم نکالتے ہُوئے پوچھا۔

"دس منٹ۔" میرا جواب سُن کر ہارون گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بم نکال نکال کر فرش پر رکھنے لگا۔ میں واپس پہلے کمرے میں گیا۔ ٹیبل کی ساری دراز میں مقفل تھیں۔ اس لیے مجھے ہارون کا جادو اثر ریوالور لینے واپس جانا پڑا تھا۔ چاروں دراز کھنگال کر جب میں ایک ڈائری اور کرنسی نوٹوں کا بنڈل بنا کر ہارون کی طرف گیا تو وہ ڈبوں کے درمیان مُجھکا تاروں کا جال پورے کمرے میں بچھا چکا تھا۔

"چلیے چیف۔" اُس نے ہاتھ جھاڑتے ہُوئے کہا۔ "ٹھیک دسویں منٹ پر یہاں شیطانوں کے قہقہے اُبلنے شروع ہو جائیں گے۔"

"اور جہنم کے شعلے بھی۔" میں نے خوش دلی سے ٹکڑا لگایا۔

"میرا اندازہ اگر غلط نہ ہُوا تو ہوٹل کو بھی نقصان پہنچے گا۔"

"کیا دھماکے بالائی منزل کو متاثر کر سکتے ہیں ہارون؟"

"نہیں صرف آگ..."

"اوہ پھر ٹھیک ہے۔ آگ سے لوگ بچ سکتے ہیں، ورنہ میں خطرہ مول لے کر تمام مہمانوں کو ہوٹل چھوڑنے کی اطلاع کر کے باہر جاتا۔"

"اُن لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں چیف۔" ہارون نے بتایا۔ "ٹائم صرف آگ بھڑکائیں گے اور لوگ دُھواں دیکھ کر اپنا بچاؤ کر لیں گے ویسے بھی ریائشی حصّہ بہت اُوپر ہے۔"

"ہارون..." ایک فوری خیال کے تحت میں دوڑنے لگا۔ "جلدی اُوپر چلو، لاشوں کو تہ خانے میں لڑھکانا ہوگا۔"

"اس تماشے کا کوئی فائدہ چیف؟" ہارون نے میرا ہاتھ تھام کر روک لیا۔ "یہ ظالمانہ کارروائی ہوگی۔ وہ بُرے سہی لیکن اُنھوں نے زندگی میں یقیناً کبھی کلمہ پڑھا ہوگا۔ ان کو کلمے کے صدقے کفن، قبر اور جنازے سے محروم نہ کرو چیف۔"

"شکریہ دوست۔" میں نے ہونٹ کاٹ کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ "خدا مجھے معاف کرے۔ میں دراصل ملک نواز کو بھرپور جھٹکے دینا چاہتا تھا۔"

"اگر اُس کے اندر ذرا بھی غیرت کی رمق زندہ ہوئی تو جتنے جھٹکے آپ اُسے دے چکے ہیں۔ وہ اُن سے جانبر نہ ہو سکے گا۔" سیڑھیاں چڑھ کر ہارون نے صرف شٹر گرایا اور میرے ساتھ ایسے چلنے لگا، جیسے ہم مال روڈ پر چہل قدمی کے بعد گھر سے نکلے تھے اور یہ آخری جھٹکا تو اُس کی سات پشتوں کی قبریں بھی لرزا دے گا۔ کروڑوں کا نقصان اور معاون ہاتھوں سے محرومی یقین کریں اُس کا غبارہ یہ شدید دباؤ برداشت نہیں کر سکے گا۔"

"کاش وہ میرے سامنے پھٹے۔" میں نے کاؤنٹر پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کو اُٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ ملک نواز کا غبارہ تو نہ پھٹا تھا لیکن میرے سامنے ٹیلی فون سیٹ پھٹ کر بکھر گیا تھا۔

نورین کی کار پاتھ وے پر گیٹ کی طرف مُنہ کر کے کھڑی ہی نہیں بلکہ اسٹارٹ تھی اور نورین کھڑکی سے چہرہ نکالے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میں نے فرنٹ ڈور کو تھپ تھپایا۔ نورین نے جُھک کر لاک کھول دیا۔

"ایک چوٹ ہو گئی نورین۔" میں نے اندر بیٹھ کر پیچھے ہیچ میں کہا۔ "گودام خالی ہے۔"

"میں اپنے شک سے تمہیں آگاہ کرنا چاہتی تھی۔" اُس نے کار بڑھاتے ہُوئے بتایا۔ "لیکن محض شک تھا۔ تم کل سے جو کچھ کرتے پھر رہے ہو، ملک نواز جیسا شخص بے پروا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس سے ایک بات ثابت ہو جاتی ہے خرم چوہدری کہ تم ملک نواز کے بھی آدمی نہیں ہو۔"

"ہاں نہیں ہُوں۔" میں نے پُرجوش آواز میں جواب دیا۔ "تمہیں کبھی موقع ملا تو میری بیک ہسٹری پڑھ لینا۔ میں بار بردار جانور کبھی نہیں رہا۔ میں نے اپنی پُشت پر کبھی کسی سوار کو برداشت نہیں کیا۔ میں ہمیشہ حاکم اور سوار رہا ہُوں۔ حالانکہ ملک نواز نے بڑے اُونچے دام دے کر کاٹھی ڈالی تھی۔"

"اگر میں نہ ملتی تو تمہاری کارروائی کا انداز کیا ہوتا چوہدری؟"

"میں شاہ زمان کی گردن توڑ کر ملک نواز کا اعتماد حاصل کرتا اور پھر اُس کے حلق میں پھنس جاتا۔"

"وضاحت نہیں کرو گے؟"

"میں اُس کے گروہ میں شامل ہو کر اُسے کترنا شروع کر دیتا۔"

"یہ چانس تو اب بھی تمہیں میسر ہے۔"

"شاید تمہیں نہیں بتایا گیا، نورین۔ میں ملک نواز کے تین گُرگے اُدھر قتل کر کے ہوٹل میں داخل ہُوا تھا۔"

"ملک نواز کے نہیں۔" نورین نے بتایا۔ "وہ ہمارا ہی ایک ذیلی گروہ تھا۔"

"اور تم ملک نواز کے گروہ سے تعلق رکھتی ہو۔ بات گھوم پھر کر وہیں جاتی ہے نورین۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس کے باوجود میں ضمانت دے سکتی ہوں خرم وہ مجھے ... کر دے گا۔" نورین نے اسٹیئرنگ وھیل پر انگلیاں بجاتے ... کہا۔ "یہ انکشاف شاید میرے لیے نقصان کا باعث ہوگا ... ... میری کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔"

"اگر تمہارے حسن میں پاگل کر دینے والا سحر نہ ہوتا تو" میں نے ... انداز میں کہا۔ "اگر میں اس سحر کا مارا ہوا نہ ہوتا تو یقین نہ کرتا، ... ہے وہ تمہارا دیوانہ ہوگا۔"

"پرستار کہو وہ کسی پجاری کی طرح میری پرستش کرتا ہے میں ... اس نے ڈیڈی کو راہ سے کیوں ہٹایا ہے؟ ڈیڈی کی موت ... وجہ سے ہوئی ہے۔ اس نے ڈیڈی سے مجھے مانگا تھا، چند روز ... بات ہے لیکن ڈیڈی نے صاف انکار کر دیا تھا۔"

"جبکہ تم نے اقرار کر رکھا ہوگا؟" میری آواز میں گرم چنگاریاں ... ...؟"

"ہاں۔" اس نے بوجھل سانس لی۔ "وہ میرے حسن کا اسیر ... کا پجاری ہے اور میں دولت کی پجارن ہوں ... میں ... ... کی بیوی بن کر اس ملک پر حکمرانی کے خواب کی تعبیر چاہتی ... نے بتایا تھا کہ بہت جلد وہ اس ملک کا سربراہ بنا دیا جائے گا۔"

"نورین..." میں نے نرم آواز میں پوچھا۔ "ملک نواز کی ڈور کس ... میں ہے؟"

"کیا... کیا مطلب؟" نورین کو اتنا شدید جھٹکا لگا تھا کہ کار ہرا ... "اسے کون سربراہ بنوا رہا ہے؟"

"اس کی پارٹی اور کون؟" نورین کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا تھا ... "مجھے معلوم وہ پارٹی لیڈر ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ وہ لیڈر ہے اور اسے کون لیڈ کر رہا ہے؟" ... چبائے آواز میں جواب دیا۔ "لیکن میں محب وطن ہوں اور ... سے کوئی دلچسپی ہے۔ ہم جیسے لوگ بھیڑیا خصلت ہوتے ... اپنی بھوک کو یاد رکھتے ہیں۔"

"اب تو مجھے بھی سیاست اور اس کی پارٹی سے کوئی دلچسپی ... رہی۔"

"جب کہ تمہارے خوابوں اور تعبیر کے درمیان حائل چٹان ہٹا ... ہے۔"

"اس کے باوجود میرے سوچنے کا انداز تم نے بدل ڈالا ہے میں ... رے مرد کا تصور بھی نہیں کر سکتی کیوں نہ وہ پوری دنیا کو ... لیے میرے قدموں میں ڈالنے والا ہو۔ ملی ایجنٹ نورین زمان ... میں ڈیڈی کے بزنس کی خاطر ملک نواز سے تعاون جاری رکھنا پسند کروں گی۔ یہ میری مجبوری ہے۔ اس شخص کے سائے سے نکل کر میں کیا اس ملک میں کوئی مرد بھی بزنس نہیں کر سکتا۔ لہٰذا تم میری اس مجبوری کو مدنظر رکھو گے۔"

"کیا میں تمہارے نزدیک ہیجڑا ہوں؟"

"کیا مطلب؟" اس نے چہرہ پھیر کر استفہامیہ نگاہوں سے سوال کیا۔

"میں اس کے سائے سے دور رہ کر بزنس کروں گا نورین زمان۔"

"فی الحال نہیں خرم۔" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ "میں تمہیں ایسا مشورہ نہیں دوں گی۔ وہ جب چاہتا ہے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکا لیتا ہے راہیں مسدود کر دیتا ہے راستوں کا ہر قدم ناگ بنا دیتا ہے پھر لوگ گھٹنے ٹیک کر اس کے سامنے گر جاتے ہیں اور وہ اپنا پٹہ ڈال کر چھوڑ دیتا ہے۔"

"جس دن میرے گلے میں پٹہ دیکھو۔" میں نے عرقاتی آواز میں کہا۔ "بس یقین کر لینا کہ دنیا میں کوئی مرد نہیں رہا۔"

"لگتا ہے۔" اس کی آواز بھرجھرانے لگی۔ "میں تمہیں ضائع کر بیٹھوں گی۔ میں پھر صرف مشین بن جاؤں گی نہیں خرم سلطان میری خاطر پلیز، اس ہاتھی سے خود کو بچا لو۔"

"تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟" میں زور دے کر بولا۔ "یقین کر لو نورین میں ہی وہ بت شکن ہوں جسے اس سعادت کی قوت عطا کر دی گئی ہے۔ میں چھوٹے بڑے تمام بت توڑ دوں گا۔"

"میں کیسے یقین کروں؟" وہ بھی اسی بھڑکتے لہجے میں بولی۔ "میں نے بڑی بڑی قدآور شخصیات کو گرتے بکھرتے اور ٹوٹتے دیکھا ہے جن کی پشت پر حکومت تھی جن کے ہاتھوں میں قانون کی قوت تھی لیکن ملک نواز سب کو بکھیرتا رہا ہے جس نے بھی اس کا پٹہ قبول نہیں کیا اسے کبھی عہدے اور کبھی اس ملک سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ یہ کھیل کوئی نیا نہیں خرم۔ میں نے جب سے ہوش کی آنکھیں کھولی ہیں ایسا ہی ہوتا دیکھ رہی ہوں۔"

"اب یہ بھی دیکھ لینا نورین۔" میں نے باوثوق انداز میں کہا۔ "سومنات کا بت بھی تو صدیوں اپنی پرستش کرواتا رہا تھا۔ ہر بت کے ساتھ ہمیشہ بڑی قوت رہی ہے لیکن جب بھی خدا نے کسی بت شکن کے ہاتھ میں گرز دیا بت خود کو بچا سکا نہ پجاری اپنے دیوتا کو گرز کی ضرب سے محفوظ کر سکے۔ یہ میرا نہیں اس معبودِ حقیقی کا قانون اور فیصلہ ہے جو صرف اپنے حضور جھکا ہوا سر پسند فرماتا ہے۔"

"دو شیطانوں کے درمیان رحمان کو مت لاؤ خرم۔" اس کے

لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ "میں کوئی مذہبی لڑکی نہیں ہوں مگر کلمہ گو ہوں، بچپن میں خدا اور خدا کے بچے کا اصل ایمان بھی رکھتی تھی۔ مجھے آج بھی یقین ہے کہ خدا صرف نیک بندوں کی مدد فرماتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو اپنی گندی زبان سے اس پاک رب کا نام نہیں لینا چاہیے۔"

"ہم بنیادی طور پر نیک بندے ہیں نورین۔" میری آواز میں سچ مچ کرب در آیا تھا کیونکہ میں خود شناس تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کبھی نیک تھا لیکن حالات نے مجھے بھی گندگی کا کیڑا اور گنہگار بنا دیا تھا۔ بس تھوڑا سا سہارا تھا کہ میں سابقہ بے راہ روی کا کچھ نہ کچھ کفارہ ادا کر رہا تھا اگر اس ذاتِ اقدس کے حضور قبول ہوتا تو۔

میری بات سن کر نورین نے عجیب سا قہقہہ لگایا تھا۔ ایسا سرد اور سفاک قہقہہ تھا کہ میرے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔

"اگر تم نیک ہو، میں اچھی ہوں تو گنہگار اور برے لوگ کہاں اور کیسے ہوں گے؟ نہیں خرم سلطان ہم اتنا بڑا دعویٰ نہیں کر سکتے، ہم اپنے مفادات کے جہنم میں انسانیت کو جھونکنے والے نیک نہیں ہو سکتے۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہم جو زہر فروخت کرتے ہیں وہ ہر روز کتنے گھروں کے چراغ بجھاتا ہے کتنے انسان خیراتی اسپتالوں اور شہر کے فٹ پاتھوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہیں۔"

"کیا تمہیں احساس ہے نورین؟" میری آواز میں حیرت کی دبی دبی سسکی تھی۔ "تم... تم اتنا حساس دل بھی رکھتی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے لرزتی ہوئی طویل سانس لی۔ "اس لیے کہ میں بنیادی طور پر نیک تو نہیں لیکن ایک لڑکی ضرور ہوں۔ اس لڑکی کو ہر تڑپتا انسان اور ہر بجھتا چراغ لرزا دیتا ہے۔"

"اوہ میرے خدایا۔" میں نے سسک کر سر تھام لیا۔ "کیا میں ایسی حساس اور دردمند لڑکی کے ساتھ برائی کے راستے پر چل سکوں گا... شاید نہیں یقیناً نہیں۔"

"ایسا نہ سوچو خرم۔" نورین نے میری کلائی تھپ تھپا کر کہا۔ "نورین زمان بڑی ظالم، سفاک بے حس مشین ہے اگر ہمیں زندگی کی راہوں پر شانہ بشانہ چلنے کی خوشی نصیب ہوئی تو ہم خود کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں گے۔ گھر کے اندر رہنے والے خرم اور نورین صرف چاہنے والے وفادار میاں بیوی ہوں گے اور گھر سے باہر بھوکے اور ظالم بھیڑیوں کا جوڑا بن جایا کریں گے جس طرح ڈیڈی نے خود کو ہمیشہ دو خانوں میں رکھا ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ وہ گھر کے اندر شفیق باپ اور مہربان خاوند کا کردار تمام عمر خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے ہیں۔ ہم بھی ان کے نقش قدم پر زندگی کا سفر جاری رکھیں گے۔"

"شکریہ نورین میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "میں تو ڈوب ہی گیا تھا کیونکہ میں اس بزنس میں بہت کچھ ضائع کر چکا ہوں اور بہت کچھ حاصل کرنے کا عزم لے کر آیا ہوں لیکن ایک بات طے شدہ ہے میں کسی کے نام کا پٹہ برداشت نہ کر سکوں گا میرے ساتھ اگر چلنا ہے تو تمہیں بھی پٹہ اتارنا ہوگا۔"

"کیسے... کیسے خرم؟" وہ چیخ کر بولی۔ "وہ عفریت نکل بے گا۔"

"اژدہا بھی چھوندر کے بس میں پہی رائے رکھتا ہے مگر حلق سے اتار نہیں سکتا۔ ہم بھی اس کے حلق میں پھنس کر اسے سانس لینے سے قاصر کر دیں گے۔ وہ اپنی موت آپ مر جائے گا مگر میں تمہارے تعاون کے بغیر کچھ نہیں ہوں کچھ نہ کر سکوں گا۔ اپنی بقاء اور مستقبل کی خوشیوں کے لیے تعاون کی روشنی بن جاؤ نورین۔"

"اب کیا کرنا چاہتے ہو چوہدری؟"

"اب تک وہ کھیل رہا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق چال چل رہا ہے۔ میں تو اب اترا ہوں میدان میں۔ جوابی کارروائی تو اب شروع ہوگی۔ میں پہلے اسے خبر کرنا چاہتا ہوں جو نہروں اسے سیراب کر رہی ہیں ان کا رخ بدلنا ہوگا۔ پھر جب اس کی ذات خشک ہو جائے گی تو ایک چنگاری اسے خاکستر کر دے گی۔"

"مجھ سے کیسا تعاون چاہتے ہو؟"

"رہنمائی اور سہارا۔" میں نے پیار آمیز آواز میں بتایا۔ "گھر کے ایک بھیدی نے لنکا ڈھایا تھا۔ تم ملک نواز کی منظورِ نظر ہو، رازداں ہو، جس طرح چٹان کو سوراخ کر کے ڈائنامائٹ اندر رکھ دیا جاتا ہے اسی طرح نورین کو اس چٹان کے اندر جا کر بیٹھنا ہوگا۔"

"تم نے مجھے الجھا دیا ہے خرم سلطان۔" وہ ہونٹ چباتے ہوئے بڑبڑائی۔ "تم بھی میرے حلق میں پھنس گئے ہو۔ میں نہ تو تمہیں نگل سکتی ہوں نہ اگلنے کی ہمت ہے۔ تمہیں حاصل کرنا میرے ان گنت خوابوں کی تعبیر ہے اور ملک نواز سے ٹکرانا ایک ایسا رسک ہے جو مجھے کبھی کر ہی نہیں سکتا ہے۔ تم ناواقف ہو خرم۔ نہیں جانتے اس کے ہاتھ کتنے مضبوط اور لمبے ہیں۔ وہ مدِمقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل کے ارادے بھانپ لینے کی قوت رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں اور کان فضاؤں میں تیرتے رہتے ہیں جس طرح مواصلاتی سیارے فضا میں گردش کرتے ہیں اور پیغامات اپنے مرکز کو دیتے ہیں۔"

"اس سیارے کی آنکھوں کے سامنے میں اس کا گھیرا توڑ کر نکل آیا ہوں۔ اگر وہ اتنا ہی باخبر ہے تو اسے ہوٹل کے گرد گھیرا ڈال لینا چاہیے تھا نہیں نورین وہ بھی ہماری طرح کا عام انسان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے جو نہیں جانتا کہ آنے والے لمحے کی مٹھی میں کیا ہے جسے اپنی پشت کی خبر نہیں ہوتی۔ میں اُس کا بھرم اور طلسم توڑ دوں گا۔ تم صرف مجھے اُس تک پہنچا دو۔"

"ابھی...؟"

"اگر چاہو تو ابھی سہی۔"

"مجھے کچھ وقت دو نرگس۔" اُس نے التجائیہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "میں جلد بازی کا فیصلہ کر کے پچھتاوے کا امکان ساتھ نہیں رکھنا چاہتی۔ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ مجھے بہت بڑا فیصلہ کرنا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ میرے باپ کی لاش ابھی بے گور و کفن پڑی ہوئی ہے۔ مجھے واپس جا کر ڈیڈی کی لاش سنبھالنی ہے۔"

"مجھے احساس ہے نورین۔ کاش میں ایک دوست کا فرض ادا کر سکتا۔"

"نہیں تم روپوش رہو گے۔ میں تمہیں اپنے ایک ٹھکانے پہ چھوڑنے جا رہی ہوں۔"

"شکریہ مس نورین۔" ہارون بول پڑا۔ "ہمارے پاس محفوظ ٹھکانہ ہے۔"

"ٹھیک ہے تو تم واپس جاؤ۔ میں کل نہیں تو پرسوں تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

"میرا خیال ہے تم لوگ مجھ پر بھروسا نہیں کرنا چاہتے۔"

"شاید میرے ساتھی کے ذہن میں کوئی ایسا خیال ہو۔"

"ٹھیک ہے میں مجبور نہیں کروں گی۔" اُس نے کار فٹ پاتھ کے ساتھ لگا دی۔ "پرسوں اگر چاہو شام یہیں ملنا چلے آنا۔ میں شام سات سے آٹھ بجے تک وہاں انتظار کروں گی۔"

"وعدہ نہیں کروں گا نور۔" میں نے معذرت خواہانہ آواز میں کہا۔ "بہر صورت پرسوں ہم ملیں گے ضرور۔" میں نے اسٹیئرنگ وہیل رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "کل کے لیے راشن دے سکو گی نورین؟"

"سوری، میں پرس نہیں لائی۔"

"راشن سے مراد مصروفیات اور کچھ کام ہے جان۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "کل کا دن میں بیکا نہیں رہنا چاہتا۔" میں نے ملک نواز کی معاون نہروں کا ذکر کیا تھا۔ ایک نہر کا نام بھی بتا دیا گیا ہے اگر اُس کا ٹھکانہ بتا سکو تو اُس کے کنارے کل سے جا سکتے ہیں۔ ناگ کو اگر خراش بھی دے دی جائے تو وقت روٹیاں اُس خراش کو گھاؤ بنا دیا کرتی ہیں۔"

"ایڈریس نوٹ کر لو۔" اُس نے سر اسٹیئرنگ وہیل پر ٹکا کر کہا اور ہارون نے نوٹ بک نکال لی۔

"شکریہ..." میں نے نوٹ بک پر ایڈریس رقم کیا اور دروازہ کھول کر فٹ پاتھ پر اُتر گیا۔ نورین نے جھک کر دیکھا اور پھر ہاتھ اُٹھا کر الوداعی سلام کرتی ہوئی کار ٹرن میں لے کر واپس چلی گئی۔ میں نے آسمان کی جانب چہرہ اُٹھا کر طویل سانس لی۔ پورا چاند آدھی مسافت طے کر چکا تھا اور ایک انسان کے نامۂ اعمال پر چار سُرخ دھبے اُبھار کر ایک دن زندگی سے نفی ہو رہا تھا۔

رات چونکہ خاصی بیت چکی تھی اور میرے بدن کا رواں رواں پھوڑا بنا ہوا تھا۔ میں گزشتہ رات کا بھی ستایا ہوا تھا۔ اُچھل کود اور ہنگامے کی بوریت بھی اعصاب پر طاری تھی۔ یہی وجہ رہی تھی کہ جب برلاس ہوٹل کے سنگل روم میں ہارون نے اپنے لیے صوفہ منتخب کیا تو میں نے مروتاً بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا تھا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو کھڑکی کے راستے آتی ہوئی دھوپ میرے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہارون کا اصل چہرہ تر و تازہ لگ رہا تھا۔ یقیناً وہ شیو اور غسل سے فارغ ہو کر میری بیداری کی راہ دیکھ رہا تھا۔ مسکراہٹ کا خوش گوار تبادلہ ہوا اور وہ ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "پیٹ میں چوہے نیلڈنگ کر رہے ہیں۔"

"میرے اندر تو شاید فٹ بال کھیل رہے ہیں۔"

اُس نے سروس روم کو ڈبل ناشتے کا آرڈر دیا اور میں موچھیں تھپ تھپاتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔ سرد پانی نے بدن سے ساری گرمی اور کسل مندی دھو ڈالی۔ میں جب باتھ روم سے باہر نکلا تو اضمحلالی کیفیت دور ہو چکی تھی۔ ہارون سامنے رکھے ناشتے کو بھوکے عقاب کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اس لیے میں ڈریسنگ ٹیبل کو نظر انداز کرتا ہوا ناشتے کی میز پر جا بیٹھا پھر ہم دونوں ایسے ٹوٹ پڑے جیسے زندگی میں پہلی اور آخری بار ناشتے کی نعمت ملی تھی۔ اُسی صبح مجھے احساس ہوا تھا کہ پیٹ کے لیے روٹیاں واقعی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں جس کسی نے کہا ہوگا پیٹ نہ پئیاں روٹیاں تے سب گلاں کھوٹیاں۔ اُس نے بھی بھوک کی اذیت سہہ کر کہا ہوگا۔ جب تک پیٹ خالی تھا مجھے اور ہارون کو کچھ بھی یاد نہ تھا۔

"ملک پیارے۔" ڈکار لے کر میں نے بشاش آواز میں پوچھا۔ "اب بتاؤ دن کا آغاز کیسے کیا جائے؟"

"خوش نگاہی سے۔" ہارون نے جگ سے پانی انڈیلتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔ پانی پی کر بولا۔ "ملک نواز کا ہوٹل دیکھ کر پھر داؤد خان کو سلام کریں گے۔"

دن کی روشنی میں داؤد خان کی مزاج پرسی کا خیال میں بھی نہ تھا۔ ہارون نے ابھی میری رائے کی تائید یا تردید نہ کی تھی کہ ویٹر ہلکی سی دستک دے کر اندر آ گیا۔ اُسے رات میں نے دس روپے ٹپ دے دیے تھے۔ اس لیے اُس کا انداز بے حد مؤدبانہ تھا۔ ہارون نے پیٹ سے بل اُٹھا کر دیکھا اور بچا کس کا نوٹ بل پر رکھ کر بولا۔ "بقایا تم رکھ لینا۔"

ویٹر نے نوٹ جیب میں رکھ کر ہاتھ ملتے ہوئے مؤدب اور دبی دبی آواز میں احسان کا بدلہ دیا۔ "سر اجب میں بل لے رہا تھا پولیس کا فون آیا تھا۔ انھیں دو نوجوانوں کی تلاش ہے چونکہ یہ رُوم ایک کے نام بُک ہوا تھا اور ناشتہ دو کا آیا ہے اس لیے فضل کریم صاحب نے انھیں بتا دیا ہے۔"

ہارون نے چونک کر میری جانب دیکھا اور میں نے آنکھ کی زبان سے کہہ دیا کہ فی الفور نکل چلو۔ اُس نے اُٹھ کر بیگ اُٹھایا اور اپنی مونچھیں اور روگ بیگ میں ڈالتا ہوا تیار ہو گیا۔

"گو ہم وہ نہیں ہیں، مگر احتیاطاً جا رہے ہیں۔" میں نے ویٹر سے کہا۔ "پولیس تھانے لے گئی تو ہم مسافروں کی ضمانت دینے والا بھی اس شہر میں کوئی نہیں۔"

"سیڑھیاں استعمال کریں سر۔" ویٹر نے مشورہ دیا۔ "میں بیک ڈور سے آپ لوگوں کو نکال دوں گا۔"

سوچنے اور کیوں کیسے اور کون کی گتھیاں سلجھانے کا وقت نہ تھا۔ پولیس کسی لمحے بھی آ سکتی تھی۔ اگر ویٹر چور کی پنڈلی کی طرح کا بالا نہ ہوتا تو میں اپنا بھرم رکھنے کے لیے سیڑھیاں اُترنا۔ لیکن ویٹر دو دو سیڑھیاں پھلانگ رہا تھا۔ اس لیے ہم بھی اُس کی ایڑیوں پر پاؤں رکھتے نیچے اُترتے تھے۔ کاٹھ کباڑ سے گزرتے تنگ گیٹ سے نکل گئے۔ ویٹر گیٹ سے واپس چلا گیا تھا۔ فٹ پاتھ پر دوڑنا مناسب نہ تھا اور نہ ہی ہم ٹیکسی میں بیٹھنا چاہتے تھے۔ پولیس اگر ملک نواز کے اشاروں پر تھانوں سے نکل آئی تھی تو کچھ دُھلنے کا عزم بھی لائی ہوگی۔ وہ گاڑیوں پر بھی نگاہ رکھ سکتے تھے۔

"ہارون۔" میں نے حکمانہ آواز میں کہا۔ "تم واپس پنڈی کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ اِدھر ہم اپ جوڑے کی صورت میں آنا دانہ چل پھر نہ سکیں گے۔ ویسے بھی تم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اگر ملک نواز نے گمان سنبھال لی ہے تو پنڈی کا محاذ بھی ہمارے لیے خطرناک ہو چکا ہوگا۔ تم لوگ خان کے خاندان کی حفاظت کرو گے۔ اگر مناسب سمجھو تو دونوں لڑکیوں کو گھر سے بلا دینا۔"

"آپ یہاں کیا کریں گے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کل ہی گرد و ملک کے ہاتھوں تک نہیں پہنچی تو پروگرام حسبِ سابق رہے گا۔ بصورتِ دیگر حالات کے مطابق قدم اُٹھاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں یاسی پلے گلے میں یہ شہر بھی صاف کر ڈالوں۔"

"آپ کا مقابلہ ایک فرد سے نہیں ہے چیف۔" ہارون نے کہا۔ "سلیمان اور رنگ باز خان کی دوسری بات تھی لیکن ملک نواز مرکزی قوت رکھتا ہے۔ اُس کے ساتھ اپنی فورس ہے اور اُس فورس کو تمام انتظامی اداروں کا تعاون حاصل ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ لاہور سے باہر نکلیں۔ ہم اپنے محاذ کو مضبوط بنا کر اُدھر اُس کا مقابلہ کریں گے۔"

"نہیں ہارون۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اچھا کمانڈر دشمن کو اپنی سرزمین پر لڑنے کی سہولت نہیں دیا کرتا۔ جنگ اگر دشمن کے صحن میں لڑی جائے تو نقصان کا تناسب دشمن کے حق میں زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے کے گھونسے دشمن کے گھر کو ہی تباہ کرتے ہیں۔ میں ملک نواز کو پنڈی تک جانے کی مہلت نہیں دوں گا۔"

"لیکن تنہا آپ کیا کریں گے؟"

"جو کچھ ماضی میں کرتا رہا ہوں۔" میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ کا اشارہ دیا۔ "میں جا رہا ہوں تم بھی کار بک کر لو۔"

ٹیکسی رُکی تو میں ہارون سے ایسے جدا ہوا جیسے فٹ پاتھ پر چلنے والے اجنبی رہے ہوں۔ جب میں نے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کیا تو ہارون کو دیکھا وہ فٹ پاتھ پر مُنہ کھولے بھونچکا سا کھڑا تھا۔

"انارکلی..."

ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"پرانی..." میں نے اُس کی آنکھوں کو جواب دیا اور اُس نے پلٹ کر پوچھا۔ "دس روپے یا میٹر پر چلوں صاحب؟"

"جس میں تمہارا فائدہ ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور اُس نے ٹیکسی بڑھا دی۔

"ڈرائیور میٹر کی شان نزول اور تقاضے پر رواں پنجابی میں لیکچر دے رہا تھا اور میں پشت گاہ سے ٹیک لگائے سوچ رہا تھا۔ میری سوچ کے دریچوں سے ملک نواز اور نورین در آئے تھے۔ ایک جو کھلا دشمن تھا اور دوسری نے اپنی والہانہ چاہت کا یقین دلایا تھا۔ ملک نواز اور نورین کو روبرو رکھ کر میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پولیس تک کون گیا ہوگا؟ ملک نواز نے مجھے دیکھا تھا۔ وہ صرف میری موجودگی سے آگاہ تھا۔ کاؤنٹر کلرک نے بھی میرے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناروین کو نہیں بلکہ شاہ زمان کو دیکھا تھا پھر پولیس کو دو نوجوانوں کی تلاش کیوں تھی؟

نورین ہی وہ لڑکی تھی جس نے کھلی آنکھوں سے خونی ڈرامہ دیکھا تھا اور ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ ایک چوک اُدھر اُتار گئی تھی۔ وہی کسی کو دو نوجوانوں کا حوالہ دے سکتی تھی۔ اگر اُس نے زبان کھولی تھی تو اُس نے اُس لڑکی کو کچل کر ہی نورین زمان کو آگے بڑھایا ہوگا۔ اُس نے ملک نواز کو آنکھوں دیکھا حال سُنایا ہوگا اور ملک نے لاہور کی زمین ہی کو نہیں بلکہ ملک کے ذرّے ذرّے کو محترم چوہدری کے حُلیے سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ اُس کی تمام ایجنسیاں ہنگامی بنیادوں پر اڈوں سے نکل پڑی ہوں گی۔

رائل ہوٹل کے سامنے میں نے ٹیکسی چھوڑ دی کیونکہ مجھے اپنا وہ چہرہ بدلنا تھا جسے نورین پہچانتی تھی۔ میں نے ایک نئے نام سے کمرا بک کروایا اور ساتھ ہی پنڈی کے لیے کال بک کروا دی۔ میں نے احتیاطاً رنگ باز خان کا نمبر نہیں دیا تھا بلکہ خطرہ تھا کہ ملک نواز نے لائن پر پہرہ بٹھا دیا ہو۔ اس لیے میں نے بیکر کے لیے کال بک کروائی تھی۔

میں ابھی میک اَپ کا سامان نکال ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"پنڈی سے بات کریں جناب۔" آپریٹر نے مؤدب آواز میں کہا۔

"ہیلو کون؟" بیکر کی کھرکھراتی آواز سنائی دی۔

"آپ کا چھوٹا بھائی بول رہا ہوں۔ اظہر کامیاب انٹرویو دے کر واپس جا رہا ہے۔ اُس کی بہنوں کا خیال رکھیں۔ وہ اُن کے لیے بے حد پریشان ہے۔ میرا خیال ہے بہتر ہوگا۔ آپ اُن کو اپنے گھر لے جائیں۔"

"کوئی اور پریشانی؟" بیکر نے پوچھا اور میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

بیل دے کر ویٹر کو کال کیا۔ وہ طویل قامت ادھیڑ عمر کا مؤدب شخص تھا۔ شاید سابق فوجی تھا۔ اُس نے اندر آ کر نہ صرف فوجی انداز سے سیوٹ کیا تھا بلکہ پاؤں جوڑ کر کھڑا ہوا تھا مجھے اُس کا غلامانہ انداز پسند نہ تھا لیکن میں نے اُسے میٹھی میٹھی مُسکراہٹ انعام میں دیتے ہوئے اپنی غرض اُس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ "میرے پاس ایزی ویزیں نہیں ہے۔ کیا یہاں سے شلوار قمیص مل جائے گی؟"

"یس سر!" اُس نے سر کو خم دے کر کہا۔ "سلیپنگ سوٹ سر؟"

"نہیں، میرون یا نیوی بلو کلر شلوار قمیص۔" میں نے تین بڑے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

رات نو بجے میں سیڑھیوں کے راستے نیچے اُترا اور ٹہلتا ہوا لابی سے گزرتا ڈائننگ ہال میں داخل ہو گیا۔ چونکہ میں میک اَپ میں تھا اگر لفٹ سے نیچے اُترتا تو لوٹ بوٹے چونک سکتا تھا جسے اُوپر جانے والے مہمانوں کی صورتیں یاد ہونی چاہئیں تھیں۔ وہ ویٹر بھی وہاں موجود تھا۔ وہ اپنا لایا ہوا سوٹ ایک اجنبی کے جسم پر دیکھ کر کچھ بھی سوچ سکتا تھا۔ میں ڈائننگ ہال سے باتھ روم کی قطار کے ساتھ ساتھ چلتا کچن والے دروازے سے باہر نکل گیا۔

سابقہ کامیابیوں کی سرشاری تھی یا وہ رات خوش گوار تھی۔ دن بھر آرام اور گہری نیند بھی ایک وجہ ہو سکتی تھی۔ کچھ بھی رہا تھا میں بے حد پُرسکون اور خوش گوار موڈ میں تھا۔ ذہن میں کوئی گرہ تھی نہ جسم پر کسمندی کا بوجھ تھا۔ میں ایسے ہی ہوٹل کے کمپاؤنڈ سے نکلا تھا جیسے گھر سے اماں جی کے لیے کوئی سعادت مند پانی لینے جا رہا ہو۔ شاید یہی خوش گوار حیرت تھی کہ میں آدھا میل پیدل چل کر بھی بے مزا نہ ہوا تھا۔

شاہ زمان کی گلی سنسان تھی اور گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں اُسی انداز اور رفتار سے گیٹ سے گزرتا پاتھ وے کی بجری کو ٹھوکروں سے اُچھالتا، بکھیرتا برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتا کاریڈور میں داخل ہو گیا۔ شاہ زمان کا کمرا تاریک تھا۔ پورا مکان سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں قبرستان میں شاہ زمان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جا رہا ہوں۔

ایک روشن کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ بیڈ کے نیچے نورین کے سینڈل اوندھے سیدھے دکھائی دیے۔ کرسی کی پشت پر سُرخ اسکارف پڑا ہوا تھا۔ گزشتہ رات وہی اسکارف نورین نے سر پر باندھا ہوا تھا۔ انسان کا ذہن پُرسکون ہو تو کسی خطرے کا احساس بھی سکون کو پریشان کرنے اندر نہیں آتا۔ میں ایسے ہی کمرے میں داخل ہوا جیسے وہ میری ہی خواب گاہ تھی اور میرے لیے ہی خوشبو کا اسپرے کیا گیا تھا۔

اگر وہ رشیدہ ترنت یا عابدہ جیسی کسی لڑکی کا بیڈ روم ہوتا تو میں اُس مہک کا نام اُن کے قابلِ احترام سراپے سے منسوب کرتا لیکن نورین جیسی بہ کار لڑکی کو میں یہ اعزاز نہیں دے سکتا تھا۔ اُس نے یا اُس کی ملازمہ نے امپورٹیڈ پرفیوم سے کمرے کو مہکایا تھا۔

میں نے اسکارف اُٹھا کر پلنگ پر اُچھال دیا اور کرسی گھسیٹ کر دروازے کے ساتھ بائیں ہاتھ بیٹھ گیا۔ کوئی چہل قدمی ہوا برآمدے میں چلتا گزر گیا تھا۔ قدموں کی چاپ نے میرے جسم کو لحظہ بھر کے لیے سنسنی آشنا کیا تھا۔ پانچویں منٹ پر پھر قدموں کی متوازن چاپ سُنائی دی۔ آنے والی نورین ہی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے

گرم لبادے میں ملبوس تھی۔ بیڈ کے قریب جا کر اُس نے سیاہ شال اُتار دی اور بالوں کو سُرخ رین سے آزاد کر کے جھٹکا دے کر شانوں پر بکھرا دیا۔ میں نے دایاں پاؤں اُوپر اُٹھایا ہی تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا سُنہری ٹیلی فون سیٹ گنگنانے لگا۔ میرا اُٹھا ہوا پاؤں بے آواز فرش پر ٹک گیا تھا۔

"ہیلو نورین دس اِز مسٹر نیاز۔ گڈ نائٹ مسٹر نیاز۔ طبیعت ...؟"

نورین چہکاری۔ "کیا آپ کا سوال عجیب نہیں مسٹر نیاز؟ ایسی رات کوئی میٹھی سکون محسوس کر سکتی ہے جس کے باپ کی لاش سرد خانے میں بے کفن پڑی ہو۔ چھوڑیے مطلب کی بات کیجیے! کچھ بھی نہیں جتنا کچھ میرے پاس تھا، وہ چیف نے حاصل کر لیا ہے۔ مسٹر نیاز یقیناً آپ بھی نشہ کرنے لگے ہیں۔ کیا وہ دُنیا کا خطرناک اور شاطر انسان مجھ سے ملنے یا رابطہ قائم کرنے کی حماقت کر سکتا ہے۔ وہ بقول چیف، آدم خور درندہ ہے اور ایسے درندے شکار کا خون پی کر شہر کی کسی گلی میں گہری نیند نہیں لیا کرتے۔ وہ بھی اپنی کچھار میں واپس چلا گیا ہوگا۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ تجہیز و تکفین کے بارے میں چیف نے کیا فیصلہ کیا ہے اگر آپ لاعلم ہیں تو چیف سے میرا رابطہ کرائیں میں خود بات کروں گی۔ اُن کے لیے وہ ایک ایجنٹ ہو سکتا ہے مگر میرے لیے وہ کیا حیثیت رکھتا ہے، یہ آپ کو معلوم ہے ... چیف کو اپنے وفاداروں سے ایسا سنگین مذاق نہیں کرنا چاہیے۔"

اُس نے کھٹ سے ریسیور رکھا اور پھر جونہی پلٹی، مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اُس کے جسم کو بھرپور جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہو گئی۔ میں یقیناً سراپا مُسکراہٹ تھا۔ اسی مُسکراہٹ جیسے پتھر کی مُورتی میں جان ڈال دی تھی۔

"تم ... وہ تمہیں اِدھر نہیں آنا چاہیے تھا۔" اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں خوف کا دُھواں لہرانے لگا۔

"مجبوری تھی۔" میں نے اُٹھ کر کندھے اُچکائے۔ "جان سے جسم دُور رہے تو لوگ اُسے مُردہ سمجھ کر دفن کر دیتے ہیں پھر ہم دُنیا بھی نبھانی تھی۔"

"تم نڈر اور ذہین نہیں ہو بلکہ احمق ہو۔ ہوٹل سے فرار کے بعد تمہیں تو اس شہر میں بھی نہیں رہنا چاہیے تھا۔"

"وہ ایک شعر ہے۔" میں ہولے ہولے چلتا اُس کے قریب پہنچ گیا۔ "مفہوم جس کا ہے تمام راستوں کا رُخ تمہارے گھر کی طرف ہے۔ میں نے بھی فرار ہونا چاہا تھا لیکن جس راستے پر بھی قدم اُٹھایا وہی تمہارے گھر کا تھا۔"

"مجھے آزمائش میں نہ ڈالو چوہدری۔ میں تمہاری طرح مضبوط

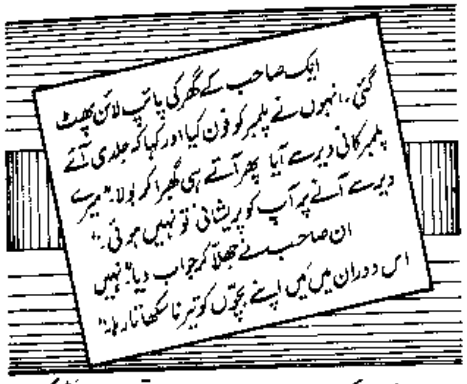
ایک صاحب کے گھر کی پائپ لائن پھٹ
گئی۔ انہوں نے پلمبر کو فون کیا اور کہا کہ جلدی آئے
پلمبر کافی دیر سے آیا پھر آتے ہی گھبرا کر بولا "میرے
دیر سے آنے پر آپ کو پریشانی تو نہیں ہوئی"
ان صاحب نے جھٹ کر جواب دیا "نہیں
اس دوران میں میں اپنے بچوں کو تیرنا سکھاتا رہا"

اعصاب نہیں رکھتی۔ مجھے معلوم ہے، وہ راستہ تمہیں میرے گھر کیوں لایا ہے۔ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو۔"

"پوچھنا صرف یہ ہے کہ کب سنگم ہوگا؟" میں نے ہاتھ اُس کے چہرے کی طرف اُٹھایا اور وہ گھبرا کر تھرتھرا سی گئی۔ "زبان کے مالکانہ حقوق کب ملیں گے؟"

"بند کرو بکواس۔" وہ کنپٹیاں دبا کر چیخی۔ "مجھ سے پوچھو! میں نے اُسے سب کچھ کیوں بتا دیا ہے؟"

"سیدھی سی بات ہے بھئی۔" میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ "اُس نے پوچھا اور تم نے بتا دیا۔"

"لیکن کیوں بتا دیا؟"

"ذہین بچے سے جو سوال پوچھا جاتا ہے۔ وہ اپنی ذہانت سے کام لے کر جواب دے دیتا ہے۔"

"نہیں۔" وہ ایک دم گھوم گئی۔ "وہ دیکھو کتنے سوال رقم ہیں۔" میں نے اُس کی شفاف جلد پر نیلی لکیریں دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اُس کی پُشت پر چابک کی ضربوں کا جال بچھا ہوا تھا۔

"جب میں تم لوگوں کو ڈراپ کر کے واپس گئی تو ملک نواز وہاں موجود تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہی دُبک گیا ہو گا۔ میں نے ڈیڈی کی لاش تلاش کی اور جب کندھے پر رکھ کر باہر جانے لگی تو اُس نے راستہ روک لیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ کسی شخص نے مجھے فون پر اطلاع دی تھی کہ شاہ زمان کی لاش ہوٹل کی سیڑھیوں کے نیچے پڑی ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی کار تک گیا اور پھر وہ راستہ جس پر مجھے کار بڑھانے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ میرے گھر کا نہ تھا۔ وہ مجھے اپنے اڈے تک لے گیا۔ اُسے لفٹ دلوانے اور کلرک نے بتا دیا تھا کہ مس نورین کو دو نوجوانوں کے ساتھ اُوپر جاتے دیکھا گیا تھا۔ تب اُس نے اُن کے بارے میں پوچھا۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو بید سے پیٹنے لگا۔ اُس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈیڈی کی لاش بھی ضبط کرنی ہے۔ اس شرط پر کہ جب میں خرّم سلطان زندہ یا مُردہ اُس کے حوالے کروں گی تو وہ لاش کو کفن دے گا۔"

"لے چلو۔" میں نے سینے پر ہاتھ باندھ کر کہا۔ "زبان سے تو سب ہی جانثاری، وفاداری اور چاہتوں کا دعویٰ کیا کرتے ہیں، مجھے آزما لو نور...!"

"شکریہ خرّم!" وہ لرزتی آواز میں بولی۔ "میں زندگی سے موت کا سودا نہیں کروں گی۔ رشتہ جسم سے نہیں رُوح سے ہوتا ہے۔ وہ رشتہ اپنی منزل پر چلا گیا ہے۔ رہا جسم تو وہ کب تک رکھے گا، اُسے کبھی نہ کبھی تو لاش ٹھکانے لگانی پڑے گی۔"

"مجھے بتا دو نورین! لاش کہاں ہے، میں...!"

"کاش مجھے معلوم ہوتا۔" نورین سسک اُٹھی۔ "شہر میں اُس کے لاتعداد ٹھکانے ہیں۔"

"کوئی تو ایسا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے نہیں، وہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں ہی اُسے کھوہ سے باہر نکالوں گا۔ تم مجھے داؤد تک پہنچا دو۔"

"سنو خرّم سلطان!" نورین ٹھوس آواز میں بولی۔ "اگر اس میں تمہارا ذاتی مفاد ہے تو میں ضرور تعاون کروں گی لیکن ایک لاش کی خاطر میں تمہیں خطروں سے کھیلنے کا مشورہ نہیں دوں گی۔"

"ہاں ذاتی مفاد ہے۔" میں پلٹ کر ٹہلتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ میری ذات، میری پہچان، میری زندگی، میری خوشی، میرا غم سب کچھ تم ہو، جس طرح چور کی بچی تو یہ اُسے ولایت کا درجہ عطا کر دیتی ہے، اسی طرح بُرا انسان جب کسی کو چاہتا ہے تو ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ میں پاک دامنی اور پارسائی کا دعویٰ نہیں کروں گا۔ میں زندگی کی خوبصورتیوں کا پجاری ہوں۔ میں نے دشمنیوں کی عمر طرح دوستیاں بھی کمائی ہیں لیکن میں ہمیشہ آسمان کا آوارہ بادل رہا ہوں۔ برسا اور ہواؤں کے دوش پر آگے بڑھ گیا۔ تعلق کی زنجیر کا کبھی اسیر نہیں رہا لیکن یقین کرسکو تو کر لینا، میں جو آوارہ بادل تھا، تمہاری ذات کی شاداب آباد اور رنگین وادی پر منجمد ہو کر رہ گیا ہوں۔"

"نہیں نہیں خرّم چوہدری!" وہ تڑپ کر دوڑی اور میری بانہوں کو جکڑ لیا۔ "میں... میں بہت بُری ہوں، ڈائن سے بھی بُری۔ مجھ پر ان جذبوں اور خوبصورت لفظوں کی بارش نہ برساؤ۔ میں بنجر ہوں بلکہ چٹانی زمین ہوں، جس میں پانی جذب ہوتا ہے اور نہ ہی کچھ اُگتا ہے، واپس چلے جاؤ خرّم سلطان... چلے جاؤ۔"

اُس نے مجھے دھکیل دیا اور خود صوفے پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"میں جا رہا ہوں نور...!" میں نے اپنی آواز میں درد سموتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہارے شہر سے نہیں۔ میں ملک نواز تک پہنچنے کے لیے کوئی سیدھی تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں اُس کے گرگے خرّم سلطان کی بُو سُونگھتے پھر رہے ہیں، کسی کو بھی متوجہ کر سکتا ہوں۔"

"تم... تم کیوں مرنا چاہتے ہو؟" وہ اُچھل کر اُٹھی۔ "نہیں میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔"

"پھر مجھے داؤد یا کسی دوسرے ماسٹر تک لے جاؤ۔"

"تم کتنے جذباتی اور ظالم ہو۔" اُس نے میرے سینے پر مُکے مارتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے نہ میرا مستقبل... تمہاری حماقتوں سے صرف تمہیں ہی نقصان نہیں ہوگا بلکہ میرا حال اور مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔"

"دیکھو نورین!" میں نے اُس کی دونوں کلائیاں ایک ہاتھ میں جکڑ لیں۔ "میں تمہارے حال کا محافظ اور مستقبل کا ضامن ہوں، تمہارے سوا میرا کون ہے، جس کے لیے میں ان جذبوں اور لفظوں کو استعمال کروں۔ کوئی تو مرکزِ نگاہ ہونا چاہیے، جس کی خاطر انسان کچھ کرنے اور کرنے پر مجبور ہو جائے۔ تعاون کی روشنی دے سکو تو وقت بچ جائے گا، ورنہ تلاش میں وقت اور زیادہ ضائع ہوگی۔"

"سچ سچ بتاؤ خرّم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ملک نواز کی ہڈیوں پر ایک شیش محل تعمیر کرنا چاہتا ہوں اپنی نورین کے لیے۔"

"جھوٹ تو نہیں بولتے؟"

"دیکھو! بُرا انسان پہلے درجے کا جھوٹا ہوتا ہے لیکن تم سے یہ بُرا شخص جھوٹ نہیں بولتا۔"

"یقین کروں۔" اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"دل سے پوچھو۔"

"دل تو...!" اُس نے بالوں کو جھٹک کر بات بدل دی۔ "خیر چھوڑو، تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔"

جب وہ باتھ روم سے نکلی تو اُس کی شخصیت ہی بدل چکی تھی۔ جینز اور بلاؤز میں وہ اسرکین فلموں کی کاؤ گرل دکھائی دینے لگی تھی۔ بال اسکارف میں چھپا کر اُس نے لانگ بُوٹ پہن لیے اور پھر الماری سے ریوالور نکال کر اُچھالتی ہوئی بولی۔ "اس رُوپ میں بھی پیار کرو گے خرّم! میرا اصل رُوپ یہی ہے؟"

میں نے لباس سے نہیں نورین سے پیار کیا ہے۔" میں نے روانی سے کہا۔ "ویسے اس رُوپ میں بھی پابندیِ حرام کر دو گی۔"

"کس کی؟" اُس نے دروازہ بند کرتے کرتے پلٹ کر مُسکراتی نگاہوں سے دیکھا۔

"میری نہیں۔" میں نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "کیونکہ میرے اندر شرقی رُوح ہے۔"

"جھوٹ نہ بولا کرو خرّم! مشرقی لوگ اتنے خونخوار اور سفاک نہیں ہوتے۔ ایک دن میں چار انسانوں کا خون پینے والا شخص مشرقیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تم سیکورٹی گارڈ کی ہڈیاں چبا رہے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے درندہ شکار کو بھنبھوڑ رہا ہو۔"

"ہاں، میں ایسا ہی ہوں۔ درندوں کے درمیان خونخوار درندہ اور انسانوں کے لیے درد مند بندہ...!"

ایک کاؤ بوائے ٹیرس سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اُس کا انداز جارحانہ ہی تھا جیسے بانہیں پھیلا کر روک لے گا لیکن جب بولا تو اُس کا لہجہ زرخرید غلام جیسا تھا مگر لہجے اور نگاہوں میں تضاد نمایاں تھا۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھور کر میں مار رہا تھا۔

"تھینک یو مظفر خان! میں مہمان کے ساتھ شیراز تک جا رہی ہوں لیکن یہ اطلاع صرف تمہارے لیے ہے۔"

"بہتر میڈم!" مظفر خان سینے پر ہاتھ رکھ کر جُھک گیا۔ "ماسٹر آئیں تو...!"

"نہیں آئیں گے۔ وہ فارن ٹور پر ہیں۔" نورین کتنی بے حس اور جامد تھی۔ باپ کی ہلاکت اُس نے چھپا رکھی تھی، اگر وہ صرف بیٹی ہوتی تو ہلک پھاڑ کر روتی، چیخ چیخ کر در و دیوار کو لرزاتی مگر وہ ایک ڈان کی بیٹی تھی۔ ناگ کا سر کوئی کچل دے تو ناگن پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔ اس لڑکی کسی مرد سے وفاداری کی توقع کیسے کر سکتی تھی؟ اس نے اگر میری محبت پر یقین کر لیا تھا تو وہ پہلے درجے کی خوش فہم تھی۔

"داؤد کی عمر کیا ہے نورین؟"

"ہوگا تینتیس چالیس کا مگر خود کو نوجوانی فلموں کا ہانکا ہیرو سمجھتا ہے۔"

"میرا تعارف کس حیثیت سے کراؤ گی؟"

"تعارف!" اُس نے نفی میں زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی میرے پرستاروں کی طویل قطار میں شامل ہے۔ کیں تو دوسرے ساتھ صرف تہ خانے کی سیڑھیوں تک چلوں گی۔ میں بار بار حماقت دُہرانا نہیں چاہتی۔ تمہاری رفاقت بڑی ظالم ہے، ہم انجیبوں کی طرح پیچھے اتریں گے۔ میں داؤد خان کے پاس جاؤں گی۔ ویسے بھی وہ میری پہچان آپ ہوتا ہے۔"

"میں اُسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ ہم لوگ صورت اور سیرت سے متاثر نہیں ہوا کرتے۔ فن کا مظاہرہ اور بازوؤں کی قوت ہماری کمزوری ہوتی ہے۔ میں منفرد انداز میں خود کو تسلیم کروانا چاہوں گا۔"

"ہاتھ کے کیسے ہو؟"

"آنکھیں بند کر کے آواز کا حلق چھید سکتا ہوں۔"

"میری مُراد تاش سے ہے۔" نورین ہنس پڑی۔ "داؤد میں الاقوامی جواری ہے۔ پندرہ برس سے اڈہ چلا رہا ہے۔ اُس کے پاس بہترین شارپر ہیں۔ ایک گروہ کھلاڑی گھیر لاتا ہے۔ شارپر جیبیں خالی کر لیتے ہیں اگر خوش قسمتی کسی کا ساتھ دے جائے تو تیسرا گروہ عقاب کہلاتا ہے۔ وہ باہر جا کر خوش قسمتی پر جھپٹ پڑتا ہے۔"

"تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟"

"پتے میرے اشاروں پر چلتے ہیں۔" اُس نے فخریہ انداز میں بتایا۔ "لیکن میں خاص خاص موقعوں پر سامنے بڑھائی جاتی ہوں۔ داؤد خان اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ مجھے بھیجتا ہے۔"

"سنو نورین! میں بھی خود کو خواص میں سے ثابت کروں گا اور تم میرے مقابل آؤ گی اور میں ہارنے کے بعد تم پر بے ایمانی کا الزام لگاؤں گا۔ ایسی صورت میں کیا ہوگا وہاں؟"

"داؤد خان کا اشارہ پا کر غنڈے تمہیں گھیر لیں گے۔"

"گڈ!" میں نے ہاتھ مَل کر ہتھیلیوں کو پھونک ماری۔ "پھر آج خرّم سلطان کے ہاتھوں کا کمال بھی دیکھ لینا۔"

"اوے نہیں خرّم!" وہ گھبرا گئی۔ "وہ لوگ بڑے ظالم ہیں، چاقو اور ریوالور بے دریغ استعمال کر لیتے ہیں۔"

"میری عمر بھی اب ٹافیاں کھانے کی نہیں۔ چاقو کی کڑکڑاہٹ، گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور ہڈیاں چٹخنے کی آواز میرے بدن میں نئی توانائی پیدا کر دیتی ہے۔ ویسے یہ تمہارا داؤد خان صرف جُوئے کا اڈہ چلاتا ہے یا دوسرا دھندا بھی کرتا ہے؟"

"وہ بہت سے دھندے کرتا ہے۔" نورین بتانے لگی۔ "اسمگلنگ، بلیک میلنگ، سٹہ بازی اور معاوضے کر قتل، اُسے ملک نواز اور ڈیڈی کی آشیرواد حاصل تھی۔"

"منشیات کا اسٹاک بھی رکھتا ہوگا پھر؟"

"ظاہر ہے جب بزنس کرتا ہے تو اسٹاک بھی ہوگا۔ اچھا یہ بتاؤ ملک نواز کے گودام سے کتنا مال لائے تھے؟"

"نمک کیا کہتا ہے؟" میں نے سوال کر ڈالا۔

"نمک تو ابھی اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہے۔ تم نے چوٹ بھی تو دہری لگائی ہے۔ مال لوٹ کر تم نے ہوٹل بھی تباہ کر دیا ہے۔ جب ہم نکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے تھے تو ہمارے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرے مہمانوں کا بھی بدحواس
ریلا باہر نکلا تھا۔"

"تمہارے ساتھ مل کر جشن تو اُس دن مناؤں گا جس روز ملک نواز اپنے آخری ٹھکانے سے خارش زدہ خرگوش کی طرح بدحواس ہو کر نکلے گا۔ لاہور کی مایکیٹ پر قبضہ کرنا میری منزل نہیں ہیں پورے ملک میں پھیلے ہوئے ملک کے برنس پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہوں، پھر ہم یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کی جانب قدم بڑھائیں گے۔ تم جن خواہوں کی تعبیر ملک کی ذات میں دیکھ رہی ہو، وہ تعبیریں دُوں گا۔ دولت میں بڑی طاقت ہے نورین! دولت اقتدار پاؤں تلے سے کھینچ لیتی ہے اور دولت ہی اقتدار کی مسند پاؤں میں ڈالتی ہے ہم پہلے دولت کی طاقت حاصل کریں گے پھر اقتدار کے ایوان میں داخل ہوں گے۔"

"بڑی شدید طویل جنگ لڑنا پڑے گی خرم سلطان! تمہیں ملک نواز کی قوت کا ابھی اندازہ ہی نہیں۔ اُس کی پشت پر ایوانوں میں بیٹھے لوگ ہیں۔ قانون کے محافظ اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُس کے اشاروں پر ہر شہر کی پولیس حرکت میں آجاتی ہے۔ تم کتنے محاذوں پر تنہا لڑو گے۔"

"میں تنہا نہیں ہوں۔" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "میرے ساتھ اگر دُنیا کی نہیں تو ملک کی خوب رُو لڑکی ہے۔ اُس کی چاہت کی خوشبو ہے۔ اُسے پانے کی شدید اُمنگ ہے۔ اُس کے لیے کشش محل تعمیر کرنے کی آرزو ہے۔ اتنی قوتیں جس کے ساتھ ہوں اُسے کون شکست دے سکتا ہے۔"

"پتا نہیں تمہاری باتوں میں حماقت کتنی ہے۔" نورین ایک کُتے کو پچکارتے ہوئے بولی۔ "لیکن خوبصورت لفظوں کے بادشاہ ضرور ہو۔ تمہاری باتیں عجیب سی سرشاری طاری کرنے والی ہیں۔ میں نے جرم کی دُنیا میں تم سا وجیہ، جری اور خوبصورت دلنشیں باتیں کرنے والا مرد آج تک نہیں دیکھا۔ تم یقیناً تعلیم یافتہ ہو گے۔"

"ہاں نور...!" میں نے گہری سانس لے کر بتایا۔ "والدین نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی تاکہ اُن کا بیٹا بڑا آفیسر بن سکے... مگر حالات کی ٹھوکروں نے اُس گریجویٹ کو بڑا مجرم بنا دیا ہے۔"

نورین نے چہرہ گھما کر میٹھی، روشن اور مسکراتی نگاہوں سے دیکھا اور سرسراتی آواز میں بولی۔ "شاید اسی لیے تم منفرد ہو۔"

نہر شاید ایک ہی تھی، ہم نے دو پل عبور کیے تھے۔ وہ جنوبی نیم مضافاتی علاقہ تھا اگر فیکٹریاں نہ ہوتیں تو وہ ایک سرسبز و شاداب مضافاتی علاقہ ہوتا۔ پھل دار باغ کے کچے پاتھ وے پر جب کار مڑی تو مجھے خطرے کا احساس تو نہیں ہوا تھا کیونکہ چھٹی حس کا الارم خاموش تھا البتہ میں نے خطرے کے بارے میں سوچا ضرور تھا۔ شہر بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ نورین نے کسی شیراز نام کے ہوٹل کا ذکر کیا تھا۔

اگر پروگرام کے بعد نورین نے کہیں کال کی ہوتی یا مجھ سے جُدا ہوئی ہوتی تو میں اُس کی نیت پر ضرور شک کرتا۔ وہ صرف لباس بدلنے باتھ رُوم میں گئی تھی اور باتھ رُوم مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھا اگر وہ ٹرانسمیٹر پر بھی بات کرتی تو میں سرگوشیاں بھی سُن لیتا۔

باغ کے عین وسط میں تالاب کے کنارے وہ دو منزلہ عمارت تھی، جس کی پیشانی پر شیراز کا روشن بورڈ آویزاں تھا۔ ویسے پارکنگ پلاٹ میں کاروں کی چار قطاریں تھیں۔ لینڈ روورز، جیپیں اور تین ٹریکٹر الگ پارک کی گئی تھیں۔ جونہی نورین نے کار روکی، ایک شخص نے آکر سلام کے ساتھ لوکن دے دیا۔

ہوٹل کے شمالی پہلو میں گرمسیری لان میں فرشی دریوں پر لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے حالانکہ رات خاصی خنک تھی لیکن میں نے کچھ لوگوں کو کوک پیتے بھی دیکھا تھا۔ ڈائننگ ہال میں آدھے ٹیبل کی بھی گنجائش نہ تھی شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ کچھ لوگ لان میں چلے گئے تھے۔

نورین کو کاؤنٹر پر کھڑے نوجوانوں، ویٹروں اور چند دیگر لوگوں نے جھک جھک کر سلام کیا تھا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتی مینجر کے آفس میں چلی گئی تھی۔ جاتے جاتے اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا تھا جیسے ڈولی میں بیٹھی ہیر نے رانجھے کو اور لیلیٰ نے اپنے مجنوں کو رُک جانے کا اشارہ کیا تھا۔

جب باہر نکلی تو بھی اُس نے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔ سیڑھیوں کی اوٹ میں جاتے ہی اُس نے چلتے چلتے میرے ہاتھ میں ایک ٹوکن دے دیا کیونکہ ہمارے پیچھے بھی کچھ لوگ آرہے تھے۔ تہ خانے کا دروازہ یقیناً ریموٹ کنٹرول کے تحت کھلتا ہوگا۔ نورین جونہی ایک اُبھری ہوئی شٹ سل پر چڑھی دیوار پھٹ گئی تھی۔

اتنا ہی خلا کیا گیا تھا جس سے ایک موٹا آدمی گزر سکتا تھا۔ نورین تین سیڑھیاں آگے تھی۔ میں جان بوجھ کر فاصلہ بڑھا رہا تھا کہ ایک شخص میرے شانے سے رگڑ کھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ چرس اور سرسوں کی بُو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہی تھی۔ کڑوے دھوئیں نے آنکھوں اور گلے کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بہت وسیع ہال تھا۔ روشنی دھوئیں کی وجہ سے میلی تھی۔ مغربی موسیقی کی مدھم مدھم پھوار دھوئیں سے بل کر اُبھر رہی تھی۔ تین لڑکیاں بڑے بڑے میزوں کے درمیان ہولے ہولے تھرک رہی تھیں۔ وہ رقص کا انداز نہ تھا اگر وہ رقص ہی کر رہی تھیں تو یقیناً اناڑی تھیں۔ رقص کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔

ایک خوش رُو لڑکی نے مجھے خوش آمدید کہا اور ڈانس کے

ساتھ بھی خالی میز تک لے گئی۔

"شیراز کی انتظامیہ آپ کو پہلی وزٹ میں دل کی خوش آمدید کہتی ہے۔" اُس کی مسکراہٹ اور لہجہ کا عذب کے پھولوں جیسا خوش رنگ مگر بُو باس سے عاری تھا۔ "آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟" اُس نے قریب سے گزرتے ویٹر کی ٹرے سے ایک سگریٹ اُٹھا کر میرے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔

"شکریہ مس! میں نے اُس کے ہاتھ پر نرم نرم تھپکی دی۔ "فی الحال نہیں۔ میں کھل سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔"

"سلگاؤں سر؟" اُس نے جھک کر سرسراتی سی سرگوشی میں کہا۔ "یہاں پینا ضروری ہے۔" اُس نے سگریٹ میرے ہونٹوں میں دے دیا اور لائیٹر کا شعلہ دے کر سلگاتے ہوئے بولی۔ "ہوش میں رہنا بھی!" ویٹر کے آنے پر اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور مسکراتی ہوئی ایک اور نووارد کی طرف لپک گئی۔

میں نے بدبودار دھواں اُگل کر اطراف کا جائزہ لیا۔ ہاں گول تھا تمام فرنیچر کا رنگ سیاہ تھا۔ دیواروں اور چھت کو رنگین پیپرز سے خوش نظر بنایا گیا تھا۔ جو دھوئیں کی وجہ سے بدرنگ ہو رہا تھا۔ میرے پہلو میں پلیٹ فارم نما ڈائس تھا، جس پر آلاتِ موسیقی... بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے اور دو بوڑھے دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے سگریٹ پی رہے تھے۔

معاً ڈائس پر ایک شعلہ لپکا اور بوڑھے ہڑبڑاتے ہوئے سازوں کے درمیان رینگ آئے تھے۔ پھر عقبی دیوار نے سازندوں کو اُگلنا شروع کر دیا۔ وہ تعداد میں دس تھے۔ وہ شعلہ رُو لڑکی رقص کا انداز اپنائے ڈائس کے وسط میں سنگی مورتی کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

آخر میں ایک نوجوان مخملی پردہ اُچھالتا ہوا ڈائس پر آدھمکا۔ میں بیٹھے لوگ یک دم اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا تھا۔ میں ہونق سا اپنی جگہ جما رہا تھا۔ نوجوان فل آستین کی گرم جیکٹ اور تنگ پتلون میں ملبوس تھا۔ میں نے سوچا تھا شاید سنیچ ڈراما کھیلا جا رہا ہے اور نوجوان مرکزی رول ادا کرے گا۔ اُس کی بدن اور چھ فٹ قد کا وجیہ مرد تھا۔ ایسا مرد جو صنفِ نازک کی دھڑکنیں بے ترتیب کر دیتا ہوگا۔

جب سازندے اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تو نوجوان نے ہاتھ ہلا کر بینڈ ماسٹر کی طرح اشارہ دیا۔ طبلے کی ہلکی سی تھاپ اُبھری اور پھر ساز موسیقی کی لہروں کی زد میں آگیا۔ موسیقی بلاشبہ متاثر کن تھی۔ مجھ جیسے بے ذوق شخص بھی اُٹھتی گونجتی لہروں میں ڈوبنے اُبھرنے لگا تھا کیونکہ وہ دھڑکنیں تیز کر دینے والی موسیقی تھی۔ میں موسیقی کے فن سے آج بھی روزِ اوّل کی طرح نابلد ہوں۔ میں اپنے محسوسات کو زبان نہیں دے سکتا۔ وہ کیسی موسیقی تھی۔ مجھے وہ بین کرتی... سرگوشیاں کرتی، روتی، مسکراتی موسیقی لگی تھی۔ اُس موسیقی میں ایسا سحر تھا جو دلوں کو تسخیر کرنے کی قوت رکھتا تھا۔

موسیقی کی گونج بتدریج بلند ہوئی تو اُس لڑکی کا ساکت بدن پھر پری بن کر متحرک ہو گیا پھر وہ بجلی کی طرح کوندی اور سُرخ سپاٹ لائٹ اُس کے رنگ کے تعاقب میں ماند پڑ گئی تھی۔ وہ دیوانہ وار رقص کر رہی تھی اور لوگ جیسے اُس جادوگرنی کے سحر سے پتھر ہو گئے تھے۔ میں بھی مبہوت سا تھا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" مدھم ہوتی موسیقی کی تانوں کے پس منظر سے مترنم آواز اُبھری۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ نورین تھی پھر اُس نے کرسی سمیٹی کی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"کیسی ہے؟"

"کون؟" میں نے سرگوشیانہ آواز میں پوچھا، اور نورین ہنسنے لگی۔

"اچھی ہے لیکن تم سے کم تر...!"

"داؤد کو دیکھا تم نے...؟" وہ آگے جھک کر بولی۔ "اُس نے تمہارے لیے خصوصی ہدایات جاری کی ہیں کیونکہ آج کی رات نئے آنے والوں میں تم اُسے ممتاز دکھائی دیتے ہو۔ اُسی نے پروگرام شروع کروایا ہے۔"

"اچھا تو وہ تھا داؤد خان!" میرے حلق سے رُکی ہوئی سانس کے ساتھ غرّاہٹ اُبھری۔

"ابھی پتے اور پانسے بانٹنے والی لڑکی آئے گی۔" نورین بتانے لگی۔ میں نے چہرہ دائیں بائیں گھمایا۔ داؤد خان ہال میں سروس کرتی لڑکیوں کے بال بکھیرتا، گاہکوں کو تھپ تھپاتا اور لڑکوں سے باتیں کرتا ہال میں گھوم رہا تھا۔ ایک لحظے کے لیے ہماری نگاہیں چار ہوئیں پھر اُس نے چہرے کا رُخ بدل لیا تھا۔ میں خود کو نمایاں کرنا چاہتا تھا اب میں ایک مرحلے سے بخوبی گزر گیا تھا۔ اُس نے میری موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔

"آؤ کشیدے کون نے آئیں۔" نورین اُٹھتے ہوئے بولی۔ میں نے قریب سے گزرتی لڑکی کو روکا۔

"یس سر!" لڑکی میرے اوپر جھک کر بولی۔ "اپنی سروس سر!"

"یہ بدل لائیں۔" میں نے نوٹوں کی گڈی اُس کی بغل میں اچھال دی۔ "اپنی ٹپ اپنی مرضی سے وصول کر لینا۔"

"تھینک یو سر!" وہ مسحور لہجے میں بولی۔ "ابھی نہیں، جب قسمت کی دیوی آپ پر مہربان ہوگی تب!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا، داؤد خان ستون کی اوٹ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

جب نورین واپس آئی تو میں پتے حاصل کرکے پتوں سے ایک کرتب دکھا رہا تھا۔ پتے میری انگلیوں کی ماہرانہ حرکت پر ناچ رہے تھے، پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ارد گرد کی میزوں کے لوگ دلچسپ نگاہوں سے میرا کھیل دیکھ رہے تھے۔

"بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے۔" نورین نے پھدک کر میز کو بجایا اور ایک لڑکی دوڑتی چلی آئی۔ "میرے نام پانچ ہزار کے کوپن لے آؤ۔"

"خوب رو لڑکی جب ہار کر پھینکارتی ہے تو میں ہمیشہ بہت خوش ہوتا ہوں۔" میں نے داؤد خان کو اپنی پشت پر محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "بنگاک کی بلیاں تو منہ نوچنے کو آجایا کرتی ہیں۔"

"اب تمہیں پڑی۔ تم لگاتا ہوئی۔" نورین نے کوپن وصول کرنے کے بعد کہا پھر اس نے پتوں کو پھونک ماری۔

"مس نا معلوم!" میں نے پتوں کو چوم کر کہا۔ "اگر تم چاہو تو بازی کم کرسکتی ہو۔ میں تم جیسی خوش رو لڑکی سے تادیر کھیلنا چاہتا ہوں۔ ہولے ہولے جیسے گرم کافی پی جاتی ہے۔"

"کیم تک محدود رہو مسٹر!" اس نے بھڑکتی آواز میں جواب دیا۔ میرے عقب میں کھڑے داؤد نے پورے پتے دیکھ لیے تھے... پھر میری حساس ٹانگوں نے فرش پر بیٹھتے پتوں کو محسوس کرلیا تھا کوئی بڑے پتے نورین تک پہنچائے جا رہے تھے۔ میری ادایاں پاؤں ایک دم اٹھا اور ایک نسوانی چیخ قہقہوں میں تحلیل ہوگئی تھی۔ اس لڑکی کے ہاتھ پر میرا پاؤں لگا تھا۔

"فیئر گیم کھیلو مس!" میں نے جھک کر پتے اٹھائے۔ "اب ہاتھ کے پتے نیچے گرادو۔"

نورین نے دھواں دھواں نگاہوں سے داؤد خان کی جانب دیکھا اور پھر بے جان انداز میں پتے میرے سامنے رکھ دیے۔ میں چوتھی بازی بھی جیت گیا تھا۔

"واہ!" ایک وزنی ہاتھ میرے شانے سے لگا۔ "خوش کردیا تم نے اجنبی دوست!" وہ گھوم کر سامنے آگیا۔ "تمہارا کھیل مجھے پسند آیا۔ اٹھو مس نورین، کسی دوسرے کو قسمت آزمانے کا موقع دو۔"

"نہیں!" نورین نے چہرے پر بہراتی بالوں کی لٹ کو اسکارف میں اڑستے ہوئے کہا۔ "مسٹر داؤد! آپ جانتے ہیں میں کبھی شکست کا بوجھ لے کر میز سے نہیں اٹھا کرتی۔"

"آپ غالباً کوئی یتیم ہوتی ہیں۔" میں نے قہقہہ لگایا اور نورین پھڑک کر ساکت ہوگئی۔ "کچھ کل کے لیے بھی بچائیں مس نورین! مسٹر داؤد کسی دوسرے کو اکھاڑی کو لائیے۔ میں اس لڑکی کو معاف کر رہا ہوں۔"

"نہیں۔" نورین حلق پھاڑ کر دہاڑی۔ "تمہیں میرے ساتھ کھیلنا ہوگا۔ میں آخری روپے تک شکست تسلیم نہیں کروں گی۔ کوپن... اور لاؤ کوپن...!"

"سوری مس!" میں نے میز پر بکھرے ہوئے کوپن سمیٹ لیے۔ "میں جا رہا ہوں۔"

"تم نہیں جاسکتے۔" اس نے اچھل کر میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ "جب تک میں ہار نہ مانوں۔"

میں نے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ ملکی سی ضرب نورین کی کلائی پر ماری پھر بھی وہ سسکاری بھرتی ہوئی جھک گئی تھی۔ میں جانتا تھا آنے والا لمحہ میرے لیے کیا لانے والا ہے، اسی لیے اپنی پوزیشن کو بہتر بناتے ہوئے میں اپنی کرسی کی پشت پر ہوگیا تھا پھر پشت گاہ پر ہتھیلیاں ٹیک کر میں نے اجازت طلب نگاہوں سے داؤد خان کی طرف دیکھا۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے سگریٹ دانتوں سے کچل رہا تھا۔

"ہاں مسٹر یہاں کا یہی دستور ہے، ہارنے والے کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔" وہ سرد آواز میں بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

"میں اس دنیا میں بیوقوف نہیں ہوا داؤد خان!" میں نے اس کی سرخ آنکھوں میں جھانک کر سفاک لہجے میں کہا۔ "میں نسلاً مشرقی ہوں مگر یہاں کا شہری نہیں ہوں۔ برنس ٹور پر ہوں۔ اس ہوٹل کے بارے میں مجھے میرے میزبان نے بتایا تھا بلکہ اسی کی وساطت سے آیا ہوں۔ مجھے اس کھیل کے نئے دستور نہ پڑھاؤ۔ میں جا رہا ہوں۔"

"تھوڑی دیر اور بیٹھو۔" وہ ایک قدم بڑھا کر مسکراتا ہوا بولا۔ "چلے ہی جاؤ گے اگر جانا ہی چاہتے ہو تو قدم بڑھانے سے قبل جانے کا راستہ تو دیکھ لو۔"

میں نے نہایت ہی آہستہ آہستہ چہرہ دائیں گھمایا۔ چار بڑا کھڑے نوجوان قطاریں کھڑے کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے خنجر زن اور ایک نشانچی تھا۔ اس نے آنکھ دبا کر ریوالور گشت شہادت میں گھمایا۔

"اتاری ہو دوست؟" میں نے نرم آواز میں کہا۔ "اتنی سی مہمت میں کوئی تمہارا حلق چھید سکتا ہے۔ پھر میں نے داؤد کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ بھی دستور ہے یہاں کا کہ ایک نہتے شخص کے لیے چار مسلح آدمی اتارے جائیں؟"

"بیٹھ... بیٹھ جاؤ۔" داؤد خان نے بڑھ کر میرے شانے پر الٹا مکا مارا۔

"نہیں۔" میرا ہاتھ اس کی واپس جاتی کلائی سے ٹکرایا اور وہ ڈگرتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا تھا۔

"اے تم لوگ بتاؤ تمہارا مسٹر کون ہے؟" چاروں نے بیک وقت داؤد کی طرف دیکھا اور وہی مختصر سا وقفہ میں نے استعمال کرلیا تھا۔ میں نے خود کو ان کی نگاہوں کے جال سے لحظہ بھر کے لیے آزاد کرنے کی خاطر ان سے ایسا سوال کیا تھا جس کا جواب بغیر سوچے ان کو دینا چاہیے تھا۔

میں نے کرسی اٹھا کر دو قدموں کی چھلانگ لگائی اور پھر کرسی سمیت چکر پورا کیا۔ کرسی ٹکراتی ہوئی جب دوسرے چکر میں گھومی تو دو چہرہ ہاتھوں میں دبائے ڈوب رہے تھے اور وہ دوسری ضرب سے بچنے کے لیے جھک گئے تھے۔

"اچھے... بہت اچھے!" داؤد خان میرے سراپا کا تنقیدی سے جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "بڑی مدت بعد ایک معیاری فائٹ دیکھنے کو ملی ہے۔ اعتماد کرسکو تو بیٹھ جاؤ۔ داؤد خان کے مہمان کی حیثیت سے...!"

"ایک شرط پر۔" میں نے نورین کی طرف دیکھا۔ "یہ سارے کوپن مس نورین قبول کریں۔" میں نے ٹیبل پر بکھرے کوپن کی طرف اشارہ کیا۔ "میں بزنس سے کماتا ہوں، یہ کھیل محض تفریحاً کھیلا کرتا ہوں۔"

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" داؤد نے کہا۔ "نورین یہ سب لے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" نورین نے ایک لڑکی کو بلاتے ہوئے کہا۔ "ایک اچھے دوست کے اضافے کے نام!" اس نے تمام کوپن لڑکی کے حوالے کردیے۔ "داؤد کیا ہم اوپر کیبن میں چل کر نہ بیٹھیں؟"

"یہ درخواست نئے دوست سے کرو۔" داؤد نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ابھی نہیں مسٹر داؤد۔" میں نے اس کے ہاتھ کو تھپک کر لوٹا دیا۔ "ہاتھ تھام کر پھر مجھ پر کچھ ذمے داریاں عائد ہوجائیں گی، آیئے ادھر بیٹھتے ہیں۔"

کیبن کی اندرونی ڈیکوریشن دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ چار مربع گز کا کیبن کسی مغل شہزادے کی عشرت گاہ بنا ہوا تھا۔ جدید ترین فرنیچر، گداز قالین، ایک بیڈ بھی تھا جس پر پھولوں کی لڑیاں تو جھول کی جھالریں جھلملا رہی تھیں۔ عجیب قسم کی خوشبو تھی، جو اعصاب پر کیف کی پھوار برسا رہی تھی۔ روشنی دیواروں سے ایسے پھوٹ رہی تھی جیسے چاروں دیواریں مرکری میوبلوں کی بنی ہوئی ہوں۔

"اب تعارف ہوجانا چاہیے۔" داؤد خان بولا۔ "دوست اور مہمان کو مسٹر کہنا عجیب سا لگتا ہے۔"

"وہ نام، جو میری ماں نے لکھا تھا۔" میں نے صوفے کے ہتھے پر انگلیاں بجاتے ہوئے کہا۔ "میں ادھر ہی چھوڑ گیا تھا وہاں مجھے نیا نام دیا گیا تھا۔ اب میں ماں کا دیا ہوا نام بھول چکا ہوں۔ مجھے بلیک اسٹون کہا جاتا ہے۔"

"حالانکہ...!" نورین مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ گولڈن اسٹون ہیں۔ کبھی آپ نے سنہری سنگ مرمر دیکھا ہے؟"

"ادھر ظاہری رنگ نہیں بلکہ نسل سے پہچانا جاتا ہے مس نورین۔ وہ لوگ اہل مشرق کو بلیک ہی کہتے ہیں۔"

"بلیک اسٹون! آپ یقیناً مشروب مغرب پسند کرتے ہوں گے؟" داؤد نے برقی گھنٹی کا بٹن دباتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... لیکن میرے کچھ اصول ہیں، جس طرح ادھر لوگ ڈیوٹی کے دوران نہیں پیتے، اسی طرح میں صرف رات بیڈ پر جانے سے قبل دو پیگ لیتا ہوں۔ اس وقت کافی کی طلب محسوس کر رہا ہوں۔"

داؤد نے لڑکی کو کافی لانے کا حکم دے دیا اور پھر ہاتھ ملتا ہوا ٹہلنے لگا۔

"میری قوم کی یہ کیسی بدنصیبی ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "بلیک اسٹون جیسا بیٹا کسی دوسری قوم کی گود میں چلا گیا ہے کاش... کاش تم اس ملک کے شہری ہوتے۔ اس قوم کو تمہاری ضرورت ہے بلیک اسٹون۔"

غصہ میری کنپٹیوں کو ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ وہ سور خود کو قوم کہہ رہا تھا۔ ایک اسمگلر کو قوم کی ضرورت بتا رہا تھا۔ خیر خانوں کی فوج میں اضافے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

بقیہ واقعات کے لیے
جو پتا حصہ
ملاحظہ کیجیے